علی اکبر ناطق
کماری والا
ناول

علی اکبر ناطق (پیدائش: 1976ء) ایک پاکستانی ناول نگار، افسانہ نگار اور شاعر ہیں۔ ان کی وجہ شہرت ان کا ناول ''نولکھی کوٹھی'' ہے۔ اب تک ان کی شاعری اور افسانوں کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ علی اکبر ناطق کا خاندان 1947ء کے فسادات میں فیروز پور سے ہجرت کر کے وسطی پنجاب کے شہر اوکاڑہ کے نواحی گاؤں 32 ٹو ایل میں آباد ہوا۔ ناطق یہیں 1976ء میں پیدا ہوئے اور اسی گاؤں میں موجود ہائی سکول میں میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ ایف اے کا امتحان گورنمنٹ کالج اوکاڑا سے پاس کیا۔ اُس کے بعد معاشی حالات کی خرابی اور کسمپرسی کی وجہ سے بی اے اور ایم اے کے امتحانات پرائیویٹ طور پر بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان سے پاس کیے۔ تعلیم کے ساتھ مزدوری کا سلسلہ جاری رکھا اور بطور راج مستری پندرہ سال تک کام کیا۔ اسی دوران اُردو نثر، شاعری، تاریخ اور سماج کا مطالعہ بھی جاری رہا۔ 1998ء میں کچھ عرصے کے لیے روزگار کے سلسلے میں سعودی عرب اور مشرق وسطی بھی رہے۔ پاکستان واپسی کے بعد چند تعلیمی اداروں میں بطور استاد شعبہ اُردو منسلک رہے۔ کچھ عرصے بعد یونیورسٹی چھوڑ کر اپنے آبائی گاؤں اوکاڑہ منتقل ہوئے۔ 2009ء میں معروف ادبی جرائد نے ان کے افسانے اور نظمیں شائع کیں تو اچانک ان کی ادبی حلقوں میں شہرت ہوئی۔ 2010ء میں اُن کا پہلا شعری مجموعہ ''بے یقین بستیوں میں'' چھپا اور یو بی ایل ایوارڈ کے لیے نامزد بھی ہوا۔ 2012ء میں اُن کا پہلا افسانوی مجموعہ ''قائم دین'' چھپا، جسے اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کیا اور اِسے بھی یو بی ایل ایوارڈ ملا۔ ابتدا میں ایک افسانہ ''معمار کے ہاتھ'' شائع ہوا، جس کا انگریزی ترجمہ کر کے محمد حنیف نے امریکا سے شائع ہونے والے ادبی جریدے 'گرانٹا' میں بھی شائع کرایا۔ ناطق کی کچھ کتابیں انگریزی اور جرمن میں ترجمہ ہو چکی ہیں اور پینگوئن انڈیا شائع کر چکا ہے۔ ناول ''نولکھی کوٹھی'' نے ادبی حلقوں میں ہلچل مچائی ہے، پینگوئن انڈیا اسے انگلش میں شائع کر رہا ہے۔

علی اکبر ناطِق

ناول:

نولکھی کوٹھی

کماری والا

افسانے:

قائم دین

شاہ محمد کا ٹانگہ

شاعری:

کلیات علی اکبر ناطق

سرمنڈل کا راجہ

در عدالت علے

سبز بستیوں کے غزال

ریشم بننا کھیل نہیں

یاقوت کے ورق

دیگر:

فقیر بستی میں تھا (محمد حسین آزاد کی سوانح)

ہیئت شعر اقبال کی شاعری کا جائزہ

کماری والا

ناول

علی اکبر ناطق

Kamari Wala
by Ali Akbar Natiq
Jhelum: Book Corner. 2020
638p.
1. Novel - Fiction
ISBN: 978-969-662-312-0

مہتمم اعلیٰ: شاہد حمید

ناشرین: گگن شاہد * اَمر شاہد

اشاعتِ اوّل: دسمبر 2020ء

اشاعتِ دوم: جنوری 2021ء

کتاب: کماری والا (ناول)

مصنف: علی اکبر ناطق

لفظ خواں: شاہد حمید

سرورق ڈیزائن: ابو امامہ

سرورق ڈرائنگ: سوسانا چیس (پرتگال)

خطاط: محمد علی زاہد

کمپوزنگ و صفحہ سازی: محمد عمر فاروقی

کتابت: نوری نستعلیق، علوی نستعلیق

مطبع: زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور

ناشر: بک کارنر

ویب سائٹ: www.bookcorner.com.pk

بک سٹور: بک کارنر شوروم، بالمقابل اقبال لائبریری، اقبال لائبریری روڈ، جہلم، پاکستان 49600
00 92 544 278051, 00 92 544 614977 00 92 314 4440882, 00 92 321 5440882
bookcornerjlm /bookcornershowroom /bookcorner
bookcornerjhelum info@bookcorner.com.pk

bookcornerjlm

جواں مرگ بھائی علی اصغر

اور

مقتولہ بہن خدیجہ بی بی

کے نام

پیش لفظ

اے میرے قارئین آپ ہی میری محبوب ترین ہستیاں ہیں جنھوں نے میری تخلیقات کو وقار بخشا اور مجھے عزت و آبرو کی مسند پر سرفراز کیا۔ آپ وہ عام لوگ ہیں جو میرے قبیلے کے ہیں۔ مَیں نے آج تک آپ سے زیادہ نہ کسی کو قابلِ توجہ سمجھا، نہ کسی یونیورسٹی اور کالج کے پروفیسر سے مرعوب ہوا اور نہ اُنھیں اِس قابل سمجھا کہ اُن کے ساتھ علمی و ادبی معاملے میں گفتگو کروں۔ میرا فکشن، میرا شعر، میری تحقیق اور میری تنقید صرف آپ لوگوں کے لیے ہے۔ آپ عام لوگوں کے لیے، جن کے سینے ہر اچھی تخلیق پر حسد سے نہیں، محبت سے بھر جاتے ہیں۔ آپ نے میری پہلی تمام کتابوں پر جس قدر محبت اور مہر کی عنایت کی اُس پر شکر گزار ہوں۔ مجھے میرے مولا علی کی قسم ہے، کم وبیش پہلے بھی اور اب مطلقاً مَیں کسی مہاتما قسم کے بزرگ ادیب کو اپنی یہ کتاب تحفے میں پیش نہیں کروں گا، نہ اُن سے داد چاہوں گا، نہ اُن سے ستائش کی تمنا کروں گا۔ میرا تمام روئے سخن آپ ہی سے ہے اور آپ ہی رہیں گے۔ مَیں جانتا ہوں آپ میرے اِس ناول کے شدت سے منتظر تھے۔ مَیں آپ کے قلب کی آواز کو سنتا تھا اور جلد اِس ناول کو سامنے لانا چاہتا تھا مگر مَیں اُن مصنفین کی طرح نہیں جن کے قلم کی روشنائی اُن کے دل کے خون سے سیراب نہ ہو۔ مجھے اِس ناول کا ایک ایک لفظ دل کے لہو کی روشنائی سے اٹھانا پڑا۔ چنانچہ اِس ناول ''کماری والا'' پر بہت وقت لگا، جس کے سبب آپ کے انتظار کی زحمت طویل ہوگئی۔ اِس پر مَیں آپ سے دست بستہ معافی کا درخواست گزار ہوں۔

''نولکھی کوٹھی'' میرا پہلا ناول تھا، ''کماری والا'' دوسرا ناول ہے۔ یہ کم وبیش ساڑھے چھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ ''نولکھی کوٹھی'' کی مقبولیت کے سبب مجھ پر بہت زیادہ ذمہ داری عائد ہوگئی تھی۔ اس کے معیار کو دیکھتے ہوئے مَیں نہیں چاہتا تھا قاری مجھ پر رکھی گئی توقعات سے مایوس ہو۔ مَیں نے اپنے معیار پر کسی قیمت سمجھوتا نہیں کیا اور جتنا ہوسکا اِس پر وقت صرف کیا۔ مجھے کامل یقین ہے قارئین اِسے پڑھ کر مجھے دعائے محبت سے یاد رکھیں گے اور ان شاء اللہ برسوں تک ناول کی دُنیا سے نہیں نکل پائیں گے۔

مَیں خاص طور پر اپنے پبلشر ''بک کارنر، جہلم'' کے دو نوجوانوں گگن شاہد اور امر شاہد کو ''کماری والا'' ناول کے چھپنے پر مبارک باد پیش کروں گا، جنھوں نے اِس کی اشاعت میں آخری حد تک دلچسپی لی۔ بار بار مسودے کو پڑھا، بار بار غلطیوں کی نشان دہی کی اور پروف کو دیکھا۔ امر شاہد نے جس طرح اِسے چھاپنے میں اپنی محنت صرف کی آج تک مَیں نے اتنی گرم جوشی کسی پبلشر میں نہیں دیکھی۔ مجھے خدائے آلِ محمد پر یقین ہے، وہ اِن کی اور میری محنت کا اجر نہیں رکھے گا اور بک کارنر جہلم کا نام مزید بلند ہوگا۔ یہ دونوں بھائی مجھ سے جس قدر محبت اور رغبت کا معاملہ رکھتے ہیں، کوئی کم ہی رکھتا ہوگا۔ میری تمام کتابوں کے آئینی حقوق اِسی ادارے کے پاس ہیں اور جب تک خدا نے چاہا، رہیں گے۔ اِنھوں نے جس تزئین اور محبت کے ساتھ میری کتابیں چھاپی ہیں اور اُنھیں قارئین تک پہنچایا ہے، یہ بات میرے لیے اور خود قارئین کے لیے بڑی حوصلہ افزائی کا باعث ہے۔

اِن کے بعد مَیں خاص طور پر سید منظر نقوی اور عرفان جاوید کا ذکر کروں گا جنھوں نے ناول کا مسودہ پڑھ کر ایسی پسندیدگی اور قبولیت کا اظہار کیا کہ مجھے خود اپنے آپ پر فخر ہونے لگا۔ دونوں احباب نے مسودے میں کئی غلطیوں کی نشان دہی بھی کی جنھیں درست کیا گیا۔ احباب! اب یہ ناول آپ کے ہاتھوں میں ہے، اِسے پڑھیے، اچھا لگے تو دیگر احباب تک متعارف کرایے۔

خدا آپ کا اور میرا حامی و ناصر ہو۔

علی اکبر ناطق

نومبر 2020ء

اسلام آباد

(۱)

یہ ایک ویران اور کچی سڑک تھی۔ چاندنی رات کا دودھ اُبل رہا تھا اور دُور تک کھلے میدانوں کے دراز ہوتے سلسلے تھے۔ رات لاری سے جس وقت یہاں اُترا، غالباً نو بجے تھے۔ آسمان اتنا شفاف اور تر و تازہ بھی ہوگا، یہ بات پچھلے 25 برسوں میں ایسے بھول گئی کہ پھر اُس کا تصور بھی ختم ہو گیا تھا۔ چاند کے آس پاس کے تارے تو پھیکے تھے مگر اِس آسمانی چھجے کے کناروں والے ایک ایک تارے کی شکل اور اُس کا مزاج کسی تجربہ کار آدمی کے دوستوں کی طرح نکھرا ہوا تھا۔ جیسے مَیں ہزاروں سال سے اِنھیں جانتا ہوں۔ چاند تانبے کے تھال کی طرح دہک رہا تھا۔ اِتنا گول اور بڑا چاند زندگی میں پہلے نہیں دیکھا تھا۔ مَیں نے کبھی قمری تاریخوں کا حساب نہیں رکھا مگر اِس قدر واضح گولائی بتاتی تھی کہ آج اِس کی چودہ تاریخ تھی اور جوبن کی انتہا تھی۔ شاید اگلے ہی لمحے اِس کے زوال کی گھڑی شروع ہونے والی تھی۔ اُس میں بیٹھی چرخا کاتنے والی بوڑھی عورت، حتیٰ کہ اُس کے ماتھے کی سلوٹیں واضح دکھائی دے رہی تھیں۔

سڑک کے دونوں طرف اُونچے درختوں کی طویل قطار نے گہرے سایے کیے تھے۔ سڑک بھٹے کی سُرخ اور بڑی اینٹوں سے بنائی تھی۔ اینٹیں کھردری اور سخت ہونے کے باوجود درختوں کے سائے میں سیاہی مائل اور ملائم نظر آتی تھیں۔ جہاں سایہ نہیں تھا وہ جگہ چاند کی طرح دودھ میں نہائی ہوئی تھی۔ لاری کے آگے گزرنے کے بعد ہُو کا عالم طاری ہو گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کروں؟ درست سمت کا اندازہ اُس وقت ہوتا جب کوئی آدمی وہاں نظر آتا اور اُس سے پوچھ لیتا۔ مجھے لاری کے کنڈیکٹر

نے بتا دیا تھا یہاں سے پندرہ کوس پیدل چلنا پڑے گا۔ مَیں اُس سے یہ پوچھنا بھول گیا کہ وہ پندرہ کوس کس جانب چلوں۔ ایک جگہ درخت کے نیچے سڑک کے کنارے دو لکڑی کے بنچ پڑے تھے۔ یہ بنچ ڈیڑھ ہاتھ چوڑے اور پانچ ہاتھ لمبے تھے۔ میرے لیے اب کوئی چارہ نہیں تھا کہ یہاں بیٹھ کر صبح ہونے کا انتظار کروں، یا پھر اُس وقت تک بیٹھوں جب تک کوئی آدمی نظر نہیں آتا۔ مَیں آگے بڑھ کر لکڑی کے بنچ پر بیٹھ گیا۔ یہ جنوری کے آخری دن تھے۔ ہوا میں سردی کی شدید خنکی تھی۔ میرا لباس پاجامے، بازو والی شرٹ اور اونی جرسی پر منحصر تھا۔ یہ تینوں چیزیں اِس وقت کافی نہیں تھیں۔ میرے لیے رات کا باقی حصہ گزارنا مشکل ہو گیا۔ مَیں بنچ پر بیٹھ کر چاروں طرف کا جائزہ لینے لگا۔ نیند میری آنکھوں سے بہت دور تھی۔ سامنے تین چار ایکڑ کا رقبہ خالی پڑا تھا اور اُس کے آگے فصلوں کے نہ ختم ہونے والے کھلیان تھے۔ اِن کھلیانوں اور خالی میدانوں سے ٹھہر ٹھہر کر اِکا دُکا گیدڑ کے ہونکنے اور کُوک مارنے کی آواز آ جاتی تھی۔ مَیں اِن آوازوں سے قدرے مانوس تھا اِس لیے ڈرنے کی کوئی بات نہیں تھی۔ جس چیز کا ڈر تھا وہ جنگلی سؤر، سانپ یا اِسی طرح کے حشرات اور جانور ہو سکتے تھے۔ اِن سب سے بڑھ کر یہ خوف تھا کہ کوئی لوٹ نہ لے۔ لُٹانے کے لیے میرے پاس ویسے تو کوئی شے نہیں تھی مگر لُٹتے وقت انسان کو جس ذلت اور تشدد سے گزرنا پڑتا ہے، وہی بات اذیت ناک تھی۔ لاری میں میرے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک بڑی مونچھوں والے چیچک زدہ مسافر نے انتہائی تشویشناک لہجے میں بتایا تھا کہ رات کے اِس وقت یہاں اُترنا بالکل مناسب نہیں ہے۔ یہ پورا علاقہ ڈکیتی کی واردات کرنے والوں کے لیے جنت ہے۔ دوسری بات یہ تھی کہ اِس وقت کماری والا جانے کے لیے اگلی کوئی سواری نہیں ملے گی کیونکہ پانچ میل سے آگے دریا کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ وہ جگہ بہت زیادہ ریت اور گرد سے اَٹی ہوئی ہے۔ اگر تم ڈاکوؤں سے بچ کر نکل بھی گئے تو پیدل چلنا محال ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اگلے سٹاپ تک میرے ساتھ چلو۔ رات میرے گھر میں گزارو، صبح یہی بس دوبارہ یہاں سے گزرے گی، اُس پر بیٹھ کر اُتر جانا۔ سویرے سات بجے یہاں سواری ملنا شروع ہو جاتی ہے۔ مَیں نے اُس کی تمام بات غور سے سننے کے بعد اُس کا شکریہ ادا کیا اور زحمت نہ دینے کا کہہ کر کماری والا سٹاپ پر ہی اُتر گیا۔ مَیں نہیں جانتا وہ آدمی میرے ساتھ اخلاص سے بات کر رہا تھا یا لوٹنے کے چکر میں تھا مگر اِس وقت مَیں کسی بھی قیمت پر نئی منزل کی طرف روانہ ہونے کے موڈ میں نہیں تھا اور جلد اپنے مقام تک پہنچنا چاہتا تھا جس کے لیے میرے پاس زندگی کے اہم ترین مسائل تھے۔ بنچ پر بیٹھے ہوئے مَیں تین سمت کو جانے والی کچی سڑکیں

دیکھ رہا تھا۔ درختوں کی شاخیں ہلنے سے اِن سڑکوں پر پڑتی ہوئی چاند کی روشنی اور شاخوں کے سائے ایک دوسرے کے گلے مل کر رقص کر رہے تھے اور مسلسل جگہ بدل رہے تھے۔ کبھی دائیں طرف چلتے جاتے کبھی بائیں طرف۔ یہ سڑکیں بنیادی طور پر زبردستی کے بنائے ہوئے راستے تھے اور سڑکیں ہرگز نہ تھیں۔ مجھے اِن تین راستوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا لیکن اُس وقت تک نہیں کر سکتا تھا جب تک کوئی آدمی نہ پہنچ جاتا۔ کچھ دیر میں درختوں کی شاخیں تیز ہلنا شروع ہو گئیں اور ہوا میں ٹھنڈک کا احساس بڑھ گیا۔ اِس کے سبب مَیں اُٹھ کر ٹہلنے لگا اور اِدھر اُدھر قدم اُٹھا کر پھرنے لگا۔ مجھے بار بار ہاسپٹل میں پڑی اُس نیم مردہ کی فکر کچوکے دے رہی تھی جس کی زندہ لاش نہ جانے کب اپنی ہڈیوں کو روح سے الگ کر لے۔ تنہائی اور بیماری کے آسیب خونخوار چھریوں کے ساتھ اُس کی لحہ بہ لحہ باریک ہوتی جلد کو کاٹ رہے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا میرے جانے سے پہلے وہ اُس تمام مصیبت سے سُبک بار ہو جائے جس کا وزن میرے کاندھوں کو شل کر چکا تھا۔ آسمان پر دہکتا ہوا زرد چاند آج پوری صحت مندی میں تھا اور میرے ساتھ کسی فیصلہ کُن مقابلے پر اُتر آیا تھا۔ مَیں نے تینوں راستوں پر تھوڑی دُور جا کر دیکھا شاید کسی گاؤں کا بورڈ لگا ہو یا کچھ لکھا ہو کہ یہ راستہ کس طرف کے گاؤں کو نکلتا ہے مگر مجھے مایوسی ہوئی۔ اِس طرح کی کوئی نشانی موجود نہیں تھی۔ مَیں واپس آ کر اُسی بنچ پر بیٹھ گیا اور چند لمحوں بعد تھک گیا۔ اب میں نے وقت دیکھا تو رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ سایوں اور روشنیوں نے جگہیں بدل لی تھیں۔ میرے جسم پر نقاہت طاری ہونے لگی۔ مَیں نے اپنے جوتے اُتار کر سر کے نیچے رکھے اور لیٹ گیا۔ دماغ میں انتشار کا ایک ہنگامہ تھا مگر تھکاوٹ اور ہوا کی سردی کے باوجود تھوڑی ہی دیر میں نیند سے ہم آغوش ہو گیا۔ پھر تمام رات سوتا جاگتا رہا۔

آنکھ کھلی تو ایک پیٹر انجن کے گڑگڑانے کی آواز آ رہی تھی۔ مَیں جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا لیکن صبح ہو چکی تھی۔ موسم نہایت فرحت عالم تھا۔ مَیں نے انجن کی غراہٹ کی طرف مُڑ کر دیکھا تو عجیب شے نظروں میں پڑی۔ ایک ایسی لکڑی کی ٹرالی جس کے آگے فقط ایک پیٹر انجن بندھا ہوا تھا۔ اُس کے نیچے ریڑھی کے موٹے ربڑ کا ٹائر تھا جس پر سٹیئرنگ لگا تھا۔ انجن سے کالا دھواں نکل رہا تھا۔ ٹرالی میں پندرہ بیس آدمی اور تین چار عورتیں بیٹھی تھیں۔ اُن میں سے تین آدمی وہیں اُتر گئے، باقی بیٹھے رہے۔ ڈرائیور نے (میرے پاس اُسے ڈرائیور نہ کہنے کا کوئی جواز نہیں ہے) اُن سے کرایہ وصول کر کے انجن کو دوبارہ گیئر میں کر دیا اور وہ عجیب و غریب آواز سے اُسی سڑک پر چل پڑا

جو اجودھن والا کو جاتی تھی۔ یہ سڑک فقط بھٹے کی سُرخ اینٹوں سے تیار کی گئی تھی جسے مقامی زبان میں سولنگ کہتے ہیں۔ اِس سے پہلے کہ تمام بندے اپنے رستے پر نکل جاتے، مَیں جلدی سے اُٹھا اور ایک آدمی کو روک کر اُس سے کماری والا کا رستہ پوچھ لیا۔ یہ آدمی جس سے رستہ پوچھا، باقی دو آدمیوں سے زیادہ سمجھ دار نظر آتا تھا۔ سفید لٹھے کا کُرتہ، نیچے بڑے گھیرے والی سفید ہی چادر تھی۔ سر پر کوئی ساڑھے پانچ گز کی لٹھے کی پگڑی تھی۔ داڑھی بھی سفید تھی اور زیادہ لمبی نہیں تھی۔ پاؤں میں دیسی چمڑے کے طِلے دار جوتے تھے اور مقامی موچی نے بڑی چاہ سے بنائے تھے۔ اُس نے تھوڑی دیر میری طرف سرسری نظر سے دیکھا پھر بولا، باؤ جی کماری والا تو یہاں سے پندرہ میل ہے۔ تھوڑی دیر انتظار کر لو، ٹرلو (پیٹر گاڑی) آ جائے تو اُس پر بیٹھ جانا۔ تمھیں دو روپے میں پنڈ چیکن والا میں چھوڑ دے گا، وہاں سے کماری والا تین میل ہے اور پیدل چلنا پڑے گا۔

ٹرلو کتنے بجے تک آ جائے گا؟

اُس کا کوئی ٹائم نہیں بیٹا، جب سواریاں پوری ہوں تو چل پڑتا ہے اور چیکن والا سے یہاں ایک گھنٹے میں پہنچ جاتا ہے۔ بس سمجھ لو اگر چیکن والا سے ٹرلو آٹھ بجے نکلے تو یہاں نو بجے پہنچے گا۔ ایک دو گھنٹے یہاں کھڑا ہو کر سواریوں کا انتظار کرے گا، پھر واپس گیارہ بارہ بجے کے قریب پہنچ جائے گا۔

مَیں بابا جی کی بات سُن کر چپ سا ہو گیا اور دل بیٹھ سا گیا۔ یہ فاصلہ جسے وہ پندرہ میل بتا رہا تھا، پچیس کلومیٹر بنتا تھا اور میرے لیے بہت زیادہ تھا مگر جس قدر ٹرلو کا انتظار وہ بتا رہا تھا، وہ سخت بھاری تھا۔ مَیں نے بابے کو ایک بار پھر مخاطب کیا، بابا جی اگر میں پیدل ہی جاؤں تو رستہ سیدھا ہی ہے یا اِدھر اُدھر موڑ آتے ہیں؟

موڑ تو آتے ہیں پر چھ میل تک ناک کی سیدھ میں جاؤ۔ آگے کسی سے پوچھ لینا۔

اب میرے لیے وہاں زیادہ دیر رُکنا نہایت مصیبت ہو رہا تھا۔ میرے پاس گندم کے بسکٹوں کا ایک پیکٹ تھا۔ دو چار اُس میں سے بسکٹ کھائے، ٹاہلیوں کے درمیان صاف اور کچے نالے سے پانی پیا اور چل پڑا۔ یہ راستہ بالکل کچا تھا اور دونوں طرف کہیں کہیں باجرے اور مکئی کے کھیت تھے۔ اکثر جگہ خربوزوں اور تربوز کی بیلیں موجود تھیں جن پر پھل نہیں تھا۔ یہ بیلیں سوکھ چکی تھیں۔ تربوز اُتار لیے گئے تھے لیکن پوری سردیاں گزر جانے کے باوجود بیلوں کو کاٹنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اب اِن بیلوں کے درمیان چوہوں، سانڈوں اور کئی قسم کے کیڑوں مکوڑوں نے بلیں کھود رکھی تھیں۔ اِنھی کے درمیان

چبڑوں اور بھکھڑے کی بھرمار تھی۔ یہ خشک بیلوں کے کھیت قدرے رتیلے تھے اور اُن میں جابجا
چوہوں کے بلوں کے سبب ریت ڈھیریوں کی شکل میں جمع تھی۔ یہ چھوٹی چھوٹی ریت کی ڈھیریاں
پورے کھیتوں میں قبروں کی طرح بکھری تھیں۔ مجھے اِن دِنوں ہر مٹی یا ریت کی اُبھری ہوئی ڈھیری قبر
کے تصور سے جوڑ دیتی تھی۔ موسم نہایت مناسب تھا اور ہوا بھی چل رہی تھی۔ سڑک کی گرد بیٹھی ہوئی تھی۔
گرد ریت اور مٹی کی ملی جُلی تھی اور بہت زیادہ تھی۔ اِن جگہوں پر موٹر سائیکل یا دوسری کوئی بھی گاڑی چلنا
مشکل تھی۔ خود میرا پاؤں اتنا دھنس رہا تھا۔ ٹرلو کے ٹائروں نے یہاں اِس قدر دھول پیدا کر دی تھی اور
مٹی کو پسا ہوا ایسا غبار بنا دیا تھا کہ کسی بھی چیز کے لیے وہ بہت گہرا اور سخت مشکل ہو گیا تھا۔ مَیں نے
سڑک سے ہٹ کر ایک کھیت میں چلنا شروع کر دیا۔ یہ کھیت خالی تھا مگر اِس میں چبڑ، بھکھڑا اور دوسری
جڑی بوٹیاں کثرت سے تھیں۔ اب میرا منہ جنوب کی سمت تھا اور تیزی سے قدم اُٹھاتا جا رہا تھا۔ سڑک
پر دُور تک کوئی ذی روح نہیں تھا۔ کچھ کچھ فاصلے پر البتہ ٹاہلی اور شرینہہ کے درخت ضرور تھے۔ اِسی
دوران مشرق کی طرف سے سورج انتہائی شفقی کے ساتھ طلوع ہو رہا تھا۔ یہ دُور نہیں لگتا تھا بلکہ جیسے کوئی
دوست چند قدموں کے فاصلے سے ساتھ چل رہا ہو اور کبھی کسی درخت کی اوٹ لے لے، کبھی کسی فصل
کی۔ ایک جگہ مَیں حیرانی سے رُک گیا۔ میرے بائیں جانب لسوڑوں کے درختوں کا ایک جنگل سا آ
گیا۔ یہ جنگل کم سے کم پانچ ایکڑ پر تھا۔ آج تک میں نے اِس درخت کا کوئی باغ نہیں دیکھا تھا۔ جہاں
کہیں بھی نظر آیا، اِکا دُکا ہی تھا۔ یہ ایک عجیب منظر تھا۔ سورج اِن لسوڑوں کے درختوں میں سے زرد اور
سنہری بالوں والے لڑکے کی طرح جھانک رہا تھا اور بلند ہو رہا تھا۔ مَیں کچھ دیر کے لیے اپنے راستے
سے ہٹ کر اِس لسوڑوں کے باغ کی طرف مُڑ گیا۔ لسوڑوں کے درخت بے ترتیب مگر کافی گھنے تھے۔
مَیں چند لمحے اِن کے درمیان کھڑا ہو کر اُنھیں اپنے اندر جذب کرنے لگا۔ درختوں کی شاخیں اور ہری
کونپلیں بے شک مرعوب کر دینے والی تھیں لیکن مَیں کتنی دیر یہاں ٹھہر سکتا تھا۔ جہاں تک یہ جنگل
میرے راستے کے قریب رہا مَیں اِس میں چلتا رہا اور جب ختم ہو گیا واپس اپنے رستے پر آ لگا۔ سورج کی
شفقی اور ہلکی زردی میں اِس قدر ٹھنڈا پن پہلے کبھی مَیں نے محسوس نہیں کیا تھا۔ آہستہ آہستہ سورج بلند اور
سفید ہوتا گیا یہاں تک کہ پھڑ پھڑاتے سفید بگلے کی طرح میرے سامنے جم کر کھڑا ہو گیا۔ مَیں نے اپنی
گھڑی پر نظر دوڑائی، دن کے دس بج رہے تھے۔ گویا مجھے چلتے ہوئے مسلسل تین گھنٹے ہو گئے تھے اور
اب میرے قدم سُست ہو چکے تھے۔ اتنے میں دُور سے دیکھا تو ایک ٹرلو سامنے سے آ رہا تھا۔ یہ وہی

گاڑی تھی جس کا مجھے تارے والا اسٹاپ پر کھڑے ہو کر انتظار کرنا تھا اور اب میں نے آٹھ میل کا فاصلہ طے کر لیا تھا یعنی انتظار کرنے سے میرا چلنا زیادہ بہتر تھا۔ مَیں وہیں کھڑے ہو کر ٹرلو کو دیکھنے لگا جو آہستہ آہستہ قریب ہو رہا تھا، پھر بالکل پاس سے گزرنے لگا۔ مَیں نے محسوس کیا گاڑی کا شور اُس کی رفتار سے زیادہ تھا۔ یہ مسلسل کالا دھواں نکال رہا تھا اور انتہائی طاقتور دھکے کے ساتھ ریت اور مٹی کی ملی جلی بہت زیادہ گرد کو چیر کر آگے بڑھ رہا تھا۔ مَیں نے پہلی دفعہ ایسی عجیب و غریب گاڑی دیکھی تھی۔ یہ سواری یہاں کے مقامیوں نے محض اپنی اختراع کی تھی اور اِسے ٹرلو کا نام بھی خود ہی دیا تھا۔ باقاعدہ گاڑی نہیں تھی۔ دھڑڑ دھڑڑ کر کے چلتی جا رہی تھی۔ جب تک وہ میری آنکھوں سے اوجھل نہیں ہو گئی مَیں اُسے کھڑا دیکھتا رہا۔ ٹرلو کے جانے کے بعد آہستہ سے پھر چل پڑا۔ ابھی تھوڑی دیر ہی چلا ہوں گا کہ ایک ہرے بھرے درختوں کے جھنڈ کے درمیان پہنچ گیا۔ یہ جگہ نہایت خوبصورت اور سایہ دار تھی۔ ٹھنڈے پانی کا ایک نالہ درختوں کے سایے سایے چل رہا تھا اور اِس کا پانی سبز نظر آ رہا تھا۔ اِس کے پاس ہی ایک ٹیوب ویل چھ اِنچ کے کھلے دہانے کی نال پانی کی بھر کر پھینک رہا تھا۔ یہ پانی سراسر ایسے لگتا تھا جیسے چاندی کی جھاگ چھلک رہی ہو۔ ٹیوب ویل کے سامنے ایک بڑا سا کچا حوض تھا۔ حوض کیا تھا، آٹھ دس فٹ کے قطر کے دائرے میں گارے اور ریت کی چھوٹی سی بندی باندھی گئی تھی اور بیچ میں شفاف پانی بہہ کر ایک نالے میں جا رہا تھا۔ یہ نالہ بھی مطلق کچا اور نہایت رواں تھا۔ سبز رنگ کی کائی اس کی تہہ میں ناگنوں کی طرح جھولتی تھی۔ کالے انجن کے ٹیوب ویل کے بائیں جانب ایک بہت بڑا بیریوں کا باغ تھا اور اتنا بھرا اور گہرا تھا کہ اردگرد کا علاقہ بھی سیاہی مائل سبز نظر آتا تھا۔ مَیں تھوڑی دیر کے لیے ٹیوب ویل کے حوض کے پاس بیٹھ گیا۔ اب وقت گیارہ بجے کا ہو چکا تھا اور مجھے چلتے ہوئے مسلسل چار گھنٹے ہو گئے تھے اور پاؤں سوجنے لگے تھے۔ مَیں نے اپنے جوتے اُتار کے ایک طرف رکھ دیے اور پاؤں پانی میں ڈال دیے۔ پانی بہت ٹھنڈا اور راحت دینے والا تھا۔ اتنا زیادہ چلنے کے بعد مجھے پیاس بھی لگ چکی تھی۔ مَیں نے حوض سے اوک کے ذریعے پانی پیا اور درختوں کی ہوا کے ساتھ اُس حوض کا لطف لینے لگا۔ پہلی بار شدت کے ساتھ احساس ہوا کاش اِس طرح کی رہنے کی جگہ مل جائے تو مَیں کبھی شہر کا رُخ نہ کروں۔ ابھی بیٹھے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ ایک آدمی اپنا حقہ اور چارپائی لیے وہاں آ گیا۔ اُس نے چارپائی حوض کے کنارے ایک ٹاہلی کے تنے کے ساتھ رکھ دی۔ اِسی تنے کے ساتھ پانی کی ندی بہہ رہی تھی۔ اجنبی نے ایک تیز نظر کے ساتھ مجھے دیکھا اور بولا، بھائی اِس علاقے میں نئے لگتے ہو، پہلے کبھی دیکھا

نہیں؟ آؤ اِس چارپائی پر بیٹھ جاؤ۔ مَیں نے پاؤں پانی سے نکالے، جوتے پہنے اور اُٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اُس کے بعد کہا، ''جی ہاں مَیں یہاں پہلی بار آیا ہوں۔ مجھے کماری والا جانا ہے۔ تارے والا سٹاپ سے پیدل چلتا ہوا پہنچا ہوں۔ ٹرالی لیٹ تھی، مَیں نے سوچا جتنے عرصے میں گاڑی لے کر جائے گی مَیں خود پہنچ جاؤں گا۔''

اُس نے اپنے حقے کے دو تین کش لیے اور بولا ''ہمت ہے بھائی تیری، دیکھنے میں تو بابو سا لگتا ہے اور کام بھینس چوروں والا کیا ہے۔''

سمجھا نہیں، مَیں نے حیرانی سے پوچھا۔

میاں تارے والا یہاں سے بارہ میل ہے اور ابھی کماری والا چار پانچ میل باقی ہے۔ ایسے کام تو وہ کرتے تھے جو راتوں کو بھینسیں چوری کر کے چالیس کوس چلا کر لے جاتے تھے۔ آج کل تو وہ بھی ٹرک لاتے ہیں اور مال چڑھا کر لے جاتے ہیں۔

کسان کی بات پر میں مسکرا دیا، گاؤں دیہاتوں میں بھینسیں چوری کرنے کا رواج عام تھا۔ ہمارے اپنے گاؤں میں یہ واقعہ بہت دفعہ پیش آیا تھا اور اِس پر حیرانی بھی ہوتی تھی۔ اُس کی بات کو ایک طرف کرتے ہوئے مَیں نے کہا ''راستہ بہت مشکل ہے، یہاں تو پیدل بھی نہیں چلا جاتا' ریت اور گردوغبار کے دریا چلتے ہیں۔

میاں یہ اِٹھاڑ کا علاقہ ہے، پتا نہیں دریا کب ڈھا لگا دے۔ ایک دو دفعہ سڑک کا سولنگ لگا تھا مگر دریا نے اُکھاڑ دیا۔ اب کوئی نہیں لگاتا۔ مٹی اور گرد تم دیکھ ہی چکے ہو کتنی ہے؟ بس دو ہی سواریاں یہاں چل سکتی ہیں، ایک سانڈنی اور دوسری خچر یا پھر کسی بھوت بندے نے یہ پیٹر چھکڑا بنا ڈالا ہے۔ چاہے اِس پر پورا گھر کھینچ کر لے جاؤ۔ تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے۔ پہلے پہل تو اِس پر بہت بندے پھٹڑ ہوئے، قابو سے نکل جاتا تھا مگر بعد میں اکثر ڈرائیوروں نے سنبھال لیا۔ اللہ بھلا کرے جس نے بھی اِس کو بنایا ہے، بہت لوگوں کا بھلا ہوا ہے۔ ورنہ پیدل چل چل کر لوگوں کا ہلکان ہو جاتا تھا۔ وساوے اڈے تک جانا ہوتا تو ایک مہینہ پہلے سے گھی کھانا شروع کر دیتے تھے۔ ویسے تمھارا کدھر سے آنا ہوا ہے؟ اور کدھر جا رہے ہو؟

مَیں اسلام آباد سے آیا ہوں، یہاں ایک خاتون سے ملنا تھا۔ کماری والا میں رہتی ہے۔ میری دُور کی رشتہ دار ہے۔ پینتیس سال بعد اُسے ملنے جا رہا ہوں۔

کون سی خاتون ہے جس کے رشتے دار اسلام آباد میں رہتے ہیں؟ یہ تو بھائی سب غریبوں کا اکا تلکا ہے۔ اسلام آباد میں تو سُنا ہے امیر کبیر لوگ بستے ہیں اور تم بھی مجھے کوئی بابو ٹائپ ہی لگتے ہو۔

اُس کا نام شاد بیگم ہے، پہلے کہیں اور رہتی تھی۔ یہ اُس کا آبائی علاقہ ہے۔

اوہ اچھا، آپ اُس شادھاں ڈاکٹرنی کی بات تو نہیں کر رہے؟ میاں بڑی سیانی حکیم ہے۔ تاپ محرقے کا علاج تو اُس کی ہتھیلی پر رکھا ہے۔ یہ سارا اِردگرد کا علاقہ اُسی سے علاج کراتا ہے۔ واہ بھئی تم تو اپنے ہی بندے نکلے۔

تو کیا آپ اُس کے رشتہ دار ہیں؟ مَیں نے تجسس سے پوچھا۔ میرا خیال تھا اگر یہ اُس کا رشتہ دار ہے تو پھر کام اور بھی آسان ہو گیا۔

میاں مجھے اُس کا رشتہ دار ہی سمجھ۔ کچھ رشتے خون کے نہیں ہوتے پر خون سے بڑھ جاتے ہیں۔ میرا نام رحمت ہے۔ یہ کھوہ اور یہ ٹیوب ویل میرا ہی ہے۔ اللہ کا دیا چالیس ایکڑ زمین اِس اِٹھاڑ میں میری ہے۔ ہر سال اُس ڈاکٹرنی کو میری طرف سے پورے پانچ من گندم جاتی ہے۔ یہ مَیں نے اپنی حیاتی تک اپنے آپ سے عہد کیا ہے۔

اِس کے بعد اُس نے اپنے بیٹے کو آواز دی، اوئے شیدے جلدی دوڑ کے آ۔

رحمت کی آواز سُن کر ایک لڑکا دوڑتا ہوا آیا اور ہمارے سامنے آ کر رُک گیا۔

کاکا جلدی کر پروہنے واسطے ساگ روٹی اور لسی لے کے آ۔ بچارا کل کا بھوکا ہے، دس کوس پیدل چل آیا ہے۔ اپنی ماں سے کہو ذرا چنگا گھی لگا دے۔

مَیں اُسے نہ نہ کرتا رہا لیکن اُس نے میری ایک بات بھی نہیں سنی اور لڑکے کو حکم دے دیا۔ اُس کے بعد مجھ سے مخاطب ہوا۔ میاں اُس عورت کا ہم پر بڑا احسان ہے۔ میری بیوی کا سارا علاج معالجہ اُسی نے کیا۔ تمھیں تو ہماری مشکلوں کی خبر نہیں پر یہاں آدھی عورتیں بچہ پیدا کرتے ہوئے مر جاتی ہیں۔ غریبوں کے پاس نہ چنگا کھانے کو ہے، نہ چنگی یہاں دوائی ملتی ہے۔ پر سمجھو اِس ڈاکٹرنی نے جب سے یہاں پاؤں رکھا ہے، پچھلے آٹھ سال میں ایک عورت بھی بچہ پیدا کرتے نہیں مری۔ اِس لڑکے کا محرقہ اُسی ڈاکٹرنی کی وجہ سے ختم ہوا ہے۔ یہاں کئی جوان مر گیں ہو چکیں ہیں۔ دُور دُور تک کوئی حکیم دوا دارو دینے والا نہ تھا اور یہاں سے شہر لے جاتے ہوئے مریض اللہ کو پورا ہو جاتا تھا۔ پر جب سے اللہ والی آئی ہے، اپنے ساتھ شفا لے کر آئی ہے۔ پیسے بھی معمولی لیتی ہے۔ بعض تو آٹے دانے پر ہی علاج کروا

لیتے ہیں اور بعض مفت کرواتے ہیں۔

اِس علاقے میں کوئی ڈاکٹر نہیں ہے؟ یہ تو بہت بڑا علاقہ ہے، سیکڑوں گاؤں ہیں۔

میاں تُو ڈاکٹر کو روتا ہے، یہاں اسپرو کی گولی لینے کے لیے ستر میل دُور جانا پڑتا ہے۔ کئی بار ووٹیں لینے والے آئے، ہسپتال کا وعدہ کرتے ہیں، ووٹ لیتے ہیں پھر اگلے پانچ سال تُو کون اور مَیں کون۔

تو آپ ووٹ ہی کیوں دیتے ہیں؟

یہاں اکثر غریب لوگ ہیں۔ میرے جیسے زمین والے تو سیکڑوں میں ہوں گے، ہزاروں ایسے ہیں جو بڑے زمینداروں کی رعایا ہیں۔ اُنھوں نے ووٹ نہ دے کر مرنا ہے۔ ایک ہی دن میں گھان بچہ کولہو پلوا دیں گے۔

ہاں یہ تو ہے، اچھا مجھے جانے دیں اب وقت کافی ہو گیا ہے، مَیں اُٹھتا ہوں۔

نہ نہ ابھی روٹی آتی ہے، کھا کے جانا۔

رحمت صاحب وہ تو ٹھیک ہے پر مجھے روٹی کھانے میں دیر ہو جائے گی اور مَیں نے پہنچنا بہت جلد ہے۔ ایک بہت ضروری کام ہے جس کی وجہ سے مَیں نے ٹرلو کا انتظار بھی نہیں کیا اور پاؤں سُجا کر یہاں تک پہنچ گیا ہوں۔

اب تُو اُس طرف سے بےفکر ہو جا۔ تجھے وہاں پہنچانا میری ذمہ داری رہی۔ یہ اونٹنی سامنے دیکھ رہے ہو، تیرا اگلا سفر اِسی پر ہوگا۔ بس روٹی کھا لے اُس کے بعد شیدا تجھے چھوڑ آئے گا مگر یہ تو بتا تیرا اِس سے رشتہ کیا ہے؟

کچھ خاص نہیں، بس ایسے ہی جان پہچان ہے، ہمارے گاؤں میں بہت عرصہ رہی ہے، وہاں اِس کی ماں نرس ہوا کرتی تھی۔

ہوں، اچھا تو مَیں سمجھا تھا واقعی تم اِس کے کوئی لگتے ہو، پر جب تم نے اسلام آباد کا نام لیا تو میری سمجھ میں نہیں آیا اُس کا وہاں کون رہتا ہے۔

ہم یہ باتیں کر رہے تھے، اِتنے میں رحمت کی بیوی کھانا لے کر آ پہنچی۔ اُس نے کھانا چارپائی پر رکھ دیا۔ کھانا دیسی گندم کے ناڑ سے تیار کی گئی چنگیر میں نہایت سلیقے سے رکھا ہوا تھا۔ یہ عورت نہایت اونچے قد کاٹھ کی اور سمارٹ تھی۔ گاؤں کی اکثر عورتوں کی طرح محنتی اور سخت جان لگتی تھی۔ رنگ سانولا تھا

مگر نقش کسی بھی خوبصورت خاتون سے کم نہیں تھے۔ البتہ آنکھوں میں تھوڑے حلقے پڑے ہوئے تھے۔ لباس کا کپڑا سستا تھا اور اُس پر ہاتھ ہی سے کڑھائی کی ہوئی تھی۔ دیکھنے میں نہایت باوقار عورت لگتی تھی۔ اِس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چنگیر کے کئی رنگ تھے۔ روٹی کے اوپر ڈالا گیا کپڑا بھی سلائی سے کڑھا ہوا تھا۔ مَیں نے چنگیر سے کپڑا اُٹھایا تو نیچے دیسی گھی میں تر بتر روٹیاں اور اُس کے ساتھ سرسوں کا دیسی ساگ تھا۔ ساگ ایک چھنے میں مکھن کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ بچپن میں اپنی ماں سے دیسی سرسوں کا ساگ کھانے کی بہت ضد کرتا تھا اور مجھے ہمیشہ سے مرغوب رہا۔ پہلے مَیں نے ایک چھنا لسی کا بھر کر پیا۔ لسی نہایت مزے کی، نمک اور کھٹاس کی تاثیر سے لبریز تھی۔ لسی پینے کے بعد دو بھاری روٹیاں ساگ اور مکھن بھرے چھنے کے ساتھ کھا گیا۔ کھانا کھانے کے دوران رحمت علی مسلسل باتیں کرتا رہا۔ اُس کے مطابق یہ سارا علاقہ غیر یقینی صورت میں رہتا تھا۔ اِن کا دریا کے ساتھ آنکھ مچولی کا کھیل چلتا رہتا تھا۔ نہری نظام یہاں بالکل کام نہیں کرتا تھا۔ البتہ کالے تیل سے چلنے والے کالے انجنوں کے ٹیوب ویلوں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ دریا کے قریب سے گزرنے کے سبب زمین کی تہہ کے پانی کی سطح کافی اُوپر آ چکی تھی اور یہ پانی بھی دریائی ہونے کے سبب بہت میٹھا تھا۔ ٹیوب ویل پانی کھینچ کر اِن کی فصلوں کو سیراب کرتے تھے۔ اِس سبب سے غلہ کافی ہو جاتا۔ اِسی کی وجہ سے یہاں کے درخت نہایت سرسبز اور سیاہی مائل تھے۔ اِن کے پتے لچکیلے اور بہت گہرے تھے۔ جتنے ٹیوب ویل یا کھوہ رستے میں دیکھ آیا تھا، سب کے اردگرد مرغیاں اور بطخیں نہایت کثرت سے پھرتی تھیں اور درختوں پر پرندوں کی بہتات بھی شہروں کے مضافات سے کہیں زیادہ تھی اور انسانوں کی آبادیاں کم تھیں۔

روٹی کھانے کے بعد میں فوراً اُٹھ کھڑا ہوا، اُسی لمحے لڑکا اونٹنی کے اوپر کجاوہ لگا کر سامنے لے آیا۔ ڈاچی کو اُس نے بٹھا دیا۔ ڈاچی یہاں کم و بیش ہر اُس گھر میں تھی، جس کے پاس ڈاچی پالنے کے وسائل تھے۔ مَیں آگے بڑھ کر پلانے میں بیٹھ گیا اور میرے آگے وہی لڑکا بیٹھ گیا۔ زندگی میں پہلی دفعہ میں ڈاچی پر سوار ہوا تھا۔ میرے لیے یہ ایک نہایت عجیب اور پُرلطف تجربہ تھا۔ ڈاچی جیسے ہی چلنے کے لیے اُٹھی ایک جھولا سا آ کر رہ گیا۔ لڑکے نے ڈاچی کو دائیں طرف سے موڑ کر ایک رستے پر لگا دیا اور وہ تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ آگے کا سارا علاقہ بہت ہی خوبصورت اور ہرا بھرا تھا۔ درختوں اور فصلوں کا ایک ناختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ خاص کر ایک جگہ حدِ نگاہ تک چھوٹے قد کی ہری بھری فصل پھیلی ہوئی تھی۔ میرے پوچھنے پر لڑکے نے بتایا یہ پوہلی کی فصل ہے۔ مزید وضاحت کی کہ یہ چنے کی

فصل یہاں ریتلی زمین میں بہت ہوتی ہے اور اِسے پانی بھی خاص نہیں دینا پڑتا، ہلکی پھلکی تریل سے ہی اِس کا گزارا ہو جاتا ہے۔ اِس کا چھولیا پکانے میں بہت لذیذ ہوتا ہے۔ یہ چنے کے کھیت ہی کھیت تھے۔ مقامی زبان میں اِسے وہ لوگ پوہلی کہتے۔ واقعی کچّے چنے جنھیں چھولیا کہا جاتا ہے، کی ہنڈیا جیسی کوئی چیز نہیں تھی۔

لڑکے کی ساری توجہ اس بات پر تھی کہ ڈاچی تیز سے تیز چلے اور ڈاچی جھول جھول کر آگے پیچھے لہریں لیتی بڑھ رہی تھی۔ اُس کے ساتھ ہم دونوں بھی جھولے لے رہے تھے بلکہ بعض دفعہ خود بھی جان بوجھ کر آگے پیچھے ہوتا جاتا۔ آدھے گھنٹے بعد ہم ایک گاؤں میں پہنچ گئے۔ لڑکے نے مجھے بتایا یہ چیکن والا گاؤں ہے اور اِس سے تین میل آگے کماری والا ہے۔ چیکن والا گاؤں ایک ہرا بھرا گاؤں تھا لیکن اتنا بڑا نہیں تھا۔ لوگ اپنے اپنے کاروبار میں مصروف تھے، کوئی مویشیوں کو چرا رہا تھا، کوئی چارا کاٹ رہا تھا اور کسی نے بیلوں سے ہل جوتے ہوئے تھے۔ اِس وقت بادل بھی سیاہ رنگ کے گھر کر آ گئے۔ دور تک سبز اور ہرے بھرے کھیت بادلوں کی سُرماہٹ سے سُرمئی ہو گئے تھے۔ ہوا پہلے سے زیادہ ٹھنڈی چلنے لگی۔ مجھے خطرہ ہوا کہیں بارش نہ ہو جائے۔ گاؤں کے قریب تمام گھر کچّے تھے۔ بعض جگہ تو صرف گھاس پھوس کی جھونپڑیاں تھیں مگر وہ بھی اِس عالم میں دل کو بہت بھاتی تھیں۔ لڑکے نے ڈاچی کو ہشکار کر گاؤں کے دائیں طرف سے نکال لیا۔ سامنے بہت بڑی ڈھلان تھی۔ آگے ایک دم پورا علاقہ نیچے کی طرف پھیلا ہوا تھا۔ یعنی اِس گاؤں کے فوراً بعد اُترائی شروع ہو جاتی تھی اور کافی نیچے تک چلی گئی تھی۔ یہاں فصلیں اور درخت تو ویسے ہی تھے جیسے چیکن والا کے اردگرد تھے مگر اِس کے ساتھ ریت میں اضافہ ہو گیا تھا اور چنے کے کھیت زیادہ سرسبز ہو گئے تھے۔ ڈاچی تیزی سے آگے کی طرف بڑھتی چلی جاتی تھی۔ بیس منٹ کے بعد آخر کار ہمیں ایک اور گاؤں نظر آ گیا۔ یہی وہ کماری والا گاؤں تھا جو میری منزل تھی۔ مَیں زندگی میں کبھی یہاں آؤں گا، سوچا تک نہیں تھا۔ کماری والا گاؤں کافی بڑا تھا۔ یہ چیکن والا سے بھی بڑا تھا مگر یہاں ٹرلو چلنے کا کوئی امکان اِس لیے نہیں تھا کہ جگہ جگہ ندی نالے اور تالاب نظر آتے تھے۔ مشرق کی طرف دریا بہت قریب نظر آ رہا تھا۔ اُس پر سورج کی روشنی پڑنے کے سبب اُس کا پانی دُور سے دیکھنے میں ایسے تھا جیسے چاندی کا بہت بڑا کھیت ہو۔ ہم گاؤں کے چوک میں پہنچ گئے۔ یہ چوک کم سے کم دو سو گز کے قطر کا تھا۔ تمام گاؤں کچا تھا، دیواریں اور مکان مٹی میں بھوسا ملا کر اُس سے لیپے ہوئے تھے اور نہایت صفائی سے اُن مکانوں اور دیواروں کے کنگرے بنائے گئے تھے۔ گاؤں

بیریاں، شریہنہ اور لسوڑے کے درختوں سے بھرا ہوا۔ اِس کے باجود بہت کھلی جگہ تھی۔ چوک کے بیچ پرالی اور کپاس کی سوکھی چھڑیوں کے بڑے بڑے ڈھیر لگے تھے۔ ایک کھلی جگہ پر ایک بہت بڑا پیپل کا درخت تھا۔ یہ درخت چوک کے عین وسط میں تھا۔ اِس کی موٹی شاخیں ایک طرف شریہنہ کی شاخوں میں پھنسی ہوئی تھیں اور دوسری طرف لوگوں کے کچّے مکانوں کے اوپر تک چلی گئی تھیں۔ لوگ اپنے مکانوں کی چھت پر بیٹھتے تو بھی اِس کے سائے سے لطف لے سکتے تھے۔ مجھے اِس کی عمر کا پتا نہیں تھا نہ ایسے درختوں کی عمر کا اندازہ لگانے کا میرے پاس قاعدہ تھا مگر اتنا ضرور ہے، ایسے درخت کو اِس قدر بھرا اور سایہ دار ہونے کے لیے کچھ زمانوں تک صبر چاہیے ہے اور وہ صبر اِس نے کیا تھا۔ لڑکے نے اونٹنی اُسی پیپل کے درخت کے نیچے بٹھا دی اور بولا، اِس گلی سے آپ اندر جائیں گے تو سیدھا چل کے ایک چھوٹا سا چوک آئے گا۔ اُس سے ایک گلی دائیں ہاتھ کو مُڑتی ہے، ایک بائیں کو۔ دائیں ہاتھ والی گلی کی نکڑ پر ایک سیبی بیری کا درخت ہے۔ اُسی گلی میں آپ آخر تک چلے جائیں۔ تب ایک کھلی جگہ آئے گی۔ اُس کے سامنے ڈاکٹر شاد بیگم کا گھر ہے۔ مَیں تھوڑی دیر وہاں کھڑا ہو گیا اور لڑکے کی طرف اشارہ کیا کہ وہ چلا جائے۔ لڑکے نے اشارہ پاتے ہی اپنی ڈاچی کو ہُش کیا۔ وہ اُٹھ کر واپسی کے لیے چل کھڑی ہوئی۔ جب تک اونٹنی ایک گلی کا موڑ نہیں مُڑ گئی مَیں وہیں کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ ڈاچی کے جانے کے بعد شاد بیگم کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اِس گاؤں کی گلیاں ندی نما تھیں۔ درمیان سے گہری تھیں اور دائیں بائیں سے بلند تھیں اور کچی بھی تھیں۔ بارش کے وقت یقینی طور پر گلیاں ندی نالوں کی شکل اختیار کر لیتی ہوں گی۔ اللہ جانے گزرنے والے کیونکر یہاں سے گزرتے ہوں گے۔ مَیں لڑکے کی ہدایات کے مطابق چلتا گیا۔ ایک چوک عبور کیا تو سامنے ایک لمبی گلی تھی۔ اِس گلی کے دائیں بائیں بھی درختوں کی بھرمار تھی اور یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یہ درخت عام نہیں بلکہ مولسری اور مونگرے کے تھے۔ گویا لوگوں نے اپنے کچّے گھروں میں شاہانہ بناؤ کر رکھے تھے۔ گلی کی آخری نکڑ پر واقعی ایک کھلی جگہ آ جاتی تھی۔ سامنے ایک بڑا نیم کا درخت تھا، اُس کے نیچے دو بکریاں بندھی ہوئی تھیں اور ایک لکڑی کے تختوں کا پھاٹک نظر آ رہا تھا۔ اب دن کے ڈیڑھ کا وقت ہو گیا تھا اور مَیں ایسی جگہ کھڑا تھا جہاں کبھی آنے کا سوچا تک نہیں تھا۔ یہ گاؤں کا ایک چھوٹا سا چوک تھا۔ یہاں ایک سیکڑوں سال پرانا نیم کا درخت پورے چوک میں چھایا ہوا تھا اور سایہ اتنا گہرا تھا کہ دھوپ کی کسی کرن کا احساس تک نہ تھا۔ نیم پر چڑیوں اور دوسرے پرندوں کی بہتات نے پورے منظر کو بھر دیا تھا۔ اِس نیم کے پیڑ کے علاوہ بھی دو تین پیڑ ایک بیری اور ایک پیپل کا

یہاں موجود تھا لیکن یہ پیڑ قدرے چھوٹے اور دس بارہ سال پہلے کے لگائے ہوئے تھے۔ نیم کے درخت کے نیچے دو چار پائیاں پڑی تھیں۔ اُن پر دو بڈھے بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ کچھ عورتیں بیٹھی کروشیے سے کپڑے پر پھول کاڑھ رہی تھیں۔ ایک عورت دو بکریوں کو باندھ رہی تھی۔ کچھ بچے بھی اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے اور گلہریوں کی طرح درختوں کی شاخوں پر اُچھل کُود رہے تھے۔ یہ ایسی دُنیا تھی جہاں زندگی موجود تھی مگر اُس کو بیان کرنے کے فلسفے نہیں تھے۔ شاید یہ بات ہمیشہ سے چلی آئی ہے، جہاں چیزیں نہ رہیں وہاں اُن کے فلسفے رہ جاتے ہیں۔ جہاں موجود ہوں وہاں نا قابلِ بیان خموشی ہوتی ہے۔ وہی خموشی یہاں بھی تھی۔ کتنے ٹھہراؤ کے ساتھ زمانہ گزر رہا تھا۔ یہ جو کچھ میں نے چند لمحوں میں محسوس کیا اُس کے لیے ہزاروں صفحات کے نظریات وافکار کی جلدیں درکار نہیں تھیں۔ فقط یہاں دو لمحے کی خموشی کی ضرورت تھی۔ لوگ بہت رسان سے بیٹھے تھے اور اُن سب کی متحیر نظریں اِس وقت میری طرف تھیں۔ اُنھیں اندازہ نہیں ہو رہا تھا مَیں کون ہوں اور کیوں آیا ہوں۔ میرے کپڑے اور چہرہ مُہرہ عام سا تھا پھر بھی ایسا لگتا تھا کہ میرے اور اُن کے درمیان کوئی فاصلہ ہے جسے وہ اور خود مَیں بھی سمجھنے سے قاصر ہیں۔ یہ ایسا فاصلہ ہے جسے بڑے شہروں کی دیواروں نے بلند کیا ہے۔

چاروں طرف کچے مکان اور درمیان میں یہ بڑی نیم والا چوک دُنیا کے کسی بھی بڑے شہر کی پُرسکون جگہ سے بڑھ کر ٹھہرا ہوا تھا۔ چند لمحوں بعد میرے قدم اُسی گھر کی طرف اُٹھ گئے جس کے بارے میں مجھے بتایا گیا تھا کہ ڈاکٹرنی کا گھر ہے۔ مَیں نے پوری زندگی کی یادوں اور کشمکشوں کو سمیٹ کر اپنے دل میں گانٹھ لیا اور دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ دروازہ محض دو ایسے تختے تھے جن کو دائیں بائیں کے دو ڈنڈوں سے مقامی لوہار کے ٹھونکے ہوئے کیلوں سے جوڑا گیا تھا۔ یہ ٹوپی والے کالے رنگ کے کیل اپنی وضع میں بے ڈھنگے لیکن مضبوطی میں فولاد کی مانند تھے۔ مَیں نہایت اضطراب اور ذہنی دباؤ میں کھڑا تھا۔ چوک میں تمام مرد خواتین مجھے گھور رہے تھے اور ایسے دیکھ رہے تھے جیسے کوئی شخص کسی دیوتا کے دروازے پر رحم کی اپیل لیے کھڑا ہو اور عوام اُس کی جزا وسزا کے منتظر ہوں۔ جب دروازہ ایک بار کھٹکھٹانے کے باوجود کوئی باہر نہ آیا تو مَیں نے دوبارہ ذرا زور سے دستک دی۔ میری اِس دستک کے ساتھ ہی چوک میں بیٹھے ایک بوڑھے نے وہیں چار پائی پر بیٹھے آواز دی، کاکا باؤ ڈاکٹرنی آج صبح سے چک شاملی میں گئی ہے۔ تم تھوڑی دیر یہاں ہمارے پاس چار پائی پر بیٹھ جاؤ۔ آنے ہی والی ہوگی۔

مَیں نے بابے کو ایک نظر دیکھا اور گھور کر رہ گیا کہ اُس نے پہلے مجھے کیوں نہیں بتایا۔ مَیں واپس

اُسی جگہ آ گیا جہاں وہ سب چار پائیوں پر بیٹھے تھے اور کچھ جوان سو رہے تھے۔ مجھے حیرت تھی کہ آج نہ جمعے کا دن تھا نہ بقر عید تھی پھر یہ لوگ کیوں اِس قدر فراغت کے ساتھ بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے اور کچھ سو رہے تھے۔ کام کاج کب کرتے تھے اور دریا کے پاٹ میں ایسے پُرسکون رہ کر اپنی معیشت کا پہیہ دھکیلنے کے لیے کیا جادو کرتے تھے۔ اُنھوں نے میرے لیے مُنج کے بان والی ایک چار پائی خالی کر دی۔ اُس کی بائیں سمت پر سفید رنگ کا سرہانہ رکھ دیا جس پر کروشیے سے پھول کڑھے ہوئے تھے۔ یہاں نہ کسی خاتون نے مجھ سے پردہ کیا نہ کسی نے وہاں سے اُٹھنے کی ضرورت محسوس کی۔ ہر طرف شانتی تھی۔ میرے بیٹھتے ہی ایک بی بی میرے لیے لسی لے آئی۔ مَیں نے اُس کے ہاتھ سے لسی کا چھنا لے لیا اور جب پینے لگا تو یقین جانیے صدیوں کی پیاس سمٹ کر میرے حلق میں اکٹھی ہو گئی۔ مَیں چیکن والا سے لسی کا دونا پی کر چلا تھا مگر یہ ہلکی کھٹاس لیے ہوئے نمکین لسی اس قدر مصفا تھی کہ دو بھرے ہوئے پیتل کے چھنے بغیر وقفے کے پی گیا۔ چند لمحوں بعد ایک عورت نے مجھے سوال کر ہی دیا، وے پروہنے کدھر سے آئے ہو؟ کوئی بیمار شمار ہے؟

جی ہاں میری ایک عزیز بہت بیمار ہے۔ اِن کے بارے میں سُنا تھا کہ بہت اچھی ڈاکٹر ہے اور اُن کے ہاتھ میں شفا بھی ہے، مَیں نے روتے ہوئے دل سے تسلیم کیا۔

ہُوں... فکر نہ کر، ہماری شاداں کی ایک ہی پُڑی تیری ووہٹی کو ٹھیک کر دے گی، گھبرائیں ناں۔ اُس اُدھیڑ عمر عورت نے مجھے ایسے دلاسا دیا جیسے اُس نے پورا مرض دریافت کر لیا تھا اور اپنی ڈاکٹرنی شاداں کو بھی خوب جانتی تھی کہ اُس کے ہاتھ سے کوئی مریض بغیر شفا حاصل کیے رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ اُس بچاری کو کیا پتا تھا کچھ مرض اپنے مسیحوں کو ہی کھا جاتے ہیں۔

کس تھاہ سے آئے ہو؟ لگتے تو شہری ہو۔ اُس کے خیال میں مَیں یہاں ارد گرد کے کسی گاؤں سے تھا اور شہر میں رہتا تھا۔

جی مَیں اسلام آباد سے آیا ہوں۔

یہ کہاں ہے؟ اُس نے اپنی دونوں ڈھاکوں پر ہاتھ رکھ کر پوچھا جیسے بہت حیران ہوئی ہو۔

لاہور سے چار سو میل دُور شمال کی طرف ہے اور پاکستان کا کیپٹل ہے۔

ہائیں اتنی دُور، اب وہ بالکل ہی پریشان ہو گئی تھی۔ اتنی دور بھی کوئی سیانا ڈاکٹر یا حکیم نہیں ملا؟ ہائے ہائے۔

ایسی بات نہیں ہے، وہاں بہت سیانے حکیم ہیں لیکن ہمیں اسی پر اعتماد تھا، مَیں نے اُس کی حیرانی ختم کرنے کی کوشش کی۔

میرے اِس جواب پر وہ سفید بالوں والی بوڑھی خاتون کچھ حیران اور پریشان سی ہوئی جیسے کوئی بات سمجھ نہ آئی ہو۔ وہ مزید کچھ دیر میری طرف دیکھنے لگی جیسے مَیں کوئی مزید وضاحت کرنے والا ہوں لیکن جب مَیں یہ جواب دے کر چُپ ہوگیا تو اُس کے پہلو میں بیٹھے ایک اور آدمی نے مجھ سے پوچھ لیا، یہ کیپٹل کیا ہوتا ہے؟ اور کیا کرتا ہے؟

یہ آدمی کا نام نہیں، ایک شہر ہے، جہاں بادشاہ لوگ رہتے ہیں۔ مَیں نے وضاحت کی۔

لاہور سے اِتنا دور؟ (پھر ہنستے ہوئے) مَیں نے تو لاہور بھی نہیں دیکھا، کہتے ہیں ہمارے اِس گاؤں جیسے پچاس گاؤں ملائیں تو اتنا بڑا شہر بنتا ہے۔ اللہ جانے سچ ہے کہ جھوٹ، شہر تو وساوے والا بھی بہت بڑا ہے۔ دنیا کی ہر شے وہاں سے مل جاتی ہے، بابے شاہ علی بخاری کی برکت سے۔ وہاں مُنڈے اور کُڑیوں کے سکول بھی ہیں۔

مَیں اُن کی لاعلمی پر کچھ حیران نہیں ہوا، نہ مَیں نے اِسے کوئی عجیب شے سمجھا، شُکر ہے وہ بوڑھا وساوے والا تک تو گیا تھا اور اُسے اِس بات کی تسلی بھی تھی کہ وہاں ضرورت کی ہر شے مل جاتی تھی۔ کاش یہ بات شہروں کے باسی بھی جان لیتے کہ قصبوں میں بھی ضرورت کی ہر شے موجود ہوتی ہے، بس اُنھیں زندگی کے ٹھہراؤ کا علم ہو بلکہ شاہ علی بخاری جیسے خدا کے نمائندے بھی موجود ہوتے ہیں جو فساد نہیں فقط امن کے داعی ہیں۔

مَیں نے کہا جی ہاں لاہور واقعی آپ کے اِس گاؤں سے پچاس گنا بڑا ہے بلکہ اب تو اِس سے بھی زیادہ بڑا ہوگیا ہوگا لیکن سچ پوچھو تو آپ کا گاؤں اُس سے کہیں بڑا ہے۔ مَیں نے یہ بات کر کے فلسفہ نہیں ہانکا تھا۔ جہاں سے مَیں پیدل چلا تھا وہاں سے یہاں تک یہ ایک شہر ہی تو تھا اور اِس خوبی کے ساتھ کہ نہ ٹریفک تھی، نہ دھواں تھا، نہ کانوں کو کھا جانے والا شور تھا اور نہ حسد سے لوٹ لینے والی نظریں تھیں۔ ایسے شہروں کا تصور ہمارے وجود کا حصہ کیوں نہ بن پایا۔ اِس کی بابت میرے پاس کوئی علم نہیں تھا۔

ایک خاتون میری اِس بات پر اُٹھ کر ذرا سا نزدیک ہوگئی۔ وہ کیسے؟ بھائی مذاق بڑے کرتا ہے۔

مَیں مذاق نہیں کرتا بی بی جی۔ آپ کا یہ گاؤں، یہ نیم کا درخت اور آپ بیٹھے ہوئے سکون اور بے فکری سے یہ چند لوگ کہیں عظیم ہیں اُس شہر سے جہاں سایے بھی بکتے ہیں اور باتیں بھی۔ مَیں اُن سے یہ باتیں کر ہی رہا تھا کہ ایک آدمی نے مجھے مخاطب کیا، لو جی آپ کی ڈاکٹرنی صاحبہ آ گئی ہیں

مَیں نے فوراً پیچھے مُڑ کر دیکھا، وہ ابھی گھر میں داخل ہو رہی تھی۔ میری ایک جھلک ہی اُس پر پڑی تھی۔ اتنے میں دروازہ بند ہو چکا تھا۔ جس جگہ مَیں بیٹھا ہوا تھا وہاں سے ڈاکٹرنی کا دروازہ میری پشت کی جانب تھا۔ اُس کی پُشت عین اُسی وقت مجھے نظر آئی تھی جب وہ دروازہ کھول کر اپنے گھر میں داخل ہو رہی تھی۔ اُس کے سر کا دوپٹہ دونوں کاندھوں کے درمیان پڑا سر سے سرکا ہوا تھا۔ اِس سے پہلے کہ مَیں چارپائی سے اُٹھتا، دروازہ بند ہو گیا۔ مَیں جلدی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میری بے تابی کئی گنا بڑھ گئی، کہیں غلط جگہ تو نہیں آ گیا تھا؟ یہ تو کوئی بالکل بوڑھی عورت تھی۔ سفید بالوں والی منحنی سی اور کمر جھکی ہوئی۔ اُس کا چہرہ مَیں دوسری طرف ہونے کے سبب دیکھ نہ سکا تھا مگر باقی تمام ڈیل ڈول سے مجھے اُس کو دیکھ کر سخت مایوسی اور اُلجھن نے گھیر لیا تھا۔ میری بے تابی دیکھ کر ایک عورت اُٹھی اور بولی، بھائی جی آپ یہاں بیٹھیں مَیں اُسے یہیں پر بلا کر لاتی ہوں لیکن اِس سے پہلے کہ وہ اُسے یہاں لاتی مَیں اُس کے پیچھے ہی دروازے پر پہنچ گیا۔ میرے لیے سب سے بڑی پریشانی یہ بن گئی کہ اگر یہ ڈاکٹرنی وہ نہ ہوئی جس نے مجھے زندگی کے کئی راستوں سے گزار کر ہمیشہ ایک ہی چوراہے پر کھڑا کیا ہے تو بہت بُرا ہو گا۔ ڈاکٹرنی کو بلانے والی عورت دروازہ کھول کر اندر چلی گئی تھی اور مَیں باہر کھڑا یہ سوچ رہا تھا، کیا میرا اندر جانا درست ہو گا؟ اِس پرائے گاؤں میں، جب کہ میرا اپنے میزبان کے متعلق یقین بھی متزلزل ہو چکا تھا، دروازہ کھول کر اندر جانا کہیں سب کی ناراضی کا سبب نہ ہو۔ مَیں وہیں رُک گیا اور انتظار کرنے لگا۔ کچھ لمحوں بعد وہ دونوں عورتیں دروازہ کھول کر میرے سامنے آن کھڑی ہوئیں۔

ڈاکٹرنی کا چہرہ اب بالکل میرے سامنے تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر ساکت کھڑی پہچاننے کی کوشش کرنے لگی تھی مگر وہ مجھے کیسے پہچان سکتی تھی۔ زمانے کے بھنور اور لحظہ درلحظہ پھیلتے اور گھومتے گردابوں نے کتنے حواس منتشر کر دیے تھے۔ اِس دوران جب کتنے ہی زندہ چہرے جنازوں میں بدل گئے اور ملائم صورتیں کھردری ہو گئیں، وہ مجھے کیوں کر پہچان سکتی تھی۔ مَیں خود اضطراب کی جزوی اور کُلی حالتوں سے ماورا کسی انجانے زمانے میں گم کھڑا تھا جیسے منزل پر پہنچ کر ملا ہوا خزانہ ریت بن گیا ہو۔ اِس میں ذرہ برابر شک نہیں تھا کہ یہ ڈاکٹرنی وہی تھی جس کے لیے مَیں یہاں پہنچا تھا مگر وہ خالص سونا اب اُن ریت

کے ذروں کے سوا کچھ نہیں تھا جنھیں فقط آندھیوں میں اُڑنے کے لیے بنایا گیا ہو۔ مَیں اُسے ایسے پہچان چکا تھا جیسے خود کو پہچانتا تھا مگر یہ بات طے تھی کہ اب میں اُس عالی شان عمارت کی بجائے ایک بوسیدہ کھنڈر میں کھڑا تھا۔ بال سفید چاندی تھے، گالوں کی سُرخ سپیدی سیاہ دھبوں کی نظر ہو گئی تھی۔ آنکھوں پر موٹے شیشوں کی تہوں نے گڑھے ڈال دیے تھے اور ہاتھوں پر کیکر کی چھال کی طرح ایسی سخت جھریاں تھیں جن کو چھونے سے بھی زخمی ہونے کا ڈر تھا۔ میرے دماغ اور دل میں ڈسپنسری کے مہ وسال کی پرچھائیاں سُرمئی بادلوں کی طرح برسنے لگیں جیسے ساون نے سمندروں کے دہانے کھول دیے ہوں۔ مجھ سے کچھ لمحوں کے لیے نہ بولا گیا اور نہ آنکھ جھپکی گئی۔ اُن دِنوں جب وہ ڈسپنسری میں تھی، مَیں محض دس برس کا بچہ تھا اور وہ تیس سال کی تھی۔

(۲)

نومبر کے مہینے کا آغاز تھا۔ گرمی کے دن رخصت ہو چکے تھے۔ گھر سے میرے سکول کا فاصلہ محض دو سو قدم تھا مگر آج یہ فاصلہ دو سو میل لگ رہا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ میری اُداسی کا سبب مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

یہ ایک گاؤں کا سکول تھا۔ گھر سے سکول آتے جاتے ہجوم نہیں ہوتا تھا۔ سکول کے پانچ سے دس لڑکوں اور ایک دو اساتذہ، جو آس پاس کے گاؤں سے آتے تھے، اُن کے پاس سائیکلیں تھیں، باقی چار پانچ سو کی تعداد پیدل ہی آتی تھی۔ چھٹی ہوتے ہی سکول ویران مندر کی طرح قابلِ رحم اور اُداس ہو جاتا تھا۔ ایسا مندر جس کے پجاریوں نے مذہب بدل لیا ہو اور اُسے چھوڑ کر چلے گئے ہوں۔ سکول کے میدانوں، روشوں اور پگڈنڈیوں پر جھولتے درخت اور اُن کی گھنی چھاؤں پرندوں کے سرگوشیاں کرنے کے لیے باقی رہ جاتے۔ فضا انتہائی اُداس اور خموش تھی جیسے پوری کائنات ٹھہری ہوئی ہو۔ ہر سال اکتوبر کے دن میرے لیے ایسے ہی بلا سبب اُداس اور ٹھہرے ہوئے ہو جاتے تھے۔ دھوپ کی حدت نہ ہونے کے برابر تھی اور سکول کے میدانوں کی گھاس کا رنگ سبز سے خاکستری ہو چکا تھا۔ گھاس کی پتیاں جھڑ کر خاک ہو گئی تھیں، فقط اُن کی جڑیں زمین میں کثرت سے موجود تھیں۔ گھاس کی یہ جڑیں سکول کے میدانوں میں اتنی زیادہ تھیں کہ بچے بے خوف ہو کر اِن پر قلابازیاں لگاتے تھے۔ اُن کے کپڑوں پر مٹی نہیں پڑتی تھی۔ میدانوں کے درمیان پانی کے بہت سے کھالے گھاس کو سیراب رکھتے مگر اس موسم میں

پانی کی سیرابی پتیوں کی نمو کے کام نہیں آتی تھی فقط جڑوں کو تروتازہ رکھتی۔ یہ سکول وکٹوریہ دور کا تھا۔ پرانی طرز کے کمرے اور کمروں کے سامنے دالان در دالان تھے۔ دالانوں کے فرش اور کمروں کے درمیانی صحن سُرخ پکی اینٹ سے بنے تھے اور ابھی تک اُسی مضبوطی اور استقامت کے ساتھ زمانے کی ٹھوکریں سہہ رہے تھے۔ ایک کونے میں کلاس روم، دوسرے کونے میں بورڈنگ ہاؤس، درمیان میں درختوں سے بھرے ہوئے وہی دسیوں چھوٹے بڑے گھاس کے میدان تھے۔ گھاس ہمیشہ سے ناتراشیدہ اور مقامی قسم کی تھی، جس میں پتیاں کم اور لمبی لمبی جڑیں زیادہ تھیں۔ چھٹی ہوئے ایک گھنٹا گزر چکا تھا مگر میرا سکول سے نکلنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ دل میں نہایت کسک کی کیفیت تھی۔

آج اُستاد کے پوچھے گئے سوال کا ایک ایک جزو یاد ہونے کے باوجود مَیں جواب نہیں دے پایا تھا۔ آخر کیا وجہ تھی کہ جب وہ سوال پوچھ رہا تھا مجھے سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ کسی دوسرے سے مخاطب تھا یا مجھے ہی ایسے لگا تھا مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ اگر کسی دوسرے سے مخاطب تھا پھر بھی مجھے آواز تو سنائی دینا چاہیے تھی۔ یہ واقعہ آج ایک دفعہ ہوتا تب بھی شک کی گنجائش تھی جبکہ دو بار دو اُستادوں کے سوال میری سمجھ میں نہیں آئے تھے اور لڑکوں نے میری حالت پر بار بار قہقہہ لگایا تھا۔ اُستاد کی سرزنش اور تضحیک الگ سے تھی۔ وہ چھڑیاں بھی مارتے مگر پہلی دفعہ غلطی ہوئی تھی اِس لیے معاف کر دیا گیا لیکن یہ معافی تھوڑی تھی؟ سب لڑکوں کے سامنے پچھلے بنچ پر کھڑا کر دیا گیا اور پورے دس منٹ کھڑا رہا تھا۔ قہر تو یہ تھا تو تلے لڑکے بھی ہنس رہے تھے۔ دل بہت زیادہ بوجھل تھا۔ مجھے آج سکول میں ہی نہیں آنا چاہیے تھا۔ مَیں کلاس روم سے باہر آنے کے بعد سنبل کے ایک اونچے درخت کے ساتھ لگ کے کافی دیر کھڑا رہا تاکہ کسی کو محسوس نہ ہو کہ مَیں ابھی گھر نہیں جانا چاہتا۔ یہ سنبل کا درخت بہت بلند تھا۔ اتنا بلند کہ اِس کی چوٹی پر بیٹھی دو کبوتریوں کی چونچیں اپنے اصلی رنگ میں نظر نہیں آتی تھیں۔ تمام لڑکے اور اُستاد آہستہ آہستہ سکول سے نکل رہے تھے اور مَیں سُنبل کے تنے کو ناخنوں سے کھرچ رہا تھا۔ یہ بالکل لاشعوری تھا۔ مَیں اِس میں اتنا مگن ہوا کہ تمام سکول خالی ہو جانے پر بھی خبر نہیں ہوئی۔ اُونچی اُونچی ٹاہلیوں اور پیپلوں کے درختوں میں سے کسی کی شاخ یا پتوں کے ہلنے کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی، نہ کوئی پرندہ بول رہا تھا۔ ہر شے جیسے میرے اُداس دل کے سوگ میں بیٹھی ہو۔ میری عمر صرف دس سال تھی مگر اُداسی نوے سال کے بزرگ کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ ہر سال کی یہ بے نام اُداسی کیا تھی؟ اِس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اچانک مجھے احساس ہوا مَیں نے کوئی نام درخت کی چھال پر کندہ کر دیا ہے۔ مَیں

نے جلدی سے اُس پر دوبارہ اُلٹے سیدھے ناخن مارنے شروع کر دیے اور چند لمحوں بعد آدھا مٹا اور آدھا نظر آتا نام چھوڑ کر وہاں سے چل دیا اور ایک گھاس کے میدان میں آ کر بیٹھ گیا۔ گھاس کا یہ میدان سکول کی مشرقی سمت میں بیرونی دیوار کے ساتھ تھا۔ گھاس کی جڑیں زمین پر ایک جال کی طرح پھیلی ہوئی تھیں، جن پر بچوں نے دوڑ دوڑ کر اُسے ملائم اور چمکدار بنا دیا تھا۔ مَیں کافی دیر اپنا بستہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹا رہا اور جڑیں اُکھیڑ کر ادھر اُدھر پھینکتا رہا۔ میرے سامنے نیم کا ایک بڑا پیڑ کسی بوڑھی عورت کی طرح سُرمئی رنگ کا لباس پہنے کھڑا تھا۔ نیم کی سب سے بلند شاخ پر ایک کوئل بیٹھی بہت دیر سے اپنے پروں میں چونچ مار رہی تھی۔ مَیں غور سے آنکھ جھپکے بغیر اُس پر ٹکٹکی باندھے لیٹا تھا۔ مجھے کوئل کی رنگت میں عجیب طلسم اپنی طرف کھینچتا تھا۔ کئی بار کوئل کے پیچھے دُور تک کھیتوں میں نکل گیا تھا۔ کوئل اِس خموشی سے پروں کو کرید رہی تھی جیسے میری اُداسی کا درد بانٹ رہی ہو۔ نیم کے پیڑ کے اُوپر دُور تک ایک ایسا خلا تھا جس میں سورج کی چادر نما ہلکی پرت چڑھی تھی۔ یہ پرت آسمان تک پھیلی ہوئی اُداسیوں کو اپنے اندر جذب کر رہی تھی۔ سکول میرے گھر کے قریب تھا۔ اِس کا گیٹ ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ چوکیدار نے کئی بار گیٹ کو تالا لگایا تھا مگر لڑکے اُسے توڑ کر اندر داخل ہو جاتے اور شام کو آدھا گاؤں اِس میں کھیلنے چلا آتا۔ سکول کا چوکیدار پاس ہی رہتا تھا۔ گیٹ کے سامنے دور تک سڑک چلی گئی تھی۔ سڑک کے دونوں کناروں پر نیم اور ٹاہلیوں کے درخت تھے۔ اِن کے نیچے پانی کے کھالے مسلسل چلتے رہتے تھے۔ سڑک کے دائیں بائیں پانی کے یہ دونوں نالے ہمارے گاؤں کے شمال میں بہنے والی اُس نہر سے آتے تھے جو سال کے بارہ مہینے چلتی تھی اور ایسی بھر کر چلتی کہ بعض اوقات اُس کا پانی کنارے سے باہر اُچھلنے لگتا تھا۔

سکول کو جانے والی اِسی چھاؤں بھری سڑک پر میرا گھر تھا۔ نچلے درجے کی کلاسیں کمروں کی بجائے باہر کے میدانوں میں لگتی تھیں۔ میدانوں میں بڑی جڑوں والی گھاس پر تمام بچے بیٹھ جاتے اور اُستاد کے لیے ایک کرسی رکھ دی جاتی۔ اُن دنوں پانچویں درجے تک ایک ہی اُستاد کے پاس تمام کلاسیں ہوتی تھیں۔

مجھے چھٹی کے بعد ایک گھنٹا گزر چکا تھا اور محسوس ہوا اگر تھوڑی دیر مزید گھر نہ گیا تو میری والدہ مجھے لینے کے لیے یہاں چلی آئے گی۔ اُس کے بعد لعن طعن کا ایک سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ مَیں آہستہ سے اُٹھا، بستہ کاندھے میں ڈال کر گھر کی طرف چل دیا۔ چلتے ہوئے ایک نظر پھر اُداس اور اُونچے اور خموش درختوں کی طرف ڈالی اور گیٹ سے باہر نکل گیا۔ سکول سے باہر نکلتے ہی گاؤں کی سب سے آخری

سڑک تھی۔ اِس سے آگے کھیت کھلیان تھے۔سکول بذاتِ خود گاؤں کی آخری نکڑ پر تھا۔

مَیں نے گھر آ کر اپنا بستہ کاندھے سے اُتارا اور اُس چھوٹے سے تھڑے پر پڑی چار پائی پر رکھ دیا جس پر میری دادی بیٹھی گوارے کی پھلیوں کی نوکیں کاٹ رہی تھی۔ یہ پھلیاں ہمارے گاؤں کے جنوب کی طرف ریتلے کھلیانوں میں اُگتی تھیں اور اکثر گاؤں کی عورتیں وہاں سے مفت توڑ لاتیں۔ اِن کا سالن بہت کرارا اور مزے کا ہوتا تھا۔ مَیں اپنی دادی کو اماں زینب کہتا۔ اماں زینب ستر سال سے اُوپر نکل چکی تھی۔ مَیں نے ہمیشہ اپنی والدہ اور اماں زینب کو گھر کا کام بانٹ کر کرتے دیکھا۔ آج بھی اماں پھلیاں کاٹ رہی تھی اور میری والدہ نلکے پر بیٹھی کپڑے دھو کر اُس تار پر لٹکائے جاتی تھی جو ایک طرف گھر میں کھڑے شیشم کے درخت سے اور دوسری طرف سے کوٹھے میں ٹھکے ہوئے گول کُنڈے سے بندھی تھی۔ گھر کی مشرقی دیوار کے ساتھ دو بکریاں بندھی تھیں۔ اِن بکریوں کا چارا پچھلے دو سال سے میرے ہی ذمے تھا۔ چارا لانے کے لیے مجھے اپنے گھر کی واحد جنوبی دیوار پار کرنا پڑتی تھی جس کے بعد ہمارا کھیت شروع ہو جاتا۔ یہ ذمہ داری مجھے بہت بھاری لگتی اور اِسے اپنے اُوپر پہاڑ سمجھتا۔ اِس کام سے جان چھڑانے کے لیے اکثر سکول سے آنے میں دیر کر دیتا۔ مَیں جان بوجھ کر سکول سے واپسی پر اپنے پڑوسیوں کے گھر میں رُک جاتا۔ یہ ہمارے گھر سے سو قدم چھوڑ کر پہلے آتا تھا۔ اِس گھر کی اماں راجن بہت اچھی تھی۔ مجھے گُڑ یا شکر کی مٹھی بھر ضرور دیتی۔ یہ بہت کھلے صحن کا گھر تھا اور اِن کے ہاں کبوتر بھی بہت تھے۔ مَیں اُن کبوتروں کے شغل میں ایسا لگتا کہ اُس میں بہت وقت نکل جاتا اور عصر کی اذان ہو جاتی۔ مَیں سوچتا اب امی نے خود ہی بکریوں کو چارا کاٹ کے ڈال دیا ہو گا لیکن جیسے ہی گھر میں داخل ہوتا، ماں ڈانٹنا شروع کر دیتی۔

اب آیا ہے؟ چھٹی ہوئے تین پہر ہو گئے۔ دونوں بکریاں چلّا چلّا کر گلا چیر بیٹھی ہیں اور تُو اب آیا ہے۔ کسی دن بُری مار کھائے گا۔

امی گراؤنڈ میں نیند آ گئی تھی۔ مَیں روہانسا ہو کر جواب دیتا۔

تجھے روز گراؤنڈ میں نیند آ جاتی ہے۔ چھٹی کے بعد تیرا وہاں کام کیا ہوتا ہے؟ اللہ جانے کیا سوچتا رہتا ہے۔ ہر وقت بُولا یا پھرتا ہے اور جھوٹ بھی سر چڑھ کر بولتا ہے۔ سب دادی سے سیکھا ہے۔ چل اُٹھ جلدی سے بکریوں کو چارا ڈال۔

والدہ کسی طرح دادی کو طعنہ ضرور دیتی۔ اِس سے اُس کو لڑائی کا عذر مل جاتا تھا کیونکہ دادی بھی

اُسی وقت تول کے جواب دیتی تھی۔

اب دادی پھنکاری، اَے ہے، تجھے بھی ہر وقت غصے نے کاٹا ہوا ہے۔ جب دیکھو بچارے کو کوستی ہے۔ نہ پانی پوچھا، نہ روٹی پوچھی، بکریوں کا چارا، بکریوں کا چارا، بھاڑ میں جائیں تیری بکریاں اور یہ سیکھا وِیکھا ہوگا تیری اماں سے، مجھ سے جھوٹ کیوں سیکھے گا۔

دادی کے دخل دینے سے امی ایک دم بھڑک اُٹھی اور بولی، نہیں یہ روٹی نہیں گھاس کھاتا ہے۔ اِسے مَیں نے مٹی کھلا کر پالا ہے؟ ایسے ہی نہ اِسے لاڈ کیے جایا کر۔ دیکھتی نہیں دو گھنٹے بعد آیا ہے۔ جب دیکھو، کبھی کوئلوں کے پیچھے بھاگتا ہے، کبھی سڑک کنارے بہتے نالے میں پاؤں ڈالے اللہ میاں کا بدھو بن کے بیٹھا ہوتا ہے۔ کیا مَیں نہیں جانتی، پورا پہر اماں راجن کے کبوتر اُڑاتا ہے؟

چل جلدی اُٹھ کر پہلے بکریوں کا چارا کاٹ کے اِن کے آگے ڈال، پھر ہاتھ دھو کر روٹی کھا لے۔

اماں زینب نے جب میری ماں سے دو چار سامنے کی سُن لیں تو مجھے بولی، اُٹھ جا پتر، تیری ماں اللہ جانے نادر شاہ کی بیٹی ہے۔ دِلی لُوٹ کے دم لیتی ہے۔ جلدی چارا لے کر اِن کے آگے ڈال دے اور خود بھی روٹی کھالے ورنہ تھوڑی دیر میں تجھے اور مجھے دونوں کو ڈنڈے سے مارے گی۔

یہ اُن کا معمول تھا، آج بھی میں نے دونوں جانب کی تکرار سُن کر ٹاہلی کے تنے کے پاس پڑی ہوئی درانتی اُٹھائی اور گھر کی جنوبی دیوار کے چھوٹے دروازے سے نکل کر ہری مکئی کے کھیت میں اُتر گیا اور چند ہی لمحوں میں ایک گٹھا ہرے گاچے کا لا کر بکریوں کے آگے ڈال دیا۔ بکریوں نے جلدی سے گاچے میں منہ ڈال دیے۔ اِدھر مَیں نے ٹوکرا اُٹھا کر اندر سے صبح کی باسی روٹی پر گوبھی کا سالن رکھا اور بڑے بڑے لقمے لینے لگا۔ اِتنے میں میری ماں نے کپڑے دھو لیے تھے اور اب چولہے پر بیٹھ چکی تھی۔ دادی زینب نے صاف کی ہوئی پھلیوں کی ٹوکری اُس کے سامنے رکھ دی اور خود عصر کی نماز کے لیے کھڑی ہوگئی۔ میرے روٹی کھاتے ہوئے والدہ نے کہا، ضامن کلہاڑی سے چھٹریاں کاٹ دے۔ مَیں نے دو چار تیز لقمے لیے اور سوکھی چھٹریاں کاٹ کر چولہے کے پاس ڈھیر کر دیں۔ اتنے میں چھوٹا بھائی پنگھوڑے میں پڑا رونے لگا۔ اکثر عورتیں اِس طرح کا پنگھوڑا چار پائی کے ساتھ کپڑا باندھ کر بنا لیتیں اور اُس میں بچے کو ڈال دیتیں۔ مَیں چار پائی پر بیٹھ کر اُسے اپنے پاؤں سے ہلانے لگا۔ تھوڑی دیر میں میرا چھوٹا بھائی چُپ ہوگیا۔ مَیں پنگھوڑے کو ہلا ہی رہا تھا کہ چچا زاد گھر کی چھوٹی دیوار عبور کر

کے میرے پاس آ گیا۔ چچا زاد مجھ سے ایک سال چھوٹا تھا۔ یوں تو اس بڑے گھر میں ہم تمام دن ایک دوسرے کی دیواریں پھاندتے رہتے مگر اِس وقت اُس کے آنے کا خاص مقصد تھا۔ یہ وقت گھر کے سامنے ڈسپنسری کے میدان میں ہاکی کھیلنے کا تھا۔

یہ کوئی کھیلنے کا میدان نہ تھا۔ بس ایک قسم کا کھلا صحن تھا جس کی لمبائی پچاس گز اور چوڑائی زیادہ سے زیادہ پچیس گز تھی۔ بالکل کچا تھا لیکن اِس کی مٹی پکی سڑک سے بھی زیادہ پتھریلی معلوم ہوتی تھی۔ اِس کے دونوں کناروں پر ایک طرف کوارٹرز اور دوسری طرف ڈسپنسری کی عمارت تھی۔ یہ عموماً ہمارے کھیل کود ہی کے کام آتا تھا۔ ہاکیاں ہمارے پاس باقاعدہ نہیں تھیں۔ کسی درخت کی شاخ سے آخری سرے سے مُڑی ہوئی لکڑی کاٹ لیتے اور اُسے ہاکی کا نام دے دیتے۔ گیند بھی عجیب طرح سے بناتے تھے۔ اِدھر اُدھر سے بکھرے ہوئے مومی کاغذ اکٹھے کر کے اُنھیں جلا دیتے۔ وہ ایک سیاہ مائع کی شکل اختیار کر لیتی۔ اُسی مائع حالت میں اُسے جلدی جلدی گولائی دیتے۔ اِس کوشش میں بعض دفعہ ہمارے ہاتھ بھی جل جاتے۔ ٹھنڈی ہو کر یہ ایک انتہائی سخت گیند بن جاتی۔ یہ گیند ہزار ضربوں سے نہیں ٹوٹتی تھی۔ بہت سخت اور بھاری بہت ہوتی تھی۔ اِس کا ایک نقصان یہ ہوتا کہ گھٹنے توڑنے کے لیے اِس کی معمولی سی ضرب کافی تھی۔ میرے چچا زاد اختر کے پاس وہی گیند تھی اور لکڑی کی ہاکی تھی۔ مَیں نے ایک نظر اپنی والدہ کی طرف دیکھا پھر آہستہ سے اُٹھ کر چل پڑا۔ والدہ میرے مزاج کو سمجھتی تھی۔ ویسے بھی گھر میں کوئی خاص کام نہیں تھا۔ پڑھنے کا معاملہ ایسا تھا کہ ماں یا باپ نے کبھی اِس بارے میں سرزنش نہیں کی بلکہ گاؤں کے سکول میں پڑھنے والے تمام لڑکے ایک ہی طرح سے اِس عمل سے آزاد تھے۔ مَیں نے اپنی ہاکی اُٹھائی اور دونوں آہستہ سے باہر نکل گئے۔

(۳)

میرا نام ضامن علی ہے۔ ہماری حویلی دو کنال پر تھی۔ اُس کا دروازہ ایک بہت بڑے لکڑی کے چوڑے تختے کا تھا، جسے ہم پھاٹک کہتے تھے۔ یہ راستہ ایک بڑے گیٹ کی شکل میں تھا۔ چاردیواری بارہ فٹ اُونچی تھی۔ پھاٹک موٹے شیشم کے سیاہ تختوں سے بنا تھا۔ شیشم کی سیاہ لکڑی قسمت سے میسر ہوتی تھی اور بہت مہنگی ملتی تھی۔ ایسی لکڑی کم سے کم دوسو سال پرانی ٹاہلی کے تنے سے حاصل ہوتی۔ یہ لکڑی پہلے کاٹ کر خشک ہونے کے لیے دو سال تک دھوپ میں رکھی جاتی۔ جب ہر طرح سے خشک ہو جاتی پھر دو تین سال تک پانی میں ڈبو کر رکھتے۔ تب کہیں جا کر وہ پائیدار اور سیاہ رنگ کے دروازے اور کھڑکیاں بنانے کے کام آتی۔ ہمارے گھر کا مرکزی دروازہ اِسی قسم کی لکڑی کا تھا۔ اُس میں لوہے کے بڑے کیل جڑے تھے اور اُن کی شکل بھی سیاہ تھی۔ دروازے کے تختے اِتنے بڑے تھے کہ اُس کی ایک لائن میں اُٹھارہ کیل تھے۔ کیلوں کے نیچے لوہے کی نقش شدہ گیندے کے پھول جیسی پتریاں چڑھی تھیں۔ بائیں طرف کے تختے کے کونے سے اُسے دیمک نے کھایا ہوا تھا۔ شاید یہاں سے لکڑی کچی رہ گئی تھی۔ مَیں جب بھی دروازے سے گھر میں داخل ہوتا پہلی نظر اُس نقش شُدہ پتری کے نیچے تختے کے اُس کونے میں لگی دیمک پر ٹھہر جاتی جو مدت سے ایک ہی نقشے پر جمی ہوئی تھی۔ اِس دیمک کو دیکھنے کی میری عادت اتنی پختہ ہو گئی کہ اگر دیمک نظر سے اوجھل ہو جاتی تو پیچھے پلٹ کر ایک بار ضرور دیکھتا۔ حویلی کے اندر کئی چھوٹے کمرے تھے جو کچی پکی اینٹوں سے مل کر بنے تھے۔ مجھے نہیں پتا حویلی کب

بنائی گئی۔ دادی بتاتی تھی اُن کے خاوند یعنی میرے دادا نے ہندوستان سے آنے کے بعد بنائی تھی۔ حویلی تعمیر کرتے ہوئے ساری توجہ چار دیواری، بڑے دروازے اور لکڑی کے بڑے پھاٹک پر دی گئی تھی۔ کمروں کی حالت مایوس کن تھی اور ہندوستان کی اُجڑی ہوئی اشرافیہ کے زوال کی عکاس تھی جس میں ساری توجہ ظاہرداری پر تھی۔ کمروں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے اُن کے گرد چار فٹ اونچی دیوار بنا کر دو الگ صحن بنا دیے تھے۔ ایک صحن چچا کے لیے اور ایک ہمارے لیے تھا۔ مجموعی طور پر یہ ایک ہی گھر تھا۔ چار فٹ اونچی دیواریں میرے اور چچا زادوں کے لیے کچھ حیثیت نہ رکھتی تھیں۔ شام سے ذرا پہلے مَیں کھیتوں کی طرف نکل جاتا۔ کھیت حویلی کے پچھواڑے سے شروع ہو کر حدِ نظر تک پھیلتے چلے گئے تھے۔ مَیں جب گھر کے جنوبی طرف کی دروازہ نما موری سے باہر نکلتا تو کسان بیلوں کے ساتھ ہل جوت کر مٹی کے بڑے ڈھیلوں کو اُلٹ پلٹ کر رہے ہوتے۔ پھر اُن ڈھیلوں کو توڑنے کے لیے اُن پر لکڑی کا بھاری سہاگہ چلاتے جو ہل شدہ زمین کی سطح ہموار کرنے کے ساتھ ڈھیلوں کو بھی باریک مٹی میں بدل دیتے۔ مجھے وہاں دو چیزیں اپنی طرف کھینچتی تھیں۔ ایک بیلوں کے گلے میں بجتی ہوئی گھنٹیاں اور اُن کے ہلکے ہلکے ساز اور دوسری ہل چلانے کے بعد نرم مٹی سے اُٹھتی ہوئی بے رنگ گرم بھاپ اور اُس کی خوشبو۔ جس وقت سہاگہ چلتا مٹی سے کیڑے مکوڑے چُننے والی ہزاروں کوّلوں اور فاختاؤں کے جھرمٹ جمع ہو جاتے اور اپنی پتلی اور نوکیلی چونچوں سے پُھرتی کے ساتھ مٹی کو پڑتالتے۔ مَیں اِن پرندوں کو مٹی کے کنکروں سے نشانہ بنانے کی کوشش کرتا جو کبھی کامیاب نہ ہو پاتی لیکن یہ سماں اور یہ کھیل مجھے مست کر دیتا تھا۔

میرے باپ کی معاشی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ عام دیہاتیوں کی طرح اُن کی زندگی نچلے درجے کے کسانوں کی تھی۔ میرا بچپن ویسے ہی گزر رہا تھا جیسے عام دیہاتی لڑکوں کا تھا۔ مجھے یاد نہیں کبھی مٹھائی یا اِس طرح کی ایسی چیز کھائی ہو جس سے قصباتی لڑکوں کی زبان کا ذائقہ مانوس تھا۔ میرے ہم عمر بھوکے ننگے چھوکرے تھے، جن میں سے اکثر کی توندیں نکلی ہوئی تھیں۔ مَیں کسی نہ سمجھ آنے والی کیفیت کے سبب اُن سے دُور رہتا۔ اُن میں سے بعض کے ساتھ اُن کی کریہہ شکلوں کی وجہ سے نفرت بھی تھی۔ یہ شکلیں افلاس اور بیماریوں کے سبب منحوس ہو گئی تھیں۔ مَیں نہیں جانتا، گاؤں کے لوگ ہل جوتنے اور چارا کاٹنے کے علاوہ کچھ اور بھی کرتے تھے۔ مَیں نے فقط اُن کو سالہا سال بوسیدہ چیتھڑوں کے ساتھ اپنے کھیتوں میں جاتے اور شام کو واپس آتے دیکھا۔ ہر سال کچھ لوگوں کے لباس بدل جاتے تھے۔ یہ

تبدیلی اُن کے لیے عید لے کر آتی تھی لیکن مَیں اُس وقت بھی پرانے کپڑوں میں ہوتا۔ مجھے بتایا جاتا یہ مہینہ ہمارے پہلے امام کی شہادت کا ہے اِس لیے ہم سوگ میں ہیں۔ مَیں جانتا تھا یہ بات میرا والد اپنی سہولت کے لیے کہتا تھا۔ اُن کے پاس کپڑے خریدنے کے پیسے نہیں ہوتے تھے۔

میرے والد کا تعلق مزدوروں اور کسانوں کی ایسی کسی تنظیم یا یونین سے نہیں تھا جس میں حقوق کی آواز اُٹھائی جاتی ہے اور اُس آواز کی آڑ میں دراصل طاقت اور دولت کے نئے مرکز کی تشکیل کا قیام ہوتا ہے جو پہلی طاقت کے مرکز ہی کی طرح استحصالی ہو۔ اُن دِنوں یا شاید آج بھی حقوق فیکٹریوں اور دفتروں میں کام کرنے والوں کے ہوتے ہیں یا شاید میری اِس معاملے میں ناواقفیت ہو اور اُن کے بھی کوئی حقوق نہ ہوں۔ میرا باپ تو محض کھیتوں میں کام کرنے والا عام کسان اور سیدھا سادہ مزدور تھا۔ ایسے مزدوروں کا نام کسی رجسٹر پر درج نہیں ہوتا، نہ اِس کے کام کا وقت معین ہوتا ہے۔ نہ اُن کی تنخواہ کے بڑھنے یا اُس میں اوور ٹائم کے دورانیے شامل ہوتے ہیں۔ اُن کے لیے دو باتیں ضروری تھیں۔ ایک کام کرنے کا ڈھنگ آتا ہو، دوم مزدوری وصول کرنے کا ہنر۔ میرا خیال تھا میرے باپ کو یہ دونوں باتیں آتی تھیں۔ اِسی وجہ سے ہمارے گھر میں روٹی پکتی تھی اور کبھی فاقہ نہیں ہوا تھا۔ یہی بات سب سے اہم تھی۔ میرا باپ اور گاؤں کے تمام کسان نہیں جانتے تھے کہ چائے کے ہوٹلوں پر بیٹھ کر سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے کچھ مارکسی پیغمبر اُن کے لیے انقلاب لا رہے ہیں۔ وہ نہیں جانتے تھے، انقلاب اور رومان ایک دوسرے سے کیسے ہم آہنگ ہوتے ہیں اور ادب میں مارکسی تنقید کس پرندے کا نام ہے؟

ہمارے گھر کے سامنے ایک ڈسپنسری تھی۔ ڈسپنسری کافی کھلی جگہ پر تھی۔ یہ کل آٹھ کنال جگہ تھی۔ اِس میں چار کنال کے احاطے میں ڈسپنسری کے لیے فقط تین کمرے تھے جن کے آگے طویل اور کھلا برآمدہ تھا۔ اِس برآمدے کے ستون گول تھے جنھیں پیلے رنگ کا چونا پھیرا گیا تھا۔ کمروں پر بھی پیلے رنگ کا چونا تھا۔ کمروں کی چھتیں بہت اونچی تھیں اور پیلے رنگ میں خوبصورت کوٹھی نظر آتی تھی۔ باقی چار کنال پر ڈسپنسری کے ملازمین کی رہائشیں تھیں۔ ڈسپنسری کے عین سامنے بہت بڑا صحن تھا۔ اِس میں امرود، جامن، پیپل اور دوسرے بہت سے بڑے درختوں کے ساتھ پھولوں کے بے شمار پودے تھے۔ اِسی بڑے صحن کی مشرقی سمت ایک لمبی قطار کوارٹرز کی تھی۔ اِس میں کچھ بڑے کوارٹرز تھے اور کچھ چھوٹے تھے۔ بڑے کوارٹرز میں ڈاکٹر رہتا تھا۔ اُسے ہم کوٹھی کہتے تھے۔ یہ کوٹھی عام کوارٹرز سے ہٹ

کے تھی۔ اُس سے چھوٹے میں جلال دین کمپوڈر تھا اور سب سے چھوٹے کوارٹر میں ہسپتال کے دو چوکیدار بستے تھے۔ اِن سے ہٹ کر عین جنوب کی طرف ایک اور کوارٹر تھا۔ یہ سب سے الگ تھا اور نرسوں کے رہنے کی جگہ تھی۔ نرسوں کا کوارٹر اُن سے الگ کیوں تھا، اِس کی مجھے کوئی خاص وجہ نظر نہیں آئی۔

ڈاکٹر اور نرسیں تبدیل ہوتے رہتے تھے۔ اُن ڈاکٹروں یا نرسوں کے چار چھ ماہ اجنبیت میں گزر جاتے۔ جب اُن سے محلے والوں کی علیک سلیک شروع ہوتی تو اُن کا تبادلہ ہو جاتا اور کوئی بھی مستقل پڑوسی نہ بن پاتا۔ مَیں نہیں جانتا، ڈاکٹر اور نرسیں مستقل کیوں نہیں رہتے تھے مگر اب بہت سی چیزوں کی سمجھ آ گئی ہے۔ ڈاکٹر اور نرسیں گاؤں کے ہسپتال میں مستقل نوکری نہیں کرنا چاہتے تھے۔ حکومت ہر نئے ڈاکٹر اور نرس کو سال چھ مہینے گاؤں کے ہسپتالوں میں بھیج کر دیہاتیوں پر تجربات کرواتی۔ جب وہ یہاں سے اچھی طرح ٹریننگ لے لیتے تو اُن کی شہر کے ہسپتال میں تعیناتی کر دی جاتی اور دیہات میں نیا میڈیکل سٹوڈنٹ بھیج دیا جاتا۔ یہ قصہ اِسی ڈسپنسری سے شروع ہوتا ہے۔

(۴)

ایک دن ہم دونوں چچا زاد پڑوسی لڑکوں کے ساتھ ڈسپنسری کے جنوبی میدان میں کھیلنے میں مصروف تھے۔ میدان ہسپتال کے اُن کمروں سے تھوڑا سا فاصلے پر تھا اور الگ تھلگ تھا، جہاں مریضوں کا علاج کیا جاتا تھا۔ اس کے دونوں جانب جامن اور امرود کے درخت تھے۔ جب لڑکوں کی اچھل کود ہوتی تو اُس سے گردسی پیدا ہو جاتی لیکن مالی اور ماشکی کے روزانہ چھڑکاؤ کرنے سے وہ گرد دب جاتی۔ ماشکی اور مالی نے ہزار بار بچوں کو کھیلنے سے روکا تھا مگر اب وہ تنگ آ کر خموش ہو گئے تھے۔ یہاں کھیل شام تک جاری رہتا تھا۔

ہم اپنی دھن میں کھیل رہے تھے۔ ڈاکٹر دُور ایک کُرسی پر بیٹھا اُونگھ رہا تھا کہ ایک بوڑھے کو اُس کے بیٹے ڈسپنسری میں اُٹھا لائے۔ ڈسپنسری کی مغربی سمت میں لکڑی کی لمبی اور چوڑی تختیوں کا ایک گیٹ تھا، یہی گیٹ مرکزی تھا۔ عورتیں پیچھے پیچھے تھیں۔ بوڑھا مسلسل ہچکیاں لے رہا تھا۔ اُنھوں نے بوڑھے کی چارپائی جامن کے بڑے درخت کے نیچے رکھ دی۔ اِس جگہ ایک ٹھنڈے پانی کا نلکا بھی تھا جس سے سارے محلے کی عورتیں پانی بھر کر لے جاتی تھیں۔ مریض کو دیکھتے ہی ڈاکٹر نے اُسے چیک کرنا شروع کر دیا اور اُس کے بعد انجیکشن لگا دیا۔ انجیکشن لگتے ہی بوڑھے کا جسم اکڑ گیا اور منہ سے جھاگ بہنے لگی۔ وہ قلابازیاں کھانے اور پھڑ کنے لگا۔ ڈاکٹر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ اِدھر اُدھر دوڑنے لگا اور اپنے ماتحتوں کو اینٹی الرجک لانے کا کہتا رہا مگر وہاں شاید اِس قسم کا انجیکشن نہیں تھا۔ ایک نرس نے

آگے بڑھ کر مریض کے ایک اور انجیکشن لگا دیا۔ اُس سے اُس کا تڑپنا کم نہ ہوا اور جھاگ پہلے سے بھی زیادہ ہوگئی۔ یہ تمام حالت دیکھ کر ڈاکٹر بھاگ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ مریض کے ورثا بوڑھے کو تڑپتے دیکھ کر پریشان ہوگئے۔ نرس بھی بھاگ کر اپنے کوارٹروں میں چلی گئی۔ اِس کا مطلب تھا مریض کی حالت اُن کے اختیار سے باہر ہوگئی ہے۔ ہم لڑکے بالے کھیل چھوڑ کر یہ تماشا دیکھنے لگے لیکن تماشا جلد ختم ہوگیا۔ مریض شدید اذیت سے دوچار ہو کر فوت ہوگیا۔ اِس کیفیت پر بوڑھے کے بیٹوں کو غصہ آ گیا۔ اُنھوں نے بھاگ کر ڈاکٹر کا دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔ جب کافی دیر تک دروازہ نہ کھلا تو دروازہ توڑ کر ڈاکٹر کو پکڑ لیا۔ ہم دروازے پر کھڑے یہ کھیل دیکھ رہے تھے۔ ڈاکٹر اپنے کمرے کی بڑی میز کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ بوڑھے کے دونوں بیٹے اُسے کھینچ کر باہر نکالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ڈاکٹر میز کے نیچے سے ہی چیخ کر کہہ رہا تھا کہ اُس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ مجھے ڈاکٹر پر بہت ترس آیا اور جی چاہا آگے بڑھ کر اُسے چھڑاؤں مگر بوڑھے کے بیٹے ایسے بپھرے ہوئے تھے کہ مَیں خود اُن کے غصے سے لرز کر پیچھے ہٹ گیا۔ آخر اُنھوں نے ڈاکٹر کو ٹانگوں سے پکڑ کر چوہے کی طرح باہر کھینچ لیا اور مارنا شروع کر دیا۔ ڈسپنسری میں ایک شدید قسم کا ہنگامہ ہوگیا۔ اِس شور شرابے کے عالم میں لوگ اکٹھا ہونا شروع ہوگئے لیکن اِس سے پہلے کہ لوگ ڈاکٹر کو بچاتے، اُنھوں نے ڈاکٹر کی ٹانگ توڑ ڈالی۔ البتہ لوگوں کے بروقت پہنچنے پر اُس کی جان بچ گئی۔ بوڑھے کے بیٹے اور بیٹیاں مسلسل رو رہے تھے کہ ہمارے اچھے بھلے والد کو اِنھوں نے زہر کا ٹیکا لگا کر مار دیا ہے۔ یہ ہنگامہ اِس قدر کرخت اور بھرپور تھا کہ مجھے اِس میں نامعلوم سی وحشت محسوس ہوئی۔ میری خواہش تھی گاؤں والے بوڑھے کے بیٹوں کی سرزنش کریں مگر ایسا نہ ہوا۔ جلد ہی بوڑھے کے ورثا میت کو لے کر گھر چلے گئے اور ہسپتال کا عملہ ڈاکٹر کو تانگے پر لاد کر شہر چلا گیا۔

اس واقعے کے بعد شہر سے کچھ لوگ دو چار دن تک ہسپتال میں آتے رہے۔ اُن کے بارے میں مجھے نہیں معلوم وہ کیوں آتے تھے۔ ایک دن ہم کھیل رہے تھے کہ شہر سے آنے والے ایک دو لوگوں نے ہسپتال کی تمام دوائیوں کو باہر نکال کر ایک جگہ رکھا اور اُنھیں آگ لگا دی۔ مَیں حیران تھا ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ ہسپتال کی ایک نرس اور دو اور لوگ فارغ کر دیے گئے تھے لیکن مجھے اِن سب باتوں سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اِس ہنگامے کے بعد تین مہینے تک ڈسپنسری بند رہی۔ اِن تین مہینوں میں نہ معائنہ کرنے والا آدمی آیا اور نہ ہی نیا ڈاکٹر پہنچا۔ ہم سب لڑکوں کو اِس کے بند ہونے کی خوشی تھی۔ پہلے

جس جگہ سارا دن مریضوں کی چارپائیاں بچھی رہتی تھیں، اب وہاں بھی ہاکیاں اور گیندیں اُچھلنے لگیں اور میدان خود بخود وسیع ہو گیا۔ ہم سب لڑکے امرود کے پیڑوں پر چڑھتے اور اُترتے۔ پھولوں کی کیاریوں میں چھپ کر ایک دوسرے کو ڈھونڈنے کا کھیل کرتے۔ امرود کے پیڑوں کا کیڑوں سمیت تمام پھل کھا جاتے۔

ڈاکٹر کے جانے کے بعد ڈسپنسری کی حالت پہلے سے زیادہ ابتر ہو گئی تھی۔ ساری ڈسپنسری کھیل کا میدان بن گیا تھا۔ ڈسپنسری کے دو لکڑی کے پھاٹک تھے۔ ایک جنوب کی طرف اور ایک مغرب کی سمت۔ لڑکوں نے دونوں پھاٹکوں سے ایک دو تختیاں نکال کر اندر جانے کا راستہ بنا لیا تھا۔ اگر ڈسپنسری کا چوکیدار شیر محمد ہمیں روکنے کے لیے ایک طرف سے حملہ کرتا تو دوسری طرف سے نکل جاتے اور اُس کے جاتے ہی دوبارہ وہیں دڑنگے مارنے شروع کر دیتے۔ کمپوڈر اور دیگر عملے کو ہم سے اور مریضوں سے یکساں کچھ لین دین نہیں تھا۔ اِن دِنوں ڈسپنسری کا سب سے اہم آدمی چوکیدار شیر محمد ہی تھا۔ ہسپتال کے ایک حصے میں اُس نے سبزیاں کاشت کی تھیں۔ اُس کے دن کا اکثر حصہ اِنھی سبزیوں کی گوڈی میں گزرتا۔ وہ لوہے کا کُھرپا پکڑے سبزیوں سے گھاس پھوس الگ کرتا۔ اِسی کے ساتھ اُس کی نظر ہسپتال پر لگی ہوتی تھی۔ جیسے ہی مریض نظر آتا، شیر محمد اپنا کھرپا وہیں پھینکتا اور ڈسپنسری کی ڈیوڑھی میں آ کر اُسی کُرسی پر بیٹھ جاتا جس پر پہلے ڈاکٹر بیٹھتا تھا۔ وہ مریض کو سامنے پڑے لکڑی کے بنچ پر بٹھا کر اُس کی نبض پکڑ لیتا اور آنکھیں ایک حاذق حکیم کی طرح بند کر کے تھوڑی دیر خموش بیٹھا رہتا، پھر مریض کو زبان باہر نکالنے کے لیے کہتا۔ چند ثانیوں بعد اُسے چھوڑ کر ڈسپنسری کے کمرے کی طرف چلا جاتا۔ دو پڑیوں میں کچھ گولیاں اور ایک شیشی لال شربت کی اُٹھا کر لے آتا۔ وہ چپکے سے مریض کے ہاتھ میں دے کر اُسے صبح شام باقاعدگی سے دوائی استعمال کرنے کا کہہ کر رخصت کر دیتا۔ مریض کے جانے کے بعد شیر محمد کھرپا پکڑ کر دوبارہ اپنی سبزیوں والی کیاریوں میں گھس جاتا۔ دوپہر تک کا وقت کیاریوں میں گزار کر پیڑ کے نیچے پڑی چارپائی کی بجائے برآمدے میں رکھی میز کے سامنے والی کُرسی پر بیٹھتا۔ یہ ڈیوٹی وہ صبح دس بجے سے سہ پہر تین بجے تک دیتا، اُس کے بعد گھر چلا جاتا۔ ایمرجنسی مریض کو پتا ہوتا تھا کہ شیر محمد کہاں ملے گا۔ وہ سیدھا گاؤں کے مشرقی کھیتوں کا رُخ کر کے حنیف محمد کے کھوہ پر پہنچ جاتا جہاں چوکیدار شیر محمد نے دو بھینسیں باندھ رکھی تھیں اور اُن کو چارا ڈال کر پالتا تھا۔

اِس ڈسپنسری کا کمپوڈر جلال دین تھا مگر وہ کبھی کبھار ہی نظر آتا۔ پچھلے دِنوں جب ڈاکٹر کی ٹانگیں

ٹوٹی تھیں، تب بھی وہ ڈسپنسری میں موجود نہیں تھا۔ اُس واقعے کے بعد جو عملہ ڈسپنسری سے فارغ کیا گیا تھا اُن میں بھی جلال دین شامل نہیں تھا۔ اُسے اِس واقعے میں ذرا بھی فرق نہیں پڑا تھا۔ جلال دین کمپوڈر ہفتے کے ہفتے دوائیوں کے ڈبے اور بوتلیں تانگے سے اُتار کر ہسپتال کے سٹور میں رکھتا نظر آتا۔ پھر وہی سامان شام کے وقت دوبارہ تانگے پر رکھ کر کہیں اور لے جاتا۔ اِکا دُکا مریض بھی آجاتے مگر وہ محض بخار یا سر درد کے ہوتے تھے۔ اگر جلال دین کی موجودگی میں آجاتے تو جلال دین اُن کو شیر محمد ہی کی طرح چار آنے کی پرچی کاٹ کر دو چار گولیاں ایک پڑی میں باندھ کر فارغ کر دیتا۔ اُن دِنوں مجھے اِس کے بارے میں ذرا بھی علم نہیں تھا۔ مَیں اِسے اپنے ہی گاؤں کا ایک فرد سمجھتا تھا مگر بعد میں پتا چلا کہ اُس کی داستان کیا ہے۔

(۵)

جلال دین کمپوڈر اِس ڈسپنسری میں پچھلے پندرہ سال سے تھا۔ اِس کی عمر پچاس سال تھی۔ مجھے اس کا قد چھ فٹ سے بھی زیادہ لگتا تھا۔ کسی بھی شخص کے ساتھ کھڑا ہوتا تو اُس سے کافی بڑا معلوم ہوتا۔ ہجوم میں بھی صاف اُبھرا ہوا نظر آتا تھا۔ پیٹ بالکل نہیں نکلا تھا اور گنجا بھی نہیں تھا۔ اِس کے پاس ایک سائیکل تھی۔ اِس کے دونوں پہیوں کے مڈگارڈ نہیں تھے۔ سائیکل کی پچھلی کاٹھی جسے وہ کیریئر کہتا تھا، خالص سٹیل کی تھی اور بہت چوڑی تھی۔ سائیکل کے بریک نہیں تھے۔ جلال دین نے جب اُسے روکنا ہوتا، اپنی لمبی ٹانگیں زمین سے لگا دیتا۔ پاؤں کے دباؤ سے سائیکل رُک جاتی۔ اِس نے سائیکل کے کیریئر پر اکثر کچھ نہ کچھ باندھا ہوتا تھا۔ تمام گاؤں سے اِس کے تعلقات رشتے داروں جیسے تھے۔ کبھی کسی کے گھر میں چلا جاتا اور کئی کئی گھنٹے وہیں گزار دیتا۔ کبھی گاؤں کی بڑی مسجد کے پچھلی جانب شمیم کے ہوٹل پر بیٹھ جاتا اور گھنٹوں وہاں تاش کھیلتا اور چائے پیتا رہتا۔ وہاں تاش کھیلنے والے سب کے لیے چائے کے پیسے بھی جلال دین ہی دیتا تھا۔ گاؤں میں تمام بازاروں میں جتنے درخت تھے اور اُن کے نیچے پانی کے نالے بہتے تھے اُنھیں بھی جلال دین عموماً دیکھ بھال لیتا تھا۔ لمبی چوڑی اور کھلے پائنچوں والی شلوار پہنتا تھا۔ گاؤں کے ہر فرد سے اور ہر عورت سے اِس کی دوستی تھی۔ چھوٹی مسجد کے سامنے کھلے میدان والے چوک میں دھوپ بہت ہوتی تھی۔ وہاں کوئی درخت نہیں تھا۔ جلال دین نے وہاں بھی کافی سارے بیریوں اور نیم کے درخت لگا دیے جو بہت جلد بڑے ہو گئے۔ صادق لوہار کا چھپر بھی اُسی

نے ڈلوا کر دیا جہاں گاؤں کے اکثر چودھریوں کے بزرگ بیٹھ کر حقہ پیتے تھے۔ حقے کی چلم میں دہکتے ہوئے سُرخ انگارے عشا تک بہار دیتے رہتے تھے۔ کئی بار مَیں نے دیکھا، جلال دین باہر سے گاؤں میں سائیکل پر آتا تو اُس کے کیریئر پر کڑوے تمباکو کے کھبڑ بندھے ہوتے تھے۔ یہ تمباکو جلال دین صادق لوہار کے حوالے کر دیتا تھا۔ وہ ہر وقت گاؤں میں گھومتا رہتا۔ گاؤں کے چوڑے بازاروں اور سایہ دار چوکوں میں جب بھی کوئی شخص نکلتا اُس کا کہیں نہ کہیں جلال دین سے سامنا ضرور ہو جاتا۔

جلال دین نے ڈسپنسری کے ایک کوارٹر کی چھت پر کبوتر اُڑانے کی چھتری کھڑی کی ہوئی تھی۔ روزانہ صبح اُٹھ کر وہ کبوتروں کی اُڈاریاں کرواتا۔ ایک گھنٹے تک کبھی ایک کبوتر اور کبھی دوسرے کبوتر کے اُڑنے کی مشق کروانے کے بعد نیچے اُتر آتا۔ پورے گاؤں میں اِس نے ہر گھر میں کسی نہ کسی کو قرض دے رکھا تھا اور واپس لینے کی زیادہ کوشش نہیں کرتا تھا۔ مجھے اُس کی تنخواہ کا اندازہ نہیں تھا مگر جس قدر پورے گاؤں کو اس نے قرض میں جکڑا ہوا تھا، وہ اُس کی تنخواہ سے کہیں زیادہ تھا۔ اُس کی اِس فالتو آمدنی کے بارے میں زیادہ نہیں معلوم تھا البتہ حکومت کی طرف سے دوائی کے لیے آنے والی الکوحل کے شیشوں کی بڑی بوتلیں بہت زیادہ خرچ ہوتی تھیں۔ یہ بات بھی پورے گاؤں میں مشہور تھی کہ ڈسپنسری میں حکومت کی طرف سے ملنے والی مفت دوائیاں جلال دین شہر میں جا کر دوبارہ بیچ آتا ہے اور اُس سے ملنے والے پیسے گاؤں کے لوگوں کو اُدھار دے دیتا ہے۔ گاؤں کا کوئی آدمی اُس کے خلاف شکایت نہیں کرتا تھا۔ ویسے بھی کسی کو پتا نہیں تھا کہ جلال دین کی شکایت کس سے کرنی ہے۔ یہ بات بھی سب کو پتا تھی کہ جب بوڑھا مرا تھا اُس میں بھی قصور جلال دین کا تھا۔ دوائیوں کا تمام ریکارڈ اُسی کے پاس تھا اور وہ اُس دن ڈسپنسری میں نہیں تھا۔ بوڑھے کی موت کے بعد تھوڑے دن تک گاؤں میں دوائیوں پر کسی نے بات نہیں کی تھی۔ بوڑھے کے مرنے کی کیفیت اور ڈاکٹر کی ٹانگ ٹوٹنے کا واقعہ البتہ ہر ایک مزے لے کر بیان کرتا رہا تھا۔ مَیں بھی اُنھی میں سے ایک تھا لیکن چھ ماہ گزرنے کے بعد باتیں کرنے والوں نے دوائیوں کے بارے میں بھی چہ مگوئیاں شروع کر دیں کہ نرس اور جلال دین آپس میں ملے ہوئے ہیں اور ساری دوائیاں بیچ دیتے ہیں۔ کچھ تو یہ بھی کہتے ڈاکٹر بھی اُن کے ساتھ اِس کام میں ملوث تھا بلکہ جو بھی نیا ڈاکٹر آتا جلال دین اُس کی آنکھوں کا تارا بن جاتا تھا۔

گاؤں کا ایک آدمی یونس اُس کا گہرا دوست تھا۔ یہ شخص گاؤں کے بڑے احاطے میں رہتا تھا۔ اِس کے چھ سات بھائی تھے۔ سب کام اُس کے بھائی کرتے تھے اور یہ فقط عیاشی کرتا تھا۔ اِس کے ہڈ

کاٹھ کافی مضبوط تھے۔ گاؤں میں اِن کی زمین بھی زیادہ تھی۔ یونس گاؤں کا ممبر تو نہیں تھا مگر ممبر بنانے میں اِس کا ہاتھ شامل ہوتا تھا۔ اِسے کسی سے لڑتے جھگڑتے نہیں دیکھا تھا لیکن گاؤں والے اِس کو زیادہ اچھا آدمی نہیں سمجھتے تھے۔ پتا نہیں اِس میں کیا راز تھا۔ یونس اور جلال دین اکثر ڈسپنسری کے پچھلے کواٹروں میں ایک بہت بڑے جامن کے درخت کے نیچے چارپائی پر بیٹھ کر الکوحل کی چھوٹی بوتل پی جایا کرتے تھے۔ مجھے معلوم نہیں تھا الکوحل کیا ہوتی ہے۔ مَیں سمجھتا تھا شہد کی طرح کا کوئی شربت ہے اور بہت مہنگا ہے جو مریضوں کو پلانے کے کام آتا ہے مگر یہ دونوں مل کر سارا شربت پی لیتے ہیں۔ مَیں دل ہی دل میں سوچتا اگر جلال دین کے کوارٹر میں میرا جانا ہو جائے تو مَیں یہ ضرور چوری کروں گا۔ اِس ارادے سے اکثر اُسے جب کبھی باہر جاتا ہوا دیکھتا تو اُس کے کوارٹر کا رُخ کرتا مگر وہاں ایک موٹا تالا لگا ہوتا تھا۔ مَیں کبھی اُس کے کوارٹر میں داخل نہیں ہو سکا اور نہ وہ الکوحل کا شربت پی سکا تھا۔ مَیں نے یہ بات اپنے چچازاد کو بھی بتائی۔

ایک دن دوپہر کی سخت دھوپ تھی۔ اُن دِنوں سکول کی چھٹیاں تھیں۔ امی اپنے کمرے میں سوئی ہوئی تھی۔ دوپہر کے وقت مجھے گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ میرے ابا گھر پر نہیں تھے۔ مَیں حالات سے موقع پا کر باہر نکل آیا۔ مجھے یقین تھا جلال دین اپنے کوارٹر میں نہیں ہو گا۔ مَیں نے گھر سے لوہے کی ایک ہتھوڑی اُٹھائی اور جلال دین کے کوارٹر کی طرف چل پڑا۔ یہ ہتھوڑی زیادہ بڑی نہیں تھی۔ اِسے مَیں نے اپنے کُرتے کے نیچے رکھ لیا اور ڈسپنسری میں داخل ہو گیا۔ کوئی ذی روح وہاں موجود نہیں تھا اور یہ بات میرے حق میں تھی۔ امرودوں کا پیڑ سنسان کھڑا تھا۔ اُس کی چوٹی پر پکے ہوئے امرود مجھے صاف نظر آ رہے تھے۔ حالات کا جائزہ لینے کے لیے مَیں پہلے امرود کی چوٹی پر چڑھ گیا۔ اِس کے دو فائدے تھے، ایک تو پکے ہوئے امرود کھا سکتا تھا اُس کے ساتھ ہی جلال دین کے کوارٹر کے اندرونی صحن میں نظر مار کر دیکھ سکتا تھا کہ کوئی آس پاس یا صحن میں موجود تو نہیں۔ یہ پیڑ کافی بڑا اور عمر رسیدہ ہو چکا تھا اور جلال دین کے کوارٹر کے بالکل سامنے تھا۔ اُوپر چڑھتے ہوئے مَیں نے چاروں طرف نظر دوڑائی لیکن کوئی شخص دکھائی نہ دیا۔ مَیں نے سامنے والے دو امرود توڑ کر اپنی جھولی میں ڈال لیے۔ اِسی اثنا میں میری نظر جلال دین کے کوارٹر پر پڑی۔ اُس کے سامنے کچی دیوار تھی۔ چوٹی پر چڑھنے کے سبب کوارٹر کا بیرونی برآمدہ صاف نظر آنے لگا۔ برآمدے میں ایک چارپائی بچھی تھی۔ چارپائی کے آگے ایک میز بھی تھی۔ میز پر ایک جگ کے ساتھ دو گلاس پڑے تھے۔ اِسی کے ساتھ ایک کریہہ منظر میری

آنکھوں کے سامنے ظاہر ہوا۔ شمیر چار پائی پر اُلٹا لیٹا ہوا تھا اور یہ ننگا تھا۔ اُس کے ساتھ جلال دین بھی محض نیکر پہنے ننگا لیٹا تھا اور دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اُلجھے ہوئے تھے۔ شمیر ہمارے محلے کا نہیں تھا۔ گاؤں کے دوسری طرف چھوٹی مسجد کے پاس اِن کا گھر تھا۔ اِس کا باپ خادی تانگے والا تانگہ چلاتا تھا اور اپنے تانگے کو شرطیں لگا کر دوڑاتا تھا اور فارغ وقت میں شمیم کے ہوٹل پر بیٹھ کر تاش کھیلتا تھا۔ یہ تاش بھی وہ جوئے پر کھیلتا تھا۔ جلال دین کا اور اُس کا بہت یارانہ تھا۔ شمیر مجھ سے چار پانچ سال بڑا تھا اور تین کلاسیں آگے تھا اور بہت شوخا لڑکا تھا۔ کئی بار اُس نے دوسرے لڑکوں کو معمولی بات پر پیٹا بھی تھا۔ یہ مجھے پہلے بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ اُس نے کھیلنے کے دوران کئی بار مجھ سے اِسی کوارٹر میں جانے کے لیے کہا تھا کہ وہاں جا کر وہ مجھے کبوتر دے گا لیکن مَیں کبھی نہیں گیا۔ اُس نے سکول جانا چھوڑ دیا تھا اور اب مکمل طور پر کبوتر اُڑاتا تھا۔ بہت دفعہ ایسا ہوا تھا کہ جب ہم ہاکی کھیل رہے ہوتے تو وہ ہمارے پاس سے گزر کر جلال دین کے کوارٹر میں چلا جاتا لیکن ایسی حالت میں پہلے کبھی بھی مَیں نے اُسے نہیں دیکھا تھا۔

مَیں امرود کی چوٹی پر بیٹھا ایک دم ساکت ہو گیا۔ امرود کا جو ٹکڑا دانتوں سے کاٹ کر منہ میں ڈالا تھا وہ میرے حلق میں پھنس کر رہ گیا۔ جیسے اُس میں سے کیڑے نکل آئے ہوں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا یہ وہی شمیر ہے۔ دونوں میں سے کسی کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ مجھے خوف تھا اگر اُنھوں نے دیکھ لیا تو پکڑ کر کوارٹر میں لے جائیں گے اور میرا گلا دبا دیں گے۔ یہ سوچتے ہی مَیں خوف اور دہشت سے کانپنے لگا۔ ابھی میری دہشت جاری تھی کہ عین اُسی کوارٹر کے ایک کمرے سے وہی یونس نامی آدمی باہر نکل کر برآمدے میں آ گیا۔ وہ بھی الف ننگا تھا اور ہاتھ میں ایک بڑی سی شیشی تھی۔ اِس کا ننگا جسم انتہائی کریہہ لگ رہا تھا۔ پیٹ پر بڑھا ہوا گوشت سؤر کی چربی کی طرح لٹک رہا تھا۔ یہ بڑی مونچھوں والا جلال دین سے بھی بڑھ کر خوفناک اور گندا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ بھی اُسی بڑی چار پائی پر اُن کے ساتھ لیٹ گیا۔ پھر دونوں مل کر شمیر کو چمٹ گئے۔ میری آنکھیں ایک دم دھندلا گئیں۔ یہ تو شمیر کا گلا دبا رہے تھے۔ کیا یہ لوگ اُسے مار دیں گے۔ وہ بھی عجیب و غریب حالت میں۔ یہ اُن کے کبوتر پکڑنے گیا ہو گا یا پھر وہی شہد پینے جاتا تھا جس کی تلاش میں مَیں نکلا تھا۔ اُس نے اپنی موت کو خود دعوت دی تھی۔ خوف سے میرا پسینا بہنے لگا۔ امرود میرے ہاتھ سے نیچے گر گئے اور میں جلدی سے نیچے اُترتا چلا گیا۔ ایک انجانی سرسراہٹ میری ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر گئی۔ خوف، پسینا اور کپکپی نے میرے وجود کو ہلا دیا۔

خدا کا شکر تھا مَیں ابھی اُس کوارٹر میں داخل نہیں ہوا تھا۔ ہتھوڑی جو میرے ہاتھ سے نیچے گر گئی تھی، اُسے مَیں نے اُٹھایا اور گھر کی طرف دوڑ لگا دی۔ گھر پہنچ کر مَیں تقریباً چارپائی پر اُوندھا گر گیا۔ میری ماں نے یہ حالت دیکھی تو دوڑ کر قریب آئی اور ایک دم پریشان ہو گئی۔ اُس نے بازو سے پکڑ کر مجھے اپنے پاس بٹھا لیا اور بولی'' ضامن تمھارا چہرہ اتنا زرد کیوں ہو چلا ہے؟ کیا کسی نے مارا ہے اور کانپ کیوں رہے ہو؟

مَیں خموشی سے اپنی ماں کی بات سنتا رہا لیکن مجھے اُس کے معنی سمجھ نہیں آ رہے تھے، کیا کہہ رہی ہے۔

کسی نے تجھے کچھ کہا تو جلدی بتا، مَیں اُس کا منہ نوچ لوں گی۔ وہ دوبارہ بولی۔

کچھ دیر بعد مجھ میں بولنے کی سکت پیدا ہوئی تو مَیں نے کہا اماں وہ شمیر کو مار رہے تھے۔

کون مار رہے تھے اور کون شمیر؟

خادی تانگے والے کا بیٹا۔

اُسے کون مار رہے ہیں؟

جلال دین کمپوڈر اور یونس پھاجا۔ ڈسپنسری کے برآمدے میں شمیر کا گلا دبا رہے تھے۔ اب تک مر گیا ہوگا۔

ہائیں یہ کیا کہہ رہا ہے تُو؟ تجھے مَیں نے اندر سُلایا تھا اور تو ڈسپنسری میں کیا لینے گیا تھا۔

مَیں امرود توڑ رہا تھا۔ اُوپر امرود کے درخت پر چڑھ کر۔

امرود کدھر ہیں؟

وہیں گر گئے ہیں۔ مجھے سانس چڑھی تھی اور بات کرتے ہوئے مزید چڑھ گئی تھی۔

اِسی عالم مَیں میری دادی دوڑتی ہوئی آئی، خدا جانے اُس نے دوسرے کمرے میں کیسے آواز سُن لی تھی، وہ ہانپتی ہوئی بولی، کیا ہوا اِسے ہائے ہائے چہرہ دیکھو، مُردوں سے لنگوٹ باندھ رہا ہے۔ پھر میرا بازو پکڑ لیا، بولتا کیوں نہیں؟ کسی نے کچھ کہا ہے، اُس کے دل میں دانت گاڑ دوں گی۔

اماں کچھ نہیں ہوا، مَیں رو دیا۔

میری ماں نے جلدی سے میرا بازو پکڑا اور مجھے لے کر ڈسپنسری کی طرف دوڑ پڑی۔

ہائے ہائے اِسے کدھر لیے جاتی ہے، بتاتی کیوں نہیں؟ دادی دوبارہ چیخی۔

اتنے میں ہم باہر نکل گئے تھے۔ والدہ اور مَیں سڑک پار کر کے جیسے ہی ہم صحن میں داخل ہوئے

تین عدد امرود وہیں گرے پڑے تھے۔ اُنھیں دیکھ کر میری والدہ کو مجھ پر ایک طرح سے یقین سا آ گیا۔ اُس کے دل کو کچھ تسلی ہوئی کہ مَیں فی الحال جھوٹ نہیں بول رہا تھا اور ابھی صرف امرود کے درخت پر ہی چڑھا تھا، کوارٹر کے اندر نہیں گیا تھا۔ اُس نے وہیں سے مجھے واپس ہانکا اور گھر لا کر کمرے میں بند کر کے باہر نکل گئی۔ مَیں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولنا چاہا مگر باہر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ ہمارے صحن میں ایک دم خاموشی چھا گئی تھی۔ ایسی کیا بات تھی کہ اُس نے مجھے کمرے میں بند کر دیا تھا۔ مَیں نے سوچا میری ماں شمیر کے گھر اُنھیں بتانے گئی ہو گی کہ اُن کے بیٹے کو دو شخص غیر انسانی حالت میں مار رہے ہیں لیکن تھوڑی دیر نہیں گزری تھی کہ وہ واپس آ گئی اور دروازہ کھول دیا۔ وہ شمیر کے گھر نہیں گئی تھی۔ مَیں اِس عرصے میں رونے لگا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی والدہ نے مجھے اپنی گود میں بھر لیا اور میرے ماتھے کو ہاتھ لگایا۔ مَیں بخار سے تپ رہا تھا جیسے جسم میں آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہوں۔ والدہ نے مجھے فوراً بازو سے پکڑا اور نلکے کے نیچے لے جا کر سر پر پانی ڈالنے لگی۔ بولی، تجھے سخت بخار ہے۔ مَیں ابھی دیکھ کے آئی ہوں، شمیر تو اپنے گھر میں چنگا بھلا بیٹھا ہے۔ تُو ڈر گیا ہے۔ یہ کوئی بھوت تیرے اُوپر آیا ہے۔

اتنی جلدی آپ اُسے کیسے گھر میں دیکھ آئی ہیں۔ اُن کا گھر تو بہت دور ہے اور اماں وہ کیسے چنگا بھلا ہو سکتا ہے؟ مَیں نے اُسے خود وہاں اُن کے شکنجے میں دیکھا ہے۔

بس چُپ ہو جا اور میری بات کان کھول کر سُن لے۔ والدہ نے ایک دم ڈانٹا، آئندہ تم نے ڈسپنسری میں قدم رکھا یا شمیر کے ساتھ بات کی تو گلا کاٹ دوں گی۔ نہ ہی اِس بات کو کسی کے آگے بیان کرنا ہے ورنہ مَیں بہت ماروں گی۔

اِس عرصے میں دادی اماں شاید تمام بات سمجھ گئی تھی۔ وہ آرام سے ایک طرف بیٹھی تسبیح کرنے لگی اور کچھ پڑھ کر مجھ پر زور زور سے پھونکیں مارتی رہی۔

نلکے کا ٹھنڈا پانی مسلسل پڑنے سے میرے جسم کی حدت کم ہونے لگی لیکن مجھے بخار ہو چکا تھا۔ نہلانے کے بعد والدہ نے مجھے شیشم کے اُس گھنے پیڑ کے نیچے چارپائی پر بستر بچھا کے لٹا دیا جس کی چھاؤں پورے صحن میں پھیلی ہوئی تھی۔ ہمارے گھر میں یہ درخت بہت بڑی سبز اور بزرگی والی چادر کی مانند تھا۔ اِس کے تنوں اور شاخوں پر توری اور کدو کی بیلیں چوٹیوں تک گئی ہوئی تھیں۔ اُن بیلوں سے مل کر اِس کا سایہ مزید گہرا ہو گیا تھا۔ مجھے والدہ نے دو گولیاں کھلائیں اور وہیں لٹا کر سر میں ہاتھ پھیرنے لگی۔ اِس راحت سے مجھے نیند نے آ لیا۔ آنکھ کھلی تو میرا والد چارپائی پر بیٹھا تھا۔ یہ شام کے قریب کا

وقت تھا۔ بخار کافی کم ہو گیا تھا۔ اُس نے شفقت سے میرے جسم کو چھوا اور محبت سے سر پر ہاتھ پھیرا اور ہدایت کی کہ آئندہ ڈسپنسری میں ہرگز داخل نہ ہوں۔

اِس واقعے کے کچھ ہی دن بعد مجھے پتا چلا جلال دین کو گاؤں والوں نے گاؤں سے نکال دیا ہے اور اُسے ہدایت کی تھی کہ اپنا تبادلہ جہاں جی چاہے کروا لے مگر اِس گاؤں میں نہیں رہ سکتا۔ ایسا کیوں ہوا تھا؟ یہ بات میرے لیے معما تھی کیوں کہ اگلے ہی دن میں نے شمیر کو ڈھول چوک میں گڈ کے ٹوٹے ہو لکڑی کے پہیے پر چھڑپے مارتے دیکھا تھا۔ یہ پہیہ یہاں میری ہوش سے پہلے کا پڑا ہوا تھا اور لڑکوں کے کھیلنے کی عمدہ جگہ تھی۔ اُسے کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ صحیح سالم حالت میں زندہ تھا اور مجھے دیکھ کر ناک بھوں چڑھا رہا تھا۔ شمیر کو دیکھ کر مجھے ایسے لگا کہ مَیں نے کوئی خواب دیکھا ہے اور جیسا کہ میری ماں نے کہا تھا مجھ پر بھوت آ گیا تھا۔ اب مَیں نے تصور کر لیا تھا کہ مَیں نے واقعی کوئی خواب ہی دیکھا تھا حالانکہ میرے منہ میں امرودوں کا ذائقہ اور اُن کا حلق میں پھنسنا ابھی تک محسوس ہو رہا تھا۔ اِس کے بعد مَیں ایک ماہ ڈسپنسری میں نہیں گیا۔ پھر آہستہ آہستہ مَیں نے اپنی والدہ کی نصیحت نظر انداز کر کے ڈسپنسری کے احاطے میں جا کر کھیلنا شروع کر دیا لیکن اِس بات کا خیال رکھا کہ اُسی وقت ڈسپنسری میں داخل ہوں جب میرے ساتھ میرا چچا زاد بھی ہو۔ اب مَیں اِس لیے بھی زیادہ بے خوف ہو گیا تھا کہ جلال دین کے چلے جانے کے بعد ڈسپنسری ایک طرح سے مکمل خالی ہو گئی تھی۔ بابے شیرے نے بھی ہمیں اب کبھی روکنے کی کوشش نہیں کی۔ ہم وہاں بے دھڑک ہر ایک کھیل کھیلتے تھے۔ کوارٹرز کے علاوہ کمروں کے برآمدوں میں بھی کھیل کود کرتے۔ ڈسپنسری کے کمروں کی تعداد صرف تین تھی۔ ایک کمرہ نرس یا کمپوڈر کے لیے تھا، ایک ڈاکٹر کے لیے اور ایک وسیع ہال مریضوں کے لیے تھا۔ یہاں ٹوٹے پھوٹے بیڈ پڑے تھے۔ یہ کبھی استعمال میں نہیں آئے تھے۔ مریض اگر ڈسپنسری میں داخل کرنے کے قابل سمجھا جاتا تو اُس کی چارپائی جامن اور امرود کے پیڑ کے نیچے ہوتی تھی۔ صحن بہت بڑا ہونے کی وجہ سے یہاں موجود درخت بہت بڑے اور گھنے تھے اور نیم کے درخت تو اتنے گھنے تھے کہ آدھے احاطے کو گھیرتے تھے۔ یہ بڑے بڑے تنوں والے، جیسے ہاتھیوں کے پیٹ ہوں۔ چوکیدار اور مالی کے گھر بھی ڈسپنسری کے اندر ہی تھے مگر کافی پرے تھے۔ اُن کے اور ڈسپنسری کے درمیان سو میٹر کا فاصلہ تھا۔ شمال کی طرف نرس کے گھر کے بالکل مقابل ڈاکٹر کی کوٹھی تھی۔ اِس کوٹھی کے دروازے پر آم کا بڑا پیڑ بہت اچھا لگتا تھا۔ اب کافی عرصے سے یہ دونوں گھر بے آباد تھے۔ یہ عرصہ قریباً آٹھ ماہ کا تھا۔

ایک دن انتہائی خوش گوار موسم میں نرم ہوا چل رہی تھی۔ درختوں کے نئے پتے کونپلیں نکال چکے تھے۔ اُن پتوں کی چکناہٹ اور ہری بھری ٹھنڈکیں ہماری گالوں کو چھو رہی تھیں۔ ڈسپنسری کے سامنے والی سڑک جو بڑی مسجد کے چوک تک چلی گئی تھی اور وہاں سے بائیں طرف کو موڑ کھا کر باہر نکل جاتی تھی۔ اُس پر دونوں جانب سے درختوں کی شاخیں جھکی ہوئی پھریریاں بھر رہی تھیں۔ اُن کے نیچے چلتے ہوئے پانی کے کھالوں کا رنگ سبز دکھائی دے رہا تھا۔ ابھی ابھی ایک گڈ ہمارے سامنے سے نکل گیا تھا جس کے آگے دو بیل جُتے ہوئے تھے۔ اِس گڈ پر برسن کے چارے کی چوٹی لگی ہوئی تھی اور اِس کے لکڑی کے پہیوں سے چرچراہٹ کی آواز کانوں کو چھوتی ہوئی چلی گئی تھی۔ ہم اِسی طرح کھیل رہے تھے کہ اُس گڈ کے پیچھے پیچھے ڈسپنسری کے پھاٹک پر ایک ٹرک سامان سے بھرا ہوا آ کر رُکا۔ چوکیدار نے ٹرک کے آتے ہی ہمیں ڈسپنسری کے صحن سے باہر نکال دیا اور اپنے ساتھ ایک اور آدمی کو لے کر ٹرک سے سامان نکال کر نرس کے کوارٹر کی طرف لے جانے لگے۔ مَیں اِس طرح کے سامان کو بہت دفعہ اِن کوارٹروں میں آتے جاتے دیکھ چکا تھا اِس لیے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہاں کوئی نئی نرس آ چکی ہے۔ پھر یہ سوچ کر افسوس ہونے لگا کہ اب شاید کھلے عام کھیل کود کا سلسلہ نہ چل سکے۔ مَیں اُس سب کچھ کو چھوڑ کر اور درمیان کی واحد سڑک پار کر کے اپنے گھر میں آ گیا اور والدہ کو نئے پڑوسیوں کی آمد کی خبر دی۔ پچھلے کئی بار کے واقعات کے ذریعے یہ ثابت ہو چکا تھا کہ میری والدہ ہر نئی آنے والی نرس کو اپنے گھر سے پہلے دن کھانا بھیجتی تھی۔ ایک عرصے سے یہ کھانا لے کر جانے کی ذمہ داری میری تھی۔ اِس لیے دوسرے ہی دن مَیں اُن کے دروازے پر کھانا لے کر کھڑا تھا۔

(۶)

پہلے دن نرس نے ہمارا کھانا خوشدلی سے قبول نہیں کیا۔ ماتھے پر ہلکی سی تیوری چڑھا کر ایسے باور کرایا جیسے اُسے یہ فعل عامیانہ لگا ہے۔ مَیں نہیں جانتا ہر نیا آنے والا پڑوسی شروع میں رکھ رکھاؤ اور رازدارانہ رویہ اپنانے کی کوشش کیوں کرتا ہے۔ شاید احساسِ شرافت یا اِسے ''احساسِ برتری'' کہہ لیں جتانے کے لیے اُسے ایک خاص دُوری کا اظہار کرنا پڑتا ہے مگر یہ پردہ چند دنوں سے زیادہ نہیں رہ پاتا کیونکہ عام لوگ زیادہ دیر تک خودساختہ پابندیوں کو برقرار نہیں رکھ سکتے اور کچھ دِنوں میں خود اپنے ناخنوں سے اُس کے تار کھینچ دیتے ہیں۔ پھر اُس معمولی سوسائٹی میں اُس کی معمولی حیثیت ظاہر ہو جاتی ہے۔ اِس نرس کی یہی کیفیت تھی مگر میری ماں نے یہ احساسِ تفاخر کسی بھی نئے پڑوسی میں اِس لیے محسوس نہیں کیا تھا کہ اُس کا اُن سے اولین لمحوں میں کبھی سامنا ہی نہیں ہوا اور مجھے یہ محسوس کرنے کی عقل نہیں تھی۔ نرس نے دروازے پر ہی مجھ سے برتن وصول کیا اور وہیں اُسے خالی کر کے واپس لا تھمایا۔

''ہم یہ سامنے رہتے ہیں۔ سڑک کے پار بڑے پھاٹک والا ہمارا گھر ہے۔'' مَیں نے نرس سے خالی پلیٹیں وصول کرنے کے بعد اُس وقت یہ جملے کہے جب مجھے محسوس ہوا کہ وہ بالکل ہی نظر انداز کر رہی ہے۔ مَیں نہیں جانتا تھا، مجھے یہ جملے کہنے چاہییں تھے مگر یہ ایک بچگانہ احساس تھا۔ نرس نے میرے جملوں پر ایسی بے اعتنائی ظاہر کی جس کی مجھے تکلیف ہوئی مگر یہ سب کچھ ایک لمحے کے لیے تھا۔ اُس کے بعد مَیں نے اُس کی طرف مُڑ کر نہیں دیکھا اور گھر کی طرف دوڑ لگا دی۔ یہ میری اُس سے پہلی

ملاقات تھی جس میں ایک طرح اُس کے خلاف میرے دل میں کینہ سا بھر گیا اور اب میں اُس عورت سے سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اِس واقعے کو دو تین دن گزر گئے۔ ایک دن شام کے وقت میری دادی نے ایک اور امام کے نام کی نیاز دلوائی اور مجھے کہا ضامن یہ ڈسپنسری والے کوارٹروں میں دے آؤ۔

اماں مَیں نہیں جاؤں گا۔ مَیں نے دادی اماں کو دوٹوک جواب دیا۔

کیوں؟ بہت بدتمیز ہو گیا ہے۔ جاؤ دے کر آؤ۔

مَیں نہیں جاؤں گا، اختر کو بھیج دو۔

تم کیوں نہیں جاؤ گے؟

دادی کو میرے اِس بے وقت انکار پر شدید کوفت ہوئی۔ اِس لمحے اگر مجھے والدہ ڈانٹتی تو وہ ضرور خوش ہوتی لیکن مَیں نے اُس کی پروا کیے بغیر کہا، وہ مجھے اچھی نہیں لگتی اِس لیے نہیں جاؤں گا۔

کیا تم نے اُس سے نکاح کرنا ہے؟ اچھی نہیں لگتی کا بچہ۔ جاؤ ورنہ ایک بائیں گال پر جماؤں گی۔

اماں کی ڈانٹ سُن کر مَیں روہانسا ہو کر بیٹھ گیا اور رونے کے انداز میں بتایا، اماں مَیں پہلے نیاز دینے گیا تھا تو اُس نے مجھے گھورا تھا اور منہ بھی بسورا تھا۔

چل جاتا نہیں کہیں سیف الملوک کا بیٹا، تجھے گھورا تھا۔ اُس کے پوتوں جیسا ہے اور منہ کیوں بسورا تھا؟ تو نے اُس کا قرضہ دینا ہے؟

اماں اختر کو بھیج دو۔

جاتا ہے یا مَیں دوں تیرے کان پر دو تین۔ دیکھو بیٹا پڑوسیوں سے بیر نہیں رکھتے۔ سانس سے سانس ملی ہوتی ہے۔ جو ہوا ہم کھاتے ہیں وہیں سے ہمسائے سانس بھرتے ہیں۔

مَیں اماں زینب کی اِس عجیب منطق پر ہنس دیا، اماں کیا ہم ہمسایوں سے مل کے غبارے پھیلاتے ہیں۔

میری اِس بات پر اماں نے اپنی سہارا لے کر چلنے والی لکڑی پکڑ لی اور میری طرف بڑھی، ٹھہر مَیں تیری خبر لیتی ہوں، زبان کیسے قینچی سی چلتی ہے۔

''اماں مَیں جاتا ہوں، ابھی جاتا ہوں'' مَیں نے اماں کی سرزنش کے بعد گڑ کے میٹھے چاولوں کی پلیٹیں اُٹھا لیں اور مُردہ قدموں کے ساتھ اُس کے دروازے کی طرف چل پڑا۔ اِس بار میرا ارادہ تھا کہ

نرس کا دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد جیسے ہی وہ بوڑھی باہر نکلے گی مَیں پلیٹیں اُس کی دہلیز پر رکھ کر بھاگ آؤں گا تاکہ اُس کی آنکھوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اب جو مَیں لکڑی کے پھاٹک سے گزر کر اندر گیا تو ایک ساٹھ سال کی عمر کا بابا صحن میں پھر رہا تھا۔ یہ بابا یہاں مَیں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ اِس کا سر گنجا اور پیٹ نکلا ہوا تھا۔ داڑھی کسی نامعلوم تراش خراش کے باعث کہیں سے چھوٹی اور کہیں سے بڑی تھی لیکن تمام سفید تھی۔ مَیں اِسے نظر انداز کر کے نرس کے دروازے کی طرف بڑھ گیا اور سامنے پہنچ کر دستک دے دی۔ بوڑھے نے مجھے نرس کے دروازے کی طرف جاتے دیکھا تو میری طرف آنے لگا لیکن زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ اِتنے میں مَیں نے دستک دے ڈالی اور اِس انتظار میں کھڑا ہو گیا کہ کوئی باہر نکلے تو پلیٹ زمین پر رکھ کر چلا جاؤں۔ وہ بوڑھا میرے قریب پہنچ گیا اور مجھ سے پلیٹ پکڑ لی۔ اُسی وقت دروازہ بھی کھل گیا لیکن اِس بار دروازے پر نرس کی بجائے ایک لڑکی موجود تھی اور بوڑھا پلیٹ میرے ہاتھ سے پکڑ چکا تھا۔ اُس کے پلیٹ پکڑنے کے انداز سے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ بوڑھا اِسی گھر کا ہے۔ پلیٹ بوڑھے سے لڑکی نے پکڑتے ہوئے کہا، ابا پلیٹ مجھے دے دو۔ اُس نے پلیٹ لڑکی کی طرف پھیر دی۔

یہ کس گھر سے لائے ہو؟ لڑکی نے مجھ سے پوچھا۔

مَیں یہ سامنے بڑے دروازے والے گھر سے آیا ہوں۔ میری اماں زینب نے بھیجا ہے۔

پرسوں بھی تم کھیر لے کر آئے تھے؟ اُس نے تجسس بھرے انداز میں پوچھا۔

جی ہاں۔ وہ میری امی نے ایک نیاز دلوائی تھی۔

کھیر بہت اچھی تھی۔ تم یہیں ٹھہرو مَیں برتن خالی کر کے دیتی ہوں۔ اِتنا کہہ کر لڑکی واپس مُڑ گئی اور مَیں دروازے سے بھاگنے کی بجائے وہیں کھڑا رہا۔ نامعلوم طاقت نے گویا میرے پاؤں وہیں ثبت کر دیے تھے جیسے کیل لگا کر ٹھونک دیے ہوں۔

مجھے اِسے لڑکی نہیں کہنا چاہیے۔ پھر کیا کہوں، وہ عورت بھی نہیں تھی اور ایسی عورت تو ہرگز نہیں تھی جیسی ہمارے گاؤں کی تھیں۔ مَیں نے اپنے گاؤں کی تمام لڑکیاں بھی دیکھی تھیں۔ یہ بالکل اُن جیسی نہیں تھی۔ عورت اور لڑکی کے درمیان کوئی شے تھی۔ وہ میرے مزاج پر ایک خوشگوار جھونکا محسوس ہوئی۔ مجھ سے بہت بڑی تھی مگر اِس سے کیا ہوتا ہے۔ وہ بوڑھا اُسی کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔

اُسی لمحے وہ دوبارہ ظاہر ہوئی اور پلیٹیں میرے ہاتھوں میں تھما کر بولی، تمھارا نام کیا ہے؟

میرا نام ضامن ہے، ضامن علی ہے، اماں دادی مجھے ضمو کہتی ہے اور امی ضامن، مَیں نے پوری وضاحت سے اپنا تعارف کروایا۔

ارے نام تو بہت پیارا ہے، ہلکا پھلکا سا۔ اچھا اپنی امی اور دادی سے کہنا، مَیں نے اُن کا شکریہ ادا کیا ہے۔

جی کہہ دوں گا۔ آپ کا نام کیا ہے؟ مَیں نے شرمیلے انداز میں پوچھا۔

وہ ہنس کر بولی، مجھے زینی کہتے ہیں۔

آپ نیازیں کھا لیتے ہیں نا؟

ہاں کیوں نہیں کھاتے؟ ہم سب کچھ کھا لیتے ہیں۔ تم بس لاتے رہنا۔ وہ بولی۔

اُس نے ایک ہلکی سی چپت میرے گال کو چھوائی اور مسکرا کر اندر چلی گئی۔ مَیں نہیں بتا سکتا یہ چپت کا کون سا احساس تھا۔ اُس کے ساتھ ایک پھیکی سی پرفیوم کی مہک میرے ناک میں داخل ہوئی تھی۔ ہمارے گھر میں کسی پرفیوم کا وجود نہیں تھا، نہ اِس طرح سے کسی ہاتھ میں خوشبو کا لمس ہوتا تھا۔ اُس کا یہ کہنا کہ تم نیازیں لاتے رہنا، تو گویا خوشبو کے یہ لمس اب میری زندگی کا حصہ بن جائیں گے۔ مَیں ایک اور ہی طرب کے ساتھ واپس ہو رہا تھا۔ مجھے اپنی عمر کا کوئی احساس نہیں تھا، نہ اُس خاتون یا لڑکی کی عمر کا احساس تھا۔ مَیں شاید اُن لمحوں میں اپنی طرف سے ایک زیرک مرد کی طرح خوشی کا غیر معمولی سامان سمیٹ کر جا رہا تھا اور وہ بھی گُڑ کے میٹھے چاولوں کے بدلے۔ پچھلی دفعہ کی تمام تلخی ایک ہی دم ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ مَیں خوشی خوشی گھر کی طرف لوٹ آیا اور اپنی دادی کے سامنے خالی پلیٹیں رکھتے ہوئے کہا، اماں وہ کہتیں تھی ہمیں ہر نیاز میں حصہ دیا کریں۔

وہ کون؟ دادی بولی۔

وہی نرس کی بیٹی۔ وہی تو دروازے پر آئی تھی نیاز لینے، مَیں دادی کو ایسے بتا رہا تھا جیسے وہ اُس کی بہت شناسا ہو۔

اچھا بھیج دیا کریں گے۔ اماں نے بے نیازی کے عالم میں ایسے جواب دیا جیسے مَیں نے یہ بات اپنی طرف سے بنا کر کہہ دی ہو۔ دادی کے اِس بے پروائی کے جواب سے مَیں زیادہ بے لطف نہیں ہوا کہ وہ اکثر اِسی طرح کا رویہ اختیار کرتی تھی لیکن ایک بات دل میں آئی، آئندہ کہیں دادی میرے چچا زاد کو نیاز دینے نہ بھجوا دیں۔

اِس واقعے کے بعد کئی روز گزر گئے۔ مَیں باتوں باتوں میں اپنی دادی اور امی سے پوچھتا تھا اماں اب کس دن نیاز پکنا ہے؟ مگر وہ کہتیں جب دن آئے گا بتا دیں گے اور وہ دن دور ہوتا جا رہا تھا۔ حتیٰ کہ کئی روز گزرنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کچھ دِن پہلے ہم نے جو شیرینی بانٹی تھی، میرا چچازاد اُس کا کچھ حصہ تب نرس کے گھر دے آیا تھا جب میں کھیتوں میں بکری کا چارا لینے گیا تھا۔ اِس بات کا مجھے بہت رنج ہوا۔ اب میں شعوری طور پر سکول سے چھٹی کرنے کے بعد ہسپتال کے صحن میں کھیلنے کے لیے بے تاب ہونے لگا تھا۔ میرا چچازاد اختر اِس میں میرا پورا ساتھ دیتا۔ ہم دونوں وقت بے وقت اپنی ہاکیاں اُٹھا کر وہیں نکل آتے۔ نرس کے کوارٹر کے سامنے دو بڑے بڑے کنیروں کے پھولوں کے پودے تھے۔ یہ ایک درخت کی مانند ہوتے ہیں۔ اِن کی شاخیں بہت لچکیلی اور سخت جان ہوتی ہیں۔ اِنھیں چوڑے چوڑے سرخ اور گلابی پھول لگے ہوئے تھے۔ اِن کی خوشبو بہت ہلکی تھی۔ مجھے اِن پھولوں سے خاص قسم کی رغبت تھی۔ مَیں ہسپتال کے صحن میں آتے ہی سب سے پہلے اِن پھولوں کو شاخ سے پکڑ کر وہیں سونگھتا اور چھوڑ دیتا۔ یہ میری عادت کا حصہ بن گیا تھا۔ مَیں نے کبھی اِن کو توڑا نہیں تھا۔

یہ واقعہ اُس کے کافی دن بعد کا تھا جب میں نرس کے گھر میں میٹھے چاول دے کر آیا تھا۔ جیسے ہی مَیں ہسپتال میں داخل ہوا، دیکھا ایک لڑکا کنیر کے پودے کی چوٹی پر چڑھ کر پھول توڑ کر نیچے پھینک رہا ہے۔ پھول سُرخ لاشوں کی طرح بکھرے پڑے تھے۔ گویا بہت سے دل خنجروں سے چیر کر پھینکے ہوئے تھے۔ مجھے پھولوں کی یہ حالت دیکھ کر غصہ آ گیا اور وہیں سے ایک ڈھیلا اُٹھا کر اُس کی طرف پھینکا۔ ڈھیلا سیدھا اُس کے ماتھے پر جا کر لگا۔ لڑکا چیخیں مار کر رونے لگا۔ اُس کے فوراً ہی بعد وہی زینی گھر سے نکل کر آئی اور آتے ہی مجھے پکڑ لیا۔ اتنے میں لڑکا نیچے اُتر آیا تھا۔ اب میرے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ اتنے زور سے روئے جا رہا تھا کہ مجھے وحشت ہونے لگی اور ڈر گیا۔

زینی نے جس طرح سے میرا بازو پکڑا تھا، اُس کی اُنگلیاں بازو میں کھُب سی گئیں۔ وہ میرے بہت قریب ہو چکی تھی۔ اُس کے کپڑوں اور جسم سے آنے والی مہک نے مجھے معطر کر دیا لیکن اب اِس خوشبو میں ڈر بھی شامل تھا۔ یوں مسرت اور ناشادمانی کا ملا جلا احساس میں نے پہلی بار محسوس کیا۔ میری خواہش تھی وہ میرا بازو چھوڑ دے اور اُس سے بڑھ کر خواہش تھی کہ پکڑے رکھے۔ کہنے لگی کیوں مارا ہے تم نے اِسے؟

مَیں نے اِسے نہیں مارا۔ مَیں رونے کے سے انداز میں ہکلایا۔

آنٹی اِس نے مجھے یہ اینٹ ماری ہے ماتھے پر۔ اپنی آنٹی کو وہ بتانے کے ساتھ زیادہ رونے لگا۔
اور زینی نے مجھے کہا چل تجھے تیری امی کے پاس لے کر چلوں۔ تُو نے اِسے کس لیے مارا ہے؟
مَیں حیران تھا وہ مجھے بالکل نظر انداز کر گئی تھی، حالانکہ نیاز والے دن بڑے اچھے طریقے سے ملی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیسے اِس غیر اضطراری عمل سے جان چھڑاؤں جو مجھ سے سرزد ہو چکا تھا۔ وہ مجھے مضبوطی سے پکڑ کر اور اُس لڑکے کو ساتھ لیے ہمارے گھر کی طرف بڑھنے لگی۔ پھر اِس سے پہلے کہ سڑک پار کر کے ہمارے گھر میں داخل ہوتی مَیں نے چیخ چیخ کر رونا شروع کر دیا۔ وہ میرے اِس عمل سے ایک دم گھبرا گئی اور فوراً چھوڑ دیا۔ اتنے میں میری والدہ گھر سے نکل آئی تھی۔ اب مَیں خاموش ہو گیا اور دونوں سے دُور ہٹ کر اپنی ہا کی لیے کھڑا تھا۔ اگر میری والدہ شکایت سُن کر مجھے مارنے کی کوشش کرتی تو دور بھاگ جاتا۔ وہ لڑکا مسلسل روئے جا رہا تھا۔ حالانکہ اُسے اتنی ضرب نہیں لگی تھی، حرامی کیسا بہانے گھڑنے والا تھا۔
کیا ہوا؟ میری والدہ نے حیرانی سے پوچھا، اُسے کسی معاملے کی سمجھ نہ آئی تھی۔
خالہ جان آپ کے اِس لڑکے نے میرے بھانجے کو مارا ہے۔ زینی ملتجی سے انداز میں بولی۔
میری ماں نے یہ سُن کر ایسی نگاہوں سے مجھے گھورا جیسے وہاں سے دو گولیاں نکل کر میرے سینے میں پیوست ہو گئی ہوں۔ مَیں نے دوبارہ رو کر بتانا شروع کر دیا، نہیں امی مَیں نے ایک چڑیا کو ڈھیلا اُٹھا کر مارا، وہ اِسے جا لگا۔ جان بوجھ کر نہیں مارا۔ میرا یہ عذر سُن کر دونوں کا رویہ تیزی سے بدل گیا اور مَیں حیران ہوا کہ یہ خیال مجھے پہلے کیوں نہیں سوجھا تھا۔
تم نے پہلے کیوں نہیں بتائی یہ بات؟ زینی بولی۔
آپ نے پوچھی نہیں تھی۔ اب مَیں رونے کے سے انداز میں بولا۔
چلو ٹھیک ہوا، معیذ اب تم بھی چُپ کر جاؤ۔ اُس نے اپنے بھانجے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔
میری ماں نے اُسے کہا، بیٹی اندر آ جاؤ اور وہ ہمارے گھر میں داخل ہو گئی۔ میری دادی شیشم کے درخت کے تنے میں پڑی چارپائی پر بیٹھی صحیفہ کاملہ پڑھ رہی تھی۔ وہ آگے بڑھتی ہوئی میری دادی کے پاس چلی گئی۔ معیذ کی انگلی ابھی بھی اُس نے پکڑی ہوئی تھی۔ اب میں بھی بے خوف ہو چکا تھا۔
میری دادی نے دونوں کے سر پر ہاتھ پھیرا اور چارپائی کا ایک حصہ خالی کر کے ایک طرف ہو بیٹھی۔ بیٹھو بیٹی۔ چائے پی کر جانا۔

نہیں اماں کوئی بات نہیں، وہ بولی، مَیں نے اپنے پرچے کی تیاری کرنی ہے۔

نہیں نہیں، میری ماں نے سختی سے دہرایا۔ مَیں ابھی ایک جھپکے میں چائے بنادوں گی۔

مَیں بھی وہیں آ بیٹھا۔ اب وہ خوف جب میرا بازو اُس کے ہاتھوں کے شکنجے میں تھا، یکسر ختم ہو گیا تھا مگر وہ خوشبو اور اُس کا لمس مَیں برابر محسوس کر رہا تھا۔ اُس کی لذت میں اُن کے قریب بیٹھا اپنا کھیل کود بھول گیا تھا۔ میری والدہ نے فوراً ہی چائے کی دیگچی چولہے پر چڑھا دی اور مَیں نے کلہاڑی پکڑ کر لکڑیوں کے ٹکڑے کرنا شروع کر دیے تاکہ چولہے کے نیچے جھونکنے میں آسانی رہے۔

معیذ جاؤ، امی سے کہہ دو مَیں یہاں بیٹھی ہوں، یہ ساتھ والے گھر میں۔

تمھارا کیا نام ہے؟ میری دادی نے اُس سے پوچھا۔

میرا نام زینت ہے۔ یہ لڑکا میرا بھانجا معیذ ہے۔ میری والدہ کا تبادلہ ہوا ہے، یہاں وہ ہیڈ نرس ہے۔

ماشا اللہ تم دونوں خالہ بھانجا منہ ہاتھ کے درست ہو۔ اللہ بھاگ بھی اچھے کرے۔ اِس لڑکے کی ماں کا نام کیا ہے؟

اُس کا نام نیامت بی بی ہے لیکن یہ ہمارے ہی پاس رہتا ہے۔ اِس کا باپ دس سال پہلے کہیں گم ہو گیا تھا۔ ماں کی آگے شادی کر دی۔ وہ اِسے ہمارے پاس چھوڑ گئی ہے کہ اللہ جانے سوتیلا باپ کیسا سلوک برتے۔ کبھی کبھی ملنے آتی ہے۔ یہ اُس وقت دو سال کا تھا۔ اب ہمارے لیے تو یتیم ہی ہوا۔ اِس لیے بہت خیال رکھتے ہیں۔

ہائیں باپ کہاں گم ہو گیا ہے۔ اب میری ماں نے اُسے لقمہ دیا، اولادیں تو گم ہوتے سنی تھیں، باپ کا گُم ہونا نئی بات ہے۔

بس خالہ اللہ کے کاموں میں کون دخل دے، وہ بے پروائی سے بولی۔

وہ اتنی سادگی اور روانی سے یہ باتیں بتا رہی تھی جیسے اُس کے لیے یہ عام سی باتیں ہوں۔ اُن میں نہ کسی قسم کا دُکھ اور ملال کا احساس تھا نہ کسی پریشانی کا شائبہ تھا۔ اِدھر میری والدہ اور دادی حیرانی سے اُس کا منہ تک رہی تھیں۔ اُنھیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ اتنی خوبصورت اور موٹی آنکھوں والی لڑکی اتنی سادہ اور عام سی ہو گی۔ اُن کے خیال میں نرس کا عہدہ کوئی بڑی کلاس کی عورتوں کو ملتا تھا اور اُنھی میں سے نئی آنے والی نرس تھی جسے سرکاری کوارٹر بھی ملا ہوا تھا، ماہانہ تنخواہ بھی اُس کے گھر آ جاتی تھی اور ہر روز

نئے کام کی تلاش کی فکر بھی نہیں تھی۔ یہ باتیں قسمت والوں کو نصیب ہوتی تھیں۔ اتنے میں میری والدہ نے چائے بنا کر پیالیوں میں انڈیل دی۔ ایک پیالی دادی اماں، ایک زینت کو اور ایک مجھے بھر دی جبکہ معیذ جا چکا تھا۔

زینت نے چائے کا گھونٹ لیتے ہی ایک فرحت سی محسوس کی اور بولی "خالہ آپ نیازیں بہت اچھی پکاتی ہیں۔ یہ چائے بھی بہت عمدہ ہے۔"

بیٹی کہاں اچھی پکاتے ہیں، بس ساگ دال جو بھی ہوتا ہے، پکا دیتے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے میری ماں ایک قسم کا فخر بھی محسوس کر رہی تھی اور اُس تعریف کی سرخوشی کو پوری طرح اپنے اُوپر طاری کر چکی تھی جو کسی عورت کے اچھے کھانے پر خاص کر دوسری عورت کی زبان سے ادا ہوتی ہے۔ مَیں چائے پیتے ہوئے زینی کو دیکھنے میں ایسے مگن تھا کہ ذرا محسوس نہیں ہوا میری دادی میری حالت کو دیکھ رہی ہے۔ اُس نے ایک ہی دم جھڑک کر کہا، ضامن اُٹھو اور اندر جاؤ۔ اُس کی جھڑک سے مجھے احساس ہوا کہ مَیں کچھ غیر معمولی حرکت کر رہا تھا۔ مَیں اُٹھ کر اندر چلا گیا۔ اُس کے کچھ ہی دیر بعد وہ ہمارے گھر سے روانہ ہو گئی لیکن اُس کے کپڑوں سے آنے والی خوشبو نے پورا صحن مہکا دیا تھا۔ اُس کے جاتے ہی دادی نے میری والدہ سے کہا، اِس لڑکی کے چلن مجھے تو اچھے نہیں لگے۔ کنواریوں والی ایک بات بھی اِس میں نہیں۔ دیکھ لو کتنی خوشبو لگا رکھی ہے۔

والدہ بگڑ کر بولی، اماں تجھے تو ہر کسی میں یہی کچھ نظر آتا ہے۔ کبھی تو اچھا سوچ لیا کر۔ کیا اب وہ اپنے اُوپر راکھ مل لیتی۔ شہروں سے آئی ہے۔ شہری سکولوں میں پڑھی ہے۔ وہاں کی لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ خود تم ساری عمر گائیوں کے گوبر پاتھتی رہی۔ اب دوسروں کی لڑکیوں سے بھی یہی چاہتی ہو۔ اب بھی لسی سے سر دھوتی ہو۔ اُس کی باس ناک سے ہو کر تلی تک اُتر جاتی ہے۔

اُے ہے، گوبر پاتھیں تیرے ہوتے سوتے، مَیں کیوں پاتھوں؟ چکی ضرور پیسی اور یہ مَیں اکیلی نہ پیستی تھی۔ اُس وقت دس دس کوس پر خراس ملتے تھے۔ ہر گھر میں پتھر کی چکیاں ہی ہوتی تھیں۔ سب یہی پیستیں۔ یہ مرجانے عطر وتر تو کسی نے نہ دیکھے تھے۔ میری دادی نے ایک دم امی کو کرارا سا جواب دیا۔

عطر وتر نہیں دیکھے تھے، گائیوں اور بھینسوں کے پیشاب تو دیکھے تھے۔ سب بوڑھیاں ابھی تک اُنھی کی باس دماغوں میں لیے پھرتی ہیں۔ والدہ نے ایک اور جملہ مارا اور چکیاں تو اب بھی تم چاہتی ہو

کہ سب پییں۔

یہ تو اپنی اماں سے پوچھ نا جس نے گائیوں کے پیشاب نہیں کستوریاں سونگھی ہیں۔ اب دادی بھی سیدھی ہو گئی تھی، سارا دن بکریوں کے واڑے میں مینگنیاں جھاڑتے گزرتا تھا۔ اُس کے گھگھرے سے دو دو سیر مینگنیاں نکلتی تھیں۔ بڑی آئی کہیں سے عنبر کی بیوپاری۔

اُن دونوں کو لڑتا چھوڑ کر مَیں گھر سے باہر نکل گیا اور سیدھا اُسی صحن میں پہنچ گیا جہاں لڑکے کھیل رہے تھے۔ یہ بہت اچھا ہوا تھا وہ ہمارے گھر چلی آئی تھی۔ اس طرح ہمارے گھر سے اُن کی راہ و رسم تو چل نکلی تھی۔ اگرچہ دادی اماں نے اُس میں سے نقص نکال دیا تھا مگر بہرحال کچھ ہوا تو تھا۔

(۷)

نرس کا نام عدیلہ تھا۔ تین مہینے کے اندر ہمارے گھر سے عدیلہ کے تعلقات خود بخود بن گئے۔ ڈسپنسری گھر کے سامنے ہونے کے باعث کچھ ہی دِنوں میں اُس کا میل جول ہمارے گھر کے ساتھ ہو گیا۔ اِس وقت اُس کی ایک بیٹی زینت اُس کے ساتھ تھی۔ وہ کافی بڑی تھی لیکن ابھی تک کنواری تھی اور اپنی ماں کی طرح اُس نے بھی نرسوں کا کورس کیا تھا لیکن ابھی گھر میں رہتی تھی۔ اُس کی عمر کا پتا نہیں تھا لیکن مجھے پختہ احساس ہو گیا تھا کہ مجھے اچھی لگتی ہے۔ ہیڈ نرس عدیلہ میری والدہ کی سہیلی بن گئی تھی۔ اِس کا ایک فائدہ مجھے یہ ہوا کہ میرے لیے ڈسپنسری کے دروازے اب پوری طرح کھل گئے تھے اور مَیں اُسی طرح وہاں کھیلنے اور آنے جانے میں آزاد ہو گیا جیسے اُن دِنوں میں تھا جب یہ صحن مکمل ویران تھا۔ دن آگے بڑھتے گئے۔ مَیں زینی کے سیاہ بالوں کے نیچے سیاہ آنکھوں میں اُترتا چلا گیا اور ہزار بہانوں سے اُن کے کوارٹر کی دہلیزیں پار کرنے لگا تھا اور اب عدیلہ کو یہاں آئے چھ ماہ ہو گئے تھے۔ اُن کے آنے سے نئی ٹرانسفروں کا سلسلہ بھی رُک گیا تھا۔ ایسے لگتا تھا اب یہاں اُس کا دل لگ گیا ہے اور کسی دوسری جگہ جانا نہیں چاہتی۔ میری والدہ اُس کے لیے اتنی اپنائیت اختیار کرنے لگی تھی کہ کئی بار عدیلہ کے آنسو نکل آتے۔ مَیں نے اپنی والدہ اور عدیلہ کی گفتگو کے دوران جو کچھ سمجھا اُسے یہاں بیان کرنا بہت ضروری ہے۔

عدیلہ تقسیم سے پہلے کسی زمانہ میں پیدا ہوئی تھی۔ اُس نے اپنا اصلی گاؤں تو کبھی نہیں بتایا لیکن

اتنا بتاتی تھی کہ وہ ہمارے سے ڈیڑھ سو میل دُور ایک چھوٹی سی بستی میں پیدا ہوئی تھی۔ اُس کا باپ ایک چھوٹا سا کسان ہونے کے ساتھ چرواہا بھی تھا۔ یہ اُس کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اِن کے گاؤں کے اردگرد کوئی قصبہ نہیں تھا، نہ علاج معالجے کی سہولت تھی۔ جب پیدا ہوئی تو اِس کی ماں ساری رات درد سے تڑپتی رہی۔ بالآخر فوت ہوگئی۔ عدیلہ کے باپ نے اِس کا نام اُسی کی ماں کے نام پر رکھ دیا۔ بڑی ہوئی تو والد نے بستی سے پچاس میل دُور ایک قصبے نور شاہ میں پڑھنے کے لیے بھیج دیا، جہاں اِس کی خالہ رہتی تھی۔ ایک دن باپ کو سانپ نے ڈس لیا۔ اُس وقت یہ دسویں جماعت میں تھی۔ خالہ نے اُسی وقت اِسے اپنے بیٹے کے ساتھ گانٹھ دیا۔ یہ لڑکا ذہنی طور پر کمزور تھا۔ عدیلہ میٹرک کرنے کے بعد منٹگمری کے ایک نرسنگ سکول میں ٹریننگ لینے لگی اور خالہ زاد، جس کا نام احمد دین تھا، تمام دن گھر میں کبوتر اُڑاتا تھا۔ جب عدیلہ کو منٹگمری میں ملازمت مل گئی تو یہ اپنی خالہ اور خاوند کو لے کر وہیں آ گئی۔ وہ کہتی ہیں یہ زمانہ اُس وقت تقسیم اور مار کاٹ کا تھا۔ دن کٹنے لگے۔ عدیلہ کا ارادہ تھا کہ وہ نرس کا کورس کر کے سیدھی اپنی بستی میں جائے گی اور وہاں کی دوسری عورتوں کو اپنی ماں کی طرح نہیں مرنے دے گی مگر حالات نے اُسے ایسے جکڑا کہ واپسی نہ ہو سکی اور وہ منٹگمری کی ہو کر رہ گئی۔ اِس کے خاوند احمد دین کو کچھ کام نہیں آتا تھا۔ بالکل فارغ رہتا اور گھر کے کام کاج اور بچوں کو کھلانا، پالنا سنبھالنا کرتا تھا اور کبوتر اُڑاتا تھا۔ دن کٹنے لگے۔ پانچ بیٹیاں اور ایک بیٹا ہوا۔ اس عرصے میں خالہ فوت ہوگئی۔ عدیلہ نے بڑی دو بیٹیاں اپنی ہی ایک کولیگ کے معمولی لڑکوں سے بیاہ دیں۔ اُن میں سے ایک لڑکا زنخا قسم کا نکلا۔ بیٹی اُسے چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی۔ اُس کے بعد اُس کی خبر نہیں ملی نہ عدیلہ نے اُسے ڈھونڈنے کی کوشش کی۔

جون کا مہینہ شروع ہونے میں دو چار روز باقی تھے۔ عدیلہ منٹگمری کے ڈسٹرکٹ ہسپتال میں ایک جونیئر نرس کی حیثیت سے رات کی ڈیوٹی پر تھی اور گرمیوں کے شدید تپے ہوئے دن تھے۔ اُس کا کوارٹر ہسپتال سے دُور نہیں تھا لیکن اتنا بھی قریب نہیں تھا کہ دو چار منٹ کی مسافت ہو۔ پیدل کا سفر کم سے کم آدھے گھنٹے کا تھا۔ یہ کوارٹر اُسے ہسپتال کی طرف سے ملا تھا مگر نئے کوارٹرز ابھی زیرِ تعمیر تھے اِس لیے عدیلہ پرانے کوارٹر میں ہی رہتی تھی۔ پرانے کوارٹر شہر کے پرانے ہسپتال کے صحن کے اندر موجود تھے اور ہسپتال نیا تعمیر ہونے کی وجہ سے شہر سے باہر چلا گیا تھا۔ یہ علاقہ اُس نہر کو عبور کر کے شروع ہوتا تھا جو شہر اور گورنمنٹ کالج کو ایک دوسرے سے جدا کرتی تھی۔ عدیلہ رات کی ڈیوٹی دے کر صبح نو بجے

گھر آئی تو ایک مرگ کی سی خموشی چھائی ہوئی تھی۔ خاوند سمیت پورے گھر میں ماتم کی صف بچھی تھی۔ کسی نے چولہے میں آگ جلائی تھی نہ ناشتا تیار کیا تھا۔ عدیلہ اُنھیں دیکھ کر حیران ہوئی کہ وہ اِس قدر پریشان کیوں ہیں۔ آخر اُس نے صفیہ سے پوچھا، یہ اُس کی تیسری بیٹی تھی، صفیہ تم پر موت کیوں چھائی ہوئی ہے، کچھ بولو تو سہی ہوا کیا ہے؟

امی عماد رات بھی گھر نہیں آیا۔ ہم نے اردگرد کا تمام علاقہ چھان مارا ہے۔ اُس کے تمام دوستوں سے پتا کیا ہے مگر کچھ پتا نہیں چلا۔ عماد اور اُس کا دوست ندیم مرزا دونوں غائب ہیں۔ ندیم کی ماں ابھی روتی پیٹتی گئی ہے۔

صفیہ کے جملے سُن کر عدیلہ کے ہاتھوں پاؤں پھول گئے اور پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ کل شام تک عماد گھر نہیں آیا تھا تو اُس نے سوچا تھا سٹیڈیم میں تھیٹر دیکھنے چلا گیا ہوگا، شام تک آ جائے گا لیکن وہ پوری رات گھر نہیں لوٹا تھا۔ یہ تو بہت بُرا ہوا تھا۔ پانچ بہنوں کا یہ ایک ہی بھائی تھا اور وہ بھی غائب ہو چکا تھا۔ ایک دفعہ تو عدیلہ پر سکوت طاری ہو گیا پھر اُس نے اپنی حالت کو مضبوط کیا اور پوچھا تم نے کہاں کہاں سے پتا کیا ہے۔

ہم نے اُس کے سب دوستوں سے پتا کیا ہے، ندیم مرزا تو ویسے ہی غائب ہے، وہ بھی اُسی وقت سے گھر نہیں لوٹا۔ باقی ہر ایک نے کہا کہ وہ نہیں جانتے۔ اب کے زینی نے روتے ہوئے جواب دیا۔

زینت کی بات سُن کر عدیلہ کا کلیجا مسوس گیا۔ وہیں سے اُلٹے قدموں باہر نکل گئی۔ اُس نے اپنا نرس والا لباس بھی نہیں اُتارا اور دوڑتی ہوئی سب سے پہلے ریلوے کالونی میں ندیم مرزا کے گھر گئی۔ عدیلہ نے تانگے پر بیٹھنے کی زحمت بھی نہیں کی۔ وہ ایک وحشی اونٹنی کی طرح دوڑتی جا رہی تھی جیسے اُس کے تمام حواس مختل ہو گئے ہوں اور آنکھوں میں اندھیرا بڑھتا جا رہا ہو۔ ایک جگہ عدیلہ بیل گاڑی کے نیچے کچلنے سے بال بال بچی۔ وہ بیل گاڑی کے پہیے سے ٹکرا کر منہ کے بل زمین پر گری۔ گرنے سے سڑک پر پڑی اینٹ اُس کے سر میں لگی اور ماتھا پھٹ گیا مگر اُس نے جیسے یہ سب کچھ محسوس ہی نہ کیا ہو۔ ندیم مرزا عماد ہی کی کلاس میں پڑھتا تھا اور اُس کا دوست بھی تھا۔ ایک دو بار عدیلہ کے گھر میں بھی آیا تھا۔ عدیلہ دوڑتی ہوئی آدھے گھنٹے میں ندیم مرزا کے گھر کے سامنے پہنچ گئی اور اب دروازے پر دستک دے رہی تھی مگر دروازہ بند تھا۔ ابھی وہ دروازے پر ہی تھی کہ ندیم کی ماں انیسہ بی بی دوسری گلی سے نکل

کر وہاں پہنچ گئی۔ انیسہ کے بال کھلے ہوئے تھے اور چہرہ راکھ کی طرح بے رونق ہو چکا تھا۔ وہ کبھی روتی تھی کبھی چپ ہو جاتی تھی۔ انیسہ سلائی مشین چلاتی تھی اور کپڑے سینے اور دلہنوں کے کپڑے تیار کرنے کا کام کرتی تھی۔ اُس کا خاوند چار سال پہلے ایک ریل حادثے میں غلط سگنل لگانے پر جیل میں چلا گیا تھا اور وہیں ہارٹ اٹیک سے مر گیا۔ یہ اپنے بیٹے کے ساتھ ریلوے کالونی میں باپ کے ساتھ رہ رہی تھی۔ انیسہ کا باپ ریلوے میں تیسرے درجے کا ملازم تھا۔ انیسہ نے اپنے بیٹے ندیم مرزا کو ایک سائیکل لے کر دی تھی۔ ایسی سائیکلیں پروفیسر بھی نہیں خرید سکتے تھے۔ اکثر عماد اور ندیم اُسی سائیکل پر گھومنے نکل جاتے اور پورا دن واپس نہیں آتے تھے مگر کل سے سائیکل گھر پر پڑی انیسہ کا منہ چڑا رہی تھی۔ انیسہ تین دفعہ سکول جا کر پتا کر چکی تھی۔ وہاں اول تو کسی نے اُسے سکول میں داخل نہیں ہونے دیا پھر وہ کسی ایسے آدمی یا لڑکے کو نہیں جانتی تھی جس سے اپنے بیٹے کے بارے میں پوچھتی جبکہ عماد خود بھی غائب تھا۔ انیسہ کے دروازے پر دونوں بدنصیب ایک دوسرے کے گلے لگ کر رونے لگیں۔ دونوں عورتیں دروازے پر ایسی ہرنیوں کی مانند بے بس ہو کر بیٹھ گئیں جن کے بچوں کو بھیڑیے گھوروں کی طرف کھینچ کر لے گئے ہوں۔ کچھ دیر یہاں پڑا رہنے کے بعد انیسہ نے ریلوے لائن کے تھانے کا رُخ کیا اور عدیلہ ننگل انبیا سکول کی طرف چل پڑی۔ یہ سکول ریلوے کالونی سے ایک ڈیڑھ میل تھا۔ عماد کو اِسی سکول میں داخل کرایا تھا اور اب وہ دسویں کلاس میں تھا۔ یہ فاصلہ اُس نے کبھی دوڑ کر اور کبھی چل کر طے کیا اور سکول میں داخل ہو کر شفیق کا پتا کیا۔ شفیق اُسی کے محلے کا لڑکا تھا مگر عماد سے ایک کلاس پیچھے تھا۔ تھوڑی دیر میں گیٹ کیپر شفیق کو ڈھونڈ کر اُس کی کلاس سے لے آیا۔ یہ بچہ ایک دو بار اُن کے گھر عماد کے ساتھ آیا تھا۔ عدیلہ نے اُسے دیکھتے ہی بازوؤں سے پکڑ لیا۔ شفقے بتا عماد کدھر ہے؟ جلدی بتا ورنہ مَیں تجھے پولیس کو دے دوں گی۔ شفیق عدیلہ کی اِس قدر سختی اور تیزی کی تاب نہیں لا سکا۔ اُسے فوراً خوف نے جکڑ لیا جیسے وہی اُس کا گنہگار تھا اور اب پکڑا ہی جانے والا تھا۔

شفیق نے ڈرتی اور کانپتی آواز میں کہا، خالہ جی مَیں بتاتا ہوں لیکن مجھے اُستاد مارے گا۔

عدیلہ نے بگڑ کر کہا، اگر نہ بتایا تو تجھے مَیں جان سے مار دوں گی، جلدی بتا۔

شفیق ہانپ کر بولا، اُسے ٹریننگ والے لے گئے ہیں۔

ہائیں، یہ کیا بک رہا ہے، کون سی ٹریننگ والے اور کیسے لے گئے ہیں؟

عدیلہ شفیق کو لے کر ایک طرف گیٹ سے باہر نکل گئی اور اُسی نہر کے اُوپر آ گئی جو ننگل انبیا

سکول کے سامنے بہتی تھی۔ اِس نہر پر دونوں جانب پاپلر کے درخت تھے اور بہت گھنے اور اُونچے تھے۔

وہ تو گھر سے سکول کے لیے آیا تھا۔ ٹریننگ پر کس نے بھیج دیا اور کیوں بھیج دیا؟ عدیلہ بے چینی سے پوچھنے لگی، دیکھ وہ تیرا دوست ہے۔ کیا تُو اپنے دوست کو مرتے دیکھ سکتا ہے؟ اچھا مَیں تجھے پورے پانچ روپے دوں گی، مجھے بتا دے۔

پرسوں مولوی عبدالحیٔ ایک بڑی داڑھی اور مونچھوں والے آدمی کو ساتھ لے کر آیا تھا، مولوی عبدالحیٔ اور اُس آدمی نے بڑی بڑی تقریریں کی تھیں اور لڑکوں کو مسلمانوں کی مدد میں لڑنے کے لیے تیار کیا تھا۔ کہتے تھے جس یاجوج ماجوج کا ذکر قرآن میں آیا ہے، وہ قوم بڑی ظالم ہے اور اُس نے ہماری دیواروں کو چاٹ کر توڑ دیا ہے۔ اگر اُنھیں نہ روکا گیا تو سب کو کھا جائیں گے۔ اس لیے اپنے آپ کو بچانے کے لیے نکلو۔ اُنھوں نے بہت سے بہادر لڑکے یاجوج ماجوج کے لیے جمع کر لیے تھے اور ہیڈ ماسٹر صاحب نے سب کے نام لکھوا دیے تھے۔ عماد اور ندیم کے نام بھی لکھوا دیے۔ کل اُن کو ایک بڑی سی گاڑی لے گئی ہے۔

اُستاد بچوں کے ساتھ یہ زبردستی کیوں کر رہے ہیں؟ عدیلہ نے نہایت فکرمندی سے پوچھا۔

اُستاد جی نے کسی کو بھی زبردستی نہیں بھیجا۔ عماد اور ندیم بھی اپنی خوشی سے گئے تھے، شفیق نے بتایا۔

پھر عماد مجھ سے اجازت کیوں نہیں لے کر گیا؟ عدیلہ نے شفیق کو جھڑکنے کے انداز میں سوال کیا۔

شفیق اب فرفر سچ بولنے لگا تھا، اُس نے بتایا، عماد نے ماسٹر صاحب سے کہا تھا وہ گھر میں بتا کر ابھی آ جائے گا مگر ہیڈ ماسٹر صاحب اور مولوی عبدالحیٔ نے کہا نیکی کے کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ اللہ ناراض ہو جاتا ہے۔

تُو کیوں نہیں گیا؟

مَیں ڈر گیا تھا اِس لیے نہیں گیا۔ مجھے بھی کہتے تھے لیکن مَیں نے تفریح کی چھٹی کے وقت اپنی امی کو بتا دیا تھا اور اُس نے مجھے تفریح کے بعد سکول میں نہیں آنے دیا۔ شفیق نے عدیلہ کو سب کہانی بتا دی اور عدیلہ وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ کچھ لمحوں بعد اچانک اُٹھی اور شفیق کو گردن سے پکڑ کر سیدھی سکول میں داخل ہو گئی۔

عدیلہ نے ہیڈ ماسٹر کا کمرہ پوچھا۔ یہ کمرہ ایک آم کے درخت کے سائے میں زرد رنگ کی عمارتوں کے آخری کونے پر تھا۔ پورے منٹگمری میں یہ واحد سکول تھا جس کی عمارت پر پیلے رنگ کی قلعی کی گئی تھی اور اِس میں درختوں کا ایک جنگل تھا۔ ایک چپڑاسی ہیڈ ماسٹر عبد العلیم کے کمرے کے سامنے بیٹھا تھا۔ عدیلہ اُس سے اجازت لیے بغیر کمرے میں درّانہ گھس گئی۔ ہیڈ ماسٹر خاتون کی دیدہ دلیری اور گستاخی پر حیران رہ گیا۔ ابھی وہ حیران ہی ہو رہا تھا کہ عدیلہ نے ہیڈ ماسٹر کی میز پر پڑا ہوا پیپر ویٹ اُٹھا کر سیدھا ماتھے پر دے مارا۔ پیپر ویٹ لگتے ہی ہیڈ ماسٹر کے اوسان خطا ہو گئے۔ عدیلہ نے نرس کی وردی پہنی ہوئی تھی۔ یہ وردی عام لباس نہ ہونے کی وجہ سے اول تو کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ معاملہ کیا ہے اور یہ سرکاری عورت کون ہے۔ دوسری بات یہ تھی کہ عدیلہ کا حملہ اِس قدر تیز اور شیرنی کی طرح زخمی کر دینے والا تھا کہ کوئی بھی اُس میں کودنے کا خیال نہیں کر سکتا تھا۔ پیپر ویٹ مارنے کے بعد وہ رُکی نہیں اور سیدھی اُس کے اُوپر جا پڑی۔ ہیڈ ماسٹر کرسی سے نیچے گر گیا اور یہ اُس کے اوپر گری ہوئی تھی اور دو ہتھڑ پیٹنے لگی۔ اِس اچانک قسم کی شروع ہو جانے والی جنگ نے پورے سکول میں ایک طرح کا سکتہ کر دیا۔ عدیلہ بلند آواز میں چلانے لگی کہ تمام سکول ہیڈ ماسٹر کے دروازے پر جمع ہو گیا۔

حرام زادے اپنے بیٹوں کو مولویوں کے ساتھ کیوں نہیں بھیجتا؟ مَیں تیرا کلیجا چبا جاؤں گی۔ میرا بیٹا ابھی اور اِسی وقت چاہیے۔

ارے کم بختو! ہٹاؤ اِسے، ہیڈ ماسٹر نیچے گرا ہوا اپنے ماتھے سے خون بند کرنے کی کوشش میں تھا اور لوگوں کو پکار رہا تھا مگر لوگ پاس آنے سے ہچکچاتے تھے، مبادا ہیڈ ماسٹر نے کوئی اِس عورت کے ساتھ بُری حرکت کی ہے۔

اُس نے ہیڈ ماسٹر پر دوسرا حملہ کر دیا اور بپھری ہوئی شیرنی کی طرح اُس کا گریبان کھینچ کر کپڑے تار تار کرنے لگی۔ ایک اُستاد آگے بڑھ کر اُسے چھڑانے ہی لگا تھا کہ اُس نے ایسے غیظ کے عالم میں اُس کا ہاتھ جھٹکا کہ وہ سہم کر رہ گیا اور عدیلہ دھڑا دھڑ دونوں ہاتھوں سے ہیڈ ماسٹر کو پیٹنے لگی۔ حرامی آج میں تیری جان سے ہاتھ دھو کر جاؤں گی۔ تیرا خون مجھ پر حلال ہو گیا ہے۔ مجھے میرا بیٹا چاہیے۔ پھر اچانک عدیلہ نے ہیڈ ماسٹر کی سفید داڑھی پر تھوک دیا۔ اِس حرکت پر تمام سٹاف اور لوگ دم بخود رہ گئے۔ آخر سب ہمت کر کے آگے ہوئے۔ ایک دو چپڑاسیوں نے عدیلہ کو بھی زدوکوب کیا۔ اُس کے بال کھینچنے لگے۔ کچھ نے مل کر ہیڈ ماسٹر کو عدیلہ کے نیچے سے نکالا۔ اُس کے بعد عدیلہ وہیں پاؤں پسار کر بیٹھ

گئی اور دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ اور سر پیٹنا شروع کر دیا۔ سب لوگ حیران تھے۔ اُس سے اِس قدر بڑے احتجاج کی توقع نہیں تھی۔ اب سب کو سمجھ آ گئی تھی کہ عورت اتنی باؤلی کیوں ہوئی ہے۔ یہ حالت دیکھ کر ایک اُستاد آگے بڑھا اور عدیلہ کے نزدیک آ کر کہا، میری بہن صبر کر، آپ کا بیٹا مل جائے گا۔ تب اُس نے ہیڈ ماسٹر کو کمرے سے نکالنے کی کوشش کی۔ اُسی وقت عدیلہ نے سامنے سے روک دیا۔

ہرگز نہیں جانے دوں گی۔ جب تک میرا بیٹا نہیں آئے گا، یہ میرے سامنے یہیں رہے گا اور چیخیں مار مار کر رونے لگی اور ہیڈ ماسٹر سے ربڑ کی طرح چپک گئی۔

اُس حرامی عبدالحئ کو بلاؤ۔ خنزیر کا پتر مجھے بھی لے ڈوبا ہے، ہیڈ ماسٹر ایک دم چیخا، بی بی تیرا پتر آ جائے گا، صبر کر جا اب مَیں اُسے منگواتا ہوں، نوکری جاتی ہے تو جائے۔ مَیں نے اُسے کہا بھی تھا سکول کے بچوں سے باز آؤ لیکن یہ جہنمی پتا نہیں کہاں تک ڈبوئے گا۔ اِس لوطی پر خدا کی پھٹکار۔

یہ کہہ کر ہیڈ ماسٹر نے چوکیدار عبدالرشید کو مولوی عبدالحئ کی طرف بھیج دیا اور اُسے کہا جتنی جلدی ہو سکے سکول میں آ جائے۔

چوکیدار رشید جلدی سے جامعہ رحیمیہ کی طرف سرپٹ دوڑ پڑا۔ اِس عرصے میں عدیلہ نے ایک لمحے کے لیے بھی رونا پیٹنا بند نہیں کیا تھا۔ سکول کے کم و بیش تمام اساتذہ نے اُسے بار بار دلاسا دیا مگر وہ نہیں مانی۔ اِتنے میں دن کے بارہ بج چکے تھے۔ ایک گھنٹے بعد رشید چوکیدار دوبارہ سکول میں داخل ہوا۔ اُس نے بتایا، قاری صاحب کہتے ہیں وہ ابھی فارغ نہیں ہیں۔ کچھ عرب مہمان آئے ہیں اُن کے ساتھ مصروف ہوں۔ کل آؤں گا۔

قاری عبدالحئ کا جواب سنتے ہی عدیلہ تو عدیلہ خود ہیڈ ماسٹر کے تلوؤں کو آگ نے پکڑ لیا۔ اُس نے چوکیدار سے کہا، میری سائیکل لاؤ۔ رشید نے بھاگ کر فوراً سائیکل حاضر کر دی۔ ہیڈ ماسٹر نے عدیلہ سے کہا، بی بی بیٹھ میری سائیکل پر۔

عدیلہ کی طرف سے اِس قدر توہین اور مار پیٹ کے باوجود عدیلہ کے ساتھ ہیڈ ماسٹر کا تعاون اور سلوک اِس قدر متاثر کن تھا کہ اُس کو لگا جیسے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی ہے۔ وہ فوراً سائیکل پر بیٹھ گئی۔ ہیڈ ماسٹر نے سائیکل سکول سے باہر نکال لی اور جامعہ رحیمیہ کی طرف سیدھی کر لی۔ عدیلہ پہلی بار سائیکل پر بیٹھی تھی۔ جامعیہ رحیمیہ کے دروازے پر پہنچ کر اُس نے سائیکل رُکنے کا انتظار بھی نہیں کیا اور سائیکل سے چھلانگ لگا دی۔ اِس تیزی میں عدیلہ منہ کے بل نیچے گر پڑی۔ ہیڈ ماسٹر نے جلدی سے

سائیکل پھینک کر عدیلہ کو اُٹھنے کے لیے سہارا دیا۔

"کرماں والیے سائیکل تو رُک لینے دیتی۔" ہیڈ ماسٹر کے اطوار اور کیفیت میں ایک طرح کی رحمدلی اور شرمندگی کے آثار واضح تھے۔

دونوں جب مدرسے کے سامنے پہنچے تو وہاں دس پندرہ لوگ عجیب قسم کی وردیوں میں موجود تھے۔ اُن کے پاس بڑی بڑی رائفلیں تھیں۔ وہ عجیب وغریب قسم کے ٹرکوں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ عدیلہ اور ہیڈ ماسٹر اُنھیں نظر انداز کر کے آگے بڑھتے گئے اور مدرسے میں داخل ہو گئے۔ مدرسے میں ایک اور ہی طرح کا ہنگامہ تھا۔ ایک بڑی لاری کھڑی تھی۔ ابھی اِس بس کا دروازہ کھلا ہی تھا۔ اُس میں بیس سے پچیس مدرسے کے لڑکے سوار تھے۔ کچھ کی داڑھیاں بڑھی ہوئی تھیں اور کچھ بغیر داڑھیوں کے تھے۔ عدیلہ نے دیکھا ایک گھنی داڑھی والا شخص اگلی سیٹ پر بیٹھا ہے۔ اُس نے ڈب کھڑبی جیکٹ پہن رکھی ہے اور دیکھنے میں وحشی نظر آتا ہے۔ عدیلہ کو شک ہوا، ہو نہ ہو اُس کا بیٹا بھی اِسی بس میں ہوگا۔ وہ چلتی ہوئی پھُرتی سے لاری میں گھس گئی۔ پاس کھڑے ہوئے رائفل بردار آدمی نے اچانک عدیلہ کی انٹری کو دیکھا تو غصے سے لال ہو گیا۔ یہ کون عورت ہے جو اُس کی اجازت کے بغیر لاری میں داخل ہو کر جلدی سے اِدھر اُدھر نظریں پھیر رہی تھی۔ وہ بھاگ کر لاری میں داخل ہوا اور عدیلہ کو ایک دم بالوں سے پکڑ کر نیچے دے مارا۔ عدیلہ منہ کے بل زمین پر گری۔ ہیڈ ماسٹر جو ابھی وہیں تھا، اُس نے آگے بڑھ کر جلدی سے عدیلہ کو اُٹھایا۔ عدیلہ کے منہ سے خون نکلنے لگا۔

بڑھیا تیرا دماغ خراب ہے، کیا دیکھتی ہے مردوں کی لاری میں، وہ آدمی چلایا؟

ہیڈ ماسٹر نے نرمی سے آگے بڑھ کر اُس آدمی سے کہا، بھائی یہ اپنے بیٹے کو دیکھ رہی تھی۔

اُدھر مولوی صاحب کے پاس جاؤ، یہ کہہ کر اُس نے ایک دھکا ہیڈ ماسٹر کو دیا اور ایک دھکا مزید عدیلہ کو دیا۔

عدیلہ نے اتنے میں دیکھ لیا تھا کہ اُس کا بیٹا اِس لاری میں نہیں تھا۔ اب دونوں آگے بڑھتے ہوئے قاری کی طرف روانہ ہوئے۔ ایک دفعہ ہیڈ ماسٹر اِس مدرسے میں آ چکا تھا اِس لیے اُسے قاری کے کمرے کا پتا تھا۔ وہ سیدھے وہیں پہنچے۔ عدیلہ سیدھی شیشم کے سائے میں موجود اُس کمرے کی طرف بھاگی جس پر ایک بڑی سی تختی پر قاری عبدالحئی لکھا تھا مگر وہاں جانے سے پہلے ہی دو آدمیوں نے اُنھیں آگے بڑھنے سے روک دیا اور کہا قاری صاحب کچھ مہمانوں سے بات چیت کر رہے ہیں۔ تھوڑی

دیر میں فارغ ہوں گے تو ملاقات ہو گی۔ وہاں بیری کے نیچے بیٹھ جائیں۔ ناچار عدیلہ اور ہیڈ ماسٹر عبدالعلیم پاس کے اُسی میدان میں بیٹھ گئے جہاں بیری کھڑی تھی۔ یہ کاٹھے بیروں والی بیری اس مدرسے میں واحد سایہ دار درخت تھا۔ باقی دو چار نئی کھجوریں لگائی گئی تھیں۔ وہ کھجوریں بھی سوکھ گئی تھیں۔ اس کے علاوہ مدرسے میں ہر طرف چمکتی اور کڑکتی ہوئی دھوپ تھی۔ وہ تین گھنٹے بیری کے نیچے بیٹھے رہے۔ یہ وقت عدیلہ پر کتنا دشوار تھا، اِس کا اندازہ وہی عورت کر سکتی ہے جس کا جوان اور اکلوتا بیٹا بھیڑیوں میں گھرا ہوا اور وہ اُسے بچانے سے قاصر ہو۔ اتنے میں وہ لاری مدرسے کے صحن سے نکل گئی تھی اور ایک سنسان خموشی نے مدرسے کو ویران کر دیا تھا۔ لاری کے جانے کے بعد اُنھوں نے دیکھا دو عرب باشندے مولوی کے کمرے سے نکلے ہیں۔ اُن کے سروں پر ٹائر کی طرح کچھ کالا سا بندھا ہوا تھا۔ مولوی عبدالحئی اُن کے ساتھ تھا۔ اُسی وقت ہی ایک بہت بڑی اور لمبی گاڑی آگے بڑھی جو مدرسے کے دروازے کے قریب ہی موجود تھی وہ گاڑی اُن کے قریب آ کر رُک گئی۔ مولوی عبدالحئی بڑی گرم جوشی سے اُن کے ساتھ عربی زبان میں باتیں کر رہا تھا۔ آخر اُس نے اُن کو رخصت کر دیا۔ تھوڑی دیر میں گاڑی وہاں سے نکل گئی۔ اُس کے نکلتے ہی گیٹ پر کھڑے اسلحہ بردار آدمی بھی اپنی گاڑیوں میں اُس گاڑی کے پیچھے چلے گئے اور مولوی عبدالحئی دوبارہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

یہ سب کچھ دیکھ کر عدیلہ پر ایک ہیبت طاری ہو گئی، وہ بالکل بجھ کر رہ گئی۔ کچھ دیر تو اُس سے اُٹھا ہی نہیں گیا لیکن ماسٹر کے اُٹھانے سے اُٹھی اور ماسٹر کے ساتھ مولوی کے کمرے کی طرف بڑھی۔ کمرے میں داخل ہو کر دیکھا کہ مولوی چارپائی پر پاؤں لٹکا کر بیٹھا تھا اور دو شاگرد اُس کے پاؤں دبا رہے تھے۔ قاری صاحب نے اُن کے کمرے میں آنے کے بعد لڑکوں کو پاؤں دبانے سے منع کر دیا۔ دونوں نو عمر لڑکے ایک طرف ہو گئے۔ اتنے میں عدیلہ قاری صاحب کے عین سامنے پہنچ چکی تھی۔ ہیڈ ماسٹر کو خطرہ لاحق ہوا کہیں عدیلہ قاری صاحب کے ساتھ بھی وہی سلوک نہ کرے جو اُس نے اُس کے ساتھ کیا اور معاملہ سدھرنے کی بجائے خراب ہو جائے۔ پھر اِس سے پہلے کہ عدیلہ قاری کے گریبان پر ہاتھ ڈالتی، ہیڈ ماسٹر فوراً بڑھ کر دونوں کے درمیان آ گیا اور اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کے بولا، قاری صاحب خدا کا واسطہ ہے اِس کا بیٹا واپس منگوا لو، وہ پانچ بہنوں اکیلا بھائی ہے اور یہ بہت غریب عورت پہلے ہی دُکھوں کی ماری ہے۔ مجھ سے اِس کا دُکھ نہیں دیکھا جاتا۔ یہ پاگل ہو جائے گی۔

ماسٹر کو بات کرتے دیکھ کر عدیلہ ایسے خموش ہو گئی جیسے اُس کی وکالت بہتر انداز سے کیے جانے کا

امکان ہو۔ ایک کام اُس نے البتہ یہ کیا کہ قاری کے قدموں کے پاس ہی چوکڑی مار کر یوں بیٹھ گئی جیسے کہتی ہو کہ جب تک عماد نہیں آئے گا وہ یہیں بیٹھی ہے۔

مجھے نہیں معلوم تھا، اُن تین میں سے ایک لڑکا اِس کا ہے۔ یہ بچاری پہلے ہی بہت شوہدی اور تنگ حال ہے۔ آپ عنایت کرو، اِس کا بیٹا واپس کرادو۔ ہیڈ ماسٹر نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

بھئی وہ تو ٹھیک ہے، قاری بولا، لیکن اُس کا کوئی نام تو ہوگا، کون سا ہے اور کون سا نہیں ہے، یہاں منٹگمری سے تو اللہ کی راہ میں بیس لڑکے گئے ہیں اور اُن کی ماؤں نے خوشی خوشی بھیجے ہیں۔ حیرت ہے یہ عورت اللہ کی راہ میں لڑنے کو کوئی حیثیت نہیں دیتی۔

قاری کی اِس بات پر عدیلہ ایک دم جوش میں آ گئی، مولوی صاحب، اللہ کی راہ میں اپنے سارے کنبے کو بھیج دے، مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر میرا بیٹا واپس نہیں آیا تو مَیں اِسی جگہ اپنے آپ کو آگ لگا کر خود بھی مروں گی اور تمھارے مدرسے کو بھی راکھ کر دوں گی۔

ماسٹر صاحب یہ کیسی بدتمیز عورت ہے، مولوی غصے سے بولا، اِسے بولنے کی تمیز نہیں، کسی بڑے چھوٹے کا لحاظ نہیں ہے۔ لونڈے کو مَیں نے باندھ کر تھوڑی بھیجا ہے، اپنی عقل سوچ کا خود مالک تھا، خوشی سے گیا ہے۔ پھر کون سا کسی بُرے کام کے لیے گیا ہے۔ نیک کام کے لیے اِس راہ میں منافع ہی منافع ہے، شہید نہیں تو غازی کو عزت ملتی ہے۔

دیکھ مولوی! مجھے نہ غازی چاہیے نہ شہید، مجھے اپنا بیٹا چاہیے، عدیلہ اپنے حواس کھونے کی طرف جا رہی تھی۔ یہ شہادتیں اللہ تمھارے گھر کو نصیب کرے۔

اِس جملے میں ایسی طنز تھی کہ قاری صاحب ایک دم تلملا گئے۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی اِس عورت کا کیا علاج کریں۔ وہ ایک دم بھڑک کے بولا، دیکھ بی بی یہ مدرسہ ہے۔ اپنے ہسپتال میں نہیں کھڑی، نہ مریضوں کو دوائی دے رہی ہو کہ جیسا بھی زہر دو گی پی لیں گے۔ میری ایک عزت ہے، میرے پاس ایک علم کی وراثت ہے۔ چپ کر کے کھڑی ہو۔

مولوی مَیں تیری عزت یہیں لنگارا کر دوں گی، عدیلہ چیخی، عزتوں والے بیگانے بیٹوں کو اغوا نہیں کراتے۔ نہ جہادوں پر بھیجتے ہیں۔ جب میرا بیٹا نہیں بچا تو مجھے بھی اپنی جان کی پروا نہیں۔ تجھ جیسا مریض کیا کچھ کر سکتا ہے، مَیں اچھی طرح جانتی ہوں۔ اللہ کو تیری منحوس شکل سے نفرت ہے۔ تیرے علم پر شیطان کی مار ہے۔ اگر میرا بیٹا نہ پلٹا تو تیرے اِس سارے مدرسے کو جہنم بنا دوں گی۔

عدیلہ کو اِس دیدہ دلیری سے بات کرتے دیکھ کر قاری کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ پلٹ کر جواب دیتا اور اِس جواب در جواب سے حالات قابو سے باہر ہو جاتے ماسٹر صاحب نے قاری کا بازو پکڑ کر اُسے چارپائی سے اُٹھایا" قاری صاحب ذرا میرے ساتھ اِدھر آیئے۔"

اُس کے بعد دونوں اُٹھ کر تھوڑے فاصلے پر جا کر کھڑے ہو گئے اور کچھ باتیں کرنے لگے۔ عدیلہ کو یہ تمام گفتگو سمجھ نہیں آ رہی تھی بلکہ وہ سُن ہی نہیں رہی تھی لیکن اُسے یقین ہو گیا کہ ماسٹر صاحب ضرور کوئی حل نکال لیں گے۔ وہ اُسی طرح ننگے فرش پر بیٹھی پاگل عورت کی طرح تنکے سے زمین پر لکیریں کھینچتی رہی۔ قاری عبدالحیٔ اور ماسٹر صاحب گفتگو کرتے رہے۔ کچھ دیر گزرنے کے بعد دونوں چل کر واپس اُسی جگہ آ گئے اور ماسٹر نے آگے بڑھ کر عدیلہ کو زمین سے اُٹھایا،" اُٹھ میری بہن اللہ کرم کرے گا۔ اُٹھ کر اُوپر کرسی پر بیٹھ جا۔" اتنے میں ایک لڑکے نے دو کرسیاں سامنے رکھ دیں۔ عدیلہ بہت ہچکچاہٹ کے بعد اُٹھی اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہی۔ آخر قاری صاحب نے پاس کھڑے دونوں لونڈوں سے کہا' چلو لڑکو اُدھر جاؤ' اور واپس عدیلہ سے مخاطب ہو گیا۔

دیکھ میری بیٹی، ذرا تحمل سے سُن۔ تیرا بیٹا میرے لیے بھی بیٹا ہے۔ آج کل کافروں سے جھگڑا چل رہا ہے۔ اِس میں ہم اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کر رہے ہیں۔ یہاں سے بہت دنیا وہاں گئی ہے۔ ہم یہاں بیٹھ کر اُن کو کمک پہنچاتے ہیں۔ اگر مجھے یہاں انتظامات نہ کرنے ہوتے تو مَیں خود بھی چلا جاتا۔ جیسا ماسٹر صاحب نے کہا کہ یہ تیرا ایک ہی بیٹا ہے اور پانچ بیٹیاں ہیں۔ بیٹے اپنے ماں باپ کا بڑھاپے میں سہارا ہوتے ہیں۔ اگر مجھے پہلے پتا ہوتا تو مَیں اُسے منع کر دیتا کہ وہ نہ جائے۔ اب یہ ہے کہ وہ ابھی تک میری اطلاع کے مطابق اِسی مُلک میں ہے مگر فی الحال منٹگمری میں نہیں ہے۔ ملک میں ایک جگہ پر چھ مہینے اُن کی ٹریننگ ہو گی۔ اُس کے بعد اُنھیں آگے بھیجا جائے گا۔ مَیں نے ماسٹر جی سے وعدہ کر لیا ہے مَیں جلد اُسے واپس منگوا لوں گا۔ باقی ساری بات ہمارے ماسٹر صاحب آپ کو سمجھا دیں گے۔ تُو میری بہن ہے اور مَیں وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ اب تُو چلی جا اور جس طرح میں نے ماسٹر صاحب سے کہا ہے وہ کر۔ مَیں اُسے تجھ سے دُور نہیں ہونے دوں گا۔ مَیں نے اِنھیں ایک کام کہا ہے۔ جیسے ہی ماسٹر صاحب مجھے اُس کام کے مکمل ہونے کی اطلاع دیں گے، تمھارا بیٹا یہاں آ جائے گا۔

قاری عبدالحیٔ کی باتوں میں ارادے کی پختگی صاف نظر آ رہی تھی مگر اُس نے ماسٹر جی کو کیا بات سمجھائی تھی، یہ عدیلہ کی سمجھ میں نہیں آئی۔ عدیلہ نے قاری سے کہا، قاری صاحب! جو بات ہے مجھے بتا

دیں، مجھ سے انتظار نہیں ہو سکتا۔ مَیں مر جاؤں گی۔

بی بی مَیں نے جب کہہ دیا ہے تو کیوں ضد کرتی ہے؟ قاری کرختگی سے بولا، جا چلی جا ماسٹر صاحب تمھیں سمجھا دیں گے۔ میری اجازت کے بغیر تمھارا بیٹا کہیں نہیں جا سکتا۔ ماسٹر نے عدیلہ کا بازو پکڑ کر اُسے اُوپر اُٹھایا اور بولا، بہن آ جا، اب تیرا بیٹا آ جائے گا، فکر نہ کر جلدی آ جائے گا۔ مَیں نے ساری بات کر لی ہے۔

ماسٹر اور عدیلہ جیسے ہی مدرسے سے باہر نکلے، عدیلہ نے بے چینی میں اُسے کہا، تُو بتاتا کیوں نہیں قاری نے تجھ سے کون سی بات کی ہے اور کیا کچھ شرطیں باندھی ہیں؟ مَیں اپنے بیٹے کے بغیر گھر نہیں جا سکتی اور ندیم بھی عماد کے ساتھ ہے۔ اُسے بھی گھر لائیں۔

عدیلہ کے منہ سے ندیم کا نام نکل تو گیا لیکن اُسے فوراً احساس ہوا کہیں ندیم کو عماد کے ساتھ نتھی کر کے اُس کی اپنی منزل کھوٹی نہ ہو جائے اور قاری اُس کا مطالبہ پورا کرنے سے صاف اِنکار ہی نہ کر دے لیکن اُدھر ماسٹر جی کے کان فوراً ہی کھڑے ہو گئے۔ اُس نے ایک نظر عدیلہ کو دیکھا اور کہا، بی بی ایک بات بتاؤں۔ اِس وقت تُو صرف اپنے بیٹے کی بات کر اور ندیم کی ماں کو اُس کے حال پر چھوڑ دے۔ جب تک تیرا بیٹا واپس نہ آ جائے اُسے ملنا بھی مت ورنہ اپنے بیٹے سے ہاتھ دھو بیٹھے گی۔

وہ تو بچاری مر جائے گی۔ اُس کا بھی ایک ہی بیٹا ہے، تُو قاری سے بات تو کر کے دیکھ اور تُو شرط کیوں نہیں بتا رہا؟ دیکھ مَیں یہاں سے نہیں ہلوں گی جب تک اصلی بات نہیں بتائے گا۔

عدیلہ ماسٹر علیم سے ندیم کے متعلق ایسے شکستہ بات کر رہی تھی جیسے اُسے انیسہ کے درد سے تعلق تو ہے مگر اپنے بیٹے کی قیمت پر نہیں۔ وہ ندیم کے بارے میں خموش ہو گئی۔

اچھا بتاتا ہوں، ماسٹر علیم نے پسینا ماتھے سے صاف کر کے پہلے اِدھر اُدھر دیکھا۔ مدرسے کا دروازہ اُن کے باہر نکلتے ہی بند ہو چکا تھا۔ ہیڈ ماسٹر کی حالت اتنی خستہ اور کٹی پھٹی تھی کہ سڑک پر لوگ رُک رُک کر دیکھ رہے تھے۔ بعض لوگ اشارے بھی کر رہے تھے مگر یہ جگہ سکول سے اتنی دُور تھی کہ کسی کو کچھ خبر نہیں تھی کون ہیں۔ عدیلہ کا لباس چونکہ نرس کا تھا اور پھٹا ہوا بھی نہیں تھا۔ اِس سے گمان چل رہا تھا کہ دونوں میاں بیوی ہیں اور کسی بات پر ہاتھا پائی کر بیٹھے ہیں بلکہ ہٹے کٹے مرد کو اُس کی بیوی نے مارا ہے۔ جیسے ہی دونوں منٹگمری جیل کی دیوار کے پاس پہنچے ایک جامن کے درخت کے سائے میں رُک گئے۔ آخر ماسٹر صاحب نے عدیلہ کو قاری عبدالحیٔ کا مطالبہ سنانے کی ہمت کر ہی لی۔ وہ ایک لمحہ تک وہیں

کھڑا اُسے ٹک ٹک دیکھتا رہا پھر بولا، ''عدیلہ بی بی یقین جان مَیں ہمت نہیں کر پا رہا لیکن قاری کی شرط بتانے پر مجبور ہوں۔ اِس کے بغیر چاہے مجھے مار دے یا جو مرضی میرے ساتھ کر تیرا بیٹا واپس نہیں آئے گا۔ اِن مولویوں کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ اِنہوں نے ہزاروں ماؤں کے بیٹے خودکشی کے جنگل میں جھونک دیے ہیں۔ کچھ لڑنے کے لیے اور کچھ عرب بدوؤں کی خدمت کے لیے۔''

کون سی خدمت؟ عدیلہ ماسٹر کا چہرہ دیکھنے لگی۔

دیکھ عدیلہ ایک بات سُن اور اُسے پلے باندھ لے اگر تم اپنی اور بیٹے کی خیریت چاہتی ہو تو یہ راز اِزار بند کے دھاگے سے باندھ لے اور مت کھولنا۔ یہاں سے دو طرح کے لڑکوں کی بھرتی ہوتی ہے۔ یہ بھرتی سرکار اور مولوی مل کر کرتے ہیں۔ جب مدرسے اور سکولوں کے لڑکے ٹریننگ کے لیے تیار ہو جاتے ہیں تو بہت سے جس مقصد کے لیے منتخب ہوتے ہیں اُسی کام پر بھیج دیے جاتے ہیں۔ کچھ لڑکے، جو منہ متھے کے ٹھیک ہوتے ہیں اُنھیں عربوں سے پیسے لے کر بیچ دیتے ہیں، پھر وہ چاہے اُن سے جو بھی کام لیں۔ یہ جو تم مدرسے میں عرب لوگوں کو دیکھ رہی تھی، اِسی خاطر یہاں آئے تھے۔ یہ کاروبار سرکار کے کچھ بڑے اور یہ مولوی آپس میں مل کے چلاتے ہیں۔ اس لیے کسی کے پاس شکایت لے جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اگر تُو نے قاری کی شرط نہ مانی تو مجھے شُبہ ہے تیرا لڑکا اور وہ انیسہ کا بیٹا کسی محاذ کی بجائے اِن کے پاس جائیں گے۔

عدیلہ ماسٹر کی باتیں سُن کر پہلے اُسے دیدے پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ اُس کی زبان گنگ تھی اور ہونٹ خشک ہو چکے تھے۔ آخر زچ ہو کر اُس کی زبان سے نہایت غضب کے عالم سے نکلا۔ ماسٹر خدا تجھے کوڑھی کر کے مارے، تُو شرط کیوں نہیں بتاتا کسی حرامدی ماں کے بچے۔ ہم اپنے لڑکوں کو اُستادوں کے پاس پڑھانے بھیجتی ہیں یا مجاہد بنانے کے لیے۔ بے غیرت تُو نے معلمی کو دلالی بنا ڈالا، ہائے میرے عماد بیٹے۔

ماسٹر علیم عدیلہ کی گالی سُن کر ایک دم جھلا گیا۔ اُس نے شرم سے دائیں بائیں دیکھا کہیں کوئی جاننے والا گالیاں تو نہیں سُن رہا۔ پھر بولا تُو فکر مند نہ ہو ابھی تک تیرا بیٹا کسی طرف نہیں گیا۔ تُو سمجھ کہ تُو خوش قسمت ہے قاری نے اُسے واپس کرنے کی ہامی بھری ہے۔

عدیلہ سٹپٹا کر بولی ''ماسٹر سیدھی بات کرو۔ تم مجھے مدرسے سے واپس لے آئے ہو۔ اگر میرے ساتھ دھوکا کیا تو دیکھ لینا مَیں تمھیں بھی جان سے مارنے میں دریغ نہیں کروں گی اور نہ اس حرام زادے

کو چھوڑوں گی۔"

"مولوی عبدالحئی نے کہا ہے اگر تم اپنا بیٹا واپس چاہتی ہو تو اپنی ایک بیٹی کو اُس کے ساتھ بیاہ دو۔" آخر ماسٹر نے ایک ہی سانس میں قاری کا مدعا بیان کر دیا۔"اِس کے علاوہ کوئی دوسری بات نہیں۔ مَیں سکول کا ہیڈ ماسٹر ضرور ہوں لیکن تمھیں سچ بتاؤں تو اُس کی چار دیواری کے اندر میرا کوئی اختیار نہیں۔ ہمیں ہدایت ہے اگر کوئی شخص سکول میں بچوں کو جہاد پر لیکچر دینے آئے تو ہم اُن کے کاموں میں رکاوٹ نہ ڈالیں۔"

ماسٹر کی یہ بات عدیلہ پر بجلی بن کر گری۔ اُسے لگا جیسے اُس نے یہ بات سنی نہ تھی محض سوچی تھی اور اب اِس چیز کو ہوتے دیکھ رہی تھی۔ چند لمحے کے سکتے کے بعد اُس نے ماسٹر سے کہا یہ تم سچ کہہ رہے ہو؟

بہن مَیں نے پہلے کہا ہے، مَیں بہت مجبور ہوں اور کسی بھی قسم کی طاقت نہیں رکھتا۔ فتنے کے دِنوں میں کچھ دین داروں کا سود بڑھ جاتا ہے۔ مگر اُس نے وعدہ کیا ہے جب تُو اپنی بیٹی صفیہ کا نکاح اُس سے کر دے گی تو تیرا بیٹا واپس آ جائے گا۔ ورنہ وہ اِس معاملے میں کچھ مدد نہیں کرے گا۔ اُس نے یہ بھی کہا ہے یہ بات تم نے باہر اُچھال دی تو اپنے بیٹے سے ہاتھ دھو لینا۔

عدیلہ ماسٹر کی بات سُن کر وہیں سڑک پر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر خموش ایسے بیٹھی رہی جیسے گہری سوچ میں ڈوبی ہو۔ پہاڑوں کی دیو ہیکل بلندیاں اور استقامتیں اپنی جگہ لیکن جب اُن کے سروں پر زلزلوں کے صدمات گرتے ہیں تو یہی استقامتیں خجالتوں کی جون بدل لیتی ہیں۔ ماسٹر سائیکل پکڑے کھڑا تھا۔ چند لمحے سکوت کے بعد عدیلہ ہچکیاں لے کے رونے لگی۔ تھوڑی دیر میں ہچکیوں کی آواز اتنی بلند ہو گئی کہ ہیڈ ماسٹر کے لیے وہاں کھڑا ہونا مشکل ہو گیا۔ آتے جاتے لوگ ایک دفعہ کھڑے ہو کر دیکھتے اور گزر جاتے۔ وہ چیخیں مار کر بلبلانے لگی۔ اِس حالت نے ماسٹر کو بالکل ہی پریشان کر دیا۔ اِس وقت وہ عدیلہ کا ایسا دوست تھا جس کے پاس اپنے مظلوم کی فریاد سننے کا یارا نہیں تھا۔ وہ نیچے بیٹھ کر عدیلہ کو دلاسے دینے لگا۔ عدیلہ کا لباس مٹی سے لت پت ہو چکا تھا۔ اُس کے بال بکھر گئے تھے۔ وہ بغیر کسی وقفے کے روئے جا رہی تھی۔ ماسٹر نے تھوڑی دیر اُسے چُپ کرانے کی کوشش کی پھر ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ جانتا تھا اِس کے ناخن سخت چٹانوں سے ٹکرا کر جھڑ گئے ہیں اور اب یہ خود ہی چُپ کرے گی۔ عدیلہ ایک ایسے جال میں پھنس چکی تھی جس سے اگر باہر بھی نکلتی تو اُس کے کئی اعضا کٹ کر اُسی میں رہ جاتے۔ وہ

ایک کٹے پھٹے کبوتر کی طرح باہر آتی۔ ہیڈ ماسٹر نے اُسے تسلی سے رونے دیا اور خود چُپ کر کے ایک طرف بیٹھا رہا۔

بہت دیر اِسی عالم میں گزر گئی۔ پھر ایک ہی دم عدیلہ اُٹھی اور اُس نے ماسٹر علیم سے کہا۔ ماسٹر میرا بیٹا کب تک آ جائے گا؟

اُس کی بات سُن کر علیم کے چہرے پر ایک دم رونق آ گئی، وہ بولا، ہاں بس ایک ہفتے میں آ جائے گا۔ قاری صاحب یہاں سے تار بھیجیں گے اور وہ لڑکے کو روانہ کر دیں گے۔

ٹھیک ہے مجھے یہ شادی منظور ہے، عدیلہ نے پختہ ارادے سے بات کی پھر وہ دونوں چل پڑے۔

تم اِسی وقت اپنے گھر جاؤ، عبدالعلیم بولا، مَیں قاری کی طرف جاتا ہوں، ہم جلد عماد کو لانے کی کوشش کریں گے۔ عدیلہ نے وہیں ایک تانگہ رکوایا اور گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ ماسٹر عبدالعلیم دوبارہ قاری عبدالحئی کی طرف چلا گیا۔ اُسے لگا جیسے وہ ایک گونا مطمئن ہو گیا ہو۔

(۸)

جولائی کی تپتی دوپہر تھی، صحن میں کھڑے کیکر کے سیاہ درخت پر کوّے بیٹھے شدت سے بول رہے تھے۔ گھر کے سامنے دو جامن کے درخت لہلہا رہے تھے۔ جامن کے پھلوں کا رنگ ابھی ہلکا گلابی تھا۔ اِس پھل کو پکنے میں بارہ پندرہ دن باقی تھے۔ ہوا ٹھہری ہوئی تھی اور گھر میں ایک ایسی خموشی تھی جس کی بابت یہ کہنا کہ اُس میں ہنگامے کی فضا تھی، مناسب نہیں۔ عدیلہ جانتی تھی اُس کے گھر سے عماد کے چلے جانے اور صفیہ کو قاری کے حجرے کو سونپ دینے سے بڑھ کے اب کوئی نیا ہنگامہ نہیں ہو سکتا۔ اُس نے اپنے دل میں جو کچھ منصوبے باندھے تھے وہ کمزور ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ شروع شروع میں انیسہ نے اُس کے گھر میں کئی چکر لگائے لیکن عدیلہ کی طرف سے مکمل خموشی پا کر کہیں غائب ہو گئی تھی اور پچھلے تین مہینے سے اُس نے اُسے منٹگمری میں کہیں نہیں دیکھا تھا۔ صفیہ کا نکاح قاری سے کر دیا گیا تھا مگر رخصتی اُسی شرط پر رکھی گئی تھی جب عماد واپس آ جاتا۔ قاری اِس بات پر رضامند ہو گیا تھا۔ اُس وقت صفیہ کی عمر بیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ ایک طرح سے عدیلہ نے اُسے بیٹے کی قربان گاہ پر چڑھایا تھا۔ نکاح ہوئے چھ مہینے ہو چکے تھے۔ عدیلہ کو ایسے لگتا تھا جیسے عماد کا معاملہ اب قاری کے بس میں بھی نہیں رہا۔ یہ سوچ کر اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی اور سر پھٹنے لگ جاتا۔ جیسے جیسے دن نکلتے جا رہے تھے قاری کے وعدے شدت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ وہ عدیلہ کو کوئی نیا بہانہ لگا دیتا کہ بس عماد آج آ جائے گا، کل آ جائے گا۔ اِس نکاح میں قاری عبدالحئی نے کم و بیش دو سو آدمیوں کو دعوت دی تھی۔ یہ دعوت

ایک طرح سے اُس اِنکار کا پیش خیمہ تھی جو کسی بھی وقت عدیلہ کی طرف سے وجود میں آ سکتا تھا۔ عدیلہ گھر کے چولہے کے پاس پڑے کھانے کے برتن دھو کر اُٹھی ہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ جلدی سے اُٹھ کر باہر بھاگی، دروازہ کھولا تو سامنے عماد کھڑا تھا۔ وہ آگے بڑھ کر اُس سے لپٹ گئی اور چیخیں مار کر رونے لگی۔ عماد خموشی سے کھڑا رہا۔ اُس کی دونوں بہنیں اور باپ بھی بھاگ کر باہر آ گئے۔ یہ تمام عماد کے ساتھ گلے ملنے اور اُسے چومنے لگے۔ دروازے کے باہر راہ چلتوں کا بڑا مجمع لگ گیا۔ اِس عرصے میں اردگرد کے کوارٹرز سے بھی بہت لوگ جمع ہو گئے اور ایک طرح سے سب ہی عماد کو خیر مقدم کہنے کے لیے نکلے تھے۔ ماں بہنوں اور باپ کا اشتیاق اور لوگوں کے جوش کے باوجود حیرت کی بات تھی کہ عماد انتہائی سرد مہر نظر آ رہا تھا۔ عدیلہ کو یہ بات عجیب معلوم ہو رہی تھی۔ اُسے محسوس ہوا یہ وہ عماد نہیں ہے جو چھ ماہ پہلے اُس سے جدا ہوا تھا۔ اُس وقت اُس نے نیلے رنگ کی شرٹ کے ساتھ کالے رنگ کا پاجامہ پہنا تھا۔ سفید ٹائی باندھی تھی اور بالکل سرخ و سفید رنگ کا نازک سا لڑکا تھا جس کے گالوں میں خون کی گلابی تھی۔ جب وہ گھر سے سکول کی طرف نکلا تھا، نہایت پر جوش اور ہشاش بشاش تھا مگر آج جب واپس آیا تھا تو صرف چھ ماہ میں چہرہ پھیکا ہو چکا تھا۔ رنگ میں گویا تیزاب گھول دیا تھا۔ ہونٹ نیلے پڑے ہوئے تھے اور منہ سے کسی انجانی شے کی بُو آ رہی تھی۔ عدیلہ کا کلیجا مسوس کر رہ گیا۔ یہ وہ عماد نہیں تھا جو کبھی اُسے لگتا تھا کہ اُس کی گود سے نکلا ہوا معصوم بچہ ہے۔ اچانک وہ کیسے اتنا سرد مہر اور بے رحم نظر آنے لگا تھا۔ عدیلہ خوفزدہ ہو گئی۔ وہ جلدی سے اُسے گھر میں لے گئی اور گھر کو اندر سے کنڈی چڑھا دی۔

نیامت جلدی کر چائے بنا، میرا بیٹا اللہ جانے کب سے پیاسا اور بھوکا ہے۔ عدیلہ نے نیامتے کو حکم دیتے ہوئے کہا اور اُس کے بعد اُسے لے کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔

میرا بیٹا یہ تیری کیا حالت ہے، مجھے بتا کس نے تجھے تباہ کیا؟ مَیں اُس کا دل کھینچ لوں گی۔ تو اتنے دن کہاں رہا، کیا تجھے وہ کھانے کو دیتے تھے؟

عدیلہ بولتی جا رہی تھی مگر عماد کسی بات کا جواب نہیں دے رہا تھا، جیسے اُسے واپسی کا غم ہو اور زبردستی بھیجا گیا ہو۔ عدیلہ اُس کے بدلے ہوئے مزاج کو قبول کرنے میں دقت محسوس کر رہی تھی۔ پھر اُسے یہ سوچ کر دلاسا ہوا کہ عماد ابھی بچہ ہے، ایک دو دن میں سمجھ جائے گا کہ اُسے واپس لا کر ہم نے اچھا ہی کیا ہے۔ عماد کے اِس مزاج کی ہلکی سی لرزش اُس کی بہن اور باپ کو بھی محسوس ہوئی تھی لیکن اصل چبھن عدیلہ ہی کو لگی۔ اُسے یہ غم بھی تھا کہ عماد کے چہرے کی معصومیت جو چھ ماہ قبل مستقل طور پر موجود

تھی اور وہ اُسے ایک پہاڑ کی طرح وہیں جمی لگ رہی تھی، اچانک اتنی جلدی کیسے درشت صورت اختیار کر سکتی ہے۔ وہ رنگ سے لے کر مزاج تک اتنا پھیکا کیسے ہو سکتا ہے۔ اللہ جانے ظالموں نے سونے بھی دیا تھا کہ نہیں۔ نہ کھانا وقت پر دیا ہوگا اور ہاتھوں میں ایک رائفل تھما دی ہوگی جس کی سختی نے اُسے اتنی جلدی سخت کر دیا تھا۔ اُسے یوں لگا جیسے عماد بے چین سا ہے اور اِدھر اُدھر کوئی چیز ڈھونڈ رہا ہے۔ شاید اُسے نیند آ رہی ہو۔ چائے پک چکی تھی۔ زینت نے چائے اور کھانا ایک ساتھ اُس کے سامنے رکھ دیا جسے وہ اُسی چُپ کے ساتھ کھانے لگا جس چُپ اور خامشی کے ساتھ پچھلے ایک دو گھنٹے سے بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کی ماں عدیلہ بار بار اُس کے سر اور ماتھے پر بوسے دیے جا رہی تھی اور رو رہی تھی۔

عدیلہ کا خاوند تمام صورتِ حال کو ایک بُت کی طرح تکے جا رہا تھا، اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ خوش ہو یا پُر جوش ہو۔ ایسی صورتِ حال پر اُسے کس قسم کے تاثرات دینا چاہیے، اِس سے وہ مکمل بے خبر تھا، بلکہ آگے بڑھ کر بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرنے اور اُسے بوسہ دینے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ نہ اُس نے کبھی زندگی میں کسی جذبے کا اظہار کیا تھا۔ اُس کا کام محض صحن میں صفائی کرنا اور بچوں کے چھوٹے موٹے کام یا عدیلہ کی ناراضی کو کسی بھی طرح اپنے اُوپر نہ آنے دینا تھا۔ جب سے عماد غائب ہوا تھا، عدیلہ کا غصہ بار بار احمد دین پر نکلتا تھا۔ اِسی حالت میں اُس نے ایک دو بار اُس کی پٹائی بھی کی تھی۔ عدیلہ کو اِس مرد کی کبھی سمجھ نہیں آئی کہ وہ اپنے اندر کوئی انسانی جذبہ رکھتا بھی ہے تو کس قسم کا؟ جب سے اُس کی ماں نے اِس کے ساتھ بیاہا تھا وہ ایسی پُتلیوں کی صورت تھا جنھیں اُن کے نچانے والے نچا نچا کر ایک مقام پر خود تھک جاتے ہیں۔ تب وہ اُنھیں زندہ دیکھنا چاہتے ہیں مگر پُتلیاں کبھی زندہ نہیں ہوتیں اور اپنے نچانے والوں کے لیے امتحان بن جاتی ہیں۔ عدیلہ کا یہ چچا زاد جس سے اُس کی خالہ نے غیر مشروط طور پر بیاہ دیا تھا آج عدیلہ کے لیے ایک امتحان تھا۔ عماد اپنی ماں اور بہنوں کے جوش اور جذبات کو دیکھتا رہا اور خموش بیٹھا رہا۔ آخر ایک ہی دم اُکتا کر اُس واحد کمرے میں چلا گیا جس میں چارپائیاں لگی ہوئی تھیں۔

یہ کمرہ یوں تو عدیلہ اور اُس کے خاوند احمد دین کا تھا مگر عماد یا اُس کی بہنوں نے کبھی اِسے اُن میاں بیوی کا کمرہ خیال نہیں کیا تھا۔ نہ اُس تمام کالونی میں ایسے الگ کمروں کے متعلق سوچا جاتا تھا۔ عماد وہاں پڑی ایک رنگین چارپائی پر لیٹ گیا جس کے پایوں کا رنگ زمانے کی گردش نے چاٹ لیا تھا۔ عدیلہ نے اُسے کمرے میں جانے سے نہیں روکا، نہ اُس کے پیچھے گئی۔ اُسے فی الحال یہ اطمینان تھا کہ

اُس کا بیٹا گھر آ گیا ہے۔ باقی جو کچھ اُس کے ساتھ بیتی ہے وہ بعد میں پوچھا جا سکتا ہے۔ تھوڑی دیر میں کھانا تیار ہو چکا تھا۔ عدیلہ اور اُس کی پانچویں بیٹی زینت کھانا لے کر اندر آئی تو دیکھا عماد سو چکا ہے۔ شاید اُسے کئی دن سے نیند کا غلبہ تھا۔ وہ دونوں کھانا لے کر واپس اُسی برآمدے میں آ گئیں اور بیٹھ کر اُس دکھ کو ٹٹولنے لگیں جو پچھلے کئی مہینوں سے اُن کی جان کا روگ بن چکا تھا۔ اُسی وقت اُسے ندیم کا خیال آیا اور وہ جھرجھری لے کر رہ گئی۔ اللہ جانے وہ کہاں ہوگا۔ عماد سے پتا چل سکتا تھا مگر وہ بولے تو سہی۔ پھر اُسے ایک اور خیال نے گھیر لیا۔ وہ اُٹھی اور احمد دین سے کہا، احمد دین جلدی کر کسی ٹرک کا بندوبست کر کے لا اور اِسی وقت سب سامان اُٹھا کر اُس میں بھر کے نکل چلیں مگر خبردار جو کسی کو کان و کان خبر ہونے دی۔ اگر قاری کو خبر ہو گئی تو یہاں سے نکل نہیں سکیں گے۔ احمد دین نے عدیلہ کی بات سنتے ہی اپنا صافہ اُٹھایا اور باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔

عدیلہ کے گھر کا سامان اتنا زیادہ نہیں تھا۔ نہ اُسے ڈھونے میں کسی قسم کی دقت ہوتی مگر مصیبت یہ تھی کہ قاری کے مخبر کہیں آس پاس ہی نہ پھرتے ہوں۔ اُسے یہی ایک تشویش تھی لیکن کچھ بھی ہو جائے وہ نہیں چاہتی تھی کہ اپنی بیٹی اِس بڈھے قاری کے نصیبوں میں لکھ دے جس کی شکل اتنی کریہہ اور نا قابلِ برداشت تھی کہ اُسے دیکھنے سے گھن آتی تھی۔ دوسری بات یہ تھی کہ عماد کے واپس آنے کے باوجود اُس کا قاری پر غصہ کم نہیں ہوا تھا۔ عدیلہ نے احمد دین کے جانے کے بعد اپنی دونوں بیٹیوں سے کہا، دیکھو گھر کا سامان سمیٹنا شروع کرو، جیسے ہی ٹرک آئے سامان لاد کر یہاں سے نکلنے کا سوچیں اور سیدھے اپنے گاؤں میں جا کر دم لیں۔ اُس کے گاؤں تک اول تو قاری پہنچ نہیں سکے گا، بالفرض پہنچ بھی گیا تو اُس کے جانے سے پہلے اپنی بیٹی کو گاؤں کے چودھری سے بیاہ دے گی۔ وہ جیسا بھی ہوگا اِس مولوی سے بہتر ہوگا۔ وہ صفیہ کو نذیر ذیلدار سے بیاہ دے گی تو کیسے ممکن ہوگا کہ ایک شیر کے منہ سے بھیڑیا شکار چھین لے۔ وہ یہ باتیں سوچ ہی رہی تھی کہ دروازے پر ایک بار پھر دستک ہوئی۔ اِس دستک پر عدیلہ کا دل دھڑکنے لگا۔ اُٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے ہیڈ ماسٹر عبدالعلیم کھڑا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی عدیلہ کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ ہاتھ کانپنے لگے اور پورے جسم میں لرزہ طاری ہو گیا۔ عدیلہ کو توقع نہیں تھی کہ ایک دم ماسٹر علیم اُس کے دروازے پر آن کر کھڑا ہو جائے گا۔ وہ اُس کے آنے کا مطلب سمجھتی تھی۔ ماسٹر علیم نکاح سے لے کر ہر اُس معاملے میں عدیلہ کے ساتھ مشاورت کے طور پر شامل رہا تھا جو قاری اور عدیلہ کے درمیان چل رہا تھا۔ اِس کے باوجود وہ ابھی تک عدیلہ کے گھر نہیں آیا تھا لیکن اِس وقت

کیوں آیا تھا۔ یہ بات عدیلہ خوب جانتی تھی۔

کیا اندر آنے کے لیے نہیں کہو گی؟ آخر ماسٹر علیم نے عدیلہ کی پریشانی بھانپتے ہوئے کہا۔

عدیلہ پژمردگی سے دروازہ چھوڑ کر ایک طرف ہو گئی، آیئے۔

ماسٹر علیم آہستہ سے دروازے کے اندر داخل ہو گیا۔ برآمدے میں زینت اور صفیہ ایک چارپائی پر بیٹھی تھیں جبکہ نیامتے چائے بنانے میں لگی تھی۔ ماسٹر علیم نے اُن کی طرف غور سے دیکھا اور دوسری چارپائی پر بیٹھ گیا جو صحن میں برآمدے سے باہر پڑی تھی۔ اِس چارپائی پر ایک سرہانہ پڑا تھا۔ ماسٹر عبدالعلیم نے وہ سرہانہ ایک طرف کر دیا اور آرام سے منہ نیچے کر کے کچھ سوچنے لگا۔ عدیلہ نے قینچی نما کرسی اُٹھائی، اُسے کھولا اور سامنے بیٹھ گئی۔ یہ کرسی لکڑی کی تھی۔ اِسے بند کیا اور کھولا جا سکتا تھا۔ اِس طرح کی کرسیاں ہر گھر میں ہوتی تھیں لیکن اِس وقت اُسے کرسی کے بارے میں کوئی فکر نہیں تھی کہ وہ بند ہوتی ہے یا کھلتی ہے۔ اُسے اِس وقت علیم کا گھر میں آنا موت کی سوگواری کا سا عمل لگا تھا۔ کچھ دیر دونوں طرف خموشی طاری رہی اُس کے بعد علیم نے زبان کھولی۔

عدیلہ بی بی مَیں اِس وقت تیری طرف خیریت سے نہیں آیا اور اِس کا تمھیں بھی پتا ہے مگر میرا آنا ناگزیر تھا۔ کیا میری بات سُن رہی ہو؟

تم بات کرو، مَیں سُن رہی ہوں، عدیلہ نے مردہ آواز سے کہا، چائے تو پیو گے؟

نیامت کو آواز دیتے ہوئے، نیامتے ماسٹر صاحب کے لیے بھی چائے بنا دو۔

عدیلہ مَیں اِس بات کو سمجھتا ہوں، ماسٹر نے دوبارہ گفتگو کا آغاز کیا، ایک شخص نے پہلے آپ کے دل میں زہر کا ٹیکا اُتارا، اُس کے بعد بھاری معاوضہ وصول کر کے اُس کا تریاق کیا۔

لیکن ماسٹر اِس کے پہلے ذمہ دار تم ہی تھے۔ عدیلہ غصے سے پھنکاری۔

تمھیں غلط فہمی ہے اور آج مَیں اُسی غلط فہمی کو دُور کرنے آیا ہوں۔ جب تک تمھارا لڑکا واپس نہیں آیا تھا، یہ بوجھ مجھے موت سے زیادہ وزنی اور سینے کو دبا دینے والا لگ رہا تھا لیکن اِسے مَیں ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔ ماسٹر علیم نے کہا۔

کیا مطلب ہے تمھارا؟ عدیلہ گھوم کر ماسٹر کی طرف سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

یہ سچ ہے کہ قاری عبدالحئی لوگوں کے بچوں کو سکول سے اغوا کروا کر جہاد والوں کے حوالے کرتا ہے مگر تیرے لڑکے کے ساتھ معاملہ الگ ہوا ہے۔

ہیں، یہ تُو کیا کہہ رہا ہے؟ عدیلہ نے آنکھیں مزید کھول دیں۔

ہوا یہ ہے کہ تیری بیٹی صفیہ سلائی سکول میں جاتی تھی، وہاں جو اُستانی اُسے تعلیم دیتی ہے وہ قاری عبدالحئی کی مخبر ہے۔ اُس نے تیری بیٹی کی خبر قاری تک پہنچائی۔ اِدھر قاری نے ایسا ڈول ڈالا کہ ایک منصوبے کے ذریعے تیرے لڑکے عماد کو اغوا کرنے کا بندوبست کیا اور اُس کے لیے جہاد ایک عمدہ بہانہ تھا۔ یہ بات بالکل سچ ہے اُس نے بیس پچیس بچے پچھلے دنوں یہاں کے سکولوں سے کہیں بھجوائے ہیں مگر اُن میں سے سمجھو آدھے ہی جہاد پر گئے ہوں گے، باقی کہیں اور بھیجے گئے ہیں لیکن یہ صرف میرے ایک سکول کی بات نہیں پورے ملک کے سکولوں اور مدرسوں میں بیگار چل رہی ہے۔ تیرے بیٹے کو کہیں بھی بھیجنے کی بجائے پنجاب کے ایک قصبے میں رکھنا تھا مگر وہ غلطی سے ایک عرب کی نظروں میں چڑھ گیا اور بڑی مشکلوں سے چھ مہینے بعد اُسے وہاں سے قاری واپس منگوا سکا ہے۔ اِس کے عوض کسی اور کا جگر بھیجا گیا ہے۔ مجھے پل پل یہی دھڑکا تھا بات اب قاری کے ہاتھوں سے نکل گئی ہوگی اور لڑکا واپس نہیں آ سکے گا۔

تُو نے یہ بات اُس دن مجھے کیوں نہیں بتائی؟ عدیلہ بپھر کر بولی۔

اُس دن بتا دیتا تو نہ مَیں آج تک زندہ رہتا، نہ تیرا بیٹا ملتا اور نہ تیری صفیہ بچتی۔ ماسٹر علیم ایک اذیت ناک لہجے کے ساتھ بولا۔

قاری اتنا طاقتور کیسے ہو گیا کہ وہ اس طرح کے اتنے بڑے بڑے دھندے کرتا ہے؟ عدیلہ نے پوچھا۔

دھندوں کا اندازہ تُو اُس دن خود جا کر مدرسے میں کر چکی ہے۔ پھر یہ بھی دھیان میں رکھ بڑے بڑے رشتوں کا لالچ صرف تیری لڑکی کو نہیں ملا، اِس پر تو خود قاری کی نظر تھی، کئی سکولوں میں لڑکوں کی طرح لڑکیوں کو اُن کے حوالے کیا گیا ہے۔

عدیلہ ہونقوں کی طرح ماسٹر کو دیکھنے لگی۔ وہ اِس وقت کیسے کیسے انکشاف کر رہا تھا۔ اُس نے اُسی لمحے صفیہ کو آواز دی، صفیہ اِدھر آؤ۔

صفیہ اُٹھ کر عدیلہ اور ماسٹر کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

کیا سلائی سکول میں سلمہ اُستانی نے تجھے کبھی کچھ کہا؟ عدیلہ نے صفیہ کا چہرہ غور سے پڑھتے ہوئے پوچھا۔

جی ایک دن کہہ رہی تھی مَیں نے تمھارے لیے ایک اچھا سا رشتہ ڈھونڈا ہے، عیش کرو گی مگر مَیں نے اُسے صاف جھڑک دیا تھا کہ مجھے رشتوں کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ کسی قاری کا ذکر کر رہی تھی۔ دو لڑکیوں کا رشتہ اُس نے کروا بھی دیا تھا، کہتی تھی شہزادیاں بن کر رہو گی اور باہر کے ملکوں کی سیر کرو گی، بہت پیسے والے لوگ ہیں۔

یہ کب کی بات ہے اور تُو نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟ عدیلہ غصے سے جھلائی۔

اِس بات کو دس مہینے ہو گئے ہیں۔ جب میں نے پہلی بار اُسے غصے سے ٹوکا تھا اُس کے بعد دوبارہ اُس نے مجھے کہنے کی ہمت نہیں کی۔

قاری نے تجھے کہاں دیکھا تھا؟ عدیلہ نے اگلا سوال کیا۔

وہیں سکول میں ایک دن آئے تھے۔ اُن کے ساتھ ایک کمانڈروں جیسی خاکی وردی کا بندہ تھا اور دو عرب کے باشندے بھی تھے۔ اُس دن قاری نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا تھا اور دیر تک ہاتھ میرے سر پر رکھے رکھا تھا۔

اچھا چلو اندر جاؤ۔ عدیلہ نے لاچاری سے جھڑکا۔

تمھارا لڑکا کہاں ہے اِس وقت؟ ماسٹر علیم نے فکر مندی سے پوچھا۔

وہ سویا ہوا ہے اور جب سے آیا ہے، نہ کوئی بات کی ہے نہ کھانا کھایا ہے۔ کھویا کھویا سا ہے۔ میرا ارادہ ہے اِسے ہسپتال لے جاؤں۔

تم اِسے کہیں بھی لے جاؤ مگر ایک بات کا دھیان رکھنا، قاری کو یہ خبر نہ ہو کہ مَیں نے تمھیں سب کچھ بتایا ہے۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ اِس قاری کا مدرسہ صرف زکوٰۃ پر نہیں چلتا۔ مدرسے کے لڑکے بھی کرایے پر کچھ عرصے کے لیے بھیجے جاتے ہیں، کچھ واپس آ جاتے ہیں، کچھ وہیں رہ جاتے ہیں۔

تمھیں اِس سارے کارخانے کا کیسے پتا ہے کہ قاری نے اِس طرح کا کوئی دھندا شروع کر رکھا ہے اور کوئی اُسے روکنے ٹوکنے والا نہیں ہے۔ عدیلہ اب اعتدال میں آ چکی تھی۔ وہ سوچنے کا کام شروع کر چکی تھی۔ اِس لیے گفتگو میں روانی لے آئی۔

مجھے کیا ہر اُس آدمی کو اِس بات کی خبر ہے جو آج کل کے مدرسوں کے حالات جانتا ہے۔ ہمارے ملک کے ایک بڑے ادارے کو لڑاکا قسم کے رضاکار چاہییں۔ اُسے یہ مولوی رضاکار مہیا

کرنے کا کام کرتے ہیں۔ ملک اور ملک سے باہر نوخیز لڑکوں اور لڑکیوں کو بھیجتے ہیں اور اُس کے عوض اِن کے مدرسے چلتے ہیں۔ بڑی گاڑیاں اِن کے ہاں آنے لگی ہیں۔ تم جانتی نہیں ایک سائیکل لینے کے لیے کتنے پیسے اکٹھے کرنے پڑتے ہیں۔

مَیں تمھیں کہنے آیا ہوں۔ اب جلدی سے صفیہ کو قاری کے حوالے کر کے جتنی جلدی ہو سکتا ہے اِس بیٹے اور اپنی چھوٹی بیٹی کو لے کر یہاں سے نکل جا۔ ورنہ یہاں نہ ایک قاری ہے اور نہ ایک تیرا بچہ ہے جو اِس طرح سے اغوا ہوا ہے۔ ایسے کئی سیکڑوں اور ہزاروں ماؤں کے بچے جا رہے ہیں۔

مَیں اِن کے خلاف تھانے میں جاؤں گی۔ عدیلہ محکم ارادے سے بولی۔

کیا تیرے علاوہ یہ خیال پہلے کسی کو نہیں آیا کہ اُس کا مسئلہ تھانے میں حل ہو جائے گا؟ ماسٹر نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ بی بی تُو سمجھتی کیوں نہیں۔ تھانہ وانا سب کچھ اِنھی کا ہے۔ ایک دوسرے سے سب ملے ہیں۔

اب تو مَیں اِسے اپنی بیٹی کبھی نہیں دوں گی اور صاف انکار کر دوں گی کہ تجھ بڈھے کو کیسے اپنی پریوں جیسی بیٹی دان کر دوں؟ چاہے کچھ ہو جائے۔ عدیلہ نے جواب دیا۔

ہاں یہ سب کچھ ضرور کرو مگر ایک بات یاد رکھو۔ جب تک تم منٹگمری میں ہو۔ اِس قسم کا ارادہ کبھی ظاہر نہ کرنا۔ ماسٹر نے سمجھاتے ہوئے کہا بلکہ مَیں تمھیں ایک مشورہ دیتا ہوں۔ اُس پر عمل کرو اور نجات پاؤ۔

وہ کیا؟

ابھی قاری کو پیغام بھیجو، قاری صاحب آپ کی مہربانی سے میرا بیٹا گھر آ گیا ہے۔ اگرچہ اُس کی صحت اچھی نہیں ہے لیکن مَیں کل اُسے ہسپتال لے کر جاؤں گی۔ ان شاء اللہ جلد اچھا ہو جائے گا۔ مَیں آپ کی بہت ممنون ہوں اور چاہتی ہوں صفیہ کے ساتھ جو نکاح ہوا ہے اُسے جلد آپ کے حوالے کر دوں لیکن مَیں ایک غریب بندی ہوں جہیز میں کچھ نہ دے سکوں گی۔ سب کچھ تمھیں ہی کرنا پڑے گا۔ میری بیٹی کے لیے مناسب قسم کے کپڑے اور دو چار تولے سونا لے کر ہفتے عشرے میں آ جاؤ اور اِسے اپنے گھر لے جاؤ۔

یہ کیا بکواس کر رہے ہو، عدیلہ غصے سے غرائی۔ مجھے تو لگتا ہے تم خود اِس سازش میں شریک ہو اور مجھے ڈرا کر قاری کے لیے راہ ہموار کرنے آئے ہو۔ مَیں کیسے اُسے یہ رشتہ دے سکتی ہوں۔ اگر تمھاری

کوئی بیٹی ہے تو اُس کے لیے سوچو، قاری کے حوالے کرنے میں تمھیں کتنی خوشی ہوگی۔

عدیلہ بہن ایک تو تم پوری بات نہیں سُنتی۔ ماسٹر نے اپنے ماتھے پر غمزدگی سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ پہلے پوری بات سُن لو مَیں کیا کہنا چاہتا ہوں۔ تیرا یہ پیغام جب قاری تک پہنچے گا وہ مطمئن ہو کر تیری طرف سے توجہ ہٹا لے گا اور مکمل طور پر شادی کی تیاریوں میں مصروف ہو جائے گا۔ اُسے گمان بھی نہیں گزرے گا کہ ایک عورت جب پانچ تولے سونے کا تقاضا کر رہی ہے تو اپنی بات پر پکی ہی ہے۔ اُس نے اپنے جو بندے تیری نگرانی میں کھڑے کیے ہیں اُنھیں ہٹا لے گا۔ تب تم اچانک رات کی تاریکی میں اپنا سامان ٹرک پر رکھنا اور نکل جانا۔ اِس نوکری کو تیاگ کر کسی ایسے علاقے میں جہاں قاری کی ہوا بھی نہ پہنچے۔ اتنے عرصے میں تم اپنا بندوبست کر لو کہ کہاں جانا ہے بلکہ مَیں تو کہتا ہوں ٹرک وغیرہ مت لاؤ۔ آہستہ آہستہ ایک ایک چیز گھر سے اُٹھا کر کسی اور جگہ منتقل کر لو۔

لیکن مَیں نے تو ابھی احمد دین کو ٹرک لینے کے لیے بھیج دیا ہے، عدیلہ نے فکرمندی سے کہا۔

ہائیں یہ کیا غضب کرتی ہو بی بی۔ یہاں اِسی محلے میں اُس نے اپنے دو تین بندے تیری نگرانی پر کھڑے کیے ہیں۔ ذرا تم نے یہ کام کیا، اُسے اطلاع ہو جائے گی۔ پھر نہ تیری خیر، نہ تیرے لڑکے کی خیر اور نہ لڑکی کی۔ اُلٹا تجھ پر اُس کی بیوی کے اغوا کا پرچہ بھی ہو جائے گا۔

لیکن ابھی جب تم میرے پاس آئے ہو تو اُنھیں اِس بات کا پتا نہیں چلے گا کہ ماسٹر علیم میرے گھر میں کیا لینے آیا ہے؟

اُسے پتا چلے گا، ہر حالت میں چلے گا اور مَیں کہہ دوں گا کہ مَیں تو اُس کے بیٹے کے ملنے کے لیے گیا تھا۔ آخر وہ میرے سکول کا بچہ تھا اور مَیں ہی اُس کے اغوا کا ذمہ دار تھا۔ پھر یہ کہ جب تو میرے مشورے کے مطابق اپنا پیغام قاری کو بھیجے گی تو مجھ پر کچھ شک اُسے ہوا بھی تو اُٹھ جائے گا۔

ہائے اللہ تو اب مَیں کیا کروں، عدیلہ رونے لگی۔ مَیں نے اب احمد دین کو بھیج دیا ہے۔ خدا کے واسطے اُسے جا کر نور شاہ ٹرک اڈے سے واپس لے آؤ تو اچھا ہے۔ مَیں اُسے یہی تیرے والا پیغام دے کر قاری کی طرف بھیج دیتی ہوں۔ تیرے پاس سائیکل ہے۔ احمد دین پیدل گیا ہے۔ اگر سائیکل پر جائے گا تو اُسے پکڑ سکتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہاں ٹرک پہنچ جائے اور ایک نئی مصیبت سر پر آن کھڑی ہو۔

تُو فکر نہ کر مَیں ابھی جاتا ہوں اور اُسے لے کر واپس آتا ہوں، لیکن مَیں تو تمھارے خاوند کو

پہچانتا ہی نہیں ہوں۔ کیسے پتا چلے گا کون سا ہے؟

ایک منٹ رُک میں سامنے والی نسیم بی بی کا بیٹا تیرے ساتھ بھیج دیتی ہوں وہ اُسے پہچانتا ہے۔
یہ کہتے ہی عدیلہ نے باہر نکل کر سامنے کے کوارٹر سے ایک لڑکے ججو کو آواز دی۔ آواز سنتے ہی ایک چودہ پندرہ سال کا لڑکا باہر نکل آیا۔ ماسٹر علیم بھی باہر نکل کر اور اپنی سائیکل پکڑ کر وہیں کھڑا ہو گیا۔

ججو بیٹا ماسٹر جی کے ساتھ جا اور اپنے بابے احمد دین کو ڈھونڈ کر جلدی گھر لے کر آؤ۔ وہ نور شاہ روڈ پر ٹرک اڈے کی طرف گیا ہے۔

یہ بات سنتے ہی ججو ماسٹر کی سائیکل پر بیٹھ گیا اور وہ ہسپتال کالونی سے باہر نکل گئے۔

(۹)

رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ یہ وقت عدیلہ کی ڈیوٹی کا تھا مگر وہ ہسپتال نہیں گئی۔ کل اُس نے قاری عبدالحئی کو جو پیغام بھیجا تھا وہ مسلسل اُس کے دماغ میں کچوکے لگا رہا تھا۔ اُس نے ماسٹر علیم کی بات مان تو لی تھی مگر اُسے کسی طرح چین نہیں آ رہا تھا۔ ماسٹر علیم نے کہیں دوبارہ اُس کے خلاف سازش تو نہیں کی۔ اگر کل ہی وہ اپنا سامان اور بیٹیوں کو لے کر یہاں سے نکل جاتی تو کتنا اچھا تھا۔ اُس نے کیوں ماسٹر علیم پر یقین کر لیا۔ بعض اوقات انسان اپنی مرضی سے انتہائی مناسب قدم اُٹھانے کی طرف جا رہا ہوتا ہے مگر اُس کی اپنے اُوپر بے اعتمادی اور ارادے کے ضعف کے سبب یہ قدم نہیں اُٹھا پاتا اور کوئی بھی شخص، چاہے رائے کے اعتبار سے کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو اُس قدم کو اُٹھانے سے روک دیتا ہے۔ عدیلہ کو لگ رہا تھا جیسے اُس نے بہت بڑی غلطی کر دی تھی اور کسی بھی وقت قاری اپنے کنبے کے ساتھ یہاں پہنچ جائے گا۔ اُس کے سامنے شادی کا بندوبست کرنا کون سی مشکل بات تھی۔ وہ ہفتے عشرے کا ہرگز انتظار نہیں کرے گا۔ عدیلہ کے دماغ میں جب اِن خیالات نے ہنگامہ برپا کیا تو وہ اُٹھ کے بے چینی سے ٹہلنے لگی۔ اُس نے ہسپتال میں سامنے والے لڑکے کے ہاتھ پہلے ہی دو دن کی چھٹی بھیج دی تھی۔ اب اِن خیالات کے آتے ہی گھر کی دیواریں اُسے چبھنے لگیں۔ اُس نے اندر جا کر دیکھا تو عماد چارپائی پر اکڑوں بیٹھا تھا۔

عدیلہ سب کچھ بھول کر اُس کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گئی۔ کل سے آ کر وہ بیس گھنٹے تک سویا رہا

تھا۔ ایک دو بار اُٹھ کر فقط غسل خانے میں گیا اور پھر واپس چار پائی پر آ کر سو جاتا تھا۔ عدیلہ اُس سے کچھ بات کرنا چاہتی تھی تا کہ پتا چلے وہ کہاں رہا ہے اور اُس کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ہے۔

عدیلہ نے اُس کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے آخر خموشی کو توڑا، عماد بیٹا مجھے ایک بات بتاؤ۔ تجھے سکول سے کیسے لے کر گئے تھے یہ لوگ؟ دیکھو مجھے سچ سچ بتا دو، مَیں اِس وقت بہت مصیبت میں ہوں۔

امی مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔ میرا سر گھوم رہا ہے۔ آخر عماد نے جواب دیا۔ میرے سامنے بس تصویریں آتی ہیں۔ ایک مولوی نے آ کر ہماری کلاس میں تقریر کی تھی، اُس نے کیا کہا تھا یہ بھی مجھے یاد نہیں ہے۔ تقریر کے بعد ہمارے ہاتھ کھڑے کروائے۔ مَیں نے تو ہاتھ بھی کھڑا نہیں کیا تھا۔ اُس وقت ایک آدمی میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے مجھے کھانے کو مٹھائی دی اور میرا ہاتھ پکڑ کر چل دیا۔ اُس کے بعد مجھے یاد نہیں کیا ہوا۔

لیکن تم چھ ماہ گھر سے باہر رہے ہو، یہ تمھیں یاد ہے؟ کہاں رہے ہو؟

مجھے نہیں یاد، کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ مَیں ہوا میں اُڑ رہا ہوں اور بہت سرور میں آ جاتا تھا۔ اِس کے علاوہ مَیں کچھ نہیں جانتا۔ کوئی اور ہی ملک تھا جو کچھ وہاں ہوا، وہ بھی نہیں بتا سکتا۔

اور وہ تیرا دوست ندیم کہاں ہے؟

وہ تو اُس دن ہی کسی اور ٹرک پر بیٹھ کر چلا گیا تھا۔ مَیں نے تو سمجھا واپس گھر پہنچ گیا ہے۔ کیا وہ ابھی تک نہیں آیا؟

وہ نہیں آیا اور اُس کی ماں کا بھی پتا نہیں چلا کہاں چلی گئی ہے۔ عدیلہ خموش سی ہو گئی۔ پھر تھوڑی دیر بعد بولی "اب کھانا کھاؤ گے نا؟

کھانے کو ابھی جی نہیں چاہتا۔ میرا جسم ٹوٹ رہا ہے۔ امی مجھے نیند بہت آتی ہے سو لینے دو۔

بیٹے اتنی زیادہ نیند اچھی نہیں ہوتی۔ ہاتھ پاؤں شل ہو کر فالج میں بدل جاتے ہیں۔ تم ہمت کرو، منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھانے کی کوشش کرو۔ جسم میں خود بخود طاقت آ جائے گی۔ اُٹھو مَیں تمھیں سہارا دیتی ہوں۔ یہ کہہ کر عدیلہ نے عماد کو سہارا دیا اور اُسے اُٹھانے کی کوشش کرنے لگی۔ عماد تھوڑا سا اُٹھا لیکن پھر ایک دم لڑکھڑا کر بیٹھ گیا۔

امی یہیں بیٹھا رہنے دیں۔

عدیلہ کو اتنا عرصہ ڈیوٹی کرتے ہو گیا تھا اور اُسے اندازہ تھا عماد کو بُری طرح سے نشہ دیا گیا تھا اور مسلسل نشے میں رکھنے کے سبب اُس کی یہ حالت ہوئی تھی۔ عدیلہ نے اُسے سوتے میں ایک دو بار انجیکشن دیے تھے اور ایک ڈرپ بھی لگا دی تھی۔ اُسے عماد کی سخت تشویش تھی۔ کہیں شعور کی زیریں تہہ میں گھر سے ابھی تک فرار نہ ہونے کی یہ بھی ایک وجہ تھی کہ عماد کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اب وہ کچھ کچھ سنبھل رہا تھا مگر اُس کا بلڈ پریشر ابھی تک اپنی حالت پر نہیں آیا تھا۔ اُسے مکمل آرام اور علاج کی ضرورت تھی جو فی الحال اِس جگہ کے علاوہ کہیں اور مناسب نہیں تھی۔ پورے شہر میں ایک ہی میڈیکل سٹور تھا، وہ بھی ہسپتال سے باہر نہیں تھا۔ اُس کے علاوہ کوئی ایمرجنسی بھی ہو سکتی تھی۔ اگر ایمرجنسی ہو جاتی تو وہ کہاں دوڑتی۔ ابھی ابھی اُس کے دماغ میں جو ہلچل ہوئی تھی کہ وہ ابھی بھاگ جائے عماد کے ہوش میں آتے ہی اور اُس کی حالت کو دیکھتے ہی دوبارہ اُس کے دماغ سے تمام خیالات منتشر ہو گئے اور وہ عماد کی خبر گیری کے متعلق سکڑ گئی۔

عدیلہ اپنی سی کوشش میں تھی کہ کسی طرح عماد کی طبیعت سنبھل جائے۔ اُسے عماد کے متعلق ہولناک خیالات آ رہے تھے۔ اللہ جانے نامرادوں نے کون سی دوائیں پلائی تھیں اور کیسے کیسے نشے دیے تھے۔

عماد کی حالت دیکھ کر عدیلہ کی فکرمندی بڑھ گئی۔ اُسے رہ رہ کر ماسٹر اور قاری پر غصہ آ رہا تھا، وہ کسی قیمت پر نہیں چاہتی تھی کہ صفیہ کو قاری کے حوالے کر دے۔ اُس نے صفیہ کو آواز دی 'صفیہ ایک بار اِدھر آؤ اور اپنے ابا کو بھی اندر بلا لو۔' صفیہ دوڑ کر کمرے میں داخل ہو گئی۔ اُس کے ساتھ احمد دین بھی کمرے میں آ گیا۔

احمد دین تم جا کر کہیں سے تانگہ لے آؤ۔ مَیں عماد کو لے کر ہسپتال جاتی ہوں۔ اِس کی طبیعت نہیں سنبھل رہی، زینت میرے ساتھ ہسپتال جائے گی تم اور نیامت گھر ہی میں رہو۔ تم جلدی سے دو روٹیاں پکا دو اور انڈے جو طاق میں پڑے ہیں وہ بھی اُبال دو اور دیکھو جب تک مَیں اِسے لے کر گھر نہ آ جاؤں، گھر سے باہر نہ نکلنا۔

جی امی ٹھیک ہے، یہ کہہ کر صفیہ روٹیاں پکانے میں مصروف ہو گئی اور زینت اور نیامت اپنے اور عماد کے کپڑے سنبھالنے لگیں۔ احمد دین بھوت کی طرح باہر بھاگ گیا۔ احمد دین ایسا خاوند شاید ہی پورے منٹگمری میں کسی عورت کا ہو جو روبوٹ کی طرح چلتا تھا۔

تھوڑی دیر میں سب کچھ تیار ہو گیا اور تانگہ دروازے پر آ کر کھڑا ہوا تو دونوں بہنوں اور ماں اور احمد دین نے مل کر عماد کو تانگے پر گویا لٹا دیا۔ زینت بیگ میں کپڑے ڈال کر ساتھ بیٹھ گئی۔ ایک برتن میں اُس نے پکا ہوا کھانا بھی ڈال لیا۔ تانگہ چل پڑا تو احمد دین اور صفیہ اور نیامت اُسے جاتے دیکھتے رہے۔ تانگہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو تینوں نے اپنے گھر میں داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔

عدیلہ ہسپتال آنے کے بعد مسلسل تین دن تک وہیں رہی۔ زینت بھی اُس کے ساتھ تھی۔ احمد دین روزانہ کھانا لے آتا تھا اور کوئی امر کسی طرف سے وقوع نہیں ہوا تھا۔ تیسرے دن عماد مکمل طور پر صحت مند ہو گیا۔ اُس کا ارادہ تھا ایک دن اور یہاں ٹھہر کر عماد کی صحت کے متعلق مطمئن ہو جائے کہ دوبارہ اُسے کوئی دورہ نہ پڑے۔ احمد دین دوپہر کو ہسپتال آ کر اُسے تمام ضروری چیزیں دے گیا تھا اور باقی کا سامان اُٹھا لے گیا جو اِن تین دنوں میں گھر سے ہسپتال میں جمع ہو گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے عدیلہ کی وجہ سے عماد پر پوری توجہ دی اور اب اُسے کسی قسم کی فکر نہیں تھی۔

لیکن اُسی شام اچانک احمد دین ہسپتال میں دوبارہ آ گیا حالانکہ اِس وقت اُسے ہر حالت میں گھر ہونا چاہیے تھا۔ عدیلہ نے جب احمد دین کو دیکھا تو اُسے بہت غصہ آیا کہ وہ صفیہ کو قاری کے لیے اکیلا چھوڑ کر آ گیا ہے لیکن اُس نے قریب آتے ہی ایک خط جیب سے نکالا اور زینت کے حوالے کر دیا۔ زینت نے جلدی سے خط کھول کر اُسے پڑھنا شروع کیا۔ پھر چند ثانیوں تک اُسے چپ لگ گئی۔

کیا ہوا؟ عدیلہ کے پسینے بہنے شروع ہو گئے۔ اُسے لگا جس چیز کی توقع تھی یعنی قاری اُن کی غیر موجودگی میں صفیہ کو اپنی بیوی سمجھ کر لے گیا ہے مگر جلد ہی یہ طلسم بھی ٹوٹ گیا۔

امی صفیہ گھر سے بھاگ گئی ہے اور یہ خط چھوڑ گئی ہے۔ زینت نے روہانسا منہ بنا کر جواب دیا۔ باقی تمام گھر اُسی طرح خموشی سے بُت بنا بیٹھا رہا۔

اللہ تیرا بیڑا غرق کرے صفیو، یہ جملے کہتے ہی وہ ہسپتال کے بیڈ پر گر پڑی اور دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ زینت اپنی ماں کو روتا دیکھ کر خود بھی رونے لگی۔ عدیلہ کا خاوند احمد دین اُسی طرح بیٹھا رہا۔ وہ اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں جیسے اُسے کسی شے سے کوئی علاقہ نہ ہو۔ عدیلہ چیخیں مار کر رونے لگی۔ پورے ہسپتال میں ایک کہرام کی صورت پیدا ہو گئی اور کافی دیر تک جاری رہی۔ کئی مریض اور نرسیں اور ڈاکٹر اُسی کمرے میں جمع ہو گئے۔ جب رونے دھونے سے تھوڑا سا توقف ہوا تو عدیلہ نے وہ کاغذ پکڑ کر پڑھنا شروع کر دیا۔ یہ ایک مختصر سا خط تھا جو جاتے وقت صفیہ چھوڑ گئی تھی۔

میری مصیبتوں کی ماری امی!

تم جیتی رہو اور خوش رہو۔ مَیں نے فیصلہ کیا ہے تم پر سے اپنا وزن اُٹھا لوں۔ مَیں قاری کے گھر میں کسی صورت نہیں جا سکتی جبکہ اُس سے فرار ہونے کی طاقت ہم میں نہیں ہے۔ میں حبیب خاں کے ساتھ جا رہی ہوں۔ مجھے یقین ہے یہ آدمی میرا خیال رکھے گا اور تکلیف نہیں آنے دے گا۔ مَیں جانتی ہوں اِس وقت میرا حبیب کے ساتھ بھاگ جانا تمھیں بہت صدمہ دے گا لیکن کیا کروں، یہ صدمے اُس وقت تک مصیبت زدوں کا پیچھا کرتے ہیں جب تک موت اُن کی راہ میں دیوار کھڑی نہیں کر دیتی۔ عماد واپس آ گیا ہے۔ اب اُس کی حالت بھی سنبھل گئی ہے۔ مَیں نے اُسی دن سے حبیب حلوائی سے معاملہ کر لیا تھا جس دن آپ نے عماد کے عوض مجھے قاری کو سونپ دیا تھا لیکن نہیں بول سکتی تھی کیونکہ ماں کی نظر میں بیٹے کی قیمت بہرحال بیٹی سے زیادہ ہوتی ہے۔ مَیں یہ نہیں بتا سکتی حبیب مجھے کہاں لے جائے گا اور نہ یہ جانتی ہوں اب قاری کا تمھارے ساتھ کیا سلوک ہو گا مگر یہ ہونا ہی تھا۔ تمھاری دوسری منکوحہ بیٹیاں اور زینت اور نیامت تمھارے پاس موجود ہیں۔ مَیں شاید تمام زندگی تم سے نہ مل پاؤں مگر ہر صورت چاہوں گی کہ نیامت اور زینت کو کسی طرح جلد کسی کے ساتھ نکاح میں دے دو۔ کچھ دنوں بعد تمھاری حالت معمول پر آ جائے گی۔ مَیں کہاں جا رہی ہوں یہ ابھی نہیں بتا سکتی لیکن وعدہ کرتی ہوں ایک دو سال میں تمھیں اطلاع کر دوں گی اور نیامت اور زینت کو نصیحت کرتی ہوں کہ وہ تمھارے ساتھ ہی رہیں۔

ایک بدنصیب ماں کی مجرم بیٹی

صفیہ

عدیلہ نے اِس خط کو بار بار پڑھا آخر ایک طرف رکھ دیا اور اوندھے منہ بیڈ پر لیٹ گئی۔ عدیلہ کا خاوند اُسے لیٹے دیکھ کر اُٹھا اور باہر کے برآمدے میں آ بیٹھا۔ کافی وقت اِسی حالت میں گزر گیا۔ بالآخر عدیلہ اپنی چارپائی سے اُٹھی۔ اُس نے اپنا نرس کا لباس اُتار کر وہیں ہسپتال کی دیوار کی ایک کھونٹی میں لٹکا دیا اور زینت سے کہا چلو اُٹھو گھر چلیں۔

(۱۰)

صفیہ کے گھر سے چلے جانے کا تیسرا دن تھا۔ عدیلہ نے اِس واقعہ کی اطلاع اُسی دن قاری عبدالحیٰ کو دے دی تھی جس کا اُس نے کوئی یقین نہیں کیا اور عدیلہ پر دھمکیوں کے ذریعے مسلسل دباؤ ڈالا کہ اپنی بیٹی اُس کے حوالے کر دے۔ وہ شرعی طور پر اُس کی بیوی ہے جسے عدیلہ نے اغوا کر رکھا ہے۔ ایک دن اُس نے شام کے وقت پولیس کو لا کر احمد دین کو پکڑوا دیا۔ پولیس اُسے تھانے لے گئی اور عدیلہ سے کہا اگر تم نے صفیہ کو واپس لا کر قاری عبدالحیٰ کے حوالے نہ کیا تو ہم اِسے اغوا کے پرچے میں چالان کر کے جیل بھیج دیں گے۔ اِدھر لاکھ کوششوں کے باوجود عدیلہ کو خبر نہیں چلی کہ صفیہ کہاں چلی گئی تھی۔ اُسے زمین کھا گئی یا آسمان۔ اکثر مصیبتیں اپنوں کی ہمدردی کے سبب آتی ہیں۔ صفیہ نے حبیب حلوائی کے ساتھ بھاگ کر عدیلہ کی تمام چالیں اُسی کے خلاف اُلٹ دی تھیں جنھیں وہ قاری کے خلاف استعمال کرنا چاہتی تھی۔ اگر صفیہ موجود ہوتی تو وہ اُس کو عدالت میں لے جا کر بیان دلوا سکتی تھی کہ قاری اُس پر زبردستی تسلط جما رہا ہے اور وہ زبردستی کے نکاح پر راضی نہیں لیکن اب معاملہ ہی دوسرا تھا۔ صفیہ عدیلہ کے گھر سے فرار ہوئی تھی اور سارا زمانہ اُس کا الزام عدیلہ پر ہی لگا رہا تھا۔ وہ یہی سمجھتے تھے کہ عدیلہ نے اُسے چھپایا ہوا ہے اور اُس کے فرار ہونے کے جھوٹے عذر پیش کر رہی ہے۔ کل شام سے زیادہ تشویش پھیلی ہوئی تھی۔ قاری نے اُسے آخر میں یہ پیغام بھی بھجوا دیا تھا اگر اُس کی بیوی حوالے نہ کی گئی تو وہ پولیس کے ذریعے زبردستی یہ کام کر سکتا ہے اور احمد دین کو چھترول بھی کروائے گا اور دو دن بعد

اُسے جیل بھجوا دے گا۔

عدیلہ کئی مصیبتوں کا شکار ہو چکی تھی۔ عماد ٹھیک تو ہو گیا تھا مگر اب وہ پچھلے دو دن سے آدھی رات کے وقت گھر لوٹا تھا۔ عدیلہ نے اُسے جھڑکا کہ وہ رات کے اِس وقت تک کہاں رہا ہے۔ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا اور مسلسل خموشی اختیار کیے رکھی۔ یہ بات اِس سے بھی زیادہ حیران کن تھی کہ اُسے اپنی بہنوں کی کوئی پروا نہیں رہی تھی۔ اب عدیلہ کے لیے مسئلہ یہ نہیں تھا کہ وہ قاری سے کیسے جان چھڑائے، اُس کے لیے سب سے بڑی مصیبت وہ غم تھا جس میں وہ مظلوم قانون کی نظر میں مجرم بننے والی تھی۔ زندگی کے کسی بھی حصے میں اِس سے زیادہ المیہ نہیں ہو سکتا جس میں انسان کو اپنے ہی جسم کے کٹنے کا حساب دینا پڑے۔ عدیلہ اِس وقت اُسی کنارے پر کھڑی تھی۔ اُسے رہ رہ کر احمد دین کی حالت پر غصہ آتا تھا جس کو کسی طرح سے خاوند بننے کا کوئی حق نہیں تھا مگر وہ عدیلہ کا خاوند تھا۔ بعض اوقات عدیلہ کو احمد دین اپنی بیوی نظر آتا تھا۔ اُس کا دماغ بالکل شل تھا۔ بس آج کی رات باقی تھی جس میں اُس نے زندگی کے اہم فیصلے کرنے تھے اور اکیلی نے کرنے تھے۔ اُسے احمد دین پر تھانے میں کیے جانے والے تشدد پر خوف آ رہا تھا۔ بالآخر عدیلہ نے آدھی رات کے وقت ایک فیصلہ کر لیا۔ وہ کسی طرح بھی احمد دین پر تشدد نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اُس نے اپنی بیٹی نیامت کو پاس بلایا اور اپنا فیصلہ سنا دیا۔ نیامت نے ماں کی بات پر سر جھکا لیا جسے عدیلہ نے ہاں سمجھا۔ اُس کی یہ خاموش اور بھلی مانس بیٹی کم و بیش احمد دین پر گئی تھی اور زندگی کے بڑے حساب بھلے مانسوں کو ہی چکانے پڑتے ہیں۔ اُسے سوچنے کے لیے دی گئی ایک ہی رات تھی جسے وہ ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اُسی وقت اُٹھی اور قاری کی طرف روانہ ہو گئی۔ اُس نے قاری کو اپنا فیصلہ سنا دیا اور رات کے دو بجے سے پہلے احمد دین کو لے کر گھر آ گئی۔

(۱۱)

دن کافی چڑھ آیا تھا مگر عدیلہ اپنے بستر سے نہیں اُٹھی۔ وہ نقاہت، کمزوری اور تفکر کے ملے جلے جھکڑوں سے بالکل نڈھال ہو چکی تھی۔صفیہ کی ابھی تک خبر نہیں ملی تھی۔ نہ اُس نے کوئی پیغام بھیجا تھا کہ کس حال میں ہے۔صفیہ نے جس قدر بے نیازی برتی تھی، اُس سے عدیلہ کو ایسی اُمید نہیں تھی لیکن اب عدیلہ کے لیے سب سے بڑا مسئلہ نیامت کا تھا۔ یہ سترہ سال کی بچی تھی اور صفیہ کی جگہ اِس عمر میں اِسے قاری کے حوالے کرنا ایک صریح ظلم تھا مگر اب اِس کے سوا چارہ نہیں تھا۔ قاری تو اُسی رات اُسے نکاح میں لے لیتا جس رات عدیلہ قاری سے نیامت کی ضمانت پر احمد دین کو چھڑا کر لائی تھی مگر پچھلے چھ دن سے قاری عبدالحئی سخت بخار میں مبتلا تھا اور بخار کسی طرح سے ٹوٹ نہیں رہا تھا اور عدیلہ دن رات اِسی فکر میں گھلی جا رہی تھی جس دن بھی قاری کا بخار اُتر گیا تو اُس کی پہلی ترجیح نیامت ہو گی۔ اُدھر بخار کے باوجود قاری عدیلہ کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ اُس نے اپنے آدمی عدیلہ کی نگہبانی کے لیے کھڑے کر رکھے تھے تا کہ وہ کسی طرح سے اب دھوکا نہ دے۔

اِدھر عماد نے سکول جانے کی بجائے کچھ اور ہی لچھن اختیار کر لیے۔ ہر وقت گھر سے باہر رہنے لگا تھا۔ حتیٰ کہ رات کو بھی گھر نہ آتا۔ عدیلہ نے تمام مصیبتیں اُسی کی وجہ سے سر پر اُٹھائی تھیں لیکن وہ بھی اختیار سے باہر ہو گیا تھا۔ اِس رات بھی وہ گھر پر نہیں تھا اور ساری رات عدیلہ نے اِسی فکر میں کاٹی۔ ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں سوئی۔ انسان ایک رنج سے با آسانی نپٹ لیتا ہے لیکن جب چاروں طرف سے

بُری خبریں مل رہی ہوں تو ایک خبر کا مقابلہ کرنے کی سکت بھی نہیں رہتی۔ یہی حالت اِس وقت عدیلہ کی ہو چکی تھی۔

عدیلہ کو اُدھ موا دیکھ کر نیامت آگے بڑھی اور چولہے میں آگ جلانے لگی۔ اُس نے چائے کی کیتلی چڑھا کر نیچے لکڑیاں اور پاتھیاں رکھ دیں۔ یہ سوکھی پاتھیاں یہاں عام مل جاتی تھیں۔ جس جگہ عدیلہ کا کوارٹر تھا وہ ہسپتال کا پچھواڑہ تھا۔ یہ چھوٹا ہسپتال تب سے ایک طرح کا ویران علاقہ بن گیا تھا جب سے شہر کے باہر نیا ہسپتال بنا تھا۔ اِسے اب ڈسپنسری کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ کئی ایک کوارٹر گر کر ویران ہو گئے تھے اور خالی پلاٹوں پر یہاں کے مکینوں نے فصلیں اُگا دی تھیں۔ چاروں طرف کی دیواریں گر گئی تھیں۔ اِن دیواروں کے اردگرد لوگوں نے گائیں اور چھوٹا موٹا مال مویشی باندھا ہوا تھا۔ اُن کے گوبر سے پاتھیاں بنتی تھیں جو بہت عام تھیں اور سستے داموں مل جاتیں۔ یوں تو لکڑیاں بھی کافی ہوتی تھیں مگر یہ پاتھیاں بہت سستی ملتی تھیں۔ احمد دین کو کچھ پیسے نیامت نے صندوق سے نکال کر دیے۔ وہ جھٹکے سے اُٹھا اور باہر نکل گیا پھر چند ہی لمحوں میں دودھ پتی اور میدے کے رس لے کر آ گیا۔ زینت نے چائے چولہے پر چڑھا دی اور وہ تینوں باپ بیٹی چولہے کے ساتھ بیٹھ کر چائے پکانے لگے۔ ناشتا تیار ہو گیا تو وہ ڈرتے ڈرتے ناشتا اُٹھا کر ماں کے پاس لے آئی، جیسے اُسے ڈر ہو کہ ماں ایک تو خود نہیں کھائے گی اور اُس پر ڈانٹے گی کہ اِس حالت میں اُنھیں ناشتے کی سوجھ رہی ہے لیکن حیرت کی بات تھی کہ عدیلہ نے خموشی سے چائے اور رس پکڑ کر اپنے سامنے پڑی تپائی پر رکھ دیے اور پوچھا، تم نے نہیں کیا ناشتا؟

نہیں امی، ابھی تک نہیں کیا۔ زینت افسردگی سے بولی۔

اپنے ابے کو دیا ہے؟

اُسے بھی نہیں دیا۔

اُسے بھی دو۔

جی امی، یہ کہہ کر زینت اُٹھی اور وہی ناشتا احمد دین کو دیا۔

اتنے میں گھر کا دروازہ کھٹکا، زینت نے دوڑ کر دروازہ کھولا تو سامنے عماد کھڑا تھا۔ عماد کی آنکھیں نہایت سُرخ اور اُبھری ہوئی تھیں۔ منہ سے کچھ جھاگ نما رال بہہ رہی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی زینت نے ایک دم چیخ ماری۔ چیخ سُن کر سب اُٹھ دوڑے اور پل میں دروازے پر پہنچ گئے، عماد کو دیکھ کر عدیلہ نے

اپنا کلیجا پکڑ لیا اور کھینچ کر اپنے ساتھ بھینچ لیا، بیٹا تم کن کاموں میں لگ گئے ہو؟ پھر رونا شروع کر دیا۔ عماد لڑکھڑاتا ہوا عدیلہ کی گود میں لڑھک گیا۔ نیامت اور احمد دین نے اُسے سہارا دیا اور اُٹھا کر چارپائی پر لٹا دیا۔

عدیلہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا وہ کیا کرے۔ اُسے کبھی عماد پر غصہ آتا، کبھی پیار آتا لیکن پچھلے کچھ دِنوں سے نیامت کے لیے عدیلہ کے دل میں ایک عجیب طرح محبت کی کسک پیدا ہو چکی تھی۔ جب سے اُسے قاری کے لیے منتھی کر دیا تھا۔ عدیلہ نے تمام صورت حال کا جائزہ لے کر آخر ایک فیصلہ کیا۔ اُس نے احمد دین سے کہا، احمد دین ایک کام کرو، مَیں کچھ دِن کے لیے نیامت اور عماد کو لے کر ہسپتال میں منتقل ہو جاتی ہوں۔ عماد کو وہاں داخل کروا دیتی ہوں، یہ وہیں رہے گا اور نیامت بھی میرے پاس ہی رہے گی۔ تم اور زینت کوارٹر میں رہو۔ مَیں وہاں ڈیوٹی کے ساتھ عماد کا علاج بھی کر لوں گی۔ اِس طرح یہ جن خباثتوں میں پڑ گیا ہے، اُن سے جان چھوٹ جائے گی۔ جب تک خدا کی مرضی ہے اور جب تک یہ قاری کے قبضے سے باہر ہے۔ اللہ اُسے سنبھال لے یا پھر ہمیں سنبھال لے۔ تُو جلدی سے تانگہ لے آ۔ احمد دین نے جو ناشتا کر رہا تھا وہیں رکھا اور دروازے سے باہر نکلنے لگا۔

'یہ ناشتا تو کر لے بوندو' عدیلہ نے احمد دین کو پیچھے سے پکارا۔ 'تُو بھی کیا میری جان کا عذاب بنا ہوا ہے، اپنی عقل کا تولہ بھی نہیں ہے' احمد دین واپس پلٹا اور دوبارہ چائے پینے لگ گیا۔ تھوڑی دیر میں اُس نے اپنا کام ختم کر لیا اور اُس کے ساتھ ہی باہر نکل گیا۔ اتنے میں نیامت نے بغیر ماں سے پوچھے اپنے کچھ برتن اور کچھ کپڑے سنبھالنے شروع کر دیے جو ہسپتال میں کام دینے تھے۔ نیامت سوچ رہی تھی شاید اِس نعمت کا اُنھیں احساس نہیں تھا کہ نرس ہونے کے ناتے اُن کی ماں ہسپتال کو گھر کی طرح استعمال کر سکتی تھی۔ اگر وہ نرس بھی نہ ہوتی تو اِس مشکل میں کہاں جاتے۔ عدیلہ نے زینت سے کہا، زینت بیٹی، دیکھو تو عماد کیا کر رہا ہے؟ ابھی غسل خانے سے نہیں نکلا، زینت جیسے ہی غسل خانے کی طرف بڑھی اُس نے دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا، وہ نہا چکا تھا اور اب خود بخود چولہے کے قریب آن بیٹھا۔ زینت نے اُسے بھی ناشتا دیا۔ ایک انڈا پانی میں اُبلنے کے لیے رکھ دیا اور رس اور چائے آگے رکھ دی۔

کچھ اور نہیں ہے؟ عماد نے عدیلہ کی طرف منہ کیے بغیر پوچھا۔

روٹی بنا دوں؟ زینت نے کہا۔

عماد بیٹا روٹی کھائے گا؟ عدیلہ نے دوبارہ پوچھا۔

ہاں بنا دو۔ عماد نے بے نیازی سے جواب دیا اور رس کیک کے ساتھ چائے پینے لگا۔ اتنے میں زینت روٹی پکانے لگی۔ صبح کے وقت اُن کے ہاں روٹی کا رواج نہیں تھا۔ عموماً ملازم پیشہ گھروں میں چائے اور رس کا استعمال ہی ناشتے میں آتا تھا۔ مزدوروں اور زمینداروں کے ہاں ناشتے میں پراٹھے یا سادہ روٹی پکتی تھی جس کا تقاضا عماد کر رہا تھا۔ عدیلہ نے روٹی پکا دی۔ عماد نے روٹی کھائی اور دوبارہ چار پائی پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں احمد دین تانگہ لے کر آ گیا۔ عدیلہ ہسپتال جانے کے لیے تیاری کرنے لگی۔ اتنی دیر میں تانگہ باہر کھڑا رہا۔ جب عدیلہ تیار ہو گئی تو اُس نے عماد سے کہا، چلو بیٹا، تانگے پر بیٹھو۔

کہاں جانا ہے؟

ہسپتال جانا ہے اور یہاں کوئی آپ کے ماموں تھوڑی بیٹھے ہیں۔

ہسپتال میں کیا ہے؟ عماد سٹپٹایا۔

وہاں تجھے داخل کرانا ہے۔ عدیلہ چڑ کر بولی۔

کیوں؟ مَیں اب ٹھیک ہوں۔

اِسے ٹھیک کہتے ہیں؟ چلو جلدی تانگے پر بیٹھو۔ نیامت چلو تم بھی۔

اِس کے ساتھ ہی نیامت تانگے پر بیٹھ گئی۔ عماد ابھی ہچکچا ہی رہا تھا کہ عدیلہ نے اُسے بازو سے پکڑ کر کھینچ لیا اور تانگے پر لے گئی۔

چلو بھائی ہسپتال لے چل۔

اچھا بی بی، تانگے والے نے کہا اور گھوڑے کو چھانٹا دے دیا۔

(۱۲)

عدیلہ ایک ہفتہ ہسپتال رہی۔ وہاں سے آنے کے بعد قاری عبدالحیٔ کے ساتھ نیامت بی بی کو رخصت کر دیا۔ نیامت اپنی بہن کی طرح ناک نقشے کی درست تھی۔ شادی کے ایک سال بعد اُن کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اُنھی دِنوں قاری اپنے کاروبار کے سلسلے میں کہیں چلا گیا اور اُس کے بعد واپس نہیں آیا۔ نیامت نے چھ ماہ قاری کا انتظار کیا۔ مدرسے کا تمام انتظام اب عبدالحیٔ کے چھوٹے بھائی قاری رحیم اللہ کے پاس آ گیا۔ اُس نے آتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ نیامت بی بی کو اُس کے بیٹے سمیت نکال باہر کیا اور کہا اب اُس کا اِس خاندان یا مدرسے اور دوسرے معاملات سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ وہ اپنی ماں کے پاس واپس چلی جائے۔ نیامت مجبور ہو کر ماں کے پاس آ گئی۔ اُس وقت اُس کی عمر انیس سال تھی۔ عدیلہ نے اُسے اپنے پاس لا کر سر پر ہاتھ پھیرا اور بچے کی پرورش کرنے لگی۔ اِس عرصے میں اُسے قاری کے متعلق مختلف خبریں ملیں۔ کبھی پتا چلتا وہ حادثے میں مارا گیا ہے، کبھی کہا جاتا اُسے پیسے کے غبن کے سلسلے میں اُٹھا لیا گیا ہے، کبھی اطلاع آتی دُہری پالیسیوں کے سبب اُس کے شراکت داروں نے اُسے غائب کر دیا ہے، کبھی پتا چلتا ایک عرب ملک کی حکومت نے اُسے وہاں پر مقیم ہندوستانی اور پاکستانی کام کرنے والوں کی تربیت کا کام سونپ دیا ہے اور وہ اُنھیں شرک سے پاک سچے مسلمان بنانے میں مصروف ہے۔ یہ بات ایسے بھی تسلیم کی جا سکتی تھی کہ جب سے قاری عبدالحیٔ غائب ہوا تھا، مدرسے میں بہت ترقی ہوئی تھی۔ رحیم اللہ نے شہر کی بہت سی دکانوں کی مارکیٹیں خرید لی تھیں۔ اِس کے

علاوہ مضافات کی زمینوں پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ الغرض دو سال گزرنے کے بعد بھی قاری عبدالحئی کے بارے میں کوئی مصدقہ اطلاع نہیں پہنچی۔ مدرسے اور باقی تمام جائداد پر اُس کے بھائی رحیم اللہ نے معاملات سنبھال لیے اور اُس نے نیامت بی بی سے صاف کہہ دیا کہ اُس کا اور اُس کے بچے کا قاری عبدالحئی کی کسی جائداد سے یا مدرسے سے کوئی واسطہ نہیں ہے کیونکہ مدرسہ اور باقی تمام جائداد اللہ کے کاموں میں وقف ہونے کے سبب اُس کی وراثت کی منتقلی نہیں ہو سکتی۔ اِس عرصے میں نیامت بی بی کو دو سال گزر گئے۔ دو سال بعد عدیلہ نے ایک کمپوڈر کے ساتھ نیامت کو باندھ دیا۔ وہ اُسے لے کر سیالکوٹ کے ایک چھوٹے سے گاؤں کی ڈسپنسری میں چلا گیا اور نیامت کا بیٹا عدیلہ نے اپنے پاس رکھ لیا جو دراصل قاری عبدالحئی کا بیٹا تھا۔ اِدھر زینت کو اُسی ہسپتال کے نرسنگ سکول میں داخل کروا دیا تاکہ اپنے کام کاج اور رزق روٹی کا بندوبست کر لے۔ زینت نے نرسنگ سکول میں پڑھنا شروع کر دیا۔

دن گزرنے لگے مگر عماد کا مسئلہ بگڑتا ہی چلا گیا۔ پہلے تو وہ اپنے نشئی دوستوں کے ساتھ کئی روز تک نکل جاتا تھا پھر واپس آ جاتا اور زبردستی عدیلہ سے پیسے مانگنے لگا۔ عدیلہ پہلے پہل تو اُسے راہِ راست پر لانے کی بھرپور کوشش کرتی رہی۔ علاج کرایا، کئی دِن تک کمرے میں بند کیا، حتیٰ کہ ایک بار تھانے میں قید کروا دیا مگر اُس کی عادتیں ٹھیک نہ ہو سکیں۔ چہرہ کالا ہوتا گیا۔ عدیلہ ماں ہونے کے ناتے زیادہ سختی نہ کرتی تھی۔ احمد دین سارا سارا دن عماد کو ڈھونڈنے میں صرف کرتا۔ اُس کی بدتمیزیاں آئے دن زیادہ ہونے لگیں۔ اب نشے کے لیے زبردستی پیسے لینے لگا۔ کبھی زینت کو مارتا، کبھی عدیلہ کے گلے پڑتا اور کبھی گھر کی چیزیں بیچ دیتا۔ عدیلہ پہلے سے زیادہ تنگ ہو گئی۔ اِن سب سے بڑھ کر عماد نے اب ایک اور کام شروع کر دیا تھا کہ شہر کے کن ٹٹوں کو بلا کر گھر لے آتا۔ اُن سے بچنے کے لیے عدیلہ نے یہ کام کیا کہ ہسپتال میں اول زینت کو ساتھ لے کر جاتی اور اُسے ہدایت ہوتی کہ جب تک اُس کی ڈیوٹی ختم نہ ہو گی وہ اُس کے ساتھ ہی رہے گی۔

اگلے چار سال تک یہ معاملہ اِسی طرح چلتا رہا۔ عماد نے ہر وہ لچھن اختیار کر لیا جو کسی بھی طرح عدیلہ اور اُس کی بیٹیوں کے لیے زہر تھا۔ پھر ایک دن ایک عجیب واقعہ ہوا۔ عدیلہ رات کی ڈیوٹی پر تھی۔ گھر میں زینت بھانجے معیذ کے ساتھ لیٹی ہوئی تھی۔ احمد دین بھی گھر میں موجود تھا۔ عماد ایک کن ٹٹے کے ساتھ گھر میں چلا آیا۔ اُس نے آتے ہی باہر سے احمد دین کے کمرے کو کنڈی چڑھا دی اور اُس کے بعد کن ٹٹے کے ساتھ زینت کے کمرے میں داخل ہونے لگا۔ زینت نے کمرے کے اندر سے کنڈی

لگائی ہوئی تھی۔ وہ ابھی جاگ رہی تھی اور آہٹ سُن کر ہُشیار ہو چکی تھی۔ عماد نے زینت کو آواز دی کہ کمرہ کھولے مگر عدیلہ نے اُسے سمجھا رکھا تھا جب اکیلی ہو کمرہ مت کھولے چاہے عماد کتنا ہی مصیبت میں کیوں نہ ہو۔ نشے کی علت خون کی غیرت کو بیچ دیتی ہے۔ کئی آوازیں دینے کے بعد بھی کمرہ نہیں کھلا تو عماد اور اُس کن ٹٹے نے کمرے کا دروازہ توڑنے کی کوشش شروع کر دی۔ زینت نے یہ حالت دیکھی تو چیخیں مارنے لگی اور ڈاکو ڈاکو کا شور مچا دیا۔ احمد دین نے دروازہ کھولنا چاہا تو پتا چلا اُس کا دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا ہے۔ وہ اندر سے اپنے دروازے کو توڑنے لگا مگر دروازے آسانی سے ٹوٹنے والے نہ تھے لیکن زینت کے شور سے اتنا ہوا کہ محلے والے جاگ اُٹھے۔ اُنہوں نے گھر کا گھیرا ڈال لیا مگر اِس سے پہلے کن ٹٹا بھاگ گیا اور عماد پکڑا گیا۔ لوگوں نے احمد دین کے کمرے کی کنڈی کھولی اور ایک آدمی عدیلہ کو جا کر بلا لایا۔ لوگوں نے عدیلہ کو مشورہ دیا وہ عماد کے شر سے بچنے کے لیے اُسے جیل بھجوا دے اور ہمیشہ کے لیے نچنت ہو جائے مگر عدیلہ عماد کو ایک بار تھانے بھجوا کر دیکھ چکی تھی۔ اِس میں عماد سے زیادہ وہ خود اذیت کا شکار ہوئی تھی۔

عدیلہ نے وہ رات انتہائی اذیت میں بسر کی اور تمام رات روتی رہی۔ اول تو ایک عرصے سے عدیلہ نے عماد کو کہنا سننا چھوڑ دیا تھا۔ وہ کتنا اِس کے بارے میں رنج زدہ تھی، یہ بات اُس سے جاننے کی ضرورت نہیں۔ اُدھر عماد ایک طرف اپنی ماں اور بہن کے لیے عذاب تھا دوسری طرف وہی اُن کے لیے اہم بھی تھا۔ عدیلہ جانتی تھی کہ اب وہ مکمل لاعلاج ہو چکا ہے، اُس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رہی اور وہ کوئی بھی گھناؤنا قدم اُٹھا سکتا ہے۔ عماد کو احمد دین والے کمرے میں بند کر کے تالا لگا دیا تھا۔ وہ اندر بیٹھا گالیاں دیتا رہا اور ساری رات روتا رہا مگر کسی نے اُس کا کمرہ نہ کھولا۔ عدیلہ صبح ہونے کے انتظار میں رہی جو اُفق کی طرح اُس سے دور ہو چکی تھی۔ اگلے دن ہسپتال ڈیوٹی پر جانے کی بجائے سیدھی ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر کے دفتر چلی گئی اور اُسے اپنی تمام مصیبت بیان کرنے کے بعد کہا کہ ہو سکے تو آج ہی اُس کا تبادلہ کر دیا جائے۔ ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر نے اُسی وقت اُس کے تبادلے کے آرڈر جاری کر دیے۔ عدیلہ جلدی سے گھر آئی، اُس نے عماد کا کمرہ کھولا، وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں لیٹا ہوا تھا۔ عدیلہ نے اُسے اُٹھا کر پہلے منہ ہاتھ دُھلایا، ناشتا دیا، اُس کے بعد اُس کی جیب میں ایک ایک روپے کے سو نوٹ ڈال دیے۔ اتنے سارے پیسے دیکھ کر عماد کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ پیسے لیتے ہی گھر سے باہر نکل گیا۔ عدیلہ کو پتا تھا جب تک اُس کے پیسے ختم نہیں ہوں گے وہ گھر نہیں آئے گا۔ تب عدیلہ

نے احمد دین سے کہا، احمد دین جلدی جا کر ایک ٹرک لے آ۔ شاید یہ عماد کی اور ہماری آخری ملاقات ہے۔ احمد دین کے آنسو جاری تھے۔ شام سے پہلے تمام سامان ٹرک پر لد چکا تھا اور آج عدیلہ اپنے اُس بیٹے سے فرار ہو رہی تھی جس کی قربان گاہ پر اُس نے دو بیٹیاں چڑھا دی تھیں۔ وہ جانتی تھی جب تک عماد کے پاس ایک روپیہ بھی باقی ہے وہ واپس نہیں آئے گا۔ اِس عرصے میں وہ اُس سے کہیں دُور نکل جانا چاہتی تھی۔ اُس نے محلے کے کسی بھی فرد کو نہیں بتایا تھا کہ اُس کا تبادلہ کہاں ہوا ہے حتیٰ کہ اپنی تینوں بیٹیوں تک کو بے خبر رکھا اور ہیلتھ آفیسر سے التجا کی کہ وہ اُس کے بیٹے عماد کو ہرگز اُس کے نئے مکان کا پتا نہ بتائیں۔ ہیلتھ آفیسر نے عدیلہ کی فائل پر کانفیڈنشل فائل لکھ کر الگ رکھ دی، تاکہ انتظامیہ کے ہاتھ نہ لگے۔ یہ گاؤں منٹگمری کی ایک تحصیل کا چک تھا جو انگریز دَور میں ماڈل ویلیج تھا مگر گاؤں والوں نے اس کے مرکز میں ایک کھنڈر نما گردوارہ چوک کی نسبت سے خود ہی اس کا نام ڈھول چوک رکھ دیا تھا۔ اپنی بیٹی زینت، خاوند احمد دین اور نواسے معیذ کے ساتھ وہ ہمارے گاؤں ڈھول چوک میں آ گئی۔

(۱۳)

ہمارے گھر اور ڈسپنسری کے درمیان صرف ایک سڑک تھی جسے مَیں دن میں کئی بار عبور کرتا تھا۔ ڈسپنسری کے صحن میں بہت زیادہ درخت اور چھاؤں اپنی جگہ لیکن اب مجھے یہ جگہ زینت کے سبب اچھی لگتی تھی جس سے میری طبیعت میں شادابی آ گئی تھی۔ ہمارے گاؤں میں یہ واحد جگہ تھی جو اِس طرح کا باغیچہ بنی ہوئی تھی کہ پھل سے لے کر پھول اور سایے سے لے کر سبزیوں تک سب کچھ میسر تھا۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔ میرے لیے اب تین جگہوں کی ایک تکون مقرر ہو گئی تھی۔ گھر سے ڈسپنسری کا صحن، وہاں سے عدیلہ کا گھر اور زینت کی زیارت۔ یہ تکون اتنی ہمہ جہت اور بھرپور تھی کہ زندگی اگر اِسی کا نام تھی تو بہت خوبصورت تھی۔ دماغ اور دل اگر کسی ایک جگہ اکٹھے کام کر رہے تھے تو شاید وہ یہی تکون تھی اور یہ تکون دو سال یونہی جاری رہی۔

پھر ایک دن اچانک اِس باغیچے میں ایک یبوست طاری ہو گئی۔ باغیچے میں یہ نحوست زدہ گھڑی کیوں آئی؟ اُس کی ذمہ داری عدیلہ پر ہی تھی۔ اب مَیں اُس نحوست کے سبب یہاں آنے سے جھجکنے لگا تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ عدیلہ کچھ دن پہلے کہیں سے ایک مُردہ یا اُسے بھوت کہہ لیں، اُٹھا لائی تھی اور اُس کی چارپائی اِس صحن میں لا کر رکھ دی۔ صبح شام ایک مردہ ڈھانچا جامنوں کے سائے میں پڑا رہتا تھا۔ ایک چارپائی جس پر سفید چادر رکھی ہوتی تھی۔ اُس کے اُوپر بیٹھا یہ کالی دنیا کا بھوت نہایت کریہہ لگتا تھا۔ اِس کا بدہیئت اور کالا بھجنگ چہرہ مجھے خوف میں مبتلا کر دیتا اور مَیں سوچتا، یہ ایک بھوت ہے یا جن ہے جو بچوں کو کھا جاتا ہے۔ مجھے اِس بات کا بھی یقین ہو گیا تھا کہ یہ بھوت عدیلہ کے گھر میں اِس لیے رہتا ہے

کیونکہ اِسے اُس کی بیٹی پسند آ گئی ہے۔ یہ خیال آتے ہی مجھے زینی پر ترس آتا۔ وہ بچاری اِس بھوت کے شکنجے میں جکڑی ہوئی تھی۔ میں اکثر سوچتا عدیلہ اُسی کی ستائی ہوئی ہے۔ وہ اِن کا گھر نہیں چھوڑتا اور میری ماں اِسی کی وجہ سے اُس کو دلاسے دیتی ہے۔ اُس وقت مجھے اپنے کم سن ہونے پر شدید غصہ آتا۔ اگر مَیں بڑا ہوتا تو ضرور اِسے مار کر بھگا دیتا۔ اِس خیال میں بعض اوقات مَیں دیکھتا کہ بھوت زینی کو چمٹا ہوا ہے اور اپنے ناخنوں اور گندے دانتوں سے اُس کا جسم نوچ رہا ہے۔ زینی اُس سے جان چھڑانے کی کوشش کر رہی ہے لیکن وہ اُس سے جدا نہیں ہو رہا۔ کبھی کبھی اِس خواب کے نتیجے میں مَیں چیخیں مار کر اُٹھ بیٹھتا۔ مَیں نہیں جانتا تھا یہ لوگ کون تھے لیکن اب بھی مجھے پختہ یقین ہے کہ یہی وہ لوگ تھے جن سے مجھے نفرت بھی تھی اور محبت بھی۔ مَیں اِس گھر میں اُس بھوت کی وجہ سے داخل ہونے سے ڈرتا تھا اور زینی کی وجہ سے اُس کے در و دیوار دیکھنے سے مجھے راحت ملتی تھی۔ مجھے اُن کے گھر کے برتنوں اور دوسری اشیا سے شدید نفرت تھی اور زینی کے لباس کی خوشبو میری جان کے لیے روح تھی۔ شاید آپ اِس بات پر ہنسیں مگر یہ حقیقت ہے، یہی وہ گھر تھا جس نے مجھے دس سال کی عمر میں ہی محبت جیسی لطافت سے روشناس کرا دیا تھا اور عشق جیسی اذیت میں پھینک دیا۔ اُنھیں ہمارے پڑوس میں آئے دو سال ہو چکے تھے مگر یہ دو سال صدیوں جیسی قرابت میں گزارے گئے دن محسوس ہوتے تھے۔ اب مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا یہی بھوت عدیلہ کا بیٹا عماد ہے۔

عدیلہ کی دوسری بیٹیاں کہاں تھیں اِس بارے میں عدیلہ نے کبھی بات نہیں کی۔ شاید اُسے خود بھی اُن کے بارے میں زیادہ معلوم نہیں تھا۔ جب عدیلہ ہمارے گاؤں میں آئی تھی، عماد نے دو سال بعد اپنی ماں کو ڈھونڈ لیا تھا لیکن اِس حال میں کہ اب اُس کے پاس جینے کے لیے زیادہ وقت نہیں رہا تھا۔ اُسے عدیلہ کے بارے میں کہاں سے خبر ہوئی، یہ مَیں نہیں جانتا۔ البتہ مَیں کافی عرصہ ماننے کے لیے تیار نہ ہوا کہ ایک بھوت عدیلہ کا بیٹا کیسے ہو سکتا ہے اور زینی کا بھائی اتنا گندا کیوں کر ہو گیا مگر اب اِس سے انکار کی کوئی وجہ نہیں رہی تھی۔ وہ زینی کا بھائی تھا اور عدیلہ کا بیٹا ہی تھا۔ پھر کچھ ہی دنوں بعد اُس نے میری آنکھوں میں مانوسیت کی جگہ بنا لی۔ یہ مانوسیت اُس کہانی کے سبب بنی جسے سننے کے بعد میری ماں کی عدیلہ پر نوازشیں پہلے سے دوگنا ہو گئی تھیں۔ اِس کے سبب مجھے کچھ ٹھہراؤ ہوا اور مَیں نے اِس فضا میں اُس کا وجود تسلیم کر لیا۔ مجھے نہیں پتا تھا وہ نشہ کس وقت کرتا تھا (اُس وقت نشے کا واحد تصور میری نظر میں شراب نوشی تھا) اور کھانا کب کھاتا تھا۔ مَیں تو فقط اُسے ایک ڈھانچا سمجھتا تھا، جس کے اوپر بوسیدہ

اور کالی ربڑ چپکا دی گئی ہو۔ یہ کالی اور بھدی ربڑ کئی جگہوں سے سوجنے کے باعث اتنی تڑی مڑی اور بے ڈھنگی ہو گئی تھی کہ اُسے چھونے سے بھی زخمی ہونے کا ڈر تھا۔

ڈسپنسری میں ڈاکٹر بالکل نہیں تھا لیکن عدیلہ کا رویہ ایسا تھا کہ اُس نے بلاشبہ ڈاکٹر کی جگہ لے لی تھی۔ وہ صبح کے وقت اپنا نرس کا لباس پہن کر ڈسپنسری میں آ جاتی۔ یہ وقت صبح آٹھ بجے کا ہوتا تھا۔ دوپہر تک مریضوں کو دیکھتی اور اُن کی دوا دارو میں مصروف رہتی۔ اُس کے آنے کے بعد اُسی طرح مریضوں کی گہما گہمی شروع ہو گئی جیسی پہلے تھی۔ ہلکے نیلے رنگ کی اُس کی وردی تھی اور تمام دن اُسی وردی میں رہتی۔ سر پر سفید رنگ کا دوپٹہ تھا۔ یہ دوپٹہ ایسا سفید باریک اور دُھلا ہوا تھا کہ دیکھنے میں بادل کا ٹکڑا معلوم ہوتا تھا۔ اگرچہ اُس کا گھر ڈسپنسری کے اندر ہی ایک طرف تھا جس کا فاصلہ مشکل سے پچاس قدم نہیں تھا مگر وہ دوپہر ایک بجے سے ایک منٹ پہلے بھی اپنے گھر میں داخل نہ ہوتی۔ اُس کے بیٹے کی چارپائی اُس بڑے امرود کے سائے میں پڑی رہتی جس سے کبھی ہم امرود توڑا کرتے تھے۔ یہ امرود کا درخت اتنا ہی اونچا اور بڑا تھا جتنے اونچے یہاں آم اور جامن کے پیڑ تھے۔ اب اِسی صحن میں شام تک اُن مریضوں کی چار پانچ چارپائیاں بچھی رہتیں جنھیں ڈسپنسری میں داخل کر لیا جاتا تھا۔ عدیلہ ایک ماہر ڈاکٹر کی طرح اُن کی دیکھ بھال کرتی۔ مَیں نے دیکھا جب کوئی مریض دو چار دن وہاں داخل رہتا اور اُس کے بعد صحت مند ہو کر گھر جانے لگتا تو وہ عدیلہ کو کچھ نہ کچھ دس بیس روپے انعام کے بھی دیتا تھا۔ عدیلہ وہ پیسے لے کر چپکے سے جیب میں ڈال لیتی اور اُسی طرح اپنے کام میں مصروف ہو جاتی جیسے یہ اُس کا فرض ہو۔ اِسی عالم میں اپنے بیٹے کو بھی دیکھتی رہتی۔ آنے جانے والے مریضوں کے لیے عماد ایک عبرت کی طرح لیٹا ہوتا تھا۔ مجھے بعد میں پتا چلا وہ اب یہاں سے کسی بھی طرف کیوں نہیں جاتا۔ اول وہ چارپائی سے اُٹھنے کے قابل نہیں رہا تھا دوسری وجہ یہ تھی کہ عدیلہ بیٹے کو اپنے ہاتھ سے نشے کے ٹیکے لگا دیتی تھی۔ وہ چاہتی تھی اگر اُس کا بیٹا مرے بھی تو اُس کی آنکھوں کے سامنے مر جائے۔ یہ ایک ایسی بات تھی جس کا احساس مجھے نہیں تھا۔ اُس کی چارپائی پر ایک سفید سوتی کپڑا بچھا ہوتا اور سفید ہی رنگ کا تکیہ ہوتا تھا۔

ایک دن مَیں اُس کے سامنے سے گزرا تو اُس نے اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ مَیں ڈر کر بھاگا اور دُور جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ میرے اِس رویے سے ہلکا سا مسکرایا اور دوبارہ چارپائی پر لیٹ گیا۔ عدیلہ یہ سب دیکھ رہی تھی۔ اُس نے مجھے دیکھا کہ مَیں اُس سے ڈر کر ذرا پیچھے ہٹ گیا ہوں تو میرے

پاس آئی اور کہنے لگی، بیٹا کوئی بات نہیں، آپ کو کچھ نہیں کہے گا، اِس کے پاس چلے جاؤ۔ یہ کہتے ہوئے اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی بہہ کر زمین پر آ پڑی۔ پہلے تو مَیں نے عدیلہ کی بات کا اثر نہ لیا اور وہیں جما کھڑا رہا مگر تھوڑی دیر بعد محتاط انداز سے قدم اُٹھاتا ہوا قریب ہو گیا لیکن بالکل چارپائی کے پاس نہیں گیا۔

قریب کیوں نہیں آتے ہو، ڈرتے ہو، اُس نے مسکرا کر کہا۔ مسکراتے ہوئے اُس کی آنکھیں مزید باہر نکل آئیں اور میرے وجود میں گھس گئیں جیسے کوئی چھرا گھونپ دے۔ مَیں اُس کی وحشت ناک آنکھوں کی تاب نہیں لا سکا جن میں سیاہی اور میلی دھند بھری ہوئی تھی۔ آنکھوں کے حلقوں میں اتنے گڑھے پڑ گئے تھے کہ اُن میں مرغی بیٹھ کر انڈا دے سکتی تھی۔ مجھے اُس وقت دیوار کے طاق میں بیٹھی مرغی یاد آ گئی۔

اِدھر میرے قریب تو آؤ یار ڈرتے کیوں ہو؟ وہ دوبارہ بولا۔

تم مجھے نشہ پلا دو گے، مَیں نے اِس بار اپنا آدھا ڈر اُسے بتایا۔ شاید مَیں یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ مجھے تمھاری شکل سے وحشت ہوتی ہے۔

میرے اِس آدھے سچ پر وہ ایک بار پھر مسکرا دیا اور بولا ''بھلا ایسے زبردستی کوئی نشہ پلا سکتا ہے۔ مجھے معلوم ہے تم کبھی نشہ نہیں کر سکو گے۔ یہ اتنی آسان بات نہیں ہے۔''

مَیں اُس کی بات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اِس لیے اپنی بات پر اصرار کرنے لگا اور کہا، جب تم خود کرتے ہو تو مجھے زبردستی کرا دو گے۔

ہوں، وہ ذرا سا تلخ طنز کے ساتھ بولا، اِس وقت تو مَیں ایک چوہے کے ساتھ بھی زبردستی نہیں کر سکتا۔ اپنی چارپائی پر میری ٹانگیں خود سیدھا کرنا اور اکٹھا کرنا میرے بس میں نہیں، تم سے کیسے زبردستی کر لوں گا۔ تم شکر کرو، تمھارے والد سوچنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ وہ تمھیں ڈانٹ بھی سکتے ہیں اور تم اپنی ماں سے بھی ڈرتے ہو۔ نہ میرا باپ تمھارے باپ کی طرح ہے، نہ تمھاری ماں درد کی ماری ہوئی ہے۔

مجھے اُس کی باتیں سمجھ نہیں آ رہی تھیں لیکن وہیں کھڑا رہا۔ میرا منہ اُن کے کوارٹر کی طرف تھا جہاں سے گاہے گاہے زینی نکل کر کبھی اُسے روٹی دے جاتی، کبھی چائے پکڑا جاتی اور کبھی ویسے ہی آ کر باتیں شروع کر دیتی تھی۔ مجھے نہیں معلوم اُس کی ماں اُس کا علاج بھی کرتی تھی یا صرف نشے کے ٹیکے لگاتی تھی۔ اُس کے بازو اور ہاتھوں کی اُنگلیوں کا ماس اِتنا سکڑ گیا تھا کہ اب اُن میں ٹیکا لگانا بہت مشکل ہو گیا تھا مگر اُس کی ماں کہیں سے اُس میں سے ناڑ ڈھونڈ لیتی تھی۔ اُن کالے سیاہ ہاتھوں اور بازوؤں

میں اب کوئی جگہ ایسی نہیں بچی تھی جہاں وہ ٹیکا لگا سکتی۔ مَیں نے دیکھا وہ کبھی اُس کے چوتڑوں سے کوئی ناڑ تلاش کر لیتی اور کبھی گردن سے۔

مجھے اُس سے کچھ غرض بھی نہیں تھی۔ مَیں تو بس یہ جانتا تھا کہ مَیں جب زینی کو دیکھتا جسم میں انگارے بھر جاتے۔ مَیں نے معیذ کو اپنا دوست بنا لیا تھا۔ یہ مجھ سے ایک سال چھوٹا ہی تھا۔ اِس کے گلے میں جب دیکھو، ایک شرٹ ہوتی تھی جس کے بازو کبھی بالکل نہیں ہوتے تھے اور کبھی آدھے بازو ہوتے۔ نیچے کبھی شلوار یا پاجامہ نہیں پہنتا تھا۔ ایک چھوٹا سا کچھا ہوتا۔ اُس کا رنگ اکثر خاکی ہوتا تھا اور شرٹ کا رنگ بدلتا رہتا تھا۔ صرف سکول جاتے وقت شلوار قمیص پہنتا تھا۔ ہماری سکول کی وردی کالے رنگ کے ملیشیے کی ہوتی تھی اور شلوار قمیص ہی ہوتی تھی۔ قمیص کے دونوں کاندھوں پر دو نیلے رنگ کے بینر لگے ہوتے۔ ایک بینر تمغا سامنے والی جیب کے پاس لگا ہوتا تھا جس پر سکول کا نام اور پتا درج تھا۔ معیذ مجھ سے دو جماعتیں پیچھے تھا۔ وہ یہ وردی آتے ہی اُتار پھینکتا اور وہی نیکر اور شرٹ پہن کر باہر نکلتا۔ ہمارے ساتھ ہاکی اور دوسرے کھیل کھیلنے لگتا۔ زینی اِس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ بالوں کو کنگھی کرتی، آنکھوں میں سُرمہ ڈالتی اور پورے جسم پر خوشبودار پاؤڈر چھڑک کر اِسے باہر آنے دیتی۔ کئی بار جب ہم کھیلتے ہوئے اُونچی آواز میں بولتے تو زینی بھاگ کر باہر نکل آتی۔ مَیں اِس کو بھانپ کر خود کئی بار جان بوجھ کر چیخ پڑتا تھا تا کہ وہ باہر نکل آئے اور وہ نکل آتی تھی۔ دن کے ایک بجے کے قریب زینی کھانا لے کر باہر نکلتی اور عماد کی چارپائی پر آ بیٹھتی۔ اُس کی رالیں صاف کرتی، منہ دُھلاتی، پھر کھانا کھلانا شروع کر دیتی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اُس کا لباس بھی تبدیل کر دیتی۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت کراہت آتی اور ہرگز پسند نہیں کرتا تھا زینی اپنے صاف ستھرے اور سونے جیسے ہاتھوں کو اُس کے گندے منہ اور جسم کے ساتھ لگائے۔ اِس طرح اُس کے خود بیمار ہونے کا خطرہ تھا۔ اگر خدانخواستہ زینی بیمار ہو گئی تو یہ کیسی لگے گی۔ کیا اس کی شکل بھی عماد بھوت جیسے ہو جائے گی؟ یہ سوچ کر ہی مجھے ایک دم وحشت ہو جاتی۔ مَیں دیکھتا تھا زینی کھانا کھلانے کے بعد عماد کے منہ ہاتھ پانی سے خود صاف کرتی۔ پھر اکثر صبح دس گیارہ بجے کے وقت جب ہم سکول میں گئے ہوتے، وہ تیل سے اُس کی کالی اور بھدی ٹانگوں پر مالش شروع کر دیتی۔ مَیں اِس عمل کو سکول میں چھٹی کے دن اکثر دیکھتا تھا اور کسی طرح روک دینا چاہتا تھا مگر نہیں روک سکتا تھا۔ میرا احساس یہی تھا کہ ایک دن اِس کی بیماری زینی کو لگ جائے گی مگر یہ باز نہیں آتی اور مسلسل اُس کے ساتھ چپکی رہتی ہے۔ یہ بات مجھے ہراساں کر دیتی تھی۔ مَیں رات کے وقت خواب دیکھتا کہ زینی کی

شکل عماد سے مل گئی ہے اور وہ اِسی طرح چارپائی پر پڑی ہے جیسے عماد کا بھوت پڑا ہے۔ زینی کا رنگ آہستہ آہستہ بدل رہا ہے، پھر شکل بدلنے لگتی ہے۔ اُس کے بعد اُس کی آنکھیں اور آنکھوں میں پڑے حلقے گہرے اور کالے ہوتے جاتے ہیں۔ پھر وہ ایک دم مجھ پر جھپٹ پڑتی ہے۔ اُسی وقت مَیں یہ خواب دیکھ کر چیخ مار کے اُٹھ بیٹھتا۔ میری ماں بھاگتی ہوئی میرے پاس آتی۔ ابا بھی اپنی چارپائی سے اُٹھ کر قریب آ جاتا۔ یہ خواب اکثر مجھے گھیر لیتا تھا اور مَیں ڈرتے ہوئے اکثر چیخیں مارنے لگتا۔ میری والدہ نے بہت دفعہ دَم کیا۔ دادی نے درود شریف اور آیتیں پڑھ کر پھونکیں ماریں۔ اُنھیں سمجھ نہیں آ رہی تھی، چند دِنوں سے اِس لڑکے کو کیا ہو گیا ہے۔ ابا کہیں سے ایک تعویذ لے کر آ گئے۔ اُنھوں نے بتایا یہ تعویذ پہن لو، مولا کی ضریح سے مَس ہو کر آیا ہے۔ مَیں نہیں جانتا تھا، اُن دِنوں کون کربلا گیا تھا۔ ہمارے گاؤں میں دُور دُور تک کوئی ایسا نہیں تھا جو کربلا جاتا۔ مکہ اور مدینہ جانے کا تصور تب ہر ایک کو تھا مگر کربلا کے بارے میں کوئی تصور موجود نہیں تھا۔ میرے ابا کی اتنی استطاعت نہیں تھی کہ وہ خود وہاں پہنچتے۔ پھر یہ تعویذ کون لا سکتا تھا؟ یہ چاندی میں مڑھا ہوا تعویذ میرے گلے میں آ گیا مگر میرا ڈر نہیں جاتا تھا۔ پھر ایک دن میرے ابا مجھے شہر لے گئے۔

شہر ہمارے گاؤں سے کچھ فاصلے پر تھا۔ ہم تانگے پر بیٹھ کر گئے تھے۔ مَیں شہر میں پہلی بار گیا تھا۔ ہر شے نئی نئی اور چمکتی ہوئی تھی۔ تانگہ ایک بڑے جی ٹی روڈ کو عبور کر کے پھاٹک نمبر دو سے شہر میں داخل ہوا۔ پھاٹک سے آگے ہوتے ہی ہم جس سڑک پر چڑھے اُس کے دونوں طرف نیم کے بے شمار درخت قطاروں میں لگے تھے اور اُن کے نیچے دکانیں ہی دکانیں تھیں۔ کسی دکان پر بکریوں کی سنگلیاں پڑی ہوئی تھیں، کہیں دکان کے باہر لکڑی کی بنی ہوئی ڈوئیاں اور توے رکھے تھے، کہیں پکی ہوئی مٹی کی ہانڈیاں نظر آ رہی تھیں۔ کچھ دکانیں چھوٹی تھیں اور کچھ بڑی تھیں۔ یہاں لوگ بھی بہت پھر رہے تھے۔ کوئی تانگے پر جا رہا تھا، کوئی پیدل چلا جاتا تھا۔ کچھ سائیکل پر تھے۔ مجھے اب پتا چلا تھا شہر کیا چیز ہوتی ہے۔ یہ تو بہت بڑا تھا۔ ہمارے گاؤں سے کتنا ہی بڑا تھا۔ کئی دکانوں پر مجھے مٹی کے کھلونے بھی نظر آئے۔ یہ کھلونے میرے چھوٹے بھائی کے کام آ سکتے تھے۔ تانگہ چلتا جا رہا تھا اور میری آنکھیں نیم کی چھاؤں میں دو طرفہ دکانوں پر پھیریاں بھرتی جا رہی تھیں۔ ایک دکان پر حقے کی چلمیں اور توے پڑے تھے۔ مَیں حیران تھا، اِس شہر میں تو ہر شے کی دکان تھی۔ اِسی لیے جو بھی کوئی شے خریدنا چاہتا تھا، وہ شہر کا نام لیتا تھا۔ میرے اپنے کپڑے جو ایک سال پہلے لیے تھے، وہ جوتے جنھیں اب کئی بار

تانگے لگ چکے تھے، وہ بھی ابا شہر سے لے کر گئے مگر ابھی تک مجھے یہاں کپڑوں اور جوتوں کی دکانیں نظر نہیں آئی تھیں اور میں بار بار ابا سے کپڑوں اور جوتوں کی دُکانوں کی بابت پوچھ رہا تھا۔ تانگہ اللہ جانے اب کہاں جانا چاہتا تھا۔ مَیں نے ابا سے کہا، ابا اگر شہر آ گیا ہے تو تانگہ رُکتا کیوں نہیں۔ اُنھوں نے کہا، بیٹا تانگہ اپنے اڈے پر جا کر رُکے گا اور اڈہ ابھی آگے ہے۔ تھوڑی دیر میں تانگہ ایک اور چوک پر آ گیا۔ کوچوان نے وہاں تانگہ روک کر کہا، سرور سوڈا چوک کون اُترے گا؟ یہ چوک بھی کافی کھلا تھا اور دو بڑے بڑے پیپل کے درختوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ اِسے سرور سوڈا چوک کہتے تھے۔ کونے پر ایک مٹھائی کی دکان تھی۔ مٹھائی شیشوں میں لگی کتنی اچھی لگ رہی تھی مگر مَیں نے سوچا یہ بہت مہنگی ہوگی اور بڑے بڑے امیر لوگ جو شہروں میں رہتے ہیں وہی کھاتے ہوں گے۔ میرے ابا کے پاس تو پیسے ہی نہیں ہوں گے ورنہ وہ لے کر دے دیتے۔ دو آدمی تانگے سے وہاں اُتر گئے۔ مَیں نے سامنے والی سڑک کے بارے میں پوچھا، ابا یہ سڑک کہاں جاتی ہے؟ یہ کتنی خوبصورت اور سولنگ لگی ہوئی پکی سڑک ہے۔ بیٹا اِسے چرچ روڈ کہتے ہیں۔ مَیں ہر ایک روڈ اور ایک ایک چیز کو بڑے شوق سے دیکھ رہا تھا۔ ہمارا تانگہ دو سواریاں اُتارنے کے بعد بائیں طرف والی سڑک پر مُڑ گیا۔ اِس سڑک پر پہلے سے بھی زیادہ ہجوم تھا اور دکانوں کی بھرمار تھی۔ مجھے حیرانی ہوئی دنیا کتنی بڑی اور خوبصورت ہے۔ ہم ایسے ہی گاؤں میں رہتے ہیں۔ وہاں تو لوگ ہی بہت تھوڑے ہیں۔ اِس خیال کے فوراً ہی بعد مَیں نے اپنے آپ پر ملامت کی۔ گاؤں میں زینی بھی تو ہے۔ شہر میں تو کوئی زینی نہیں۔ ہم گاؤں میں ہی اچھے ہیں۔ ایک جگہ تانگہ رُکا۔ یہ ایک لال رنگ کی بڑی سی عمارت تھی۔ اِس کے صحن میں کافی ساری سائیکلیں بھی کھڑی تھیں۔ ابا نے بتایا، بیٹا یہ ڈاک گھر ہے۔ یہاں سے دُور دُور شہروں اور ملکوں میں خط جاتے ہیں۔ مَیں نے پوچھا، ابا خط لکھتا کون ہے؟ خط منشی لکھتے ہیں۔ یہ جتنی سائیکلیں یہاں کھڑی ہیں، سب ڈاک پھیروں کی ہیں۔ اِن ڈاک پھیروں کو ڈاکیا کہتے ہیں۔ تانگہ چوڑی اور چھاؤں بھری سڑک پر چلتا ہوا آخر کار ایک جگہ رُک گیا۔ یہ تانگوں والا اڈہ تھا۔ تمام اڈے پر چھت تھی اور نیچے پندرہ سولہ تانگے کھڑے ہوئے تھے۔ گھوڑے لوسرن کھا رہے تھے۔ کئی تانگوں پر سواریاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ کچھ انتظار کر رہے تھے۔ ایک دو تانگے اڈے سے نکل رہے تھے۔ میرے ابا نے تانگے والے کو چند سکے تھمائے اور میری اُنگلی تھام کر چل پڑا۔ مَیں نے دیکھا سامنے قلفیوں والی دکانیں تھیں۔ ایک جگہ فالودے والی ریڑھی کھڑی تھی۔ ایک ایک چیز کو دیکھ کر میرے منہ میں پانی بھر آتا تھا۔ ایک جگہ ایک ریڑھی پر گولے

بنانے والا گولے بنا کر دے رہا تھا۔ یہ لال پیلے اور ہرے رنگ کے گولے کتنے مزے کے اور خوبصورت لگ رہے تھے۔ دو تین لڑکے اُس سے گولا لے کر چوسنے میں مگن تھے۔ مَیں فقط حسرتوں کی خریداری میں لگا ہوا تھا۔ میرے قدم رُک رُک جاتے تھے اور میرے ابا میری اُنگلی پکڑے ایک طرز تیز قدموں سے چلے جاتے تھے۔ ابا یہاں سے گول چوک بازار میں آئے۔ یہ سب کچھ پہلوں سے بڑھ کر خوبصورت اور پر رونق تھا۔ گول چوک سے واپس مُڑ کر وہ کچہری بازار میں آ گئے۔ یہاں ایک مچھلی چوک آتا تھا۔ یہاں مچھلی وغیرہ بالکل نہیں تھی۔ سردیوں میں ہوتی ہوگی۔ ابھی تو نیم اور پیپل کے پیڑوں کی بھر بھری چھاؤں میں ٹھپے بنانے والوں، جوتے والوں، کپڑے والوں اور بچوں کی سائیکلوں والوں کی دکانیں تھیں۔ ایک ریڑھی پکوڑوں اور جلیبیوں کی لگی تھی۔ ابا یہاں سے بھی آگے نکل گئے اور ایک مطب کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ یہ جگہ مجھے ایک افسانوی لگی۔ میری دادی اماں مجھے جن پریوں کی کہانیاں سناتی تھی۔ بالکل اُسی طرح کے مکانوں اور درختوں کے بیچ کسی حکیم کا مطب تھا۔ ابا مجھے لیے ہوئے مطب میں چلے گئے۔ سامنے ایک آدمی، سیاہ رنگ داڑھی اور سُرخ و سفید چہرے والا بیٹھا تھا۔ اُس کے آس پاس تین چار اور لوگ بھی چوکیوں پر موجود تھے۔ وہ آدمی ہمیں دیکھتے ہی اُٹھا اور ابا کو سلام کا جواب دے کر بیٹھنے کے لیے کہا۔ مجھے ایسے لگا یہ آدمی ابا کا دوست ہے اور پہلے بھی ایک دوسرے کو ملے ہیں۔ ابا اُسے کبھی حاجی فطرس علی اور کبھی حکیم صاحب کے نام سے مخاطب کرتے۔ حکیم صاحب سفید رنگ کے چٹے گورے آدمی تھے، شیروانی پہن رکھی تھی۔ چھوٹی چھوٹی سفید داڑھی تھی اور سر پر دوپلی ٹوپی جما رکھی تھی۔ اُنھوں نے اپنے ایک شاگرد کو آنکھوں سے اشارہ کیا۔ شاگرد نے گلابی اور پیلے رنگ کو ملا کر دو شربت کے گلاس تیار کیے، ایک مجھے اور ایک میرے ابا کو دے دیا۔ مَیں نے جیسے ہی شربت منہ سے لگایا دنیا کا عجیب مزا پایا۔ ایسا خوش ذائقہ شربت تو مَیں نے پوری زندگی نہیں پیا تھا۔ مجھے بے پناہ لطف آیا۔ اُس کے بعد ابا نے حکیم صاحب کو میرے خواب اور سوئے ہوئے ڈرنے کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ حکیم صاحب نے میرا بازو پکڑ کر نبض دیکھنا شروع کی۔ کافی دیر دیکھتے رہنے کے بعد مجھ سے سوالات کرنے لگے، مَیں نے اُنھیں بتانا شروع کر دیا۔ اُس میں ایک بار میری زبان سے عماد بھوت کا ذکر بھی آ گیا۔ حکیم صاحب نے مجھے وہیں روک دیا اور ابا سے کہنے لگے۔ آئندہ لڑکا ڈراؤنے خواب نہیں دیکھے گا۔ اُنھوں نے مجھے کچھ دوائیاں دیں۔ اُن کے مطب میں ایک طرف کچھ چھوٹی چھوٹی کہانیاں اور تصویروں کی کتابیں پڑی تھیں۔ حکیم صاحب نے وہاں سے تین کتابیں اُٹھا کر

مجھے دیں اور کہا یہ تینوں کتابیں ایک ہفتے میں پڑھنی ہیں اور تصویریں بھی دیکھنی ہیں۔ اُس کے بعد تم بالکل نہیں ڈرو گے۔ مَیں نے وہ کتابیں بھی پکڑ لیں۔ اُس کے بعد ابا کافی دیر وہاں بیٹھے حکیم صاحب اور دوسرے لوگوں سے باتیں کرتے رہے۔ حکیم صاحب نے ابا سے میری دوائی کے نہ تو پیسے لیے نہ کتابوں کے پیسے لیے۔ فقط اتنا کہا، یہ ہفتے کا کورس ہے۔ ایک ہفتے بعد اِسے یہاں کتابوں سمیت لائیے گا۔ مَیں چیک کر کے نئی دوائی دوں گا۔ ہم سہ پہر کے وقت وہاں سے اُٹھے اور امام بارگاہ چلے گئے۔ وہاں ابا نے علَم کو بوسے دیے اور مناجات کرنے کے علاوہ علَم سے دو سیاہ رنگ کے دھاگے لیے اور میرے بازو پر باندھ دیے۔ پھر اندر پڑی ہوئی ضریحوں کو بوسے دیے۔ اُس کے بعد ابا ہارنیاں والا چوک میں آ گئے۔ یہ جگہ شہر کے مغرب کی جانب اور منڈی کے بالکل قریب تھی۔ وہاں سے اُنھوں نے دو چار مزید چیزیں خریدیں جن میں حقے کی چلم، چارپائیوں کا بان اور ایک کنالی، پانی کے لیے ایک مٹی کا گھڑا اور کچھ نیازیں دلوانے کے لیے سوجی اور چاول وغیرہ۔ یہ سب سامان ابا نے ایک گٹھڑی میں باندھا اور تانگوں والے اڈے پر چلے آئے۔ اِس میں میرے کام کی کوئی شے نہیں تھی۔ یہاں ہمارے گاؤں کے تین تانگے کھڑے تھے۔ اُن میں سے ایک گلو دکاندار کا تانگہ بھی تھا۔ گلو دکاندار کی ہمارے گاؤں میں سودا سلف اور سبزی کی دکان تھی۔ اِس کا اپنا تانگہ تھا جس پر شہر سے روز تانگہ سامان کا بھر کے لاتا تھا اور اپنی دکان پر بیچتا تھا۔ ہم اُسی کے تانگے پر بیٹھ کر سہ پہر تین بجے گھر چلے آئے۔ گھر آتے ہی مَیں نے حکیم صاحب کی دی ہوئی کتابیں کھول لیں۔ مجھے خبردار کیا گیا تھا اگر کتابیں نہ پڑھوں گا تو خواب آنے بند نہ ہوں گے۔ اب جیسے ہی مَیں نے ایک کتاب پڑھنا شروع کی تو عجیب طلسمات اُس میں دیکھے۔ کسی اور ہی دنیا کا خوبصورت خطہ تھا۔ اُس میں پریاں تھیں، جن تھے، ہر طرف باغ و بہار تھی، جادو تھے، منتر تھے۔ غرض کتاب کیا تھی پریوں کے دیس میں جادو کی دنیا تھی جس میں مَیں ایسا ڈوبا کہ وہ تینوں کتابیں ایک ہفتہ تو ایک طرف چار دن میں ہی پڑھ ڈالیں۔ یہ تینوں چھوٹی چھوٹی کتابیں ایک سو پچاس صفحات کی ہوں گی۔ اب ہوا یہ کہ خواب تو مجھے آنے سے نہ رُکے مگر اب اُن خوابوں میں عدیلہ کے بھوت بیٹے کی بجائے رنگا رنگ باغوں اور پریوں کے طلسمات تھے۔ میرے جی میں آئی یہ حکیم صاحب تو کوئی بڑی پہنچی ہوئی شے ہیں۔ اب مَیں نے ابا سے تقاضا کیا کہ یہ تو مَیں نے پڑھ لی ہیں، نئی چاہییں۔ ابا اگلے ہی دن حکیم صاحب سے نئی کتابیں لے آئے البتہ مجھے اُن کے پاس نہیں لے گئے۔ اُس کے بعد اور کچھ بھی چلتا رہا اور حکیم سید حاجی فطرس علی کی کتابیں بھی چلتی رہیں۔

(۱۴)

عدیلہ کی تنخواہ کیا تھی؟ اِس کا اندازہ مجھے کیا ہوسکتا ہے۔ البتہ اُن کا گزارا ہماری ہی طرح کا معمولی تھا۔ وہی صبح کے وقت ایک روپے کا دودھ، چونی کی چائے کی پڑیا اور آٹھ آنے کی شکر جب گلو کی دکان سے لے کر مَیں اپنے گھر کی طرف جاتا تو اِسی قیمت کا سامان عدیلہ کا خاوند بھی خریدتا تھا۔ میرے خیال میں بوڑھے کا مصرف عدیلہ کے گھر میں یہی رہ گیا تھا کہ سودا سلف لے آیا کرے۔ وہ اپنے بھاری جسم کے ساتھ نہایت سُست دنبے کی طرح چلتا تھا۔ اردگرد سے بے خبر، نہ کسی سے دعا نہ سلام، فقط اپنی مسکینی چال سے چلتا جاتا تھا۔ کئی بار مَیں جان بوجھ کر اُس کے آگے پیچھے ہوتا کہ مجھے بلائے مگر اُس کے منہ میں زبان بالکل نہیں تھی۔ مَیں نے اُسے کبھی مسجد یا کسی اور جگہ جاتے نہیں دیکھا۔ کوئی اور کام بھی کرتے نہیں دیکھا۔ اکثر عماد کے پاس چارپائی ڈال کر بیٹھ جاتا اور اُس سے آہستہ آہستہ باتیں کرتا۔ مَیں نے اُن باتوں کی آواز کبھی نہیں سنی تھی۔ عماد بھی اُس کی باتیں سُن کر اُسی آہستگی سے جواب دیتا۔ یہی دو چیزیں احمد دین کی مصروفیت کی مَیں نے دیکھی تھیں مگر جلد ہی وہ وقت آ گیا کہ اُس کے سر سے یہ دونوں ذمہ داریاں بھی ہٹ گئیں۔

وہی بھوت جسے اب میں پوری طرح جان چکا تھا، وہ عدیلہ کا بیٹا اور زینی کا بھائی، جس کی شکل بے شک بہت ڈرا دینے والی تھی مگر وہ میرے لیے بالکل بے ضرر ثابت ہوا تھا۔ ایک دن دوپہر دو بجے جامن کے سائے میں چارپائی پر پڑے پڑے مر گیا۔ احمد دین کے اِن دو کاموں میں سے دُکان سے

سودا لانا اسی المناک حادثے کے سبب پہلے تو عارضی طور پر پھر مستقل میرے ذمے پڑ گیا۔

یہ جولائی کی ایک سخت دوپہر تھی۔ سکول سے ہماری گرمیوں کی چھٹیاں تھیں۔ دن نہایت چمکتا ہوا اور سفید تھا۔ دُھوپ کے حرارے آسمان کی طرف بلند ہو رہے تھے۔ مَیں اپنے کمرے میں چارپائی پر لیٹا روشندان سے ایک چڑیا کو بار بار اندر آتے اور باہر جاتے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے بچے دیے ہوئے تھے اور اُن کے لیے چوگا لے کر آتی تھی اور منہ میں ڈال کر باہر نکل جاتی تھی۔ اُس کا گھونسلا ہمارے کمرے کے روشندان ہی میں تھا۔ میری دادی اکثر اِس میں دانے ڈال دیتی تھی مگر مَیں دیکھتا تھا کہ چڑیا یا اُس کے بچے وہ دانے کم ہی استعمال کرتے تھے۔ گرمی شدید تھی لیکن کمرے کا ماحول اِس قدر گرم نہیں تھا۔ ہمارے گھر میں بجلی نہیں تھی۔ گاؤں میں تب بجلی کو آئے ابھی ایک ہی مہینہ ہوا تھا۔ ایک دو لوگوں نے ہی اُس کے تار لیے تھے، وہ بھی گاؤں کے امیر آدمیوں نے۔ ہمارا گھر درمیانے سے بھی کم تھا اور ابا کی توجہ فی الحال مزدوری کے علاوہ کسی اور طرف کم ہی جاتی تھی۔ میرے ہاتھ میں کھجور کے پتوں کا ایک پنکھا تھا جسے وقفے وقفے سے جھل رہا تھا۔ میری ماں اور دادی دوسرے کمرے میں تھیں۔ میرا پورا دھیان اِس وقت چڑیا اور اُس کے بچوں پر تھا۔ اچانک عدیلہ اور زینی کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ مَیں بھاگ کر باہر نکل آیا۔ میری والدہ اور دادی مجھ سے بھی پہلے نکل آئیں۔ ہم اُسی وقت تینوں تقریباً دوڑ کر ڈسپنسری کے صحن میں پہنچ گئے۔ عدیلہ اور زینی دونوں عماد کی چارپائی کے پایوں کو پکڑے ایسے دردناک بین کر رہی تھیں کہ مَیں کانپ گیا۔ معیذ بھی ایک طرف کھڑا رو رہا تھا۔ احمد دین اُوندھے منہ چارپائی پر لیٹا دھاڑیں مار رہا تھا۔ پہلی بار مجھے لگا احمد دین کوئی زندہ شے ہے اور یہ زندگی عماد کی موت نے عطا کی ہے۔ اُس کی دھاڑیں عدیلہ اور زینی سے بھی بلند اور ہولناک تھیں۔ مجھے اُس کی لاش اُس کی زندگی سے بھی کئی گنا کریہہ اور ڈرا دینے والی لگ رہی تھی۔ مَیں یہ تمام منظر دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا اور دُور جا کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑے ہی وقت میں بہت سی عورتیں اکٹھی ہو گئیں۔ وہ اُن کے گلے لگ کر اور دھاڑیں مار کر رونے لگیں۔ میری والدہ بھی آنسو بہانے لگی۔ ڈسپنسری میں پڑے دوسرے مریض اور دوسری تمام اشیا ایسے لگتی تھیں کہ اِس موت میں شریک ہو گئی ہیں۔ زینی اپنے گالوں کو اُس بدہیئت مردے کے چہرے سے رگڑ رہی تھی۔ اُس کے اِس عمل سے مجھے اتنی کراہت ہونے لگی کہ مَیں نے اُسے دل میں بُرا بھلا کہا اور آنکھیں پھیر لیں۔ یہ عماد اِن کے لیے کتنا اہم تھا۔ مجھے اِس بات پر حیرانی تھی۔ ایک نہایت بیکار ڈھانچا، جو اِن پر صرف ایک بیہودہ بوجھ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ جس کو روزانہ نشے کا انجیکشن دینا اُس کی

ماں کی ذمہ داری تھی اور اُس کے لیے وہ پیسے بھی خرچ کرتی تھی۔ وہ نہ کوئی اُن کے لیے کام کرتا تھا، نہ اُن کے غموں کو بانٹتا تھا، کیوں اتنا اہم ہو گیا؟ اِن کو تو خوش ہونا چاہیے تھا اُس سے جان چھوٹ گئی۔ اُسے زندہ رکھ کر آخر کیا حاصل کرنا چاہتے تھے؟ حبس، گرمی اور بین کی ملی جلی کیفیت نے ایسی کثافت پیدا کر دی کہ میرا دم گھٹنے لگا۔ مَیں نے فوراً وہاں سے بھاگنے میں عافیت سمجھی۔

مجھے اُس بھوت کے مرنے کا ذرہ برابر غم نہیں تھا بلکہ خوشی محسوس ہوئی۔ خوشی تھی کہ زینی کی اِس سے جان چھوٹ گئی تھی۔ اب اُن کے گھر کی چیزیں پاک ہو جائیں گی۔ اِس کے باوجود آج جب کہ مجھے بہت سے واقعات بھول چکے ہیں، اُس کی موت کا ایک ایک لمحہ میری آنکھوں پر نقش ہے اور مَیں نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کو یاد رکھنے پر مجبور ہوں۔ اِس کی وجہ شاید زینی کی چیخیں اور اُس کی چارپائی پر بین کر کے گرتی ہوئی عدیلہ کا چہرہ میرے سامنے آجاتا ہے۔ اُس کا ڈھانچا نما وجود ایک سال تک جامن کے سائے کا حصہ بن چکا تھا، میری آنکھیں اُسے دیکھنے کی عادی ہو گئی تھیں۔

اُس دن اُن کا شام کا کھانا ہمارے گھر میں پکا۔ کھانا مَیں خود لے کر گیا۔ اُس دن اُنھوں نے اُس میں سے ایک لقمہ بھی نہیں لیا مگر میری والدہ معیذ کو ہمارے گھر لے آئی۔ وہ اُس دن بالکل خموش اور سہما ہوا تھا۔ میری والدہ نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دلاسا دے کر کھانا کھلایا۔ والدہ کی یہ بات مجھے بہت اچھی لگی۔ اُس کے بعد مسلسل چار دن مَیں اُن کے لیے کھانا لے کر جاتا رہا۔ یہی دن تھے جب مجھے زینی سے گہری قُربت نصیب ہوئی۔ وہ گھر کا سودا سلف مجھ سے منگوانے لگی۔ پیسے لیتے ہوئے یا اشیا پکڑاتے ہوئے اکثر ہمارے ہاتھ ایک دوسرے سے چھو جاتے۔ تب ایک لطیف نورانی قسم کی رَو پورے بدن میں بھر جاتی۔ رفتہ رفتہ ہم جان بوجھ کر ایک دوسرے سے ہاتھ مس کرنے لگے۔ اُس وقت میں صرف گیارہ سال کا تھا اور زینی بائیس سال کی ہو چکی تھی۔ کچھ ہی دِنوں میں وہ بھائی کا غم بھول گئی اور چار چار پہر ہمارے گھر گزارنے لگی۔ بات بے بات میرے گالوں پر چٹکی لیتی۔ مَیں جان بوجھ کر ایسی حرکتیں کرتا، جس سے اُسے چٹکی بھرنے کا موقع ملے۔ یہی وہ دن تھے جنھیں مَیں اپنی زندگی کے خوشگوار لمحے کہہ سکتا ہوں۔ ہماری دونوں کی عمر کے فرق کی وجہ سے کسی قسم کے شک اور پابندی کا خطرہ نہیں تھا۔ دونوں کو اِس محبت کا پورا احساس ہو گیا تھا۔ سکول سے آتے ہی مَیں اپنا بستہ پھینکتا، سڑک پار کرتا اور ڈسپنسری کے صحن میں آجاتا۔ ایک دو منٹ جامنوں کے سائے میں کھڑے ہو کر وہاں موجود نلکے سے ٹھنڈا پانی پیتا، ایک ہلکی سی آواز میں معیذ کو پکارتا اور عدیلہ کے گھر میں داخل ہو جاتا۔ یہاں اول

میرا سامنا عدیلہ ہی سے ہوتا۔ وہ مجھے بہت نرمی سے معیذ کے کمرے کی طرف اشارہ کر دیتی۔ وہاں زینی بیٹھی اکثر معیذ کے کان مروڑ رہی ہوتی۔ مجھے دیکھتے ہی اُس کے چہرے پر رونق آ جاتی۔ ''لو ضامن آ گیا۔ اب تم دونوں کھیلو، مَیں دوپہر کا چولہا تپالوں'' کے جملے کہہ کر باہر نکل جاتی۔ اُس کے بعد عصر تک بیسیوں چکر اِس کمرے میں لگاتی جہاں مَیں بیٹھا اُس کے ہر چکر کے بعد اگلے چکر کے انتظار کی سولی پر لٹک جاتا۔ مجھے نہیں یاد عماد کی موت کے بعد اُس گھر سے میرا کیا تعلق بنا مگر یہ ضرور کہوں گا زینی پر میری دانست میں میرا پورا حق ہو چکا تھا۔ مَیں اکثر کنگھی سے اُس کے بال سنوار دیتا تھا۔ بعض اوقات اُس کے کاندھے، بازو یا گردن پر دانت بھی کاٹ لیتا۔ اُس کا ردِعمل بھی ویسا ہی ہوتا۔ مجھے ابھی تک اُس پاؤڈر کی خوشبو یاد ہے جو اُس کے ساتھ مس ہونے سے میرے جسم میں شامل ہو جاتی تھی۔ اُس کی ماں عدیلہ ڈسپنسری سے اُسی وقت گھر لوٹتی جب ایک بج جاتا۔ ایک گھنٹا وہ گھر میں رُکتی اُس کے بعد واپس ڈسپنسری چلی جاتی۔ پھر شام کے چھ بجے سے پہلے گھر میں چکر نہیں لگاتی تھی۔ احمد دین اپنے برآمدے میں بیٹھا اللہ جانے کیا سوچتا رہتا۔ کبھی اُٹھ کر باہر چلا جاتا اور ڈسپنسری کے وسیع صحن کی کیاریوں میں اُگائی ہوئی سبزیوں میں کھرپا چلاتا رہتا۔ اُس نے کبھی مجھے مخاطب نہیں کیا تھا۔ مَیں نے دیکھا بعض اوقات جب عدیلہ گھر میں آتی اور چارپائی پر لیٹ جاتی تو وہ اُس کا سر اور ٹانگیں دبانا شروع کر دیتا۔ عدیلہ کے کپڑے بھی وہی دھوتا تھا۔ اُسے ایسے کسی کام میں عار نہیں تھی جو عورتیں کرتیں۔ مَیں حیران ہوتا یہ عورتوں کے کام کرنے سے شرماتا کیوں نہیں۔ میرا خیال ہے یہ دن عدیلہ اور اُس کے خاندان کے لیے سکون اور خوشحالی کے تھے۔

(۱۵)

عصر کا وقت تھا۔ آسمان پر سُرمئی بادلوں کے ٹکڑے اُڑ رہے تھے۔ مَیں اپنے گھر سے نکل کر اُس چھوٹی گلی سے ہو کر پچھلی جانب کے کھیتوں کی طرف جا رہا تھا جو ڈسپنسری کے عقبی لکڑی کے پھاٹک کے سامنے سے نکلتی تھی۔ یہاں پانی کا ایک چھوٹا سا تالاب تھا۔ یہ تالاب نالے کے اندر سے ایک سوراخ کے مسلسل بہنے سے بنا تھا۔ یہاں گاؤں کے اِکا دُکا لوگ اپنی بھینسوں کو پانی پلایا کرتے تھے۔ تالاب میں کسی نے شیشم کے موٹے تنے کاٹ کر پھینکے ہوئے تھے تاکہ مسلسل پانی میں پڑے رہنے سے لکڑی مزید سیاہ اور بھاری ہو جائے۔ اِن تنوں کے اوپر کے حصوں کی کچھ چوبیں پانی سے باہر نظر آتی رہتی تھیں جہاں کبھی کوئی چڑیا آن بیٹھتی اور کبھی مینڈک بیٹھے نیند کی اونگھ لیتے تھے۔ اِسی تالاب کے کنارے کچھ مہینوں سے مَیں ایک دو لڑکوں کو اکثر کھڑے دیکھتا تھا، حالانکہ یہ لوگ ہمارے محلے کے نہیں تھے۔ یہ گاؤں کے شمال مشرقی حصے کی آخری گلیوں میں رہنے والے تھے اور اُس وقت اِن کو دیکھا تھا جب مَیں اپنے باپ کے ساتھ نذر محمد لوہار کی دُکان پر گیا تھا۔ اِن کی شکلیں عجیب بے سُری سی تھیں۔ کھلے گریبان کے سفید کُرتے اور لال کناروں والی دھوتیاں پہنتے تھے۔ اُن دھوتیوں کو لاچا کہا جاتا تھا۔ تب ہمارا سارا گاؤں دھوتیاں ہی پہنتا تھا مگر وہ سفید رنگ کی سادہ سی دھوتیاں ہوتی تھیں لیکن اِن دونوں کی دھوتیاں ہمیشہ رنگین ہوتیں۔ کبھی اِن کے ہاتھوں میں کوئی بٹیرا ہوتا جسے مٹھلاتے رہتے اور کبھی کبوتر یا مُرغ لے کر نکل آتے۔ مجھے نہ اِن کے نام آتے تھے نہ یہ معلوم تھا کہ کام کیا کرتے ہیں؟ مجھ سے اتنے بڑے تھے

کہ مَیں اِن کو چچا کہہ سکتا تھا اگر مجھے اِن کی شکل اچھی لگتی۔ مگر یہ دونوں بالکل اچھی شکل کے نہیں تھے۔ دونوں کی مونچھیں اتنی لمبی تھیں کہ بعض اوقات میرا جی چاہتا تھا قینچی سے کاٹ کر سیدھی کر دوں مگر یہ ایک خیال ہی تھا۔ داڑھیاں اِن کی نہیں تھیں مگر جو کچھ اِن کے چہرے پر تھا اُنھیں داڑھیاں ہی کہا جا سکتا تھا۔ اِس کے علاوہ میرے پاس الفاظ نہیں تھے۔ یہ ہمارے اِس محلے میں کیا کرنے آتے تھے، مجھے اِس بارے میں کچھ معلوم نہ تھا، نہ مَیں اِس طرح سوچنے کا عادی تھا۔ کچھ تو کام ہو گا۔ کافی دِنوں سے مسلسل نظر آنے لگے تھے۔

مَیں اپنے دھیان میں جا رہا تھا اور اِن کے پاس کی گلی سے گزرنے ہی لگا تھا کہ ایک آدمی بھاگتا ہوا اِن کے پاس آیا۔ اُس نے دو تین تیز قسم کی گالیاں دینے کے ساتھ ہی اِن میں سے ایک کا گریبان پکڑ لیا۔ اُس کے پیچھے ایک اور بھی آدمی تھا۔ مَیں وہیں رُک گیا لیکن ذرا فاصلے پر کہ مجھے کوئی نقصان نہ ہو۔ اُس وقت میرے ذہن میں لڑائی کا تصور اتنا تھا کہ لڑنے والے اپنے دشمن کے علاوہ ہر دسترس میں آنے والے کو نقصان دے سکتے ہیں۔ مَیں سمجھتا تھا لڑائی کے دوران اُن کے ہوش صرف ہاتھ چلانے کی طرف ہوتے ہیں، سمت اور پہچان سے بے خبر ہوتے ہیں۔ چاروں آدمیوں کی ڈسپنسری کے کوارٹروں کے سامنے گالم گلوچ ہونے لگی۔ ایک دوسرے کا گریبان پکڑنے کے بعد چاروں لوگ گینڈے کی طرح حملہ آور ہو گئے۔ مَیں اُنھیں دیکھنے کے لیے ایک دیوار کی ہلکی سی اوٹ لے کر رُک گیا تا کہ وقت آنے پر بھاگ جاؤں۔ بعد کے دو حملہ آوروں میں سے ایک آدمی گاؤں کے بااثر خاندان میں سے تھا۔ اِس کا نام حامد تھا اور بہت سخت طبیعت کا تھا۔ میرا اِس سے کبھی واسطہ تو نہ پڑا تھا مگر اُسے دیکھتے ہی جان خشک ہو جاتی تھی۔ اِس کا گھر ہماری گلی سے تین گلیاں چھوڑ کر قریباً گاؤں کے چوک میں تھا۔ یہ بھی بڑی بڑی مونچھوں کے ساتھ اکثر اِس گلی میں آنے لگا تھا۔ حامد کے پیچھے ایک موچی کا بیٹا تھا، جو اِس کے پیچھے پیچھے پہنچ گیا تھا۔ یہ بھی اپنی طرح کا غنڈہ ہی تھا اور ہر وقت حامد کا معاون ہوتا تھا۔ اِس کے ہاتھ میں اکثر جوتے گانٹھنے والی آر ہوتی تھی۔ اِس آر کی نوک بہت سخت لوہے کی اور سوئی سے زیادہ تیز تھی مگر اِس سے مجھے ڈر نہیں لگتا تھا، نہ کبھی اُس نے مجھے گھور کر دیکھا اور نہ کبھی واسطہ رکھا تھا۔ یہ اِسی بازار کے دو چار گھر چھوڑ کر رہتا تھا اور یہیں ہر وقت گویا پہرے داری پر متعین تھا۔ مَیں اِن چاروں کی لڑائی دیکھنے کے لیے اُس چھوٹی گلی کی دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے بالکل نہیں معلوم تھا اِن کی لڑائی کیوں شروع ہوئی ہے لیکن اِن چاروں کا ایک دوسرے سے اِس قدر غیظ کے

عالم میں ٹکرا جانا ٹھیک نہیں تھا۔ گالی گلوچ سے آواز بہت بلند ہونے لگی۔ اُن کی تکرار سے مجھے پتا چلا کہ دوسری پارٹی کے ایک آدمی کا نام صفدر ہے۔ پھر ایک ہی دم بہت ہلا دینے والا منظر سامنے تھا۔ لڑائی کا شور سُن کر لوگ ابھی اکٹھے نہیں ہوئے تھے۔ اِن چاروں نے ایک دوسرے کو تھپڑوں اور مکوں پر رکھ لیا۔ پہلے دونوں کے ہاتھ خالی تھے۔ اُن میں سے صفدر کے پاس ابھی بھی ایک بٹیرا تھا، جسے وہ ہاتھ سے چھوڑ نہیں رہا تھا اور ایک ہی ہاتھ سے لڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اِسی تگ و دَو میں صفدر تالاب میں گر گیا۔ اتنے میں چند لوگ وہاں پہنچ گئے۔ یہ سب حامد کے رشتہ دار تھے اور گاؤں میں اِن کی تعداد کافی تھی۔ اُنھوں نے آگے بڑھ کر ایک کو پکڑ لیا۔ اِتنے میں صفدر کا ایک ساتھی جو تالاب سے باہر تھا وہ سرپٹ بھاگ گیا۔ اُسی وقت حامد نے تالاب میں چھلانگ لگا دی اور ایک لمبا چاقو نکال کر پے در پے صفدر کے پیٹ میں وار کر دیے۔ چاقو کے وار ایسی تیزی سے لگے کہ صفدر فوراً ہی نیچے گر گیا اور زمین خون سے رنگین ہونے لگی۔ صفدر نے اتنی بلند چیخیں ماریں کہ آسمان کو چیر کر نکل رہی تھیں لیکن وہ جلد ہی نڈھال ہو گیا تھا۔ حامد سمیت سب ایک پل میں وہاں سے بھاگ گئے۔ اتنے میں سامنے کے بازار سے کچھ لوگ بھاگ کر آ گئے۔ یہ تین چار لوگ تھے اور صفدر کے بھائی اور چچا زاد تھے۔ اُن کی عورتیں بھی ساتھ تھیں۔ عورتیں پیٹنے اور واویلا مچانے لگیں۔ مردوں نے جلدی سے صفدر کو تالاب سے باہر نکال کر اُٹھایا اور اُسی ڈسپنسری میں لے گئے۔ اُسے وہاں ایک لکڑی کے بنچ پر لٹا دیا۔ اتنے میں عدیلہ بھاگ کر باہر نکل آئی۔ ڈسپنسری میں ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ عدیلہ نے اُس کی مرہم پٹی شروع کر دی اور اپنے گھر سے لا کر دو انجیکشن بھی لگائے مگر خون مسلسل بہے جا رہا تھا۔ اتنے میں ایک آدمی تانگہ بھگا کر لے آیا اور اُسے تانگے پر لا دلیا لیکن ابھی تانگہ گاؤں سے نکلا بھی نہ تھا کہ صفدر مر گیا۔ اُس کے مرنے پر وہ بین پڑا کہ الاماں۔ لاش دوبارہ اُتار کر اِسی ڈسپنسری میں رکھ دی گئی۔ پورا گاؤں وہاں اکٹھا تھا اور صفدر کی ماں عجیب طرح سے بین اُٹھا اُٹھا کر عدیلہ کو طعنے دیے جا رہی تھی۔ ہائے تیری بیٹی میرے بیٹے کو کھا گئی۔ اِس چڑیل نے میرے بیٹے کو مروا دیا۔

میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ مَیں نے اِس پوری لڑائی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ یہاں زینی کا وجود تک نہیں تھا۔ نہ اُس نے حامد سے کہا تھا کہ وہ صفدر کو مارے۔ پھر کیسے عدیلہ کی بیٹی نے اُسے مروا دیا؟ مجھے صفدر کے مرنے کا غم تھا مگر اُس کی ماں کے یہ بین اچھے نہیں لگ رہے تھے۔

اُسی دن شام کے وقت ہمارے گاؤں میں ایک بڑی جیپ پولیس کی بھر کر آئی۔ مَیں نے اتنی

زیادہ پولیس پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ایک موٹا سیاہ رنگ کا تھانیدار تھا اور باقی دس بارہ اُس کے سپاہی تھے۔ یہ تمام اُسی جگہ پر کھڑے تھے جہاں صفدر قتل ہوا تھا۔ اُس کا خون اُس چھوٹے سیاہی مائل تالاب میں گھل گیا تھا۔ جب اُسے باہر نکالا تھا تو اُس بہتے ہوئے خون کا کچھ حصہ مٹی پر جم کر سیاہ ہو چکا تھا۔ اُس کے اُوپر کچھ لوگوں نے تغاری دے دی تا کہ قتل کی جگہ محفوظ ہو جائے۔ ہمارے گاؤں کے ایک آدمی نے وہ جگہ پولیس والوں کو دکھانی شروع کر دی۔ اُس کے بعد تمام لوگ ڈسپنسری میں چلے گئے۔ لاش ابھی تک ڈسپنسری کے صحن میں پڑی تھی۔ عدیلہ وہاں موجود تھی۔ ڈسپنسری کا پورا صحن آدمیوں سے بھر گیا۔ تھانیدار عدیلہ سے پہلے سخت قسم کے سوالات کرتا رہا۔ اُس کے بعد اُس نے دو تین گالیاں نکالیں۔ مجھے تھانیدار پر غصہ آ رہا تھا۔ اِس آدمی کے مرنے میں عدیلہ کا کیا قصور تھا۔ وہاں موجود ایک عورت جو مسلسل بین کر رہی تھی۔ اُس نے بھی صفدر کے مرنے کا الزام زینی پر لگایا کہ اِسی کی وجہ سے اُس کے بیٹے کو حامد نے مارا ہے۔ تھانیدار عدیلہ کو ننگی گالیاں دینے لگا اور کہا اپنی بیٹی کو باہر نکالو۔ اُس سے پوچھ گچھ کرنی ہے۔ دوسرے کئی لوگوں نے بھی یہی کہا کہ اِس آدمی نے زینی کی وجہ سے صفدر کو مارا ہے۔ یہی اِس حادثے کی قصوروار ہے۔ کچھ دیر بعد تھانیدار نے زینی کو طلب کر لیا اور صحن کے بیچ میں ہی ایک عدالت لگ گئی۔ زینی جیسے ہی باہر آئی تھانیدار سمیت تمام لوگوں کی نظریں اُسی پر تھیں۔ اُس کے چہرے پر موجود دو آنکھوں میں اتنی چمکدار سیاہی کسی نے پہلے نہ دیکھی ہو گی۔ وہ آنکھیں موٹی اتنی تھیں کہ ہمارے گاؤں کی کوئی بھی عورت ایسی آنکھیں نہیں رکھتی تھی۔ زینی لاش اور تھانیدار کے درمیان آ کر کھڑی ہو گئی۔ اُس وقت تھانیدار کی زبان جیسے گنگ ہو گئی تھی۔

تھانیدار بالآخر اپنی مجرمانہ تفتیش شروع کرتے ہوئے سوالات کرنے لگا۔ یہ سوالات ایسا نہیں کہ بہت چالاکی اور عیاری سے کر رہا تھا بلکہ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ چالاک اور عیار قسم کا تفتیشی ہے۔ اُس کا خیال تھا وہ جھوٹ کو مجرم کے ماتھے سے پڑھ کر جرم کا ٹھیک اندازہ لگا لیتا ہے۔ مَیں نے تھانیدار نہیں دیکھے تھے نہ اُن کی گفتگو سنی تھی۔ بار بار اپنی مونچھ کے سروں کو ایک انگلی اور انگوٹھے سے مروڑ رہا تھا اور ایک کرخت مسکراہٹ کے ساتھ زینی سمیت ڈسپنسری کے صحن میں کھڑے تمام لوگوں کو ڈرا رہا تھا۔ اُس کی اِن حرکات سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ قاتل کو اُس کے اصل جرم کے بدلے میں پکڑنا چاہے گا جس میں حقائق وہی ہوں گے جن کے عوض مقتول قتل ہوا تھا۔

تمھارا نام کیا ہے؟ آخر تھانیدار بولا۔

زینت بی بی، زینت ڈری ہوئی بولی۔

اِس لاش کو پہچانتی ہو؟

مَیں اِسے نہیں جانتی، زینی نے سہمی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

بکواس مت کرو، سچ بتاؤ ورنہ یہ میرا بیت بہت سخت ہے۔

تھانیدار کے اِس جملے پر عدیلہ تلملا گئی، بولی، میری بیٹی بے گناہ ہے، اِس پر کیوں اتنا بگڑ رہے ہو؟

تھانیدار نے عدیلہ کی طرف گھور کر دیکھا۔ چپ کر بڈھی رنڈی۔ یہ اسی کی وجہ سے قتل ہوا ہے۔ پہلے اِس کے لچھن قابو کرنے تھے نا؟ جب تک مَیں اِس سے پوچھ رہا ہوں، تُو بیچ میں مت آ۔

تھانیدار کی جھڑکی سُن کر عدیلہ ایک بار پھر سہم گئی۔ اُسے اِتنا تو پتا چل گیا تھا، اِس میں کچھ نہ کچھ زینی کا نام تھا لیکن کیسے تھا؟ یہ بات خود عدیلہ کی سمجھ سے باہر تھی۔

کیا نام ہے تمھارا؟ تھانیدار زینی سے دوبارہ مخاطب ہوا۔

زینت بی بی، زینی نے دوبارہ اپنا نام بتایا اور لہجہ دوٹوک ہو گیا۔

اِس کے ساتھ کب ملی ہو اور کتنی دفعہ ملی ہو؟ یہ سوال کرتے ہوئے تھانیدار پوری طرح لطف بھی لے رہا تھا لیکن اُسے وہ تفتیش کا نام ہی دے رہا تھا۔ اِس طرح کی تفتیش کرنے میں کیسا لطف ہوتا ہے؟ اِس کے بارے میں شاید وہ شخص نہ بتا سکے جس نے ابھی کسی تفتیش کی ذمہ داری نہ اُٹھائی ہو لیکن کچھ بات ایسی تھی کہ اُس میں تھانیدار کو لطف آ رہا تھا۔

'مَیں تو اِسے کبھی نہیں ملی۔ ہمارے کوارٹر پر رقعے پھینکتا تھا' زینت نے کہا۔ اب مجھے غصہ آیا۔ زینت نے مجھے تو اِس بات کی ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی۔

اور وہ حامد جس نے اِسے قتل کیا ہے، اُس کے ساتھ؟ تھانیدار نے پھر پوچھا۔

وہ بھی یہی کچھ کرتا تھا اور یہ رات کو اکثر یہاں ہمارے کوارٹر کے آس پاس آ کر سیٹیاں بجاتے تھے۔ دن کے وقت بھی یہیں پھرتے رہتے تھے۔

تمھاری اِن دونوں میں سے کسی کے ساتھ بھی بات نہیں ہوئی؟

کل شام مَیں اپنے کوارٹر کی چھت سے دھوئے ہوئے کپڑے اُتار رہی تھی جب اِس آدمی نے مجھ پر کچھ جملے کسے تھے اور مَیں نے اِسے بُرا بھلا بھی کہا تھا لیکن مَیں کبھی گھر سے یا اِس ڈسپنسری سے

باہر نہیں نکلی اور اِن دونوں کو کبھی نہیں ملی۔ میرے گالیاں دینے کے دوسرے دن یہ دونوں آپس میں اِسی کونے پر ایک دوسرے کو کھڑے گالیاں دے رہے تھے۔ مَیں اور امی عدیلہ گالیاں سُن رہے تھے اور آج یہ قتل ہو گیا۔ مجھے اِس سے زیادہ کوئی خبر نہیں، نہ مَیں نے اِسے قتل ہوتے دیکھا۔ زینت نے اب کے وضاحت کے ساتھ بات کی۔

تجھے ہمارے ساتھ تھانے جانا پڑے گا۔ تھانیدار نے اپنا فیصلہ سنایا۔

تھانیدار کی اِس بات پر ہمارے گاؤں کا ایک بوڑھا آدمی آگے بڑھا اور بولا، ''چودھری صاحب! یہ بچی اِسی گاؤں کی ہے۔ جو کچھ پوچھنا ہے، یہیں پوچھ لے اور اب گالی مت دینا۔ مَیں کافی دیر سے تیرے ارادے دیکھ رہا ہوں۔''

اُس بوڑھے کی بات سُن کر تھانیدار ایک دم چُپ ہو گیا۔ ایسے لگا جیسے تھانیدار کی زبان کاٹ دی گئی ہو۔

اِس طرح تو تفتیش ادھوری رہ جائے گی۔ تھانیدار ایک قسم کا گڑگڑایا۔

تھانیدار صاحب میری عمر تفتیشیں نپٹاتے گزری ہے۔ مَیں سانپ کے زہر اور اُس کی کینچلی کو جانتا ہوں۔ یہ بھی جانتا ہوں اُس کا تریاق میری لاٹھی میں ہے۔ یہ جو چارپائی پر اُوندھا پڑا ہے اور اِس کے باقی تین ہم مزاج جو بھاگ گئے ہیں، سارا گاؤں اِن کے کرتوت سے واقف ہے۔ یہ بچی اور اِس کی ماں تو یہاں کل آئے ہیں۔ کیا یہ سارے جو اِس وقت کھڑے ہیں اِنھیں اِن کی حرامکاریوں کی خبر نہیں؟ کیا یہ لڑکی اِن کے گھر گئی تھی؟ تجھے چاہیے لڑکی کی دادرسی کر، اُلٹا اُسی کو ڈرا رہا ہے۔ تیری آنکھوں کی سردی میں جو آگ ہے اُسے مَیں جانتا ہوں۔ یہ لاش اُٹھا اور یہاں سے چلتا بن۔

حاجی صاحب میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ تھانیدار کی آواز اب کے بہت دھیمی ہو گئی تھی۔ ہمیں تفتیش میں تمام پہلوؤں کو دیکھنا پڑتا ہے۔ اگر معاملے کی ضمنی صحیح سے نہ لکھی جا سکی تو قتل ضائع ہو جائے گا۔ پھر مجھے نہ کہنا قاتل کو سزا نہیں ملی۔

ایسے قتل تو ویسے بھی ضائع ہونے کے لیے ہوتے ہیں۔ یہ مجھے سمجھانے کی ضرورت نہیں۔ تیری ضمنی مَیں لکھواؤں گا۔ بابے علی محمد نے تھانیدار کو دوٹوک جواب دیا۔

آپ سرکاری معاملے میں خوامخواہ دخل دے رہے ہیں۔ تھانیدار نے زچ ہونے سے بچنے کے لیے دوبارہ کہا۔

اچھا ٹھیک ہے، بوڑھا زینت کی طرف منہ کر کے بولا، بیٹی تو اپنے گھر جا، پھر عدیلہ سے کہا، پُتر عدیلہ تُو بھی جا۔ جتنی تم نے پچھلے تین سال میں اِس گاؤں کی خدمت کی ہے، گاؤں والے تجھے صلہ کیا دیں گے؟ پھر تھانیدار سے دوبارہ مخاطب ہوا، میاں تو اپنی یہ لاش اُٹھا اور جو کچھ کرنا ہے کر کے جا۔ جب تجھے کوئی اِس لڑکی کے بارے میں ثبوت ملے تو میرے پاس آ جانا، مَیں لڑکی کو حاضر کر دوں گا لیکن یاد رکھ، اِس کے علاوہ اب اِس ڈسپنسری میں قدم مت رکھنا ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔ میری عمر اِنہی سرکاری معاملوں میں دخل دیتے نکلی ہے۔

مَیں نے دیکھا بابے علی محمد کی بات سُن کر تھانیدار بُجھ سا گیا تھا۔ اُس کی ساری تفتیش سمٹ کر اب صرف لاش کا منہ دیکھنے تک محدود ہو گئی تھی۔ اُس کے بعد اُس نے سپاہیوں سے کہا، اِسے اُٹھا کر ایک تانگے پر رکھو اور پوسٹ مارٹم کے لیے بڑے ہسپتال لے چلو۔

تب وہ عدیلہ کی طرف دوبارہ آیا، بی بی اِس کی ابتدائی رپورٹ بنا دو۔

عدیلہ نے جلدی سے لاش کی ابتدائی رپورٹ بنا کر تھانیدار کے حوالے کر دی۔ اِتنے میں تھانیدار نے کچھ لوگوں سے اور عینی شاہدین سے صفدر کے قتل کی گواہیاں لیں۔ اُس کی ماں سے پوچھ گچھ کی اور اصل کارروائی کرنا شروع کی جس میں اُسے ایک گھنٹا مزید لگ گیا۔ اتنے میں رپورٹ تیار ہو گئی تھی۔ ایک تانگے پر لاش کو رکھا اور پولیس گاؤں سے روانہ ہو گئی۔ پولیس کے جانے کے بعد بابے علی محمد نے عدیلہ کے اور زینی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا، بیٹی پریشان مت ہونا۔ یہ سؤر کا بچہ تھا اور مَیں ایسوں کو خوب جانتا ہوں۔ اِن کے دانتوں میں حرام مال کی جڑیں اُگی ہوتی ہیں۔ جب تک کسی کے سینے میں پیوست نہ کر دیں اِنھیں چین نہیں آتا۔ آپ تو پھر غیر ہیں، یہ اپنی بہو بیٹیوں کو رندے کے نیچے رکھ لیتے ہیں۔

لاش کے اُٹھ جانے سے ڈسپنسری کے صحن میں تھوڑی دیر تک کچھ لوگ جمع رہے اور چہ مگوئیاں بھی ہوتی رہیں۔ پھر سب اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔

اِس حادثے نے پورے گاؤں میں ایک نئی بحث کو جنم دے دیا تھا اور ستم کی بات یہ کہ اِس کا سارا الزام زینی پر آ رہا تھا۔ اکثر گاؤں کی عورتیں اُسے منحوس کہنے لگیں۔ گلیوں میں چلتی ہوئی، چوراہوں پر کھڑی ہوئی، تندوروں پر روٹیاں لگاتی ہوئی، کنویں سے پانی بھرتی ہوئی، نہر کنارے کپڑے دھوتی ہوئی، کہیں بھی جب دو یا زیادہ عورتیں اکٹھی ہوتیں، عدیلہ کی بیٹی زینی کا تذکرہ چھڑ جاتا۔ پہلے اُس کے

حُسن کے بارے میں بات کرتیں، پھر اُس کی نحوست کے بارے میں دُور دُور کی کوڑیاں لاتیں اور آخر میں عدیلہ کے دُکھ اور رنج کا تذکرہ کر کے اپنے دُکھ کا اظہار کرتیں۔ میری دادی اماں زینب نے تو گھر میں صاف حکم سنا دیا کہ اِس لڑکی کو آئندہ گھر میں مت گھسنے دیں۔ میری والدہ سے کہنے لگیں، مَیں نے تو اُسی دن اِس کے لچھن دیکھ لیے تھے اور کہا تھا یہ رنڈیوں کے چال چلن رکھتی ہے، ایک دن چاند چڑھائے گی، وہی ہوا نا؟

میری والدہ دادی اماں کی بات پر خموش ہو گئی۔ واقعی اِس وقت والدہ کے پاس زینت کے دفاع میں لفظ نہیں تھے۔ وہ بولی، اماں اب مجھ سے تو ماتھے پڑھے نہیں جاتے، مجھے تو دیکھنے میں ایسی نہ لگتی تھی۔ بس اللہ معاف کرے۔ دلوں کی حالتیں وہی جانے۔

حامد اور اُس کا دوست کہیں بھاگ کر جا چکے تھے۔ وہ پولیس کو پکڑائی نہیں دیے۔ مَیں اتنا ڈر گیا تھا کہ گھر آنے کے بعد مجھے سخت بخار ہو گیا۔ جان کے لالے پڑ گئے۔ اِس حادثے سے کئی دن بعد تک عدیلہ بھی ہمارے گھر نہیں آئی، نہ اُس کی بیٹی آئی اور نہ ہی مَیں باہر جا سکا لیکن ایسا نہیں تھا کہ زینی ایک دن کے لیے بھی میری آنکھوں سے اوجھل ہوئی ہو۔

(۱۶)

قتل کے واقعے کو گزرے چھ ماہ ہو گئے تھے۔ پولیس دوبارہ گاؤں میں نہیں آئی۔ رفتہ رفتہ عدیلہ اور اُس کی بیٹی زینی کے تذکرے بھی مدھم ہو گئے۔ عدیلہ نے اِس واقعے کے بعد اپنے رویے کو ڈسپنسری اور مریضوں کے ساتھ اتنا اپنایت والا کر لیا کہ گاؤں اور اردگرد کے دوسرے گاؤں کے لوگ اُس کے ساتھ پہلے سے بھی زیادہ ہمدرد ہو گئے۔ اُس کی بیٹیوں کے بارے میں تمام باتیں قریب قریب ختم ہو گئیں۔ زندگی اپنے معمول سے چلنے لگی۔ ایک دن شام کے وقت مَیں اپنے کھیتوں سے ہشاش بشاش کھیلتا ہوا گھر میں داخل ہوا تو میری ماں نے مجھے نیاز کی کھیر کپڑے میں ڈھک کر دی اور کہا میں ڈاکٹر فرح کو دے آؤں۔

ڈاکٹر فرح کو ڈسپنسری میں آئے ہوئے دوسرا دن تھا۔ وہ پہلے ڈاکٹر کی ٹانگ ٹوٹنے اور اُس کے جانے کے ساڑھے تین سال بعد آئی تھی۔ کل عصر کے وقت ایک چھوٹے سے ٹرک میں اپنا سامان لادے ڈسپنسری میں داخل ہوئی۔ ڈاکٹر فرح کی عمر 40 سال سے زیادہ نہیں تھی۔ پاکستان بننے سے پہلے پیدا ہوئی ہو گی اور یہ نئی ڈاکٹر بھی نہیں تھی۔ شکل وصورت سے بھی خوبصورت تھی۔ سر پر کوئی دوپٹہ نہیں تھا۔ گلے میں ایک سُرمئی مفلر لٹکایا ہوا تھا۔ ڈاکٹر فرح کا سامان ڈسپنسری کے ملازمین نے اُتار کر چند لمحوں میں اُس کی کوٹھی میں رکھ دیا تھا۔ جب ڈاکٹر فرح آئی تھی مَیں اُس وقت ڈسپنسری کی پچھلی طرف موجود پانی کی ٹینکی سے ایک ڈول میں پانی بھر رہا تھا۔ یہ ٹینکی اُن دنوں نئی نئی بنائی گئی تھی جس سے گاؤں والوں

کو صاف پانی پینے کے لیے مفت حاصل ہوتا تھا۔ ڈاکٹر فرح کی کوٹھی عدیلہ کے کوارٹر کے بالکل سامنے تھی۔ درمیان میں ڈیڑھ سوفٹ کا وہی صحن تھا، جہاں ہم کھیلتے تھے۔ اِس کوٹھی کے سامنے بڑے آموں اور جامنوں کے چار پانچ پیڑ بہار دکھاتے رہتے تھے۔ کوٹھی کے مرکزی دروازے کی چوکھٹ پر لمبی اور خشک گھاس کی جڑیں اب کافی پھیل چکی تھیں۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد چوکیداروں نے اِس پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ ایک درخت بھی آدھا سوکھ چکا تھا۔ اُس کی سوکھی ٹہنیوں پر اکثر کوّے بیٹھتے تھے۔ یہ آدھا سوکھا ہوا آم کا درخت مجھے کافی بھلا لگتا تھا۔ جب آسمان بہت نیلا اور دُور ہوتا تھا اُس وقت اِس کی ٹہنیوں پر بیٹھے ہوئے کبوتر یا کوئل چھوٹی پریوں کی طرح آسمانی لگتے تھے۔ آدھی ہری اور آدھی سوکھی شاخیں ہمیشہ اساطیری ہوتی ہیں۔ خاص کر جب اِن پر بیٹھے ہوئے پرندے اُڑتے ہیں اور اُڈاری بھر کر واپس اِسی کی سوکھی ٹہنی پر آ بیٹھتے ہیں۔ اِسی صحن میں مَیں، معیذ اور میرا چچازاد کھیلتے تھے۔ بعض اوقات چار فٹ اُونچی دیوار سے چھلانگ مار کر کوٹھی میں گھس جاتے اور صحن میں کھڑے آم سے کچی امبیاں توڑ کر پلک جھپکتے میں اِدھر کود پڑتے تھے۔ چوکیدار اِس کوٹھی میں گھسنے پر بہت سختی سے پیش آتا تھا۔ اُس کی موٹی تازی چُندیا مجھے بُری لگتی تھی۔ آج وہ کوٹھی کی دہلیز پر اُگی بے تحاشا گھاس کو کاٹ رہا تھا اور اُس کی صفائی کر رہا تھا۔

مَیں نیاز لے کر دروازے پر پہنچا تو چوکیدار میری طرف پھرتی سے بڑھا اور ہاتھ سے پلیٹ پکڑنا چاہی لیکن مَیں بھی ایک ہی کایاں تھا۔ پلیٹ ایک طرف کر کے فوراً دروازے پر دستک دے دی۔ میرے اِس عمل سے چوکیدار ایک طرف ہو گیا اور مجھے گھورنے لگا۔ اُسی لمحے دروازہ کھلا۔ ایک لڑکا میرے سامنے کھڑا تھا۔ اُس کا قد مجھ سے کم سے کم ایک فٹ لمبا تھا۔ مَیں اُسے دیکھ کر ایک دم ٹھٹھک گیا۔ یہ تو وہی لڑکا تھا جو کل شام صحن میں گھوم رہا تھا۔ ہلکی نیلی ٹی شرٹ اور نیکر پہنے کتنا عجیب سا لگ رہا تھا۔ جیسے ننگا ننگا پھرتا ہو۔ مجھے اُس وقت اُسے دیکھ کر دادی اماں کی فرنگیوں والی کہانیاں یاد آئی تھیں۔ اُن کہانیوں میں انگریز مرد آدھے ننگے ہوتے تھے۔ مَیں اُسے بھی فرنگی سمجھا تھا لیکن اب یہ اچھا بھلا لڑکا لگ رہا تھا۔ سُرمئی رنگ کا پاجامہ اور وہی نیلی ٹی شرٹ پہنے تھا۔ تب میں نے اِس کو غور سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر ایک طرف ہو گیا اور مجھے آگے بڑھتے ہوئے دیکھنے لگا۔ میں جلدی سے پلیٹ لے کر اُن کے صحن میں آ گیا۔ ڈاکٹر فرح پہلو والے کمرے سے نکل کر میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی،

''یہ نیاز ہے، امی نے بھیجی ہے، وہ ہر نئے مہمان کو نیاز بھیجتی ہیں۔'' یہ کہہ کر مَیں نے پلیٹ اُس کے آگے

کر دی۔ ڈاکٹر فرح نے پلیٹ میرے ہاتھ سے لے لی اور آم کے درخت کے نیچے پڑی ہوئی تین کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھنے کو کہا۔ ایک کُرسی پر وہی لڑکا بیٹھ چکا تھا۔ میرا اُس سے کوئی تعارف نہیں تھا۔ اِس لیے مَیں سر نیچا کیے خموشی سے بیٹھ گیا۔ مَیں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ مجھ سے آٹھ نو سال بڑا تھا۔ میری اور اُس کی دوستی کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اِس کے باوجود مَیں اُسے کن اَکھیوں سے دیکھنے لگا اور یہ اندازہ لگانے میں ذرا دیر نہ لگی کہ وہ مجھے بھرپور انداز سے گھور رہا تھا۔ کچھ دیر میں ڈاکٹر فرح پلیٹ خالی کر کے لے آئی۔ پلیٹ پکڑنے کے بعد اُس نے جلدی سے ایک روپیہ میری جیب میں ڈال دیا۔ مَیں نہ نہ کرتا رہ گیا اور پیسے جیب سے نکال کر واپس پھینکنا ہی چاہتا تھا کہ اُسی لڑکے نے مجھے مضبوطی سے پکڑ کر پیسے میری جیب میں واپس ٹھونس دیے اور زبردستی گلے لگا لیا۔ اُس کی اِس حرکت سے میرے چہرے کا رنگ سُرخ ہو گیا۔ اُس وقت مجھے احساس ہوا کہ اُس کے جسم سے خوشبو بھی آ رہی تھی۔ یہ خوشبو کس چیز کی تھی، مَیں نہیں جانتا لیکن اُس کی وجہ سے مجھے اُس کا گلے لگانا بُرا نہیں لگا۔ ویسے بھی یہ لڑکا ہمارے گاؤں کے بڑے لڑکوں کی طرح بدصورت نہیں تھا اور مجھے اچھا لگا تھا لیکن یہ دیکھ کر بھی حیران ہوا کہ اُس کی ماں نے ذرا بھی اِس چیز کا نوٹس نہیں لیا کہ اُس نے مجھے اتنے جوش سے گلے کیوں لگایا تھا۔ اگر ڈاکٹر فرح کی جگہ وہاں میری والدہ ہوتیں تو بہت بُرا مانتیں۔ گلے لگانے سے اُس کے سانس لینے کی آواز میرے کان کی لَو کو چھو رہی تھی۔ لڑکا مجھے پہلو سے لگا کر بڑے پیار سے دروازے تک چھوڑنے آیا۔ اُس دن کے بعد ہماری دوستی ہو گئی۔ پھر کچھ ہی دن میں مجھے اُن کے بارے میں بھی سب کچھ معلوم ہو گیا۔

(۱۷)

ضلع خانیوال کے ایک چھوٹے سے گاؤں ٹبہ ولی بخش میں یہ تینوں بھائی رہتے تھے۔ ٹبہ ولی بخش ایک ٹیلے پر واقع تھا۔ اِس کے تین طرف سے راستے تھے اور چوتھی طرف نہر بہتی تھی۔ ٹیلے کی لمبائی مشکل سے دوسو میٹر تھی اور چوڑائی کی حد ایک سو میٹر ہوگی۔ البتہ کافی اونچا ہونے کی وجہ سے اِس میں ایک قسم کی ہیبت اور وقار تھا۔ تین ہزار ایکڑ رقبے پر وسیع کاشتکاری تھی۔ کاشتکاری اِن کا عملی شوق بھی تھا۔ سب سے بڑے کا نام احمد بخش، اُس سے چھوٹا اللہ بخش اور سب سے چھوٹے کا نام صادق بخش تھا۔ اِن کا باپ ولی محمد عرف ولی بخش جنگِ عظیم دوم میں انگریزوں کی طرف سے لڑتا ہوا اپنے ایک بازو سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ اُسی کے صلے میں اِنھیں کافی ساری زمین الاٹ ہوگئی اور کچھ اُس نے اپنی محنت اور ذہانت سے پیدا کر لی۔ حتیٰ کہ پاکستان بننے سے پہلے ہی ولی بخش ہزاروں ایکڑ کا مالک بن گیا۔ ولی بخش جب فوت ہوا تو تینوں بھائی بہت چھوٹے تھے۔ کچھ رقبہ شروع میں اِن کی دو پھپھیوں کے نام ہو گیا۔ اُن میں سے ایک کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ گھر بیٹھی رہی اور تین ہزار ایکڑ اِن تین بھائیوں کے حصے میں آ گئے۔ یہ تمام رقبہ نہری پانی کے سبب بہت زرخیز تھا۔ کماد گندم اور کپاس کی فصلیں ایسی ہوتیں کہ ہر طرف ہرا ہرا ہو جاتا۔ بیسیوں نوکر دن رات کام میں جُتے رہتے۔ پانچ سو ایکڑ پر باغات تھے۔ یہ باغ آم، مالٹا اور امرود کے پھلوں کے تھے۔ پورے رقبے میں چھوٹی چھوٹی سڑکیں اِس طرح بنائی گئی تھیں کہ اُن سڑکوں کے دونوں طرف سنبل اور پیپلوں کے درخت ہر وقت بے پناہ سایہ کیے رکھتے۔

پورے خانیوال میں ایک بھی زمیندار اِن کی ٹکر کا نہیں تھا۔ آس پاس کے ضلعوں میں بھی کوئی ایسا نہیں تھا جس کے پاس اتنی زیادہ زمین کے ساتھ وہاں کھیتی باڑی کا نظام بھی خوبصورت ہوتا۔ سب سے بڑے بھائی احمد بخش کا ایک بیٹا تھا۔ اس کا نام طلال احمد تھا۔ الٰہ بخش دوسرے نمبر پر چھوٹا تھا۔ الٰہ بخش کی بیوی نے ایک بیٹی کو جنم دیا اور خود اللہ کو پیاری ہوگئی۔ تب اُس نے دوسری شادی کر لی جس سے کوئی اولاد پیدا نہ ہوئی۔ ماں کے سوتیلے پن سے بچانے کے لیے الٰہ بخش نے بیٹی کو اُس کی نانی کے پاس لاہور میں چھوڑ دیا۔ دوسری بیوی کا نام ارشاد بیگم تھا جس سے کوئی اولاد پیدا نہ ہوئی۔

اُس سے چھوٹے یعنی صادق بخش کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ صادق بخش نے دو شادیاں کیں مگر دونوں سے اولاد پیدا نہ ہوئی۔ اولاد سے مایوس ہو کر صادق بخش نے کام کاج میں دلچسپی چھوڑ دی اور اپنے حصے کی زمین کاشت کرنے کے لیے احمد بخش کے حوالے کر کے حج اور سیر و سیاحت کو اپنا شعار بنا لیا۔ احمد بخش اور اُس کا بیٹا طلال زمینداری میں حد سے زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔ اِنھوں نے اپنی حویلی کے سامنے ایک ڈیرہ بنا رکھا تھا۔ یہ ڈیرہ کافی بڑا تھا۔ ڈیرے میں بیٹھ کر وہ اپنی زمینداری اور رعایا کے متعلق فیصلے کرتے۔ احمد بخش تاش اور فلم بینی میں بھی دلچسپی رکھتا۔ وہی عادتیں اُس کے بیٹے میں چلی آئیں بلکہ طلال میں باپ سے بڑھ کر ایک اور عادت بھی داخل ہوگئی کہ وہ آئے روز کسی نہ کسی خاتون سے بدتمیزی کرنے لگا۔ اِس کے باوجود ایک بات اُس میں ضرور تھی کہ اپنے باپ کے علاوہ دونوں چچاؤں کا ادب بھی باپ ہی کی طرح کرتا۔ اُنھیں چچا کہنے کی بجائے ابا کہہ کر پکارتا۔ نئے ملنے والوں کو کبھی پتا نہ چل پاتا کہ طلال کا باپ تینوں میں سے اصل میں کون ہے۔ اس لڑکے میں تمام بدمعاشیوں کے باوجود ایک بات قابلِ ستائش تھی کہ وہ اپنی زمینداری کے بارے میں بہت زیادہ دلچسپی رکھتا تھا۔

احمد بخش سے چھوٹے الٰہ بخش کا ایک ڈیری فارم بھی تھا۔ وہ کاشت کاری سے زیادہ ڈیری میں اور باغوں میں دلچسپی رکھتا تھا۔ تینوں کے مزاج ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔ اِس کی وجہ کیا ہو سکتی تھی؟ کسی کو معلوم نہیں۔ پاکستان بننے کے دس سال بعد ایک بار تینوں بھائیوں میں تھوڑی سی شکر رنجی اِس بات پر ہوئی کہ زمین کو تین حصوں میں تقسیم کر لیا جائے۔ احمد بخش کو یہ گوارا نہیں تھا۔ اُس کا خیال تھا زمین کے تقسیم ہونے سے علاقے میں اُن کا رعب داب ماند پڑ جائے گا اور کچھ زمینداروں کی زمین اُن سے زیادہ ہو جائے گی مگر الٰہ بخش اِسی تقسیم کے حق میں تھا۔ اردگرد کے گاؤں میں اِس تلخی کی خبر ہوئی تو علاقے کے بڑے زمینداروں نے بیچ میں پڑ کر سمجھایا لیکن الٰہ بخش کا تقاضا تھا بے شک زمینداری

اکٹھی کرتے رہیں مگر زمین کی تقسیم ضرور کر لی جائے۔آخر اُس کی بات تسلیم کر لی گئی لیکن احمد بخش کو یہ بات کسی طرح پسند نہیں آئی۔زمین کی تقسیم تین حصوں میں ہوئی تو اللہ بخش نے اپنی کاشت کاری بھی الگ کرنا شروع کر دی۔صادق بخش کی اولاد نہیں تھی مگر وہ اپنی زمین کا کچھ حصہ اپنی دونوں بیویوں کے نام کرنا چاہتا تھا۔احمد بخش نے اُسے فی الحال اِس کام سے باز رہنے کے لیے کہا۔احمد بخش نے صادق بخش کو اِس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ جتنی زمین اپنی بیویوں کے نام کرنا چاہتا ہے، احمد بخش اتنی قیمت کے پیسے اُس کی بیویوں کو دے دے گا اور زمین خود خرید لے گا۔ پھر چاہے تو اُس کی دونوں بیویاں اُن پیسوں سے کسی اور جگہ پر زمین خرید لیں یا اپنی کوئی اور قسم کی جائداد بنا لیں مگر اِس جگہ کی زمین اُن کے نام نہ لگائی جائے تا کہ زمین تقسیم نہ ہو۔صادق بخش نے اِس بات سے اتفاق کرتے ہوئے اپنی دونوں بیویوں کو قائل کر لیا چنانچہ صادق بخش کی زمین بھی طلال کاشت کرنے لگا۔

چھ مہینے کے بعد اللہ بخش کے ساتھ احمد بخش کی رنجش بھی جاتی رہی اور اب تینوں دوبارہ شیر وشکر ہو گئے۔اللہ بخش کی بیٹی کی عمر 17 سال تھی۔وہ اپنی نانی کے پاس لاہور میں رہتی تھی۔اللہ بخش اُنھیں بہت کم ٹبہ ولی بخش پر لے کر آتا۔اگر کسی وقت لاتا تو اُسی دن واپس بھیج دیتا۔اِس بات سے احمد بخش کئی بار ناراض بھی ہوا کہ بیٹی کو کیوں یہاں لے کر نہیں آتا؟ اُسے پتا چلے وہ زمینداروں کے سردار کی بیٹی ہے مگر اللہ بخش بہانا کر دیتا کہ وہ پڑھائی میں لگی ہے۔وہ اُسے ہر حالت میں ڈاکٹر بنانا چاہتا تھا تا کہ علاقے میں لوگ اُسے ڈاکٹر کا باپ کہہ کر پکاریں۔احمد بخش اور اللہ بخش میں ایک اور ذہنی امتیاز یہ تھا کہ احمد بخش ہر وقت اپنے ڈیرے پر پولیس کے بڑے افسروں، کمشنروں اور سیاستدانوں کو دعوت پر بلاتا۔ اُنھیں شکار پر لے جاتا۔خاص کر کراچی کی حکومتی اشرافیہ کی دعوتیں کر کے اُنھیں دیہات کی پرسکون زندگی میں سانڈنی کی نوابی سواریاں کراتا، شہ سواری اور اونٹ گاڑی کے پہیے جھولاتا۔اِن سب سے بڑھ کر آم کے دنوں میں بڑے بڑے افسروں کے گھروں میں آم کی پیٹیاں تحفے میں دے کر سب کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔عمدہ کھانوں کی دعوتیں کرتا۔علاقے کے ایم این اے اور ایم پی اے بھی اُس کی اجازت لے کر الیکشن میں حصہ لیتے مگر وہ خود الیکشن نہ لڑتا۔کئی بار اُس کی رعایا اور خاص طور پر بیٹے طلال بخش نے اُسے کہا میاں صاحب آپ خود الیکشن لڑیں اور پورے ضلع پر حکومت کرنے کا بندوبست رکھیں۔اُس کے جواب میں احمد بخش کہتا،" میاں دیکھو الیکشن سر دردی اور پیسے کے اُجاڑے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ووٹ کے لیے کیڑے مکوڑوں کی منتیں کرنا پڑتی ہیں اور کس لیے کہ طاقت ہاتھ میں آئے،

اِدھر تم دیکھتے ہو یہ بڑے بڑے سورمے یہاں حاضری دیتے ہیں۔ اِن سے کچھ بھی کروالو۔ الیکشن لڑنے والے اپنا پیسہ بھی خود لگاتے ہیں، ہمارے محتاج بھی رہتے ہیں اور وہی کام، جو ہم نے الیکشن کے بعد اپنے لیے خود کرنے ہیں، وہ ہم اِن سے مفت میں لیتے ہیں۔ رہے سرکاری ملازم، تو بھائی یہ سرکاری نوکر طاقتوروں کے شکاری کتے ہوتے ہیں، خود طاقت نہیں ہوتے۔ اِن کی زنجیریں ہمارے ہی ہاتھوں میں ہیں۔ آپ کتے کو راشن دیں وہ آپ کا وفادار رہے گا اور جسے کہو گے، یہ کاٹ لے گا۔ اپنے بھائی کو بھی کاٹ لے گا۔ مَیں تو کہتا ہوں جس کے منہ کو رشوت کا خون لگ جائے، جو یہاں دو چار دانوں کو چھوڑ کر ہر سرکاری افسر کو لگا ہوا ہے، اُسے پیسے دے کر کہو اپنے باپ کا کلیجا کھالے، وہ کھا جائے گا۔"

لیکن میاں جی کوئی نہ کوئی افسر اکڑ بھی تو جاتا ہے، ڈیرے پر بیٹھے ہوئے ایک شخص لال دین نے احمد بخش کی بات کو کاٹا۔

احمد بخش لال دین کی بات پر ہلکا سا مسکرایا، میاں لالے، سرکاری نوکر میں کہاں کی اکڑ؟ یوں کہو اُس کے گلے کا پٹہ کسی دوسرے کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ وہ اپنی ایمانداری کے نہیں، اپنے کسی آقا کے بانس پر چڑھا ہوتا ہے۔ تم اُس کے اصلی آقا کو ڈھونڈ کر اُس کا بانس نیچے سے نکلوا دو، اپنے آپ نیچے آپڑے گا۔

پر چودھری صاحب ایک ذات اِن سب سے اُوپر بھی بیٹھی ہے جس کا بانس ہر ایک کے نیچے چڑھا ہے اگر اُس نے کسی دن اپنا بانس کھینچ لیا تو کیا بنے گا؟ خیر اللہ نے ہنستے ہوئے اپنی بات کر ہی دی، جس پر احمد بخش سمیت سب ہنس پڑے۔

دُر فِٹے منہ خیرے، تیرے منہ سے کبھی خیر کا کلمہ نہ نکلے گا، جب بولے گا منحوس جملہ بولے گا۔ احمد بخش نے کہا۔

چودھری صاحب کسی دن اِس کا بانس بھی نکال ہی دیں، لال دین نے دوبارہ خیرے کو جت کی۔

لالے خدا نے ہمارے نیچے تو بانس رکھا ہی نہیں جو نکالے۔ ہاں چودھری کے جوتے سارا سال سر پر رہتے ہیں۔ وہ اُٹھالیں تو سر ہلکا ہو جائے، خیر دین نے ایک طنز کا جملہ پھینک دیا۔

اگر تیرے سر سے جوتے اُٹھالیے تو پھر تُو کب یہاں ٹِکے گا؟ چودھری احمد بخش نے خیر دین کی طرف منہ کر کے گھورا اور خیر دین کھسیانا سا ہو کر بیٹھ گیا۔ اِسی وقت لال نے بات دوبارہ پلٹی، چودھری

صاحب آپ سیاست کی بات کر رہے تھے۔

چودھری صاحب تو سیاست کی بات کر رہے تھے، بیچ میں گیدڑی ماروں کی بات آن آئی، لال دین نے پھر جملہ پھینکا۔

اصل میں خیر دین کا قبیلہ پکھی واس تھا جن میں سے اکثر اوڈ کہلاتے تھے۔ پکھی واسوں میں جو مسلمان ہو گئے تھے اُنھیں اب اوڈ کہا جاتا تھا اور جو مسلمان نہیں ہوئے تھے اُنھیں گیدڑی مار ہی پکارا جاتا تھا۔ لیکن لال دین خیرے کو گیدڑی مار کہہ کر اُسے چڑاتا تھا۔

اور اب خیرا واقعی چڑ گیا تھا۔ اُس نے جوابی حملہ کیا، لال دین اللہ کا کرم ہے باپ دادا نے ساری عمر اپنی محنت کر کے گیدڑ مار کر کھائے ہیں، آپ کے باپ کی طرح چودھری ولی بخش کی لعنتیں نہیں کھائیں، نہ گورے بابا کی میموں کے پوتڑے دھو کر جاگیرداریاں لیں۔ یہ جس جگہ تُو چوتڑ لگا کے بیٹھا ہے، یہاں میرے باپ کے چھوہے پلتے تھے۔ ہم پچھلے ہزاروں سال سے اسی بیلے کے باسی ہیں۔ یہ چودھری اور آپ کی کمین ہی اصل پکھی واس ہو۔ برفوں سے بھوکے مرتے یہاں آ گئے اور یہاں آ کر ہمارے گیدڑ کھا گئے۔ اب دُور دُور نظر کر کہیں گیدڑ نظر آتا ہے تو بتا؟ پوچھ لے چودھری صاحب سے، کیوں چودھری جی؟ مگر چودھری سمیت اب سب کے سروں میں پانی پڑا ہوا تھا، کوئی نہ بولا۔ کیونکہ جب خیرا بولتا تھا تو سب کی بولتی بند کر دیتا تھا۔ یہ اصل میں ولی بخش کا پرانا نوکر تھا اور احمد بخش اسے کسی بات پر بھی کچھ نہیں کہتا تھا۔

چودھری بولا، چاچا خیرے تُو مجھے تو بخش دیا کر۔ ہاں لال دین کی جتنی مرضی لال کیا کر تجھے کوئی نہیں روکتا۔

چودھری صاحب مجھے کیا پتا، مَیں تو یہی سمجھتا ہوں آپ کی دھوتی کے نیچے یہی لال دین لٹکا ہوتا ہے۔ اِس لیے آپ کا نام آپو آپ بیچ میں آ جاتا ہے۔

خیر دین کی اِس بات پر ایک زور کا قہقہہ لگا اور چودھری احمد بخش تو ہنس ہنس کے دوہرا ہوتا گیا۔ اُس کے بعد لال دین کا نام ہی لوگوں نے ''چودھری کی لٹکن'' رکھ دیا۔

کافی دیر ہنسنے کے بعد چودھری کو اپنی بات یاد آ گئی، وہ دوبارہ بولا، بس بھئی اب مذاق ختم۔ تو مَیں بات کر رہا تھا جب آپ سیاست میں آتے ہیں پھر ایک تو آپ لوگوں کی نظروں میں آ جاتے ہیں۔ پھونک پھونک کر پاؤں رکھنا پڑتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی بات پر بڑی بڑی پکڑ ہونے کا خطرہ ہوتا ہے اور

حاصل وصول کچھ نہیں ہوتا۔ اور تو اور نکمو تم نے بھی رعایا ہونے سے انکار کر دینا ہے۔ سب خیر دین بن جاؤ گے، نہ لحاظ نہ مروت۔ اپنے ووٹ کی طاقت دکھاؤ گے۔ میاں سو باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ تم نے دیکھا، مَیں نے کبھی کسی کن ٹٹے کو یہاں جگہ دی ہو؟ وہ ایک تو کام ادھورے کرتے ہیں پھر بدنامی کا باعث بھی بنتے ہیں۔ کسی بھی طرح کا کام ہے، پولیس افسر کو بلاؤ، اُسے ہدایات دو اور بے فکر ہو کر بیٹھ جاؤ۔ وہ وہی کام ایسے پڑھے لکھے طریقے سے کرے گا کہ کسی کو بدگمانی تک نہ ہو گی۔ خدا کی قسم آج تک مَیں نے پولیس سے بڑا سمجھ دار کن ٹٹا نہیں دیکھا۔ اِسی لیے مَیں اِن کو یہاں بلا کر راتب ڈالتا ہوں اور وہ شوق سے کھانے آتے ہیں۔

(۱۸)

احمد بخش کے صادق بخش سے معاہدے کے دو سال گزر گئے۔ اب کچھ دن سے صادق بخش اور احمد بخش میں دوبارہ تکرار شروع ہو گئی تھی۔ صادق بخش کی شکایت تھی کہ احمد بخش نے وعدے کے مطابق اُس کی بیویوں کو پیسے نہیں دیے اور زمین مسلسل کاشت کیے جا رہا ہے بلکہ اُس کی زمین کا جتنا ٹھیکا بنتا ہے وہ بھی پورا نہیں دے رہا۔ احمد بخش اُسے مسلسل ٹال مٹول کر رہا تھا۔ یہ تکرار ایک دن بہت اونچی ہو گئی مگر دونوں بھائیوں کے علاوہ اُس میں کسی تیسرے نے حصہ نہیں لیا۔ بات اِس طرح طے ہوئی کہ احمد بخش اِس سال کی کپاس کی فصل پر اُس کی دونوں بیویوں کا حصہ جتنا مقرر کیا گیا ہے اُنھیں دے دے گا۔ دوسری طرف زمین کی تقسیم سے کچھ عرصے بعد اللہ بخش اور احمد بخش کی رنجش تو دور ہو گئی مگر اللہ بخش اپنے بھائی احمد کے ساتھ اب ڈیرے پر کم ہی بیٹھتا تھا۔ یہ ڈیرہ تینوں بھائیوں کا سانجھا تھا مگر اب فقط احمد بخش اور اُس کے بیٹے کے استعمال میں رہ گیا۔ اللہ بخش اپنی زمینوں میں کام کرنے والوں کو گھر کے صحن میں ہی بلا لیتا اور وہیں ہدایات دیتا تھا جبکہ احمد بخش کا سارا دن ڈیرے داری میں گزرتا۔ اِس طرح ٹبہ ولی بخش میں احمد بخش تو ہر طرف سے سوشل تھا مگر باقی دونوں بنیادی طور پر تنہائی کا شکار ہو گئے۔

ایک شام پانچ بجے اللہ بخش اپنے ملازموں کو ہدایات دے رہا تھا تو طلال احمد بھاگتا ہوا اُس کے پاس آیا۔ اُسے سانس چڑھی ہوئی تھی اور چیخیں مار کر رو رہا تھا۔ طلال احمد کی عمر تیس سال سے کم نہیں

تھی۔ اُسے طلال کا اِس وقت بچوں کی طرح رو رو کے چیخیں مارنا عجیب سا لگا۔ وہ بھاگ کر پیچھے کی طرف پلٹا۔ طلال احمد الٰہ بخش کو بھی اپنا ابا کہہ کر پکارتا تھا۔ اس نے کہا، ابا جی صادق ابا کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ وہ خانیوال شہر سے ٹبہ پر آ رہے تھے کہ راستے میں اُن کی جیپ ایک پتھر سے ٹکرا کر گڑھے میں گر گئی۔ پولیس اُن کی لاش کو لے کر آئی ہے۔ الٰہ بخش نے یہ سُنا تو اپنا دل پکڑ کر بیٹھ گیا۔ صادق بخش اُس کا چھوٹا بھائی تھا اور بہت خوش طبع تھا۔ ہمیشہ اُسے جھک کر ملتا۔ کبھی دونوں میں شکر رنجی نہ ہوئی تھی۔ اولاد کے نہ ہونے کے سبب بجھا بجھا رہتا۔ الٰہ بخش بھاگ کر باہر نکلا اور ڈیرے پر آ گیا۔ اُس کی لاش پولیس نے گاڑی سے اُتار کر ایک چارپائی پر رکھ دی تھی۔ ایک طرف احمد بخش کھڑا دھاڑیں مار کر رو رہا تھا۔ الٰہ بخش کو جیسے ہی قریب آتے دیکھا بھاگ کر اُس کے گلے لگ گیا اور رونے لگا۔ کچھ گھر کی خواتین کے رونے کی آواز بھی حویلی کے اندر سے آ رہی تھی۔ ایک چارپائی پر اُس کی دونوں بیویاں پڑی تھیں۔

قصہ یہ ہوا کہ آج صبح صادق بخش اپنی دونوں بیویوں کو جیپ پر بٹھا کر خانیوال کچہری میں گئے تاکہ بیویوں کے حصے کی زمین اُن کے نام کر دے۔ تحصیل دار نے پٹواری کو کاغذات تیار کرنے کے لیے کہا تھا مگر وہ ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا اور مختلف عذر اور ضروری چیزیں جو انتقال میں پیش آتی تھیں اُن کی دستیابی کے لیے صادق بخش کو کچہری میں چکر لگوا رہا تھا۔ حالانکہ صادق بخش نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ یہ سب کام اُس کا باپ اور اُس کا بھائی ایک ہی دن تحصیلدار اور پٹواری کو اپنے ڈیرے پر بلا کر انجام دے لیتے تھے۔ جبکہ تمام کاغذات پورے ہونے کے بعد بھی تحصیلدار نے کل پھر بہانہ کر دیا تھا اور کہا وہ اگلے دن اپنے ساتھ دو گواہ اور نکاح نامے بھی لے کر آئے۔ آج صبح صادق بخش اِن سب چیزوں کا اہتمام کر کے لے گیا مگر کچہری میں کمشنر کی آمد کے سبب تمام عملہ دفتری کام چھوڑ کر اُس کے پروٹوکول کے لیے جمع ہو گیا اور صادق بخش کا کام آج بھی نہ ہو سکا۔ اُسے کل پر ٹال دیا گیا۔ واپسی پر صادق بخش کی جیپ ایک میل ستون سے ٹکرا کر اُلٹ گئی اور ایک گہرے کھڈ میں جا گری۔ تینوں کے سروں اور جسم کے دوسرے حصوں پر گہری چوٹیں آئیں۔

صادق بخش کا حادثہ شہر کے قریب ہی ہوا تھا۔ اُسی وقت ایک پولیس کی گاڑی خود حادثے کی جگہ پہنچ گئی۔ وہ زخمیوں کو لے کر سیدھے ہسپتال گئی۔ وہیں ایس پی پولیس پہنچ گیا۔ ایس پی صاحب نے ایک آدمی احمد بخش کی طرف دوڑایا جس نے فوراً آ کر اطلاع دی۔ احمد بخش اُسی وقت خانیوال نکل گیا اور دوسرے بھائی کو خبر نہیں دے سکا۔ اب وہ لاشوں کے ساتھ ہی واپس ڈیرے پر آیا تھا۔ پولیس نے

حادثے کی کارروائی مکمل کر کے احمد بخش سے دستخط بھی لے لیے کہ بڑا بھائی ہونے کے ناتے وہی اُس کا وارث تھا۔ کچھ ہی دیر بعد پولیس چلی گئی۔ لاشیں احمد بخش کے گھر میں چلی گئیں۔ جہاں ساری رات عورتوں نے رو رو کر آسمان سر پر اُٹھائے رکھا۔ احمد بخش بار بار الہٰ بخش کے گلے لگ کر روتا رہا کہ اُن کا بےاولاد بھائی چل بسا اور پیچھے کوئی نام چھوڑ کر نہیں گیا۔ یہ کتنا بڑا دکھ تھا۔ الہٰ بخش کے سینے میں اِس موت پر گویا کسی نے خنجر گھونپ دیا تھا۔ دوسرے دن ارد گرد کے ہزاروں لوگ جنازے پر آئے، وہ بڑھ کر الہٰ بخش اور احمد بخش کو پرسہ دے رہے تھے۔ الہٰ بخش نے دیکھا جنازے کا پرسہ دینے والوں کی اکثر تعداد پولیس والوں کی تھی۔ ایس پی اور ڈی ایس پی سے لے کر آئی جی پولیس تک وہاں پہنچے تھے۔ یہاں تک کہ آس پاس کے ضلعوں سے کوئی سیاسی آدمی بھی پیچھے نہ تھا۔ اُن میں سے اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جنھیں الہٰ بخش نہیں جانتا تھا۔ یہ لوگ کیسے اور کب اُن کے واقف بنے، اِس بارے میں الہٰ بخش بالکل بےخبر تھا۔ طلال بخش رہ رہ کر روتا تھا اور سر پیٹ رہا تھا۔ تین دن تک یہ پرسہ داری اور ماتم چلتا رہا۔

ایک دن الہٰ بخش نے اپنے چار آدمیوں کو ساتھ لیا اور جائے حادثہ پر پہنچ گیا۔ وہاں نہ تو ایسا کوئی کھڈا تھا اور نہ ایسی کوئی جگہ تھی جہاں میل سٹون کھڑا ہو۔ الہٰ بخش نے قریب کے کچھ لوگوں سے بات چیت کی کہ اُنھیں یہاں کسی حادثے کی اطلاع ہو لیکن مقامی لوگوں نے ایسے کسی حادثے کی بابت اپنی بےخبری بتائی۔ صادق بخش کی جیپ کا معاملہ بھی عجیب تھا۔ وہ ڈیرے کے بڑے دروازے کے بائیں طرف کچلی ہوئی پڑی تھی اور صاف ایسے لگتا تھا جیسے اُسے کسی سڑکیں بنانے والے رولر نے کچلا ہو۔ وہ پسی ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ سیٹ جہاں صادق بخش بیٹھا تھا، وہ بھی مکمل تہہ ہو چکی تھی۔ اگر صادق بخش اِس سیٹ پر تھا تو اُس کی ہڈیوں کا میدہ بننا چاہیے تھا۔ الہٰ بخش کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا آخر وہ کون سی جگہ ہے، جہاں صادق بخش کی جیپ اُلٹی ہے مگر اُسے وہ مقام نہ مل سکا۔ یہ کیسے ممکن تھا اتنا بڑا حادثہ ہو اور مقامی لوگ اُس سے بالکل بےخبر ہوں۔ الہٰ بخش اپنے ساتھیوں کے ساتھ واپس آ گیا اور رات اکیلا گھر میں آ کر لیٹ گیا۔ اُس کا جی چاہا وہ چیخ چیخ کر روئے۔ پھر ایک دم اُسے رونا آ گیا اور وہ اونچی اونچی دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ اُس کا رونا رُک نہیں رہا تھا۔ الہٰ بخش صادق بخش کی موت سے لے کر اب تک بالکل نہیں رویا تھا بلکہ خاموش پھرتا رہا تھا۔ اُسے چار دن تک ایسے چُپ لگی رہی جیسے کسی کے مرنے کا یقین نہ آ رہا ہو۔ اکثر بڑے دُکھ انسان سے وقوع کے وقت اپنی اہمیت کا اندازہ نہیں ہونے دیتے۔ وہ بےدماغی کی کیفیت میں اُن کا سامنا کرتا ہے۔ جب حادثے کو کچھ وقت گزر جاتا ہے تب انسان کے

حواس بحال ہوتے ہیں۔ اُس وقت اُسے اپنی شکست کا احساس ہوتا ہے اور رونے کی فرصت ملتی ہے۔
یہی حالت اِس وقت الہ بخش کی تھی۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا، صادق بخش جو آج تک اپنے ہر رشتے کا
پاس کرنے والا تھا اور کسی کے لیے ایک لحہ تک ضرررساں نہ ہوا تھا، بے خبری میں کیسے مارا گیا۔ الہ بخش
کے رونے کی آوازیں سُن کر اُس کے نوکر چاکر اور عام خواتین اکٹھی ہو گئیں اور اُسے دلاسے دینے
لگے۔ لیکن وہ چپ نہیں کر رہا تھا، بچوں کی طرح ہچکیاں لینے لگا۔ رونے کی آوازیں سُن کر احمد بخش اور
اُس کا بیٹا طلال بھی آ گیا۔ دونوں قریب آ کر بیٹھ گئے۔ وہ دونوں بھی رونے لگے۔ پھر آہستہ آہستہ سب
کو ایک طرح کا سکون آ گیا۔ دوسرے دن صبح ہی الہ بخش نے اپنی بیوی اور بیٹی کو ساتھ لیا اور ملتان آ
گیا۔ الہ بخش کی بیٹی اُسی رات لاہور سے آئی تھی جس دن اُس کا چچا فوت ہوا تھا اور تب سے اب تک
یہ رہی تھی لیکن الہ بخش نے اُسے سختی سے ہدایت کی تھی کہ وہ گھر سے باہر قدم نہ رکھے۔

الہ بخش نے ملتان میں اپنی بیٹی اور بیوی کے لیے بینک میں پیسے جمع کروائے اور ایک وصیت
نامہ تیار کروایا جس میں اپنی تمام زمین اپنے بعد بیٹی اور بیوی کے نام ہبہ کرنے کی ہدایات جاری کیں۔
اُس کے بعد الہ بخش نے بیٹی کو واپس لاہور بھیج دیا۔ اِس کام میں اُسے تین دن لگ گئے۔ چوتھے دن
شام بیوی کے ساتھ واپس آ کر اپنے نوکروں کو لیا اور آلوؤں کی فصل کی کاشت کے بارے میں زمین کی
کھالیاں تیار کروانے لگا۔ وہ سنبلوں کے درختوں کی لائن کے سائے میں موجود اُس نہر کے چھوٹے سے
پُل پر بیٹھا تھا جو اُس نے دو سال پہلے خود بنوایا تھا جب اُس کی احمد بخش سے تلخی ہوئی تھی۔ نہر کے پہلے
والا پُل احمد بخش کی زمینوں پر تھا اور الہ بخش وہاں سے گزرنا نہیں چاہتا تھا۔ بیلوں کے ہل جُتے ہوئے
تھے اور کھالیاں تیار ہو رہی تھیں۔ اِس بار اُس کا اِرادہ تھا کہ وہ چار سو ایکڑ پر آلو کی فصل کاشت کرے
اور اُسے عربوں میں بھیجنے کے لیے احمد بخش سے آزادانہ طور پر بیوپاریوں سے رابطہ کرے۔

اتنے میں اُس کا ایک پٹواری اپنی سائیکل پر اُس کی طرف آتا نظر آیا۔ الہ بخش اُٹھ
کر کھڑا ہو گیا اور نوکروں سے کہا اُس کی چارپائی پل سے ہٹا کر سُنبل کے سائے میں کر دیں جہاں سایہ
کافی گہرا ہو گیا تھا۔ اتنے میں پٹواری نزدیک آ کر سائیکل سے اُتر گیا اور چودھری الہ بخش کو سلام کر کے
ایک طرف ہو گیا۔ الہ بخش نے اُس کے سلام کا جواب دیا اور آنے کا سبب پوچھا۔ پٹواری نے کہا، میاں
صاحب اگر تھوڑا سا ایک طرف ہو کر بات سُن لیں تو زیادہ بہتر ہے۔ یہ بات نوکروں کے سامنے کرنے
کی نہیں۔

یہیں بات کرلو۔ خیر تو ہے؟ یہ سب اپنے ہی لوگ ہیں۔ اللہ بخش نے حیرانی سے پوچھا۔

پٹواری زمین پر بیٹھ گیا اور اپنا بستہ کھولنے لگا۔ یہ کپڑے سے سیا ہوا بستہ جسے جھولا کہتے ہیں، اِس میں موجود رجسٹر، ایک لمبے چوڑے نظام کا برطانوی پٹوار خانہ تھا۔ بستہ کھولتے ہوئے اُس نے پھر کہا، چودھری صاحب یہاں تو سگے بھائی اپنے نہیں ہوتے، غیر کہاں سے اپنے ہو گئے؟

کیوں کیا ہوا؟ پٹواری کا جملہ سُن کر اللہ بخش ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اُسے احساس ہوا پٹواری گہری بات کر گیا ہے، یہیں اُوپر آ بیٹھیں۔ اللہ بخش نے اُسے ہاتھ سے پکڑ کر اُٹھانے کی کوشش کی اور نوکروں سے کہا، بھئی شاباش آپ لوگ اُدھر چلے جائیں اور کام کریں۔

پٹواری اُسی رجسٹر کے ساتھ چار پائی پر اللہ بخش کی پائنتی بیٹھ گیا۔

جاؤ بھئی اپنا اپنا کام کرو، اللہ بخش نے اپنے دو ملازموں کو دور جانے کا اشارہ کر دیا، اُس کے بعد رجسٹر کھول لیا۔

چودھری صاحب، کیا صادق بخش نے مرنے سے کچھ دن پہلے اپنی ساری زمین طلال بخش کے نام کر دی تھی؟ یہاں ساری زمین اُس کے نام ہے۔

کیا مطلب؟ پٹواری کی بات سُن کر اللہ بخش کے گویا حواس منتشر ہونے لگے، یہ کیا بک رہا ہے؟ اگر وہ اپنی زمین طلال کے نام کرتا تو کم از کم مجھے ضرور بتاتا۔

لیکن یہاں اُسی دن تمام زمین اُس کے نام کی گئی ہے جس دن وہ حادثے میں فوت ہوا ہے۔ یہ دیکھیے۔ پٹواری نے اللہ بخش کو فرد دکھاتے ہوئے اپنی طرف جھکنے کو کہا، مَیں نے کہا آپ کو بتا دوں اور یہ کام ایک دو دن کا نہیں ہے۔ مسلسل کئی دنوں سے ہوا ہے۔ ایک اور بات سنیے صادق بخش کے جس اسٹام پر دستخط ہیں وہ الگ ہے۔ اُس تاریخ میں طلال کو مَیں نے کچہری میں نہیں دیکھا۔ لگتا یہ ہے کہ پٹواری نے اُن کے نام یہ کھاتے یہاں آ کر چڑھائے ہیں اور صادق بخش سے دستخط کچہری میں لیے گئے ہیں۔ اگر کوئی گڑ بڑ ہے تو ابھی تک آپ کے پاس حق شفعہ کا وقت ہے۔ آپ اِسے کورٹ میں چیلنج کر دیں۔ زمین کی منتقلی پر صادق بخش کے دستخط اور انگوٹھا موجود ہیں مگر طلال کے دستخط اور انگوٹھے کی سیاہی وہ نہیں جو صادق بخش کے دستخط اور انگوٹھے کی ہے۔

پٹواری کی بات سُن کر اللہ بخش خموش ہو گیا۔ اُسے پہلے ہی شک تھا کہیں گڑ بڑ ضرور ہے۔ اُس کے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی اور ایک منحوس قسم کی اُلجھن نے پکڑ لیا۔ یہ احمد بخش اُن کے

ساتھ کیا کر رہا تھا؟ وہ تو اُن کا بڑا بھائی تھا پھر ایک دم اُن کا دشمن کیسے بن گیا؟ اُس کا بھتیجا جو اُنھیں اپنا والد کہتا تھا اور جہاں ملتا انتہائی ادب سے ملتا، وہ کیسے اُن کی جان کا دشمن ہو سکتا ہے؟ مگر جو کچھ سامنے آ رہا تھا، اُس سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ نیک طینت دل کے مالک کو بدطینتی کے متعلق کسی احساس کا تجربہ نہیں ہو سکتا۔ وہ اُن کیفیات کو محسوس ہی نہیں کر سکتا جو بدطینت شخص کے وجود سے جنم لیتی ہیں پھر وہ اُنھیں بیان کرنے کا اہل کیسے ہو سکتا ہے۔ اللہ بخش اِس وقت اُنھی احساسات سے گزر رہا تھا۔ اُسے اپنے بھائی اور بھتیجے کی فطرت میں رواں دواں مجرمانہ کیفیتوں کے سمجھنے میں مشکل پیش آ رہی تھی جنھیں انجام دیتے ہوئے احمد بخش اور اُس کے بیٹے کو کوئی مشکل نہیں ہوئی۔

ایک کام کرو، آخر اللہ بخش نے پٹواری سے کہا، تم اِن سب کی نقلیں مجھے تیار کر کے دو۔ اگلے دو دن وہ تمام مواد مجھے لا کر دو جنھیں وکیل کو مقدمہ دائر کرنے کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے۔ آگے دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے، اللہ بھلی کرے گا۔

چودھری صاحب آپ پر خدا اپنی مدد کا اعلان کرے۔ پٹواری بولا، ایک گزارش ہے آپ سے۔ خدا کا واسطہ ہے یہ معاملہ اپنے تک ہی رکھیے گا اور میرا ذکر کہیں نہ آنے دیجیے گا۔ پٹواری مجید اور تحصیلدار صاحب کو پتا چل گیا کہ یہ خبریں نے دی ہے تو مجھے کسی گھپلے کے کیس میں پھنسا کر نوکری اڑا دیں گے اور آپ کے بھائی کی طرف سے بھی خطرہ ہو گا۔

تم فکر نہ کرو، تمھارا نام اس معاملے میں کہیں نہیں آئے گا۔ اللہ بخش نے سو روپے کی خطیر رقم نکال کر پٹواری کے حوالے کی۔ یہ رکھو، آگے بھی جو ہو سکا مَیں تمھاری خدمت کرنے میں کوتاہی نہیں کروں گا۔

سو روپے کا نوٹ جسے پٹواری نے پکڑ کر اپنی جیب میں ڈالنے سے پہلے تھوڑی دیر ہاتھ میں رکھ کر محسوس کیا تھا، اُس کے لیے ایک خزانے سے کم نہیں تھا۔ پٹواری کے چہرے پر ایک رونق دوڑ گئی تھی مگر وضعداری سے بولا، ''چودھری صاحب اِس کی کیا ضرورت تھی۔ مَیں تو یہ کام اللہ رسول کے واسطے سے کر رہا ہوں۔ مَیں ظلم ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔ اِس لیے بتانے آ گیا ہوں۔''

پٹواری سلام کر کے اُسی سائیکل پر دوبارہ بیٹھ گیا۔ اُس کے جاتے ہی اللہ بخش نے اپنے ملازم سے کہا، ممدو دیکھو خبردار بھائی احمد بخش کو پٹواری کے آنے کی بالکل خبر نہ ہو ورنہ مَیں تمھاری چمڑی اُدھیڑ دوں گا۔

اگلے ہی دن الٰہ بخش حویلی میں آ کر اپنے تین نوکروں کے ساتھ خانیوال گیا اور عدالت میں جا کر اپنے وکیل سے بات کی۔ پھر ایک وصیت لکھوائی، اُس وصیت کو اپنے وکیل اور عدالت کے گواہوں کی موجودگی میں ایک بینک میں محفوظ کر دیا۔ یہ پورا دن اُس کا اسی کام میں گزر گیا۔ شام کو واپس آ گیا لیکن اُسے تمام رات نیند نہیں آئی۔ اگلے دن سورج جب پوری آب و تاب سے نکلا تھا، الٰہ بخش دوبارہ خانیوال کی طرف روانہ ہو گیا اور ایس پی پولیس فیصل جہانگیر کے دفتر میں داخل ہو گیا۔

الٰہ بخش کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ہی ایس پی اُس کے استقبال کے لیے دروازے کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

آیئے چودھری صاحب، تشریف لایے، الٰہ بخش کے داخل ہوتے ہی ایس پی نے اُسے ہاتھ ملا کر ایک کرسی پیش کی۔

الٰہ بخش کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ ایک دو بار پہلے سرکاری افسروں کے ہاں جا چکا تھا لیکن اُس وقت اُس کا وہاں جانا کسی کام کے لیے نہیں تھا۔ پھر یہ کہ وہ جگہ کلب یا اُن کے گھر تھے۔ تھانے کچہری یا اس طرح کی جگہیں عجیب نحوست زدہ ہوتی ہیں۔ جہاں سرکاری ملازم اور عوام کا درمیانی فاصلہ کئی سمندروں کی گہرائی اور چوڑائی کا آئینہ ہوتا ہے۔ وہ وہاں کبھی نہ گیا تھا۔ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ایک آدمی نے ٹیبل پر چائے رکھ دی۔ سرکاری آفس میں کسی چائے کا موجود ہونا بذاتِ خود ایک بڑی بات تھی۔ چائے کسی سائل کے سامنے رکھنے کا مطلب تھا کہ سائل کی وقعت افسر کے متوازی ہے۔ الٰہ بخش چائے کی چسکیوں کے ساتھ بڑے انہماک سے ایس پی صاحب کے آفس اور کمرے کو گھور رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا وہ کچھ ایسی بات کہنا چاہ رہا ہے جس کے لیے مناسب الفاظ موجود نہیں ہیں۔ نہ اُس کا پہلے کبھی ایسے کام سے واسطہ پڑا تھا۔ ایس پی کی کرسی کے عین پیچھے دیوار کے ساتھ محمد علی جناح کی تصویر کسی مظلوم کی طرح لٹک رہی تھی۔ الٰہ بخش تصویر کو مسلسل گھور رہا تھا۔

چودھری صاحب، فرمایے آج ہمیں کس لیے عزت بخشی؟ آخر ایس پی صاحب نے پوچھ لیا۔

الٰہ بخش کے آفس میں پہلی بار آنے کی اطلاع ملتے ہی اُس کے دماغ کی گھنٹیاں بج چکی تھیں۔ اب وہ بے چین ہو رہا تھا کہیں کھلے تو سہی آخر الٰہ بخش کہاں تک پہنچا ہے۔

جناب رانا صاحب بات یہ ہے کہ میرے بڑے بھائی احمد بخش کو پٹے دار کتے خریدنے کا بہت شوق ہے۔ میں تو بس اِدھر اُدھر یہ دیکھتا پھر رہا ہوں، وہ کہاں کہاں ہیں؟ اُن کی پہچان مجھے بھی ہونی

چاہیے۔ نہ جانے کب مجھے بھی کاٹ لیں۔ اللہ بخش کے منہ سے اچانک اتنا سخت جملہ نکل گیا تھا جس کی تلخی کو اُس نے خود اپنے حلق میں محسوس کر لیا تھا مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ ایسا آدمی جسے اپنی بات کہنے کے لیے الفاظ نہ مل رہے ہوں وہ جلد ہی جھگڑے کی طرف نکل جاتا ہے۔

بھائی احمد بخش کے گُتے؟ ایس پی حیرانی سے بولا، وہ آپ کو کیوں کاٹیں گے؟

میاں جب بھائی ہی جان کا دشمن ہو جائے پھر گُتے تو کاٹیں گے نا؟ بس اُنھی کے سُراغ میں ہوں۔

ایس پی رانا فیصل جہانگیر نے ایک کھسیانی سی ہنسی میں کہا، چودھری صاحب کیسی عجیب باتیں کرتے ہیں۔ یہاں کون سا کتوں کا کاروبار چل رہا ہے؟

رانا صاحب، کاروبار کے لیے یہی جگہیں سب سے زیادہ محفوظ اور مناسب ہوتی ہیں۔ خیر چھوڑیں اِن باتوں کو۔ مَیں ایک خاص کام سے آیا ہوں۔

جی میاں صاحب، اگر میرے لائق ہوا تو میرے لیے اعزاز کی بات ہے۔ ایس پی رانا فیصل نے جواب دیا۔

ایس پی صاحب، کیا مَیں قتل یا حادثے کا شکار ہونے سے پہلے اپنی ایف آئی آر درج کرا سکتا ہوں؟ اِس طرح کا کوئی قانون ہے؟ اللہ بخش نے کہا

اللہ بخش کی بات سُن کر ایس پی صاحب ایک دم الرٹ ہو گیا، چودھری صاحب اللہ نہ کرے آپ حادثے کا شکار ہوں۔

کیوں؟ میرا بھائی صادق بخش ہو سکتا ہے تو مَیں کیوں نہیں ہو سکتا؟ اللہ بخش تلخی سے مسکرایا، یہ عین ممکن ہے، کچھ دنوں بعد یا پھر یہیں سے نکلتے ہوئے دوسرا میل سٹون مجھے گڑھے میں پھینک دے۔

مَیں سمجھا نہیں آپ کی بات۔ میاں صاحب تھوڑی سی وضاحت ہو جائے تو سمجھنے میں آسانی ہو گی۔ ایس پی تذبذب سے بولا۔

بات یہ ہے کہ لاکھ کوشش کے باوجود مجھے نہ تو میل سٹون کا نشان ملا ہے اور نہ حادثے کی جگہ پر وقوعے کی خبر کسی مقامی آدمی نے دی ہے۔ آپ کہیں گے چونکہ بہت دن ہو گئے ہیں اِس لیے تمام شواہد حادثے کا شکار ہونے والے شخص کے ساتھ ہی قبر میں چلے گئے ہیں اس لیے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ جب حادثہ، جو کہ دن کی روشنی میں ہوا تھا، کے وقت کوئی مقامی وہاں موجود ہو۔ یہ تمام

باتیں اگر آپ کہیں کہ کسی حادثے کی نفی کی دلیل نہیں بن سکتیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ جب کہ میرے بھائی احمد بخش نے اُس کی تصدیق کر کے بطور وارث لاش کو قبر میں بھی اُتار دیا ہے۔ پھر اُس کے مرنے کا ایک ایس پی کو کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟ اور وہ اُس کے نشانات کیوں مٹائے گا۔ فائدہ تو دونوں بھائیوں کو ہوگا جو اُس کی زمین کے مالک ہو جائیں گے، یا پھر صرف احمد بخش کو جس نے اُسی دن بھائی صادق بخش کی زمین اپنے نام منتقل کروالی تھی۔ آپ یہی کچھ اور ایسے ہی کہیں گے نا؟

جیسے جیسے بات کھل رہی تھی ایس پی رانا فیصل کی آنکھیں حیرانی سے کھل رہی تھیں۔ اُس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے ظاہر ہونے لگے۔ اُس نے بولنے کی کوشش کی لیکن پہلے تو منہ سے آواز بہت مدھم نکلی۔ جب محسوس ہوا کہ اُس کی آواز خود اُسے بھی سنائی نہیں دی تو بلند آواز سے بولا چودھری صاحب، لیکن وہ اتنی بلند ہوگئی کہ پورا کمرہ اُس سے گونج اُٹھا۔ اِس سے الٰہ بخش تو ایک طرف خود ایس پی کو بھی پتا چل گیا کہ وہ بوکھلا گیا ہے۔

آپ کے کہنے کا مقصد مَیں ابھی تک نہیں سمجھ سکا۔ وہ دوبارہ احتیاط سے بولا۔

دیکھیے رانا صاحب، مَیں اپنے بھائی صادق بخش کی نئے سرے سے تفتیش کرانا چاہتا ہوں۔ وہ قتل کیا گیا ہے، اب کے الٰہ بخش نے کھل کر بات کی۔

اُسے کس نے قتل کیا ہے؟ ایس پی بولا۔

یہ تفتیش میں خود پتا چل جائے گا، الٰہ بخش نے اُسی معنی خیز انداز میں کہا۔

لیکن اُس کا حقیقی وارث تو اِس کیس کو کلوز کروا چکا ہے، رانا نے جواب دیا۔

اونہہ حقیقی وارث، الٰہ بخش تلخی سے مسکرایا، کیا میری پیدائش میں آپ کو شک ہے؟ حقیقی وارث کون ہوتا ہے اِس کا فیصلہ آپ نے نہیں عدالت نے کرنا ہے۔

او کے آپ درخواست دے دیں، ایس پی کا لہجہ ایک دم افسرانہ ہو گیا۔ مَیں ایک کمیٹی تشکیل دے دیتا ہوں جو اِس پورے معاملے کی تحقیق کر کے نئے سرے سے جانچ کرے گی۔

الٰہ بخش نے ایس پی کے لہجے کو فوراً محسوس کر لیا۔ یہی وہ لمحہ تھا جہاں افسر شاہی اور عوام ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اب وہ یہاں ایک لمحے سے پہلے نکل جانا چاہتا تھا۔

بہت شکریہ جناب، ایک بات جاتے ہوئے کہنا چاہوں گا۔ مَیں ایک زمیندار ہوں اور زمین کی خاصیتوں کو جانتا ہوں۔ زمین کو پرکھنے کی سب سے آسان ترکیب یہ ہے کہ اُسے پانی میں ڈبو دیں۔

زمین زرخیز ہوئی تو اُس کی سطح پر سبز کائی جمے گی، اگر خراب ہوئی تو شور اُبھر آئے گا۔ مجھے اپنے بھائی احمد بخش اور تمھاری زمین خراب لگتی ہے۔

اللہ بخش کی بات سُن کر ایس پی اپنی کُرسی سے گویا اُچھل پڑا۔ اِس سے پہلے کہ کچھ بولتا اللہ بخش کھڑا ہو گیا اور سلام کر کے باہر نکل گیا۔ وہ اپنے وکیل کے ساتھ ایک درخواست لکھ کر لایا تھا۔ اُس نے درخواست جمع کرائی اور جیپ پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ وہ جب ولی بخش پہنچ کر اپنے گھر میں داخل ہوا ہی تھا کہ احمد بخش اور اُس کا بیٹا طلال بخش گھر میں داخل ہو گئے۔

صحن میں ایک بڑے نیم کے درخت کی چھاؤں میں چار پائی پڑی تھی۔ اللہ بخش نے اپنے بھائی کو دیکھ کر فوراً چار پائی کی طرف اشارہ کیا، آئیں بھائی جان، یہاں بیٹھیں۔ وہ خود بھی بیٹھ گیا۔

طلال آپ کا کیا حال ہے؟ اللہ بخش نے اُسے انتہائی سکون سے مخاطب کیا۔ وہ جانتا تھا ایس پی نے اُس کے آنے سے پہلے اُنھیں پیغام بھیج دیا ہے اور اب کسی ہچکچاہٹ کے بغیر ایسی کھلی جنگ کا اعلان کرنا ہوگا جس میں کسی قسم کے خوف اور وضع داری کی راہ نہیں ہوتی۔

ٹھیک ہے ابا جی۔ طلال نے اللہ بخش کو اُسی طمانیت اور ادب سے جواب دیا جیسے وہ پہلے دیا کرتا تھا۔

طلال آپ آئندہ مجھے میرے نام سے مخاطب کیا کریں، میرا نام اللہ بخش ہے۔ چودھری احمد بخش اپنے اِس بیٹے کو میرے نام کے ہجے یاد کروا دیں۔ اللہ بخش نے دونوں باپ بیٹوں کو فاصلے کی نوعیت سے خبردار کرتے ہوئے کہا۔

احمد بخش اور طلال کو اللہ بخش سے اِس طرح کی گفتگو کی توقع نہیں تھی۔ وہ ایک دم گھبرا سے گئے لیکن چُپ رہے اور آرام سے کھڑے رہے۔ اللہ بخش نے اپنی نوکرانی شاداں کو آواز دی، شاداں بیٹی! میاں احمد بخش کے لیے چار پائی بچھا دے اور لسی لے آ۔

شاداں نے فوری طور پر چار پائی لا کر پاس رکھ دی۔ اُس پر دونوں باپ بیٹا بیٹھ گئے پھر تھوڑی دیر کے لیے گھر میں خموشی چھائی رہی۔ فضا انتہائی بوجھل اور سوگوار تھی جیسے ایک طوفان نئی مسماری کا پیغام دے رہا ہو۔

اُس کے بعد احمد بخش بولا، اللہ بخش تمھیں شاید مَیں بھائی صادق کی وفات کے بعد بتانا بھول گیا تھا کہ اُس نے حادثے سے ایک دن پہلے اپنی خوشی سے اپنے حصے کی زمین طلال کے نام منتقل کر دی تھی۔ شاید اُسے پتا چل گیا تھا کہ وہ زیادہ دن کا مہمان نہیں ہے۔ سُنا ہے مرنے والے کو خود بھی پتا چل

جاتا ہے۔ اُس نے تو مجھے بھی نہیں بتایا کہ وہ اپنے حصے کی زمین طلال کے نام کرنا چاہتا ہے۔ مجھے خود وہ دن بعد پتا چلا لیکن اُس کی موت کے وقت ہوش ہی کسے تھا کہ اس معاملے پر بات کی جاتی۔

لیکن میاں جی، اب تو اُسے فوت ہوئے کافی دن ہو گئے ہیں، الہ بخش دھیمے لہجے میں بولا اور مجھے تو بھنک تک نہیں پڑی۔ جب آپ کو پتا چل گیا تھا تو کسی واسطے سے ہی مجھے خبردار کر دیتے۔ خیر اب تو جو ہو گیا سو ہو گیا۔ مَیں حق شفعہ کا دعویٰ کرنے جا رہا ہوں۔

اس طرح تمھیں پتا ہے خاندان کی عزت اور وقار رنڈی کے چوبارے سے کہیں زیادہ ننگا ہو جائے گا، احمد بخش تلخی سے بولا۔

اِس کا خیال تو آپ کو بڑا بھائی ہونے کی نسبت سے خود کرنا چاہیے تھا۔ حیرت ہے مرنے والے نے مجھے کبھی نہ بتایا کہ اُس کی میرے ساتھ دشمنی تھی، اس لیے تمام جائداد طلال کے حوالے کر گیا۔

اُس نے مجھے بھی خبردار نہیں کیا، احمد بخش بولا۔

چلیے کوئی بات نہیں، اب جس کی بھی غلطی ہے، ساری دنیا خبردار ہو جائے گی۔ الہ بخش نے محکم ارادے سے اپنا فیصلہ سُنا دیا۔

اگر تمھیں کوئی رنج ہے تو یہ تیرا بھتیجا طلال بیٹھا ہے، اِس نے کہا ہے اُس زمین سے ایک سوا ایکڑ خوشی سے آپ کے نام کرا دیتے ہیں۔ باقی یہ طلال بھی تو تیرا ہی بیٹا ہے اور تیری بیٹی میری بیٹی ہے۔

نہ طلال میرا بیٹا ہے اور نہ میری بیٹی آپ کی بیٹی ہے۔ میری بیٹی کی قسمت میں جو کچھ ہوا، وہ اُسے مل جائے گا۔ الہ بخش نے اپنی حتمی رائے دی۔ اب میاں جی مَیں اِس بارے میں کچھ نہیں کہنا، نہ سننا چاہتا ہوں۔ مجھے تو ابھی تک اُس کے حادثے پر یقین نہیں آ رہا۔

کیا مطلب ہے تیرا؟ احمد بخش ایک دم بھڑک اُٹھا۔ وہ پولیس والے جھوٹ بولتے تھے؟ وہ موقع پر موجود تھے۔

میاں جی پولیس والوں کو مَیں نہیں جانتا۔ مَیں تو اپنے دونوں بھائیوں کو جانتا ہوں۔ ایک وہ جو میرے سامنے بیٹھا ہے اور دوسرا جسے مٹی کھا چکی ہے۔ جس نے کسی کو آج تک ایک چھڑی نہیں ماری تھی نہ کسی کے حق میں بُرا تھا۔

یعنی آپ کہتے ہیں مَیں نے لوگوں کے حقوق پر ڈاکا زنی میں زندگی گزاری ہے، احمد بخش چیخا۔

یہ مَیں نے کب کہا ہے؟ الہ بخش ہلکی آواز میں بولا، لیکن آپ بھائی کے حادثے کو ایسے کھا گئے

جیسے وہ انسان نہیں اونٹ کا بچہ ہو۔

تو کیا مَیں کسی بے گناہ پر اُس کا خون لاد دیتا؟ مَیں اتنا ظالم نہیں کہ بھائی کی موت کو کسی مخالف کی گردن کا ریشم بنا دوں۔ جس وقت اُس کی لاش صحن میں پڑی تھی، تجھے کیوں خموشی نے سونگھ لیا تھا؟ مجھ سے اپنے شک کا اظہار کرتا۔ اُسی وقت تفتیش کا دروازہ کھول لیتے۔

اُس وقت مجھے اپنے بڑے بھائی پر بھروسا تھا اِس لیے خموشی سے صادق کو مٹی کا نمک ہوتے دیکھتا رہا مگر اب تو چہروں پر خون کے چھینٹے صاف نظر آنے لگے ہیں۔

وہ قاتل کون ہیں جن کے چہروں پر تجھے چھینٹے نظر آنے لگے ہیں؟ مجھے بتا، اُن کی انتڑیاں کھینچ لوں گا، احمد بخش مکمل سٹپٹا گیا تھا۔

میاں احمد بخش انتڑیاں کُتے کھینچتے ہیں اور وہ صادق بخش کی کھینچی جا چکی ہیں۔ جن کُتوں نے انتڑیاں کھینچی ہیں اُن کی گردن کے پٹوں کی بات کر کہ وہ کس کے ہاتھ میں تھے؟

مجھے نہیں سمجھ آ رہی تم کیا کچھ بک رہے ہو، احمد بخش تلخ لہجے میں بولا، ایک تو بھائی مر گیا ہے اور تُو اُس کی لاش کا تماشا بنانا چاہتا ہے۔

احمد بخش یہ ظُلم نہ کر۔ مَیں بھائی صادق بخش کی لاش کا تماشا نہیں بنانا چاہتا۔ اُس کے قاتل کا چہرہ ننگا کر کے لوگوں کو دکھانا چاہتا ہوں۔

ٹھیک ہے، احمد بخش اُٹھتے ہوئے بولا، تم جو سوچو تمھارا حق ہے لیکن مَیں تمھیں یہ اجازت نہیں دوں گا کہ عدالتوں میں جا کر میرے والد کی عزت نیلام کرتے پھرو اور حق شُفعے کے دعوے کرو۔ ابے کی پگڑی کا شملہ اِتنا کھلا نہیں کہ وہ علاقے کے بالکوں کے پاؤں کا کِھدو بن جائے۔ نہ میری پگ پر کوا بیٹ کر سکتا ہے۔ اپنا کیس واپس لے لو اور وہ درخواست بھی جو پولیس کو بھائی صادق کی موت کی انکوائری کے بارے میں ہے۔ مَیں اُس کے مردے کو خراب نہیں ہونے دوں گا۔

میاں جی مَیں بھی اُس کے خون کو ضائع نہیں ہونے دوں گا، الہٰ بخش نے اُنھیں دروازے سے نکلتے ہوئے جملہ اُچھالا۔ چاہے اُس میں میرے اپنے ہی کیوں نہ پھنسیں۔

احمد بخش اور طلال الہٰ بخش کا کاٹ دار جملہ سُن کر ایک دھڑکے سے باہر نکلے جس کے سبب دروازہ اتنا کھڑکا کہ نوکرانی ڈر کر سہم گئی۔

(۱۹)

اللہ بخش اور احمد بخش کی دشمنی کی خبر اردگرد کے تمام علاقوں میں پھیل چکی تھی۔ صادق بخش کے حادثے کی تفتیش بھی دوبارہ شروع ہو چکی تھی۔ عدالتوں میں دونوں بھائی حاضر ہوتے۔ اللہ بخش نے اپنے گارڈز میں اضافہ کر لیا۔ استغاثے میں اللہ بخش نے اپنے بھائی صادق بخش کو مقتول قرار دے کر عدالت سے ایس پی رانا فیصل اور احمد بخش کے خلاف ایف آئی آر کے آرڈر جاری کروا لیے۔ یہ ایک ایسی بات تھی جس نے اِس زمیندار گھرانے کی پوری قلعی کھول کر رکھ دی۔ ایف آئی آر سے ایک بات اور ظاہر ہوئی کہ اردگرد میں احمد بخش کا پورا رعب داب ریت کی طرح بکھرنے لگا۔ پوری ساکھ تباہ ہو کر رہ گئی۔ یہ ایسی ساکھ تھی جس کی اللہ بخش کو پہلے ہی خاص پروا نہیں تھی لیکن احمد بخش کی پوری ایمپائر دھڑام سے گر گئی۔ اور تو اور خود رعایا بھی اُس سے نظریں چرانے لگی۔ ڈیرے پر لوگوں نے آنا جانا کم کر دیا۔ یہاں تک کہ راہ جاتے سلام دعا سے بھی آنکھ چرانے لگے۔ یہ بات احمد بخش کو کسی طرح گوارا نہ تھی۔ عام شہرت پا گئی تھی کہ احمد بخش نے زمین کے ٹکڑے کی خاطر اپنے بھائی کو پولیس سے مروا دیا ہے۔ اب اللہ بخش کے استغاثے کا فیصلہ اگر احمد بخش کے حق میں بھی ہو جاتا تو جو عوام میں تاثر پھیل چکا تھا اُس کی تلافی ممکن نہیں تھی۔ احمد بخش کو اِس بات کا شدید قلق تھا۔ اُس کا بیٹا طلال احمد اب ساری مروت اور وضع داری طاق پر رکھ کر باقاعدہ اپنے چچا کے مقابلے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ کئی بار اُس نے اپنے والد سے کہا، ابا جی! چچا جان اب حد سے گزر رہے ہیں۔ انھیں کہیں نہ کہیں روک دینا ضروری ہے ورنہ بات ہاتھ سے

نکل جائے گی۔ اگر عدالت نے ہمارے خلاف فیصلہ دے دیا تو ہم کچھ بھی نہیں سنبھال سکیں گے مگر احمد بخش اُسے ٹال رہا تھا۔ ایک بار جب طلال نے زیادہ اصرار کیا تو احمد بخش نے اُسے غصے سے ڈانٹ کر اپنے کمرے سے نکال دیا پھر اُسی شام بلا کر سمجھایا اور کہا، طلال بیٹے الہٰ بخش کے پیچھے خفیہ ہاتھ ہیں۔ پہلے وہ ہاتھ کاٹنے چاہییں۔ اُس کے بعد الہٰ بخش خود بخود کٹ جائے گا۔ احمد بخش کے خیال میں خاندان کی عزت سب سے زیادہ ضروری تھی۔ اُس کے بعد ہر چیز تھی۔ الہٰ بخش نے وہ عزت چوراہے پر لا کر رکھ دی تھی اور اب حالت یہ ہوگئی تھی کہ اُسے چھوٹے چھوٹے سرکاری افسروں کو بھی وضاحتیں دینا پڑتی تھیں۔ آئے دن دو ٹکے کے تھانیدار اور تفتیشی افسر اُن کے گھر چلے آتے تھے۔ احمد بخش کو اُن سے مسکراہٹ دے کر ملنا پڑتا تھا۔ یہ سب کیا دھرا الہٰ بخش کا تھا۔ حق شُفعے کا کیس الگ تھا۔ اِس کیس نے صادق بخش کے قتل کی تفتیش میں بھی کردار ادا کرنا تھا۔ وہ سرکاری افسر جن کی حیثیت پچاس روپے کی نہیں تھی وہ بھی پانچ پانچ سو مانگتے تھے۔ پورے علاقے میں ایک گونج پھیلی تھی کہ صادق بخش کا قاتل کوئی اور نہیں احمد بخش ہی ہے۔ دونوں طرف سے پیسہ پانی کی طرح بہایا جا رہا تھا۔ اِن معاملات کے ساتھ الہٰ بخش نے آنے والے خطرے کے پیشِ نظر اپنی واحد بیٹی کو تمام زمین اپنی زندگی ہی میں ہبہ کرنے کا بندوبست کر دیا۔ الہٰ بخش کو کسی طور گوارا نہیں تھا کہ اُس کی نصف زمین اُس کا بھتیجا لے جائے۔ اس نے ٹبہ ولی بخش میں رہنا چھوڑ دیا۔

اِس سب کے باوجود الہٰ بخش کئی وجوہات کے پیشِ نظر احمد بخش اور طلال سے کمزور تھا۔ وہ کتنی ہی طاقت اپنے اردگرد اکٹھی کر لیتا اُس کی تمام طاقت دفاعی تھی۔ ایسی صورت میں مدافع کا گھر ہی میدانِ جنگ بنتا ہے۔ یوں الہٰ بخش کے لیے نقصان یقینی تھا۔ الہٰ بخش کے گارڈز اُس کے ساتھ صرف اس لیے تھے کہ الہٰ بخش پر حملہ نہ ہو۔ اُنھیں حملہ کرنے کی ہدایات نہیں دی گئی تھیں۔ جبکہ احمد بخش نے اپنے اردگرد کوئی گارڈ نہیں رکھا، نہ اُسے کسی طرف سے خطرہ تھا۔ یہی صورت طلال کی تھی۔ دونوں باپ بیٹا اپنے لیے ایک طرف سے آزاد تھے۔ اُن کے منصوبے جارحیت کے ساتھ شروع ہونے کی توقع تھی۔ اِدھر عدالتوں نے الہٰ بخش کے کیس کو نمٹانے کی بجائے طول دینا شروع کر دیا۔ یہ بات کسی صورت ٹھیک نہیں تھی۔ اِس میں دونوں کے لیے نہ سہی الہٰ بخش کے لیے خطرہ تھا۔ کیس کو دو سال ہو گئے لیکن ابھی تک نہ تو ایس پی پولیس رانا فیصل کو پولیس نے آنچ آنے دی نہ احمد بخش کا جرم ثابت ہوا۔ ایک بات البتہ الہٰ بخش نے اپنے بچاؤ کی ایسی کی کہ اُس کی بیٹی جو اب ایک میڈیکل کالج میں تھی، اُسے کراچی کے

ڈاؤ میڈیکل کالج میں بھیج دیا اور خبر اُڑادی کہ وہ تعلیم کے سلسلے میں مُلک سے باہر بھیج دی گئی ہے۔

ایک رات جب ہر طرف سناٹا تھا اور احمد بخش کسی کام کے سلسلے میں گھر سے باہر تھا، طلال نے اپنے ایک پرانے نوکر خیر دین کے بیٹے فتے اوڈ کو گھر بلایا۔ اُس کے گھر میں داخل ہونے کی خبر کسی کو نہیں ہوئی حتیٰ کہ اس کے باپ خیر دین کو بھی۔ طلال نے اُسے اپنے خاص کمرے میں مدعو کیا جہاں اُن کا نوکر تو ایک طرف، بڑے سے بڑا سرکاری افسر یا رشتہ دار بھی نہیں جا سکتا تھا۔ یہ اتنا بڑا اعزاز تھا کہ کوئی بھی نوکر اِسے پا کر اپنی جان سے کھیلنے کے لیے تیار ہو سکتا تھا۔ طلال نے اُسے اپنے پلنگ پر بٹھایا اور اپنا خاص طمنچہ دیا۔ اُس کے بعد تمام بات سمجھا دی۔ اِس سے پہلے بھی فتح محمد عرف فتے اوڈ نے کچھ کام طلال احمد کے لیے انتہائی خوبی کے ساتھ انجام دیے تھے اور اُن کا بہترین معاوضہ پایا تھا۔ طلال احمد کا اُصول تھا جس سے کام لیا جائے اُسے کام کے بعد معاوضہ بڑھ کر دیا جائے۔ پھر کبھی ناکامی کا منہ نہیں دیکھنا پڑتا۔ آج اُس سے بھی بڑھ کر ایک کام اور کیا کہ طلال نے پورے سوسو کے سُرخ نوٹوں کی گڈی اُس کے حوالے کر کے کہا تم جانتے ہو مَیں نے تمھیں ہمیشہ اپنے خاص بندوں میں شمار کیا ہے اور ہمیشہ تم پر بھروسا کیا ہے۔ آج مَیں تمھیں اپنا بھائی ہونے کا درجہ بھی دیتا ہوں۔ تم اور مَیں دس سال کے تھے جب سے اکٹھے جوان ہوئے ہیں۔ یہ پیسے رکھ لے اور اِن سے انکار نہیں کرنا۔ آئندہ اِس سے بڑھ کر نوازشات کروں گا۔ جب کام مکمل ہو جائے گا تو پورے بیس ایکڑ رقبہ تمھارے نام کرا دوں گا۔

طلال کی بات سُن کر فتے اوڈ کی آنکھوں میں تشکر آمیزی کے جذبات اُبھر آئے۔ اُس نے طلال کی طرف دیکھ کر کہا، چودھری جی، مَیں آپ کا بھائی نہیں غلام ہوں، آپ کا نمک کھایا ہے، بس کام بتائیں؟

فتے کام ایسا ہے کہ اُسے انجام دینے میں سب سے زیادہ صدمہ جنھیں پہنچے گا وہ مَیں ہوں یا میرا باپ احمد بخش ہے لیکن ایک گھر کے فرد کی حیثیت سے تجھے بھی بہت رنج ہو گا مگر اس کے انجام دیے بغیر چارہ بھی نہیں ہے، یہ کہتے ہوئے طلال کی آنکھوں میں آنسو نکل آئے۔

چودھری صاحب مجھے بس اتنا بتائیں کرنا کیا ہے؟ آپ اگر مجھے اپنے باپ کے قتل کا حکم بھی دیں گے تو بجا لاؤں گا۔

فتے آپ کے باپ کو خدا سلامت رکھے، وہ میرا بھی ایک طرح کا باپ ہے لیکن یہاں اُس کی بات ہو رہی ہے جسے مَیں نے کبھی باپ کے علاوہ کسی لفظ سے نہیں پکارا تھا۔ وہ چچا اللہ بخش ہے۔ اُس

نے ہر حد پار کر دی ہے۔ پورے خاندان کی عزت داؤ پر لگ گئی ہے۔

طلال بخش کی بات سُن کر فتا اوڈ ایک دم خموش ہو گیا جیسے اُسے چپ لگ گئی ہو۔ اُسے خموش دیکھ کر طلال بخش ایک دم فکر مند ہو گیا اور بولا فتے کیا سوچ رہے ہو؟

چودھری صاحب کچھ نہیں سوچ رہا، بس یہی کہ کیا اِس بات کا چودھری احمد بخش کو پتا ہے؟ فتے نے طلال کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ اگر بڑا چودھری اِس کام سے خوش نہ ہوا تو کام بگڑ جائے گا۔

اُسے ابھی نہیں پتا اور نہ اُسے کسی شے کی خبر ہونی چاہیے۔ عدالت سے تمھیں آزاد کرانا میرے دائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ پھر یہ ہے کہ الٰہ بخش میرا چچا ہے اور اُس کا حقیقی وارث بھی مَیں ہی ہوں۔ کچھ بھی ہو جائے بات گھوم کر میری ہی عدالت میں آئے گی۔ ابے کو مَیں خود بعد میں سمجھا لوں گا اور مَیں تمھیں آزاد کرا لوں گا۔ کام کرنے کے بعد بس تمھارا ایک ہی بیان ہونا چاہیے کہ احمد بخش میرا مالک تھا۔ مَیں اِس کی بے عزتی برداشت نہیں کر سکا اور یہ کام مَیں نے اپنی مرضی سے کیا ہے بغیر کسی کی صلاح مشورے کے۔

مجھے پیسوں کی کوئی ضرورت نہیں تھی، اگر آپ مجھ سے میری جان بھی مانگتے تو مَیں کبھی دینے سے دریغ نہ کرتا۔ ان شاء اللہ کام جیسے آپ کہیں گے ویسے ہی ہو گا۔ فتے اوڈ نے نہایت دلیری اور استقامت سے جواب دیا۔

مقدمہ ملتان ہائیکورٹ میں چل رہا تھا۔ اِس بار 15 مئی کی تاریخ تھی۔ احمد بخش اکثر عدالت نہیں جاتا تھا۔ اُس کی طرف سے اُس کا وکیل پیش ہوتا تھا اور پچھلے کئی مہینوں سے سب کو خبر تھی کہ احمد بخش کی صحت ٹھیک نہیں ہے۔ اُسے بخار اور کھانسی کی شکایت تھی۔ اِس بار اُس نے اپنے وکیل کو پیغام بھیجا کہ وہ جج سے اگلی تاریخ لے لے۔ طلال بخش کا ویسے بھی عدالت میں کوئی کام نہیں تھا۔ ہر طرف سے معاملہ طے ہو چکا تھا۔ صبح نو بجے پیشی کی آواز بلند ہوئی۔ الٰہ بخش کو اپنے آدمیوں کے ساتھ عدالت میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی کیونکہ اُن کے پاس اسلحہ ہوتا تھا۔ جیسے ہی الٰہ بخش کمرے میں داخل ہوا، فتا اوڈ اُس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ الٰہ بخش اُسے اچھی طرح جانتا تھا اور اِس بات کی بھی خبر تھی کہ طلال احمد چھوٹے موٹے کام اِسی سے لیا کرتا ہے۔ اُن کاموں کی نوعیت عموماً مجرمانہ ہوتی تھی۔ اُس کے آتے ہی الٰہ بخش بھانپ گیا کہ معاملہ اِس بار گمبھیر ہے۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ فتے اوڈ نے اپنی قمیص کے نیچے سے دیسی لوہار کے ہاتھ سے بنا ہوا وہ طپنچہ نکال لیا جس میں ایل جی کا کارتوس

پڑتا تھا۔ یہ کارتوس اتنا سخت اور زوردار تھا کہ ایک بھینسے کو مارنے کے لیے کافی تھا۔ اُس نے الٰہ بخش کے دل کے اوپر رکھ کر گھوڑا دبا دیا۔ ایک ایسا دھماکا ہوا کہ تمام عدالت کانپ اُٹھی۔ جج بھاگ کر اپنے کمرے میں گھس گیا اور ہر طرف ہڑبونگ مچ گئی۔ اِتنے میں فتے اوڈ نے کمرے کو کنڈی لگا دی تا کہ الٰہ بخش کے گارڈ اندر نہ آ جائیں۔ کمرے میں موجود آٹھ دس افراد کا عملہ کھڑا تھا۔ اُن کے ساتھ غالباً پہلے سے معاملات طے تھے۔ پولیس بھی کافی تعداد میں تھی۔ فائر کی آواز سُن کر مزید پولیس کورٹ کے باہر جمع ہو گئی۔ الٰہ بخش کے گارڈز نے عدالت کے دروازے پر بھرپور حملہ بول دیا اور اُسے فائرنگ پر رکھ لیا مگر دروازہ اندر سے بند ہونے کے سبب اُس میں صرف گولیاں گزر کر اندر داخل ہوئیں۔ گولیوں سے بچنے کے لیے لوگ پہلے ہی دیواروں کے ساتھ چپک گئے تھے۔ کورٹ کی عمارت برٹش دور کی ہونے کے سبب انتہائی مضبوط تھی۔ دروازے تو گویا لوہے کی طرح سخت تھے۔ کالی ٹاہلی کی موٹی لکڑی سے بنائے گئے تھے جن پر الٰہ بخش کے گارڈز کی گولیاں بھی کارآمد ثابت نہ ہوئیں۔ عین اُسی وقت اُن گارڈز کو پولیس نے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ اُن میں سے ایک گارڈ جس نے سب سے زیادہ شجاعت دکھائی وہ جمال تیلی تھا۔ اُس نے آخر دم تک پولیس سے لڑ کر کورٹ میں داخل ہونے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ آخر اُس کو گولی مار دی گئی اور اُس کی لاش کمرہ عدالت سے باہر دروازے پر اُسی طرح لڑھک کر گری جیسے کمرہ عدالت میں الٰہ بخش کی لاش بے طرح بکھری پڑی تھی۔ فتے اوڈ نے جیسے ہی اِس بات کی تسلی کر لی کہ الٰہ بخش کے سانس پورے ہو چکے ہیں اُس نے طپنچہ پھینک کر اپنی گرفتاری دے دی۔ دوسری طرف پولیس نے باہر الٰہ بخش کے گارڈز کو گرفتار کر لیا۔ ایک گارڈ اُن میں سے بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔

الٰہ بخش کی موت کی خبر جیسے ہی احمد بخش کے پاس پہنچی وہ اپنی بیماری کی حالت میں روتا اور دھاڑیں مارتا ہوا باہر نکل آیا۔ اِس کے عدالت میں آنے تک پولیس نے اُس کی لاش وہیں پڑی رہنے دی۔ عدالت کے اندر الٰہ بخش کے قتل کی خبر آگ کی طرح پورے علاقے میں پھیل گئی لیکن اِس اطلاع کے ساتھ کہ طلال بخش کے ایک نوکر، جس کا باپ بھی ولی بخش کا قدیمی نوکر ہے، نے اپنے چودھری کی ذلت پر غیرت کھا کر اپنی مرضی سے الٰہ بخش کو گولی ماردی ہے۔ وہ اِس خاندان کی بربادی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اُس نے یہ بیان گولی مارنے کے بعد سب کے سامنے علی الاعلان دیا کہ میاں احمد بخش اُس کا سب کچھ ہے اور وہ اندر ہی اندر اُس کی تذلیل پر کُڑھتا تھا۔ وہ یہ کام کب کا کر چکا ہوتا لیکن اُسے احمد بخش

اور طلال کا ڈر تھا مگر اب اُس نے سب سے بے نیاز ہو کر یہ قدم اُٹھایا تھا۔ اِس میں اگر اُسے پھانسی بھی ہو جاتی ہے تو وہ اپنے میاں جی کی خاطر قبول کرنے کو تیار ہے۔ فتے اوڈ نے جیسے ہی احمد بخش کو دیکھا، بھاگ کر اُس کی طرف بڑھا، فتے کے دونوں ہاتھ ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے تھے۔ وہ احمد بخش کے قدموں میں گر پڑا اور بولا، میاں جی مجھے معاف کرنا مَیں آپ کی ذلت نہیں دیکھ سکتا تھا۔ آپ کو عدالتوں میں خوار ہوتے دیکھ کر خون کے آنسو روتا تھا۔ اللہ بخش آپ کا بھائی ضرور ہے مگر اُس نے بھائیوں والی نہیں کی تھی۔ اب آپ میرے ساتھ جو چاہے کریں، مَیں تیار ہوں۔

احمد بخش نے فتے اوڈ کی بات سُن کر ایک دم حقارت سے اُس کے منہ پر تھوک دیا اور چہرہ دوسری طرف کر کے کھڑا ہو گیا اور کہا اِسے میری نظروں سے دور لے جاؤ۔ اِس نے جس تھالی میں کھایا اُسی میں مُوت دیا۔ یہ کہہ کر احمد بخش آگے بڑھ کر اللہ بخش کی لاش پر گر پڑا اور رونے لگا۔ طلال بھی لاش سے لپٹ کر رونے لگا مگر احمد بخش نے ایک دم طلال کے منہ پر تھپڑ مار کر اُسے پیچھے ہٹا دیا۔ احمد بخش کے اِس اچانک عمل سے طلال بخش سمیت پورا مجمع ہونق ہو کر رہ گیا۔ فتے اوڈ نے میاں احمد بخش کے یہ تیور دیکھے تو اُس کا دل لرز کر رہ گیا۔

(۲۰)

اللہ بخش کی لاش اُٹھا کر ٹبہ ولی بخش لائی گئی تو وہاں ایک کہرام مچ گیا۔ گرمی کے دن تھے، لاش کو زیادہ دیر تک نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ اِس عالم میں اللہ بخش کی بیوی ارشاد بیگم تو پہنچ گئی مگر بیٹی کا پہنچنا مشکل تھا۔ اللہ بخش کی بیوی لاش سے لپٹ کر غش کھا رہی تھی۔ عورتیں اُسے پکڑ کر منہ میں بار بار پانی ڈالتیں، جب ہوش میں آتی کہتی طلال بخش ہمیں کھا گیا۔ میرے اللہ بخش کو کھا گیا۔ خدایا طلال کو ابھی اُٹھا لے۔ اِسی عالم میں شام تک لاش کو دفنا دیا گیا۔ اِس دوران لوگ دُور دُور سے ٹبہ ولی بخش پر اکٹھے ہونے لگے۔ ہر ایک کی زبان پر دونوں بھائیوں کی دشمنی کے چرچے عام ہو گئے اور چہ مگوئیاں ہونے لگیں۔ احمد بخش کی زبان گنگ ہو کر رہ گئی۔ ایک دو دن ہونقوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتا اور ٹھنڈی سانس بھر کے رہ جاتا۔ پھر اُسے ایسی چُپ لگی جیسے سکتے میں چلا گیا ہو اور گھر آتے ہی چار پائی پر لیٹ گیا۔ اُس کے بعد گھر سے باہر نہیں نکلا۔ اگلے ہی دن طلال بخش ارشاد بیگم کو اُسی کے گھر نظر بند کر کے خود تھانے گیا اور فتے اوڈ پر تین سو دو کی ایف آئی آر درج کروا دی اور اُس کا مدعی خود بن گیا۔

اِسی دوران ایک حادثہ یہ ہوا کہ احمد بخش پر فالج کا حملہ ہو گیا اور وہ بولنے چلنے سے بند ہو گیا۔ اِس فالج کے حملے نے ایک نئی بحث کا آغاز کر دیا۔ ٹبہ ولی اور آس پاس کے لوگوں نے احمد بخش پر فالج کو اللہ کے عذاب سے تعبیر کر دیا۔ ارشاد بیگم کو اِس سے یہ تاثر ملا کہ اللہ بخش کو احمد بخش ہی نے قتل کروایا تھا اور اب اُس کے بعد اُن کا کوئی دشمن نہیں رہا۔ وہ بے فکر ہو کر منٹگمری سے ٹبہ ولی بخش میں چلی آئی۔

طلال بخش نے اپنی چچی کے ساتھ اِس طرح حسنِ سلوک کیا کہ اُس کی تمام پریشانیاں اپنے سر پہ لے کر اُسے پوری زمینداری اور کیس کی سرپرستی کرنے میں پوری مدد دی۔ چھ ماہ کے اندر فتے کو بھری عدالت میں اقبالِ قتل اور گواہوں کی شہادتوں میں سزائے موت ہوگئی۔ طلال نے ارشاد بیگم کے ساتھ مل کر الٰہ بخش کے قتل کی بھرپور پیروی کر کے فتے کو سزائے موت دلوا دی۔ اُس نے ملتان سے ایک مہنگا وکیل کرنے کے ساتھ کیس کی سماعت کے نیچے پیسوں کے پہیے لگا دیے تا کہ اُس کے چچا کے قاتل کو کیفرِ کردار تک پہنچایا جا سکے۔ قتل کے دوسرے ہی دن شام کو الٰہ بخش کی بیٹی طبہ ولی بخش آ گئی تھی۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ باپ کی قبر پر گئی اور رو دھو کے واپس آ گئی۔ اُس نے اپنی ماں ارشاد بیگم کو لاکھ سمجھایا کہ وہ طلال پر بالکل اعتماد نہ کرے لیکن ارشاد بیگم اُن واقعات کو کیسے نظر انداز کر سکتی تھی جس میں احمد بخش کو اللہ کے قہر سے فالج ہوا تھا۔ اُس نے بیٹی کو سمجھایا کہ اب وہ وقت نہیں رہا اور اُن کا اصل دشمن احمد بخش ایک عذاب یافتہ مُردے کی طرح چارپائی پر پڑا ہے۔ اِس لیے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ طلال اُن کے ساتھ ہے بلکہ طلال نے اُسے خود بتایا ہے کہ الٰہ بخش کو قتل کرنے کا حکم احمد بخش نے ہی دیا تھا اور اُس کی مرضی کے خلاف دیا تھا اور وہ شرمندہ ہے کہ چچا کی حفاظت نہیں کر سکا۔ اللہ نے اُس کے باپ کو عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔ مَیں تو کہتی ہوں اب تُو بھی ڈاکٹری کا کام چھوڑ کر یہیں آ جا۔ اتنی بڑی زمینداری اکیلی عورت سے نہیں سنبھالی جائے گی مگر ہوا یہ کہ وہ ماں کے ساتھ ناراض ہو کر کسی کو بھی بتائے بغیر دوسرے ہی دن واپس چلی گئی۔

الٰہ بخش کے قتل کو ایک سال چھ ماہ ہوئے تھے کہ اُس کے خاص مکان کو آگ لگ گئی۔ جب یہ آگ بھڑکی تو ارشاد بیگم اپنی ایک ملازمہ کے ساتھ کمرے ہی میں موجود تھی۔ پورا مکان جل کر راکھ ہو گیا۔ اگلے دن پولیس آئی تو لوگوں نے بتایا آگ بھڑکنے کا سبب وہ گھونسلا تھا جو ایک چڑیا نے بنا رکھا تھا۔ اِس گھونسلے میں چڑیا ہر روز تنکوں کا اضافہ کر رہی تھی اور شاداں نے اُسے ہٹانے کی کوشش نہیں کی۔ کل شام چڑیا ایک سلگتا ہوا تنکا اُٹھا کر لے آئی اور اُسے گھونسلے میں رکھ دیا۔ اِس تنکے سے پہلے گھونسلے میں آگ بھڑکی پھر وہ آگ اُسی پلنگ پر گری جہاں شاداں لیٹی ہوئی تھی۔ آگ نے آناً فاناً زور پکڑ لیا اور اُسی میں وہ جل کر راکھ ہو گئی۔ اُس کے ساتھ والی چارپائی پر شاداں کی خاص نوکرانی لیٹی تھی، وہ بیچاری بھی اِسی میں جل مری۔

جس دن مکان کو آگ لگی طلال بخش نے جہاں تک ممکن ہو سکا یہ خبر الٰہ بخش کی بیٹی کو دینے کی

کوشش کی۔ تمام میڈیکل کالجز اور ممکنہ ہاسپٹل میں، جہاں وہ ہو سکتی تھی پتا لگوایا مگر اُس کی کچھ خبر نہ ملی۔
اصل میں اللہ بخش کی بیٹی جو اَب ڈاکٹر فرح بن چکی تھی، ٹبہ ولی بخش سے ایک ایک پل باخبر تھی۔ وہ اپنی سوتیلی ماں کا انجام پہلے سے جانتی تھی۔ اِسی لیے بار بار اُس نے اُسے ٹبہ ولی بخش چھوڑ دینے کو مجبور کیا تھا مگر وہ ایک بڑی سرداری اور بڑی زمینداری کے چکر میں بہت سی باتوں کو نظر انداز کر چکی تھی اور آج اُسے یہ آگ اور دھویں کا دن دیکھنا پڑا تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر فرح نے اپنے آپ کو اُن تمام جگہوں اور مقامات سے ہٹا لیا تھا جہاں طلال بخش کے پہنچنے کی اُمید کی جا سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی طلال بخش کے تار اور خطوط اصل میں میری موت کے دعوت نامے ہیں۔ وہ اب کسی صورت ٹبہ ولی بخش کا منہ نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ نہ اُس کا وہاں کوئی بچا تھا۔ اُس نے یقین کر لیا ٹبہ ولی بخش اُس کے لیے قبرستان ہے جہاں باپ اور سگی ماں کی قبریں ہیں اور اب اُس میں ایک سوتیلی ماں کا اضافہ بھی ہو گیا ہے۔ زندگی نے موقع دیا تو اُن قبروں کی زیارت ہو جائے گی۔ ڈاکٹر فرح نے اپنے ایک کلاس فیلو ڈاکٹر زبیر سے شادی کر لی تھی جس نے بعد میں ڈاکٹری چھوڑ کر اپنا الگ ایک بزنس چلا لیا تھا۔ اِسی دوران اُن کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہو گیا۔ اِس کا نام اُنھوں نے جنید رکھ دیا۔ اب سوتیلی ماں کے مرنے کے بعد ڈاکٹر فرح مزید پریشان ہو گئی۔ اُس نے فوری طور پر جاب سے استعفیٰ دیا اور بیٹے اور خاوند کے ساتھ کسی نامعلوم جگہ منتقل ہو گئی۔ اُس نے سوچا اگر اُس دن وہ بھی اُس مکان میں ہوتی تو زندہ آگ میں جلنا کیسی اذیت ناک موت ہوتی۔

اِدھر گاؤں والوں کی نظر میں اِس حادثے کا طلال کو بہت افسوس ہوا تھا۔ اِس آگ کے حادثے کے دو ہفتے بعد ہی ایک بھونچال ٹبہ ولی بخش میں اور آیا کہ احمد بخش پینسٹھ برس کی عمر میں بستر پر فالج میں پڑا پڑا فوت ہو گیا۔ ٹبہ والے کھل کر تو نہ کہتے تھے البتہ اِس موت کو خدا کا عذاب قرار دینے لگے۔ احمد بخش کی موت نے بہت سے معاملات میں ایک نمایاں تبدیلی کی روایت ڈال دی۔

اِدھر طلال نے بہت کوشش کی کہ اپنی چچا زاد کو ٹبہ علی بخش میں لے آئے لیکن وہ ایسی غائب ہوئی کہ لاکھ کوششوں کے باوجود دوبارہ نہ مل سکی۔ طلال احمد نے ڈاکٹر فرح کے نام سے ہر اُس ہسپتال اور ہر اُس ڈسپنسری سے ریکارڈ چیک کروایا جہاں اُس کا وجود ہو سکتا تھا مگر اِس نام کی کوئی ڈاکٹر سرے سے موجود ہی نہیں تھی۔ اِس تلاش کو سات برس نکل گئے۔ بالآخر طلال نے ڈاکٹر فرح کا خیال چھوڑ دیا۔ ویسے بھی اب وہ ٹبہ ولی بخش کا بلا شرکتِ غیرے واحد بادشاہ تھا اور ہر طرح سے اُس نے تمام

علاقے پر اپنا سکہ جما لیا تھا۔ اُس نے ایک بڑے رئیس کی بیٹی سے شادی کر لی جہاں سے اُسے مزید تین سو ایکڑ ملے۔ وہ زمین اُس نے بیچ کر اُنھی پیسوں کی زمین ٹبہ کے آس پاس لے لی۔ اِس عرصے میں اُس کے ہاں ایک بیٹا اور ایک بیٹی کی پیدائش ہوئی۔

ایک دن ملک میں اچانک ایک جنگ کے لگنے کے سبب تمام ڈاکٹروں کو واپس بلا لیا گیا۔ سب نئے پرانے ڈاکٹروں کی چھٹیاں اور استعفے منسوخ کر دیے گئے۔ ڈاکٹر فرح کی ڈیوٹی کراچی کے ایک ہسپتال میں لگ گئی۔ اُنھی دِنوں ایک نیا گُل یہ کھلا کہ ڈاکٹر زبیر کو اپنے ہی آفس کی ایک نوعمر لڑکی پسند آ گئی۔ اُس نے اُس سے شادی کر لی۔ اس بات پر ڈاکٹر فرح نے احتجاجاً ڈاکٹر زبیر سے طلاق لے لی اور بیٹے کو ساتھ لے کر پنجاب میں آ گئی جو اُس کا اصلی وطن تھا۔ یہاں اُس کی پوسٹنگ اول ضلع جھنگ میں ہوئی۔ وہاں اُس نے نو سال تک ڈیوٹی انجام دی۔ پھر اُس کا تبادلہ منٹگمری ہو گیا لیکن وہاں وہ ڈیوٹی دینے کے لیے تیار نہ تھی۔ اُنھی دِنوں اِس گاؤں کی ڈسپنسری میں ایک ڈاکٹر کی سیٹ خالی پڑی تھی۔ ڈائریکٹر ہیلتھ نے اُسے تجویز دی اگر وہ چاہے تو اُس کا تبادلہ اِس گاؤں میں کر دیا جائے۔ ڈاکٹر فرح فوراً تیار ہو گئی۔ وہ ہر صورت شہروں سے دور نکل جانا چاہتی تھی جہاں اُس کا بیٹا اپنے باپ کی دسترس سے نکل جائے اور وہ خود اپنے بچپن کو اور اپنے اجداد اور اُن کے ورثے کو بھول جائے اور اپنے بیٹے کے ساتھ زندہ رہ سکے۔

(۲۱)

ڈاکٹر فرح نے جنید کو کبھی باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ ہمیشہ نئی نئی چیزیں خرید کر دیتی۔ زمانے کے اعتبار سے کوئی ایسی خواہش نہ تھی جسے وہ پوری نہ کرتا ہو۔ روزانہ نئے کپڑے اور جوتے پہنتا تھا۔ ہمارے گاؤں میں بھی ایک بڑا اسکول تھا جہاں مَیں خود پڑھتا تھا مگر جنید اپنی نئی نکور موٹر سائیکل پر شہر پڑھنے جاتا۔ ہمارا پورا گاؤں تو ایک طرف اردگرد کے کئی گاؤں میں بھی ایسی موٹر سائیکل کسی کے پاس نہیں تھی وہ بھی لشکتی اور چمکتی ہوئی۔ اُسے انگریزی بھی آتی تھی۔ ہمارے ساتھ بہت سی باتیں ایسی کر جاتا جن کی ہمیں بالکل سمجھ نہ آتی اور ہم اُس کا منہ دیکھتے رہ جاتے۔ ہر روز شہر سے مٹھائی اور پھل لے کر آتا۔ وہ یہ پھل دوسرے لڑکوں سے چوری چھپے مجھے اور معیذ کو دیتا۔ شکل وصورت میں مجھے اچھا لگتا تھا۔ اُس کے کپڑوں سے بڑی عمدہ خوشبو آتی تھی۔ ڈاکٹر فرح کے آنے سے ہمارے محلے میں کئی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ہسپتال میں پہلے سے دُگنی چہل پہل شروع ہوگئی۔ عدیلہ عمر اور تجربے میں اُس سے بڑی تھی لیکن وہ بہرحال نرس تھی۔ ڈاکٹر فرح ڈاکٹر ہونے کے ناتے رعب داب اور وقار میں اُس سے کہیں زیادہ تھی۔ یہ دونوں عورتیں اپنے کام اور فرائض میں اتنے عمدہ تعاون سے آگے بڑھنے لگیں کہ ڈسپنسری ایک طرح سے ہسپتال میں بدل گئی۔ بڑے سے بڑے مریض کو ڈیل کیا جانے لگا۔ ڈاکٹر فرح نے چھوٹی موٹی سرجری کا سامان بھی منگوا لیا تھا اور اب انتہائی پیچیدہ مرض کے علاوہ کوئی مریض شہر کے ہسپتال میں ریفر نہیں کیا جاتا تھا۔ اِس نے آتے ہی نہ صرف مریضوں کے ساتھ اپنایت کا اظہار کیا بلکہ

مالیوں کے کام کا بھی باقاعدہ جائزہ لینا شروع کر دیا۔ پڑوس میں ہونے کی وجہ سے ہم سے بھی خاص قربت ہو گئی لیکن وہ عدیلہ کی طرح ہمارے گھر کبھی نہیں آئی البتہ کوئی خاص چیز پکاتی تو ہمیں ضرور بھیجتی اور اکثر مجھ سے میری والدہ کے بارے میں دریافت کرتی۔

اب میری عمر تیرھویں سال میں جا پڑی تھی۔ جنید مجھ سے سات سال بڑا تھا لیکن عمر کے اس فرق کے باوجود ہماری دوستی ہو گئی تھی۔ جنید کا دوست ہونے کے ناتے مَیں اکثر ان کے ہاں آنے جانے لگا۔ اُن کی کوٹھی میں تین بیڈ روم، ایک ڈرائنگ روم اور ایک برآمدے پر مبنی وسیع جگہ تھی۔ ڈرائنگ روم کی چھت باقی کمروں کی نسبت کافی اونچی تھی۔ کوٹھی کے کمروں کی دیواریں ڈیڑھ فٹ موٹی اور چھتیں عام کمروں کی نسبت دُگنی اونچی تھیں۔ چھتوں پر لکڑی کے بڑے بڑے شہتیر تھے۔ اُن پر لکڑی ہی کے آنکڑے جما کر اُسی قسم کی لکڑی کی پھٹیاں نصب کی ہوئی تھیں۔ کمروں کی دیواروں پر سفید قلعی ابرق ملا کر کی گئی تھی۔ یہ قلعی اتنی دفعہ ہوئی تھی کہ بعض جگہوں پر دیوار سے کئی پرتیں اُکھڑی نظر آتی تھیں۔ روشن دان اونچے اور چھتوں سے جڑے ہوئے تھے۔ اِن روشن دانوں میں لوہے کے تاروں کی باریک جالیاں تھیں تاکہ چڑیاں اندر گھونسلے نہ بنائیں مگر چڑیاں کہیں نہ کہیں سے راستہ تلاش کر کے گھونسلے بنا گئی تھیں۔ اِن گھونسلوں کو ڈاکٹر فرح نے سرے سے غائب کر دیا اور کمروں کے دروازوں کو اِس طرح پردے لگائے کہ کوئی پرندہ اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ چھتوں کی بلندی اور دیواروں کی موٹائی نے کوٹھی کی ہیبت کو دوچند کر رکھا تھا۔ اِس کے علاوہ ڈسپنسری کو داخل ہونے والے پرانے پھاٹک اتروا کر نئے پھاٹک نصب کر دیے گئے تھے۔ گھر کے اندر داخل ہونے کے بعد نہ تو سردیوں میں زیادہ سردی محسوس ہوتی تھی اور نہ گرمیوں میں اتنی گرمی لگتی۔ ڈاکٹر فرح نے طرح طرح کا فرنیچر اِس میں سجایا ہوا تھا۔ مَیں نے اپنے گھر میں تو ایک طرف، گاؤں کے کسی بھی گھر میں ایسا فرنیچر نہیں دیکھا تھا۔ کمروں میں خوبصورت پینٹنگز اور گلدستے الگ سے سجے ہوئے تھے۔ یہ گھر کسی بھی نواب کے گھر سے کم نہیں تھا مگر مَیں نے نوابوں کا گھر دیکھا ہی کب تھا۔ میری کوشش ہوتی تھی کہ مَیں زیادہ سے زیادہ اِس گھر میں وقت گزارا کروں لیکن میرے والد اور والدہ کو یہ بات سخت ناگوار گزرتی تھی۔ مَیں ڈاکٹر فرح کو خوش رکھنے کے لیے اُن کے بغیر پوچھے اُن کے کچھ کام بھی کر دیا کرتا۔ ڈاکٹر فرح کی ایک بوڑھی سی ملازمہ بھی تھی، جو اُن کے ساتھ ہی آئی تھی مگر مَیں نے اُسے کبھی کام کرتے نہیں دیکھا تھا۔ ہاں کبھی کبھار جھاڑ پونچھ ضرور کر دیتی تھی۔ جنید کے کھانے پینے کا طریقہ بھی الگ سا تھا۔ مجھے حیرت ہوتی تھی جب اُس کی ماں

کچھ اور پکا کر کھا رہی ہوتی، اُسی وقت جنید اپنے لیے الگ چیز پکار رہا ہوتا تھا۔ اگر ڈاکٹر فرح اُسے پکا کر دیتی تو لازمی اُس سے پوچھتی، ناشتے میں کیا لو گے؟ ہمارے گھر اس طرح کا کوئی رواج نہیں تھا۔ ایک ہی چیز پکتی تھی اور وہ ہر ایک نے کھانا ہوتی تھی۔ مَیں اِس طرح کی باتوں پر حیران ہوتا تھا لیکن کبھی بولتا نہیں تھا۔ جنید اور اُس کی والدہ ڈاکٹر فرح کے چائے پینے کا طریقہ بھی عجیب تھا۔ اول تو اُن کے گھر میں ہمارے گھر کی طرح لکڑیاں جلانے والا چولہا ہی نہیں تھا۔ ہمارے گھر میں صحن کی ایک دیوار کے ساتھ مٹی کا ایک چولہا تھا جس میں لکڑیاں جلتی تھیں اور ہم سب اُس چولہے کے اردگرد بیٹھ کر روٹی کھاتے تھے اور میری والدہ روٹی پکاتی جاتی تھی۔ اگر سردی ہوتی تو یہی چولہا آگ سینکنے کے کام بھی آتا مگر اِس کوٹھی میں ایک تو چولہا ہی مٹی کے تیل کا تھا۔ پھر اُسے ایک اونچی جگہ پر رکھا تھا اور وہیں کھڑے ہو کر اُس پر کوئی چیز پکاتے تھے۔ جب پک جاتی تو اُسے پہلے ایک میز پر سجاتے۔ اُس کے بعد میز کے اردگرد پڑی کرسیوں پر بیٹھ کر اُسے کھاتے تھے۔ یہ تو بادشاہوں والی بات تھی جو ہمارے گاؤں میں کسی نے نہیں دیکھی تھی اور شاید میرے سوا کسی نے اِس کا مشاہدہ بھی نہیں کیا تھا کیونکہ میرے علاوہ اِن کی کوٹھی میں کوئی آتا نہیں تھا۔ کئی بار چائے پیتے ہوئے مَیں نے اِن کے آگے پلیٹوں میں انوکھی قسم کی مٹھائیاں بھی دیکھیں۔ مَیں نے وہ مٹھائیاں کبھی کھائی نہیں تھیں۔ میری ماں نے مجھے سختی سے منع کر رکھا تھا کہ اُس وقت تک کوئی چیز کسی کے گھر سے نہیں کھانی جب تک بلا کر پیش نہ کی گئی ہو یا پھر نیاز کی ہو۔ کئی طرح کے رس اور کیک بھی وہاں ہوتے تھے۔ جنید مجھے ہر روز چائے پینے کے لیے بلاتا مگر میں ہر روز نہیں جاتا تھا۔ اُن کے گھر میرا آنا جانا ایک دو دن بعد ہی ہوتا۔ جنید مجھ پر بہت زیادہ التفات اور شفقت برتنے کی کوشش کرتا۔ گیند بلا بھی لا کر دیا۔ اُس کے گھر میں ایک وی سی آر بھی تھا۔ یہ ٹیلی ویژن ہی کی طرح کی کوئی شے تھی جس پر ڈراموں کی بجائے فلمیں چلتی تھیں۔ وہ ٹیپ میں ڈالی جانے والی ریل کی طرح ایک ڈبے میں بڑی سی ریل ڈالتا۔ اُس کے بعد فلم چل پڑتی۔ مجھے فلمیں دیکھنا سخت منع تھا۔ ایک بار مَیں نے دیکھی اور تین گھنٹے وہاں بیٹھا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد میرا چچا زاد مجھے ڈھونڈتا ہوا آیا اور لے گیا، تب گھر میں ایسی مار پڑی کہ میرے فرشتے بھی رو پڑے تھے۔ اُس کے بعد مَیں نے جنید کے پاس جا کر کبھی فلم نہیں دیکھی بلکہ پندرہ دن تک اُن کے گھر بھی نہیں آیا۔ ویسے بھی مجھے اِس گھر میں آنے یا نہ آنے سے کچھ فرق نہیں پڑتا تھا۔ میرا دل عدیلہ کے گھر میں اٹکا ہوا تھا۔ مَیں موقع پاتے ہی اُن کے گھر بھاگ جاتا۔ یہاں مجھے کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔

اب عصر سے شام تک ہم نے ریکٹ کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ جنید شہر سے ٹینس کا پورا سامان لے آیا تھا۔ اُس نے ایک ریکٹ میرے لیے، ایک معیذ کے لیے اور ایک میرے چچازاد کے لیے خریدا۔ میرا چچازاد مجھ سے ایک سال چھوٹا تھا۔ مَیں اور معیذ ایک طرف ہو جاتے۔ میرا چچازاد اور جنید دوسری طرف ہوتے تھے۔ اُس نے ہمارے لیے نیکریں اور شرٹیں بھی لا دیں جن کا اول میرے والد اور والدہ نے بُرا مانا پھر خموشی اختیار کر لی۔ ٹینس کھیلتے ہوئے جنید کا منہ ہمیشہ جنوبی سمت ہوتا تھا اور ہمارا شمال کے رُخ یعنی جنید کے گھر کی طرف۔ کھیلتے ہوئے ہم ہسپتال کے صحن کا دروازہ بند کر دیتے۔ یہ دروازہ لکڑی کا پھاٹک تھا جس میں پہلے بہت پرانی پھٹیاں لگی ہوئی تھیں مگر ڈاکٹر فرح نے اُنھیں تبدیل کروا دیا تھا۔ مَیں اُس وقت چھٹی کلاس میں تھا۔ مجھے سوائے کھیلنے کے اور زینی کے بارے میں سوچنے کے کسی بات کی خبر نہیں تھی۔ اِسی لیے مَیں اپنی والدہ اور عدیلہ کے درمیان ہونے والی کھسر پھسر پر دھیان نہ دے سکا۔ البتہ میرے لیے اِن دِنوں ایک پریشانی ضرور پیدا ہو گئی تھی اور مَیں اُس کا کوئی نتیجہ بھی نہ نکال سکتا تھا۔ کچھ دنوں سے زینی نے میرے ساتھ چُہل بازی کم کر دی تھی۔ وہ اب میرے ہاتھوں کے ساتھ اپنے ہاتھوں کو مس کرنا بھی چھوڑ گئی اور اب ہمارے گھر بھی آنا چھوڑ دیا۔ یہ میرے لیے خطرے کی گھنٹی تھی لیکن میں کسی نہ کسی طرح اِس خیال کو اپنے دل سے جھٹک دیتا مگر روز بہ روز اُس کی بے اعتنائی بڑھتی جا رہی تھی۔ مجھے لگا کہ وہ مجھ سے صرف ایک چھوٹا بچہ سمجھ کر شفقت کرتی تھی۔ اب چونکہ مَیں بڑا ہو گیا ہوں تو اُس نے شفقت کے رویے سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ یہ بات مجھے شدید رنج میں مبتلا کر دینے والی تھی۔ مَیں دیکھ رہا تھا زینی پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت نظر آنے لگی تھی۔ ہر روز کپڑے بھی بدلتی اور روزانہ نہا کر ڈسپنسری کے صحن میں کلیوں اور پھولوں کے پودوں میں گھومتی۔ جب ہم ٹینس کھیل رہے ہوتے تو اپنا پراندہ پیچھے سے اُٹھا کر گلے کے سامنے سے بل دے کر دائیں کاندھے پر پھینک لیتی اور دروازے میں کھڑی ہو جاتی۔ وہ وہاں اُس وقت تک کھڑی رہتی جب تک ہم کھیلتے رہتے۔ مَیں نے کئی بار احتجاج کیا کہ مَیں اپنی جگہ بدلنا چاہتا ہوں مگر جنید مجھے ایسا نہیں کرنے دیتا تھا۔

ڈاکٹر فرح کو ہمارے پڑوس میں آئے اب ڈیڑھ سال کے قریب ہو گیا تھا۔ اِس عرصے میں کئی اچھے کام اُن کے ہاتھوں انجام پا گئے۔ دوائیوں کے ذخیرے سے ہر وقت سٹور بھرا رہتا۔ پودوں اور درختوں کو مسلسل پانی لگنے سے ڈسپنسری میں باغ و بہار کا عالم ہو گیا۔ عدیلہ کے کوارٹرز اور فرح کی کوٹھی کی رینوویشن ہو کر قلعی ہو گئی۔ دیواریں بھی قلعی ہو کر چمک گئیں اور بالکل نئی لگتی تھیں۔ مریضوں کے لیے

پہلے چار بیڈ تھے، وہ بھی ٹوٹے پھوٹے، اب دس ہو گئے اور اُن پر سفید چادریں دودھ کی طرح روشن بچھی رہتیں۔ اُس نے کئی دفعہ مجھے بھی اچھے اچھے تحفے دیے اور میں بھی جنید کی طرح کا لباس پہننے لگا۔ مٹی اور دھوپ سے بچنے کی کوشش کرتا۔ جنید مجھے اور معیز کو روزانہ ایک ڈیڑھ گھنٹا پڑھاتا، جس کی وجہ سے میری تعلیمی حالت کئی ہم جماعتوں سے بہتر ہو گئی اور میں ساتویں سے فرسٹ ڈویژن سے پاس ہو گیا۔ اس کے باوجود عدیلہ اور میری والدہ ڈاکٹر فرح سے کھنچی کھنچی رہنے لگیں۔ مجھے اِس بات سے کوئی غرض نہیں تھی۔

(۲۲)

یہ 22 رجب کی رات تھی جس کی صبح کونڈوں کا ختم تھا۔ پورے گاؤں میں ہمارا واحد گھر تھا جو ہر سال یہ ختم دلاتا۔ میری والدہ اور دادی دوسری نیازوں کی نسبت اِس کا اہتمام شدومد سے کرتیں۔ والد تو اِس معاملے میں بڑے سخت پابند تھے۔ ہماری مالی حالت بہت بری تھی لیکن وہ نیاز دلانے کے معاملے میں قرض اُٹھانے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ چونکہ پورا محلہ نیاز کھانے آتا اِس لیے اِس پر کافی خرچہ اُٹھ جاتا۔ ساری رات پوڑیاں اور حلوے کے کڑاہے تیار کرتے نکل جاتی۔ پرانی روایت کے تحت نیاز منہ اندھیرے ہی دلانا ہوتی تھی۔ صبح کی اذان سے پہلے ہی تمام چیزیں تیار کرلی جاتیں۔ کام زیادہ تھا اس لیے رات تین بجے میری والدہ نے مجھے عدیلہ کو بلانے بھیج دیا کہ وہ ہمارا ہاتھ بٹادے۔ اب اُن کا ہمارے ہاں آنا جانا اور اِس طرح کے کاموں میں ہاتھ بٹانا معمول بن چکا تھا۔ مَیں نے اپنے گھر سے نکل کر سڑک پار کی اور پھاٹک کی طرف پھرا لیکن وہ خلافِ توقع بند تھا۔ درز سے اندر جھانکا تو مجھے دو سائے جامن کے اُسی پیڑ کے نیچے نظر آئے جہاں عماد بھوت چارپائی پر پڑا رہتا تھا۔ میرے دل کو ایک دم ہول نے پکڑ لیا۔ اندھیرے میں کچھ صاف دکھائی نہ دیتا تھا اس لیے میری سمجھ میں کچھ نہ آیا اور مَیں بھاگتا ہوا اپنے گھر میں آ گیا۔ والدہ کو بڑی مشکل سے دوسایوں کے بارے میں بتایا۔ میرے دماغ میں عماد کی تصویر اور اُس کا بھوت بن کر خوابوں میں آنا اور مجھے ڈرانا ایک دم سب کچھ پلٹ کر آ گیا۔ عماد کا بھوت ابھی تک ہسپتال کے اِس صحن سے رخصت نہیں ہوا تھا لیکن یہ دوسرا سایہ کس کا تھا، اُس

وقت اِس بارے میں سوچنے کے لیے میرے پاس نہ تو فرصت تھی اور نہ عقل۔ میری سانس اُکھڑ چکی تھی۔ والدہ نے فوراً میرے منہ پر انگلی رکھ دی اور سختی سے خموش رہنے کی ہدایت کی۔ پھر اُنھوں نے والد کے کان میں کچھ کہا۔ والد صاحب مجھے غور سے دیکھنے لگے۔ پھر آہستہ سے اُٹھ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور مجھے دوبارہ ہسپتال کے کوارٹر میں نہ جانے کی ہدایت کی اور خود اُٹھ کر باہر نکل گئے۔ مَیں نے جلدی سے اپنے اُوپر کپڑا لیا اور لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میرے والد آ گئے اور اطمینان سے والدہ کے ساتھ باتیں کرنے لگے مگر یہ باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں۔ مَیں اُس وقت غنودگی کے عالم میں تھا اور سونے کی طرف جا چکا تھا۔

صبح زینی عدیلہ کے ساتھ ہمارے گھر نیاز کھانے آئی تو میں نے دیکھا اُس کے چہرے پر حیرت انگیز حسن پھوٹتا تھا۔ آتے ہی اُس نے مجھے ٹھوکا دیا۔ اُس کے ساتھ ہی ایک مانوس سی خوشبو میری سانسوں میں اُترتی چلی گئی۔ مَیں دہل کے رہ گیا۔ یہ خوشبو تو جنید کے کپڑوں سے آتی تھی۔ یہ ایسا انکشاف تھا جس نے میرے لیے حسن اور اذیت کے نئے باب کھول دیے۔ عدیلہ کے آتے ہی میری والدہ اُسے دوسرے کمرے میں لے گئی۔ جب وہ باہر آئیں تو عدیلہ کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔ مَیں محلے والوں کو نیاز بانٹنے میں مصروف تھا لیکن یہ سارا عمل بھی کن اکھیوں سے دیکھتا جاتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد عدیلہ زینی کو لے کر اپنے گھر چلی گئی۔ اُس کے بعد سارا دن کوئی بات نہ ہوئی لیکن عصر کے وقت مَیں ریکٹ اُٹھا کر ہسپتال کے صحن میں جانے لگا تو میری ماں نے میرے ہاتھ سے ریکٹ کھینچ لیا اور مجھے ہسپتال جانے سے منع کر دیا۔ مَیں بہت جز بز ہوا مگر اجازت نہ ملی۔ مجھے کہا گیا کہ آئندہ جنید سے کوئی واسطہ نہ رکھوں۔ کھیلنا ہے تو سکول میں جا کر کھیل لیا کروں۔ یہ اچانک سب کچھ میرے لیے حیرت کا باعث تھا۔ اُس دن مَیں صبر سے بیٹھ گیا اور مغرب کے وقت کا انتظار کرنے لگا۔ یہ وہ وقت تھا جب زینی اپنی ماں عدیلہ کے ساتھ ہمارے گھر آتی اور عشا تک یہیں رہتی اور میں زینی کو دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ ہم گاہے گاہے مذاق کا کوئی جملہ بھی چھوڑ دیتے تھے لیکن اب کافی اندھیرا چھا گیا اور وہ نہ آئیں۔ مَیں بے چینی سے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ ایک دو دفعہ پھاٹک تک جا کر بھی دیکھ لیا مگر وہ نہ آئیں۔ اب میری تشویش دو چند ہو گئی۔ مَیں ایک بے نام سی اُکتاہٹ کا شکار ہو کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ یہ رات ایسی اذیت کی تھی کہ بیان سے باہر ہے۔ مَیں جو نو بجے ہی کبوتر کی نیند سونے کا عادی تھا، رات کے تیسرے پہر جا سویا اور مؤذن کی اذان

اپنے احاطے کے گیٹ، جو لکڑی کے تختوں سے بنا تھا، کے کُنڈے کو نیچے گرایا کہ گھر والے نہ اُٹھ بیٹھیں۔ سڑک پار کر کے کوارٹر کے باہری صحن میں جا پہنچا۔ یہ میری روزانہ کی ڈیوٹی بھی تھی۔ مولوی صاحب کے لیے اِن کیاریوں سے چنبیلی کی کلیاں توڑ کر لے جاتا تھا۔ یہ وقت زینی کا ان کیاریوں سے طراوت پینے کا ہوتا تھا۔ ہمارے دن کی ملاقات کی ابتدا یہیں سے ہوتی تھی پھر دن ریشم کی طرح نرم نرم گزر جاتا۔ ہر چیز مولوی کی قرأت سے لے کر الجبرے تک حفظ ہو جاتی مگر آج سورج کے آثار ظاہر ہو گئے لیکن وہ نہ آئی۔ ایک دفعہ تو جی چاہا دیوار پھاند جاؤں مگر ابا کی رات والی نصیحت یاد آ گئی اور اُن کی غصے سے لال ہوتی ہوئی آنکھیں نظر میں گھوم گئیں۔ ناچار مسجد میں گیا پھر واپس آ کر ناشتا کیا اور سکول چلا گیا۔ چھٹی کے بعد بھی وہاں لیٹا رہا اور چار بجے گھر آیا اور ایسے جیسے کوئی لُٹا پٹا مسافر ہو۔ مجھے نہیں پتا صبح مولوی صاحب نے کیا پڑھایا اور سکول میں کیا پڑھا۔ کھانا کھایا اور بے دم سا ہو کر بستر پر گر گیا۔ شام کے قریب دوبارہ باہر نکلنے لگا تو والدہ نے وہی تنبیہ دہرائی کہ خبردار ڈسپنسری نہیں جانا مگر اب یہ سب کچھ برداشت سے باہر ہو چکا تھا۔ ساری نصیحتیں بالائے طاق رکھ کر صحن میں آ گیا جہاں جنید تو تھا مگر زینی کا بھانجا معیذ نہیں تھا۔ جنید اِدھر اُدھر بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی فوراً میری طرف بھاگا، کاندھے سے پکڑ کر امرود کے پودے کے دوسری طرف لے گیا۔

ضامن ایک کام گڑبڑ ہو گیا ہے، سمجھ نہیں آتا کیا کروں؟

کیا ہوا؟ مَیں نے حیرانی سے پوچھا، مجھے لگا جیسے اُسے بھی عماد کا بھوت نظر آیا تھا اور وہ اُس سے ڈر گیا تھا۔

عدیلہ کو پتا چل چکا ہے۔ جنید تشویشناک انداز سے بولا، جیسے وہ جس چیز کے بارے میں مجھ سے بات کر رہا ہے، مَیں اُس معاملے میں گویا اُس کا ہم راز ہوں۔

کس چیز کا، بھوت کا؟ مَیں نے اُسے حیرانی سے پوچھا۔

یار تم بھی بہت بھولے ہو میرے چاند، جنید نے تلخی سے کہا، زینی اور میرے چکر کا۔

میرے پاؤں سے ایک دم زمین نکل گئی۔ اب میری سمجھ میں آیا مجھے کس لیے روکا جا رہا تھا اور زینی کل سے ہمارے گھر کیوں نہیں آئی تھی۔ حتیٰ کہ صبح کیاریوں کی چنبیلیوں کا لمس لینے بھی نہیں۔ دوسرے ہی لمحے جنید نے ایک اور بجلی مجھ پر گرا دی۔

نہ جانے اُسے کس نے بتا دیا کہ میری زینت سے محبت چل رہی ہے۔ اُسے ہماری رات کی

ملاقات کا علم بھی ہو گیا۔ آج صبح ہی ماما نے مجھے ڈانٹ پلائی اور عدیلہ نے زینی کے گھر سے نکلنے پر پابندی لگا دی۔

جنید سب کچھ مجھے جلدی میں بتا رہا تھا جو میرے کانوں میں سیسہ بن کر اُتر رہا تھا۔ مجھے سابقہ فلم کی دھندلی تصویریں صاف دکھائی دینے لگیں۔ صبح شہر جاتے ہوئے جنید کا تیز تیز موٹر سائیکل کا ہارن دینا۔ ٹینس کھیلتے ہوئے اپنا منہ ہمیشہ جنوبی سمت رکھنا۔ امرود پر چڑھ کر گانے گانا۔ دونوں طرف سے نہا دھو کر ہر وقت خوبصورت نظر آنا۔ پھر نیاز کی رات جامن تلے دو بھوتوں کا سایہ اور زینی کی میرے ساتھ بڑھتی ہوئی بے مروتی۔ یہ سب ایک دم چاک کے گھومتے ہوئے چکر کی طرح تیزی سے میرے سر میں تصویریں بن کر گھومنے لگا اور میرا دماغ پھٹنے لگا۔

یار میرا ایک کام کر دو بڑا احسان ہو گا۔ تم تو زینی کے گھر آتے جاتے ہو، کسی طرح سے میرا یہ خط اُسے دے دو۔ پھر میرا منہ چومتے ہوئے اُس نے پانچ روپے اور خط ایک ساتھ میری جیب میں ڈال دیا۔

مَیں ایک دو لمحے وہاں گم سم کھڑا رہا پھر اچانک پانچ روپے اور کاغذ کا ٹکڑا جنید کے سامنے پھینک کر اپنے گھر کی طرف سرپٹ دوڑ پڑا اور لحاف میں گھس کر رونے لگا۔ اُس کے بعد مَیں عدیلہ کے گھر کی طرف نہیں گیا اور نہ ہی ہسپتال میں داخل ہوا۔

میرا کھیل کود کے لیے سارا دھیان سکول کے گراؤنڈ کی طرف ہو گیا۔ میرا چچا زاد اختر بھی میرے ساتھ ہی اُدھر پھر گیا۔ اِس واقعے کو دو مہینے گزر گئے۔ مجھے ایک طرح سے اب ہسپتال کے صحن سے دہشت ہونے لگی تھی اور جنید سے مکمل طور پر نفرت ہو چکی تھی۔ مجھے نہیں معلوم وہ اب کیسے کھیلتا تھا، کس کے ساتھ کھیلتا تھا، کیا کھاتا پیتا تھا اور کون سی اُس کی مصروفیات تھیں؟ زینی کو اُس کی ماں نے روک دیا تھا تو یہ بات انتہائی اچھی ہوئی لیکن یہ بھی تھا کہ نیاز والے دن کے بعد زینی سے میری اپنی ملاقات بھی نہ ہوئی البتہ معیذ کے ساتھ روزانہ سکول میں اور بازار میں ملاقات ہو جاتی۔ اب اُس کے شان ہی اور ہو گئے تھے۔ تین چار روپے روزانہ خرچ ڈالتا۔ اچھی خوشبو اُس کی شرٹ سے آتی تھی۔ ایک دن مَیں نے پوچھا معیذ تیرے پاس اِتنے پیسے کہاں سے آتے ہیں۔ معیذ فخر سے بولا، جنید بھائی بہت اچھے ہیں اور مجھے چھوٹا بھائی بنا لیا ہے۔ اُنھوں نے لے کر دیے ہیں۔ مجھے روزانہ خرچہ دیتے ہیں۔

(۲۳)

یہ جاڑوں کے دن تھے میری عمر کا چودھواں سال اور نویں کلاس کے امتحانوں کا وقت تھا۔ پچھلے دو ماہ سے میری تعلیمی کارکردگی صفر ہو کر رہ گئی تھی۔ ہر بار زینی کا خیال جھٹکنے کی کوشش کرتا مگر جان نہ چھوٹتی تھی۔ پڑھائی کی کوئی بات دماغ میں نہ رہتی۔ مارچ کی بارہ کو پہلا پیپر تھا۔ صرف ڈیڑھ مہینہ بیچ میں تھا۔ دادی اماں سے کہہ دیا تھا کہ وہ تہجد کے وقت جگا دیا کرے لیکن یہ ایسا وقت ہوتا ہے کہ انسان پھانسی گھاٹ پر بھی سونے کی سوچتا ہے۔ ہماری چار پائیاں صحن میں بچھی ہوتی تھیں۔ مارچ کے مہینے میں یوں تو سردی زیادہ نہیں ہوتی مگر پچھلی رات خنکی بڑھنے سے سردی کا احساس پلٹ آتا تھا۔ رات بھر کی شبنم اِس خنکی کو مزید سرد کر دیتی۔ اِس عالم میں رضائی کے بغیر گزارا نہ ہوتا تھا۔ دادی اماں اُٹھا تو دیتی مگر سردی کے عالم میں گرم رضائی کی نعمت جسے ملی ہو وہ خوابوں کی معراج پر ہوتا ہے۔ مجھے نماز تو ہر حالت میں پڑھنا پڑتی کہ اِس کے بغیر میری مسلمانی مشکوک ہوتی تھی جس کے بعد گھر میں میرا وجود منحوس اور بے معنی تصور کیا جاتا۔ نماز کے معاملے میں دادی کی سپورٹ بھی والد اور والدہ کے پلڑے میں جا پڑتی تھی۔ اِس لیے ایک دفعہ اُٹھ جاتا مگر نماز پڑھنے کے بعد پھر بستر کی طرف بھاگتا اور پرندوں کے جاگنے سے پہلے سو جاتا اور ظاہر کرتا کہ بس پڑھنے بیٹھ گیا ہوں۔

آج صبح دادی اماں نے مجھے اُٹھایا ہی تھا کہ ہمارے بڑے دروازے پر دھپا دھپ شروع ہو گئی۔ دروازہ شیشم کی سیاہ اور بھاری لکڑی کا ہونے کی وجہ سے کرخت آواز تو پیدا نہ ہوئی لیکن دھڑک

دھڑک بجنے لگا۔ سارا گھر پریشانی سے اُٹھ بیٹھا۔ جیسے زلزلے کے جھٹکے افراتفری پھیلا دیتے ہیں۔ مَیں نے بجائے دوبارہ بستر میں گھسنے کے اِس طرح اُسے پھینکا کہ وہ فرش پر جا پڑا اور مَیں اُسی پھرتی سے بڑے دروازے پر پہنچ گیا۔ دروازے کی بلّی جو اُس وقت لکڑی کی ہوتی تھی اُٹھائی ہی تھی کہ عدیلہ بے ساختہ صحن میں آ پہنچی بلکہ میرے اوپر گرتے گرتے بچی۔ اتنے میں میری والدہ اور والد بھی صحن میں آ کھڑے ہوئے۔ عدیلہ کی سانسیں سان پر چڑھی ہوئی تھیں۔ پہلے تو ہونقوں کی طرح ہمیں دیکھتی رہی پھر رونا شروع کر دیا۔ میری والدہ اُسے پکڑ کر اندر لے گئی اور تسلی دینے لگی کہ آخر ہوا کیا ہے۔ مَیں بھی پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔ عدیلہ دو چار لمحے چپ روتی رہی اور کھڑی رہی پھر ایک دفعہ میری طرف دیکھا اور اُس کی زبان سے اتنا نکلا زینت سامنے والے چھوکرے کے ساتھ چلی گئی۔ ڈاکٹر فرح کے لڑکے کے ساتھ۔ اِس بات کے ساتھ ہی وہ چارپائی پر گر پڑی۔ اتنا سننے کے بعد اب میرا وہاں کھڑے رہنا مشکل ہو گیا۔ مَیں نہ جانے کس جذبے کے تحت انتہائی تیز رفتاری سے بھاگتا ہوا سیدھا ڈاکٹر فرح کے دروازے پر جا کر کھڑا ہو گیا جیسے جنید اُسے عدیلہ کے گھر سے اُٹھا کر یہاں اپنے گھر میں آ بیٹھا ہو اور مَیں اُس سے اُس کا بازو چھڑا کر پھر عدیلہ کو سونپ دوں گا۔

مَیں نہیں جانتا وہاں اِس وقت میرے جانے کا کیا مقصد تھا مگر پہنچ کر معلوم ہوا کہ مَیں پسینے سے شرابور تھا اور میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ مَیں چند لمحے وہاں کھڑا رہا جیسے تیز رفتار گھوڑے کے سامنے اچانک قلعے کی فصیل آ جائے اور اُس کا سب جوش ٹھنڈا پڑ جائے۔ مجھے جرأت نہ ہوئی کہ ڈاکٹر فرح کے دروازے پر دستک دوں۔ چند لمحے وہیں کھڑا رہا پھر سر نیچا کیے شکست خوردگی کی چادر اوڑھ کر واپس ہو گیا اور اپنے گھر جانے کی بجائے سیدھا سکول کے گراؤنڈ میں چلا آیا۔ گراؤنڈ میں پڑے ہوئے ایک بنچ پر بیٹھ کر بے اختیار رونے لگا۔ میری ہچکی بندھ گئی۔ مجھے لگا کہ زندگی کا تمام سرمایہ لُٹ چکا ہے اور اب میرے پاس کچھ نہیں رہا۔ جنید ایک پرلے درجے کا حرامی نکلا۔ حرامی ہی ایسا کام کیا کرتے ہیں۔ زینی اچھی بھلی میری تھی اُس نے اپنے پیسے کی وجہ سے مجھ سے چھین لیا۔ اب جب وہ اُسے پیٹا کرے گا تو زینی کو خوب پتا چلے گا۔ غنیمت یہ تھا اُس وقت صبح کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ اندھیرا ہونے کی وجہ سے مجھے کوئی دیکھ نہیں رہا تھا۔ نہ ہی اُس وقت سکول میں کوئی فرد تھا جو میرے بڑبڑانے کی آوازیں سُن سکتا۔ کبھی کبھی لمحے برگد اور پیپل کے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ رونے میں مخل ہو جاتی تھی۔ آدھا گھنٹا اِسی طرح گزر گیا۔ جب دل کا کافی غبار نکل گیا تو مَیں نے اُٹھ کر نیم کے پیڑ کے پاس والے نلکے سے ہاتھ منہ

دھویا پھر پھولوں اور کلیوں کی کیاریوں سے دل بہلانے لگا۔ اِسی عالم میں سورج کی پیشانی سے پہلی کرنیں پھوٹیں اور مجھے پرسہ دینے کے لیے ٹھہر گئیں۔ اگرچہ گھر جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن چلا آیا اور بے نیازی سے اپنے کمرے کی طرف مُڑنے ہی والا تھا کہ میری والدہ نے مجھے آواز دی۔ وہ چولہے پر بیٹھی ناشتا بنا رہی تھی۔ مَیں پاس جا کر بیٹھ گیا۔ والدہ مجھے غور سے دیکھنے لگی جیسے میرے اندر سے کچھ پڑھ رہی ہو۔ اُس کے اِس طرح دیکھنے سے مَیں نے محسوس کیا کہ میرا تمام راز افشا ہو گیا ہے اور مَیں آئینے کی طرح اُس کے سامنے کھل گیا ہوں۔ پھر اُسی بے دھیانی کے عالم میں مَیں نے زینی سے محبت کے اقرار پر اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ اُسی لمحے والدہ نے مجھے کھینچ کر میرا سر اپنی گود میں لے لیا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ اُس کے اِس رویے سے میری ہچکی بندھ گئی۔ مَیں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ والدہ میرے سر میں ہاتھ پھیرنے لگی۔ اُس دن مجھ پر کھلا والدہ کی گود کتنی راحت بخش ہوتی ہے کہ دُنیا کا سارا غم ایک لمحے میں کھا جاتی ہے۔

اِس واقعے کو دوسرا دن تھا۔ مجھے کسی بھی طرح چین کی سبیل نہیں مل رہی تھی۔ جس قدر ممکن تھا، مَیں ہسپتال کے صحن میں جا کر معاملے کی ٹوہ لینا چاہتا تھا۔ صبح ساڑھے سات بجے تھے۔ یہ وقت میرے سکول جانے کا تھا۔ سکول جانے سے پہلے سردیوں میں نہانے کا سلسلہ بند ہوتا تھا۔ ہمارے گھر میں اتنی لکڑیاں نہیں تھیں کہ اُن کو جلا کر پانی گرم کیا جاتا۔ فقط منہ ہاتھ دھونے پر اکتفا کیا جاتا تھا۔ سردی کے دنوں میں نہانے کے لیے اول تو ہفتے میں ایک یا حد دو بار پانی گرم کیا جاتا اور نہایا بھی اُس وقت جاتا جب سورج خوب چمک کر نکلا ہو۔ سکول جانے میں ابھی آدھ گھنٹا باقی تھا اور مَیں چولہے کے پاس بیٹھا ناشتا کر رہا تھا۔ یہ ناشتا دیسی ساگ اور دیسی آٹے کی روٹی کا تھا جس میں تھوڑا بہت دیسی گھی بھی لگا تھا۔ دیسی گھی کے بغیر ساگ کا تصور نہیں تھا۔ ابھی ایک دو لقمے لیے تھے۔ اُسی وقت مجھے ایک شور شرابے نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ مَیں جلدی سے گھر سے باہر نکلا اور سڑک کے دوسری طرف ڈسپنسری میں آ گیا۔ وہاں دیکھا تو ہنگامے اور گالیوں کا ایک طوفان تھا۔ ایک بڑا مجمع ڈاکٹر فرح کے گھر کے سامنے موجود تھا اور اِن میں زیادہ تر آس پاس ہی کے لوگ تھے۔ وہی لوگ جن کے گھر ہسپتال کے ساتھ پڑتے تھے۔ دو نوجوان، جو شادی شدہ بھی تھے، ڈاکٹر فرح پر بے تکے پن سے برس رہے تھے۔ اِن میں ایک ہمارا رشتے دار تھا۔ اِس کا نام آصف تھا، ڈاکٹر فرح اُسے سمجھا رہی تھی لیکن وہ کسی طور سنبھل نہیں رہا تھا۔ بات کرتے ہوئے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔ اُس نے ڈاکٹر فرح پر اِس قدر دباؤ ڈالا کہ مجھے اُس پر غصہ

ڈاکٹر فرح اِس کی باتیں سُن کر سمجھ نہیں رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اِس قدر مشتعل ہو گیا کہ مجھے لگا آنے لگا۔ آگے بڑھ کر ڈاکٹر فرح کو تھپڑ رسید نہ کر دے۔ اُس کا ساتھ ہمارے گاؤں کا وہی کبوتر باز دے رہا تھا جس نے مجھے ایک دن اُس وقت چپت رسید کی تھی جب مَیں اُن کے گھر سے نکل کر اٹکھیلیاں کرتا ہوا اپنے گھر کی طرف آ رہا تھا۔ اُسے شبہ تھا کہ مَیں اُس کے کبوتر چوری کرتا ہوں۔ اِن دونوں کی تائید میں دوسرے لوگ یا تو خاموش تھے یا حمایت میں بول رہے تھے۔ اِس ہنگامے میں زینی کا والد نہایت سکون سے ایک طرف کھڑا تھا۔ وہ کچھ بول نہیں رہا تھا۔ یہی حالت اُس کی والدہ کی تھی۔ دونوں پر مُردنی چھائی تھی۔ گویا زبان ہی نہ رکھتے ہوں۔ آصف نے ڈاکٹر فرح سے جب حد سے زیادہ بدتمیزی شروع کی تو وہ ایک دم پھٹ پڑی۔ اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور آنکھیں باہر اُبلنے لگیں۔

بدتمیز بکواس کیسے کیے جاتا ہے؟ مَیں خاموش ہوں اور تُو بھونک رہا ہے۔ دفع ہو جا یہاں سے۔ ورنہ ہتھوڑا مار کے سر پھاڑ دوں گی۔

آصف کو اُس کی طرف سے ایسی توقع نہیں تھی۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ اُس نے ڈاکٹر فرح کو مرعوب کر لیا ہے لیکن اِس اچانک ردِعمل پر وہ بوکھلا گیا۔ اُس کا دوست تو واقعی دو قدم پیچھے ہٹ گیا بلکہ پورا مجمع اچانک ایک نئی کیفیت سے دوچار ہو گیا۔ آصف کو کچھ لمحے سمجھ نہ آیا کیا کرے مگر فوراً ہی اُس نے محسوس کیا، اگر خود کو تھوڑا سا بھی کمزور کروں گا تو سبکی ہو گی۔ اُس نے ایک لمحے ضبط کیا اُس کے بعد ایک دم آگ بگولہ ہو گیا۔ کسی لڑائی میں ایسی حالت میں لڑنے والا آدمی کچھ بڑا نقصان یا معرکہ سر کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا، نہ اُسے یہ خبر ہوتی ہے کہ وہ کس لیے اودھم مچا رہا ہے۔ وہ لاشعوری ہدایات کے زیرِ اثر اپنے اردگرد پھیلے مجمعے یا فقط سامنے والے کے بیانیے کو ایک شور یا چھوٹی موٹی ہاتھا پائی سے دبا کر اپنی ذات کی تسکین کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ یہی کیفیت آصف کی تھی۔ یہ آدمی نہ تو گاؤں کے بدمعاشوں میں سے تھا، نہ اِس کی ذاتی حیثیت میں کوئی بڑا جوہر چھپا تھا لیکن محلے کے معاملات نپٹانے کی خواہش ہمیشہ اسے اپنی انا کی تسکین کا سامان دیتی تھی جس میں کبھی یہ کامیاب ہو جاتا اور کبھی ناکام۔ ناکامی اور کامیابی میں زیادہ امتیاز کرنے کی صلاحیت بھی اُس میں مفقود تھی۔ بس محلے کے لوگ اُسے کہہ دیں کہ تم نے بہت عمدہ بات کی ہے اور وہ خوش ہو جاتا۔ بعض اوقات اِسی دوران بہت رسوا بھی ہو جاتا مگر اگلے ہی لمحے بھول جاتا کہ اُس کی کسی سے بے عزتی ہوئی ہے۔ آصف گالی دیتے ہوئے آگے کی طرف لپکا، اِس سے پہلے کہ وہ ڈاکٹر فرح کے ساتھ عملی بدتمیزی کرتا، اتنے میں میرے والد صاحب آگے بڑھے۔ وہ کچھ

ہی لمحے پہلے اِس ہنگامے میں داخل ہوئے تھے اور ابھی سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اس آدمی کے ساتھ ڈاکٹر فرح نے کیا کیا ہے؟ ایک آدمی نے میرے والد کو بتایا آصف میاں کا تاؤ بھاؤ زینت کی فرارگی سے متعلق ہے۔ والد صاحب کا گاؤں میں کوئی زیادہ اثر و رسوخ نہیں تھا مگر اس آدمی سے کہیں بہتر عزت اور معاش رکھتے تھے۔ والد صاحب فوراً ہی مجمع چیر کر درمیان میں ہو گئے اور آصف کو ایک طمانچہ ایسا دیا کہ وہ بچارا گھوم گیا۔

حرام زادے وہ تیری کیا لگتی تھی، جو تُو اتنی خرمستی دکھا رہا ہے؟

آصف کو بالکل بھی توقع نہیں تھی ایک ایسا آدمی جس نے کبھی چڑیا کو بھی ہاتھ نہیں لگایا اِس طرح سے چڑھائی کر دے گا۔ وہ اِس تھپڑ پر ہکلا سا گیا۔ مجھے ایسی خوشی ہوئی کہ کچھ نہ پوچھیں۔ والد صاحب کے اِس جارحانہ قدم پر میرے دل میں ایک جھنجھنا سا بج اُٹھا۔ وہ ہکلاتے ہوئے بولا، چاچا مَیں آپ کی عزت کرتا ہوں۔ آپ دُور ہو جائیں ایسا نہ ہو کہ کچھ کر بیٹھوں۔

میرے والد صاحب کی آنکھوں سے اب کے شعلے برسنے لگے۔ اُنھیں آج تک مَیں نے اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ جواب میں وہ اُس پر ایسے برسے کہ تمام لڑائی کا مرکز گھوم کر میرے والد کے گرد ہو گیا۔ اُن کے اعضا و اطوار سے صاف ظاہر تھا کہ اِس وقت وہ نہ تو کسی دکھلاوے میں ہیں اور نہ کوئی ڈھیل اُن کی ذات سے برتی جائے گی۔ اُن کا تمام جسم کانپنے لگا تھا اور غصے میں شیر کی دھاڑ سے مشابہ تھے۔ اُسی وقت مَیں نے بھی اپنی پوزیشن لے لی تھی اور اُس پھرتی کے لیے تیار تھا کہ جیسے ہی آصف بدتمیزی دکھائے، مَیں اینٹ اُٹھا کر اُسے ماردوں گا۔ مَیں نے ایک اینٹ پر اپنی نظریں جما لی تھیں۔ یہی زندگی میں پہلا موقع تھا جب مَیں نے کسی پر عملی طور پر تشدد کے بارے میں سوچا تھا۔

کیا کرلے گا تُو؟ والد صاحب اب دوٹوک انداز میں دھاڑے۔ یہاں سے ابھی اور اسی وقت دفع ہو جا۔ مَیں جانتا ہوں تجھے کس چیز نے اِس حد تک حرام زدگی پر آمادہ کیا ہے۔ بے غیرت کیا تُو سب کو اندھا سمجھتا ہے؟ بچاری شریف خاتون پر بکواس کیے جاتا ہے۔ پرائی جنج میں دولہا بنا بیٹھا ہے۔

یہ شریف ہے؟ اس کا بدمعاش بیٹا بچاری غریب کی بیٹی کو بھگا کر لے گیا ہے۔ آصف اب گڑگڑانے لگا۔ اُس کا دوسرا ساتھی اپنی جگہ چھوڑ کر دیوار کے ساتھ جا لگا تھا اور کچھ ہی لمحے بعد وہ چپکے سے کھسکنے والا تھا۔

تو پھر؟ والد صاحب کا غصہ کسی طرح نیچے نہیں آرہا تھا۔

کیا اِس کی مرضی کے بغیر ہوا ہے؟ آصف نے اپنی ایک توجیح پیش کرنے کی کوشش کی۔
تُو اُس کا ماما لگتا ہے۔ جن کی بیٹی ہے وہ آرام سے کھڑے ہیں اور تیرے چوتڑوں کو آگ لگی ہے۔ یہاں سے ابھی اور اِسی وقت نکل جاورنہ مَیں تیری ٹانگیں توڑ دوں گا۔ ہر وقت اپنی ڈگڈگی بجانے سے بندر قبضے میں نہیں آتے۔

میرے والد کے اِس تابڑتوڑ حملوں سے آصف کی دھونکنی میں دھواں بھر گیا۔ وہ ایسے خموش ہو گیا جیسے کچھ سمجھ نہ آ رہی ہو۔ وہ کھسیانا سا ہو کر پیچھے ہٹ گیا اور بڑبڑاتا ہوا دُور جا کر کھڑا ہو گیا۔ تب میرے والد نے ڈاکٹر فرح کو مخاطب کیا، بہن آپ بےفکر ہو کر گھر میں بیٹھیں۔ عصر کے وقت فیصلہ کرتے ہیں کیا کرنا ہے؟ پھر والد صاحب نے مجمعے کو مخاطب کیا، ہاں بھئی یہاں کوئی مداری تماشا کر رہا ہے؟ جاؤ اپنے اپنے گھروں میں۔ عدیلہ بی بی آپ بھی ایک دفعہ یہاں سے جایئے۔ اللہ سب بہتر کرے گا۔ یہ آوارہ لفنگے تمھارے لیے کیوں لڑ رہے ہیں کبھی اِس پر غور کیا ہے تم نے؟

اِس عمل سے ایک ہی دم میں ہجوم چھٹنے لگا۔ اتنے میں وہاں گاؤں کا ایک اور معروف آدمی نکل آیا۔ اُس نے والد صاحب کے ساتھ تھوڑی دیر چہ مگوئی کی۔ اُس کے بعد سب اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو گئے۔

یہ دن میرے لیے عجیب مصروفیت کا تھا۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے مَیں ایک لمحے کے لیے بھی فارغ نہیں بیٹھا۔ پورا جسم تھکاوٹ سے نڈھال تھا۔ مجھے رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ عدیلہ کے گھر جانا چاہیے لیکن قدم اجازت نہیں دیتے تھے۔ اب بھی مجھے یقین تھا، زینت کہیں گھر کے کمرے میں بیٹھی ہے۔ یہ سارا ہنگامہ ایک خواب ہے اور مَیں جلد بیدار ہو کر اصلی حالت میں آ جاؤں گا۔ اُسی لمحے والد صاحب کی نظر مجھ پر پڑی۔ وہ پھر ایک دم بپھر گئے، تُو یہاں کیا کر رہا ہے، سکول تیرے ابے نے جانا ہے؟ دفع ہو جا یہاں سے۔ جب دیکھو کسی ہنگامے میں کھڑا ہوتا ہے۔ اُس کے ساتھ ہی ایک ہلکی سی چپت میرے کان کے نیچے لگا دی۔ مجھے تیرے کرتوت کی سب خبر ہے۔ ہر وقت ڈسپنسری کی دیواروں میں رہتا ہے، جیسے کوئی مال کھو گیا ہے۔ مَیں والد صاحب کی سرزنش سے سٹپٹا گیا اور بھاگ کر جلدی سے گھر کی طرف بھاگا۔ اپنا بستہ ڈھونڈا اور تیز رفتاری سے بھاگتا ہوا سکول جا پہنچا۔

(۲۴)

اُسی دن عصر کا وقت تھا۔ چالیس سے پچاس آدمی عین اُس جگہ جامن کے پیڑ کے سائے میں چار پائیاں بچھا کر بیٹھے تھے۔ کسی بات کا فیصلہ کر رہے تھے۔ مجھے آج صبح اپنے والد کی سرزنش یاد تھی اس لیے سامنے کے گیٹ کی بجائے پچھلی جانب کے پھاٹک سے صحن میں داخل ہو کر اُس پلاٹ میں آ کر بیٹھ گیا جس میں ٹماٹر اور سبزیاں وغیرہ اُگائی ہوئی تھیں۔ یہاں پودے اور گھاس پھوس کے سبب مجھ پر کسی کی نظر نہ جا رہی تھی۔ جلد ہی پتا چل گیا یہ پنچایت زینت اور جنید کے بارے میں ہے۔ اگر زینت کا معاملہ نہ ہوتا تو مَیں کسی بھی طرح ایسے کاموں میں دلچسپی نہ لیتا۔ زینت کے جانے کے بعد میری کیفیت انتہائی بے چینی اور مایوسی کی تھی۔ کچّے مکانوں پر لگی کبوتروں کی چھتریاں، دیواروں پر بیٹھے کوے، درختوں پر بیٹھے پرندے اور کھیتوں میں ہل چلاتے کسان، ہر ایک شے خموش بجھی بجھی اور اُداس لگنے لگی تھی۔ کسی چیز میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ مجھے زینت سے ہرگز یہ تقاضا نہ تھا کہ میرے لیے بے حجاب ہوتی۔ ایسی چیز سوچنے کا مجھ میں نہ خیال تھا نہ شعور لیکن اُس کا گاہے گاہے نظر آ جانا اور تعلق کا ایک تسلسل برقرار رہنا چاہیے تھا جو اُس کے چلے جانے سے بالکل ٹوٹ گیا تھا۔ اب مَیں کسی ایسے معجزے کا منتظر تھا جس کے تحت وہ لوٹ آتی۔ اِسی لیے مَیں ہر اُس جگہ اور ہر اُس کوشش پر کان لگائے ہوئے تھا جس کے تحت زینت کی واپسی ممکن ہو سکتی۔

ڈسپنسری کے مریض اپنی چار پائیوں پر بیٹھے اور کچھ لیٹے اِس پنچایت میں شریک تھے۔ یہ وہ

مریض تھے جن کے بیڈ شام کے وقت کمروں کے اندر منتقل ہو جاتے تھے اور دن کے تمام وقت اسی صحن میں پڑے رہتے۔ اِن مریضوں کی ساری ہمدردیاں عدیلہ اور ڈاکٹر فرح کے ساتھ برابر تھیں۔ ڈاکٹر فرح بھی ایک طرف کرسی پر بیٹھی تھی اور اب وہ مکمل طور پر پُر وقار نظر آ رہی تھی۔ اُس کے لہجے میں وقار اور شادابی تھی مگر افسردگی حد سے زیادہ تھی۔ اُس نے اپنی بات شروع کی۔

دیکھیے، جنید میرا بیٹا ہے، میرا اِس بات سے انکار نہیں ہے۔ وہ بالغ ہے، یہ بھی مَیں تسلیم کرتی ہوں۔ مَیں آپ کے سامنے ہر وقت اپنے کام سے غرض رکھتی ہوں اور یہ سمجھتی تھی کہ سب کام ٹھیک چل رہا ہے۔ مجھے تو اِس وقت یہ بھی خبر نہیں اُس کا باپ کہاں ہے۔ مَیں اُس سے نو سال پہلے طلاق لے چکی ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ اپنے باپ کے پاس چلا گیا ہو لیکن یہ بات مَیں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتی۔ جتنا مجھے معلوم ہے میرا بیٹا کسی بُرے کام میں ملوث نہیں، نہ اُسے کسی شے کی کمی آنے دی ہے۔ یقین جانیں اُس وقت تک جب یہ حادثہ رونما ہوا، مَیں بھی آپ ہی کی طرح بے خبر تھی۔ کیا آپ اُس دکھ کو سمجھ سکتے ہیں جس کی تمام پونجی ایک بیٹا ہی ہو اور وہ بھی اُس سے جدا ہو جائے؟ آپ بھی کوشش کریں، مَیں اپنی کوشش کے مطابق جنید کے والد کا پتا کرتی ہوں اُس کے پاس نہ چلا گیا ہو۔ اگر کوئی میرا ساتھ دے تو مَیں چاہوں گی اُن دونوں کو واپس لے آئیں۔ عدیلہ چاہے تو ہم دونوں جا کر وہاں سے پتا کرتی ہیں۔ اِس کے علاوہ جنید کے پاس کوئی ٹھکانا ہو گا، اِس بارے میں مجھے خبر نہیں ہے۔

عدیلہ آپ کیا کہتی ہیں؟ سید اغن شاہ نے اب کے عدیلہ کی طرف بولنے کا اشارہ کیا۔

مَیں مصیبتوں کی ماری کیا کہوں گی؟ میرا تو حساب اُس ہرنی کا ہے جو بھیڑیوں کے غول سے بھاگ کر آئے اور شیر کی کچھار میں پناہ لے بیٹھے۔ ایک کے بعد ایک حادثہ میری راہ میں بیٹھا ہے اور مَیں آہستہ آہستہ اپنا سب کچھ لُٹاتی جا رہی ہوں۔ لوگوں کی نظر میں میری بیٹیاں اور خود مَیں منحوس ہو چکی تھیں۔ مَیں نے سوچا تھا یہ گاؤں میرے لیے امان کی جگہ ہو گا مگر ہونی کو کون روکے۔ مجھے ڈاکٹر فرح سے کوئی گلہ نہیں ہے مگر یہ ضرور کہوں گی وہ اپنے بیٹے کو واپس بلا لے۔ اگر اُنھوں نے شادی کرنی ہی ہے تو ہم یہاں اُس کی شادی کر دیں گے۔

اِس بات پر اغن شاہ جیسے مطمئن سے ہو گئے ہوں اور فرح کی طرف دیکھ کر بولے، لو ڈاکٹر صاحبہ اب تو معاملہ ہی صاف ہو گیا ہے۔ آپ کا بیٹا جہاں کہیں بھی ہے اُسے بلا لیں اور یہاں اُن دونوں کی شادی کر دیں۔

اس بات پر وہی آصف میاں ایک دم سیخ پا ہو گیا اور بولا، شاہ صاحب، آپ کیسے فیصلے کرتے ہیں۔ اس طرح تو گاؤں کا جو لڑکا بھی کسی لڑکی کو ورغلا کر لے جائے، بعد میں اُس کی شادی کر دیں گے۔ کیا آپ اس طرح کے فیصلے کرتے ہیں؟ آپ جانتے ہیں ایسے فیصلوں سے گاؤں کی اخلاقیات پر کیا اثر پڑے گا؟

آصف کی اِس بات کو جواز بنا کر ایک اور آدمی بول اُٹھا۔ شاہ صاحب بات یہ ہے کہ آصف ٹھیک کہتا ہے۔ اگر تو اکیلے لڑکے کا قصور ہے تو اُسے سزا ضرور ملنی چاہیے۔ اگر دونوں کا قصور ہے تو ایسے نہیں کہ اُن کی اِس بیہودگی کے عوض اُلٹا انعام کے طور پر اُن کا نکاح پڑھا دیا جائے۔ ان دو بیبیوں کے علاوہ اب یہ ایک گاؤں کا مسئلہ بھی ہے۔ کل کلاں اِس واقعے کو جواز بنا کر ہمارے اپنے بچے بچیاں یہی حرکتیں کرنے لگے تو بات دیکھنا کہاں تک جائے گی۔ ایسا نہ کرو، اُنھیں گاؤں میں لاؤ اور پہلے سزا دو۔ بعد میں جو کچھ بھی کہنا کرنا ہے، کیجیے گا۔

بات تو سچ ہے، اغن شاہ اُن کی اِس بات سے متاثر ہوتے نظر آئے۔

اُنھیں اِس طرح کی کیفیت میں دیکھ کر میرے والد صاحب بولنے لگے۔ اغن شاہ، آپ بھی کمال کرنے لگے ہو۔ جب لڑکے اور لڑکی کے علاوہ اُن کے والدین بھی اِس بات پر خموش ہیں تو آپ کو کیا مصیبت ہے؟ اُنھیں جیسے اور جہاں ہیں رہنے دیجیے۔ گاؤں کے بچے بچیاں اگر ایسا کریں گے تو گاؤں والے اپنے بچے بچیوں کو سنبھالیں۔ والدین میں قدرت نہیں تو اولادوں کو پیدا نہ کریں۔ اونٹ خریدتے وقت اُس کا کوہان ساتھ ہی آئے گا۔ اگر بچے ہیں تو ایسے خطرے ہر صورت رہیں گے مگر ایسا نہیں ہو سکتا کہ آنے والے خطرے کے پیشِ نظر آپ پہلا فیصلہ ہی غیر منصفانہ کر دیں۔ یہ آصف تو نرا لفنگا ہے اور ایسا ہی اِس کا دوست ہے۔ اگر خدانخواستہ اُن کو کوئی زک پہنچتی ہے تو آپ کا انصاف کہاں جائے گا؟ میری پوچھتے ہو تو آپ سب سے زیادہ یہ بی بی فرح اور مائی عدیلہ کا دُکھ اور شرمندگی ہم سے زیادہ ہے۔ بچی بچے کو سزا دے کر ہم اپنی کون سی شرمندگی کے ازالے کی بات کرتے ہیں؟

یہ بھی تو ہو سکتا ہے ڈاکٹر فرح کا لڑکا اُسے زبردستی بھگا کر لے گیا ہو بلکہ اغوا کر کے لے گیا ہو۔ جب تک وہ سامنے نہ آئیں تب تک کیسے کہہ سکتے ہیں دونوں رضامندی سے گئے ہیں؟ وہاں بیٹھے ایک مونچھوں والے آدمی نے اپنی بات کی۔

میرا بیٹا ایسا نہیں ہے، ڈاکٹر فرح نے احتجاج کیا۔ ویسے بھی وہ عمر کے لحاظ سے ایک دو برس

زینت سے چھوٹا ہی ہے۔
وہ تو ہر ماں یہی کہتی ہے کہ اُس کا بیٹا نیک اور معصوم ہے۔ مَیں تو اِس کیس کو ایسے رفع دفع نہیں ہونے دوں گا اور پولیس کو اطلاع کر دوں گا۔ آصف نے دھمکی دی۔
اگر میرا بیٹا نیک نہیں ہے تو اِس کی بیٹی بھی پارسا نہیں۔ کس کو نہیں پتا اِس کی پانچوں بیٹیاں ایک ایک کر کے کیسے گئی ہیں۔ کیس تو میرا بنتا ہے۔ اِس کی بیٹی نے میرے بیٹے کو ورغلایا ہے۔ کئی دن سے میرے گھر میں بہانے بہانے سے چکر لگاتی تھی۔ مَیں سمجھتی تھی بہت شریف لڑکی ہے۔ مجھے کیا پتا تھا یہ ڈائن میرا بیٹا ہی کھا جائے گی۔ پولیس کو اطلاع تو مَیں خود کروں گی۔ ڈاکٹر فرح ایک دم بگڑ کر ہتھے سے اُکھڑ گئی۔
نہیں ایسا مت کریں، میرے پاس پولیس کو دینے کے لیے ایک پیسہ نہیں ہے۔ عدیلہ ایک دم بوکھلا اٹھی۔
دیکھیں جی ہمارے ہوتے تو آپ پولیس کی بات نہ کریں۔ اُن کے منہ کو تو سؤر لگا ہوتا ہے۔ مُردے تک کی کھال کے پیسے وصول کرتے ہیں۔
ہاں ٹھیک ہے یہ بات تو واقعی اہم ہے، چلیے ایک بات اب آخری رہ گئی ہے کہ بہرحال ڈاکٹر فرح کا بیٹا اِس کام میں زیادہ گنہگار ہے۔ لڑکی کی نسبت ایک لڑکا زیادہ سمجھ دار تھا اور دوسرا وہ مرد تھا اُس کا گناہ بہرحال زیادہ ہے۔ میرا فیصلہ ہے اگر وہ واپس گاؤں آتے ہیں تو اُن کا نکاح کروا دیا جائے اور دو ہزار روپیہ ڈاکٹر فرح عدیلہ کو دے تاکہ اِس کا بھی کچھ ازالہ اور غم کی نوعیت کم ہو۔
مَیں کوئی پیسہ نہیں لوں گی، فرح صاحبہ میری محسن ہیں۔ میری اِن سے بس یہی التجا ہے کہ مجھ دکھوں کی ماری سے کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔ کسی طرح اُن کو تلاش کر کے یہاں لے آئیں پھر چاہے اکٹھے رہ لیں۔ مَیں پہلے ہی اپنا ایک بیٹا اور ایک بیٹی کھو چکی ہوں۔
جی ڈاکٹر صاحبہ آپ کیا چاہتی ہیں؟ اغن شاہ نے دوبارہ پوچھا۔
مَیں جنید کو ضرور ڈھونڈنے کی کوشش کروں گی۔ شاہ صاحب آپ کو کیا خبر میرے دل پر کیا گزر رہی ہے اور دو ہزار روپیہ بھی عدیلہ کو دینے کو تیار ہوں۔
بی بی ہم نے تو آپ کو ذرا پریشان نہیں کیا۔ یہ دُکھ تو آپ کو اپنی ہی اولادوں نے دیا ہے۔ اب آپ ہی بتائیے جس لڑکے کو اتنا خیال نہیں کہ اپنی اکیلی ماں کو دھوکا دے جائے اور اُسے بے سہارا چھوڑ

کر ایک لڑکی کے ساتھ نکل جائے اُس سے کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ چند دن گزار کر اُس لڑکی کو بھی چھوڑ دے اور وہ بے چاری سڑک پر آ جائے۔ جیسا بھی کہو، زینت کو ٹھکانا مہیا کرنے کا بندوبست تو تمھارے لڑکے ہی نے کیا ہوگا۔ اِس لیے الزام تو اُسی پر آئے گا۔ بہر حال تمھیں لڑکے کو ڈھونڈنا ہوگا۔ باقی عدیلہ اور تم دونوں بیٹھ کر اپنی کہانی نپٹا لو۔

اِس فیصلے کے بعد یہ پنچایت برخواست کر دی گئی۔

اُسی دن شام کے وقت میرے باپ نے مجھے اپنے پاس بٹھایا اور بڑے پیار سے جنید کے متعلق پوچھنے لگا۔ مَیں نے والد کو بتایا کہ وہ کیسے ہم کو پیسے دیتا تھا اور کس طرح چھپ چھپ کے زینت کو دیکھتا تھا۔ پھر رات کو درختوں میں موجود سایے کی بابت سوال کیا، وہ بھی مَیں نے اُنھیں بتایا لیکن یہ کہ مَیں اُن کو پہچان نہیں سکا تھا۔ ان باتوں کے بعد والد نے مجھے کہا، اچھا جاؤ اور اپنا کام کرو لیکن یہ باتیں کسی کے ساتھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ عشا کے وقت میری والدہ اور والد مجھے لے کر ڈاکٹر فرح کی کوٹھی پر پہنچے۔ ڈاکٹر فرح اپنے گھر میں اکیلی تھی۔ ایک ملازمہ نے دروازہ کھولا، اُس کے بعد واپس جا کر اُسے بتایا کہ ہم آئے ہیں۔ تھوڑی دیر میں ڈاکٹر فرح دروازے پر آ گئی۔ آنسوؤں سے اُس کے چہرے میں گڑھے پڑ چکے تھے۔ ڈاکٹر فرح ہمیں لے کر اپنے خاص کمرے میں پہنچی اور بیٹھنے کو کرسیاں سامنے رکھ دیں۔ مَیں ایک بیڈ پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر خموشی چھائی رہی۔ اُس کے بعد میری والدہ نے بات شروع کی۔

بی بی فرح معاملہ یہ ہے کہ اِس پورے واقعے میں زیادہ قصور تو آپ کے بیٹے ہی کا بنتا ہے۔ مانتی ہوں عدیلہ کی بیٹیاں بڑی تیز ہیں لیکن یہ آخری والی اتنی تیز بھی نہیں تھی۔ یہ میرا لڑکا اِس پورے واقعے کا عینی گواہ ہے۔ اول سے آخر تک چھوٹی بڑی کہانی کا دیکھنے والا ہے۔ ہم نے اِس سے ہر بات کی ہے۔ جنید نے اِن سب کو طرح طرح کی چیزیں لے کر دی ہیں اور اِن کو اِس میں شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب جو ہوا سو ہوا، کسی طرح سے اپنے بیٹے کو ڈھونڈنے کی کوشش کریں اور عدیلہ کو مزید بے عزتی سے بچانے کے لیے جنید اور زینت کی شرعی شادی کا بندوبست کر دیں۔

ڈاکٹر فرح یہ سب باتیں سُنتی رہی اور روتی رہی۔ اُس کی کہانی بہت پیچیدہ ہو گئی تھی۔ اُسے شاید عدیلہ سے بھی زیادہ دُکھ تھا کہ ایک ہی بیٹا تھا جسے وہ اتنے عرصے سے پال پوس رہی تھی اور اب جب وہ جوان ہو گیا تو لڑکی لے کر بھاگ گیا۔ ڈاکٹر فرح نے بتایا، اُس کے خاوند نے نو سال پہلے اُسے طلاق دی

تھی اور یہی ایک بیٹا اُس کی ساری جمع پونجی ہے لیکن سب سے اہم اور پریشانی کی بات یہ ہے کہ جنید زینت کو لے کر اپنے باپ کے پاس چلا گیا ہے۔ مَیں اُسی وقت سے جنید کے باپ کو فون کر رہی ہوں اور وہ فون اُٹھا نہیں رہا۔ رات ہی مجھے خبر ملی ہے وہ پچھلے ایک مہینے سے کسی بزنس کانفرنس کے سلسلے میں ملک سے باہر گیا ہوا ہے اور اُس کی ڈائن بیوی بات ہی نہیں سُن رہی۔ ہوسکتا ہے جنید اپنے کسی دوست کے ہاں لے گیا ہو اور یہی خوف مجھے سب سے بڑا ہے۔ میرے والد اور والدہ ڈاکٹر فرح کی تمام بات سُن کر عجیب کشمکش میں پڑ گئے۔ جسے دیکھو اُسی کا غم دوسرے سے سوا تھا۔

والد نے اُسے کہا، فرح بی بی آپ ایک کام کرو۔ چُپ کر کے اپنی ڈاکٹری پر دھیان دو اور کسی کی مت سُنو، مَیں گاؤں والوں سے خود نمٹ لوں گا اور سُنو جو کوئی تمھیں ذرا سا تنگ کرنے کی کوشش کرے بس ایک ذرا میرے کان میں ڈال دیجیے گا۔ اگر جنید سے آپ کی بات ہو یا اُس کی خبر ملے تو ہرگز گاؤں کے کسی فرد کو مت بتائیں، نہ اُسے اب وہ گاؤں میں لائے۔ کسی دوسرے شہر لے جائے۔

مجھے والد صاحب کی آخری بات عجیب سی لگی۔ پتا نہیں کیوں۔ مجھے احساس تھا مَیں زینت سے ملوں گا۔ وہ دوبارہ ہمارے گھر آیا کرے گی، اُسی چارپائی پر بیٹھے گی جس کے دوسری طرف میری چارپائی ہے۔ والد صاحب کا کہنا کہ وہ آئندہ کبھی یہاں نہ آئے، سراسر ایک ظُلم تھا۔ کیا والد صاحب واقعی زینت سے نفرت کرتے تھے؟ وہ تو ایسی تھی کہ کوئی بھی اُس سے محبت کیے بنا نہیں رہ سکتا تھا۔ میرے والد کی یہ عجیب دشمنی تھی کہ اُسے اب گاؤں میں دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ اُن کی باتوں سے میرے دل کو سخت ٹھیس پہنچ رہی تھی مگر وہ بے دھڑک اُسے اِس طرح کے نامناسب مشورے دے رہے تھے۔

ہم کافی دیر ڈاکٹر فرح کے گھر بیٹھے رہے۔ یہ پہلا موقع تھا جب مَیں نے اُنھیں غور سے دیکھا۔ وہ کسی طرح بھی جنید کی والدہ نہیں لگتی تھی۔ بڑی بہن ہوسکتی تھی۔ مجھے لگا وہ جھوٹ بولتی ہے کہ جنید اُس کا بیٹا تھا بلکہ وہ بھائی ہوگا اور مَیں نے اپنے خیال کو ذہن میں پختہ کر لیا۔ سب باتیں کرنے کے بعد والد صاحب خموش ہو گئے۔ تب میری والدہ بولی، ڈاکٹر صاحبہ مَیں نے عدیلہ کو سمجھا دیا ہے، اگر جنید اور وہ زینت آجاتے ہیں تو اُن کا شرعی نکاح کروا دیں ورنہ اُس کی طرف سے زینت کو فوت سمجھو۔ وہ تو بچاری پہلے ہی بہت دُکھی ہے۔ اِس نئے جھگڑے نے رہی سہی کسر نکال دی ہے۔ مرے کو مارے شاہ مدار، اُس کا حساب کچھ ایسا ہی ہے۔ اگر مَیں کہوں تو یہ قصہ تم دونوں کے لیے اچھا نہیں تھا۔

اِس طرح تھوڑی دیر کے بعد ہم تینوں وہاں سے نکل آئے اور خود والد صاحب گاؤں کے معزز

افراد کی طرف اُن کو معاملے کی سنگینی سے باخبر کرنے کے لیے نکل گئے۔ مجھے نہیں خبر والد نے اغن شاہ کو کیا کہا اور کیسے اُن کو مطمئن کیا مگر مَیں نے دیکھا کئی دن تک کسی نے اِس واقعے کا کچھ ذکر نہیں کیا۔ سب کام اپنے معمول پر آ گئے۔ زینی سب سے چھوٹی تھی اور مَیں دعوے سے کہہ سکتا ہوں عدیلہ کی بیٹیوں میں سے ایک بھی اِس کے مقابلے کی نہ ہو گی۔ اکثر میرے دماغ میں آتا تھا کاش میں زینی کو بھگا کر لے جا سکتا۔

عدیلہ کی بیٹی کے بھاگنے سے اُس کے خاوند کو خاص فرق نہ پڑا تھا کہ پچھلے تمام عرصہ اُسے کسی ذی روح سے بات کرتے نہیں دیکھا۔ وہ ایسی زندہ مشین تھا جس کی انسانوں کے جنگل میں گنجائش نکالی گئی تھی۔ حِس لطیف موجود ہی نہ تھی۔ معیذ اِس کی تیسری بیٹی کا بیٹا تھا۔

(۲۵)

جنید اور زینت کو غائب ہوئے دو سال ہو گئے تھے۔ لاکھ کوششوں کے باوجود اُن کی کہیں خبر نہیں ملی۔ سب سے بڑھ کر تشویش ڈاکٹر فرح کو تھی، وہ خود بھی سیکڑوں جگہیں ماری ماری پھری۔ جہاں کہیں اُسے شبہ تھا، جنید ہو سکتا ہے، وہیں تلاش کیا مگر وہ ایسے غائب ہوا تھا کہ کچھ پتا نہ چلا۔ اِس کے ساتھ ہی ڈاکٹر فرح کا مریضوں کو دیکھنے کا عمل بھی جاری تھا مگر پہلے سا اخلاص نہیں تھا۔ اکثر بیٹھی بیٹھی یا کام کرتی کہیں گم ہو جاتی۔ یہی حالت عدیلہ کی تھی مگر عدیلہ کو شاید اتنا صدمہ نہیں پہنچا تھا۔ اِس لیے وہ جیسے بھی تھا کام پر زیادہ دھیان رکھتی تھی۔ ڈاکٹر فرح نے کئی جگہ میرے والد کو کچھ پیسے دے کر بھیجا کہ وہ جنید کا پتا چلا لائے مگر نا کام رہے۔ اِن دو سال میں نہ جنید کی طرف سے کوئی خبر ملی اور نہ زینت ہی نے اپنی ماں سے رابطہ کیا۔ جنید کی ماں اب پہلے کی نسبت زیادہ عمر کی نظر آنے لگی تھی۔ زیادہ رونے سے آنکھوں کے حلقے سیاہ ہو چلے تھے اور اب ایک ڈاکٹر سے زیادہ نرس لگتی تھی۔ مَیں پہلے کی نسبت سمجھ دار ہو گیا تھا۔ ہر شے کے بارے میں نقطہ نظر بدل رہا تھا۔ دنیا کی چیزیں اور لوگوں کی باتیں واضح اور دو ٹوک کی بجائے پیچیدہ لگنے لگی تھیں۔

پھر ایک دن ایسے ہوا کہ ڈاکٹر فرح ہمارے گاؤں سے چلی گئی۔ وہ اچانک چلی گئی۔ اُس کے جانے کی خبر دن کے وقت ہوئی اور اُس وقت ہوئی جب مریضوں کو اُس کی ضرورت پڑی۔ اُس نے آدھی رات کے وقت اپنا تھوڑا بہت سامان ٹرک پر لادا اور کسی دوسری جگہ رخصت ہو گئی۔ پیلے رنگ کی

کوٹھی پھر سے خالی ہوگئی۔ میرا ڈاکٹر فرح سے کبھی قریبی واسطہ نہیں بن سکا تھا بلکہ کسی سے بھی اُس کا کوئی جذباتی تعلق نہیں بنا تھا مگر اُسے مَیں شاید اپنایت میں قبول کر چکا تھا۔ مجھے اُس کے اِس طرح اچانک رخصت ہوجانے کا دُکھ ہوا۔ اُس کے اچانک چلے جانے سے گاؤں والوں میں کافی زیادہ چہ مگوئیاں ہونے لگیں لیکن چند ہی دنوں بعد وہ بھی بند ہوگئیں۔ مجھے خود ایک قسم کی تسکین اور طمانیت نے اپنے حصار میں لے لیا تھا مگر یوں پچھلے دو ڈھائی سال سے ہمارے گاؤں اور خاص کر ڈسپنسری کی فضا میں جو ایک قسم کی کشیدگی اور تناؤ تھا وہ ختم ہوگیا اور حالات معمول پر آ گئے۔ عدیلہ نے اپنی بیٹی سے ہاتھ دھو لیے تھے اور جان گئی تھی کہ اِس میں ڈاکٹر فرح خود ایک مظلوم تھی۔ اُس سے کسی قسم کا محاسبہ جائز نہیں تھا۔ عدیلہ نے فرض کر لیا تھا جنید لازمی اپنے باپ کے پاس تھا اور اُس نے اُسے بچانے کے لیے کسی جگہ چھپا دیا تھا۔ عدیلہ کا خیال تھا ڈاکٹر فرح کے سابقہ خاوند نے اِس طرح دو شکار کیے تھے کہ ڈاکٹر فرح سے بدلہ بھی لے لیا تھا اور اپنے بیٹے کو بھی پا لیا تھا جس پر زبردستی فرح قبضہ جمائے بیٹھی تھی۔ دوسری طرف ایک مدت گزرنے کے بعد ڈاکٹر فرح کے دماغ میں بھی ایک بات اٹک گئی تھی۔ اُس کا خیال تھا عدیلہ اور اُس کی بیٹی نے جنید کو ورغلایا تھا اور اُس کے بڑھاپے کا سہارا چھین لیا تھا۔ وہ آخری کچھ دنوں سے عدیلہ سے کھنچی کھنچی رہتی تھی۔

اگر تمام بات کا جائزہ انصاف سے لیا جائے تو مَیں کہوں گا کہ ڈاکٹر فرح اور عدیلہ میں سے کسی کا بھی قصور نہیں تھا۔ البتہ ڈاکٹر فرح کی نسبت عدیلہ کی عزت گاؤں میں خاک نہ بچی تھی۔ عدیلہ کا خاوند، جس کا نام مجھے اب بھی یاد نہیں ایک بے جان مردے کی طرح سوکھ کر کانٹا ہوگیا تھا۔ اُس نے اس سارے قضیے اور المیے میں ابھی تک اپنی زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہیں کیا تھا۔ ٹک ٹک لوگوں کی طرف دیکھتا اور آگے بڑھ جاتا یا منہ پھیر لیتا۔

عدیلہ کا اب ہمارے گھر میں آنا جانا معمول بن گیا تھا۔ صبح اور شام کا ناغہ کبھی نہیں ہوتا تھا باقی تمام دن ڈسپنسری میں رہتی۔ چہرہ پہلے کی نسبت مرجھا گیا تھا۔ اُس کے اوپر گہرے بڑھاپے کے آثار بھی نمایاں ہو گئے تھے۔ آنکھوں میں ویسے ہی گڑھے پڑتے جاتے تھے جیسے اُس کے بیٹے عماد کے تھے لیکن اس میں ابھی گوشت کی تہیں موجود تھیں۔ آنکھوں پر بڑے بڑے نمبروں کے شیشے چڑھ گئے۔ یہ شیشے اتنے موٹے تھے کہ جب وہ ہمارے گھر آتی تو میرا چھوٹا بھائی اُس کی عینک کے عدسوں سے اپنے کاغذ یا تنکوں کو آگ لگا لیتا۔ مَیں نے کبھی غور سے نہیں دیکھا لیکن مجھے احساس ہوتا کہ عدیلہ اپنی ذات سے

بالکل ہی بے نیاز ہو چکی ہے۔ میرے ساتھ اُس نے کبھی آنکھیں نہیں ملائیں۔ حالانکہ مَیں اُس کے نواسے کی عمر کا تھا۔ مَیں پہلے سے زیادہ اُس کی عزت کرتا تھا مگر اب کبھی اُن کے گھر نہیں گیا۔ حتیٰ کہ ڈسپنسری کا گیٹ تک عبور نہیں کیا تھا۔ مجھے اب وہاں جانے سے ایک وحشت کا احساس ہوتا۔ کبھی کبھی مَیں سوچتا کاش یہ ڈسپنسری ہی یہاں نہ ہوتی۔ معیذ کے ساتھ میرا رابطہ اب ایسے ہی رہ گیا تھا جیسے کوئی اجنبی ہو۔ اُس سے میرا سامنا روزانہ ہی ہوتا تھا لیکن ملنے میں گرم جوشی نہیں تھی۔ اُس نے بھی نئے دوست بنا لیے تھے۔ وہ محلے کے دوسری طرف کے لڑکوں میں اُٹھنے بیٹھنے لگا تھا جنھیں بہت سی بُری عادتوں نے پکڑ رکھا تھا۔ یہ دوست ایسے تھے کہ مجھے بدفطرت معلوم ہوتے تھے۔ بدشکل اور بدہیئت ہونے کے ساتھ بدتمیز بھی تھے۔ مَیں اُن سے دُور رہتا تھا۔ دوسری ایک کسک زینت کی تھی جو مجھے اُس سے دور رکھے ہوئے تھی۔ میرے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا لیکن دل کے کسی گوشے میں محسوس ہوتا تھا کہ یہ اپنی پھوپھی زینت اور جنید کا دلال ہے۔ اُس کا مہنگا لباس، پرفیوم اور دوسرے ناز نخرے جس طرح وہ کرتا رہا تھا اُس کی نانی کبھی پورے نہیں کر سکتی تھی اور مَیں نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ اُس نے اِس سارے قضیے میں اپنی طرف سے کوئی بھی سردردی نہیں لی تھی۔ حالانکہ زینت معیذ کا بہت خیال رکھتی تھی۔

یہ سب تو ایک طرف تھا۔ اِس سال اِن سے بھی ایک اہم بات ہوئی کہ میرے والد صاحب مزدوری کے سلسلے میں کویت نکل گئے۔ خضر علی اُن کے اُس زمانے کے دوست تھے جب وہ تقسیم سے پہلے لدھیانے کے ایک سکول میں پڑھتے تھے۔ خضر علی لاہور آ بیٹھے تھے لیکن اُن کا ایک دوسرے سے رابطہ رہا تھا۔ تعلقات کا زمانہ چونکہ میری پیدائش سے کہیں پہلے کا تھا، اِس لیے مجھے اُن کی دوستی کی پختگی کا اندازہ نہیں تھا۔ سال میں ایک بار اپنی بیوی کے ساتھ ہمارے گھر آتے تھے۔ اِس سال اُن کا ہمارے گھر دوسرا چکر تھا اور والد صاحب کے ساتھ عراق اور کویت کے بارے میں باتیں کرتے رہتے تھے کہ وہاں کنسٹرکشن کمپنیاں کھل گئی ہیں جو اُن کے جاننے والوں کی ہیں اور وہ والد کو بطور سپروائزر وہاں بھیجنا چاہتے تھے۔ اِس خبر سے ہمارے گھر میں ایک خوشی کا سماں تھا۔ خضر علی نے والد صاحب کو ایک چھوٹی سی کاپی دی جس پر اُن کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ یہ اُن کا کویت میں جانے اور وہاں کام کرنے کا پرمٹ تھا۔ اِس کے معنی تھے کہ ہم بھی شہر کے لوگوں کی طرح امیر ہونے والے تھے اور ہمارے پاس بھی جنید کی طرح نئی نئی چیزیں خریدنے کے لیے پیسے آنے والے تھے۔ یہ احساس ہی ذہنی طور پر خوشحالی کا تھا۔ میری دادی نے دکان سے سوجی کی برفی اور میٹھی پھلیاں منگوا کر پورے محلے میں بانٹ

ہمارے گھر میں ایک دیسی اور اصیل مرغ تھا جسے کافی دِنوں سے بچا کر رکھا ہوا تھا۔ مجھے حکم ملا
دیں۔ ہمارے گھر میں ایک دیسی اور اصیل مرغ تھا جسے کافی دِنوں سے بچا کر رکھا ہوا تھا۔ مجھے حکم ملا
اِسے پکڑو۔ مَیں تمام صحن میں اُس کے پیچھے دوڑتا پھرا اور بالآخر تھکا تھکا کر پکڑ لیا۔ میرے والد نے اُس
کو حلال کر دیا۔ یہ پہلی قربانی تھی جو ہم نے اپنی معاشی حالت کی درستی کے عوض کسی دوسری جان سے دی
تھی۔ دیسی مرغ کا گوشت میری والدہ نے نہایت عمدہ پکایا۔ مجھے بہت مزا آیا اگرچہ اُس گوشت میں
سے مجھے ایک چھوٹی سی بوٹی ہی ملی تھی۔ دوسرے دن میرے والد نے اپنے تمام رشتے داروں کو دعوت
دی۔ یہ کم وبیش پچیس لوگ تھے۔ اِن میں سے کچھ تو ہمارے ہی گاؤں میں رہتے تھے اور کچھ گاؤں
سے باہر تھے۔

دوسرے دن دوپہر کا وقت تھا۔ گھر کے صحن میں کھڑی ٹاہلی کا سایہ بہت دُور تک پھیلا تھا اور ہمارا صحن قریباً اُس سے بھر گیا تھا۔ اِس ٹاہلی کے نیچے آٹھ چار پائیاں بچھی تھیں۔ ہمارے یہ رشتہ دار ہماری ہی طرح غریب تھے۔ چھوٹی موٹی محنت مزدوری کرتے تھے۔ اُن کے لیے میری والدہ نے دیگچہ بھر کے شوربے والے آلو اور روٹیاں چولہے پر بیٹھ کر خود پکائی تھیں۔ اِن مہمانوں میں میری دو پھوپھیوں کے خاوند اور وہ خود بھی تھیں۔ میری امی کی بڑی بہن کے بیٹے بھی تھے اور وہ خود بھی آئی تھی۔ اِن کے علاوہ بھی کئی رشتہ دار تھے جنھیں مَیں کبھی نہیں ملا تھا۔ جب یہ سب کھانا کھا چکے تو والد صاحب نے اُن کے آگے اپنا مسئلہ رکھ دیا۔ جب وہ اُن سے بات کر رہے تھے، مَیں اُنھی کی چار پائی پر پائنتی کی طرف ادوائین کے عین اوپر بیٹھا تھا۔ مَیں بہت کم بولا کرتا تھا اور اکثر خموشی اتنی طاری ہو جاتی کہ مجھے ڈر لگنے لگتا کہیں مَیں عدیلہ کے خاوند ہی کی طرح نہ ہو جاؤں۔ والد صاحب نے اُنھیں بتایا کہ اُن کا کویت کا ویزہ لگ گیا ہے۔ اُس پر ٹکٹ سمیت پانچ ہزار خرچ اُٹھا ہے۔ یہ پیسے اُن کے دوست خضر علی نے اپنی جیب سے ادا کیے ہیں اور کہا ہے جب تم جہاز پر بیٹھ جاؤ تو مجھے دے دینا۔ دو دن بعد میری روانگی ہے اور مَیں چاہتا ہوں مَیں یہ رقم اُسے جانے سے پہلے ادا کر دوں۔ آپ سب سے گزارش ہے مجھے سب مل کے پانچ ہزار روپے دے دیں۔ مَیں وہاں جاتے ہی پہلے آپ کا قرض ادا کروں گا تب کچھ اور طرف دھیان دوں گا۔ مجھے معلوم ہے تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کے پاس نقدی میں سو دو سو روپے سے زیادہ ہوں لیکن تم میں سے ہر ایک کے پاس ایک یا دو تولے سونا ضرور ہے۔ آپ مجھے وہ سونا دے دیں، مَیں یہ سُنار کو بیچ کر اُس کے عوض پیسے لے لوں گا اور جب مَیں چلا جاؤں گا تو اتنا سونا آپ کو بنوا دوں گا۔ میرے وہاں جانے سے شاید ہمارے سب کے دن پھر جائیں۔

میرے والد کی اِس آخری بات پر سب کے چہروں پر ہلکی سی چمک آ گئی۔ وہ سونا دینے پر راضی ہو گئے۔ ہمارے ایک رشتہ دار کے پاس نقدی ایک ہزار روپیہ تھا۔ اُس نے خدا جانے وہ کہاں سے لیا تھا لیکن وہ اُس نے دے دیا۔ باقیوں نے سونا دے دیا۔ اِن سب سے جو قرض ہمیں ملا وہ ساڑھے پانچ ہزار روپے تھا۔ یہ پیسے میرے والد نے لاہور جا کر خضر علی کے حوالے کر دیے۔ اگلے ہی دن اُن کا کوچ تھا۔ میری دادی نے والد صاحب کو امام ضامن باندھا۔ ہم نے پہلے دن سالم تانگہ منگوایا جس پر پورے تین روپے خرچ ہوئے۔ یہ تانگہ ایک بس اڈے تک جاتا تھا۔ وہ بس اُنھیں لاہور لے جاتی۔ کوچ کے دن عجیب سا منظر تھا، میری دادی والد صاحب کے گرد کچھ پڑھ پڑھ کر پھونکیں مارتی رہی اور روتی رہی۔ میری اپنی حالت بھی ایک طرح سے اُداسی کی لپیٹ میں تھی۔ اُنھوں نے مجھے شاید ہی کبھی ڈانٹا ہو۔ کبھی کبھی سخت قسم کی غلطی پر گھورتے ضرور تھے۔ مارا تو کبھی بالکل بھی نہیں تھا جیسا کہ ہمارے گاؤں میں اکثر والد اپنے بیٹوں کو چھوٹی سی غلطی پر مار مار کر ادھ موا کر دیتے تھے۔ وہ اتنے سخت جان ہو جاتے کہ پھر اُن پر کوئی مار اثر نہیں کرتی تھی۔ مَیں اُن لڑکوں سے دُور رہتا تھا جن کو بہت مار پڑتی تھی۔ وہ خود بھی معمولی سی بات پر لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے تھے اور کچھ بھی پاس پڑی ہوئی چیز اُٹھا کر مار دیتے تھے۔

میرے والد کے ایک دوست اُنھیں لاہور ایئرپورٹ پر چھوڑنے کے لیے گئے۔ مَیں بھی اُن کے ساتھ تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا ایئرپورٹ تھا۔ مَیں اپنے والد کو جہاز پر چڑھتا دیکھ رہا تھا۔ ہم سامنے ایک چبوترے پر کھڑے جہاز کے اُڑنے کا منظر دیکھ رہے تھے۔ میری زندگی میں یہ ایک بالکل انوکھا تجربہ تھا کہ مَیں نے جہاز کو اتنے نزدیک سے دیکھا تھا۔ یہ بہت بڑا جہاز تھا۔ اِس سے پہلے مَیں نے جتنے جہاز دیکھے تھے وہ بالکل چھوٹے اور چمکیلے سے ہوتے تھے جو ہمارے گاؤں کے اُوپر سے گزرتے تھے اور اپنے پیچھے دھوئیں کی دو ہلکی سی لکیریں چھوڑتے جاتے تھے۔ اِنھیں مَیں اُس وقت تک دیکھتا رہتا تھا جب تک آنکھوں سے اوجھل نہیں ہو جاتے تھے۔ اُس وقت میری آنکھیں اتنی تیز اور صاف ہوتی تھیں کہ جہاز کی معمولی سی لکیر کو بھی دیکھ لیتا تھا۔ جیسے ہی والد صاحب کا جہاز پرواز پر چڑھا، میرے دل میں ہلکی سی ٹیس اُٹھی۔

(۲۶)

والد صاحب کو کویت گئے ایک سال ہو گیا تھا۔ جاتے ہی اُنھوں نے ایک کام یہ کیا کہ جو خط بھیجا اُس میں خیر خیریت کے علاوہ ایک سو پینتیس روپے بھی موجود تھے۔ یہ پیسے اُن کے پاس بچ گئے تھے۔ دو مہینے بعد والد صاحب کا ایک خط آ جاتا تھا۔ یہاں ہماری طرف سے بھی اِسی وقفے کے ساتھ خط بھیجا جاتا تھا۔ اِس سے پہلے خط بھیجنے کی فی الحال ہماری معاشی حالت اجازت نہ دیتی تھی۔ اُن کے خطوں سے جو کچھ مجھے معلوم ہوا، مختصر یہ ہے کہ جس کمپنی کے ساتھ وہ گئے تھے، اُس نے کویت کے بدؤوں کے لیے رہائشی کالونیاں بنانی تھیں۔ عربوں میں تیل نکلنے کے بعد اُنھیں ہمارے وزیر اعظم نے مشورہ دیا کہ اپنے بدؤوں کو صحراؤں سے پکڑ کر ایک جگہ آباد کرو تا کہ یہ مہذب ہوں اور شہری زندگی اختیار کریں۔ یہی صورت تمھیں انسانوں میں شمار کرے گی۔ اِسی ایک کام سے تم دوسری قوموں کے ساتھ مقابلہ کر سکتے ہو۔ جب تک یہ خیموں کے سایے میں بیٹھتے اور صحراؤں کی ریت اُڑاتے رہیں گے، انھیں شام کا چاند اور گھنٹی کی آواز اپنے سحر میں لیے رکھے گی۔ یہ دونوں چیزیں ان کے لیے افیون ہیں اور یہ افیون انھیں کبھی ارتقا کا منہ نہیں دیکھنے دے گی۔ آپ اِن کے لیے کالونیاں تیار کریں۔ وہاں اِن کی ضروریات کا سامان جمع ہو۔ اِن کالونیوں کے بنانے اور شہری ڈھانچے تیار کرنے میں لیبر اور انسانی دماغ ہم مہیا کریں گے۔ اُس کے عوض آپ ہمیں تیل اور زرِ مبادلہ دیجیے گا۔ وزیر اعظم کی بات عرب حکمرانوں کی سمجھ میں آ گئی۔ یوں مُلک سے لیبر عرب ملکوں میں دھڑا دھڑ جانے لگی۔ مُلک کی کنسٹرکشن

کمپنیاں کویت، عراق، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات میں پھیل گئیں۔ کالونیاں بننے لگیں۔
والد صاحب خطوں میں عرب بدوؤں کی بہت دلچسپ کہانیاں لکھتے تھے۔ عربوں نے پولیس کی ایک نفری مقرر کی تھی جو بدوؤں کو پکڑ کر زبردستی خیموں میں لاکر آباد کرتی مگر وہ آنکھ بچا کر پھر وہاں سے فرار ہو جاتے۔ یوں بدوؤں اور پولیس کا آنکھ مچولی کا کھیل شروع ہو گیا تھا۔ اِدھر پولیس اُنھیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر اُن کے اونٹوں اور بکریوں سمیت کالونی میں لے کر آتی، اُدھر رات ہوتے ہی وہ سب کچھ وہیں چھوڑتے اور اپنے اونٹوں اور بکریوں کے ساتھ صحراؤں میں نکل جاتے۔ بدوؤں کے پاس سیکڑوں اونٹوں اور ہزاروں بکریوں کے غلے تھے۔ یہ ریوڑ دن میں سُرخ پہاڑوں کے دامن میں پھیلی کھجوروں کی وادیوں میں گھومتے پھرتے۔ اُن میں اُگی ہوئی سخت جڑوں والی گھاس اور ببول کے پتوں اور جھاڑیوں کو چرتے پھرتے۔ عرب بدو اِنھی بکریوں اور اُونٹوں کا دودھ پیتے اور گوشت کھاتے تھے۔ اِنھی کی کھال کے کپڑے بناتے۔ کویت میں سردی اور گرمی شدید تھی۔ رات کا موسم اور صحرا کا چاند ان کے لیے جنت سے کم نہیں تھا۔ رات کے عالم میں صحراؤں کی ریت ٹھنڈی ہو کر پورے صحرا کو برفوں کے میدان بنا دیتی۔ اِس عالم میں سمندروں کی طرف سے آنے والی ہوا یخ بستگی کا احساس پیدا کر دیتی۔ خیموں کے آس پاس آگ جل جاتی۔ ثابت اونٹ اور بکرے دم پخت کیے جاتے اور اُنھیں رقصِ جشن کی محفلوں میں کھایا جاتا۔ رات کے عالم میں صحرا کے چاند اور تارے اتنے واضح، روشن اور بھرے ہوتے کہ وہ فلک پر باغات کی شکل اختیار کر لیتے۔ بدوؤں کے پاس گدھے بھی بہت زیادہ تھے۔ یہ گدھے کھجوروں، خیموں اور کھانے پینے کی اشیا کی بار برداری کے کام آتے تھے۔ اونٹوں پر عموماً عورتیں بٹھائی جاتی تھیں۔ ان بدوؤں کا سفر زیادہ تر رات کے عالم میں ہوتا تھا اور اُونٹوں کی چرائی دن کے عالم میں کی جاتی۔ اِنھیں کالونیاں جیل کی طرح لگتیں تھیں۔ وہاں رہنے سے اِن کا دم گھٹنے لگتا۔

یہ کالونیاں بہت کھلی اور شاندار طرز کی تھیں۔ اِن کے دروازے اتنے بڑے تھے کہ ایک وقت میں اُس میں سے تین تین ہاتھی نکل جاتے اور مکانوں کی لمبائی چوڑائی قلعے کی فصیلوں سے بلند تھیں مگر یہ اُن میں ٹِک کر نہ دیتے تھے۔ کچھ دن کے لیے ایک جگہ خیمے لگاتے۔ پھر وہاں سے اُکھاڑ کر آگے لے جاتے لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ خیموں میں پڑا ہوا سامان وہیں چھوڑ جاتے اور آگے خیمہ لگانے کے لیے بالکل نیا سامان خریدتے۔ میرے والد اور دوسرے پردیسیوں کی خواہش تھی کہ اِن کے خیموں کا سامان اُٹھا کر اپنے گھروں میں لے جائیں مگر بہت مشکل تھا۔ عرب بدوؤں کو کسی بھی چیز سے کوئی رغبت

نہیں تھی۔ رات کے وقت جب یہ لوگ اپنے ناقوں کی مہاریں اُٹھاتے تو گھنٹیوں کی آوازیں ایسے اُٹھتیں جیسے خدا نے فرشتوں کی محفل میں لاکھوں ساز چھیڑ دیے ہوں۔ پولیس کئی بار کالونیاں بنانے والے مزدوروں کو اپنے ساتھ لے لیتی کہ بدوؤں کو پکڑنے میں اُن کی مدد کریں۔ مزدور دن بھر مزدوری میں رہتے اور رات بدوؤں کو پکڑنے کے لیے پولیس کے ساتھ بھاگتے پھرتے۔ پولیس کے پاس ٹرک اور ہیوی انجن کے ڈالے تھے۔ وہ بدوؤں اور اُن کی بیوی بچوں کو پکڑ کر ڈبل کیبن ڈالوں میں سوار کرا لیتے اور مزدوروں کو اُن کے اونٹوں کے پیچھے لگا دیتے کہ انھیں لے کر آئیں۔ اُس کا کچھ نہ کچھ معاوضہ بھی دیتے تھے لیکن اِس سے یہ ہوتا کہ ریگستانوں اور پہاڑوں میں کئی کئی میل فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا۔ کہیں صبح کے وقت اور کہیں ایک ایک دو دو دن تک پیدل سفر کر کے ٹھکانے پر پہنچتے۔ میرے والد وہاں سپر وائزر تھے مگر اِن کاموں میں سب ایک ہوتے تھے اور یہ ایک ہونا اُن کی نظر میں مسکین ہے۔ وہ ہر آدمی کو جو غریب الوطن ہو مسکین کہہ کر حساب برابر کر دیتے۔ عرب لوگ کسی بھی رتبے کے حامل شخص کو کسی بھی کام پر لگا سکتے تھے۔ انھیں کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی، نہ وہ اِس طرح کا کوئی حساب رکھتے تھے۔ مثلاً عین ممکن تھا ایک انجینئر کو گدھے کے پیچھے لگا دیں کہ چلو اِس پر سامان لادو اور مزدور کو جہاز بنانے پر لگا دیں۔ اگرچہ میرے والد اور اُس کے ہم نفسوں کی تمام سر دردی کمپنی لیتی تھی مگر کسی بھی وقت کمپنی کی حکومت معطل ہو کر عربوں کی حکومت لاگو ہو جاتی تھی اور وہ جتنے چاہتے تھے آدمیوں کو اپنے کام پر لگا دیتے تھے۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا کہ وہ بدوؤں کو پکڑنے جاتے، پولیس بھی ساتھ ہوتی مگر وہ آگے سے تلواریں نکال لیتے اور عربی زبان میں عجیب و غریب گالیاں دیتے۔ میرے والد کو ایک دفعہ ایک بدو کی گالی نے بہت ہنسایا۔ وہ تیسری دفعہ کالونی سے بھاگا تھا اور اب کے پھر پکڑا گیا تھا۔ جیسے ہی پولیس نے اُس کے خیمے کا گھیرا ڈالا، وہ بیزاری کی شکل میں تلوار لے کر باہر نکل آیا اور بولا، یہ میرے ہاتھ میں تلوار نہیں شیطان کا لام ہے، جسے چاہیے مَیں خوشی سے دے دوں گا اور سرکشوں کو اللہ ایسی ہی جزا دیتا ہے۔ اُس کی بات سُن کر ایک عرب پولیس افسر آگے بڑھا اور اُسے نہایت پیار سے سمجھانے لگا کہ وہ اپنے بیوی بچوں کو شہر میں چھوڑ کر خود خوشی سے اونٹ چرائے، اِس کے عوض اُس کو ایک بڑی گاڑی دے دی جائے گی تاکہ وہ جب چاہے اپنے بیوی بچوں کے پاس پہنچ جایا کرے اور یہ شیطان کا لام ہماری بجائے اپنی بیوی کے لیے سنبھال لے۔ الغرض بہت سمجھا بجھا کر اُسے اور اُس کی فیملی کو ہم شہر میں لائے اور چار پانچ مزدوروں کو اُس کے اونٹوں، بکریوں اور گدھوں کے حوالے کیا اور کہا آپ سب

گدھے اِن تمام اشیا کو لے کر پیچھے پیچھے آؤ۔ غرض اُن کے خطوں میں اِس طرح کی بہت دلفریب کہانیاں ہوتیں جن میں غریب الوطنوں کے المیے اور اُن کی بے بسی کے حوالے ایسے قہقہوں میں دبے ہوتے تھے جن کے نیچے کرب ناک چیخیں چھپی تھیں۔ میری دادی والد صاحب کا جس دن خط سُن لیتی اُس کے بعد کئی دن سو نہیں سکتی تھی۔ مصلے پر بیٹھی ساری رات کربلا کے اسیروں کے حوالے دے کر خیریت کی دعائیں مانگتی رہتی۔

یہاں کی دیکھا دیکھی پڑوسی ٹلک نے بھی اپنی لیبر سستے داموں وہاں منتقل کرنا شروع کر دی۔ ہمارے رشتہ داروں نے جس قدر سونا دیا تھا اُنھیں اتنی ہی قدر کا سونا بنوا کر اور اُس سے تھوڑا سا زیادہ دے کر شکریہ ادا کیا۔ یوں اُن کی چھ ماہ کی آمدنی اُسی میں صرف ہوگئی۔ اگلے چھ ماہ میں ہمارے پاس پیسے جمع ہونے لگے۔

(۲۷)

میرا میٹرک دو سال پہلے ہی ہو چکا تھا لیکن گھر کے حالات نے سر نہ اُٹھانے دیا تھا۔ اب ذرا حالات کی گرد بیٹھی تو مَیں نے اپنے مقامی شہر کے کالج میں داخلہ لے لیا۔ ہمارے پاس جتنے پیسے تھے وہ گاؤں کے محدود اخراجات کے لیے بہت تھے۔ ایسے کسی منصوبے کے سوچنے کی اہلیت نہیں تھی جو بڑے شہروں کے رہنے والے بناتے ہیں۔ اِس لیے یہ پیسے کافی تھے۔ سب سے پہلی چیز جو مَیں نے عیاشی کے طور پر خریدی وہ بائی سائیکل تھی۔ یہ سائیکل، جس کے خواب مجھے چھٹی کلاس میں آنے لگے تھے اب دن رات کی ساتھی تھی۔ فراغت اور سائیکل میرے جیسے شخص کے لیے کیا معنی رکھتی تھیں، اِس کا اندازہ اِس بات سے لگائیں کہ سائیکل خریدنے کے بعد روزانہ چھ چھ گھنٹے چلاتا تھا۔ کالج ہمارے گھر سے چھ میل دُور تھا۔ یہ سائیکل اُس فاصلے کے نئے جہانوں کی نوید تھی۔ اِس پر بیٹھ کر ہر بار پیدل چلنے والوں کے لیے کیڑے مکوڑوں کا احساس دلاتی۔ اصل پوچھو تو یہی دن تھے جو میری زندگی کا دوسرا باب کھولنے والے تھے۔ مجھے نہیں پتا والد صاحب پردیس میں کس مشکل میں تھے۔ مَیں تو اتنا جانتا تھا کہ پیسے متواتر آ رہے تھے۔ اِس حالت میں جب آپ کے پاس سائیکل بھی اپنی ہو اور جیب میں آٹھ دس روپے بھی موجود ہوں، دوستوں کا حلقہ خود بخود بڑھ گیا تھا اور مزید بڑھ رہا تھا۔

میرے لیے شہر مَیں سب سے پہلا ٹھکانا سید حکیم حاجی فطرس علی کا مطب بنا۔ مَیں روزانہ کالج جاتے ہوئے اور آتے ہوئے وہاں چند لمحے ضرور بیٹھتا تھا۔ اُس کی خاص وجہ کوئی بھی ہو سکتی ہے۔

میرے والد سے اُن کے دوستانہ اور برادرانہ تعلقات، حاجی صاحب کے ساتھ مانوسیت، اُن کے مطب کی لائبریری سے روزانہ کوئی نہ کوئی کتاب اُٹھا کر پڑھنا اور اُن کے ہاں سے صندل کے شربت کا کٹورہ پینا۔ سچ تو یہ ہے کہ حاجی فطرس علی کو اب مَیں اپنا مربی سمجھنے لگا تھا۔ اُن کے علمی اور عملی وجدان کے سبب میرے کئی مغالطے ختم ہو جاتے تھے۔

یہ جگہ پھاٹک والا چوک کے پاس تھی اور نہایت فرحت آگیں تھی۔ شہر میں پھاٹک والا چوک کیا تھا؟ یہ سمجھ لیجیے کہ جنت میں اگر ایسا کوئی مقام تھا تو یہی تھا۔ اِس چوک کا قطر دو سو مربع فٹ تھا۔ چوک کا تمام فرش پکی اینٹوں سے جوڑا گیا تھا۔ صبح کے وقت شہر کے ماشکی اِس پر تر کاؤ کر دیتے اور اُس کے بعد گاہے گاہے جھاڑو دینے والے جھاڑو دیتے تھے۔ میونسپل کمیٹی والوں کو شہر کی کسی دوسری جگہ کی فکر ہو نہ ہو اِس چوک کو بنانے سنوارنے اور حفاظت کرنے میں بالکل کوتاہی نہ کرتے۔ یہاں ہر وقت ایک میلہ لگا رہتا تھا۔ مَیں بچپن میں کئی بار سُنتا تھا کہ فلاں آدمی پھاٹک والا چوک سے فلاں چیز لے کر گیا، فلاں آدمی پھاٹک والا چوک میں فلاں شے بیچ کر آیا۔ آج پھاٹک والا چوک میں فلاں تماشا لگا تھا۔ مَیں اپنے والد کے ساتھ کئی بار یہاں آیا تھا مگر مجھے اُس وقت اِس کی اہمیت کا احساس نہیں تھا۔ چوک کے چاروں طرف اور درمیان میں گوندنیوں اور شریہنہ کے درخت تھے۔ اُن کی چھاؤں میں قلفیوں والے، فالودے والے، برف کے گولوں والے اور گونا گوں اشیا بیچنے والے کھڑے ہوتے تھے۔ شہر میں آنے جانے کے لیے کئی تانگے بھی یہاں رُکے ہوتے۔ پتلی تماشے والے اور گھوڑوں کا ناچ کرنے والے بھی یہیں ملتے۔

یہیں کئی منڈلیاں بینڈ باجے والوں کی تھیں۔ جو آدمی بھی گاؤں سے شہر میں آتا، وہ اِس جگہ ضرور پھیرا لگاتا تھا۔ اِس کے دائیں طرف آدھے کلومیٹر پر نہر بہتی تھی۔ نہر کے دونوں طرف درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ اِس طرح سایہ کیے بیٹھے تھے جیسے مُرغی اپنے بچوں کو پروں کے نیچے لیے بیٹھی ہو۔ گھنے اور سیاہ سایے کے سبب نہر کا پانی بہت ہرا اور ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ درختوں کی شاخیں نہر کے پانی میں ڈوبتی تھیں اور تیرتی تھیں۔ نہر کے دائیں طرف پہلوانوں کا باغ تھا۔ یہاں سارا دن زور ہوتے تھے اور کُشتیاں چلتی تھیں۔ اِس باغ میں پیپل اور نیم کے اتنے درخت تھے کہ اُن کا حساب مشکل تھا۔ بارش اور آندھی میں اِن درختوں کے پتوں سے باغ میں زمرد کا فرش بچھ جاتا تھا۔ پھاٹک والے چوک سے سیدھی سڑک چرچ بازار کو نکلتی تھی جس کے شمالی کونے پر لیڈی پارک تھا۔ لیڈی پارک کے اگلے کونے پر آموں کے

باغات شروع ہو جاتے تھے۔ یہ باغات شمالی طرف کی دوآب باری نہر تک چلے گئے تھے اور اتنا ہی آگے پیچھے پھیلے ہوئے تھے۔ اِن باغات کے ایک طرف گھوڑے شاہ قبرستان تھا اور دوسری طرف کچہریوں کے ساتھ اصطبل تھا۔ اِن دونوں کے بیچ نہایت چوڑی اور لمبی سڑک تھی جس کا نام ٹھنڈی سڑک پڑ گیا تھا۔ یہ سڑک دونوں طرف سے ٹاہلیوں میں گھری ہوئی تھی اور چھاؤں سے بھری رہتی تھی۔ ٹھنڈی سڑک ایک طرف سے لائل پور جانے والی سڑک سے ملی ہوئی تھی اور دوسری طرف سے اِس کا سرا سبزی منڈی کو چھوتا تھا۔ پھاٹک والے چوک کے جنوب کی طرف کرپا رام محلہ تھا۔ اُس کا دروازہ عین پھاٹک کے سامنے کھلتا تھا۔ اِس محلے میں حرفت پیشہ لوگ بستے تھے اور بہت غریب تھے۔

مَیں کالج جانے سے پہلے یا بعد میں ہر روز اِس چوک میں ضرور آتا تھا اور قلفی یا فالودہ کھانے کے بعد گاؤں کی طرف روانہ ہوتا تھا۔ پہلے پہل تو مَیں خود ہی آتا تھا لیکن آہستہ آہستہ کالج میں میرے نئے بننے والے دوستوں نے میرے ساتھ یہاں آنا شروع کر دیا۔ کالج میں اُنھی دنوں میرا ایک دوست حبیب علی مجھے اپنے چچا ایچ اے احمد کامریڈ کے پاس لے گیا۔ حبیب نے مجھے بتایا عنقریب ملک میں ایک انقلاب آنے والا ہے۔ اُس میں بڑے بڑے جاگیرداروں اور بزنس مینوں سے اُن کی دولت چھین کر مزدوروں میں تقسیم کر دی جائے گی اور اُنھیں حکومت بھی دی جائے گی۔ تمھارے والد صاحب بھی ایک مزدور ہیں اور تجربہ کار مزدور ہیں۔ اُنھیں تو ایک بڑا عہدہ ملے گا۔ اِس انقلاب کے بعد ہر طرف خوشحالی اور ہریالی ہو جائے گی۔ حبیب علی کی بات سُن کر ایک دم مجھے لگا جیسے اُن کی بات نے حقیقت کا روپ دھار لیا ہے۔ کیسا عجوبہ ہو گا کہ میرے والد جیسے ہی مُلک میں آئیں گے، اُنھیں لیبر کا وزیر بنا دیا جائے گا۔ حبیب علی نے بتایا چچا ایچ اے احمد اِس شہر میں اِنقلاب کی قیادت کر رہے ہیں اور بہت بڑے کام میں مصروف ہیں۔ مُلک بھر کی ایجنسیاں اُن کے پیچھے ہیں لیکن وہ کسی کے ہاتھ نہیں آ رہے۔ پکڑنے والوں کو ہر دفعہ غچہ دے جاتے ہیں۔ وہ دنیا کے ہر علم پر دسترس رکھتے ہیں اور کوئی اُن کے سامنے مسئلہ مشکل نہیں رہتا۔ آپ کے حکیم فطرس علی تو اُن کے سامنے کل کے بچے ہیں۔

یہ میرا انٹر کا دوسرا سال تھا۔ اپنی شکل کا تذکرہ بار بار کرتے ہوئے اچھا نہیں لگتا مگر اِس میں ایک تو ضرورت ہے اور دوسرا لطف بھی موجود ہے۔ مَیں کسی بھی سرخ وسفید اور خوبصورت شخص سے زیادہ

خوبصورت تھا۔ لباس کی نفاست اپنی جگہ تھی اور سائیکل تو مَیں خرید ہی چکا تھا۔ یہ سب چیزیں ایک طرح سے اُس میں اضافہ کر رہی تھیں۔ اِس حالت میں کالج کے ساتھیوں میں میرا ایک رعب تھا۔ حبیب نے بتایا کامریڈ ایچ اے کی ایک ہوٹل میں انقلابیوں سے خفیہ میٹنگ ہوتی ہے۔ یہ ہوٹل وینس سینما کے بالکل پچھواڑے میں ہے۔

وینس سینما اُسی بازار میں تھا جس کے شروع میں ایک بازار ریلوے اسٹیشن کو نکلتا تھا اور دوسرا تانگوں والے اڈے سے ہوتا ہوا چرچ روڈ پر آ نکلتا۔ اِسی بازار پر ڈاکخانہ تھا جہاں سے مَیں اپنے والد کو خط بھیجتا تھا۔ میٹنگ دوپہر دو بجے سے رات گیارہ بجے تک جاری رہتی تھی۔ دو بجے اِس لیے شروع ہوتی کہ کامریڈ دوپہر ایک بجے تک سوئے رہتے تھے۔ پھر اُنھیں اپنے گھر سے چل کر آنے میں بھی وقت لگتا تھا۔ رات گیارہ بجے کے بعد یہ میٹنگ برخواست ہوتی تھی۔ اُس کے بعد اُنھیں مُلک کے معاشی، سماجی، ادبی، ثقافتی، سیاسی اور سرمایہ داری نظام پر مضامین لکھنے ہوتے تھے۔ مضامین اُن کے مینوفیسٹو ہی کی طرح چھوٹے چھوٹے رسائل میں چھپتے تھے جنھیں وہ خود اور اُن کے دوست احباب اپنی کمیونٹی میں تقسیم کرتے اور اُن کی چھپائی کا چندہ وصول کرتے تھے۔ شام کے وقت جب کامریڈ کے تمام احباب وہاں جمع ہو جاتے تو وہ اُن کو سمجھاتے تھے کہ جو کچھ اِس مضمون میں لکھا گیا ہے دراصل وہ اُس میں کیا کہنا چاہتے ہیں۔

حاجی فطرس علی کے سبب مَیں نے بہت سی ادبی کتابیں بچپن سے پڑھنا شروع کر دی تھیں۔ مَیں نہیں جانتا وہ میرے لیے کہاں تک فائدہ مند تھیں لیکن مَیں اُن کی اصناف اور نوع سے واقف ضرور ہو چکا تھا مگر کچھ ایسے نام بالکل میرے لیے نئے تھے، جنھیں کامریڈ صاحب بار بار استعمال کرتے تھے۔ کیموزم، کیمونسٹ، کامریڈ، مینوفیسٹو اور اِسی طرح کی حشرات الارض قسم کی چیزیں تھیں۔ مجھے ان کی کچھ سمجھ نہیں تھی کہ یہ کیا ہیں؟ لیکن متواتر ملاقاتوں میں کچھ کچھ کھلنے لگی تھیں۔

پہلے دن جب مَیں اور حبیب علی کالج سے سیدھے اُس ہوٹل پر پہنچے تو عجیب سی وحشت محسوس ہوئی۔ یہ ایک اندھیری سی گلی میں تھا اور نہایت نیچے تھا، جیسے آپ تاریک غار میں داخل ہو رہے ہوں۔ دروازے پر سائیکل روک کر جیسے ہی ہوٹل میں داخل ہوئے مجھے شدید کھانسی نے گھیر لیا۔ دُھویں کے اتنے غبار تھے کہ پہلے تو کچھ دکھائی نہ دیا اور کھانسی نے بھی اِس زبردستی سے جکڑا کہ کچھ بھی دیکھنے کی فرصت نہ مل رہی تھی [illegible] مَیں تھوڑی دیر وہیں رُکا رہا۔ جب

کھانسی تھمی اور کچھ دکھائی دینے لگا تو آگے بڑھ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اور ماحول کو سمجھنے کی کوشش کی۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے چرسیوں، غنڈوں اور موالیوں کا ایک ٹولا بیٹھا ہے۔ سب لوگوں نے سگریٹ سلگائے ہوئے تھے اور دھواں بھٹوں کی طرح سیاہ اور غلیظ مرغولوں کی شکل میں بلند ہو رہا تھا۔ اُن کی ٹیبلوں پر سیاہی مائل چائے گندی پیالیوں میں ایک سیال مادے کی طرح پڑی تھی۔ جسے وہ وقفے وقفے سے سُڑک رہے تھے۔ جب وہ اپنے کپ کی چسکی لینے کے بعد اُسے میز پر رکھتے تو وہاں موجود مکھیوں کی فوج اُن سے اپنی باری لینے لگ جاتی۔ ابھی مَیں سوچ ہی رہا تھا کہ ہم کسی غلط جگہ پر آ گئے ہیں، حبیب علی مجھے ایک شخص سے متعارف کرانے لگا۔ مَیں اُسے شخص کہنے میں غلطی کر رہا ہوں۔ وہ انسان نما کوئی شے بیٹھی تھی۔ ایک لمبے قد کا ڈھانچا جسے میلے چکٹ کپڑوں میں لپیٹ دیا گیا ہو۔ آنکھوں میں صدیوں کی بے نوری اور سر کے بال شاید عید پر دھوتا ہو۔ یہ تو مجھے بعد میں خبر ہوئی کہ کامریڈ صاحب عید ایسی کسی بھی خرافات سے بہت بلند ہیں۔ کیپ نما ٹوپی، جس کے کنارے بوسیدگی اور میل کا امتزاج تھے، اُتار کر میز پر سامنے رکھی تھی۔ اُس کے نیچے ایک بروشر ٹائپ رسالہ تھا۔ اُس پر مزدور اور سرمایہ کا عنوان تھا۔ اِس بروشر کا ایک کونا ٹوپی سے باہر اپنے عنوان سمیت نظر آ رہا تھا۔ اُس وقت وہاں اُن کی زوردار گفتگو کا موضوع بھی یہی تھا۔ ایش ٹرے سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھر چکی تھی اور اب سگریٹ کی مزید راکھ کچھ میز پر گر رہی تھی اور کچھ اُن کی چائے کی پیالیوں میں حل ہو رہی تھی۔ اُس راکھ کے سبب وہ چائے ٹھنڈی اور گہری ہو چکی تھی۔ وہ جس سرور کے ساتھ اُس میں سے چسکیاں بھرتے تھے، شاید اُنھیں تازہ چائے سے زیادہ لطف دیتی تھی۔

حبیب علی نے آگے بڑھ کر میرا اُن سے تعارف کرایا۔ یہ ضامن ہیں اور میرے کلاس فیلو ہیں اور یہ (ایچ اے کامریڈ کی طرف دیکھ کر) ترقی پسند تنظیم کے جنرل سیکرٹری کامریڈ ایچ اے ہیں۔ مَیں نے اپنا ہاتھ کامریڈ کی طرف کیا تو اُنھوں نے پورے جسم کی خشکی سمیٹ کر اپنے ہاتھ میں جمع کی پھر اُسے مصافحے کے لیے میری طرف بڑھا دیا۔ اِس دوران اُن کے چہرے پر ایسی پتھریلی سنجیدگی تھی گویا جمالیات کی تمام تہیں نوچ لی گئی ہوں۔ مَیں نے ہاتھ تو ملایا لیکن دل ہی دل میں حبیب علی کو کوسنے لگا۔ یہ کہاں مجھے بھنگیوں میں لے آیا تھا۔ آج تک میں نے تاریخ کے جتنے بڑے انسانوں کے حالات پڑھے تھے اِن کی ہیئت اُن سے یکسر مختلف تھی۔ مَیں اُلٹے پاؤں پھرنے ہی والا تھا لیکن برسوں کے خاندانی رکھ رکھاؤ اور مروت نے راستہ روک لیا۔ اِس کے علاوہ حبیب علی کی دوستی الگ امر تھا۔ مَیں

اُسے ذہنی کوفت نہیں دینا چاہتا تھا۔ کامریڈ کے بعد بقیہ افراد سے مصافحہ کیا۔ اُس کے بعد دو کرسیاں کھینچ کر بیٹھ گئے۔ یہ اُس ہوٹل میں وافر خالی تھیں۔ گفتگو جو ہمارے آنے کے چند ثانیے بعد تعطل کا شکار ہو گئی تھی، وہ دوبارہ شروع ہوگئی۔ گفتگو میں مزدور، روس اور فرانس وغیرہ کے الفاظ بار بار استعمال ہو رہے تھے۔ اِس میں ایک بار بھی دنیا کا کوئی دوسرا شہر دہرایا نہیں گیا۔ دو گھنٹے بیزاری اور دلچسپی کی ملی جلی کیفیت میں بیٹھنے کے دوران ایک خیال تو میرے ذہن سے صاف ہو چکا تھا کہ یہ لوگ زندگی کو گھسیٹنے کی کوشش میں ہیں اور انقلاب کا ڈھکوسلا اِن کا اپنے اوپر محض افترا ہے لیکن تماشا دیکھنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ اپنی گفتگو سے فارغ ہو کر اُن سب کی توجہ ہماری طرف ہوگئی اور طے پایا کہ مجھے ترقی پسند تنظیم کی رکنیت فوراً لینی چاہیے اور آج ہی لی جائے۔ اُس دن میرے پاس پیسے نہیں تھے لہٰذا فیصلہ ہوا کہ رکنیت تو آج ہی ہو جائے مگر اِس کی فیس کل ادا کر دی جائے گی کیونکہ رُکنیت میں دیر ہوگئی تو ہو سکتا ہے انقلاب آنے کے بعد کسی حکومتی عہدے میں مجھ سے پہلے رکنیت لینے والا آدمی جگہ لے جائے۔ یعنی اِن کی حکومت میں اہلیت کی بجائے سبقت زیادہ اہمیت کی حامل تھی۔ رکنیت کی فیس سو روپیہ تھی۔ وہ حبیب علی کی ضمانت پر دوسرے دن ادا کرنے کی ہامی بھری گئی۔ اُس دن اُنھیں بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں کرنا تھیں اِس لیے ہم جلد نکل آئے۔

اگلے دن مَیں حبیب کے ساتھ ہوٹل میں داخل ہوا تو کامریڈ نے آگے بڑھ کر ہمارا استقبال کیا۔ مَیں نے اُس استقبال کے دوران ہی جیب سے سو روپیہ نکال کر اُنھیں دے دیا تاکہ دیر کرنے پر اُنھیں ہم سے بدگمانی شروع نہ ہو جائے۔ رُکنیت کی فیس دیتے وقت مجھے اپنے گاؤں کی مسجد کے مولوی صاحب کا چہرہ یاد آ گیا۔ جب مَیں ایک سپارہ ختم کرتا تھا اور اُس کے عوض اُنھیں کچھ پیسے دیتا تھا تو اُن کے چہرے پر رونق پلٹ آتی تھی۔ یہ رونق کبھی اُن کے نماز یا روزہ سے فراغت پر نہیں دیکھی تھی۔ بالکل وہی رونق کامریڈ کے چہرے پر بھی ظاہر ہوئی تھی۔ عجیب بات تھی کامریڈ کو پیسے دیتے وقت مجھے اپنے گاؤں کا مولوی کیسے یاد آ گیا۔ آج جب ہم یہاں آئے تھے تو محفل کچھ بجھی بجھی تھی مگر کچھ ہی دیر بعد کل کی طرح چمک اُٹھی۔ سچ بات تو یہ تھی کل کی تمام گفتگو کے بعد مَیں کسی بھی انقلاب پر یقین رکھتے ہوئے یہاں نہیں آیا تھا بلکہ اُس دلچسپ گفتگو کو سننے کے لیے پہنچا تھا جو میرے ایک سو روپے کے ضائع ہونے سے مہنگی نہیں تھی۔ بالکل ویسے ہی جیسے چند روپوں کے عوض گاؤں کا مولوی پورے گھر کو جنت کے میووں کے خواب بیچ دیتا ہے۔ وہ سو روپیہ جو ایک گھنٹا پہلے مَیں کامریڈ کے حوالے کر چکا تھا کچھ ہی دیر قبل وہ

سب اُن پیسوں کی روٹی کھا کر فارغ ہو چکے تھے۔ اگرچہ مجھے یہ سب عمل انتہائی تکلیف دہ لگا کہ میرے باپ کی کمائی کا سو روپیہ ضائع ہو گیا تھا جسے حاصل کرنے میں اُنھیں جانے کتنے میل بدذوں کو ڈھونڈنے کے لیے چلنا پڑا ہو گا یا اُن کی کالونیوں کی اینٹیں لگائی تھیں۔ مَیں نے وہ ممبر شپ کبھی کبھار اُن کی ہانکیں سننے کے لیے اور سب سے بڑھ کر اپنے دوست کا دل رکھنے کے لیے لی تھی۔ حبیب علی جس میٹنگ کو خفیہ کہہ رہا تھا وہ اِن کی خوش فہمی تھی یا خفیہ کا لفظ بار بار استعمال کرنے سے یہ لوگ اُس کی اہمیت کا اندازہ ختم کر بیٹھے تھے۔

یہ سردیوں کے دن تھے۔ دسمبر کا آخری عشرہ تھا۔ ٹھنڈی ہوا اور باہر کی بوندا باندی نے زیادہ کثافت پیدا نہ ہونے دی لیکن دو گھنٹے بیٹھنا میری طبیعت پر سخت گراں گزرا۔ اِس کوفت کا سبب سگریٹ کا دھواں کم اور کامریڈ کی گفتگو زیادہ تھا۔ گفتگو اُس وقت ہمیشہ لطف دیتی ہے جب مکالمے کی شکل اختیار کر جائے، اگر مکالمہ خارج ہو کر محض محاسبہ رہ جائے اور وہ بھی ایک ہی شخص کی زبان سے تو بیزاری کے معنی واضح ہونے لگتے ہیں۔ اینگل، کارل مارکس، سرمایہ، روس تو خیر کچھ کچھ سمجھ میں آ رہے تھے کہ یہ دو ملکوں اور دو انسانوں کے نام تھے مگر اِن کے علاوہ پوری گفتگو ایسی خلا میں تھی جس میں انسانوں کے پُتلے گھڑی کی ٹک ٹک کی طرح اپنی مقررہ رفتار سے سفر کر رہے تھے۔ دو تین بار میں نے حبیب علی سے اُٹھنے کا کہا اور کہنی کا ٹھوکا بھی دیا لیکن اُس نے پھر مجھے ہاتھ دبا کر بیٹھنے کا اشارہ کر دیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا یہ کیا سمجھا رہا ہے۔ باقی کے لوگ کامریڈ کی آواز میں گاہے گاہے لقمہ دے رہے تھے لیکن ہم محض خموش تماشائی تھے۔ اتنا وقت کسی کو محض سنتے رہنے میں کیا دانائی تھی؟ اُسی وقت جب مَیں اُٹھنے ہی والا تھا میرے جاننے والے دو آدمی اور آ گئے۔ مجھے اُن کا وہاں آنا عجیب سا لگا۔ اِن میں سے ایک کی ملاقات کالج میں ہو چکی تھی دوسرا جاوید ساقی تھا۔ یہ فرسٹ ائیر کا نہایت خوش شکل سٹوڈنٹ تھا۔ دونوں کچھ عرصہ پہلے ہمارے گاؤں میں آئے تھے۔ اِن کی سرِراہ مجھ سے ملاقات ہوئی تھی۔ پھر ایک دو ملاقاتیں محض رسمی ہوئی تھیں۔ جاوید ساقی ساڑھے پانچ فٹ قد کا منحنی سا آدمی تھا۔ مَیں نے باقاعدہ فلسفی نہیں دیکھے البتہ گندے کوٹ، الجھے ہوئے بال، ٹوٹی چپل اور بے تراش کی داڑھی سے وہی لگتا تھا۔ بے ترتیب بالوں سے بھرے ہوئے سر پر اون کی میلی ٹوپی تھی۔ سگریٹ کے دھویں اُڑانے کے ساتھ انتہائی اعتماد سے بے ربط گفتگو کرنے کا ماہر تھا۔ اُس نے آتے ہی کسی صاحب پر ایک جملہ کسا لیکن کامریڈ سے تعظیم کے ساتھ پیش

آیا۔ پھر میری طرف دیکھ کر داغ کا شعر پڑھا ؎

لے ہی آئے ہیں راہ پر اُسے ہم باتوں میں
اب اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

شعر سن کر سب ہنس دیے۔ اُس نے آتے ہی گفتگو کو شگفتگی کی طرف پھیر دیا اور ایسی لایعنی باتیں کیں کہ میری طبیعت میں جو ایک طرح سے بیزاری پیدا ہوئی تھی، وہ جاتی رہی۔ اُس کی گفتگو سے مَیں نے حوصلہ پا کر ایک دو باتیں کیں اور اپنے ہونے کا احساس دلایا۔ شام سات بجے گھر پہنچا تو میرے ہاتھ میں دو چھوٹی چھوٹی کتابیں تھیں جو کامریڈ نے آج کے مطالعے کے لیے عنایت کی تھیں۔

(۲۸)

عصر کا وقت تھا، مَیں اپنی سائیکل پر گاؤں جا رہا تھا۔ ہمارے گاؤں کی شمال مشرق کی جانب دوسرے گاؤں کو ملانے والی ایک کچی سڑک تھی۔ یہ چھ کلومیٹر سڑک یوں تو کچی تھی اور اس پر گرد و غبار بھی تھا مگر یہ عین نہر کی پٹڑی پر تھی اور بالکل سیدھی تھی۔ نہر کی دوسری جانب بھی ایک پٹڑی تھی لیکن یہ پٹڑی با قاعدہ سڑک نہیں تھی۔ اُس کے اُوپر بے شمار سنبلوں، کیکروں اور ٹاہلیوں کے درخت اور درختوں کی دوسری جانب دور تک ہر بھرے کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ نہر کی پٹڑی کے نیچے دو ایکڑ رقبے تک ساتھ ساتھ بھی درخت ٹاہلیوں، شریہنہ اور پیپلوں کے گھنے اور سایہ دار تھے اور ہر پانچ کلومیٹر پر ایک ڈاک بنگلہ بھی تھا۔ یہ ڈاک بنگلے برٹش دور میں بنائے گئے تھے تاکہ نہری عملے کے افسران دورہ کرنے کے دوران یہاں قیام کر سکیں۔ ڈاک بنگلوں میں اب کسی نہری افسر کی رہائش نہیں تھی نہ کبھی افسران یہاں ٹھہرتے تھے۔ مقامی لوگوں نے اپنے مال مویشی اِن میں باندھ رکھے تھے یا پھر اِن کے سائے میں مختلف نوعیت کے جواری جمع ہو کر جوا کھیلتے تھے۔ ہر ڈاک بنگلے پر مقامی چودھریوں کا زیادہ قبضہ تھا اور اُنھی کی اولادیں اِن میں طرح طرح کے دھندے کرتی تھیں۔ اس نہر اور پٹڑی پر روزانہ کچھ نہ کچھ کھیل کے سامان پیدا ہوتے رہتے تھے۔ سڑک نہر کے کنارے پر ہونے کی وجہ سے بلند تھی اس لیے اِس پر بارشوں کا اثر کم ہوتا تھا۔ پانی نیچے کھیتوں میں بہہ جاتا تھا اور سڑک پر گڑھے نہیں بن پاتے تھے۔ دوسری اس کے صاف ہونے کی وجہ یہ تھی کہ جوئے باز، گھوڑ دوڑ والے اور تانگوں کی دوڑیں

لگانے والے اِس کو صاف کیے رکھتے۔ اگر کوئی گڑھا پڑ بھی جاتا تو یہ لوگ اُسے پُر کر دیتے۔ غرض حکومت سے بڑھ کر یہ لوگ اپنی مدد آپ کے تحت اِس کی حفاظت کی ذمہ داری اُٹھائے ہوئے تھے۔ گرد وغبار زیادہ جمع ہو جاتا تو نہر کے پانی سے اِس پر چھڑکاؤ کر دیتے۔ سڑک پر کھڑی ہوئی بعض ٹاہلیوں کی فقط سوکھی شاخیں رہ گئی تھیں۔ اِن سوکھی ٹہنیوں پر چیلیں اور کوّے آرام کرتے۔ جو ٹاہلیاں سبز اور ہری بھری تھیں اُن پر دوسرے پرندے، طوطے اور چھوٹی چونچوں والے پرندے اپنے ٹھڑے جما لیتے۔ یہ نہر اور اِس کی پٹڑی اپنی طرز کا گویا ایک شہر تھا۔

جیسے ہی مَیں اِس سڑک کے قریب پہنچا دیکھا کہ لوگوں کا ایک بڑا مجمع اکٹھا دیکھا۔ مَیں نے اپنی سائیکل نہر کے پُل پر روک دی اور اُس مجمعے کو دیکھنے لگا۔ مَیں نے ایک شخص سے پوچھا آج کیا معاملہ ہے۔ اُس نے کہا گھوڑ دوڑ پر جوا لگا ہے اور اِس بار پورے ایک ہزار کا جوا ہے۔

ہائیں اتنی بڑی رقم؟ مَیں نے حیرانی سے دوبارہ پوچھا۔

جی ہاں، اتنی بڑی رقم ہے، آج تو جو ہار گیا اُس کے گھر ماتم کی دری بچھے گی اور جو جیت گیا وہ لُڈیاں پائے گا، کنجریاں نچائے گا۔

اِس آدمی کی بات سے اندازہ ہوا کہ تماش بین نہ صرف گھوڑ دوڑ دیکھنے کے لیے جمع تھے بلکہ اِس کے نتیجے میں ہونے والے حادثات کا لطف اُٹھانے کے لیے بھی تیار تھے۔ اکثر کی دلچسپی گھوڑ دوڑ کے بعد جیتنے اور ہارنے والوں کے مستقبل سے تھی۔

گھوڑے کس کس کے ہیں اور شرط کن نے لگائی ہیں؟ مَیں نے گھوڑ دوڑ میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

گھوڑے تو ڈبن شاہ اور دارے کے ہیں، وہ بولا

اور شرطیے کون ہیں؟

ایک شرطیہ تو وہی آپ کا دوست معیذ ہے، عدیلہ لیڈی کا نواسا اور دوسرا طالی خاں ہے، وہ بولا۔

معیذ کا نام سُن کر مجھے ایک ہی دم جھٹکا سا لگا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا، یہ کیا کہہ رہا ہے اور وہ شخص گویا مجھ پر طنزیہ جملے سے بتانا چاہ رہا تھا جیسے معیذ نے نہیں یہ شرط مَیں نے لگائی ہو۔

معیذ نے شرط کیسے لگائی اور کیوں لگائی؟ مجھے اندازہ ہوا کہ کچھ بہت غلط ہو رہا ہے۔ شمیر کی دوستی نے اِسے بالکل تباہ کر دیا تھا۔ یہ اُسی طرف بڑھ رہا تھا جس طرف اِس کا ماموں گیا تھا۔ یہ بات خطرے

سے خالی نہیں تھی۔ اپنی نانی کے پیسے یوں اُجاڑ رہا تھا جیسے شاہی لاٹری کا پیسہ ہو۔ مجھے اُس آدمی کی بات سُن کر ایک طرح سے ہیجانی کیفیت طاری ہو گئی اور مَیں غصے سے کانپنے لگا۔ عدیلہ کی جو حالت اور صحت ہو چکی تھی، اُس میں وہ مزید کسی صدمے کو برداشت کی بالکل سکت نہیں رکھتی تھی۔ اِدھر یہ حرامی چھوکرا ان دھندوں میں پڑ گیا تھا۔ یہ گُھڑ دوڑ نہیں تھی، سیدھی سیدھی ٹھگی تھی جو معیذ کے ساتھ ہونے والی تھی۔ لوگ اُسے شرط کے چکروں میں ڈال کر دراصل اُس کا پیسہ ہضم کرنے کے پھیر میں تھے۔ مجھے اِس بات پر شک ہی نہیں، یقین تھا کہ معیذ سے اِنھوں نے پیسے ہتھیانے کا پانسا پھینکا ہے ورنہ طالی خاں کبوتر باز کے پاس تو تین سو روپے نہیں تھے۔ ایک ہزار کہاں سے لاتا۔ اُسے اِنہی آوارگیوں کے سبب اُس کے باپ نے گھر بدر بھی کر رکھا تھا اور وہ اب گھڑ دوڑ کے ٹھگوں کے ساتھ مل کر اِس طرح اپنے گزارے چلاتا تھا۔ پہلے بھی کئی بار ایسا ہوا تھا کہ یہ گٹھ جوڑ کر کے کسی دوسرے کے ساتھ شرط باندھ لیتے تھے اور گھپلا دوڑ میں بچارے شرطیے کو لوٹ لیتے تھے۔

مَیں نے جلدی سے اپنی سائیکل وہیں پھینکی اور مجمع میں گھس گیا۔ دوڑ ابھی تک شروع نہیں ہوئی تھی۔ بھیڑ کو چیر کے جیسے ہی آگے ہوا، سامنے معیذ کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ تھوڑا سا پریشان ہو گیا جیسے مَیں نے اُس کی چوری پکڑ لی ہو۔ وہ مجھ سے ایک سال چھوٹا تھا لیکن میری عمر سے زیادہ لگنے لگا تھا۔ اُس کی خاص وجہ یہ تھی کہ مَیں اُن تمام لچھنوں سے ابھی تک دور تھا جن میں لڑکے پڑتے ہیں تو اُن کی عمر ایک دم دُگنی ہو جاتی ہے۔ اِس کے باوجود وہ مجھ سے گھبرا جاتا تھا۔ مَیں نے اُس سے تمام تعلق سلام دعا تک رکھا تھا مگر یہ سلام دعا دوستی ہرگز نہیں تھی۔ اُس کی نانی کا ہمارے گھر سے جو تعلق تھا اور اُس کی پھوپھی نے جو مجھے داغ دیا تھا، شاید معیذ کو ڈانٹ کر مَیں اُس کی تشفی کر سکتا تھا۔ مَیں نے آگے بڑھ کر معیذ کے گریبان کو پکڑ لیا۔

کیا کرنے چلے ہو؟ تم نے یہ پیسے کہاں سے لیے ہیں؟ مَیں نے انتہائی غصے کے عالم میں اُسے گھسیٹا۔

ضامن آپ میرے کام میں دخل نہ دو، معیذ نہایت سرد مہری سے بولا۔

مَیں تجھے یہ شرط نہیں لگانے دوں گا۔ تم نہیں جانتے تم کیا کرنے لگے ہو۔ تم نے اپنے نانی کے پیسوں کو سیندھ لگا دی ہے۔ وہ بچاری پہلے اتنے صدموں میں ہے۔ مَیں نے اب کے جارحانہ رویہ اختیار کر لیا۔

تمھیں اِس سے کیا کہ مَیں نے پیسے کہاں سے لیے ہیں۔ اگر نانی کے لیے ہیں تو اپنی نانی کے لیے ہیں، تمھاری نانی کے تو نہیں لیے۔ مہربانی کر کے میرا باپ بننے کی کوشش نہ کرو۔

معیذ کے جواب میں بہت زیادہ درشتی اور دوٹوک رویہ تھا لیکن مَیں بھی پیچھے ہٹنے والا نہیں تھا۔ شہر کی مسلسل آب و ہوا اور لوگوں سے میل جول نے میرے اندر ایک وسعت پیدا کر دی تھی جس میں اپنی بات پر اصرار کرنے کی کیفیت زیادہ ہو گئی تھی۔ مَیں نے کہا جو بھی ہو مَیں یہ جوا نہیں کھیلنے دوں گا اور پولیس کو بتا کر سب کو اُٹھوا دوں گا۔ تم سب کے خلاف گواہی دوں گا بلکہ پولیس کی گاڑی میں بیٹھ کر خود پکڑواؤں گا۔

میرے اِس طرح مجمع میں داخل ہو کر اُس میں خلل ڈالنے کے سبب سارا مجمع سکڑ کر میرے اور معیذ کے پاس آ چکا تھا۔ اُس میں سے بیشتر جانتے تھے کہ مَیں ٹھیک کہہ رہا ہوں لیکن کوئی بھی اِس دوڑ کو منسوخ ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کسی کے نقصان پر تماشا دیکھنے کی مہلت ڈھونڈنا لطف کی چیز ہوتی ہے۔ انھیں میرا اِس طرح پورے کھیل میں کھنڈت ڈالنا اچھا نہیں لگا اور پولیس والی بات سُن کر اور بھی مشتعل ہو گئے۔ اب کے معیذ تو چپ ہو گیا اور ایسے لگا جیسے وہ کچھ سوچنے جا رہا ہے۔ اُس کی خموشی دیکھ کر سب لوگ پریشان سے ہو گئے کہیں یہ واقعی اپنی شرط واپس نہ لے لے۔ اِس حالت کو دیکھ کر طالی خاں آگے بڑھا۔

او بھائی یہ آپ کی بدمعاشیاں اپنے کالج کے دوستوں میں چلتی ہوں گی۔ یہاں ہم سب تمھاری اوقات جانتے ہیں۔ تو ہٹتا نہیں لالو خاں بدمعاش کہیں کا۔ جا کر اپنا کام کر ورنہ یہیں پر قاچو مار کے پھڑکا دوں گا۔

طالی خاں کی اِس توہین آمیز گفتگو سے میرا خون کھولنے لگا۔ یہ وہ لڑکا تھا جسے مَیں نے ایک دن سکول کی راہ میں اُس وقت دھن کے رکھ دیا تھا جب اِس نے میرے گال کو چومنے کی کوشش کی تھی۔ یہ اول دن سے لفنگا تھا لیکن کوئی بدمعاش جیسا بھی دلیر ہو اپنے بچپن میں پیٹنے والے کے سامنے سر کم ہی اُٹھا سکتا ہے۔ اُس سے مرعوبیت کا احساس لاشعور میں زندہ رہتا ہے۔ مَیں نے اُسی احساسِ تفاخر میں ایک زوردار چانٹا اُس کے منہ پر دے مارا اور اُس کے بعد اُسے لاتوں اور گھونسوں پر رکھ لیا۔ میرے اِس حیرت ناک اور اچانک حملے کی اُسے بالکل توقع نہیں تھی اور نہ تاب تھی۔ وہ ایسے ہاتھ پاؤں چھوڑ بیٹھا جیسے مٹی کا بت ہو لیکن مجھے اُسی وقت پورے مجمع نے اِدھر اُدھر سے پکڑ لیا اور وہ زمین سے اُٹھ کر

کھڑا ہو گیا۔ مَیں غصے سے کانپ رہا تھا اور اُسی غصے سے معیذ کو دیکھ رہا تھا۔ طالی خاں اب زمین سے اُٹھ کر مجھ سے دوبارہ بھڑنے لگا تو مَیں نے اُسے خبردار کیا، اگر ایک انگلی بھی لگائی تو یہیں قتل کر دوں گا۔ وہ میری اِس دھمکی پر سہم سا گیا اور دُور ہو کر گالیاں دینے لگا۔ گاؤں میں ہر دوسرا آدمی اُس سے ڈرتا تھا لیکن اِس بھری محفل میں اُس کا مجھ سے یوں پٹ جانا کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اُسے شکست خوردہ دیکھ کر میری ہمت پہلے سے دہ چند ہو گئی۔ اب مَیں نے معیذ کو گھورا، حرامی تجھے حیا نہیں۔ بے غیرت تیری ماں رنڈی کسی کے ساتھ بھاگ گئی اور تو نانی کے کنویں کی مشک بن کر رہ گیا ہے۔ اُس کے پانی سے بیگانوں کے صحنوں کو تر وتازہ کرتا ہے اور لوگوں پر بھی چھڑکانے سے گریز نہیں کر رہا۔ اُس کے بعد مَیں نے مجمعے سے خطاب شروع کر دیا۔ بھائیو جو بھی ہوا اب یہ گھڑ دوڑ نہیں ہو سکتی۔ آپ اپنے گھر چلے جاؤ ورنہ پولیس آپ کے گھر آئے گی۔

میرے اِس رویے سے ایک شخص دل برداشتہ ہو کر آگے بڑھا اور کہنے لگا۔

کیا تو سمجھتا ہے ہم تم سے ڈر کر اپنے کھیل اور روایت بند کر دیں گے؟ یہ گاؤں تمھارے باپ کا ہے؟ تم اِس علاقے کے ڈپٹی لگے ہو اور ہم پر قانون نافذ کر رہے ہو۔

اِس آدمی کی گفتگو دھیمی مگر سپاٹ تھی۔ ایسی گفتگو انتہائی خطرناک ہوتی ہے۔ اُس پر آپ نہ تو اُس شخص کا گریبان پکڑ سکتے ہیں اور نہ اپنے جارحانہ رویے کو طول دے سکتے ہیں۔ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب لوگوں کو اپنے غلط کام جاری رکھنے کا موقع مل جاتا ہے اور اُن پر کی گئی سختی یا دھونس بے کار ہو کر رہ جاتی ہے۔ ایسے مقام پر بہت ہی مشکل سے قابو پایا جا سکتا ہے، جسے بہر حال میں نے اپنے ہاتھ سے باہر نہ جانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اُس کے لیے بالکل ویسا ہی رویہ اختیار کیا جیسا اُس نے اپنی گفتگو میں ظاہر کیا تھا۔

دیکھ میرے بھائی، مَیں نے اپنے آپ کو اُسی دھیمے انداز میں توازن دے کر کہا، مَیں نہ آپ کا ڈپٹی لگا ہوں، نہ مجھے آپ کے کھیل تماشوں سے کچھ لینا ہے۔ آپ لوگ پہلے بھی جوئے کرتے ہیں اور شرطیں باندھتے ہیں، کبھی مجھے نہیں دیکھا ہو گا کہ اُس میں دخل دوں لیکن آج معاملہ الگ ہے۔ یہ میرا رشتہ دار نہیں ہے۔ جائے جہنم میں جو بھی کرے مگر مَیں وہ پیسے جو یہ اپنی نانی کی جیب کاٹ کے نکال لایا ہے، یہاں ضائع نہیں ہونے دوں گا۔ اگر آپ نے تماشا دیکھنا ہے تو اپنے پیسوں سے دیکھیں۔ اگر مَیں اِس کا رشتہ دار نہیں ہوں تو آپ بھی نہیں ہیں۔ اِس کی نانی تمام دن ہمارے گھر میں ہوتی ہے۔ اُس کا

رونا دھونا ہم نے سنا ہے، آپ نے نہیں۔ اب آج جو پیسے یہ ہارے گا، اُس کے عوض پورا ایک مہینہ اس کی نانی کے بین ہم سنیں گے۔ ہمارے کان میں مونگر چلے گا، آپ کے کانوں میں نہیں۔ ہاں آپ اپنے پیسے ان گھوڑوں پر شوق سے لگائیے اور مجھ پر مہربانی کر کے چڑھائی نہ کیجیے۔ میں کم از کم اس کے پیسوں سے یہ گھڑ دوڑ نہیں ہونے دوں گا۔ آج یہ بات طے ہے۔

میرے اِس جواب نے اُس کی گویا کمر توڑ کر رکھ دی۔ اس سے لوگوں کے درمیان چہ مگوئیاں شروع ہو چکی تھیں۔ اِسی دوران معیذ نے اچانک اپنا فیصلہ سنا دیا، بھائی طالی خاں مَیں شرط نہیں لگا رہا۔

کیوں نہیں لگا رہا شرط؟ کیا تُو اِس کا نوکر ہے، اب کے دارا لنڈا آگے بڑھا اور بولا، تُو اس بڑھا کو کا نوکر ہے؟

نوکر نہیں لیکن یہ میری نانی کو بتائے گا، معیذ نے بددلی سے کہا۔

بیٹا اب شرط لگا یا نہ لگا، پیسے تجھے نہیں ملیں گے۔ وہاں کھڑے اُسی آدمی نے کہا۔ اس کا مطلب تھا پیسے اُسی کے پاس تھے۔ شرطیوں کے مابین اصل میں جب معاملہ طے ہو جاتا ہے تو وہ اپنے لگائے گئے پیسے اُس ثالث فریق کے پاس جمع کرا دیتے ہیں جو بعد میں پیسے جیتنے والے کے حوالے کر دیتا ہے۔ معیذ چونکہ اُسے اپنے پیسے دے چکا تھا اِس لیے مجبور تھا۔ وہ کسی بھی صورت یہ پیسے ہضم کرنا چاہتے تھے اِس لیے بہانے کیے جا رہے تھے۔

معیذ کی تائید پا کر اب میں کچھ زیادہ ہی شیر ہو گیا اور بولا، معیذ تم فکر نہ کرو، سیدھے گھر چلے چلو، پیسے تو اِس کا باپ بھی دے گا۔

میرا یہ کہنا تھا کہ وہ آدمی مجھ پر جھپٹ پڑا اور اُس کے بعد ایک دنگل شروع ہو گیا۔ مَیں نے اُسی رفتار سے اُس پر حملہ کرنا چاہا جس رفتار سے طالی خاں پر کیا تھا لیکن یہاں معاملہ اُلٹ ہو گیا۔ ایک دم پانچ چھ آدمیوں نے مجھے دبوچ لیا۔ اُس کے بعد مجھے خبر نہیں کس طرف سے میرے اُوپر مکے اور لاتیں برس رہی تھیں۔ کسی کا پنچ میرے جبڑوں پر پڑا، کسی کا تھپڑ میرے کان پر لگا اور کسی نے میری کمر پر لات ٹھونک دی۔ یہ وار اتنی تیزی سے اور اتنی طرفوں سے ہونے لگے کہ میرے اپنے ہاتھ پاؤں جواب دے گئے۔ مَیں زمین پر گر گیا۔ اپنا منہ اور سر مَیں نے زمین کی طرف کر لیا اور اُس کے ارد گرد گھٹنوں سے باڑ کر لی تاکہ سیدھی منہ پر کوئی شے نہ پڑے اور نہ سر میں چوٹ آئے۔ کچھ لوگ بیچ میں پڑ کر اُن مارنے والوں کو مجھ سے الگ بھی کر رہے تھے لیکن کہیں نہ کہیں سے میرے لات، مکا اور تھپڑ پڑ ہی جاتا

تھا۔ مَیں وہاں کچی سڑک پر گرد و غبار میں لت پت ہو گیا۔ اِسی دھینگا مشتی اور مار دھاڑ میں طالی نثار نے اپنے بدلے چکائے اور میں دیکھ رہا تھا کہ وہ کیسے اُبھر اُبھر کر مار رہا تھا۔ اِدھر تو یہ لڑائی جاری تھی اُدھر معیذ میرا ساتھ دینے کی بجائے آرام سے ایک طرف ہو کر سب کھیل دیکھ رہا تھا۔ میرے منہ سے خون جاری ہو چکا تھا۔ کان میں سائیں سائیں ہو رہا تھا۔ ایک آدمی نے آگے بڑھ کر میری سائیکل کو ڈنڈے مارنے شروع کر دیے۔ اِس پورے گروہ میں میرا ایک بھی ایسا دوست نہیں تھا جسے مجھ سے ذرا بھی ہمدردی ہوتی۔ اِس سے پہلے اپنے گاؤں میں میری نہ تو کبھی کسی سے لڑائی ہوئی تھی اور نہ میرا کسی سے واسطہ تھا۔ یہی سبب تھا کہ مَیں اُن میں سے کسی کے ساتھ الجھنے میں بے باک ہو گیا تھا۔ وہ مجھے اور میرے باپ کو اچھی طرح جانتے تھے۔ یہ بات سب کو پتا تھی کہ میرا باپ ایک غیر ملک میں پیسے کمانے گیا ہے، شہر میں میرے کئی رابطے ہیں اور مَیں اُن کی بنیاد پر پولیس کو گاؤں میں لانے پر قادر ہوں۔ یہ ایسا تفوق تھا جو کسی کسی کو حاصل ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میرا اُن کے جوئے میں یوں دھنس جانا پھر اُس میں نہایت ڈھٹائی سے جوا روک دینا معنی رکھتا تھا۔ وہ میرے اِن افعالِ قبیح کو جہاں تک ہو سکا نظر انداز کر رہے تھے لیکن مَیں ضرورت سے زیادہ ہمت کر گیا جس کا نتیجہ میری ذلت پر ختم ہوا۔ ایک بندے نے آخری وار یہ کیا کہ جب مَیں اپنی سائیکل اُٹھا رہا تھا اُس نے مجھے پیچھے سے ہلکی سی چپت لگا کر ایسے تمسخر اُڑایا جیسے پانچ سال کے بچے کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ مَیں اِس مجمع سے جتنی جلدی ہو سکے نکل جانا چاہتا تھا۔ سائیکل کا اگلا مڈگارڈ ٹیڑھا ہو کر پہیے کے ساتھ رگڑ کھا رہا تھا لیکن مَیں جیسے تیسے سائیکل پر بیٹھ کر بھاگ نکلا۔ پیچھے مختلف آوازیں کسنے کی صدائیں آ رہی تھیں۔ میرے دل میں شدت پسندانہ خیالات لہریں مار رہے تھے۔ دل میں ایک خواہش نہایت زور سے سر پکڑ رہی تھی کاش اِس وقت میرے پاس بندوق ہوتی لیکن اِس طرح کے خیالات کم و بیش ہر اُس شخص کے ہو سکتے ہیں جو زندگی میں پہلی بار لفنگوں کے ہاتھوں پٹنے کا تجربہ حاصل کرے۔ گھر پہنچا تو والدہ میری حالت دیکھ کر ایک دم چیخ مار کے میری طرف بھاگی۔

ہائے اللہ میرے لال یہ تجھے کیا ہوا؟ کس سے دنگا کر کے آیا ہے؟

مَیں نے سائیکل دیوار کے ساتھ لگائی اور سیدھا کمرے میں چلا گیا تا کہ کپڑے بدل لوں۔ اپنی ماں کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا لیکن وہ میرے پیچھے ہی کمرے میں بھاگی چلی آئی۔

مَیں پوچھتی ہوں کس کے ساتھ لڑائی ہوئی ہے؟ کیا منہ میں گھنگنیاں ڈال رکھی ہیں کہ جواب

نہیں دیتے۔ میری والدہ ایسی بے چین نظر آ رہی تھی جیسے اُس کے پاؤں کے نیچے انگارے آ گئے ہوں۔

امی کہہ تو رہا ہوں کچھ نہیں ہوا، کسی سے نہیں لڑا۔ بس گر گیا تھا۔ مَیں نے بہانہ گھڑا۔

بکواس نہ کر، یہ تیرا منہ سوجا ہوا ہے اور خون نکلا ہوا ہے؟ تم لڑے ہو۔ تجھے ہزار بار کہا ہے کالج میں کسی سے لڑائی جھگڑا مت کرنا۔ وہاں ایک سے بڑھ کر ایک بدمعاش پھرتا ہے لیکن تم نے قسم کھائی ہے کہ اپنی ماں کی ایک بات نہیں مانو گے۔

امی کالج میں کسی سے نہیں لڑا۔ مَیں نے جھلا کر جواب دیا۔

پھر یہ کہاں سے مار کھا کر آئے ہو؟ میری والدہ بضد تھی کہ اُسے اِسی وقت جواب دیا جائے۔ شاید ہر ماں کی خواہش ہوتی ہے کہ اُسے حادثے کی تمام جزیات بتائی جائیں۔ اُس کے بعد اُسی وقت وہ اُس مسئلے کو نمٹا کر آئندہ کے لیے اپنے بیٹے کو محفوظ بنا دینا چاہتی ہیں حالانکہ یہ بات کوفت میں مبتلا کر دینے والی ہوتی ہے۔ بعض اوقات معمولی مسئلہ اِسی ماں کی وجہ سے پھیل کر نہ ختم ہونے والا سکیورٹی رسک بن جاتا ہے۔ اب چونکہ مجھے پتا چل چکا تھا کہ جب تک نہ بتاؤں گا والدہ ایک انچ پیچھے ہٹنے والی نہیں۔ چنانچہ مَیں نے غصے کے عالم میں کہا۔

میری یہ حالت تیری اِسی سہیلی عدیلہ کے سبب ہوئی ہے۔

ہائیں، وہ کیسے، اُس نے کیا کہا؟ میری والدہ حیرت کے سمندر میں آنکھیں کھول کر رہ گئیں۔

اُس نے نہیں کیا، اُس کے نواسے معیذ کی کارستانی سے ہوا ہے۔ وہ نہر کے پل پر طالی کے ساتھ گھوڑوں پر شرطیں لگا رہا تھا۔ مَیں نے روکا تو سب نے مجھے مل کر مارا۔ مَیں نے ساری وضاحت ایک ہی دم کر دی۔

کیا وہ بھی مارنے میں شامل تھا؟ والدہ کی حیرت دوچند ہو گئی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں ایک دم عدیلہ کے پورے خاندان سے نفرت کا شعلہ جاگ گیا تھا۔

میری دادی، جو مصلے پر بیٹھی نماز میں مشغول تھی اور بے صبری سے اُسے ختم کرنے کا انتظار کر رہی تھی، اُسی لمحے سہ تکبیر سے نماز ختم کی اور لڑکھڑاتے ہوئے اُٹھی۔ مجھے شبہ ہوا کہ وہ اتنی تیزی سے اُٹھے گی اور گر پڑے گی مگر سنبھل گئی۔ البتہ اُس کی عینک گر گئی جسے سیاہ دھاگے سے باندھ کر لٹکایا ہوا تھا۔ دادی نے زیارت اور دعا پڑھنے کی بھی کوشش نہیں کی اور لاٹھی ٹیکتی ہوئی سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ ایک بار میرے پورے جسم کو ہاتھ سے چھوا کہیں جسم کا کوئی ٹکڑا تو نہیں گر گیا پھر میری سلامتی کے شکرانے

کے ساتھ عدیلہ اور اُس کے سارے خاندان کو بدعائیں دینے لگی اور روئے بھی جا رہی تھی۔ اُس کے بعد اُس نے والدہ کو ڈانٹا، مَیں تجھے ہزار بار سمجھا چکی ہوں، اِن ذلیلوں سے واسطہ ختم کر دے مگر تُو میری بات سمجھے تو پھر ہے نا۔ مَیں نے اول دن ہی تجھے اُس لڑکی زینت کے لچھن بتا دیے تھے مگر تیری سمجھ میں دھواں بھرا ہوا ہے اور مجھے گوبروں کے طعنے دیتی ہے۔ اب دیکھ لیا نتیجہ؟

اماں ایک تو بندہ پہلے پریشان ہوتا ہے اُوپر سے تیری آریاں چلنے لگتی ہیں۔ مَیں اِس کی ماں نہیں ہوں؟ کیا تجھ سے مجھے کم رنج ہے۔ پھر اِس سے پہلے کہ میری والدہ اور دادی اماں آپس میں اُلجھ پڑیں مَیں بول پڑا، اماں مجھے کچھ نہیں ہوا، تھوڑی بہت چوٹ آئی ہے لیکن مَیں بھی اُنھیں دیکھ لوں گا۔

تُو کیا اُنھیں دیکھ لے گا، اُس خبیث نے تجھے مار مار کر لہولہان کر دیا ہے اور اب تُو اُسے سمجھ لے گا۔ خبردار جو گھر سے نکلا۔ میری دادی نے جواب دیا۔

اُس نے تو نہیں مارا لیکن وہ عدیلہ کی مسلسل جیب کاٹ رہا ہے اور اُس کے بعد میں نے اپنی والدہ اور دادی کو سب ماجرا کہہ دیا اور یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ میری ماں بالکل حیرت کا اظہار نہیں کر رہی تھی۔ یعنی اُسے پہلے ہی معیذ کی کرتوتوں کا پتا تھا۔

اچھا تُو نہا کر اپنے کپڑے بدل اور خبردار اگر دوبارہ اِن سے اُلجھنے کی کوشش کی یا معیذ کے کسی بھی کام میں دخل دیا۔ وہ اللہ جانتا ہے عدیلہ کے ساتھ کیا کرے گا۔ اُس بچاری کی قسمت میں سُکھ نہیں لکھا۔

کیا کرے گا؟ یہ تُو نہیں جانتی؟ دادی کا غصہ نیچے نہیں آ رہا تھا، رنڈیوں کے بچے اور گلی کا کتا کوئی کوئی وفادار نکلتا ہے۔ یہ کہہ کر وہ دوبارہ مصلے پر بیٹھ گئی اور والدہ باہر نکل گئی۔

یہ جملہ میری دادی نے اتنی نفرت اور شدت کے ساتھ کہا کہ اُس کی دھمک میرے سر میں لگی۔

مجھے پتا تھا میری ماں سیدھی عدیلہ کی طرف گئی ہے۔ وہ اتنے غصے میں تھی کہ مجھے اُس کو منع کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ مَیں جانتا تھا وہ ایک ایسی عورت کو طعنہ دینے گئی تھی جو بے کراں سمندر کے درمیان اُس کشتی میں سوار تھی جس کے بادبان پھٹ گئے تھے اور کمپاس گم ہو چکے تھے۔ اُس کے بازو شل ہو جانے کے سبب چپوؤں سے اختیار اُٹھ گیا تھا۔ میری والدہ معیذ کے سب کرتوت پہلے سے اِس لیے جانتی تھی کہ عدیلہ نے اُس کے متعلق اپنا ہر دکھ بیان کر دیا تھا بلکہ کچھ ایسے دُکھ بھی جنھیں میری والدہ کے سامنے بیان کرنے سے ہچکچائی ہو گی۔ اب والدہ کے دیے گئے طعنے، جو اُس کے بیٹے کی

معمولی پٹائی کے سبب تھے، اُن کا کوئی جواز نہیں تھا۔ جب میں نہا کر اور کپڑے بدل کر باہر نکلا تو میری والدہ نے خبر دی کہ وہ عدیلہ کو ایسی کھری سنا کر آئی ہے جس کا وہ خیال بھی نہیں کر سکتی تھی۔ نمک حرام خاندان مدتوں کھلایا پلایا اور حاصل وصول نمک حرامی ہوئی۔ میرے لیے والدہ کی یہ اطلاع نئی بات نہیں تھی۔ وہ جس غصے کے ساتھ باہر نکلی تھی، اُس کا نتیجہ وہی تھا جو وہ بتا رہی تھی۔ پھر یہ کہ عدیلہ کا معاملہ ایسا نہیں تھا کہ اُس کی بے عزتی کرنے میں کوئی مشکل پیش آتی۔ بعض لوگ اتنے معمولی ہوتے ہیں کہ اُن کی تذلیل کر کے خود اپنی تذلیل کا احساس ہوتا ہے۔ وہ اتنی آسانی سے ذلت کا شکار ہوتے ہیں کہ بعض اوقات اُنھیں عزت دینے کو جی چاہتا ہے۔ اُسی شام یہ اطلاع بھی گاؤں میں عام ہوگئی کہ معیذ گھوڑوں پر لگائی گئی شرط بہت آسانی سے ہار گیا ہے۔ مجھے اب اِس بات سے کوئی غرض نہیں رہی تھی لیکن ایک بات شدت سے محسوس ہو رہی تھی کہ عدیلہ اب ہمارے گھر نہیں آ رہی تھی۔ نہ ہی میری والدہ نے کبھی اُس کا ذکر کیا تھا۔

(۲۹)

کالج کے تیسرے سال تک میرے ذہن میں خیالات کا ایک ملغوبہ سا بن گیا۔ اِس ملغوبے پر حاجی فطرس علی کی صحبت کے سبب میری طبعی شوخی ہمیشہ غالب رہی۔ گاؤں میرے لیے اپنی دلچسپی کھوتا جا رہا تھا۔ ایک طرف شہر میں نئے دوست، پھر کامریڈوں کی محفلیں اور حبیب علی کی صحبت۔ اِن سب کے علاوہ کئی تماشوں کا نظارہ۔ ایک دن میں نے شہر میں کمرہ ڈھونڈ کر وہیں رہنا شروع کر دیا۔ مَیں اور حبیب علی چار نمبر کمرے میں منتقل ہو گئے۔ یہ اتنا ستا تھا کہ سوچتے ہوئے بھی لطف آتا ہے۔ گھر جانے کی فکر اور شام ہونے کا اندیشہ ختم ہو چکا تھا۔ دس دن کے اندر یہ کمرہ ادبی اور علمی مباحثوں کا مرکز بن گیا۔ مَیں نے یہ لفظ بلاشبہ جس طرح استعمال کیا ہے یہ ایک مبالغہ ہے لیکن اِسے اِس لیے قبول کر لیں کہ ہم ایک عرصے سے ایسے لال بجھکڑوں کی غپ بازیوں کو علمی بحثوں کے زمرے ہی میں رکھ رہے تھے۔ یہی وقت تھا کہ مَیں نے اِن صحبتوں سے حد درجہ قنوطی، دنیا بھر کے انسانوں سے بیزار اور قبض میں مبتلا رہنے والوں کو پڑھا لکھا ہونے کی دلیل سمجھنے لگا۔ مجھے اِس سب کچھ سے اِس حد تک دلچسپی تھی کہ یونانی، فرانسیسی، روسی اور انگریزی کے بیشتر بڑوں کے نام یاد ہو گئے۔ اِن پر روزانہ سیر حاصل گفتگو ہوتی۔ یہ الگ بات کہ اِن میں سے ایک کی بھی کتاب ہم میں سے کسی کے پاس نہیں تھی۔ ہم نے اُن کے نام صرف اُن بروشرز میں دیکھے اور سنے تھے جنھیں کامریڈ ایچ اے یا اِن جیسے دانشور اپنے مضامین میں استعمال کرتے تھے۔ یہ نام تکرار کی وجہ سے میرے حافظے میں ایسے بیٹھے کہ مَیں انھیں

اپنے والد یا اسی قسم کے رشتے سے باندھ بیٹھا۔ یہ وقت تھا کہ اُس ادبی اور علمی گروہ میں میری ذات نمایاں حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ اُس کی واحد وجہ جو مجھے سمجھ آئی وہ چائے اور کھانا تھا۔ میں اپنے باپ کے پیسوں کو اِن کے سامنے غارت کرتا تھا۔ اُس کے نتیجے میں اُنھوں نے میری ادبی اور دانشورانہ حیثیت کو قبول کر لیا۔ اُنھی دِنوں وہاں دو مصنّفین کے بارے میں بہت زیادہ گفتگو ہونے لگی۔ یہ مصنف ویسے تو ترجمہ نگار تھے لیکن اِنھوں نے ترجمہ شدہ کتاب میں کبھی اپنے لیے مترجم کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ نہ مجھے یہ خبر تھی کہ یہ جو کچھ لکھتے ہیں اُسے ترجمہ کہتے ہیں یا ادب اور فلسفہ کا نام دیا جاتا ہے۔ اِن کی چھوٹی چھوٹی کتابیں وہاں لائی گئیں۔ کامریڈ صاحب نے وہ کتابیں میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا، اِنھیں پڑھو اور دوسروں کو پڑھاؤ۔ اُس کے بعد تمھیں خود پتا چلے گا، یہ دنیا کیا ہے، یہ کائنات کیا ہے، مذہب کتنا بڑا جھوٹ کا پلندہ ہے اور ہم کیا ہیں؟ یہ جو تم حاجی فطرس علی کی صحبت میں اپنا وقت برباد کرتے ہو، آئے دن مجلس اور عرس اور میلے ٹھیلے کے لیے بھاگ جاتے ہو، یہ ایک افیون ہے۔

کامریڈ کی اِس بات پر اول مَیں بہت حیران ہوا کہ صرف اِن دو مترجم بذاتِ خود مصنّفین کو پڑھ کر اتنی بڑی اور پیچیدہ ترین کائنات کو کیسے سمجھ لوں گا۔ پھر اگر خود کامریڈ اور اُس کے دوستوں نے مجھ سے پہلے یہ کائنات سمجھ لی ہے تو وہ اِس میں عملی طور پر بڑے پیمانے میں ارتقائی تبدیلی کیوں نہیں کرتے؟ تبدیلی تو ایک طرف خود اُن کی اپنی ذات کے بارے میں پچھلے کئی سالوں سے کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ یہ لوگ تو میری طرح حاجی فطرس علی کی صحبت، عرسوں اور مجلسوں میں وقت ضائع نہیں کرتے، پھر اُس بچائے ہوئے وقت سے اپنی شیو تک ڈھنگ سے نہیں کر پاتے۔ مَیں پچھلے ایک مہینے سے اُن کی سائیکل کو دیکھ رہا تھا۔ سائیکل کا پچھلا ٹائر پنکچر تھا اور یہ پنکچر چونی کا لگتا تھا لیکن وہ اِس کو نہیں لگوا پائے تھے۔ اُس سائیکل کے مڈگارڈ بھی نہیں تھے۔ سائیکل روزانہ ہینڈل سے پکڑے پیدل ہوٹل آتے اور پیدل ہی جاتے۔ دو دن پہلے مَیں نے زبردستی اِس کا پنکچر لگوایا۔ فقط ہوٹل سے بیس قدم چل کر پنکچر کی دکان پر جانا پڑا تھا۔ نہاتے بالکل نہیں تھے۔ ایک دن مَیں نے ڈرتے ڈرتے اُن سے سوال کیا کامریڈ صاحب آپ نہاتے کیوں نہیں ہیں؟

اس لیے کہ آپ یہ نہ سمجھیں مَیں نے وضو کیا ہے، یہ میری مذہب کے ساتھ ضد ہے، اُنھوں نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

کامریڈ کے جواب نے کم از کم مجھ پر سکتہ طاری کر دیا۔ یہ بات اور خصائص صرف کامریڈ

ایچ اے کے نہیں، وہاں اجتماعی طور پر سب کے تھے۔ اِس کے باوجود مَیں نے وہ کتابیں لے لیں۔ اُن کا معاوضہ وہیں کامریڈ نے مجھ سے وصول کر لیا تھا۔ مَیں کائنات کی اصل اور وجوہات کو اُن سے جاننا نہیں چاہتا تھا مگر وہ کیا کچھ دے گئے تھے، کم از کم مجھے یہ جاننے کی خواہش ہوئی۔ البتہ ایک خطرہ مجھے تھا کہ اُنھیں پڑھ کر میرا وجود بھی کہیں سمٹ کر اِسی ہوٹل کے لیے نہ رہ جائے لیکن خدشات حقیقتیں بننے میں دیر لیتے ہیں۔ میں نے دو سے تین ماہ میں وہ سب کتابیں پڑھ لیں اور ایک بار تو سچ پوچھیں مَیں اِن کی کتابیں پڑھنے کے بعد واقعی باولا سا ہو گیا۔ میرے دماغ میں ہر شے کا تصور ایک بے معنی وجود کا حصہ ہو گیا۔ چلتے پھرتے اور کام کرتے لوگ بے وقوف لگنے لگے۔ مسجدوں اور امام بارگاہوں کی دیواروں سے دُوری بڑھنے لگی۔ ہر اُس شے سے نفرت محسوس کرنے لگا جس میں نفاست اور صفائی موجود تھی اور کسی اندھے حافظ کی طرح بیس پچیس جملے میری زبان پر چڑھ گئے، جن میں استعمار، سرمایہ داری نظام، مزدور، بورژوا، پرولتاری کے الفاظ بار بار آتے تھے۔ طبیعت کو شاعری سے انقباض ہونے لگا اور ہر شے میں بے رونقی در آئی۔ مجھے ہر وہ شے اچھی لگنے لگی جس میں سیاہی اور کالک کا کچھ نہ کچھ اثر ہوتا تھا۔ یہ سیاہی یا کالک ورکشاپوں میں کام کرنے والوں کے کپڑوں پر بھی ہو سکتی تھی۔ چمنیوں پر بھی دیکھی جا سکتی تھی اور ہر وہ در و دیوار جس میں پانی اور گندگی کے درمیان سیاہی اور دھواں اور راکھ چڑھی ہو۔ اِن کے ساتھ ساتھ لال رنگ وغیرہ سے بھی متاثر تھا مگر یہ دونوں چیزیں مجھے اُس حالت میں اچھی لگتیں جب اِن میں بوجھل پن اور کوڑا کرکٹ اور فیکٹریوں کے دھویں شامل ہوتے۔ اگر کسی جگہ صفائی اور نفاست کے ساتھ یہ دونوں رنگ نظر آتے تو مجھے غصہ آنے لگتا۔ اِس عرصے میں حاجی فطرس علی کے پاس بھی جانا چھوڑ دیا۔ مجھے ڈر تھا وہ میری اِس کیفیت کو اپنی جادو آمیز باتوں سے ختم نہ کر دیں۔ اِن دِنوں میں نے اپنا منہ دھونا بھی چھوڑ دیا اور جان بوجھ کر کپڑوں اور جوتوں پر میل کچیل رکھنے لگا تھا۔ بال کٹوانے اور اُن کو صاف کر کے کنگھی کرنا بھی بند کر دیا۔ کامریڈ اور اُس کے دوست میری اِس حالت کو دیکھتے اور خوش ہوتے۔

ایک دن جب اِسی حالت میں گھر پہنچا تو میری دادی اور والدہ نے میرے لتے لینے شروع کر دیے۔ وہ شاید پہلے سے صلاح بنا کر بیٹھی تھیں۔ اُنھوں نے وہ بے عزتی کی کہ مجھے بھاگنے کو جگہ نہ تھی۔ اُس دن کے بعد میری یہ حالت زیادہ دیر تک نہیں رہی۔ مَیں اگلے دن ہی سیدھا کالج سے سید فطرس علی کے مطب پر جا پہنچا۔ پھر مسلسل گاؤں اور امام باڑے میں آنے جانے اور فطرت سے ہم کلام ہونے

کے سبب طبیعت نے اُن کے متعلق ذرا فاصلے سے ہو کر سوچنا شروع کر دیا۔ مَیں نے حاجی فطرس علی کو اپنی تمام کیفیت بتائی اور اُن پر واضح کیا کہ آئندہ اُس گروہ سے مَیں کبھی نہیں ملوں گا۔ اُنھوں نے مجھے کہا مَیں ہرگز ان کتابوں کو نظر انداز نہ کروں اور ایک نئے نکتہ نظر سے مطالعہ کروں جس میں متاثر ہونے کی بجائے مکالمے اور سوالات کی کیفیت ہو اور نہ ہی مَیں ترقی پسند احباب سے ملنے میں کوتاہی کروں کہ علم کی جڑیں صنوبر کے پیڑ کی طرح سخت اور نرم چٹانوں میں یکساں موجود ہوتی ہیں۔ چنانچہ مَیں نے نئے سرے سے کامریڈ کی دی ہوئی کتابوں پر غور و فکر شروع کر دیا اور اُن پیراگرافوں کی تلاش میں رہا جنھیں پڑھ کر مَیں بھی کائنات کو سمجھ سکوں مگر وہ ہیرے کہیں نظر نہ آئے جنھیں مَیں حجت سمجھتا۔ عین مذہبی قصوں کی طرح اِدھر اُدھر کی روایتیں جمع تھیں جو اپنی طرح کے ویسے ہی سچ تھے جیسے ہم پیروں اور ولیوں کی کرامات کے سچ سنتے آئے تھے۔ اُن کو پڑھنے کے دوران کامریڈ سے میرا مکالمہ بھی چلتا رہا تھا اور مجھے اُس مکالمے میں احساس ہوا کہ وہ کتابیں خود کامریڈ اور اُس کے ساتھیوں نے نہیں پڑھی تھیں۔ اُنھوں نے اُن کے خلاصے سُن رکھے تھے۔ اِسی طرح فلسفے اور ادب کی کتابوں کا حال تھا۔ وہ جن کتابوں پر مجھ سے بات کرتے تھے تھوڑی دیر بعد بھٹکتے ہوئے کچھ کا کچھ کہہ جاتے اور زیرِ بحث کتاب سے کوسوں دور کی کوئی کوڑیاں سناتے۔ آہستہ آہستہ مَیں اِس سارے معمے کو سمجھنے لگا۔ کامریڈ کی محفل میں اکثر ان مصنّفین کی بے انتہا تعریفیں سنی جاتی تھیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں مَیں نے اُن مصنّفین کی تعریفوں کو غیر سنجیدہ لینا شروع کر دیا۔ میرا خیال تھا مجھے وہی کرنا چاہیے جس میں ذہنی آسودگی حاصل ہو اور وہ مَیں اپنے بچپن سے کرتا آ رہا تھا۔ یہ افسانہ، داستان، شاعری اور دلچسپ اور پُرمزاح ادبی مضامین تھے۔ اب میرا کالج کا چوتھا سال تھا۔

جب مَیں کچھ ہی دِنوں بعد دوبارہ اپنے ثقافتی اور مذہبی فیسٹول میں بھرپور حصہ لینے لگا تو کامریڈ سمیت اُن کا تمام گروہ مجھ سے نا اُمید ہو گیا۔ میری بحث، تکرار بعض اوقات اُنھیں چڑچڑا کر دیتی لیکن اِس شہر میں حاجی فطرس علی کے علاوہ یہ میرا دوسرا ٹھکانا تھا اور مَیں اِسے چھوڑنا بھی نہیں چاہتا تھا اِس لیے مَیں اِس بحث کو جھگڑے تک نہیں لے کر جاتا تھا اور واپس کامریڈ کی کسی نہ کسی بات سے اتفاق کر لیتا تھا تاکہ ماحول سازگار رہے۔ کامریڈ کو ناراض نہ کرنے کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ وہی اخبار یا رسالہ جسے وہ خود نکالتا تھا، اُس میں کامریڈ میری چھوٹی موٹی تحریریں چھاپنے لگا تھا۔ یہ تحریریں، کالم نما ہوتی تھیں۔ اپنی طرف سے مَیں اُن تحریروں کو مضامین کہنے لگا تھا اور زندگی کے بارے میں بزعمِ خود بڑے بڑے

فلسفے بیان کرتا تھا۔ اُن فلاسفہ ہائے زندگی کی وہ گروہ بہت تعریفیں کرتے تھے۔ مَیں اپنی تحریروں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتا اور پورے گروہ کو اُس دن کھانا کھلاتا جس دن میری کوئی تحریر چھپتی۔ یہ کھانے کی نوبت ہر تیسرے اور چوتھے دن آنے لگی تھی۔ اِس سب کے باوجود مَیں اپنے معاملات ویسے ہی رکھتا تھا جیسے وہ تھے۔ یعنی عشرہ محرم کا سوگ منانا اور مختلف مذہبی تقریبات میں شرکت کرنا۔ نماز روزے کی بابت مَیں عام مسلمانوں کی طرح بے فیض ہی تھا۔ کبھی پڑھ لی، کبھی نہ پڑھی۔ کالج کے چوتھے سال کے آخری مہینوں میں تو بالکل ہی نماز چھوڑ چکا تھا مگر اِس نماز کے چھوڑنے میں میرے ایمان کی کمزوری نہیں بلکہ کاہلی اور سُستی کی وجہ تھی۔

(۳۰)

اُنھی دِنوں کے دو واقعے قابلِ ذکر ہیں۔ مَیں نہیں جانتا اِن سے آپ کیا نتائج نکالیں گے، یا پھر یہ سرے سے ہی فضول ہوں مگر بہت چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ اہم نہ بھی ہوں تو بھی اُنھیں بیان ہو جانا چاہیے۔ کالج کے طلبہ کے لیے بہت سی سیاسی تنظیمیں وجود میں آ چکی تھیں۔ میرا ویسے تو کسی تنظیم سے تعلق نہیں تھا لیکن سب کے لیے میں ایک خدمت انجام دینے لگا تھا۔ یہ خدمت اُن تنظیموں کے لیے مفت تقاریر کرنے کی تھی۔ مَیں اپنی تقریر میں اِس قدر شعلہ بیانی سے کام لیتا اور ایسے الفاظ ڈھونڈ کر استعمال کرتا کہ دوسرے طلبہ کے بس میں نہیں تھے۔ ایسا نہیں کہ میرا اُن تنظیموں یا الفاظ کے ساتھ جذباتی تعلق تھا۔ بس اُسے میرا شغل سمجھ لیجیے۔ معاملہ یہ تھا کہ کسی طلبہ تنظیم نے کالج کے دیگر طلبہ کو اپنی طرف متوجہ کرنا ہوتا تو وہ مجھے پیغام بھیج دیتے کہ ذرا دیر کے لیے امتحانی ہال کے سامنے والے گراؤنڈ میں آ جاؤ۔ کالج زیادہ بڑا نہیں تھا مگر ایک خوبصورت عمارت تھی۔ ٹھنڈی سڑک سے شمالی طرف کمپنی باغ کے بالمقابل یہ عمارت برٹش دور کے ایک سیکنڈری سکول کی تھی۔ 1954ء میں اِسے کالج کا درجہ دے کر اُس پر ایک دو عمارتیں اور کھڑی کر دی گئیں مگر سکول کا جتنا رقبہ تھا اُس میں اضافہ نہیں کیا گیا۔ دائیں پہلو کے ایک گراؤنڈ کے درخت کاٹ کر نئی عمارت وہیں بنائی گئی۔ امتحانی ہال اُسی پرانی عمارت کے عین مرکز میں تھا اور یہ جگہ پویلین کے بالکل سامنے تھی۔ سامنے والے گراؤنڈ میں بے شمار شیشم کے درخت تھے۔ یہ درخت اتنے پرانے تھے کہ اِن کے تنے دو بازوؤں کے احاطے میں نہیں آتے تھے۔ اِنھیں پانی کم دیا

جاتا تھا اِس لیے بعض درخت سوکھتے جا رہے تھے۔ یہ گراؤنڈ اُن سیاسی اور غیر سیاسی طلبہ سے بھرا رہتا تھا۔ یہاں ایک چھوٹا سا بُرج تھا۔ سیاسی طلبہ کے لیڈر، جو خود بھی طلبہ ہی ہوتے تھے اور اُنھیں تعلیم وغیرہ سے کچھ غرض نہیں تھی، اِس پر چڑھ کر تقریریں کرتے تھے۔ کالج میں میری حیثیت زیادہ معتبر نہیں تھی۔ نہ مجھے کوئی تنظیم عہدہ دینے کے لیے تیار تھی مگر طلبہ کو اکٹھا کرنے کے لیے میری پہلی تقریر ضروری سمجھی جاتی اور وہ مَیں شوق سے کرتا۔ اُس کی دو وجوہات تھیں۔ پہلی وجہ طلبہ تنظیموں کی طرف سے تھی کہ اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے میری تقریر کے چٹخارے دار الفاظ کی ضرورت ہوتی تھی جو میرے پاس کافی تھے اور مَیں اُنھیں بہتر طریقے سے استعمال کرتا تھا۔ دوسری وجہ میری طرف سے تھی کہ بُرج پر چڑھ کر محسوس کرتا جیسے مَیں ایک انسان ہوں اور سامنے کھڑے ہوئے کیڑے مکوڑوں سے خطاب کر رہا ہوں۔ یہ کیڑے میری فریب افزا لفظیات پر خوش ہو کر تالیاں بجاتے تو مجھے ایک طبعی فرحت اور تسکین کا احساس ہوتا۔ اِس کے علاوہ بھی ایک وجہ تھی مگر وہ ثانوی تھی۔ اِن تقریروں کے باعث کالج میں ایک دوسرے کی متضاد فکر اور نظریات کی حامل تنظیمیں بالاتفاق میری دوست تھیں اور مَیں اِن سب کے سبب تمام کے شر سے محفوظ تھا۔ اِن تنظیموں کے پاس اپنے اپنے ایشوز تھے۔ ایک ایشو جو سب کے لیے تھا وہ کشمیر کا مسئلہ تھا۔ یہ خطہ کہاں موجود تھا، اِس کا جغرافیہ کیا تھا اور کیونکر مسئلہ تھا؟ اِس بارے میں مجھ سمیت تمام طلبہ بے خبر تھے۔ بس نام یاد تھا۔ اِس لیے کہ اِس کے بارے میں تواتر سے خبریں آتی تھیں کہ ہندوستان نے پاکستان کا یہ حصہ زبردستی دبا لیا ہے۔ اِس مسئلے کی بنیاد پر کالج میں جب بھی کوئی تنظیم کلاسز سے چھٹی کا فیصلہ کرتی وہ کشمیر میں ہونے والے ظُلم پر سٹرائیک کر دیتی۔ تنظیم کے طلبہ ایسی کرختگی سے کلاس میں گھستے کہ ٹیچر دوسرے دروازے سے باہر کی طرف بھاگ جاتا۔ یوں پورے کالج میں چھٹی ہو جاتی۔ دوسری وجہ کمیونسٹ قسم کی طلبہ تنظیموں کی تھی۔ یہ مزدوروں پر ہونے والے ظُلم پر آئے دن احتجاج کر کے چھٹی کا بندوبست کر دیتیں۔ بنیادی طور پر طلبہ اِن دونوں سے خوش تھے۔ باقی رہی طلبہ کی سیاسی تربیت، تو اُسے آپ غنڈہ گردی کی تربیت کہہ سکتے ہیں۔ طلبہ اس دوران آسانی سے سیکھ جاتے تھے کہ اپنی بات منطق اور دلیل کی بجائے دھونس سے کیسے منواتی ہے۔

مَیں جس فلیٹ میں قیام رکھتا تھا وہ شہر کے مغربی حصے میں جناح روڈ کے دائیں طرف سہارنیاں والا کی سڑک پر واقع تھا۔ یہاں سے گول چوک کا فاصلہ دس منٹ سے زیادہ نہیں تھا اور اتنا ہی فاصلہ پھاٹک والا چوک کا تھا۔ سردی شدید تھی اور رات کے گیارہ کا وقت تھا۔ یہ وقت میرے اور حبیب علی کے

شہر کی سیر کا ہوتا تھا۔ ہم رات کے اِس سناٹے میں شہر کی سڑکیں اور گلیاں ایسے گھومتے جیسے یہاں کے چوکیدار ہوں۔ اِس کے دو فائدے تھے۔ ایک ہمیں شہر کی گلیوں کے تمام نقشہ جات معلوم ہو چکے تھے اور دوسرا مرکزی فائدہ ہماری اُن چہروں سے شناسائی ہوگئی تھی جنھیں راتوں کے لوگ کہنا زیادہ مناسب تھا۔ خموشی کے اِس عالم میں زندگی نہایت پروقار، ہمہ گیر اور واضح نظر آتی تھی۔ ہم چلتے ہوئے گول چوک کے دائیں طرف کے بازار میں آ گئے۔ یہ بازار بالکل بند تھا۔ کسی آواز، ہیولا اور شور کی صدا تک نہیں تھی۔ سرد رات کے اِس سناٹے میں حکیم دلدار دواخانہ کے سامنے ایک کبابوں کی ریڑھی پر جگمگاتے کوئلوں کی تپش اور بھنتے ہوئے گوشت کا دُھواں سلامت تھا۔ ہمارے پاس اُس وقت پیسے کم تھے، یعنی کل ملا کر جیب میں اتنے پیسوں کا وزن تھا جس کے ترازو میں فقط چار کباب آتے تھے مگر بھنتے ہوئے گوشت کی خوشبو اور رات کی تاریکی اور لال انگاروں کی کشش نے بے خودی کے ساتھ ہمیں اپنی طرف کھینچ لیا اور ہم دونوں کھنچے چلے گئے۔ ارادہ یہ ہوا، چار کباب کھائیں گے اور پیسے تھما کر تنگی گلی سے آگے ہو جائیں گے۔ کباب فروش بوڑھا آدمی تھا۔ ساٹھ برس سے اُوپر، چھدری داڑھی اور سر پر لٹڑے کی جرسیوں سے اُدھیڑے ہوئے دھاگے کی چادر تھی۔ دن کے وقت یہ جگہ انتہائی مصروف تھی اور کسی کباب کی ریڑھی کی گنجائش نہیں تھی۔ ریڑھی کے دائیں طرف دو لکڑی کے بنچ پڑے تھے۔ ہم اُن میں سے ایک بنچ پر بیٹھ گئے اور کہا بابا جی ایسا کیجیے چار کباب لگا دیجیے۔ بابے نے ہماری طرف ایک نظر دیکھا اور بولا، ٹھیک پُتر پر تم دو شیر جوان اور چار کباب سونگھنے کے لیے لینے ہیں؟

بابا جی شیر جوانوں نے آپ کو پیسے بھی تو دینے ہیں۔ اب دعاؤں کے عوض تو آپ کھلائیں گے نہیں؟ مَیں نے اُسی طنز سے جواب دیا۔

اللہ نہ کرے دعاؤں کے عوض کھاؤ۔ بیٹھ جاؤ، کباب فروش بولا۔

کبابیے نے چار کباب آگ پر رکھ دیے۔ ابھی وہ کباب لگا ہی رہا تھا کہ حاجی ولی فلور مل والے کا بھینسے جیسا لڑکا اپنی ہنڈا موٹر سائیکل سے اُترا اور بولا، چاچا شریف، ذرا دس کباب لگا دے۔

شریف کبابیے نے اُس کی طرف تشکر آمیز نظروں سے دیکھ کر کباب سیخوں میں پرونے شروع کر دیے اور اُس کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔ ہماری طرف سے مکمل بے نیاز ہو گیا۔ یہ بے نیازی ایسی تھی جس میں ہم نے اپنی طرف سے سمجھ لیا کہ بوڑھے نے ہمیں گویا حقارت سے رد کر دیا ہے اور یہ معاملہ صرف ایسا نہیں جسے دو خاندانی لڑکوں کی طرف سے نظر انداز کیا جا سکے۔ مَیں حبیب علی کے مزاج کو جانتا

تھا کہ وہ کباب کھائے بغیر یہاں سے اُٹھ جائے گا۔ اِسی عالم میں حبیب علی نے میری طرف دیکھا اور بولا، ضامن کیا یہ ظلم نہیں ایک ایسا بھینسا جس کے پاس فقط پیٹ ہے اور دماغ نہیں وہ اکیلا دس کباب کھائے اور ہم دونوں سابقہ کامریڈ چار کباب۔ یہ صریح زیادتی اور سرمایہ داری نظام کا غیر منصفانہ عمل ہے۔ اِس میں استحصال کے ساتھ ذلت بھی شامل ہے۔

تو کیا کیا جا سکتا ہے؟ اب ہم نہ تو بھتہ کھا سکتے ہیں، نہ شہر کے معززین میں شامل ہیں کہ بڑھا ہماری تواضع کرے یا پھر وضع داری چل جائے۔

نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہم بھی دس کباب کھائیں گے، یہ کہہ کر حبیب علی نے شریف کبابیے کو دس کباب لگانے کا آرڈر دے دیا۔

ابھی تو آپ کہہ رہے تھے پیسے نہیں ہیں، شریف کباب فروش نے ہنس کر کہا اور کباب سیخوں میں چڑھانے لگا۔

بابا جی آپ کباب لگائیں؟ پیسے بہت۔

مَیں حبیب علی کی طرف حیرانی سے دیکھنے لگا۔ مَیں اچھی طرح جانتا تھا اُس کے پاس پیسے نہیں تھے پھر اُس نے یہ کیا کر دیا تھا۔

مَیں نے آہستہ سے کہا، ظالم یہ کیا کر رہے ہو۔ پیسے تو پاس نہیں ہیں۔

حبیب علی نے مجھے گھورا اور کہنے لگا، دیکھو بھائی آج چُپ بیٹھے رہو۔ تم دیکھ نہیں رہے یہ حاجی حرام خور کا سؤر اکیلا دس کباب کھائے گا اور ہم دو دو کھائیں گے۔ میری غیرت گوارا نہیں کرتی۔ یہ فیکٹری کا مالک ہوگا تو اپنی جگہ۔ ہم بھی کم نہیں ہیں۔

لیکن میاں پیسے کہاں سے دو گے؟ مَیں نے اصرار کیا اور دوبارہ کبابیے سے مخاطب ہوا، بابا جی یہ مذاق... ابھی مَیں نے اتنا ہی جملہ ادا کیا تھا کہ اُس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا یار چپ بیٹھے رہو۔ اب مَیں مکمل چپ ہو گیا۔ حبیب علی کی عادت کو مَیں جانتا تھا، وہ ضد پوری کر کے رہتا تھا۔

اتنے میں ہمارے اور اُس لڑکے کے کباب لگ گئے مگر لڑکے نے ایک اور زیادتی کی کہ بابے سے کہا پیپسی کی بوتل دے دو۔ یہاں بھی حبیب علی نے اُس سے مقابلہ کیا اور کہا، بابا جی ہمیں بھی دو بوتلیں کھول دو۔ چند منٹوں میں وہ لڑکا کباب کھا کر اپنے موٹر بائیک پر بیٹھا اور چلا گیا۔ اِدھر ہم اپنے منہ صاف کرنے لگے۔ اگرچہ آرڈر حبیب علی نے دیا تھا لیکن تشویش مجھے تھی۔ مَیں نے اُسے کہا، میاں

دیکھو، ہم کباب کھا چکے اور سرمایہ داری نظام سے بدلہ بھی لے چکے مگر یہ بتاؤ، اب کبابیے کے پیسے کیسے پورے کریں؟

پورے کیسے کرنے ہیں؟ جتنے پیسے جیب میں ہیں، اِسے تھماؤ، یہ اُن کو گننے لگے گا، اِتنے میں ہم رفوچکر ہو جائیں گے۔ ہمارے پیچھے بھاگنے سے تو یہ رہا۔

حبیب علی کی بات پر مَیں ایک دم چونکا۔ یہ نہایت عجیب بات تھی اور خطرناک بھی۔ کسی بھی شخص کو خبر ہو جائے تو اِس سے بڑی ذلت کیا ہو سکتی تھی؟ مَیں تھوڑی دیر کے لیے خموش ہو گیا۔

کیا سوچتے ہو؟ حبیب علی نے مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

سوچتا ہوں اول تو بھاگنا اچھی بات نہیں۔ اگر بھاگنا ہی ہے تو جو کچھ پاس ہے اُسے بھی کیوں گنوائیں۔

چلو پھر اُٹھو، یہ کہہ کر حبیب علی اُٹھ کر چل پڑا اور مَیں اُس کے پیچھے ہو گیا۔ ہم دونوں دو قدم ہی چلے تھے کہ شریف کبابیا بولا بیٹا اب پیسے تو دیے جاؤ لیکن ہم نے اُس کی آواز سنی ہی نہ تھی، اپنی رفتار تیز کر دی۔ اُس نے دو بار مزید کہا اور ہمارے پیچھے آنے لگا۔ اِدھر ہم مزید تیز ہو گئے۔ اب جو بابا جی تیز قدم ہوئے، ہم نے دوڑیں لگا دیں۔ وہ گالیاں دیتا ہوا ہماری طرف بھاگا لیکن سامنے مسجد کا گول چوک آ چکا تھا۔ یہاں مَیں دائیں طرف سے ہو کر نکل گیا اور حبیب علی بائیں طرف مُڑ گیا۔ شریف کبابیا اول تو بوڑھا آدمی تھا، بھاگ کر کہاں پکڑ سکتا تھا۔ جب ہم نے دو مختلف سمتوں میں دوڑیں لگائیں تو وہ غریب تذبذب کا شکار ہو گیا کہ کس لڑکے کا پیچھا کرے؟ دائیں طرف جائے یا بائیں طرف؟ جب اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو بچارا وہیں کھڑا رہ گیا اور ہم دائیں بائیں والے اگلے ہی بازار میں پھر اکٹھے ہو گئے۔ اِس طرح کے واقعات میں یہ لمحے ہوتے ہیں، اگر سنجیدگی سے ہنسا نہ جائے تو شرمندگی گھیرے میں لے لیتی ہے۔ ایک دوسرے کے سامنے ایسا تماشا کر کے چُپ رہنا ایک دوسرے کو ذلت کی نظر سے دیکھنے کے مترادف ہوتا ہے۔ ہم نے بھی واقعے کی کیفیت پر بے اختیار ہنسنا شروع کر دیا۔ اِس عمل سے یہ ہوا کہ ہمارے ضمیر کا احتجاج قہقہوں کے شور میں دب گیا۔ ہمیں نہیں معلوم ہم نے فیکٹری کے مالک حاجی ولی کے بیٹے کو شکست دی تھی یا شریف کبابیے کو۔ اُس وقت اِس طرح کی بات سوچنا عین حماقت تھی۔

ہم پیپل والی گلی پہنچ چکے تھے۔ پیچھے دھند اور اندھیرا تھا۔ ہم چلتے گئے اور کچہری روڈ سے ہوتے ہوئے سیدھے پھاٹک والے چوک پہنچ گئے۔ ان ابہام کے لمحوں میں ہمارا وجود دو سایوں کی

طرح تھا۔ ایسے سائے جنھیں کھائے ہوئے کباب بھول کر فقط دوڑ نا یاد رہ گیا۔ اُن کبابوں کا لطف اُسی وقت ختم ہو گیا تھا اور عین ممکن ہے بھاگنے کے بعد اُس کی کڑواہٹ باقی رہ جاتی مگر ہم نے اُسے مسلسل ہنسی کے گھونٹ سے ختم کر دیا۔ ویسے بھی طلبا تنظیموں کی صحبت میں مسلسل برپا کی جانے والی دھونس سے ہمارا ضمیر آدھا رہ گیا تھا۔ ہم دونوں لکڑی کے ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ یہاں کافی دیر آوارگی کے نشے کی غنیمت کو یاد کرتے رہے، پھر ایک ہی دم اُٹھے اور سرور سوڈا چوک سے ہوتے ہوئے غوثیہ چوک پہنچے۔ وہاں سے آگے نکل کر حکیم سید فطرس علی کے مطب کو دائیں ہاتھ رکھ کر بینک والی گلی آ گئے۔ پھر اس جگہ سے بھی آگے نکلے۔ اب ہمارے سامنے محمدیہ چوک تھا۔ یہ چوک بھی سنسان پڑا تھا۔ لوگ اپنے گھروں میں پڑے سردی کے دروں سے نکلے لحافوں میں تپش کے ہلکورے لیتے سو رہے تھے۔ اُنھیں کیا معلوم اس شہر کے ایک چھوٹے سے حصے میں تین چھوٹے چھوٹے لوگوں نے ایک دوسرے کے خلاف بازی کھیلی تھی۔

اگلے دن ہم ہوٹل پہنچے تو ہمارے جانے سے پہلے تمام دوست بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ مسلسل کسی بات پر تکرار کر رہے تھے۔ یہ تکرار جائداد کی تقسیم پر تھی اور نذیر باؤز کامریڈ کے ساتھ اُس کے نکات سمجھ رہا تھا۔ یہ باؤز عیسائی تھا اور مجھ سے پہلے اِس گروہ کا حصہ تھا۔ اکثر خموش بیٹھا رہتا۔ جب بولتا تو کوئی سڑی ہوئی بات کہتا۔ اُس کی خموشی میں دانشمندی ہرگز نہیں تھی بلکہ اِس محفل میں اُس کے پاس کہنے کو کوئی بات ہی نہ تھی۔ پڑھنے لکھنے سے اِسے بالکل رغبت نہیں تھی۔ کامریڈ کے مضامین بھی نہ پڑھتا تھا۔ اِس بات پر اُن میں اکثر جھگڑا بھی ہوا۔ باؤز کا خیال تھا کامریڈ اور دوسرے لوگ اِس ایک بات پر متفق ہیں کہ کالے عیسائی نجس ہیں۔ اُس نے یہ نتیجہ اِنھی کامریڈوں میں رہ کر سال ہا سال کے تجربات سے حاصل کیا تھا۔ سچ یہ ہے وہ کامریڈ کو بھی بے وقوف سمجھتا تھا۔ آج اُس کا جائداد کی تقسیم پر کامریڈ سے گفتگو کرنا اور جائداد کی تقسیم کے اسلام میں شرعی اصولوں کو سمجھنا ایک معنی خیز بات تھی جبکہ وہ خود عیسائی تھا۔ مَیں اور حبیب علی ہوٹل میں داخل ہوئے تو وہاں ایک دم سب کے چہروں پر رونق آ گئی۔ جاوید ساقی نے ہماری طرف دیکھ کر کہا، لیجیے وہ آ گئے ہیں۔ ہم اِس بات کو سمجھ نہ سکے کہ ہمارا انتظار کیوں ہو رہا ہے؟ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد بات آہستہ آہستہ سمجھ میں آ رہی تھی۔

باؤز شہر کے سب سے بڑے کامریڈ رانا الیاس کی بچیوں کو پڑھاتا تھا۔ کامریڈ الیاس کی شہر اور شہر کے مضافات میں بیشمار زمین تھی اور ایک کباڑ کی مارکیٹ تھی۔ یہ تمام چیزیں اُس کی ذاتی ملکیت

تھیں۔ رانا الیاس کی دو بچیاں تھیں، بیٹا نہیں تھا۔ اِدھر اُس کے تین بھائی تھے اور اُن بھائیوں کی اولاد میں کافی بیٹے یعنی رانا الیاس کے کئی بھتیجے تھے۔ کامریڈ ایچ اے دراصل رانا الیاس ہی کا شاگرد تھا۔ کافی عرصے سے کامریڈ الیاس بیمار تھا اور بستر کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ وہ ہماری محفل میں نہیں آتا تھا، نہ مَیں اُس سے ملا تھا البتہ بار بار اُس کا نام مختلف طریقے سے محفل میں ضرور لیا جاتا تھا اور اب مَیں اُس سے بخوبی واقف ہو گیا تھا۔ اصل میں آج رانا الیاس ہی نے باؤز کو یہاں کوئی پیغام دے کر بھیجا تھا۔ اُس پیغام میں چھپے سوالات پر باؤز بحث کر رہا تھا جو وہ کامریڈ الیاس سے نہیں کر سکتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد کامریڈ ایچ اے باؤز کو تمام مسائل سمجھا کر خموش ہوا تو میری طرف مخاطب ہوا۔ دیکھو میاں کامریڈ ضامن آجکل تمھاری ضرورت بڑھ گئی ہے۔ مَیں حیران کہ مجھ بے سروسامان کی اِن بڑے اور دانشور لوگوں کو کون سی ضرورت پڑ گئی ہے؟ مَیں نے نہایت احترام سے کہا، جناب مَیں حاضر۔

کامریڈ ایچ اے نے، پہلے میری طرف غور سے دیکھا پھر اپنی بڑھی ہوئی شیو پر میل شدہ ناخنوں سے بھرپور خارش کی۔ ایسا وہ اُس وقت کرتے تھے جب اُنھیں اندیشہ ہوتا کہ سامنے والا شاید بات نہ سمجھے اور یہ اکثر ہوتا تھا۔ جب وہ چہرے کی خارش کے بعد ہر طرف سے مطمئن ہو گئے تو کہنے لگے، بھیا بات یہ ہے کامریڈ الیاس صاحب میرے اُستاد ہیں۔ اُنھی کی وجہ سے مَیں مذہبی ذلت سے نکل کر انسانیت کے دائرے میں داخل ہوا ہوں اور آج جس قدر بھی عقل و آگہی سے واسطہ ہوا ہے یہ اُنھی کا فیض ہے۔ تمھیں شاید پتا ہو اُن کی دو بچیاں ہیں۔ دونوں اُن کے گھر میں بیٹھی ہیں۔ ایک کی شادی ہوئی تھی۔ اُسے طلاق ہو گئی اور دوسری کی شادی ابھی تک ہو نہیں پائی۔ کامریڈ الیاس کی بیماری کی سمجھ نہیں آ رہی۔ بالکل ہڈیوں کی مٹھ بن چکے ہیں۔ اُن کی جائداد پر اُن کے بھتیجے نظریں گاڑے بیٹھے ہیں۔ تمھیں اور ہمیں سب کو پتا ہے کہ ہمارا تو کسی مذہب وذہب سے کوئی واسطہ نہیں مگر الیاس صاحب سُنّی العقیدہ فیملی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کی جائداد کی تقسیم اُن کے چلے جانے کے بعد سُنّی قوانین کے تحت ہو گی۔ جس میں آدھی جائداد اُس کے بھتیجوں کو منتقل ہو جائے گی اور بیٹیوں کے حصے میں بہت کم آئے گی۔ سنا ہے مذہبِ جعفریہ میں اُصول مختلف ہے۔ باپ کے مرنے کے بعد اگر اولاد میں کوئی بیٹا نہیں، صرف بیٹیاں ہیں تو ساری جائداد بیٹیوں کے حصے میں برابر تقسیم ہوتی ہے۔ کامریڈ الیاس صاحب کا کوئی بیٹا نہیں صرف بیٹیاں ہیں۔

مَیں نے کہا کامریڈ صاحب وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن مجھے تو اِن اصولوں کا اختیار نہیں ہے، نہ

مَیں طاقت رکھتا ہوں کہ سُنّی مذہب کے اصول وقواعد بدل دوں؟ نہ میری کوئی بڑی سفارش ہے۔

بھائی پہلے سُن تو لو، تم دین دھرم والوں کی عادت ہے کہ پوری بات سنے بغیر تکرار کرتے ہو، کامریڈ جھلا کر بولا۔ تمھیں کچھ نہیں کرنا۔ تم ایک شیعہ فیملی سے تعلق رکھتے ہو اور شیعہ سادات میں اُٹھنا بیٹھنا ہے۔ وہاں مجلس میں سلام وغیرہ بھی پڑھتے ہو۔ تم نے دو گواہیاں تیار کرنی ہیں جو عدالت میں بیان دے سکیں کہ رانا الیاس نے اپنا مذہب بدل لیا ہے اور اب وہ شیعہ ہے۔ ہم آج عدالت میں جائداد کی تقسیم کی درخواست دے دیں گے۔ یہ سب کام خفیہ ہے، کسی کو کان وکان خبر نہ ہو۔ ایک گواہ تو آپ ہوئے اور دوسرے اپنے دوست سید علی حسین زیدی صاحب کو لے آیئے گا۔ شیعہ مذہب کی قبولیت کا خط ہم نے سید غضنفر نقوی سے لے لیا ہے۔ جب عدالت میں پیش ہوں تو آپ نے بس یہی کہنا ہے، رانا الیاس صاحب نے ہمارے سامنے شیعہ مذہب قبول کیا ہے۔ گواہی کے طور پر خط میں آپ کا اور سید علی زیدی کا نام درج ہے۔

یہ دوسرا گواہ بھی سید ڈھونڈ لیتے، مَیں نے مزاحاً کہا، مجھ اُمتی کو کیوں لپیٹتے ہو۔ جن کی اُمت ہے وہی نپٹیں۔

کامریڈ ایچ اے ہنس کر بولے، دونوں سید رکھ لیتے تو کیا معلوم وہاں سچ بول دیں، بھائی ان سید لوگوں کا کوئی بھروسا نہیں، کب صادق اور امین بن جائیں۔ ہر وقت انقلاب کے درپے ہوتے ہیں اور ہمیشہ اس راہ کے مخالف چلتے ہیں جس راہ خلق چلتی ہے۔

تو کیا سید غضنفر نقوی صاحب عدالت میں پیش نہیں ہو سکتے؟ مَیں نے کامریڈ سے پوچھا، اُن کی گواہی تو ہم سے زیادہ معتبر ہوگی۔ ہم تو ابھی لونڈے لپاڑے ہیں۔ جج کو شک گزرے گا کہیں سے اُٹھا کر لے آئے ہیں۔

میاں ایک تو سوال جواب سے آپ باتوں میں زچ کر دیتے ہیں، جج نے وہاں آپ سے گواہی حلف پر لینی ہے اور جب آپ کے باپ دادا کی تصدیق ہے کہ یہ لوگ مومن بھائی ہیں تو جج کی ماں کو کون سا کانٹا چبھے گا گواہی تسلیم کرتے ہوئے۔ کامریڈ ایک دم تڑپ گیا۔ اگر گواہی دینی ہے تو ٹھیک ورنہ ہم کوئی اور ڈھونڈ لیتے ہیں۔ یہاں ایک سے بڑھ کر ایک مومن ہماری جیب میں پڑا ہے۔

دادا جی مَیں نے گواہی دینے سے کب انکار کیا ہے؟ اپنے تحفظات کا اظہار کر رہا تھا لیکن اب مجھے کامریڈ الیاس صاحب سے بھی ملوا دیں، اُن کی صورت تو دیکھ لیں۔

ہاں ٹھیک ہے، یہ چائے پی لیں تو چلتے ہیں۔ کامریڈ نے فتح مندی سے جواب دیا۔

چائے کے بعد ہم کامریڈ الیاس کے گھر روانہ ہو گئے۔ الیاس صاحب کا گھر ریلوے لائن کے دوسری طرف چھ نمبر چونگی کے پاس تھا۔ یہ ایک بہت بڑی کوٹھی تھی جس میں بڑے بڑے درخت اور باغیچے تھے۔ مَیں کوٹھی دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ سیکڑوں درخت اور درختوں کے درمیان جا بجا اِدھر اُدھر کامریڈ الیاس کے ہاتھوں کے بنائے ہوئے مجسمے کھڑے تھے۔ رانا صاحب نے یہ مجسمے اِس طرح گاہے گاہے درختوں کے درمیان کھڑے کیے تھے جیسے آدمی پہرہ دے رہے ہوں۔ ایک کونے میں اتنا بڑا برگد کا درخت تھا کہ اُس سے بڑے گھیر کا درخت شاید ہی اِس شہر میں ہو۔ اُس کی جڑیں کم سے کم تین چار مرلے میں پھیلی تھیں اور سایہ تو چار کنال میں چھایا تھا۔ درختوں، پودوں اور گھاس کے میدانوں میں بہت زیادہ جھاڑ جھنکاڑ اُگا تھا۔ اُس کی وجہ شاید اُن کی بیماری تھی۔ اُس کے سبب وہ اِن پر توجہ نہیں دے سکے تھے اور کوئی مالی اُنھوں نے اِس کام کے لیے نہیں رکھا تھا۔ مالی نہ رکھنے کی کوئی بھی وجہ ہو سکتی ہے۔ مجھے اِس سے غرض نہیں تھی لیکن ایک جمالیاتی احساس کے تحت خیال گزرا کہ اتنے خوبصورت گھر کو کم از کم ایک بے ترتیب جنگل نہیں ہونا چاہیے مگر میرا جمالیاتی احساس تو کچھ بھی سوچ سکتا ہے۔ لوگ اُس کے پابند تو نہیں۔ کوٹھی میں داخل ہوتے ہی بائیں طرف ایک پرانی طرز کا خستہ سا کمرہ تھا۔ اِس کمرے کے ایک طرف پکی اینٹوں کے فرش پر پانچ چھ خستہ لکڑی کی کرسیاں رکھی تھیں۔ اُن کے بیچ ایک چھوٹی سی میز تھی۔ اِسے تپائی کہنا زیادہ بہتر تھا۔ اِس کی لکڑی اور رنگ اتنے پرانے تھے کہ دونوں ناخن سے کھرچنے سے ٹوٹنے لگتے تھے۔ ہم تینوں اُنھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تپائی پر ایک پرانی شطرنج پڑی تھی۔ اِس کے مہرے وہاں نہیں تھے۔ یہ لکڑی کی شطرنج شاید مدت سے بے کار پڑی تھی۔ اسے کون کھیلتا تھا، اِس بارے میں پوچھنے کی زحمت نہیں کی۔ ہم وہاں خاموش بیٹھے تھے۔ کامریڈ اور باؤز تو شاید کسی قسم کے احساس سے بے نیاز تھے لیکن مَیں اِس پورے منظر نامے سے بہت متاثر ہوا تھا۔ یہ تاثر کہیں مثبت تھا اور کہیں منفی۔ میرے خیال میں بہترین چیزیں بے کار ہو رہی تھیں۔

اتنی دیر میں ایک لڑکا باہر نکلا اور اُس نے کوٹھی کا اندرونی دروازہ کھول دیا۔ اِس کا مطلب تھا رانا الیاس صاحب ہمیں اندر بلا رہے تھے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک عجیب تماشا دیکھا۔ ایک لمبا تڑنگا آدمی چوڑے بیڈ پر بیٹھا تھا اور ارد گرد کی الماریوں میں عجیب ٹھسا ٹھسنی تھی۔ دوائیوں کے ڈبوں اور شیشیوں کے بیچ کتابیں اور کتابوں کے بیچ دوائیوں کے پیکٹ۔ یہ دوائیاں ہومیو اور ایلوپیتھک،

دونوں طرح کی تھیں۔ الیاس صاحب کے پچھلی طرف کی الماری میں تمام دوائیاں تھیں اور بیڈ پر بھی دوائیوں اور کتابوں کا امتزاج تھا۔ سامنے ایک لمبا سا صوفہ تھا۔ اِس پر بھی اُلٹی سیدھی انگریزی اور اُردو کی کتابیں رکھی تھیں۔ باؤزنے جلدی سے کتابیں سمیٹ کر ایک طرف کیں تاکہ بیٹھنے کی جگہ بن جائے۔ ہماری آمد پر الیاس صاحب کے چہرے پر ہلکی سی خوشگواری پیدا ہو گئی۔ الیاس کامریڈ کی عمر کا اندازہ اُن کی بیماری کے سبب لگانا ممکن نہیں تھا، اِس کے باوجود وہ ستر سے اُوپر ہی تھے۔ تھوڑی دیر بعد چائے آ گئی۔ ہم نے چائے پیتے ہوئے اُن کی خیریت دریافت کی۔ اِس عرصے میں وہ مسلسل میری طرف دیکھتے رہے۔ آخر کامریڈ نے اُنھیں کہا، یہ ضامن علی ہیں۔ یہ اور اِن کے دوست سید علی حسین زیدی گواہی دیں گے۔ جو کچھ بھی وہاں کہنا ہو گا، اِنھیں آپ بتا دیں۔ کامریڈ کی وضاحت کے بعد رانا صاحب تھوڑا سا سیدھے ہوئے اور بے نیازی سے بولے، کہنا کیا ہے بس یہی کہ ہمارے سامنے جعفری مذہب اختیار کیا ہے، یہ جملہ کہتے ہوئے وہ ہلکے سے مسکرا دیے، ویسے بھی میاں اگر تھوڑا بہت ہم کسی کا لحاظ کرتے ہیں تو وہ یہی لوگ ہیں۔ مَیں الیاس صاحب کی بات پر مسکرا دیا۔ مجھے کسی قانون اور شریعت کا معلوم نہیں تھا کہ پاکستان میں اِن کی کیا صورت ہے مگر اِتنا ضرور معلوم تھا کہ بعض جاگیردار شیعہ گھرانوں کی لڑکیاں بھی تمام عمر بے بیاہی بیٹھی رہتی ہیں۔ کہنے کو تو ہوا یہ تھی کہ اُن کا کفو نہیں ملتا۔ کفو کے نہ ملنے کی ایک بات رہی مگر مسئلہ یہاں بھی جاگیر کی تقسیم کا تھا کہ کہیں آدھا حصہ بانٹ کر نہ لے جائے۔ الیاس صاحب نے ہمارے ساتھ تمام گفتگو بے نیازی سے کی۔ اُس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اُنھیں میرے بارے میں پہلے سے بتا دیا گیا تھا۔ وہ جانتے تھے مَیں وقت پر دھوکا نہیں دوں گا۔ ویسے بھی اگر اُنھوں نے جعفریہ انجمن سے اپنے مذہب کی تبدیلی کا خط لے لیا تھا تو گواہ تیار کرنا کون سا مشکل تھے۔ خیر اُس دن ہم چلے آئے۔

اگلے دن مَیں گھر آیا اور اپنی والدہ اور دادی کو صورتِ حال کے متعلق تمام واقعہ سنا کر آگاہ کیا اور بتایا کہ مَیں ایک آدمی کی جھوٹی گواہی دینے جا رہا ہوں۔ یہ سنتے ہی دونوں بلبلا اُٹھیں۔ دادی اماں تو اس قدر پریشان ہوئیں جیسے اُن کے گھر پر قیامت نازل ہونے والی ہو۔ وہ گڑگڑا کر مجھے اِس کام سے باز آنے کا کہنے لگیں۔ مَیں نے اُن کی پریشانی سے محظوظ ہوتے ہوئے پوچھا۔ آخر اِس میں برائی کیا ہے؟ دادی اماں بولیں، بیٹا بُرائی صرف تیرے لیے نہیں ہمارے پورے گھر کے لیے ہے۔ جب ایک آدمی کا ایمان ہی خراب ہے تو جھوٹ بول کر تُو خدا کے دشمن کا فائدہ کیوں کرتا ہے؟

اماں آپ سے کس نے کہا وہ خدا کا دشمن ہے؟ میرے لیے بہت آسان تھا کہ مَیں والدہ اور دادی اماں کو پریشانی سے تلملاتے چھوڑ کر اپنے کام میں لگ جاتا لیکن جب سامنے بحث کرنے والا ہدف کمزور ہو تو اُن سے گفتگو میں زیادہ مزا آتا ہے۔ مَیں نے ذرا جان بوجھ کر گفتگو کو طول دیا۔

اماں نے مجھے نہایت رحم دلی سے سمجھاتے ہوئے کہا، بیٹا، جو جو ہمارے امام کو نہیں مانتا، وہ خدا کا دشمن ہے اور اُس کے رسولؐ کا بھی دشمن ہے۔ یہ قرآن میں لکھا ہے۔

لاؤ مجھے دکھاؤ کہاں لکھا ہے، مَیں نے مسکراتے ہوئے کہا، اگرچہ مَیں اُصول و فروع کو سمجھتا تھا لیکن دادی کو پریشان کرنا مقصود تھا۔

وہ ایک دم غصے سے بڑبڑائیں، اے ضامن خانہ خراب اب تُو قرآن پر بھی شک کرے گا۔ مَیں اتنی سی بچی تھی جب سے مولوی صاحب کو یہی کہتے سنتی آئی ہوں۔

اچھا مان لیا وہ خدا اور رسولؐ کا دشمن ہے لیکن خدا تو روز اپنے دشمنوں کو روٹی پانی دیتا ہے اور رسولؐ بھی اُن کے بھلے کی سوچتے رہے ہیں، پھر یہ ناجائز کیوں ہوا؟ مَیں نے فوراً اپنی دلیل پیش کی۔

لیکن وہ دونوں جھوٹی گواہیاں تو نہیں دیتے تھے، دادی اماں سٹپٹا کر ایسے بولی کہ مجھے ایک دم ہنسی آ گئی۔ اماں مَیں کون سا جھوٹی گواہی دینے جا رہا ہوں، اُس نے کہہ دیا مَیں مذہبِ شیعہ میں آ گیا ہوں۔ اب مَیں کون ہوتا ہوں اُس پر شک کرنے والا۔

وہ کھتری کی اولاد اتنی جلدی کیسے شیعہ ہو سکتا ہے؟ میری دادی اور والدہ ایک دم بولیں جیسے اُنھیں یہ جملہ الہام ہوا ہو۔

اچھا وہ کھتری کی اولاد ہے تو کیا آپ ابوطالب کی اولاد میں سے ہیں؟ اب مجھے تھوڑا سا غصہ آ گیا۔ اماں سیدھی سیدھی بات ہے، اگر میری جھوٹی گواہی پر اُس کی بیٹیوں کا حق بچتا ہے تو مجھے یقین ہے میرے آئمہ کو اِس پر کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔

میری اس بات پر وہ دونوں چُپ کر گئیں۔ مَیں جانتا تھا وہ مجھ پر لعنت ملامت کرنے کے ساتھ میرے راہ راست پر آنے کی دعائیں کریں گی مگر خدا ایسی دعائیں نہیں سنا کرتا۔ مَیں گھر سے باہر نکل گیا۔ مجھے معلوم تھا اب بہت دنوں تک یہ ناراض رہیں گی لیکن کیا کیا جا سکتا تھا؟ پھر ٹھیک دس دن بعد ہم نے عدالت میں جا کر اُن کی منشا کے مطابق بیان دے دیا۔ عدالت میں جانے اور قرآن پر حلف دینے کا میرا یہ پہلا موقع تھا۔

(۳۱)

ایک دن مَیں سو کر اُٹھا تو فلیٹ کے چوکیدار نے بتایا، استقبالیے پر ایک آدمی بیٹھا ہے، وہ کہتا ہے مَیں ضامن کا چچا ہوں اور ملنے آیا ہوں۔ مَیں جلدی سے باہر نکلا، دیکھا تو میرا چچا بیٹھا تھا۔ مجھے پریشانی ہوئی کہ اِس صبح کے عالم میں کون سی ایسی بپتا پڑ گئی ہے جو چچا جان یہاں آئے ہیں۔ مَیں نے اُن سے ہاتھ ملایا اور بیٹھ گیا اور چائے پانی پوچھے بغیر صرف اتنا کہا، چچا خیر تو ہے اتنی صبح آپ یہاں کیسے؟ وہ بولے، گھر میں چوری ہو گئی ہے۔ چور آپ کے مکان کے پچھلی طرف سے دیوار توڑ کر جو کچھ بھی تھا، لے گئے ہیں۔ سونا، کپڑے، پیسے، حتیٰ کہ برتن تک نہیں چھوڑے۔ سب کچھ ختم کر گئے ہیں۔ اب فقط خالی کمروں کی آوازیں رہ گئی ہیں یا تمھاری ماں کے بین ہیں جو آدھی رات سے ابھی تک جاری ہیں۔ مَیں چچا جان کی دی ہوئی اِس خبر پر سُن ہو کر رہ گیا اور کچھ دیر کے لیے میری زبان گویا گونگی ہو گئی۔ میرے والد نے پچھلے پانچ سال میں گھر میں دو چکر لگائے تھے۔ اِس کے علاوہ وہ صرف کام کرتے رہے اور پردیس کی ریت پھانکتے رہے تھے۔ اِس خبر پر سب سے پہلے میرے سامنے اپنے والد کی شکل دکھائی دی۔ مَیں نے دیکھا وہ کسی ریت کے ٹیلے پر نہایت غمگین بیٹھے مجھے دیکھ رہے ہیں اور کہتے ہیں مَیں کما کما کر تھک گیا اور تم سے سنبھالا نہیں گیا۔ مَیں نے کئی بار اپنی ماں سے کہا تھا، اماں یہ کپڑے اور سونا تو چلو گھر میں ٹھیک ہے مگر پیسے تو ہمیں بینک میں رکھنے چاہییں لیکن وہ کہتی اللہ جانے یہ موئے بینک والے پیسے لے کر بھاگ جائیں تو کس کا منہ دیکھوں گی۔ اپنی رقم پرائے غلے میں احمق رکھتے

ہی۔ اب میں اُسے کیا پوچھتا کہ اپنا تو غلہ ہی چور لے گئے۔ مَیں اُسی وقت بغیر کچھ بولے چچا کے ساتھ گاؤں روانہ ہو گیا۔ گھر پہنچ کر دیکھا تو سارا گاؤں ہمارے گھر کے سامنے جمع تھا۔ ہمارے مکان کے پچھلی جانب ایک کھلا خالی احاطہ تھا جس کی چاروں طرف سے دیوار کی گئی تھی۔ اس کے ایک طرف دروازہ لگا دیا گیا تھا جسے آٹھ پہر تالا لگا رہتا تھا۔ یہ دیوار سر سے دو فٹ اونچی تھی اور باہر سے کوئی آدمی احاطے میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اِس احاطے کے شمالی طرف فصلیں اور باغات تھے۔ رات کے وقت یہ جگہ مکمل ویران ہو جاتی تھی۔ چوروں نے اُسی احاطے میں داخل ہو کر ہمارے مکان کے عقبی جانب سے دیوار میں شگاف کیا اور کمروں میں داخل ہو گئے۔ والدہ، چھوٹا بھائی اور دادی اماں باہر صحن میں نیند کے ہلکورے لے رہے تھے اور چور کمروں کے اندر سے سامان نکال کر اُس احاطے میں جمع کرتے رہے۔ اُس کے بعد شمالی طرف سے احاطے کی دیوار توڑ کر اور سامان لے کر اُنھی فصلوں اور باغات کے اندھیرے میں ڈوب گئے۔

لوگ مختلف تبصرے کر رہے تھے۔ کوئی کہتا کہ سامان یہاں سے باہر گٹھڑیاں باندھ کر سروں پر اُٹھا کر لے جایا گیا ہے اور اُس کے بعد ٹرک پر لاد کر روانہ ہو گئے ہیں۔ کوئی کہتا، یہ چوری کرنے والے لوگ گاؤں ہی کے ہیں اور خاص کوئی مخبر ہے جس نے سیندھ لگوائی ہے۔ غرض جتنے منہ اُتنی باتیں۔ میری ماں رو رو کر بے ہوش ہوئی جاتی تھی۔ دادی اماں گم سم بیٹھی تھی۔ اُس کی حالت ایسی تھی کہ کچھ دیر میں غم کے سبب موت واقع ہو جائے گی۔ دونوں کو تسبیحیں بھول گئی تھیں۔ دادی اماں وقفے وقفے سے کہتی جا رہی تھی میرا بیٹا برباد ہو گیا۔ اُس کی محنت کی کمائی لُٹ گئی۔ کبھی مجھ پر الزام کستی کہ یہ سب ہم پر ضامن کی جھوٹی گواہی کا عذاب پڑا ہے۔ مَیں اُن دونوں کو اُسی حالت میں چھوڑ کر اُن کمروں میں داخل ہوا جو کبھی بھرے بھرے تھے۔ عمدہ ترین کپڑوں کے تھان سے لے کر ہر وہ چیز جو کسی مڈل کلاس گھر میں ہوتی ہے، ایک رات پہلے ہمارے گھر میں تھی۔ مجھے ایسے خالی اور سُرنگ لگے کمروں سے ایک خوف سا آ گیا۔ مجھے لگا ابھی تک کوئی چور یہاں موجود ہے جو ہم گھر والوں کی روح چوری کرنے کے لیے رُکا ہوا ہے۔ پہلی دفعہ احساس ہوا چور گھر کی تمام برکت اُٹھا کر لے گئے ہیں اور کمرے مردہ لاشوں کی طرح بے روح پڑے ہیں۔ مَیں ڈر کر فوراً باہر نکل آیا۔ مجھے دیکھ کر میری ماں نے اونچی آواز سے چیخنا اور رونا شروع کر دیا۔ کتنی بار کہا اپنے گھر میں رہو لیکن جن کو اپنے چھوڑ کر غیروں کی محفلیں اچھی لگیں اُنھیں لٹنے سے کون روک سکتا ہے۔ اب تیرے باپ کی کمائی کس کام آئی؟ کچھ غیروں کو کھلا دی باقی چور لے گئے۔

اللہ جانے کہاں کہاں جھوٹی گواہیاں دیتے پھرتے ہو۔ سب تیرے کرموں کا پھل ملا ہے۔ اللہ تمھیں کب ہدایت دے گا۔ مَیں اپنی ماں کے بَین اور طعنوں سے شرمندہ ہو کر چُپ کھڑا تھا۔ بہت دیر ماں اور دادی کے کوسنے سننے کے بعد نہایت بے زاری کے عالم میں باہر نکلا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی اب کیا کروں۔ سب کچھ یہیں چھوڑ کر دوبارہ شہر بھاگ جاؤں یا کچھ ہاتھ پاؤں ماروں۔ سچ پوچھو تو پچھلے چار سال کامریڈوں اور مجلس و ماتم اور گپی دوستوں کے ساتھ رہ کر مَیں بالکل سہل پسند اور باتوں کا دھنی ہو چکا تھا۔ عملی طور پر کام کرنے کی مجھ میں ذرا بھی اہلیت اور ہمت باقی نہیں رہی تھی۔ اِس مصیبت کے لیے میرے پاس اُن نظریات و فلسفہ میں سے ایک شے بھی کارآمد نہیں تھی جو اِس وقت کام آتی۔ جن کے بارے میں اللہ جانے کیا کیا خرافات مَیں نے کامریڈ ایچ اے کے رسالوں میں لکھی تھیں۔

دوسری طرف گاؤں میں میرا ایک بھی ایسا دوست نہیں تھا جسے کبھی مَیں نے اپنوں میں شمار کیا ہو یا خود کسی کے کام آیا ہوں۔ میری عمر کے اکثر لڑکے اول تو اِس معاملے میں مدد کرنے سے قاصر تھے، کوئی کارآمد تھا تو اُس سے دوستی کے تعلقات نہیں تھے۔ مَیں اب صرف اُنھی پر انحصار کر سکتا تھا جو میرے چچا یا والد کے دوست تھے۔ دوسری طرف میری والدہ اور چچا سمجھ رہے تھے مَیں اتنا عرصہ شہر میں رہا ہوں۔ بڑے بڑے لوگوں سے تعلقات ہیں، اِس لیے اِس مسئلے کو نمٹا سکتا ہوں۔ تھانے کچہری میں بھی دوستیاں پھیلی ہوں گی اور مَیں جلد ہی چوروں کو بازیاب کر لوں گا۔ باہر نکل کر مَیں نے اپنے چچا سے بات کی کہ اب کیا کیا جائے؟ اُس نے پہلے تو تمام قضیہ مجھ ہی پر چھوڑ دیا لیکن جب میری طرف سے مسلسل خموشی ہوئی تو وہ سمجھ گیا کہ میری طرف سے ہاتھ کھڑے ہیں۔ یہ بات اُس کے لیے عجیب تھی۔ اُسی شام گاؤں کے کچھ لوگوں نے سر جوڑے اور اِس بات پر فیصلہ ہوا کہ اِس گھر کا مال چوری کرنے میں باہر سے نہیں، گاؤں ہی کے کسی فرد کا ہاتھ ہے، وہ ہاتھ کون ہے؟ اُس کا میرے چچا کو یقین تھا لیکن اُن کا نام لینے والا کوئی نہیں تھا۔ تمام شواہد جس طرف کھُرا لے کر جاتے تھے اُن میں سے ایک میرے والد کا دوست تھا۔ اُسے خوب پتا تھا کہ ہمارے پاس کیا کچھ ہے اور کہاں رکھا ہوا ہے۔ وہ گاؤں کے سرکردہ لوگوں میں سے بھی تھا۔ دوسرا شک معیذ پر تھا۔ میری والدہ کو کامل یقین تھا کہ یہ کام معیذ نے اپنے لفنگے دوستوں سے مل کر کیا ہے۔ کچھ دِنوں سے معیذ کو اُسی آدمی کے ساتھ بھی دیکھا گیا تھا جو گاؤں کا سرکردہ تھا اور بہت بڑا رسہ گیر تھا۔ میری والدہ نے کہا ضامن سب کچھ چھوڑ کر ان دونوں پر تھانے میں پرچہ درج کروا دو۔ ہماری چوری کے یہ دونوں لوگ ذمہ دار ہیں۔ پچھلی بار جب تمھارے والد آئے

مجھے یہ اُس سے کرید کرید کے ساری کمائی کے حساب پوچھتا تھا اور معیذ کو تم سے بہت زیادہ دشمنی ہے۔
یہ دونوں سانپ دوستی اور دشمنی کے رنگ میں اِس گھر کو لوٹنے کے درپے ہوئے ہیں۔

اُسی شام مَیں شہر آیا، حبیب علی کو ملا اور اُسے لے کر اپنے کامریڈ دوستوں سے اِس حادثے کا ذکر کیا لیکن یہاں ایک عجیب بات دیکھنے میں آئی۔ اُنھوں نے میری بات کو سنجیدہ ہی نہیں لیا۔ اول سُن کر سب ہنسنے لگے، جیسے مَیں نے اُن کے ساتھ اپنی مصیبت بیان نہیں کی تھی بلکہ دل لگی کی تھی۔ کسی پولیس افسر اور کار آمد آدمی سے بات کرنا تو ایک طرف، سب نے وہاں اپنے اپنے فلسفے، گاؤں میں سرمایہ کاری کا عمل، کمیون کے عدالتی نظام اور مارکس کے نظامِ معیشت کی طویل بحث کر کے یہ نتیجہ نکالا کہ اگر وہی سسٹم نافذ ہوتا تو چوری کی نوبت ہی نہ آتی۔ یہ چوری دراصل سرمایہ داری نظام کی سازش ہے اور ذخیرہ اندوزی کا شاخسانہ ہے اور آپ لوگ اُس میں ملوث تھے۔ یہ باتیں اُلٹا میرے لیے تضحیک کا باعث ہوئیں۔ میرے بار بار باور کرانے پر کہ یہ باتیں اب کرنے کی نہیں ہیں صرف مجھے آپ کی مدد درکار ہے، اُن میں سے ایک نے بھی اپنے مجوزہ تعلقات کو ظاہر نہ کیا بلکہ اُس ہوٹل سے اُٹھنے تک کی ہمت نہ کی۔ یہ بات میرے لیے انتہائی توہین کا باعث ثابت ہوئی اور مَیں وہاں کسی سے بھی سلام لیے بغیر اُٹھ کھڑا ہوا۔ مَیں نے کامریڈ ایچ اے کو انتہائی حقارت سے دیکھا جو ابھی بھی صرف اپنے لکھے ہوئے ایک مضمون کو سنانے کے چکروں میں بیٹھا تھا اور اِس انتظار میں تھا کہ مَیں اپنے انتہائی غیر اہم قضیے کو چھوڑوں اور اُس کا مضمون سننا شروع کروں جو اُس نے پاکستان کے جاگیرداری مسائل پر لکھا تھا۔ مَیں اپنے چچا کو کہیں اور بٹھا کر آیا تھا اور اب خدا کا لاکھ شکر تھا کہ وہ اِس صریح توہین میں میرے ساتھ نہیں تھا۔ مَیں چچا کو کیوں وہاں نہیں لایا تھا، شاید دل کے اندر یہ بات موجود تھی کہ اُن کا یہاں آنا خود اُن کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ کامریڈ کی بے چینی اور بے نیازی نے مجھے مشتعل کر دیا اور مَیں کسی طرح سے اُس تمام محفل کے اِس بُت کو اُن کے سامنے ٹھوکر مار کر توڑ دینا چاہتا تھا۔ مَیں انتہائی بدتمیزی سے اُٹھا اور بولا، کامریڈ تم ایک بے وقوف اور احمق آدمی ہو۔ دوسروں کے ٹکڑوں پر پلنے والے محض ایک کیڑے مکوڑے۔ مَیں لعنت بھیجتا ہوں تمھارے اِن چیتھڑا قسم کے مضامین اور فلسفوں پر جو کسی عام آدمی کے کام نہ آسکیں۔ میری آواز یہ الفاظ کہتے ہوئے اتنی بلند ہوئی کہ ہوٹل کا بیرا بھاگتا ہوا آ گیا۔ تمام محفل کو سانپ سونگھ گیا۔ اُن پر گویا سکتہ چھا گیا تھا۔ اتنے معزز انسان کو بے وقوف کہنے کی ایسی غیر متوقع حرکت کیسے وجود میں آ گئی۔ اُنھیں ایک دم بھول گیا کہ خود اُن کے نظریے کے مطابق دنیا کا کوئی شخص بھی معزز

نہیں ہے۔ ہر ایک پر جارحانہ تنقید کی جا سکتی ہے اور بڑے لوگوں پر تو اِس لیے بہت ہی جارحانہ تنقید ہونی چاہیے کہ اُن کی وجہ سے بڑے غلط قسم کے انقلابات نے جنم لیا ہے مگر عین اُس وقت جب خود اُن کی توہین ہوئی اُن کی آنکھیں باہر نکل آئیں اور منہ بالکل کھل گیا اور کافی دیر تک بند نہ ہوا۔ مجھے اُن کی اِس کیفیت پر ایک لمحے کے لیے ایسی بیکراں سرشاری نے باندھ لیا کہ مَیں اپنا غم بھول کر اُس کا مزا لینے لگا۔ پھر جب تک وہاں سے رخصت نہیں ہو گیا اُن کی خشک آنکھیں مردے کی طرح دیکھتی رہیں۔ یہ میرا وہاں آخری لمحہ تھا۔ اِس کے بعد میں نے کامریڈ کی شکل نہیں دیکھی اور سیدھا حاجی فطرس علی کے مطب پر آ گیا۔

(۳۲)

میرا خیال ہے مَیں حاجی فطرس علی کے بارے میں ابھی تک صحیح سے نہیں بتا سکا۔ حاجی صاحب سے میری بے حساب ملاقاتیں تھیں لیکن اُن سے رشتہ صرف علمی اور ادبی تھا۔ اِس عرصے میں مَیں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ کسی بھی قسم کی مدد کرنے میں ہچکچاہٹ کا شکار نہیں ہوتے تھے۔ تین سال پہلے ایوانِ حسین میں ایک جمعہ کی نماز کے بعد مجھے اِس کا اندازہ خوب ہوا تھا۔ مَیں اُن دِنوں باقاعدگی سے نمازِ جمعہ پڑھتا تھا اور اِس بات کا خواہشمند تھا کہ امام بارگاہ میں ایک لائبریری کو قائم کیا جائے جہاں مذہبی کتب کے علاوہ ادبی، تاریخی اور فلسفیانہ کتابوں کا اچھا ذخیرہ بھی موجود ہو۔ یہ تجویز دراصل میری ذاتی ہوسِ کتب بینی کی وجہ سے وجود میں آئی تھی اور وہاں بیٹھے حاجی فطرس علی نے اِس کی بھرپور تائید کی تھی۔ سب سے پہلے اپنی طرف سے 500 روپے کی امداد کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ مَیں اُن کے اِس عمل سے بہت متاثر ہوا۔ پھر ہم دونوں نے وہاں ایک لائبریری کا قیام کر دیا۔ اُس کا سب سے بڑا فائدہ مجھے حاجی فطرس علی کی دوستی کی شکل میں ملا۔ حاجی صاحب کا مطب جیسا کہ مَیں پہلے بتا چکا ہوں غوثیہ چوک سے دائیں طرف مُڑ کر پہلی گلی میں تھا اور یہ گلی گویا بازار جیسی کھلی تھی، جہاں سب سے پہلے اپنے والد کے ساتھ آیا تھا۔ یہ تمام گلی لکھنوی صفوی سادات کے مہاجروں سے بھری ہوئی تھی۔ گلی کے دونوں جانب نیم اور پیپلوں کے بڑے بڑے درخت تھے۔ پرانی طرز کے مکان تھے جن میں صراحیاں اور ڈاٹیں جڑی تھیں۔ حاجی فطرس علی کا مطب اِسی گلی کے آخری کونے پر تھا اور بالکل سامنے تھا۔ مطب

بہت کشادہ اور پُرہیبت تھا جیسے کسی نواب کی حویلی ہو۔ یہ صرف مطب نہیں تھا، شعر و ادب اور تاریخ و فلسفہ کا ایک جیتا جاگتا مکتب بھی تھا۔ حاجی صاحب نے اپنے مطب میں ہی ایک طرف ایک لائبریری قائم کر رکھی تھی۔ تمام گلی کے مکان دو منزلہ تھے اور نیم کے پیڑوں کی شاخوں سے ایسے ڈھکے ہوئے تھے کہ کسی بھی مکان پر چڑھنے کے لیے آسانی سے شاخ کا سہارا لیا جا سکتا تھا۔ حاجی صاحب کا مکان نہایت کشادہ، اونچا اور ٹھنڈا تھا۔ شدید گرمی کے دِنوں میں بھی اُن کے مطب میں داخل ہوں تو جسم کو ایک ٹھنڈک کا احساس جکڑ لیتا تھا۔ مَیں دن میں ایک بار ضرور اُن کے مطب میں جاتا اور اب تو وہ میرے گھر کی طرح کی جگہ بن گئی تھی۔ مطب کے سامنے ایک بڑا دالان تھا۔ اُس دالان کے ستونوں سے کمریں ٹکائے دو شاگرد پیشہ لڑکے کونڈوں میں طبابت کی جڑی بوٹیاں کوٹ رہے ہوتے۔ ایک طرف کونے میں شربت کی بوتلیں جمی تھیں۔ وہاں ایک آدمی بیٹھا شربت بنا بنا کر پلاتا جاتا۔ یہ شربت کئی قسم کا تھا۔ صندل، فالسہ، بکائن، ہریڑ، عک، ثمہ، اجوائن اور اللہ جانے کون کون سی جڑی بوٹیاں جنھیں منہ سے لگانے پر بھی کڑواہٹ سینے میں اُتری محسوس ہو، حاجی صاحب نے اُن سب کے شربت تیار کر دیے تھے۔ اُن مشروبات کی مٹھاس، خوشبو اور لذت سے مشابہ مَیں نے آج تک دوسرا شربت نہیں پیا۔ یہ شربت تمام شہر پینے آتا تھا اور بنا کر دینے والے کو ایک لمحہ فرصت نہ تھی۔ ایک شربت کا گلاس چھ آنے کا تھا۔ مطب کے دروازے موٹی شیشم کی لکڑی کے تھے اور بہت موٹے تختوں سے مل کر بنے تھے۔ یہ لکڑی ایک تو خود کالی سیاہ اور لوہے کی طرح سخت تھی، اُس پر کی گئی پالش نے اِسے مزید سیاہ اور پروقار بنا دیا تھا۔ مطب کے دروازے کے عین سامنے نیم کا اتنا بڑا درخت تھا کہ اُس کی عمر کم سے کم پانچ سو سال ہوگی۔ نیم کے اِس پیڑ کی شاخیں اتنی نیچے تک آئی ہوئی تھیں کہ بعض اوقات لوگوں کے چہرے سے ٹکرا جاتی تھیں۔ مجھے یہ جگہ ہمیشہ سحر میں لے لیتی کہ مَیں فقط یہاں بیٹھنے کا لطف لینے کے لیے ہی چلا آتا تھا۔ مطب کا کمرہ دالان در دالان پھیلا ہوا تھا اور اتنا وسیع تھا کہ اِس میں ایک وقت میں دو تین مجلسیں جمائی جا سکتی تھیں۔ مطب کے عین سرے پر اونچا علم لگا ہوا تھا۔ مَیں نے اکثر دیکھا کہ شہر کے سُنّی اور اہلِ حدیث عالم تک حاجی صاحب کی محفل میں بیٹھ کر محظوظ ہوتے۔ اُن کے تمام شہر سے ایک تو ذاتی تعلقات تھے کہ اُس میں شیعہ سُنّی کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ دوئم بات ایسی منطقی اور مدلل کرتے کہ مخالف کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہ ہوتا۔ مَیں نے اُنھیں مذہبی بحث یا اپنی بات پر اصرار کرتے کبھی نہیں دیکھا۔ مَیں جب بھی جاتا، کسی کتاب کی ورق گردانی میں مصروف ہوتے اور اِس میں تخصیص نہیں تھی کہ کون سی

کتاب پڑھی جائے۔ فلسفہ، منطق، ہیئت، فکشن، شاعری حتیٰ کہ سائنس کی جدید کتابوں کا بھی اچھا خاصا سٹاک اپنی اِس ذاتی لائبریری میں اکٹھا کر رکھا تھا۔ اِنہی کتابوں میں سے جو مناسب سمجھتے، مجھے پڑھنے کی تلقین کرتے۔ مَیں اور کیا چاہتا تھا؟ لیکن مَیں نے یہ سب کچھ کامریڈ بھائیوں سے الگ رکھا ہوا تھا۔ مَیں نے کبھی اُن کے سامنے حاجی فطرس علی کے بارے میں بات نہیں کی۔ مَیں جانتا تھا جیسے ہی کچھ بات کروں گا یہ لوگ مذاق اڑائیں گے اور حاجی صاحب سے اِن کا مذاق مَیں گوارا نہیں کر سکتا تھا، کیونکہ مَیں نے کبھی بھی حاجی فطرس علی کو کسی جاہل ترین شخص کا بھی مذاق اڑاتے نہیں دیکھا تھا۔

مَیں اکثر اُن کے مطب پر عصر کے بعد آتا، یہ وہ وقت ہوتا تھا جب وہ قیلولے سے اُٹھ کر اور نماز پڑھ کر آ چکے ہوتے تھے۔ یہی وقت اُن کی زیادہ فرصت کا ہوتا تھا۔ مریضوں کو دیکھنے کے لیے وہ فجر کی نماز کے بعد یہاں بیٹھتے اور ظہر تک مسلسل بیٹھے رہتے۔ مریض آ گیا تو اُسے دیکھ لیا ورنہ کتاب میں غرق ہو لیے۔ حاجی فطرس علی نے میرے لیے ایک اور سہولت بھی مہیا کر دی تھی کہ جب چاہوں اُن کے ملازم سے کہہ کر چائے شربت منگوا سکتا تھا اور جو کتاب چاہوں وہاں سے اُٹھا کر لے جاؤں اور پڑھ کر واپس رکھ دوں۔ مجھے اِس میں ذرا انکار نہیں کہ اُن کی صحبت اور اخلاق کی پائنداری نے ہی اصل میں دوبارہ مذہب کی طرف راغب رکھا اور یہی اخلاقی گراوٹ اور تمسخر تھا جس نے مجھے کامریڈوں کی اگر کوئی سنجیدہ بات بھی تھی تو اُس کی حیثیت کو میرے سامنے ختم کر دیا تھا۔

اِن باتوں کے علاوہ ایک اور بات جو مجھے حاجی فطرس کے نزدیک کرنے میں زیادہ کارآمد ثابت ہوئی کہ میرے والد کے پردیس کے دِنوں میں میری دادی اور دوسرے رشتہ داروں کی چھوٹی موٹی بیماریوں کا تمام علاج نہایت کم پیسوں میں اِسی مطب سے ہوتا رہا تھا بلکہ ہمارے گاؤں کے کچھ ایسے غریب لوگ بھی جنھیں پیسے روپے کی بہت تنگی تھی، اِسی مطب کے سہارے پر بیماری سے تندرست ہوتے تھے۔ مجھے حاجی صاحب سے باتیں کر کے ایک طرح سے ذہنی آسودگی اور طمانیت کا احساس ہوتا تھا۔ اُنہوں نے مجھے کبھی نماز روزے کی پابندی کی تلقین نہیں کی شاید وہ سوچتے ہوں کہ اِن باتوں سے کہیں مَیں اپنا رُخ تبدیل ہی نہ کر لوں۔

حاجی صاحب مجھے دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ شاید اس وجہ سے کہ میرے ساتھ چچا جان بھی تھے۔ اُنھوں نے ہمیں سامنے پڑی دو چوکیوں پر بٹھا دیا۔ میرے لیے یہ عجیب موقع تھا۔ مَیں نے آج تک حاجی صاحب سے ذاتی کوئی بات نہیں کی تھی مگر آج بالکل ذاتی نوعیت کا مسئلہ

بیان کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ ابھی دو منٹ ہی بیٹھے گزرے تھے کہ حاجی صاحب نے اپنے شاگرد سے کہا، جعفر ذرا دو چائے کہہ دو جلدی سے۔ جعفر فوراً اپنی چوکی سے اٹھا اور چائے کہنے کے لیے سامنے والے چھجے پر جا پہنچا۔ اُس کے بعد حاجی فطرس علی ہم سے مخاطب ہوئے، ضامن مجھے آپ کے گھر کی چوری پر بہت افسوس ہوا ہے۔ تمھارے آنے سے کچھ دیر پہلے مَیں نے غضنفر نقوی کو اطلاع دی تھی۔ اُس نے تھانہ صدر میں ایک تھانے دار سے بات کی ہے۔ تمھیں اگر کسی پہ شک ہے تو اس پر پرچہ کٹوا لیتے ہیں مگر یہ ہے کہ کوئی ناجائز نہ پھنس جائے۔

مَیں حاجی صاحب کی بات سُن کر حیران ہوا اور ایک گونا تسکین بھی ہوئی، چلو کام ہو یا نہ ہو چچا جان کے سامنے عزت رہ گئی۔ اتنے میں چائے آ گئی۔ ہم دونوں چائے پینے لگے۔ مَیں نے چائے پینے کے دوران کہا، حاجی صاحب بات یہ ہے، ہمیں دو لوگوں پر شک ہے اور میری دادی کو تو یقین ہے لیکن اُن پر صرف پرچہ کٹوانے سے بات بننا مشکل ہے۔ اصل مسئلہ مال کی برآمدگی ہے۔

حاجی فطرس علی نے میری طرف اور چچا کی طرف غور سے دیکھا اور بولے، ضامن شاید تمھیں خبر نہیں اِس مطب کی دو بار چوری ہو چکی ہے۔ پولیس کے بڑے افسر سے لے کر ہر طرف سے کوشش ہوئی۔ چوروں کا بھی عین الیقین تھا مگر چوروں سے مال نہیں نکل سکا۔ مسئلہ بھلا کیا تھا؟ تفتیشی افسر چوروں سے مل گیا تھا۔ جس قدر یہ تفتیشی افسر شیطان عملہ ہوتا ہے اِس کا تصور ہم نہیں کر سکتے۔ پولیس افسر تو کوئی نیک نام ہو سکتا ہے، تفتیشی افسر نہیں ہو سکتا۔ مسئلہ یہ ہے کہ اُسے جس قدر مجرموں سے واسطہ پڑتا ہے، رفتہ رفتہ اُن کی صحبت میں خود مجرم بن جاتا ہے۔ ہاں اگر آپ کی قسمت میں کوئی نیا اور ایماندار تفتیشی آ جائے تو کچھ ہو سکتا ہے باقی اللہ وارث ہے اور اللہ نے سب کام بندوں کو سونپ دیے ہیں۔

حاجی صاحب، تھانے کب چلیں پھر؟ مَیں نے اتنے میں اپنی چائے کی پیالی ختم کر لی تھی۔

ابھی تھوڑی دیر میں نقوی صاحب اور اُن کے دوست حبیب اللہ آتے ہیں۔ آپ اُنھی کے ساتھ جائیں گے۔

ابھی ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ سید غضنفر نقوی صاحب تشریف لے آئے۔ اُن کے ساتھ اُن کے دوست حبیب اللہ بھی تھے۔ حبیب اللہ اہل حدیث مسلک سے تعلق رکھتے تھے مگر صلح کل کے داعی تھے اور سید غضنفر نقوی کے شب و روز کے ساتھی تھے۔ جیسے ہی وہ دونوں آئے مَیں نے اور چچا جان نے چوری کی تمام صورتِ حال اُن کے گوش گزار کی۔ یہ دونوں دن رات کے تھانہ کچہری کے شاہد

تھے۔ دونوں کی یہی صلاح ٹھہری چوری کی رپورٹ تو درج کرادی جائے مگر لوگوں کو نامزد نہ کیا جائے۔ اُس کی وجہ اُنھوں نے یہ بتائی، اِس میں دو خرابیاں ہیں۔ بالفرض نامزد کیے گئے لوگ حقیقی چور نہ ہوئے تو خواہ مخواہ کی گاؤں میں ایک اور دشمنی بن جائے گی۔ اگر وہ چور ہوئے اور تفتیشی افسر اور پولیس نے تعاون نہ کیا تو تمام مدعا ہی غائب ہو جائے گا۔ پھر کل کلاں اُن کے ہاں چوری کا ثبوت ملتا بھی ہے تو کیس نہیں بنے گا۔ بہتر یہی ہے کچھ دن ٹھہر کر لوگوں کو نامزد کرلیا جائے۔

سہ پہر کے وقت ہم چاروں تھانے گئے، وہاں رپورٹ درج کرائی اور واپس چلے آئے۔ اُسی دن شام کو پولیس نے جا کر موقع واردات دیکھا، جگہ کا نقشہ بنایا۔ میری والدہ اور ارد گرد کے لوگوں سے چند سوالات کیے، اُس کے بعد مشکوک لوگوں کے نام لکھے اور واپس چلی آئی۔ آنے جانے کا خرچہ پولیس نے ہم سے وصول کیا۔ یہ تمام کام پولیس نے گویا ہم پر احسان کے طور پر کیا کہ ہمارے جاننے والوں کی مروت نے اُنھیں مجبور کر دیا تھا۔ مَیں نے اتنی کارروائی پر بھی خدا کا شکر کیا۔ اگر سرے سے پولیس ہی گاؤں میں نہ آتی اور چوری کے موقع واردات کی رپورٹ بھی درج نہ کرتی تو ہم کیا کر سکتے تھے۔ سچ تو یہ ہے مَیں اس کارروائی کے علاوہ پولیس سے اور کوئی توقع بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔

(۳۳)

ڈاکٹر فرح کو گاؤں سے گئے ہوئے دو سال ہو گئے تھے۔ اُس کے جانے کے بعد پھر کوئی نیا ڈاکٹر نہیں آیا۔ ڈسپنسری اب مکمل ویران ہو چکی تھی۔ درختوں کی شاخیں سوکھتی جا رہی تھیں۔ پھولوں کی کیاریاں اور سبزیوں کی کھیتیاں ختم ہو گئی تھیں۔ اُن کی جگہ گھاس پھوس اور جھاڑیوں نے لے لی۔ جنوبی اور شمالی طرف کے پھاٹکوں کی پھٹیاں ٹوٹ کر اُن میں خلا پیدا ہو گئے۔ یہ خلا ایک طرح سے کھلی کھڑکیاں تھیں جن سے بکریاں اور آوارہ کتے ڈسپنسری میں داخل ہونے شروع ہو گئے۔ بکریوں نے پہلے تمام پھولوں کی کیاریاں تباہ کیں اُس کے بعد بے کار اُگنے والی جھاڑیوں میں پھرنے لگیں۔ انھی جھاڑیوں میں بلیوں نے بچے دینے شروع کر دیے اور کتے سرِ عام پوری ڈسپنسری کے اندر بھونکنے شروع ہو گئے۔ بعض اوقات یہ کتے ڈسپنسری کے کمروں میں بھی گھس جاتے۔ ڈسپنسری میں اب نہ پانی کا چھڑکاؤ ہوتا تھا، نہ چوکیدار جھاڑو دیتا۔ اِس کی وجہ سے تمام صحن گرد و غبار سے بھر گیا۔ اتنی دُھول جمع ہو گئی کہ ایک ٹرالی بھری جا سکتی تھی۔ چوکیدار اب اکثر غائب رہتا تھا۔ نہ شہر سے کوئی افسر اِس کا آڈٹ کرنے آتا تھا۔ عدیلہ بھی کوئی توجہ نہیں دیتی تھی۔ وہ صرف اُس مریض کو دیکھتی جو نزلے بخار کا معمولی مریض ہوتا، باقیوں کو شہر کے ہسپتال کا حکم سنا کر اپنے گھر بیٹھ جاتی۔ ڈاکٹر فرح کے جانے کے بعد لوگ شہر کے ہسپتال ہی کا رُخ کرنے لگے تھے۔ عدیلہ بھی کچھ دِنوں میں ریٹائر ہونے والی تھی۔ عدیلہ کا نواسا ڈسپنسری میں ایک طرح کا ڈاکو بن چکا تھا۔ اُس نے کئی درخت کاٹ دیے اور ڈاکٹر کی کوٹھی میں منتقل

ڈیرہ جمالیا۔ وہاں اپنے دوستوں کے ساتھ شراب پینے لگا اور تاش کا جوا کھیلنے لگا۔ درخت کاٹ کر بیچنے لگا۔ گاؤں کے اُن لفنگوں سے ناتے لگا لیے جن کی ذاتی حیثیت ذرا مضبوط تھی۔ اکثر مریضوں کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آتا تھا۔ اُس کی بدتمیزی پر اگر کوئی احتجاج کرتا تو اُس کے دوست یار امداد کو دوڑے آتے اور ایک طرح سے مریضوں کے ورثا کی مار پیٹ شروع کر دیتے۔ معیذ ایک طرح سے ڈسپنسری کی جونک بن گیا کہ ہر شے چوسنے لگا تھا۔ ڈسپنسری میں آنے والی دوائیاں سرِ عام بیچ دیتا۔ میز کرسیاں، حتیٰ کہ سٹیل کی ٹرے اور قینچیاں تک بیچ ڈالیں۔ عدیلہ کو مارنے پیٹنے کی خبریں بھی آنے لگی تھیں۔ مَیں نے اُس دن سے اُن میں مکمل دلچسپی چھوڑ دی تھی جس دن میری نہر پر سرِ عام جوابازوں کے ہاتھوں پٹائی ہوئی تھی۔

اِدھر ہمارے گھر میں چوری ہوئے چار مہینے ہو چکے تھے۔ ہمیں تو ایک طرف پورے گاؤں کو چوروں کی خبر تھی مگر پولیس نے حاجی فطرس اور غضنفر نقوی سمیت شہر کے کئی معزز لوگوں کی سفارش پر ایف آئی آر کاٹنے کے باوجود چوروں کے خلاف ایک انچ بھی کارروائی نہیں کی تھی۔ اِس چوری میں معیذ اور اُس کے دوستوں کا حصہ تھا۔ عدیلہ کو بھی تمام بات کی خبر تھی مگر وہ اپنے نواسے کے سامنے بے بس تھی اور میری ماں نے اُس سے اپنے تعلقات مکمل ختم کر لیے تھے۔ والدہ اُن آوازوں کو اکثر سُنتی تھی جو عدیلہ اور اُس کے نواسے کے درمیان گالی گلوچ کے نتیجے میں ہمارے گھر تک پہنچتی تھیں۔ معیذ نے ایک طرح سے عدیلہ کو یرغمال بنا لیا تھا۔ ایک دو بار اُس نے تھانے میں جا کر معیذ کی شکایت بھی درج کروائی مگر تھانے والے اُلٹا معیذ کے یار دوست بن گئے۔ اُنھوں نے عدیلہ کی ایک درخواست پر بھی توجہ نہیں دی۔ میری حالت یہ تھی کہ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ اکیلے معیذ سے تو دس بار نمٹ لیتا مگر اُس کے لفنگے دوستوں سے لڑنے کے قابل نہیں تھا۔ ایک بار میری صلاح بھی ٹھہری کہ کالج سے مختلف تنظیمی دوستوں کو لے جا کر ایک بار اُن کی اچھی طرح دھلائی کروا دوں مگر یہ سوچ کر کہ کالج کے دوست تو حساب چکتا کر کے چلے جائیں گے لیکن مَیں نے اِسی گاؤں میں رہنا ہے۔ کل کلاں اِنھوں نے کوئی بڑا نقصان کر دیا تو کہاں جاؤں گا اور یہ معیذ نہ اِس کا کوئی گھر نہ بار۔ ایک بے نام ونشان لڑکا ہے۔ کوئی اسے کہاں تلاش کرے گا۔ اِدھر معیذ کے وہی دوست تھے جو اکثر ایسے کاموں میں ملوث تھے اور اُن کے بڑے بھی کرتے آئے تھے۔ آپ کہہ سکتے ہیں چوری اُن کا خاندانی پیشہ تھا۔ اِدھر میرے جن لوگوں سے تعلقات تھے اُن کا تھانے کچہری اور عدالت سے کوئی تعلق نہیں تھا اور چوری کرنے والوں کی

ہر لحاظ سے ہماری نسبت بہتر اپروچ تھی۔ مجھے تھانوں اور پولیس کے لوگوں سے گھن آنے لگی۔ یہ تمام لوگ عادات واطوار سے اتنے کریہہ تھے کہ مَیں اِن کا سامنا کرنے سے ڈرتا تھا۔ جرائم پیشہ افراد کے لیے اِن کے دل میں کیونکر نرم گوشہ تھا۔ اُس کی ایک وجہ جو مجھے نظر آئی وہ اُن کے مستقل گاہک تھے جبکہ ہم لوگ فقط پہلی بار پولیس اور عدالت کی دکانوں میں گئے تھے اور سودا بھی مفت چاہتے تھے۔ شروع میں ہمیں انصاف کی خریداری کے طریقہ کار کی خبر نہ ہو سکی۔ جب خبر ہوئی تو ہمارا کیس خراب ہو چکا تھا۔ تھانیدار، وکیل، جج، منشی درخواست ٹائپسٹ تمام نے کچھ ایسے طریقے سے ہمارے معاملے میں حق تلفی کی کہ ہمیں زچ کر کے رکھ دیا۔ اتنے میں میرے والد کو خبر ہو چکی تھی کہ جو کچھ اُنہوں نے کمایا تھا وہ ختم ہو گیا ہے اور گھر میں لگائی گئی وہ اینٹیں رہ گئی ہیں جن سے وہ آ کر بخوشی اپنا سر ٹکرا سکتے تھے۔ وہ ایسے بددل ہوئے کچھ ہی عرصے بعد کام چھوڑ کر گھر آ گئے۔ اُنھوں نے واپس آ کر خود بہت تگ و دو کی۔ پہلے کئی مہینے پولیس کے مکرر چکر لگا کر اور پیسے ضائع کر کے اور منہ کی کھانے کے بعد ارد گرد کے گاؤں کے بڑے لوگوں کی پنچائتیں بلا کر کوششیں کیں مگر سب بے سود تھا۔ پنچایت نے چوروں کا ساتھ دیا اور آخر میں اِس بات پر فیصلہ دیا کہ اگر اُنھوں نے یہ چوری نہیں کی تو مسجد میں جا کر قرآن سر پر رکھیں اور قسم اُٹھا دیں۔ میرے بھولے بھالے والد صاحب اِس بات کو اپنی فتح سمجھنے لگے اور چوروں نے بڑی آسانی سے قرآن اُٹھا کر معاملہ صاف کر دیا۔ مَیں جانتا تھا والد صاحب اب اِس کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ اِس لیے اپنی خجالت مٹانے کو اُنھوں نے یہ قدم اُٹھایا ہے۔

جب چوروں نے قسم اُٹھا دی اور کچھ بھی ہاتھ نہیں آیا تو اب اُن کا تمام غصہ مجھ پر نکلنے لگا۔ بات بات پر مجھے جھڑکتے اور بُرا بھلا کہتے۔ میرے لیے یہ اذیت ناک لمحے تھے۔ میری گریجوایشن ہو چکی تھی۔ ہر جگہ درخواست دیتا تھا مگر کہیں سبب نوکری کا نہ تھا۔ ایک رات والد صاحب میرے ساتھ جھگڑنے لگے کہ میرا کمایا ہوا بچا بھی نہیں پایا اور اب گھر میں بیٹھ کر کھانے کے سوا کچھ نہیں کرتا۔ اگر بڑی نہیں تو چھوٹی موٹی نوکری ہی کر لوں۔ مَیں دل میں اُن کی باتوں کو سمجھ رہا تھا لیکن میرے لیے کوئی سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ یہ رات کے دس کا عالم ہو گا۔ مَیں غصے سے ایک دم اُٹھا اور باہر نکل گیا۔ سڑک ویران تھی۔ سامنے کی ڈسپنسری میں مکمل سناٹا تھا۔ مَیں ڈسپنسری کی دیوار کے ساتھ ساتھ سڑک پر چل رہا تھا کہ عدیلہ کے کوارٹروں سے ایک دم گالی گلوچ اور شور کی آواز آنے لگی۔ مَیں نے یقین کر لیا معیذ پھر عدیلہ کو مار رہا ہے اور وہ اُسے گالیاں دے رہی ہے۔ مَیں پہلے ہی غصے میں تھا۔ اِس وقت اِس شور نے جلتی پر

تیل کا کام کیا۔ میرا جی چاہا فوراً اندر داخل ہو کر معیذ کو پکڑ لوں۔ مَیں ڈسپنسری کے گیٹ کو عبور کر کے عدیلہ کے گھر کی طرف بڑھا اور اُسی وقت ایک زوردار دھماکے کی آواز آئی۔ یہ کاربین کا فائر تھا۔ اِس کے ساتھ ہی ایک چیخ بلند ہوئی اور دروازہ دھڑک سے کھل گیا۔ مَیں دروازے کے ایک طرف تھا۔ دروازہ کھلتے ہی معیذ باہر کی طرف بھاگا اور اُسی وقت مَیں نے اُسے دبوچ لیا۔ اُس کے ہاتھ میں کاربین تھی لیکن کاربین کا مسئلہ یہ ہے کہ اُس سے ایک فائر کرنے کے بعد جلدی سے دوسرا فائر نہیں کیا جا سکتا اور خطرناکی اُس کی یہ ہے کہ اُس کا فائر لگنے سے جان بچنے کا موقع کم ہی ہوتا ہے۔ یہ کاربین ہمارے گاؤں کے اُسی لوہار کے ہاتھوں کی بنی ہوئی تھی جو شراب اور جوئے میں معیذ کے ساتھ شامل بھی ہوتا تھا اور اِس طرح کا اسلحہ بنانے کی صلاحیت بھی رکھتا تھا۔ اِس کاربین میں ایک کارتوس پڑتا تھا اور جب کارتوس چل جاتا تو نیا کارتوس ڈالنے کے لیے اُس میں کافی محنت کرنا پڑتی تھی کہ پہلے کارتوس کا کھوکھا نکالنا بہت مشکل ہوتا تھا۔ معیذ کو اندازہ نہیں تھا کہ یوں ایک دم اُس کے دروازے پر کوئی آدمی آ کر کھڑا ہو جائے گا اور اُسے دبوچ لے گا۔ معیذ نے اپنے آپ کو چھڑانے اور بھاگنے کی بہت کوشش کی مگر مَیں نے اُسے نہیں چھوڑا۔ اِس دھماکے کا اتنا شور اپیدا ہوا کہ اردگرد کے لوگ بھاگ کر جمع ہونے لگے۔ اِسی دوران مجھ میں اور معیذ میں دھینگا مشتی جاری رہی۔ اُس نے مجھے اُسی کاربین سے ضربیں مارنے کی کوشش کی مگر ایک دو ضربوں کے علاوہ نہیں مار سکا۔ طبعی طور پر مَیں اُس سے زیادہ طاقتور تھا۔ اِسی اثنا میں لوگ وہاں پہنچ گئے۔ اُن میں وہی آصف سب سے پہلے پہنچا، جب اُس نے مجھے اور معیذ کو آپس میں اُلجھتے دیکھا تو چھڑانے کی کوشش کی لیکن مَیں نے اُسے جلدی سے سمجھایا کہ اِس نے عدیلہ یا اُس کے خاوند کو فائر مارا ہے لہٰذا پکڑنے میں میری مدد کرے۔ اُنھوں نے معیذ کو پکڑ لیا۔ اتنے میں میرا چچا اور والد بھی وہیں آ گئے۔ جب معیذ کو قابو کر لیا گیا تو عدیلہ کے گھر میں داخل ہو گئے۔ دیکھا تو سامنے عدیلہ زمین پر پڑی تھی۔ کارتوس کے تمام دانے اُس کے سینے میں داخل ہو چکے تھے اور وہ پوری طرح مر چکی تھی۔ اُس کی لاش ایسے زمین پر پڑی تھی جیسے موٹا تازہ کیلے کا درخت بکھرا پڑا ہو۔ بالآخر اُس کا سفر ختم ہو گیا تھا۔ لاش دیکھ کر مجھے شدت سے رونا آیا لیکن مَیں دُور ہٹ گیا۔ پالے ہوئے سانپ نے کتنی بے دردی سے اُسے ڈنک مارا تھا کہ تریاق کا ذرا سا موقع نہیں دیا۔ عدیلہ کے اردگرد چند نوٹ بکھرے پڑے تھے جنھیں معیذ چھین کر لے جانے کی کوشش میں تھا اور وہ اُنھیں نہیں دے رہی تھی۔ شاید لڑائی کی وجہ اور بھی ہو لیکن وہاں بکھرے ہوئے نوٹوں سے یہی بات عیاں تھی۔ معیذ نے اُسے

غصے میں آ کر مارا اور اِس میں کوئی منصوبہ بندی نہیں کی گئی تھی۔ معیز سے دھینگا مشتی کرتے ہوئے میری سانس پھول گئی تھی۔ اب میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ اگرچہ معیز کے ہاتھ سے کاربین برآمد ہو چکی تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ اِس کے قتل کا اِس وقت میں اکیلا گواہ ہوں۔ لوگوں نے معیز کو ہاتھ پاؤں باندھ کر بٹھا دیا اور پولیس کو اطلاع کرنے کے لیے ایک آدمی بھیج دیا گیا۔ اتنے میں ایک آدمی کی توجہ عدیلہ کے خاوند کی طرف گئی۔ وہ برآمدے میں اُلٹا لیٹا تھا۔ نزدیک ہو کر دیکھا تو اُس کے ہاتھ پاؤں بندھے تھے اور منہ میں کپڑا ٹھنسا تھا۔ منہ سے کپڑا نکالا گیا مگر اُس سے اُسے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ اُس کی سانس بند تھی اور وہ مکمل مر چکا تھا۔ معیز نے اُس کی مزاحمت پہلے ہی ختم کر دی تھی۔

(۳۴)

مَیں رات دو بجے گھر آیا اور سیدھا اپنے کمرے میں جا کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ مَیں نے اندر سے دروازہ بند کرلیا۔ یہ میرے لیے انتہائی اذیت کی رات تھی۔ مجھے اتنا تو اندازہ تھا کہ عدیلہ معیذ کے ہاتھوں نہایت پریشان ہے لیکن وہ اُسے جان سے مار دے گا، اِس کی توقع نہیں تھی۔ انسان بعض اوقات ایک بے ڈھنگی سی اَنا کی خاطر ایسی بدصورت بے نیازی سے کام لیتا ہے کہ پھر اُس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ضیاع کا پچھتاوا عمر بھر کی ملامت بن جاتا ہے۔ مجھے ہرگز عدیلہ کو تنہا نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ اگر مَیں اُس دن اپنی شکست کی اَنا کو انسانیت کے رہن رکھ دیتا تو شاید آج اتنا بڑا حادثہ پیش نہ آتا۔ عدیلہ ایک عورت کا نام نہیں تھا، وہ ذلت، رسوائی اور کرب کی ایسی تصویر تھی جس کے بعد اطمینان کی گنجائش نہیں بچتی۔ اُسے بانجھ کوکھ والی عورت کا طعنہ نہیں دیا جا سکتا مگر کیا اُس کے بطن سے پیدا ہونے والی اولاد کو اُس کی اولاد کہا جا سکتا تھا؟ میرے لیے یہ ایک سوالیہ حقیقت تھی۔ خدا زینت اور معیذ پر لعنت بھیجنے میں دیر کر سکتا تھا مگر خود لعنت اپنے وجود میں کسی وسیلے کی محتاج نہیں تھی۔ عدیلہ مر چکی تھی مگر کیا وہ آج مری تھی؟ میرے خیال میں اگر موت کی کوئی ارتقائی شکل تھی تو وہ عدیلہ کی موت تھی جو عماد کے اغوا سے شروع ہو کر اُس تک پہنچی تھی۔ مَیں اچھی طرح جانتا تھا عدیلہ مشکل میں تھی مگر مجھے کا مریڈوں سے گپ بازی اور دوستوں کے درمیان بیٹھ کر قہقہوں سے کب فرصت تھی کہ اُس کے سینے میں لگنے والے بے شمار تیروں میں سے کسی ایک کو باہر نکال دیتا۔

مَیں جانتا تھا معیذ اُس کی جمع پونجی تیزی سے سمیٹ رہا تھا۔ اُس نے عدیلہ کے گھر کے برتن تک بیچ دیے تھے۔ جوا اور شراب اُس کی نسوں میں اُتر چکا تھا۔ وہ اِن دو علتوں کے سبب کسی بھی حد تک جا سکتا تھا اور اُس کے ساتھ ڈسپنسری کی بربادی کر رہا تھا۔ عدیلہ ڈسپنسری کو اپنے گھر کی طرح سمجھتی تھی۔ اُسے برباد ہوتا دیکھ کر کڑھتی تھی لیکن کچھ بھی کرنے پر قادر نہیں تھی اور آج کے بعد تو بالکل ہی بے خبر ہو گئی تھی۔ میری ماں نے مجھے بتایا تھا وہ صرف تین دن پہلے ہمارے گھر آئی تھی اور تھوڑی دیر بیٹھ کر چلی گئی تھی۔ میری ماں نے کہا تھا عدیلہ کے بقول وہ میرا سامنا کرنے سے گریز کرتی تھی۔ ہر چند میری والدہ اور دادی نے اُس کے وہ گناہ معاف کر دیے تھے جن کا بار اُس کے کاندھوں پر آ پڑا تھا جب معیذ نے جوابازوں کے ساتھ مل کر میری پٹائی کی تھی۔ ہم سب کو معلوم تھا اُس کے یہ وہ گناہ ہیں جن کے لیے اُس نے ذرا بھی محنت نہیں کی تھی نہ اُس محنت کا پھل میٹھا تھا۔ وہ حلق میں پھنس جانے والے تلخ پھل صرف معیذ کی نانی ہونے کے سبب اُس کی جھولی میں آ گرے تھے۔ یہ معیذ جسے عدیلہ لاکھ جبر کا عنایت کردہ رشتہ کہے مگر دنیا عدیلہ کے اِس عذر کو نہیں مان سکتی تھی کہ وہ اُس کا نواسہ نہیں ہے۔ میری ماں بھی کیوں مان لیتی کہ وہ اُس کی بیٹی کا بیٹا نہیں بلکہ اُس کی بیٹی کے جبریہ مولوی خاوند کا بیٹا ہے۔

مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ مَیں سونے کی کوشش کرتا تھا لیکن جب آنکھیں بند کرتا عدیلہ کی شکل میری آنکھوں میں گھس جاتی۔ موت کے بعد یہ دوسری لاش تھی جس نے میری آنکھیں نوچ لی تھیں۔ پہلی لاش اس کے بیٹے عماد کی تھی۔ عدیلہ ایک ترتیب سے میرے سامنے آ رہی تھی۔ پہلے پہل پیار اور شفقت کا نمونہ بنی ہوئی، پھر مریضوں کو دیکھتی اور اُنھیں دوا دارو دیتی ہوئی، پھر ہمارے گھر آتی ہوئی اور میری ماں سے رو رو کر باتیں کرتی ہوئی۔ اپنے بیٹے عماد پر بَین کرتی ہوئی، اُس کے بعد نہایت دردناک آواز میں چیخیں مارتی ہوئی۔ مَیں اُس کی اِس آخری کیفیت پر کانپ جاتا اور اُٹھ کر بیٹھ جاتا۔ اِسی عالم میں صبح کے چار بجے مجھے نیند آ گئی مگر اُس میں بُری طرح سے عدیلہ کے خواب آنے لگے۔ اِس میں وہ زینی کے ساتھ کبھی جھگڑتی نظر آ رہی تھی اور کبھی اُسے گلے سے لگا کر روتی نظر آ رہی تھی۔

صبح سات بجے دوبارہ دادی کے اُٹھانے پر میری آنکھ کھُل گئی۔ نیند ابھی تک آنکھوں میں تھی۔ مجھے لگا مَیں ایک پل بھی نہیں سویا تھا۔ جب بھی گھر میں ہوتا صبح کی نماز ضرور پڑھتا۔ آج نماز بھی نکل گئی۔ نہ ہی دادی نے مجھے جگایا۔ اُسے لگا آج کی میری نیند نماز سے زیادہ ضروری ہے۔ مَیں ہاتھ منہ دھو کر چولہے پر آ بیٹھا۔ تمام گھر خاموش تھا۔ دادی اماں، میرا چھوٹا بھائی، میری والدہ اور والد تمام ایسے

چُپ تھے جیسے اُن کی عزیزہ کا جنازہ نکل رہا ہو۔ مجھے نہیں معلوم، عدیلہ کی لاش پولیس کے لوگ کہاں لے گئے تھے۔ اُس کا جنازہ اور کفن دفن کہاں ہونا تھا۔ نہ مَیں اِن معاملات میں شریک ہونا چاہتا تھا۔ مَیں تو اب اپنے سامنے والے بازار کی طرف سے باہر بھی نہیں نکلنا چاہتا تھا۔ ہم سب نے خموشی سے ناشتا کیا پھر میرا والد باہر نکل گیا۔ مَیں جانتا تھا وہ عدیلہ کے کفن دفن میں شرکت کریں گے بلکہ وہی اُس کی تجہیز کی ذمہ داری لیں گے۔ یہ بات میرے لیے اطمینان بخش تھی۔ ایک مصیبت زدہ شخص کی اگر اُس کی موت کے بعد تجہیز و تکفین عمدگی سے ہو جائے اور قبر کا نشان متواتر بن جائے تو مرنے والا پرسکون ہو جاتا ہے۔
اُس دن مَیں اپنے گھر سے ایک قدم باہر نہیں نکلا۔ میرے والد اور چھوٹا بھائی البتہ تمام دن عدیلہ کی تجہیز و تکفین میں شامل رہے۔ اُنھوں نے اُس کی لاش پوسٹ مارٹم کے بعد وصول کی۔ اُس کا جنازہ پڑھایا اور ہمارے گاؤں کے قبرستان میں دفن کر دیا۔ یہ کام شام کی سُرمگیں سے ذرا پہلے انجام پذیر ہوا۔ اِس عرصے میں عدیلہ کی دو بڑی بیٹیاں اور اُس کے داماد آ چکے تھے۔ اُنھوں نے رو رو کر آسمان سر پر اُٹھایا تھا۔ پھر دوسرا اور تیسرا دن بھی گزر گیا۔ تیسرے دن عدیلہ کے قُل پڑھے گئے۔ یہ قل ہمارے گاؤں کی جامع مسجد میں پڑھے۔ اِس میں عدیلہ کی بیٹیوں نے شرکت بھی کی اور اپنی ماں کے حق میں بہت سی دعائیں اور تین سے چار بار تمام قرآنِ پاک کی قرأت کا ثواب پہنچایا۔ مولوی صاحب نے عدیلہ پر تمام پڑھی گئی دعائیں، سورہ یٰسین اور قرآن کا ثواب دہرا دہرا کر اللہ کو یاد دلایا کہ وہ اُس سب کا ثواب عدیلہ تک پہنچائے اور اُن کے عوض اُس کے ظاہری اور باطنی گناہ معاف کرے۔ قُل ختم ہونے پر عدیلہ کی بیٹیوں نے مولوی صاحب کو ایک جوڑا سوٹ، ایک پگڑی اور اُس کا رکھا ہوا سو روپے کا لال نوٹ ہدیہ کیا، جسے اُس نے بخوشی قبول کر لیا۔

مجھے بہت اُمید تھی اِس موت کی اطلاع کسی طرح زینی کو ہو گی اور وہ اپنی ماں کے جنازے یا قُل فاتحہ پر آئے گی مگر وہ نہیں آئی۔ اُسے شاید اطلاع نہیں مل سکی تھی۔ اِس کا مطلب تھا ابھی تک عدیلہ کے خاندان کے کسی فرد کو بھی زینی کے بارے میں علم نہیں تھا وہ کہاں ہے۔ یہ ایک عجیب بات تھی مگر بہر حال تھی۔ مجھے پہلے دن عدیلہ کی موت کے وقت ایک عظیم دُکھ کے ساتھ جو ہلکی سی مسرت کا احساس تھا کہ اِس بہانے زینی کا چہرہ دیکھ لوں گا۔ وہ جب اپنے بچوں کے ساتھ یہاں آئے گی تو کیسا عجیب سا احساس ہو گا، وہ اُمید اب مکمل مایوسی میں بدل گئی۔ جب وہ نہیں آئی تو مَیں نے اپنے آپ کو ملامت کی کہ مَیں کس قدر کمینہ پن کی مسرت سے ہمکنار ہونے کا سوچ رہا تھا۔ مَیں نے اندازہ لگا لیا کہ اب زینی

سے شاید قیامت تک ملاقات نہیں ہو پائے گی۔

چوتھے دن ڈسپنسری مکمل ویران ہو گئی۔ عدیلہ کی بیٹیاں اپنے گھروں کو چلی گئیں۔ جاتے ہوئے وہ نہیں بھولیں کہ عدیلہ کا بچا کھچا سامان کیا تھا۔ اُنھوں نے یہ سامان آپس میں تقسیم کیسے کیا؟ اِس کے بارے میں بالکل لاعلم ہوں مگر یہ کہ ایک چھوٹی ٹرالی پر یہ تمام سامان رکھا جا چکا تھا۔ جب وہ ٹرالی ڈسپنسری سے نکل کر ہمارے گاؤں سے شمال کی طرف جانے والی سڑک پر رواں ہو رہی تھی مَیں اُسے انہماک سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے اُس وقت یقین ہوا اصل میں عدیلہ کا جنازہ اِس ٹرالی میں ہے اور اُس کے ساتھ ہی زینی کا جنازہ بھی اِسی ٹرالی کے اُوپر جا رہا ہے۔ آج کے بعد عدیلہ کا خاندان میری آنکھوں سے مکمل مٹ گیا تھا۔ مَیں اپنے گھر سے باہر نکل کر کھیتوں میں چلا گیا اور تمام دن گاؤں کے مضافات میں گھومتا رہا۔ میری کوشش تھی مَیں اِس معاملے سے پوری طرح لاتعلق ہو جاؤں اور اب کسی طرح خیالوں میں بھی واسطہ نہ رکھوں۔ فصلوں میں پھرتے پھراتے مَیں اتنا دُور نکل آیا کہ جنوبی طرف کے دوسرے گاؤں کی حدود میں داخل ہو گیا۔ اِس بات کا احساس مجھے تب ہوا جب اُس گاؤں کی مسجد کے مینار نظر آنے لگے۔ اُس وقت اُن میناروں سے اذان کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یعنی مغرب ہو چکی تھی۔ مَیں نماز پڑھنے میں کبھی مستعد نہیں رہا مگر مجھے شام کی سُرمئی فضا میں کہیں دُور سے اذان کی پکار اچھی لگتی ہے جیسے کوئی اُفق کی زرد وادیوں میں بلا رہا ہو۔ مَیں نے جلدی سے گھر کی راہ لی اور دو گھنٹے بعد دس کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے عشا سے کچھ دیر بعد گھر پہنچا۔ میری ماں پریشان تھی۔ دادی نے کچھ دِنوں سے مجھے بہت پیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ بھی میرے انتظار میں دروازے پر ہی کھڑی تھی۔ اُن سب کی پریشانی دیکھ کر مجھے احساس ہوا وہ مجھے ابھی تک بچہ سمجھ رہی ہیں۔ مجھے اتنا بے پروا نہیں ہونا چاہیے تھا۔

(۳۵)

یہ بہار کے دِن تھے۔ عدیلہ کو فوت ہوئے آٹھ ماہ ہو چکے تھے۔ سونے کے لیے ہماری چار پائیاں کمروں سے نکل کر صحن میں آ چکی تھیں۔ میری چار پائی مغربی دیوار کے ساتھ تھی۔ عشا کے بعد میری دادی گھر کی تمام بتیاں بند کرا دیتی اور سونے کا فرمان جاری ہو جاتا تھا۔ اگر کوئی جاگنا بھی چاہتا تو اُس کے لیے صحن کا بلب نہیں جل سکتا تھا اور کمرے میں اُن دنوں اکیلا سونے کی ممانعت تھی۔ مجھے رات دیر تک کتاب یا کوئی ناول پڑھنا ہوتا تھا۔ اُس کے لیے لالٹین جلا کر اپنے قریب رکھ لیتا۔ یہ لالٹین اتنی دور ہوتی تھی کہ اُس کی روشنی ہمارے گھر کے دوسرے فرد کے پاس نہیں جا سکتی تھی۔ مجھے لالٹین کی روشنی میں کتاب پڑھنے کی عادت ویسے بھی اُن دنوں سے تھی جب ہمارے گھر میں بجلی نہیں آئی تھی اور اب تو اِس میں مزا آتا تھا۔ مَیں نے گھر کی مغربی دیوار کے ساتھ لکڑی کی ایک ٹیبل بنا کر رکھ لی تھی۔ اُس پر لالٹین رکھ دیتا اور بستر پر لیٹے لیٹے اُس کی روشنی میں کتاب پڑھتا رہتا۔ کتاب پڑھتے ہوئے کیا وقت ہوا تھا، اِس کا صحیح اندازہ مجھے نہیں لیکن اتنا ضرور تھا کہ گھر کے تمام افراد سو چکے تھے۔ مَیں نے دیکھا میری والدہ اُٹھ کر میری طرف آ رہی تھی۔ اُسے دیکھ کر مَیں چار پائی پر بیٹھ گیا۔ والدہ میرے قریب آ کر چار پائی کی پائنتی پر بیٹھ گئی اور آہستگی سے بولی، ضامن بیٹا مَیں تم سے ایک بات کرنا چاہتی ہوں۔ مَیں نے کتاب بند کر کے اپنے سرہانے رکھ دی اور والدہ کی طرف دیکھنے لگا۔ کوئی خاص بات ہے امی؟

والدہ نے لالٹین بند کر دی۔ اب چاند کی ہلکی سی لَو رہ گئی تھی جس میں صرف دُھندلا سا چہرہ ہی نظر

آ سکتا تھا۔ باقی تمام صحن تاریک نظر آتا تھا۔ اُسی تاریک دھند لکے میں وہ دوبارہ گویا ہوئی۔ ضامن بیٹا میرے پاس ایک امانت ہے، اُس کے بارے میں فکر مند ہوں۔

کون سی امانت؟ مَیں امی کی طرف دیکھ کر حیران ہوا۔ آج تک اُس نے کسی امانت کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔

عدیلہ کی بیس تولے کی سونے کی چوڑیاں اور دو کنگن ہیں، وہ بہت آہستہ سے بولی، تجھے مَیں نے بتایا تھا وہ مرنے سے کچھ دن پہلے میرے پاس آئی تھی۔ وہ یہی چیزیں لائی تھی اور میرے پاس امانت رکھ گئی تھی۔ اُس نے مجھے کہا تھا معیذ گھر کی ہر شے پر ہاتھ صاف کر رہا ہے۔ مجھے خطرہ ہے یہ اُس کے ہاتھ نہ لگ جائیں، اِنھیں اپنے پاس رکھ لو، خدانخواستہ مجھے کچھ ہو گیا تو یہ بیس تولے سونا ہے، اِسے زینی کا کچھ پتا چلے تو اُس تک پہنچا دینا مگر زینی کے علاوہ کسی کو نہ دینا۔ مَیں اِس کا آدھا حصہ ضرور نیامت کو دے دیتی مگر اُس کے نجس خون نے میری زندگی کو روگ دے دیا ہے۔ عدیلہ نے تیرا نام لے کر کہا تھا کہ ضامن پر مجھے اعتماد ہے۔ وہ یہ سامان اُس تک پہنچا دے گا اور خیانت نہیں کرے گا۔

اپنی والدہ کی یہ بات سُن کر مَیں حیران رہ گیا، مجھے کافی عرصے سے والدہ کے متعلق یہی پتا تھا کہ وہ عدیلہ سے سخت ناراض ہے اور میری وجہ سے اُس کے ساتھ سلام دعا نہیں رکھ رہی۔ نہ ہی وہ اُس سے کسی قسم کی ہمدردی رکھتی ہے لیکن اُس نے عدیلہ کی اتنی بڑی ذمہ داری سنبھال لی تھی۔ سچ پوچھیں تو مجھے اپنی والدہ کی سادگی اور اخلاص پر بے پناہ پیار آیا۔ یہ کس قدر درد رکھنے والی خاتون تھی۔

آپ نے اِس بارے ابا کو بتایا ہے؟ مَیں نے پوچھا۔

چپ، اُس نے اپنا ہاتھ میرے ہونٹوں پر رکھ دیا، اُسے تو بالکل نہیں بتانا۔ وہ پہلے ہی بہت مجھے ڈانٹ چکے ہیں کہ مَیں نے عدیلہ سے خوامخواہ کی پینگیں بڑھا لی ہیں اور ہمارے گھر کی ہر خبر اُسی کے ذریعے سے معیذ اور اُس کے حرامی دوستوں اور لفنگوں تک پہنچی تھی جس کے سبب گھر لُٹ گیا اور اُس کی پانچ سال کی کمائی ایک ہی دن میں برباد ہو گئی۔ اِس امانت کا اُسے پتا چلا تو کہرام مچا دیں گے اور ابھی اِس سونے کے ساتھ مجھے بھی گھر سے نکال دیں گے۔ کہیں گے اگر یہ سونا بھی کسی حادثے میں چوری ہو گیا تو کون پورا کرے گا۔ کیا دوزخ میں سڑنے کا بندوبست کر رکھا ہے؟ ہاں البتہ تیری دادی کو پتا ہے۔ مَیں نے اُسی کے مشورے سے رکھا تھا۔

دادی کو پتا ہے؟ اِس بات پر میری آنکھیں کھُل گئیں، یہ کیسی ہونق کر دینے والی خبر تھی۔ تو اُس

نے اول آپ کو یہ امانت رکھنے کی اجازت دے دی پھر ابا سے بھی نہیں کہا؟
پتر تیری دادی کو اللہ حیاتی دے، وہ بہت اچھی ہے۔ اُسی نے مجھے امانت رکھنے پر آمادہ کیا تھا ورنہ مَیں تو انکار کر چکی تھی۔
یہ ایک عجیب بات تھی، یہ عورتیں بھی ایک ایسا عجوبہ ہیں جن کی سمجھ شاید دو اور دو چار کے حساب سے بھی نہیں آسکتی۔
مَیں تم سے بس اتنا کہنا چاہتی ہوں، تُو کسی طرح زینی کا کھوج نکال تاکہ یہ مال اُس تک پہنچ جائے اور ہماری اِس بلا سے جان چھوٹ جائے۔ جاتے جاتے بھی وہ ہمیں کس مصیبت میں ڈال گئی ہے۔
لیکن مَیں اُسے کہاں تلاش کروں؟ جب ہزار کوششوں کے باوجود خود اُسے نہیں مل سکی تو مَیں کہاں ڈھونڈوں گا، مَیں نے عذر بیان کیا۔
ضامن بیٹا، مَیں بھول میں رہی، مَیں سمجھی تھی وہ عدیلہ کی موت پر ضرور کہیں سے آ جائے گی۔ وہیں اُسے یہ امانت سونپ دوں گی مگر اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی وہ عدیلہ کی قبر پر نہیں آئی تو اب مجھے نا اُمیدی سی ہوگئی ہے اور میرا جی گھبرانے لگا ہے۔ کہیں خدانخواستہ یہ امانت ضائع ہوگئی تو کیسے پوری کروں گی۔
لیکن مسئلہ تو امی جان وہی رہا کہ آخر اُسے کہاں سے تلاش کروں۔ میرا تو اِس اپنے شہر سے آگے کوئی واقف بھی نہیں اور اُسے اتنا عرصہ یہاں سے گئے ہو گیا پتا نہیں کہاں سے کہاں نکل گئی ہوگی۔ اس ملک میں ہوتی تو شاید آ ہی جاتی مجھے تو لگتا ہے وہ اور جنید کسی باہر کے دیس نکل گئے ہیں۔
بیٹا اول تو عدیلہ نے اُسے ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی۔ پھر وہ ڈاکٹر فرح کا سامنا بھی نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن اب تو نہ عدیلہ رہی ہے اور نہ کوئی اِن کے خاندان کا دوسرا فرد یہاں ہے۔ ہم نے عدیلہ کی امانت تو ہر حالت میں اُس تک پہنچانی ہے۔ کوشش کرے گا تو اُن کا پتا مل ہی جائے گا۔ مَیں تب تک اسے سنبھالتی ہوں۔ کمرے کے اندر ایک گڑھا کھود کر اُس میں رکھ دیا ہے۔ تُو کسی ملازمت کی تلاش کے بہانے چلا جا اور اُن کا کہیں سے پتا چلا۔ تجھے نہیں پتا مَیں نے تجھے یہ بتانے سے پہلے کتنی بار سوچا ہے۔ اب میرے اور تیری دادی کے سوا صرف تم اِس راز کے پہریدار ہو اور اِسے پورا کرنے والے ہو۔ تم کل ہی نوکری تلاش کرنے کے بہانے چلے جاؤ اور اُنھیں تلاش کرنے کی کوشش کرو۔ ساتھ اپنی نوکری کا

بندوبست بھی کرتے رہنا۔ تمھارے والد کا حوصلہ اب جواب دیتا جا رہا ہے۔ وہ ویسے بھی بوڑھے ہو چکے ہیں۔

ٹھیک ہے، آپ فکر نہ کریں، مَیں یہ سب کرنے کی کوشش کروں گا۔ آپ آرام سے سو جائیں، مَیں نے اپنی ماں کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔ میری بات سُن کر وہ کافی مطمئن نظر آنے لگی اور تھوڑی دیر بعد اپنی چارپائی پر جا کر لیٹ گئی۔ اِس کے بعد مجھے تمام رات زینی کے بارے میں سوچتے نکل گئی۔ مَیں اپنے دماغ میں مختلف منصوبے بناتا رہا کہ کیسے اُس تک پہنچا جائے۔ میرے سامنے دو ہی رستے تھے۔ ایک ڈاکٹر فرح کا اور دوسرا اُس کے خاوند کا۔ ڈاکٹر فرح نے اپنے خاوند کے متعلق جو کچھ بتایا تھا، اُس کے مطابق مَیں اُن کا کھوج لگا سکتا تھا۔ اُس کے بعد میری آنکھ لگ گئی تھی۔

(۳۶)

صبح اُٹھتے ہی مَیں نے والد سے کہا، ابا جی مَیں کسی کام کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ والد صاحب کا غصہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ پچھلے چار پانچ دن سے اُنھوں نے ایک بھی لفظ چڑ چڑے پن سے ادا نہیں کیا تھا مگر مَیں جانتا تھا وہ دل ہی دل میں ہم پر نازل ہونے والے افلاس سے خوفزدہ تھے اور چاہتے تھے کسی طرح مَیں کسی معقول کام پر جا ٹھہروں۔ وہ خود بھی اپنے طور پر قریبی لوگوں سے اِس بارے میں بات کرتے رہتے تھے۔ اب جب کہ مَیں خود ہی کام کی تلاش میں نکلنے لگا تھا تو میری اِس بات پر اُنھوں نے مجھے منع نہیں کیا، بولے ٹھیک ہے جاؤ لیکن ضروری نہیں کام نہ ملے تو گھر میں ہی داخل نہ ہو۔ کام تلاش کرنا بیٹوں کی ذمہ داری ہے مگر ذمہ داری اذیت نہیں بنی چاہیے۔ مَیں غصے سے کچھ بھی بول جاتا ہوں اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمھیں گھر میں دیکھنا نہیں چاہتا۔ میرا خیال ہے پہلے اپنے مقامی شہر میں کام ڈھونڈنے کی کوشش کرو۔ اگر مل جائے تو فابہا ورنہ دوسرے بڑے شہر میں جاؤ اور گھر میں چکر لگانا نہ بھولنا۔ مَیں نے کہا ابا جی آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن مجھے کچھ دن باہر لگ جائیں گے۔ آپ پریشان نہ ہوں، جہاں جاؤں گا وہاں جاننے والے ہوں گے اور جاتے ہی آپ کو اطلاع دوں گا۔ اُس کے بعد دادی اماں اور اپنی والدہ سے رخصت لی۔ دونوں نے مجھے علم کے نیچے کھڑے ہو کر امام ضامن باندھا۔ پھر جب تک مَیں اپنے گھر سے قریب کی سڑک کا ایک موڑ نہیں مڑ گیا، وہ گھر میں داخل نہیں ہوئیں۔

ہمارے گاؤں کے شمالی طرف سے شہر کی طرف پہلے کچی سڑک جاتی تھی مگر اب یہاں سولنگ

لگ گیا تھا اور تانگے روانی سے آتے جاتے تھے۔ یہاں سے شہر پندرہ کلومیٹر تھا۔ صبح کے دس بجے کا وقت تھا۔ گاؤں کے اِس شمالی کونے پر بے شمار کیکروں کے درخت تھے۔ ان کے قریب ہی کئی گھاس کے کھلے میدان تھے جن میں طرح طرح کی جڑی بوٹیاں اُگی تھیں۔ اُن کے زرد پھول نکلے ہوئے تھے۔ یہاں ایک دو چائے کے ہوٹل تھے۔ گھاس کے میدانوں کے قریب اور چائے کے ہوٹلوں کے سامنے اِن بے شمار کیکر کے درختوں پر نئے نئے پتے نکل رہے تھے اور کیکر پوری طرح سے ہرے بھرے تھے۔ یہ کیکر اِس وقت عجیب ٹھنڈک اور فرحت کا احساس دلا رہے تھے۔ ان کے نیچے چھ سات تانگے اپنے گھوڑوں سمیت جتے کھڑے تھے۔ یہی تانگے سواریوں کو شہر لے کر جاتے تھے۔ اصولاً مجھے سائیکل پر شہر جانا چاہیے تھا لیکن میرا خیال تھا اپنے شہر سے آگے بھی کئی جگہوں پر جانا پڑا تو سائیکل بے کار ہو جائے گی۔ پھر شہر میں جس کے پاس بھی سائیکل رکھوں گا وہ اُسے بیگانوں کی طرح استعمال کر کے دِنوں میں صرف لوہے کے پائپ بنا ڈالے گا۔ اِس سبب سے مَیں نے سائیکل گھر میں ہی چھوڑ دی تا کہ میرا چھوٹا بھائی اور والد اُسے استعمال کر لیا کریں۔

مَیں تانگوں کے اڈے پہنچ کر اپنی باری کے تانگے پر بیٹھ گیا۔ اِس پر چار سواریاں پہلے سے بیٹھی ہوئی تھیں۔ میرے سمیت پانچ سواریاں ہو گئیں۔ ہر تانگہ کم و بیش دس سواریاں لے کر شہر جاتا تھا اور اتنی سواریاں واپس گاؤں لاتا۔ چھ سواریاں تو آرام سے سیٹوں پر بیٹھ جاتی تھیں، باقی کی اِدھر اُدھر کے بمبوؤں پر اڑس جاتیں۔ ایک دو ہودے میں لگی تختیوں پر بیٹھ لیتیں اور تانگہ چل پڑتا۔ اِن تانگوں کو سواریاں ملتی رہتی تھیں۔ ہمارے گاؤں میں سواریوں کی بہتات اِس لیے بھی زیادہ تھی کہ گاؤں کے اردگرد دو دو اور تین تین میل پر دوسرے گاؤں بھی پڑتے تھے۔ اُن کی سواریاں بھی پیدل ہمارے گاؤں میں چلی آتیں اور یہاں سے تانگے پر بیٹھ کر شہر جاتیں۔ تھوڑی دیر میں تانگے کی سواریاں پوری ہوئیں تو وہ کچی سڑک نما سولنگ پر چل پڑا۔ اِس سڑک کا تین میل کا فاصلہ کچے راستے میں جا بجا کھڈوں اور دُھول سے اَٹا ہوا تھا مگر گھوڑوں کی ہمت تھی کہ اِسے انتہائی حوصلے اور جگر کاوی سے پار کر جاتے تھے۔ تین میل بعد سڑک پکی ہو جاتی تھی۔ یہ پکی سڑک ابھی پانچ سال پہلے ہی بنی تھی اور اب اِس پر بسیں بھی چلنا شروع ہو گئی تھیں۔ تانگہ سڑک پر چلتا جا رہا تھا۔ سڑک کے دونوں جانب بہت زیادہ اونچے اور سایہ دار درخت تھے۔ اُن سے پرے دور تک فصلوں اور باغات کے سُرمئی اور سبز کھیت چمک رہے تھے۔ سڑک کے دونوں جانب اور درختوں کے نیچے پانی کے نالے بہہ رہے تھے۔ یہ سڑک انگریزی

دور کی دین تھی۔ درخت بھی سڑک کے دونوں جانب اُسی دور کی گواہی دیتے تھے۔ پوری گرمیاں سڑک پر سایہ ایسے رہتا تھا جیسے قدرت نے ہرے پتوں کی چھتریاں بنا کر سروں پر لٹکائی ہوں۔ اتنے سایے اور چھاؤں میں تانگہ چلتے ہوئے دُھول اور مٹی کے اُڑنے کی خبر نہیں ہوتی تھی۔ البتہ لوگ دھول سے بچنے کے لیے سروں پر چادریں اور پٹکے ضرور رکھ لیتے تاکہ شہر میں جا کر اُن کے سر مٹی کے گھڑوں سے نکالے ہوئے نہ لگیں۔ تانگہ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں شہر پہنچ گیا۔ اُس نے مجھے اڈے پر اُتار دیا۔

تانگوں کا اڈہ جہاں واقع تھا اِسے تحصیل بازار کہتے تھے۔ اِس وقت ساڑھے گیارہ بجے تھے اور یہ وقت حاجی فطرس علی کا مطب کے لیے مصروف ہوتا تھا، مَیں اُن کے مریضوں کے وقت کبھی مطب پر نہیں گیا تھا۔ تحصیل بازار میں پہنچ کر سب سے پہلے مَیں نے کوشش کی اپنے دوست حبیب علی سے ملوں۔ وہ خود پچھلے دو سال کا مریڈی اور چچا ایچ اے کا مریڈ کو چھوڑ کر اپنے دھندوں میں لگ گیا تھا اور یہاں ایک چھوٹی سی کپڑے کی دُکان کھول لی تھی۔ یہ دُکان نیشنل بینک والی گلی میں تھی۔ شہر مَیں اِس وقت تین بینک تھے۔ ایک غوثیہ بازار میں حبیب بینک تھا، دوسرا بینک غلہ منڈی میں تھا۔ غلہ منڈی شہر کے آخری بازار میں تھی اور اُس سے آگے کھیت شروع ہو جاتے تھے۔ شہر سارے کا سارا ریلوے اسٹیشن کے دائیں جانب واقع تھا۔ بائیں جانب یا تو لکڑی کے آرے تھے یا پھر کھیت کھلیان تھے۔ بینک والی گلی شہر گلی کہلاتی تھی اور وینس سینما کے سامنے سے نکل کر کنویں والے چوک میں نکلتی تھی لیکن حبیب علی کی کپڑے کی دُکان اُس سے پہلے ہی آ جاتی تھی۔

مَیں تانگے سے اُتر کر سیدھا اُسی طرف چل دیا۔ حبیب علی سامنے لکڑی کی بینچ پر فارغ بیٹھا تھا۔ کوئی گاہک ابھی دُکان میں داخل نہیں ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور گلے ملا۔ ایک چودہ پندرہ برس کا لڑکا بھی وہیں بیٹھا تھا۔ یہ لڑکا شاید اُس نے ملازم رکھا تھا۔ لڑکے نے فوراً میرے لیے ایک بینچ سے کپڑے کے تھان اُٹھا کر جگہ بنائی اور مَیں بیٹھ گیا۔ حبیب علی نے میری طرف غور سے دیکھا اور بولا، ضامن کیا پیو گے؟ لطیف شاہ سے برفی اور چائے منگوا لو، مَیں نے تُرت جواب دیا۔

یہاں ریل بازار میں ایک نیا چائے کا ہوٹل کھلا ہے وہاں بہت عمدہ اور ملائی والی چائے اور جلیبیاں ملتی ہیں۔

مَیں نے کہا بھائی وہ بھی کھا لیں گے لیکن مَیں آج ایک ضروری کام سے آیا ہوں اور اِس میں پولیس یا کچہری کا کوئی دخل نہیں ہے۔ بالکل آسان سا کام ہے۔

آپ بولیے تو سہی، حبیب علی نے کہا، ہمارے اِن ایشیائی ملکوں میں بعض دفعہ جنگ لڑنا معمولی کام ہوتا ہے۔

اچھا بھائی اب بول دو کام کیا ہے، حاجی لطیف اللہ نہ بنو۔

ایک بی بی ڈاکٹر فرح ہمارے گاؤں میں آئی تھی اور پانچ سال پہلے تبادلہ کروا کے گئی ہے۔ اُس کا تبادلہ کہاں ہوا ہے اور وہ کہاں ملے گی، اُسے ڈھونڈنا ہے۔

ہائیں، حبیب علی نے حیران ہونے کا مظاہرہ کیا۔ میاں یہ آنٹیوں وانٹیوں سے صحبت رکھنا شرفا کا کام نہیں اور اب تک تو وہ ریٹائر ہو کر گھر بیٹھ گئی ہوگی۔ کوئی ڈھنگ کی لڑکی ڈھونڈو، کلرکی کرو اور گھریلو مرد کی طرح زندگی کے پھول چن کر جنت کماؤ۔ مَیں نے تو بھائی اِس طرح کے سب دھندے واش آؤٹ کر دیے ہیں۔

کامریڈوں کی صحبت میں پلنے والا انسان پوری بات سُن کر جواب دینے کا متحمل نہیں ہو سکتا، مَیں نے غصے سے کہا۔

اُسے ڈھونڈنے کی وجہ؟ اب حبیب علی نے درست راستے سے بات سننے کی کوشش کی۔ کوئی کام ہے اُس سے؟ یا ویسے ہی ملاقات کا شوق چرا رہا ہے؟ ارے بھائی وہ بہت بوڑھی ہو گئی ہوگی۔ حبیب علی نے پھر چھیڑنے کی کوشش کی لیکن مَیں نے اُس چھیڑ کو بائی پاس کر کے مطلب کی بات کرنا مناسب سمجھا۔

اُسے ڈھونڈ کر اُس کے ذریعے ایک نئے آدمی کو ڈھونڈنا ہے۔ پھر اُس کے ذریعے ایک اور کو۔

میری اِس وضاحت پر حبیب علی ٹپٹا گیا اور بولا، یار ایک آدھ آدمی کو تو ڈھونڈا جا سکتا ہے لیکن یہ جو تم سراغ رسانی کی بات کر رہے ہو، اُس کے لیے میرے پاس نہ وقت ہے نہ حالات ہیں۔ دکان پہلے ہی ماٹھی چل رہی ہے۔ اللہ جانے کن قصوں میں پڑ گئے ہو۔ کہیں وہ تمھاری چوری والا مسئلہ پھر تو نہیں اُٹھ کھڑا ہوا؟

ہماری چوری کو دفع کرو اور اُس کا نام مت لو، مَیں نے کہا، یہ ایک اور قضیہ میرے ذمے آ پڑا ہے۔ آپ سیدھے بتاؤ یہاں تحصیل ہیڈ کوارٹر میں کوئی جاننے والا ہے، جس سے ڈاکٹر فرح کے بارے میں پوچھا جا سکے؟

مجھے سوچنے دے۔ حبیب علی نے دانتوں میں اُنگلی رکھ لی۔ اتنے میں لڑکا چائے لے کر اندر آ گیا

اور ہم نے چائے پینا شروع کر دی۔ دو تین منٹ اسی حالت میں خوش نکل گئے۔ پھر ایک ہی دم بولا، یار ضامن، آپ کو ایک اور مزے کی خبر دوں، کچھ دن پہلے ہمارے کامریڈ جاوید ساقی نے بھی گول چوک والی مسجد کے نیچے ایک کپڑے کی دکان کھول لی ہے۔ بھوکا مرتا پھرتا تھا، مَیں نے کہا میاں تم بھی یہی کر لو۔ مولوی فتح اللہ نے اُس کے ساتھ کافی رعایت کر دی۔ ایڈوانس بھی نہیں لیا اور پہلے تین ماہ کا کرایہ بھی معاف کر دیا ہے۔

ارے واہ، چلو ایک کامریڈ اور تاجر ہوا، اچھی بات ہوئی آپ لوگوں کا انجام یہی ہے۔ یا تجارت کرتے ہو یا مغرب کی وادیوں میں بسنے کی لگن رکھتے ہو۔ مَیں نے طنز بھرے لہجے میں کہا، ویسے اب مجھے کسی کامریڈ کے مرنے جینے سے کوئی علاقہ نہیں اور یہ وقت اِس اطلاع کے لیے ٹھیک بھی نہیں۔ کسی اور وقت اِس پر گفتگو کریں گے۔

یار مَیں اُسی سلسلے میں کہنے لگا تھا کہ جاوید ساقی کا رشتے دار ہسپتال میں ہے۔ یہ ہمارے کامریڈ بھائی کس کام آئیں گے؟ اُنھیں کہتے ہیں نا۔ حبیب علی نے وضاحت کی۔

اُنھیں جہنم میں ڈالو، یہ خصی بھیڑیں ہیں۔ بچہ دینے کے قابل نہیں۔ کوئی اور سلسلہ بناؤ۔ مَیں نے دوٹوک کہا، دراصل مَیں اُن کی تضحیک سے بہت زیادہ اُکتا گیا تھا جب اپنی چوری کے معاملے میں اُن سے ملا تھا۔

اچھا تو ایسا کرتے ہیں میرا تو کوئی واقف نہیں ہے البتہ دونوں چلتے ہیں اور چودھری فضل صاحب سے پوچھتے ہیں۔ یہ بھی ڈاکٹر ہے اور مَیں اِس سے اپنا علاج کرواتا ہوں۔ صبح کے وقت اِسی تحصیل ہیڈکوارٹر میں ڈیوٹی دیتا ہے، شام کو حق بازار میں اپنا کلینک کھول لیتا ہے۔ ابھی ہسپتال میں ہی مل جائے گا۔

ٹھیک ہے پھر اُٹھو۔ اور مَیں اُٹھ پڑا۔ ہم دونوں وہاں سے اُٹھ کھڑے۔ جاتے ہوئے حبیب علی نے اپنے چھوکرے پر بھی جملہ کس دیا، جمو خاں ذرا دیکھ کے۔ غلے میں پیسے ڈالنے ہیں نکالنے نہیں۔

ہم دونوں بینک والی گلی سے نکل کر ہاروں والی گلی میں داخل ہوئے۔ وہاں سے حکیموں کی گلی میں آئے۔ یہ ایک طویل اور پتلی سی گلی ہے۔ حکیموں کی بہت سی دکانیں پرانی طرز کی بنی تھیں۔ شاگرد پیشہ اللہ جانے کیا اول بلا گوٹ رہے تھے۔ اردگرد گاؤں کے بیشتر افراد اور شہر کے جوشیلے نوجوانوں کی پسندیدہ گلی یہی تھی۔ حبیب علی آگے تھا اور مَیں اُس کے پیچھے اور دیکھ کر حیران تھا کہ اُس کے اِن تمام

حکیموں سے تعلقات دوستانہ تھے۔ جس قدر مؤدبانہ سلام دعا اُس کی یہاں ہوئی کسی سے آج تک نہ دیکھی تھی۔ مَیں نے حبیب علی کو اب چھیڑنے کی کوشش کی، میاں حبیبے، حکیموں کی دلالی میں کتنا خرچہ نکل آتا ہے؟

آپ کا گزارا آسانی سے چل جائے گا۔ حبیب علی نے مُڑے بغیر جواب دیا، مگر کمبخت کچھ ایسے جنسی مریضوں سے بھی راہ نکل آتی ہے جو خود آپ پر ہی آنکھ رکھ لیتے ہیں۔

ذرا عمر دیکھ کر گاہک پکڑا کرو نا بھائی۔ مَیں نے جواب دیا۔

میاں دلال تو ہوں مگر اِن حکیموں کا نہیں اِن کے پاس آنے والے جوانوں کا ہوں جنھیں اِس قوم کے غازی ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ یہ سی ایم آر اور ایم سی ہائی سکول سے لے کر ہمارے کالج کے تمام لڑکوں کی بیماریاں اِنہی کے ہاتھوں شفا پاتی ہیں۔

مَیں حبیب علی کے اِس جملے کی معنویت پر ٹھٹھک سا گیا۔ یہ سالا مذاق میں بھی ایسے پتے کی باتیں کرتا تھا کہ بڑے سے بڑا مجمع باز نہیں کر سکتا۔

اب ہم گول چوک میں نکل آئے تھے اور یہاں سے سیدھا ہسپتال بازار میں سے ہو کر تحصیل ہیڈ کوارٹر آ جاتا تھا۔ گیٹ کے سامنے پہنچ کر حبیب علی نے پیچھے مُڑ کر دیکھا کہ مَیں موجود بھی ہوں یا حکیموں کی گلی میں رہ گیا ہوں۔

اچھا ابھی تک ہو، حبیب علی نے مسکرا کر کہا۔

مَیں زہر کھا کر نہیں آ رہا کہ رستے میں چل بسوں۔ مَیں نے جواب دیا۔

ہم نے ریسپشن پر پہنچ کر نہایت سیاہ فام لڑکی سے پوچھا، ڈاکٹر چودھری فضل صاحب کا کون سا کمرہ ہے؟

اِس کوریڈور سے سیدھا چلے جائیں۔ دائیں ہاتھ پر آخری کونے کا کمرہ اُنھیں کا ہے لیکن ابھی وہ وارڈ میں ہوں گے۔

ہم نے اُس کی آدھی بات سنی اور آگے چل دیے، اِس مُلک میں بس یہی ایک خوبی تھی کہ ریسپشن پر ایسی بلائیں بٹھائیں جنھیں انسان کو زیادہ دیر دیکھنے کی ہمت نہ ہو سکے اور وقت ضائع نہ ہو۔

ہم جا کر ڈاکٹر فضل کے کمرے میں بیٹھ گئے۔ یہ کمرہ نہایت سادہ مگر پرانا تھا۔ ایک دو بیماروں کے اشتہار اور اُن کی دوائیوں کے کلینڈروں کے علاوہ نہ کوئی قرآنی آیت تھی نہ دوسری توجہ کی چیز تھی۔

مجھے تین سال کا مریڈوں کے ساتھ رہنے سے ایک عادت پختہ ہو گئی تھی کہ جہاں بھی داخل ہوتا پہلے خیال اِسی بات پر جم جاتا کہ یہ آدمی خدا کو مانتا ہے یا نہیں۔ اگر کمرے میں ایسی کوئی چیز نظر آتی جو ہڈیوں کے ڈھانچے یا گندے پیلے اور مٹیالے جسموں کی نشاندہی کرتی تو صاحب کمرہ کو کامریڈ سمجھ لیتا اور خدا کا منکر بھی۔ اگر قرآنی آیت نظر آ جاتی تو اُسے خدا کا دوست اور دُنیاداروں کا دُشمن خیال کرنے لگتا۔ کئی دنوں سے یہ عادت ختم ہوتی جا رہی تھی لیکن ابھی مکمل نہ ہوئی تھی۔ اِس ڈاکٹر کے بارے میں شکر ہے میرا کوئی خیال اِس طرح کا نہیں گزرا۔ مَیں اُسے بطور انسان دیکھ رہا تھا۔ چند لمحے گزرے تھے مَیں نے حبیب علی سے کہا، چیئے چلیں ہم وارڈ میں جا کر دیکھ لیتے ہیں، یہاں بیٹھے بیٹھے بخار ہو جائے گا۔

یار بیٹھ جا، حبیب علی ایک دم غصے سے بولا، وہاں مریضوں سے مجھے گھن آتی ہے۔ یہ ڈاکٹر لوگ بھی اُن میں سے ایک ہوتے ہیں۔ دن رات مریض، مریض اور میڈیسن۔ یہ زندگی نہیں گزارتے مرض گزارتے ہیں۔ یہیں بیٹھا رہ۔

اُسی وقت ڈاکٹر نے اپنے کمرے میں انٹری کی۔ ایک دفعہ تو حیران ہوا پھر اُس نے حبیب کو پہچان لیا اور ہلکا سا مسکرا کر اپنی کرسی کی طرف بڑھ گیا۔

ہاں بھائی فرمائیں، آج کون سا روگ لائے ہو؟ ڈاکٹر صاحب نے بیٹھتے ہی حبیب علی کو مریض سمجھ کر بات شروع کی بلکہ حبیب علی کا خیال تھا کہ اُس نے مجھے مریض سمجھ کر اُس سے پوچھا ہاں بتایئے اِسے یعنی مجھے کیا کسر ہے؟

ڈاکٹر صاحب اِس بار مَیں آپ سے دوائی نہیں انفارمیشن لینے آیا ہوں، حبیب علی نے اُسی روانی سے کہا۔

کون سی انفارمیشن؟ ڈاکٹر مسلسل ایسے طریقے سے پیش آ رہا تھا جیسے اُسے صرف اپنی فیس سے مطلب تھا۔ اگر ہماری اُس سے بات چیت ایسے کسی عمل کی طرف لے کر نہیں جاتی تھی تو ملاقات کرنا فضول تھی اور کمرے سے نکل جانا زیادہ بہتر تھا۔ مجھے اُس کے رویے سے یہی لگ رہا تھا لیکن حبیب علی ہمت نہیں ہارا اور مجھ پر ظاہر کرنے کی کوشش میں تھا کہ ایسا نہیں ہے، ڈاکٹر سے اُس کے تعلقات مریضانہ سے آگے کے ہیں۔

ڈاکٹر فرح صاحبہ کے بارے میں کہ اُن کا تبادلہ کہاں ہوا ہو گا۔ پانچ سال پہلے تو وہ ہمارے دوست کے گاؤں میں تھی۔

مَیں تو اُسے نہیں جانتا اور نہ آپ کے دوست کے گاؤں کو جانتا ہوں۔ ڈاکٹر نے دوٹوک جواب دیا۔ یہاں اللہ جانے کتنے ہی ڈاکٹر تھے۔ اب مجھے کیا پتا وہ کب اور کہاں چلی گئی ہیں؟

یہاں کوئی ایسا آدمی ہے جسے پتا ہو؟ ڈاکٹر کے رویے سے حبیب علی کی ساری شوخی ہوا ہوگئی اور بجھے سے انداز میں بولا۔

نہیں مَیں اپنے کام سے کام رکھتا ہوں، مجھے ایسے کسی فرد کا پتا نہیں جو اُس کا پتا بتادے۔ اُس نے انتہائی بے رُخی سے جواب دیا اور ابھی ہم سوچ ہی رہے تھے کہ اب کیا کریں، ڈاکٹر دوبارہ بولا، کوئی اور کام؟

ڈاکٹر کے اِس جواب سے ظاہر تھا کہ اب وہ ہمیں اپنے کمرے میں بیٹھے نہیں دیکھ سکتا۔ اُسی وقت مَیں کرسی سے اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ حبیب علی بھی اُٹھ گیا۔ دروازے سے باہر نکلتے ہی حبیب علی نے یہ موٹی گالی دی کہ میرے کان جلنے لگے۔ ہم واپس کوریڈور سے ہوتے ہوئے اُسی حبشیانہ ریسپشن کے پاس آخر کھڑے ہوگئے اور سوچنے لگے کس سے پوچھیں، عین اُسی وقت حبیب علی ریسپشن والی بی بی کے پاس جا کر کھڑا ہوگیا۔

میڈم آپ یہاں یعنی اِس ہسپتال میں کب سے کام کر رہی ہیں؟

آپ کو اِس سے مطلب؟ اُس خاتون نما لڑکی نے جواب دیا۔

اب مَیں آگے بڑھا اور اِس سے پہلے کہ حبیب علی اُس سے اُلٹ کوئی سوال کرتا، مَیں نے کہا، میڈم اصل میں ہم نے ڈاکٹر فرح کے بارے میں پوچھنا تھا۔ وہ ہمارے گاؤں میں ڈیوٹی کرتی تھی۔ پانچ سال پہلے اُس کا وہاں سے تبادلہ ہوگیا تھا۔

تو آپ ہمارے ایڈمن آفس میں جائیے نا۔ اُس نے اُسی تیزی سے جواب دیا۔

وہ کہاں ہے؟ اب حبیب علی آگے بڑھا۔

وہ اِس کاریڈار سے دائیں ہاتھ دو کمرے چھوڑ کے ہے۔ آپ کو اُس سے کیا کام ہے؟

آپ اُسے جانتی ہیں؟ مَیں نے تیزی سے آگے بڑھ کر پوچھا۔

وہی جو اونچے لمبے قد کی کسی گاؤں سے تبادلہ ہوکر یہاں آئی تھی۔

جی جی وہی، کیا وہ یہیں ہے؟ مَیں نے ایک طرح سے خوشی سے نہال ہوکر پوچھا۔

یہاں چھ ماہ رہی تھی پھر چلی گئی تھی۔ کہاں گئی؟ اِس کے بارے میں مجھے نہیں پتا۔ آپ ایڈمن

سے پتا کر لیں۔

مَیں اُس کی بات سے کچھ بجھ سا گیا لیکن یہ احساس ضرور ہوا کہ پھول کی خوشبو اُس کے ہونے کا احساس ضرور دلا دیتی ہے۔

ہم ایڈمن آفس میں آ گئے۔ یہاں کمرے میں دو تین لوگ بیٹھے تھے جن میں ایک خاتون تھیں۔ یہ خاتون اُن کی افسر نظر آ رہی تھی اور یہ اچھی بات تھی۔ اُس نے ہمیں اپنی عینک کے اُوپر سے دیکھا اور وہیں سے ہمارے دڑانہ داخل ہوتے ہوئے پوچھا، جی فرمائیے؟

اِس کا مطلب یہ تھا کہ آپ کا اِس کمرے میں کیا کام؟ یہ تو ہسپتال کے عملے کے لیے ہے اور تم دونوں اجنبی ہو۔ مَیں نے دور ہی سے کہا میڈم ڈاکٹر فرح کے بارے میں معلوم کرنا تھا کہ اُن کا یہاں سے کس شہر میں تبادلہ ہوا تھا۔

میڈم فرح، وہ جو سمارٹ سی تھی؟ ایڈمن خاتون نے میری طرف غور سے دیکھا۔

جی وہی، اب مَیں تھوڑا سا ہچکچا کر بولا، ہمارے گاؤں سے تبادلہ ہو کر یہاں آئی تھی مگر شاید یہاں سے بھی چلی گئی ہے۔

اُس سے کیا کام ہے؟ ایڈمن خاتون نے چبھتے ہوئے سوال کیا۔

مجھے نہیں میری والدہ کو اُس سے کام ہے۔ مَیں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ مَیں اُس کو اتنا بے ضرر اور فی البدیہہ جواب دوں گا لیکن بعض اوقات انسان کا لاشعور ایسی مدد کرتا ہے کہ آپ کو حیرت ہوتی ہے۔ مَیں دعوے سے کہتا ہوں چند لمحے پہلے تک مجھے اِس جواب کا خیال بھی نہیں تھا بلکہ یہی سوچ رہا تھا، جب مجھ سے پوچھا جائے گا مَیں ڈاکٹر فرح کا کیوں پوچھ رہا ہوں تب میرا جواب اُنھیں مشکوک کرے گا۔

آپ بیٹھیے، کوئی خاص کام ہے آپ کی والدہ کو اُس سے؟ گویا ایڈمن خاتون ہار ماننے والی نہ تھی۔

اُس کی ایک امانت میری والدہ کے پاس ہے، اُس تک پہنچانا تھی، مَیں نے جواب دیا۔

ساڑھے چار سال پہلے اُس کا یہاں سے تبادلہ ہو گیا تھا لیکن یاد نہیں کہاں ہوا۔ اعزاز ذرا میڈم فرح کی فائل دینا؟ ایڈمن آفیسر خاتون نے اپنے ایک ماتحت سے کہا۔

اُس نے تھوڑی دیر میں ڈاکٹر فرح کی فائل ڈھونڈ کر خاتون کے سامنے رکھ دی۔ خاتون نے

فائل کو دیکھنا شروع کر دیا۔ اِس دوران مَیں اور حبیب علی خموشی سے بیٹھے کمرے کا جائزہ لیتے رہے۔ یہ کمرہ کافی لمبا چوڑا اور وسیع تھا۔ چھت اونچی اور لکڑی کے آنکڑوں سے بنی ہوئی تھی۔ اِن آنکڑوں پر لکڑی ہی کی پھٹیاں جوڑ کر چھت کو کھڑا کیا گیا تھا۔ دو پنکھے چھت سے لٹکے ہوئے چیونٹی کی رفتار سے گھوم رہے تھے۔ اُن کی آواز گویا نہ ہونے کے برابر تھی۔ ایک میز ایڈمن افسر کے سامنے پڑی تھی اور دو میزیں مزید تھیں۔ ایک دائیں طرف کی دیوار کے ساتھ اور ایک بائیں طرف کی دیوار کے ساتھ۔ اُن میزوں کے گرد دو دو لوگ مزید بیٹھے تھے۔ دائیں دیوار کے ساتھ ایک لمبی قطار لکڑی کی الماریوں کی تھی جس میں ہسپتال کے عملے کی فائلیں جمع تھیں۔ الماریوں پر اُن کے عہدوں کے حساب سے فائلیں ترتیب سے لگی تھیں۔ دو الماریوں پر ڈاکٹرز لکھا تھا۔ دو الماریوں پر انتظامیہ درج تھا اور ایک الماری پر فور کلاس فائلز لکھا تھا۔ جیسی ترتیب اُن کے عہدوں کی تھی ویسی ہی الماریوں کی حالت تھی۔ افسران اور ڈاکٹرز کی الماریاں بالکل نئی تھیں جبکہ فور کلاس عملے کی الماریاں بھی فور کلاس تھیں۔

ڈاکٹر فرح صاحبہ یہاں سے شاہ کوٹ چلی گئی تھیں۔ ایڈمن خاتون نے بالآخر بتا دیا۔

چلو یہ تو اچھا ہوا کہ اُن کی خبر تو ہوئی کہ کہاں ہیں مگر یہ شاہ کوٹ کہاں تھا۔ اتنے عرصے سے زمانے بھر کی خبریں اور دنیا بھر کے انسانوں کے حال و ماضی کے افسانے کہتے اور سنتے آ رہے تھے مگر اِس شاہ کوٹ کا نام اُن میں کہیں نہیں سُنا تھا اور تو اور روس، نارمنڈی، جرمن اور برطانیہ کے چھوٹے چھوٹے قصبوں کے نام ازبر ہو گئے تھے لیکن آج شاہ کوٹ ایک سوال بن کر ہمارے سامنے کھڑا تھا۔ مَیں نے حبیب علی کی طرف دیکھا، اُس نے نفی میں ایسے سر ہلایا جیسے کچھ نہ جانتے ہوں۔ پھر اُسی خاتون کی طرف مُڑ کر پوچھا، میڈم شاہ کوٹ کہاں ہو گا بھلا۔

یہ تو مَیں نہیں جانتی، اُس نے دوٹوک جواب دیا، میرا جغرافیہ خراب ہے اور ہنس دی۔

کیا آپ ایک زحمت اور کر سکتی ہیں کہ پتا کر دیں وہ وہیں ہے یا کسی دوسری جگہ چلی گئی ہیں؟ حبیب علی نے دوبارہ سوال کیا۔

سوری، یہ اگلے کام آپ خود کریں، مَیں نے جتنا فرض سمجھا کر دیا۔ آپ جا سکتے ہیں۔ اُس نے انتہائی درشتی سے جواب دیا۔

ہم دونوں ہسپتال کے صحن میں ایسے آ کر کھڑے ہو گئے جیسے بے سہارا ستون ہوں۔ اِسی اثنا میں ایک آدمی سفید کپڑوں میں ہمارے پاس سے گزرا۔ مَیں اُسے پڑھا لکھا سمجھ کر اُس کی طرف بڑھا

اور پوچھا، بھائی صاحب ایک بات بتایئے گا، یہ شاہ کوٹ کہاں ہوگا؟

اُس نے ایک نظر میری طرف گھور کر دیکھا جیسے یہ سوال پوچھنے پر اُس کی ہتک ہوئی ہو، بولا، کیا میں آپ کو کہیں سے پٹواری یا گرداور لگتا ہوں؟

معذرت، اتنا کہہ کر مَیں پیچھے ہٹ گیا۔

اب ہم ہسپتال کے گیٹ سے باہر نکل آئے تھے اور سیدھا اشرف کتاب گھر کا رُخ کیا۔ وہاں سے پنجاب کا نقشہ آسانی سے مل سکتا تھا لیکن محمدیہ چوک پر آ کر لطیف چائے والے کے پاس بیٹھ گئے اور چائے کا آرڈر دے دیا، اِس کی چائے اور جلیبی پورے شہر میں مشہور تھی۔ ہم نے دو چائے اور پاؤ بھر جلیبی کا آرڈر دیا اور باتیں کرنے لگے۔ حبیب علی کہنے لگا، خیر یہ شاہ کوٹ تو ہمیں مل ہی جائے گا لیکن ضامن میاں اب مَیں یہ تو نہیں جانتا، آپ پر اِس بی بی کو ڈھونڈنے کی ذمہ داری کیوں آ پڑی لیکن اِن دو ملاقاتوں سے اتنا ضرور جان گیا ہوں، یہ ڈاکٹر صاحبہ کچھ الگ چیز ہے۔ بھلا ایک شہر کی بجائے قصبوں اور ٹاؤنوں میں کون ڈاکٹر رہنا پسند کرتا ہے۔ مَیں حبیب علی کے تجزیے سے حیران ہوا۔ وہ اکثر اِس طرح کے عقلمندانہ تجزیے کرنے میں ماہر تھا اور جلد بات کی تہہ تک پہنچ جانا اُس کے بس میں ہوتا تھا مگر عین اُسی وقت حبیب کے جملے کا پہلا حصہ لطیف چائے والے نے سُن لیا اور بولا، میاں شاہ کوٹ میں کون ہے؟

چاچا طیفے وہاں بھی کوئی ہے، کیا تم جانتے ہو یہ کدھر ہے؟ حبیب علی نے پوچھا۔

یہ گوجرانوالہ کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ پہلے گاؤں تھا پھر وہاں کسی نے ایک مل لگا دی۔ تب یہ قصبہ بن گیا۔ میری بیوی وہیں کی ہے۔ اُس کے بعد طیفے چائے والے نے تفصیل سے تمام پتا سمجھا دیا اور اُسے مَیں کاغذ پر لکھتا بھی گیا۔ یہاں تک کہ کہاں سے تانگہ لینا ہے اور کتنا پیدل چلنا ہے۔ البتہ جو سفر اُس نے اپنے سسرال کے گھر تک کا بتایا، وہ مَیں نظر انداز کرتا گیا۔

لو بھئی مسئلہ حل ہو گیا، مَیں نے کہا، ہم سے بڑا عالم تو یہ طیفا چائے والا نکلا۔ اچھا وہاں ہسپتال بھی ہے؟ مَیں نے ایسے ہی پوچھا۔

یہ تو مجھے نہیں پتا۔ ظاہر ہے اگر شاہ کوٹ ہے تو ہسپتال بھی ہوگا وہاں، وہ بولا۔

اِس وقت کتنے بجے ہیں؟ چائے پینے کے دوران مَیں نے حبیب سے پوچھا۔

ساڑھے بارہ بج گئے ہیں؟ حبیب علی نے اُسی سرعت سے جواب دیا۔

میرا خیال ہے مجھے آج ہی شاہ کوٹ روانہ ہو جانا چاہیے۔ مَیں نے اپنے مستقل ارادے کو ظاہر

کیا اور چائے کے ہوٹل سے اُٹھ گئے۔

اتنی جلدی کیا ہے؟ حبیب علی نے وضاحت چاہی لیکن مَیں اُسے وضاحت دینے کے حق میں نہیں تھا۔ مَیں اپنے علاوہ کسی کو بھی یہ معلومات نہیں دینا چاہتا تھا۔ بلاشبہ میری جلدی کی وجہ اپنی والدہ کی ذمہ داری کو پورا کرنا تھا لیکن اُس کی تلاش میں ایک لاشعوری احساس شاید یہ تھا کہ جلد زینت کو دیکھ لیا جائے۔ کتنا ہی عرصہ یہ احساس دبا رہا تھا مگر اب مجھے گھر سے اِسی کام کے لیے بھیجا گیا تھا تو میری ذاتی خواہش کہیں تہوں میں ڈوبی ہوئی اُبھر کر دوبارہ سامنے آ گئی تھی۔ یہ زینت بد بخت مرنے تک دل کے کسی نہ کسی کونے میں پڑی رہے گی۔ جب موقع ملے گا اچھل کر سامنے آ جایا کرے گی۔ اِس کا اندازہ مجھے بالکل نہیں تھا۔ مَیں نے اپنی تمام خواہشات کو دبا کر بس اتنا کہا، جو کام کل کرنا ہے اُسے آج کر کے وقت بچا لیا جائے تو بہتر ہے۔

میاں وقت اُن کے بچتے ہیں جن کے پاس مزید کرنے کو کچھ ہو۔ تم اور ہم وقت کا حساب رکھنے کی ذمہ داری خواہ مخواہ پال لیتے ہیں۔ خیر کیسے جاؤ گے؟ حبیب علی نے بے نیازی سے پوچھا۔

لاری پر جاؤں گا اور کیسے؟

مگر پہلے تسلی کر لو، کس طرف سے راستہ جاتا ہے۔ ہماری طرح کے بُدھو دس میل کا رستہ پچاس میل میں کرتے ہیں۔ بہتر یہ ہے گول چوک اشرف کتاب گھر سے معاشرتی علوم کی کتاب اُٹھا کر اُس میں سے پنجاب کا نقشہ پکڑو اور دیکھ لو شاہ کوٹ کہاں ہے۔ ضروری نہیں ہر چائے والا ٹھیک کہتا ہو۔

وہ کہہ تو رہا تھا گوجرانوالہ میں ایک قصبہ ہے، یہاں سے پہلے گوجرانوالہ میں جاتے ہیں۔ وہاں سے خود ہی پتا چل جائے گا۔ مَیں نے وضاحت پیش کی۔

حبیب علی مجھے دیکھ کر ہنسا اور بولا، بھائی میرے مجھے اِن چائے کے ہوٹلوں اور دُکانداروں سے جتنا واسطہ ہے اُس کے تجربے سے کہتا ہوں یہ لوگ کا مریڈوں سے بھی زیادہ گپی ہیں۔ اِنھیں اپنے گاہکوں اور بیویوں کے محلے یاد ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ لوگ نہ کعبہ کے ہوتے ہیں نہ قبلہ کے۔ ضروری نہیں یہ وہی شاہ کوٹ ہو جہاں تیری ڈاکٹر کا تبادلہ ہوا ہے۔ پنجاب میں جتنے شاہ جاگیردار ہوں گے اتنے ہی شاہ کوٹ ہوں گے۔ یہاں سے تسلی کر کے نکلنا۔

ہم چلتے ہوئے گول چوک کے اشرف کتاب گھر کے سامنے آن رُکے۔ آگے بڑھ کر مَیں نے تیسری جماعت کی معاشرتی علوم اُٹھا لی۔ اُس میں پنجاب کا نقشہ اور پنجاب کے ضلعوں کے نقشے الگ

الگ موجود تھے۔

نقشہ دیکھا تو واقعی حبیب علی کی بات ٹھیک نظر آئی۔ یہ شاہ کوٹ تو ننکانہ صاحب میں تھا۔ گوجرانوالہ کا پورا نقشہ دیکھنے کے بعد بھی مجھے وہاں کوئی شاہ کوٹ نظر نہیں آیا البتہ شادکوٹ ضرور تھا۔

اب میرے لیے مسئلہ یہ تھا کہ یہاں کیسے پہنچا جائے۔ اگر پہلے ننکانہ جاتا تو اُس سے پہلے لاہور اور شیخوپورہ کی طرف جانا پڑتا، وہاں سے شاہ کوٹ جاتا۔ اگر فیصل آباد کی راہ سے جاتا تو فیصل آباد سے پہلے تاندلیانوالہ سے ایک سڑک جڑانوالہ کو جاتی تھی اور وہیں سے شاہ کوٹ کو راستہ تھا۔

مَیں نے حبیب علی سے الوداعی سلام لے کر اُسے وہیں چھوڑا اور لاری اڈے کی طرف نکل گیا تاکہ جتنا جلدی ہو سکے شاہ کوٹ پہنچ جاؤں۔

(۳۷)

یہ لاری اڈہ چھوٹا سا تھا۔ جہاں سے چاروں طرف بسیں نکلتی تھیں لیکن کوئی بس بھی شاہ کوٹ یا ننکانہ نہیں جاتی تھی۔ اِس کا مطلب تھا مجھے فیصل آباد والی بس پر بیٹھنا تھا اور تاندلیانوالہ اُترنا تھا۔ وہاں سے جڑانوالہ کی بس لینی تھی اور جڑانوالہ سے شاہ کوٹ جانا تھا۔ فیصل آباد جانے والی بس کا منہ ٹرک کی طرح کا تھا۔ بس نئی تھی اور سیٹیں انتہائی خوبصورت تھیں۔ بس کے شیشے اِتنے رنگین اور خوبصورت تھے کہ دیکھے جانے کو جی چاہتا تھا۔ مَیں تاندلیانوالہ کا ٹکٹ لے کر سوار ہو گیا۔ یہ دو روپے کا ٹکٹ تھا۔ یعنی کنڈیکٹر نے مجھ سے آٹھ آنے زیادہ وصول کیے تھے۔ سوا ایک بجے بس اڈے سے نکل پڑی اور ٹھیک ڈیڑھ بجے نہر والا پل عبور کر کے فیصل آباد کے روڈ پر جا چڑھی۔ ڈرائیور نے بس کی رفتار اتنی تیز کر دی جیسے ہوائی جہاز پر بیٹھا ہو۔ سڑک بالکل خالی اور ویران تھی۔ دونوں جانب درختوں کی چھاؤں نے اِسے مزید خوبصورت کر دیا تھا۔ رنگین بس جیسے چھاؤں میں اُڑی جا رہی تھی۔ دیکھنے میں ایک پری لگتی تھی۔ شیشے رنگین ہونے کی وجہ سے باہر کی ہر شے سبز اور سُرخ دکھائی دیتی تھی۔ تھوڑی ہی دُور گئی تھی کہ مجھے اُس کے جھولوں میں نیند آ گئی اور جب آنکھ کھلی تو تاندلیانوالہ میں پہنچ چکے تھے۔ یہاں لاری نے دس منٹ رک کر آگے چلنا تھا مگر مجھے یہیں اُتر کر دوسری لاری لینا تھی۔ مَیں تاندلیانوالہ سٹاپ پر اُترا تو دو بج چکے تھے۔ تاندلیانوالا ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ لاری نے جہاں مجھے اُتارا وہاں چار پانچ موٹے تنے کے شیشم کے سایہ دار درخت تھے۔ اُن کے نیچے صاف ٹھنڈے پانی کا نالہ بہہ رہا تھا۔ نالے کے پار اور ٹاہلیوں

کی چھاؤں میں دو چار پھلوں کی ریڑھیاں لگی ہوئی تھیں۔ ان کے پاس ہی ایک چائے اور کھانے کا کھوکھا تھا۔ یہ کھوکھا پانی کے نالے کے اُوپر لکڑی کے پھٹے جما کر اُس پر قائم کیا گیا تھا۔ قریب دو تین چار پائیاں پڑی تھیں۔ میرا جی چاہا پہلے اِسی کھوکھے پر بیٹھ کر کچھ کھا لوں۔ مَیں اُن میں سے ایک خالی چارپائی پر بیٹھ گیا اور ہوٹل والے سے کھانے کے لیے کہا۔ بولا، کیا کھاؤ گے؟

مَیں نے کہا بھائی جو اچھا پکا ہے، دے دو۔

آلو پالک ہی ہے اور تو کچھ نہیں پکا۔

پھر پوچھتے کیوں ہو؟ جو ہے لا دو۔

اتنے میں نزدیک ہی ایک پانی کے نالے پر میری نظر پڑی وہاں ایک بوڑھی خاتون بیٹھی اول فول بول رہی تھی۔ پھٹے اور چیتھڑے کپڑوں کے ساتھ، اُنھیں مَیں اصطلاحاً کپڑے کہہ رہا ہوں۔ ورنہ وہ محض ٹاکیاں تھیں، جنھیں اِدھر اُدھر بے ترتیبی سے لپیٹا ہوا تھا۔ بالوں میں بہت زیادہ مٹی تھی جنھیں دھوئے ہوئے شاید زمانے گزر گئے تھے۔ البتہ سر پر ایک صاف دوپٹہ ضرور تھا۔ بالکل مٹی اور گرد میں لپٹی ہوئی اپنے آپ سے بے نیاز تھی۔ اُس کا منہ میری طرف تھا۔ مَیں سمجھا وہ مجھے ہی مخاطب کر رہی ہے۔ اُس کے زیادہ جملے تو میری سمجھ میں نہیں آئے البتہ کچھ لفظوں کی بار بار تکرار سے چیزیں دہرا رہی تھی، مَیں جب تک کھانا نہیں ملا اُس کی طرف متوجہ ہو گیا اور اُسے مخاطب کر کے پوچھنے لگا، اماں جی کیا مسئلہ ہے، آپ کی بات سمجھ نہیں آ رہی؟

تم نے میرے بیٹے کو دیکھا ہے؟ وہ کل آ جائے گا۔ دیما، میرا دیما، یہاں اسی جگہ وہ کہتا تھا مَیں آؤں گا۔ بے غیرت لے گئے، ابھی نہیں آیا۔ کل رات آئے گا۔ آتا ہے مگر رات کو اور مَیں جب سوئی ہوتی ہوں، اُسی وقت آتا ہے اُسی وقت چلا جاتا ہے۔ مَیں سوتی نہیں۔ پر نیند آ جاتی ہے اور وہ مجھے دیکھ کر چلا جاتا ہے۔ کسی دن پکڑ لوں گی۔ بالکل گورا تھا۔ پھر اُسی وقت اُس نے رونا شروع کر دیا، یہ ساری زمین میری ہے، جو بھی دیمے کو لے آئے گا، اُسے مَیں یہ ساری زمین دے دوں گی۔

کون دیما مَیں نے اُسے دوبارہ پوچھا؟

میرا بیٹا دیما اور کون، تجھے پتا ہے۔ اِن سب کو پتا ہے۔ اللہ کو بھی پتا ہے، وہی اُسے لے گیا۔ ابھی تک نہیں آیا، کہتا تھا سکول گیا ہے۔

اتنے میں ہوٹل والے نے اپنے ہاتھ سے مٹی کی پیالی میں سالن ڈالا اور دو روٹیاں لا کر میرے

سامنے چارپائی پر رکھ دیں اور بولا، بھائی جی آپ آرام سے روٹی کھائیں، یہ عورت پاگل ہے، کئی بار یہاں سے مار کر بھگایا ہے، پھر آ جاتی ہے اور یہاں سے اپنا بیٹا ڈھونڈتی پھرتی ہے۔ منٹگمری سے آئی ہے۔ جو بھی آتا ہے اُسے یہی کچھ کہتی ہے۔

ہوٹل والے کی بات سُن کر میں روٹی کھانے لگا اور اُسے پوچھا، مگر یہاں کیوں آ کر بیٹھ گئی ہے؟ میری دلچسپی دو چند ہو گئی تھی۔

یہاں ساتھ والے گاؤں میں ایک آدمی چودھری ہدایت کئی سال پہلے اِسے یہاں لے آیا۔ بعد میں وہ مر گیا تو اُس کے رشتے داروں نے اِسے گھر سے باہر نکال دیا۔ اُس وقت سے یہیں پھرتی رہتی ہے۔ مَیں اِسے روٹی دے دیتا ہوں۔ یہیں آ جاتی ہے۔ کبھی کبھی پیدل منٹگمری تک نکل جاتی ہے پھر لوٹ آتی ہے۔ اِس کا اصل میں ایک بیٹا تھا۔ اُس کا نام ندیم تھا، آج سے بائیس سال پہلے وہ گم ہو گیا ہے۔ سنا ہے اُسے جہادی لے گئے تھے۔ یہ اُسی وقت سے پاگل ہے۔ جب بھی بس آتی ہے، اُس کی سواریاں دیکھنے لگتی ہے۔

ہماری گفتگو کے دوران وہ بڑبڑائے جا رہی تھی مگر اب لقمہ میرے حلق میں اٹک گیا تھا اور تمام بھوک گویا بھک سے اُڑ گئی تھی۔ مَیں اُسے غور سے دیکھنے لگا۔ ہو نہ ہو یہی وہ عورت تھی جس کا بیٹا عدیلہ کے بیٹے کے ساتھ اغوا ہوا تھا۔ جو وقت اور حالات یہ ہوٹل والا بتا رہا تھا، عین وہی تھے۔ اتنے میں وہ عورت وہاں سے اُٹھی اور بڑبڑاتی ہوئی پاس ہی ایک شہتوتوں کے پیڑ کے نیچے چلی گئی۔ اُس کے دُور ہوتے ہی مَیں دوبارہ روٹی کھانے لگا۔ یہ روٹیاں اُس نے پہلے سے پکا کر رکھی تھیں مگر خالص آٹے کی ہونے کے سبب ابھی تازی معلوم ہوتی تھیں۔ مَیں نے کھانا شروع کیا۔ اُس میں گھی اگرچہ سونگھا یا گیا تھا لیکن بہرحال اچھا تھا۔ اتنے میں اُس نے میرے پاس پانی رکھ دیا۔ مَیں نے کہا یار کھانا تو عمدہ ہے لیکن گھی بالکل نہیں ڈالا۔

بولا، بھائی صاحب یہاں گھی ڈالوں تو کماؤں گا خاک۔ دیسی گھی آج کل ایک تو ملتا کم ہے اُوپر سے اتنا مہنگا ہو گیا ہے کہ سونے کے بھاؤ تُلتا ہے۔ اِس قصبے کے باقی ہوٹل والوں نے تو ڈالڈا گھی شروع کر دیا ہے، لیکن مَیں نے تو اللہ کو جان دینی ہے۔

گھی واقعی دیسی تھا۔ مَیں روٹی کھا کر اُٹھا اور پیسے پوچھے۔ اُس نے تین روپے بتائے۔

اتنے پیسے؟ مَیں نے حیرت سے کہا، بھائی تم نے تو آگ لگا رکھی ہے۔

کچھ دن اور رُک جاؤ، ابھی اور آگ لگے گی میاں۔

ہوٹل والا اپنی سیاست چمکانے کے چکروں میں تھا۔ کچھ عرصے سے چھوٹے بڑے تمام شہروں کے دکانداروں کی عادت ہو گئی تھی کہ اُن سے جیسے ہی ناجائز منافع کا کہو، وہ آگے سے سیاست چھیڑ دیتے ہیں۔ اب آپ اُن سے بحث کرنے سے رہے۔ مَیں نے پیسے ادا کیے اور پوچھا، یہ بتائیے جڑانوالہ کو کون سی بس جائے گی اور کہاں سے جائے گی؟

آپ نے جڑانوالہ جانا ہے؟ وہاں بیٹھے ایک اور آدمی نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

جی ہاں وہیں جانا ہے۔ جانا تو شاہ کوٹ ہے لیکن جڑانوالہ سے ہی شاید لاری آگے جائے گی۔ مَیں نے یہ وضاحت اِس لیے کر دی کہ اگر سیدھی شاہ کوٹ جانے والی لاری بھی ہو تو اُسی پر بیٹھ جاؤں۔

آپ اِس نالے کے ساتھ ساتھ چلے جایئے، سامنے ایک چوک آ جائے گا۔ اُس چوک کے دائیں طرف کچھ ویگنیں کھڑی ہیں، وہ جڑانوالہ ہی جائیں گی۔ اجنبی نے مجھے رستہ بتایا۔

لاریاں بھی جاتی ہیں؟ مَیں نے پوچھا۔

لاریاں بھی جاتی ہیں لیکن وہ کھٹارا لاریاں ہیں، تمھیں بہت دیر سے پہنچائیں گی۔ اِن لوکل رستوں پر یہی ویگنیں عمدہ سواری ہیں۔

مَیں اُس کے بتائے ہوئے رستے پر چل پڑا۔ تھوڑی ہی دُور گیا تھا سامنے قصبے کا چوک آ گیا۔ یہ قصبہ زیادہ تر کچے مکانوں اور پکی دکانوں کا ایک بڑا سا گاؤں تھا۔ بازار بہت کھلے اور صاف تھے۔ چوک میں چند ایک ریڑھیاں تھیں اور دکانوں میں عام استعمال کی اشیا بھری ہوئی تھیں۔ اکثر ریڑھیوں پر اُنگلی نما پتلے کیلے اور چھوٹے چھوٹے مالٹے پڑے تھے۔ ایک چھابڑی پر کالی سیاہ کھجوریں تھیں۔ یہ کھجوریں مٹی اور مکھیوں کی بہتات سے گلا سڑا سا ملغوبہ تھیں مگر اِدھر اُدھر کے گاؤں کے لوگ انھیں شوق سے خریدتے تھے۔ ایک جلیبی اور پکوڑے بنانے والی دُکان پر کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ ساتھ ہی ایک ہوٹل تھا جہاں پانچ آدمی بیٹھے چائے کی چسکیاں لے رہے تھے۔ مَیں وہاں سے دُور کھڑی ویگنوں کا جائزہ لینے لگا۔ اُن کے سامنے کہیں بھی جانے والی تختیاں نہیں لگی تھیں، رہ رہ کر میرے دماغ پر پاگل عورت کچوکے لگا رہی تھی۔ اُس کی ہم نفس عدیلہ کا سفر تو کب کا ختم ہو چکا تھا۔ اللہ جانے اس عورت کو کب تک عذاب میں مبتلا رہنا تھا۔ مَیں اڈے کے پاس پہنچ کر ایک بینچ پر بیٹھ گیا اور وہاں بیٹھے ہوئے ایک آدمی سے جڑانوالہ یا شاہ کوٹ جانے والی ویگن کا پتا پوچھا۔ اُس نے ایک ویگن کی طرف اشارہ کیا اور بتایا،

یہ ویگن یہاں سے تین بجے نکلے گی اور صرف جڑانوالہ تک لے کر جائے گی۔ ڈھائی بج چکے تھے۔ اس کا مطلب تھا نصف گھنٹے بعد روانہ ہونا تھا۔ ایک آدمی نے دوسرے کو آواز دے کر بتایا، اوئے جھارے، اپنی سواری کو بٹھا۔ اُس کی آواز سُن کر جھارا آگے بڑھا اور مجھے کہنے لگا بھائی کہاں جانا ہے؟

میاں جانا تو شاہ کوٹ ہے لیکن آپ جہاں تک لے جائیں۔

بیٹھ جاؤ، جڑانوالہ سے تمھیں شاہ کوٹ کی ویگن پر بٹھا دوں گا۔ وہاں سے تیس میل ہے۔ ویگن کے کنڈیکٹر نے مجھے بتایا۔

مَیں آگے بڑھ کر ویگن میں بیٹھ گیا۔ ویگن میں دس سواریاں میرے علاوہ بیٹھی تھیں۔ یوں تو یہ ویگن پندرہ سواریوں سے زیادہ گنجائش نہیں رکھتی تھی مگر یہ لوگ اُس میں اُوپر نیچے اور چھتوں پر لاد کر پچیس سواریاں پوری کر لیتے تھے۔ مجھ پر اُس نے یہ رحم کیا کہ بابو سمجھ کر ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بٹھا دیا اور بولا، یہاں بیٹھنے کے آٹھ آنے زیادہ لگیں گے۔

دے دوں گا بھائی، مَیں نے اُس کی چالاکی سمجھ کر کہا، ہاکری کرتے ہوئے اُنھیں اتنا پتا ضرور چل گیا تھا کون سی سواری سے کتنا اینٹھنا ہے۔ اللہ اللہ کر کے سوا تین بجے ویگن اڈے سے نکلی اور مَیں دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس پر جتنی سواریوں کی توقع مَیں کر رہا تھا اُس سے بھی چھ سات سواریاں زیادہ بھر لی گئی تھیں۔ وہ تو اللہ بھلا کرے کنڈیکٹر کا مجھے اگلی سیٹ پر بٹھا دیا ورنہ دم نکل جاتا۔ اگرچہ یہ سیٹ بھی دو آدمیوں سے زیادہ بار نہیں رکھتی تھی مگر اُس نے میری طرح کا ہی ایک اور لونڈا اِس میں بھر دیا۔ یوں ہم ڈرائیور سمیت تین آدمی اگلی سیٹ پر ہو گئے۔ باقی سب پیچھے ٹھنسا ٹھنس ہو گئے۔ اُس کے بعد بھی کنڈیکٹر آوازیں دیے جا رہا تھا۔ اِدھر ڈرائیور نے ویگن کے ساتھ وہ کی، جو بدو اونٹ کے ساتھ کرتا ہے۔ روڈ پر سولنگ لگا ہوا تھا اور اُس کے بیچ کئی جگہ کھڈے آتے تھے مگر ڈرائیور اللہ کا بندہ بریک لگانا تو ایک طرف کھڈے کے قریب جا کر مزید تیز کر دیتا تھا۔ سواریاں ایسی نڈر تھیں کہ جھولے لیتی جاتی تھیں اور قہقہے بھرتی جاتی تھیں۔ پورے رستے سڑک کے دونوں طرف کیکروں کے درخت چھاؤں کیے ہوئے تھے۔ بعض اوقات اُن کی شاخیں ویگن پر بیٹھے ہوئے لوگوں سے ٹکرا جاتیں۔ ایک دفعہ تو قہر ہونے لگا تھا۔ ایک موٹی تازی شاخ سڑک کے اوپر عین سامنے سے دیوار بن کر جھکی ہوئی تھی۔ ویگن اُس سے ٹکرانے ہی لگی تھی۔ مَیں ایک دم ڈر گیا کہ یہ شاخ ضرور ویگن کی چھت پر بیٹھے لوگوں سے ٹکرا جائے گی اور دو تین لوگ یہاں بے موت مارے جائیں گے۔ عین اُسی لمحے ڈرائیور نے ویگن کا ہینڈل

دوسری طرف گھما کر ویگن کو ایک طرف سے گزار کر لے گیا اور میری طرف دیکھ کر ہنسنے لگا۔ بولا باؤ جی آپ نہ ڈرو، ہمارا روز کا کام ہے لیکن اُس کی بے پروائی اور بے نیازی سے میرا خون خشک ہو گیا تھا اور جی میں تھا جتنی جلدی ہو سکے جڑانوالہ آ جائے۔

ساڑھے تین بجے کے قریب ویگن نے جڑانوالہ جا کر دم لیا اور مَیں گویا قید سے چھُٹا۔ جڑانوالہ شہر تاندلیانوالہ سے قدرے بڑا تھا۔ اِس شہر میں کہیں درخت نام کی شے نظر نہیں آئی۔ دُکانیں بھی تاندلیانوالہ سے تھوڑی سی ترقی یافتہ تھیں اور ایک لائن میں نظر آ رہی تھیں، لیکن جا بجا کھلے میدان یہاں بھی پڑے تھے۔ ویگن کا اڈہ غلہ منڈی کے قریب تھا۔ منڈی میں زیادہ تر گڑ اور دیسی کھنڈ اور شکر کا کاروبار ہو رہا تھا۔ کہیں کہیں تمباکو، مکئی اور ونڈے کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ زمیندار اور بیوپاری پگڑیاں باندھے اپنے مال کی بولیاں لگوا رہے تھے۔ ایک جگہ سفید زرد اور سنہرے رنگ کے گڑ کا ڈھیر لگا تھا۔ اُسے دیکھ کر میرے منہ میں ایک دفعہ پانی بھر آیا لیکن مَیں اِس سب کو دیکھ کر آگے گزر گیا۔ پیچھے سے مجھے اُسی کنڈیکٹر نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے آواز دی، باؤ جی وہاں سے ٹیڈی بس شاہ کوٹ جائے گی۔ لاری تیار ہے جلدی سے چڑھ جاؤ۔ اِس لاری کے سامنے شاہ کوٹ کی تختی لگی ہوئی تھی۔ مَیں بغیر پوچھے اُس پر سوار ہو گیا۔ اندر کافی ساری سیٹیں خالی تھیں۔ مَیں اُن میں سے ایک ونڈو والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ لاری تھوڑی ہی دیر میں چل پڑی۔ اب مجھے نیند آ رہی تھی اور مَیں سیٹ پر ہی سر رکھ کر سو گیا۔ پتا نہیں کتنی دیر سویا رہا مگر آنکھ کھلی تو لاری شاہ کوٹ میں داخل ہو رہی تھی۔ لاری سے اُتر کر مَیں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ یہ تو قصبے سے بھی چھوٹا علاقہ تھا۔ بالکل ہمارے گاؤں کی طرح کا۔ ذرا سا اُس سے بڑا۔ پرانے اور سکھوں کی طرز کے مکان تھے۔ اکثر کچے تھے۔ پکے مکانوں پر ممٹیاں اور چھجے بنے ہوئے تھے۔ سڑکیں تنگ تھیں اور ہمارے گاؤں کی سڑکوں کی طرح سیدھی بھی نہیں تھیں۔ آبادی بالکل کم تھی۔ مَیں نے فوراً ہی ایک آدمی سے ہسپتال کا پتا پوچھا۔ اُس نے ایک طرف کا اشارہ کیا اور کہا اِس بازار میں تھوڑی دور تک جاؤ گے تو ایک پانی کا تالاب آئے گا۔ اُس تالاب کے دوسری طرف ہسپتال ہی ہے۔ تالاب کے دونوں طرف سے سڑکیں نکلتی ہیں، جس طرف سے چاہے مُڑ جانا اور ہسپتال چلے جانا۔ یہ ایک بالکل ویران جگہ تھی۔ شام کا وقت ہو گیا تھا۔ ساڑھے چھ بج چکے تھے لیکن گرمی کے موسم کے سبب ابھی شام کا سرمئی پن نہیں ہوا تھا۔ مَیں پانچ منٹ چلا ہوں گا کہ سامنے ایک تالاب آ گیا۔ اِس میں بھینسیں تیر رہی تھی اور بطخیں ڈبکیاں لگا رہی تھیں۔ تالاب کافی بڑا اور پانی سے بھرا ہوا تھا لیکن پانی

صاف نہیں تھا۔ مَیں تالاب کے بائیں طرف کی سڑک سے چکر کھا کر چار پانچ منٹ میں ہسپتال کے گیٹ پر پہنچ گیا۔ اِس ہسپتال کو دیکھ کر مجھے فوراً اپنے گاؤں کی ڈسپنسری یاد آ گئی۔ بالکل وہی صورت تھی مگر ذرا بڑی تھی۔ اِس کے بڑے لوہے کے گیٹ سے اندر داخل ہو گیا۔ وہاں ایک چوکیدار پھر رہا تھا، وہ میری طرف بڑھا لیکن مَیں اُسے نظر انداز کر کے آگے بڑھ گیا، ہسپتال میں مریض بھی تھے اور وہ چل بھی رہا تھا جبکہ ہماری ڈسپنسری برباد ہو گئی تھی۔ مَیں برآمدوں میں آ گیا۔ وہاں ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ اُس کا لباس نرسوں والا تھا۔ مجھے کہنے لگی، جی فرمایئے؟

مَیں نے کہا، مَیں مریض نہیں ہوں، کسی کام سے آیا ہوں۔

کیا کام ہے؟ لڑکی نے بہت ہی نرم لہجے میں پوچھا۔

یہاں کے ڈاکٹر صاحب کا نام کیا ہے؟

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مَیں ڈاکٹر فرح کے بارے میں کیسے پوچھوں۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے ابھی اُس سے ملاقات ہو جائے گی اور وہ مجھے دیکھ کر ایک دم حیران رہ جائے گی۔ پھر مَیں اُسے کیسے بتاؤں گا کہ مَیں کس مقصد کے لیے آیا ہوں۔ اسی طرح کے خیالات میرے دماغ پر حملہ کیے ہوئے تھے۔

اُس نے میری شکل غور سے دیکھتے ہوئے کہا، اُن کا نام ڈاکٹر لطیف صاحب ہے۔ آپ کام بتائیں کیا ہے؟

آپ ڈاکٹر فرح کو جانتی ہیں؟ مَیں نے دوسرا بے تکا سوال کر دیا اور اُسے میرے دماغ پر شبہ ہونے لگا۔

یہاں کوئی ڈاکٹر فرح نہیں ہے۔ مَیں جب سے یہاں ہوں، ڈاکٹر لطیف صاحب ہی یہاں مستقل ہیں۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھے ہیں۔

مَیں اُن سے مل سکتا ہوں؟ مَیں نے گویا اپنی خجالت دور کرنے کی کوشش کی۔

آپ یہاں ٹھہریں مَیں اُن سے پوچھ لوں۔ یہ کہہ کر وہ ایک کمرے میں چلی گئی اور اُسی وقت باہر آ کر کہا، آپ کا نام کیا ہے؟ اور کہاں سے آئے ہیں؟ اور ڈاکٹر صاحب سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟

میرا نام ضامن ہے، منٹگمری کی ایک تحصیل کے ایک گاؤں سے آیا ہوں۔ اُن سے ایک ضروری کام ہے۔

اُس نے تھوڑی دیر سوچا پھر واپس کمرے میں چلی گئی اور دو تین منٹ کے بعد دوبارہ نمودار ہوئی۔ اُس نے ایک آدمی کو آواز دی، رفیق اِدھر آؤ، اُس کی آواز سُن کر ایک موٹا تازہ باریک مونچھوں والا آدمی دوڑ کر آ گیا۔ وہ دو قدم آگے بڑھ کر اُس کے پاس گئی۔ اُسے کچھ کھسر پھسر کی اور واپس آ کر اپنی جگہ بیٹھ گئی۔ مَیں اُسے کھڑا دیکھتا رہا اور حیران ہو رہا تھا آخر کیا بات ہے؟ مَیں نہ کوئی پولیس والا تھا، نہ منشیات کا کاروبار کرتا تھا پھر اتنی احتیاط کیوں تھی۔ اِتنے میں وہ سانڈ میرے پاس آیا اور بولا چلیے صاحب ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں۔ اتنا کہہ کر وہ میرے پیچھے ہولیا۔ جیسے مجھے دھکیلتا ہوا جا رہا ہو۔

مَیں اندر چلا گیا۔ یہ ایک نوجوان ڈاکٹر تھا۔ مجھ سے آٹھ دس سال بڑا ہو گا۔ چھوٹی چھوٹی سنہری مونچھیں تھیں۔ رنگ گورا اور قدرے کاندھے جھکے ہوئے تھے۔ لیکن انتہائی باوقار اور تمیز دار نظر آ رہا تھا۔

آیئے بیٹھیں۔ اُس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا جو اُس کی میز کے اِس پار تھی۔

مَیں آرام سے کُرسی پر بیٹھ گیا اور اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ بولا ، جی بھائی کیا بات ہے؟ ڈاکٹر نے انتہائی خوشگوار لہجے میں بات کی۔

سر یہاں ساڑھے چار سال پہلے ایک خاتون ڈاکٹر فرح کا تبادلہ ہوا تھا۔ مجھے اُس سے ملنا تھا۔ مَیں نے بیٹھتے ہی اپنے مطلب کی بات کی۔

آپ کا نام شریف؟ ڈاکٹر فرح کا نام سُن کر ایسے لگا جیسے ایک دم ہشیار ہو گیا ہو۔

میرا نام ضامن ہے۔

آپ ڈاکٹر فرح کے کیا لگتے ہیں؟ میرا مطلب ہے آپ اُس کے رشتے دار ہیں یا دوست ہیں؟

مَیں نہ تو اُس کا رشتے دار ہوں، نہ دوست ہوں۔ بس ایک ذمہ داری تھی جو میری ماں نے میرے سر پر ڈال رکھی ہے۔ اُسے پوری کرنے کے لیے اُسے ڈھونڈ رہا ہوں لیکن آپ کیوں اتنی تحقیق کر رہے ہیں۔

کون سی ذمہ داری؟ ڈاکٹر نے دوبارہ مجھے غور سے دیکھا۔

اُس کی ایک امانت میری والدہ کے پاس پڑی تھی۔ وہ امانت اُس نے تب رکھوائی تھی جب ہمارے گاؤں کی ڈسپنسری میں تبادلہ ہو کر آئی تھی اور وہاں تین سال رہی تھی۔ اچانک ایک رات چلی گئی۔ میری والدہ کو پتا نہیں چلا کہ وہ گاؤں سے چلی گئی ہے۔ اب وہ چاہتی ہے وہ امانت اُس تک پہنچا

دی جائے۔

مجھے آپ کی بات سمجھ نہیں آئی، امانت کیا ہے؟ ڈاکٹر کا استعجاب بڑھتا جا رہا تھا۔

مجھے ڈاکٹر صاحب حیرت ہے آپ اتنی تفتیش کیوں کر رہے ہیں؟ مَیں نے زچ ہو کر کہا، امانت کے بارے میں تو میری ماں نے بھی مجھے نہیں بتایا کہ وہ کیا ہے۔

میرے بھائی تفتیش اِس لیے کر رہا ہوں کہ ڈاکٹر فرح صاحبہ قتل ہو چکی ہیں۔ اب ڈاکٹر نے اپنی کُرسی سے پشت کو ذرا اُٹھا کر اِس زور سے انکشاف کیا کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اُسے قتل ہوئے دو سال ہو چکے ہیں۔

مَیں ساکت ہو گیا تھا۔ میرے لیے یہ شاک اتنا بڑا تھا کہ مَیں اُس کی سنسناہٹ سے کرسی کے ساتھ چپک کر رہ گیا اور زبان تالو سے لگ گئی۔ کچھ دیر کے لیے اتنی خاموشی ہو گئی کہ ہم دونوں اُس سے گھبرا گئے۔ مجھے اب بالکل نہیں سوجھ رہا تھا ڈاکٹر سے آگے کیا پوچھوں۔ میرا گلا خشک ہو گیا تھا۔ مَیں نے محسوس کیا اِتنا صدمہ شاید مجھے عدیلہ کے مرنے پر نہیں ہوا تھا جو رنج کی کیفیت اِس خبر سے میری رگوں میں دوڑ گئی تھی۔ ہم کچھ دیر دونوں خموش بیٹھے رہے اور ڈاکٹر مجھے دیکھتا رہا۔ تب مَیں نے ہکلاتے ہوئے پوچھا، کیسے قتل ہوئی؟

آپ پہلے اُس کی وہ امانت بتائیں کیا ہے؟ مَیں یہ تو دیکھوں آپ کون ہیں؟ ویسے بھی اِس وقت مریضوں کا ہجوم ہے۔ آپ مہربانی کر کے اب چلے جائیں۔ مجھے مریض چیک کرنے ہیں۔

دیکھیے ڈاکٹر صاحب آپ مریض چیک کریں مَیں باہر بیٹھ جاؤں گا۔ مَیں آج اپنے شہر سے گیارہ بجے نکلا ہوں اور اِسی لیے نکلا ہوں۔ جب آپ فارغ ہو جائیں گے تو مجھے براہِ کرم پانچ دس منٹ دے دیجیے گا۔

ڈاکٹر میری بات سُن کر خوش ہو گیا۔ اِس کا مطلب تھا وہ مجھے سنجیدہ لے رہا ہے اور میرے ساتھ ڈاکٹر فرح کے متعلق بات کرنے پر راضی تھا لیکن یہ بات تو طے تھی مَیں اُسے امانت کے متعلق کچھ نہیں بتانے والا تھا۔ البتہ اُس سے ڈاکٹر فرح کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلوم کرنا بہت ضروری ہو گیا تھا ورنہ میری معلومات پلٹ کر میرے گھر تک محدود ہو جاتیں۔ مَیں اُٹھ کر واپس اُسی بنچ پر آ بیٹھا جہاں کچھ دیر پہلے لڑکی سے بات ہوئی تھی۔ یہاں اِکا دُکا مریض آ جا رہے تھے اور لڑکی اُن کی پرچی کاٹ کر اُنھیں انتظار گاہ میں بٹھا رہی تھی۔ ایک مزید نرس اُن کو اپنی باری پر چیک کر رہی تھی۔ یہاں مریضوں کی تعداد

دس پندرہ سے زیادہ نہیں تھی۔ ایک مریضوں کا بیڈروم تھا جہاں فقط چھ بستر لگے تھے۔ ایک اور بیڈروم میرے بائیں جانب تھا۔ اُس میں دو بیڈ تھے۔ اِن میں سے چار بستر خالی تھے۔ بائیں جانب والے بیڈروم پر دونوں بستر خالی تھے اور دو دائیں جانب کے بیڈ پر خالی بستر تھے۔ ہسپتال کے باہر ایک چھوٹا سا تانگوں کا اڈہ تھا۔ یہ تانگے مریضوں کے علاوہ سواریاں بھی ڈھوتے ہوں گے۔ دو بڑے نیم کے درخت ہسپتال کے اندر کھڑے تھے۔ اِن کا سایہ صحن کے علاوہ کمروں کی چھتوں پر بھی جاتا تھا۔ میری پچھلی جانب دو چھوٹی چھوٹی کیاریاں تھی۔ اُس سے آگے کوارٹر در کوارٹر تھے۔ یہ کوارٹر ہمارے گاؤں کی ڈسپنسری کی طرح ہسپتال کے عملے کے لیے ہوں گے۔ مجھے بالکل علم نہیں تھا یہاں ڈاکٹر کی کوٹھی کونسی ہے اور دوسرے عملے کے لیے کون سے کوارٹرز ہیں۔ میری نظر میں اِس وقت تمام چیزیں بھول کر فقط ڈاکٹر فرح کا چہرہ تھا جسے کچھ ہی دیر پہلے میں فوت ہوتے دیکھ رہا تھا۔ وہ کب کی فوت ہوئی تھی۔ مَیں اِس سے بے خبر تھا اور صرف اُس ڈاکٹر کی معلومات کا منتظر تھا جس کا مجھے شدت سے انتظار تھا۔ میرے لیے ڈاکٹر فرح پہلے کبھی اتنی اہم نہیں رہی تھی لیکن جب سے میری ماں نے مجھ پر ذمہ داری ڈالی، مجھے اس سے سروکار ہو گیا اور اب وہ اچانک اُس سے بھی کئی گنا اہم ہو گئی تھی۔ کیوں، شاید مَیں یہ بھی نہیں جانتا تھا۔ ایک وقت اچانک مجھے ایسا خیال آیا کہ مَیں اُس خیال سے شرمندہ ہو گیا مگر وہ خیال دوبار مجھے آیا تھا۔

اب وہ تمام سونا اور پیسے صرف ہمارے ہو چکے ہیں لیکن اُن کے ہمارے ہونے میں ہماری کسی بے ایمانی یا خیانت کا دخل نہیں تھا۔ ڈاکٹر فرح بھی نہیں رہی تھی پھر کیسے اور کس سے زینی کی خبر مل سکتی تھی اور یہ بھی ہو سکتا ہے زینی کو بھی مار دیا گیا ہو۔ زینی کے متعلق اِس طرح کی سوچ میرے دماغ میں ایک کچوکے کی طرح لگی مَیں نے جھرجھری لے کر اپنے سر کو جھٹکا اور خود پر لعنت کی۔ یہ خیال صرف سونے کی حرص سے میرے دماغ میں نفوذ ہوا تھا۔ مَیں یہ کن گمراہ کن خیالوں میں پڑ گیا تھا۔ جس کا نتیجہ ہو سکتا ہے میری ذلت پر ختم ہو۔ اتنے میں ایک لڑکا میرے لیے چائے لے کر آ گیا۔ یہ چائے چینی کی چینک میں انتہائی عمدہ اور صاف طریقے سے لایا تھا۔ ضرور اُسے ڈاکٹر نے بھیجا ہو گا۔ مَیں چائے پینے لگا۔ اِس عرصے میں میرا دماغ دوبارہ فرح کی طرف مُڑ گیا۔ اُس کی ہسپتال میں آمد، ہماری پہلی ملاقات، اُس کے کُرتے پر لگی نچلی طرف سے جھالر، سب چھوٹی چھوٹی چیزیں ایک فلم کی طرح گردش کرنے لگیں۔ کچھ دیر کے لیے ایسے لگا جیسے اپنے پچھلے دور میں چلا گیا ہوں۔ اُسی وقت زینی کا فرح کے بیٹے کے ساتھ چلے جانا۔ کس قدر اذیت ناک لمحے تھے۔ مَیں نے اپنے آپ کو زبردستی حالیہ لمحوں کے ساتھ منسلک کیا۔

پھر میرا دماغ اِس ہسپتال کی طرف دوڑ گیا۔ مَیں صحن میں آنے جانے والوں کو سرسری دیکھنے لگا۔ اس حالت میں مجھے ڈیڑھ گھنٹا گزر گیا۔ اب سب مریض جا چکے تھے اور نیا کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھے کسی قسم کی جلدی نہیں تھی۔ شام ہو گئی تھی۔ مَیں گاؤں میں رہنے والا عام سا لڑکا تھا اور کسی بھی کھیت کھلیان میں رات کاٹنا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ مَیں نے سوچا جو بھی ہو ڈاکٹر سے میڈم فرح کی بابت پوچھ کر ہی جاؤں گا، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔

مَیں ڈاکٹر فرح کے پہلے دن کی ملاقات والے چہرے کو بار بار یاد کر رہا تھا۔ اُس کا مجھے پانچ روپے دینا معمولی بات نہیں تھی۔ وہ کتنی صاف اور اچھی خاتون تھی۔ ہمارے گاؤں کے ہسپتال کو اُس نے ایک ہرا بھرا چمن زار بنا دیا تھا اور جب سے گئی تمام کچھ اُجڑ گیا تھا۔ اب تو وہ سرے سے ڈسپنسری رہی ہی نہیں تھی۔ بد بخت معیز نے اُسے کھنڈر بنا کر رکھ دیا۔ اچھا ہوا وہاں سے دفع ہو گیا۔ ورنہ اور اللہ جانے کیا کچھ چاند چڑھاتا مگر اُس کے جیل جانے نے بھی عدیلہ کی قربانی لی۔ مَیں اُس کے خلاف عدالت میں دو بار جا کر گواہی دے چکا تھا۔ عدیلہ کی بیٹیاں مقدمہ لڑ رہی تھیں۔ معیز کی پیروی کرنے والا کوئی نہیں بچا تھا چنانچہ اُسے دو قتل کے عوض آج نہیں تو کل سزائے موت ہونا تھی۔ مَیں اِن سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ ڈاکٹر نے میرے پاس آ کر کھنکھارا۔ مَیں نے اُوپر دیکھا، وہ بولے ضامن صاحب میرے ساتھ آئیں۔ مَیں اُٹھ کر ڈاکٹر صاحب کے پیچھے چل پڑا۔ ہم چند لمحوں میں ہسپتال سے باہر نکل گئے۔ وہ مجھے لے کر ایک مکان کی طرف چلا گیا۔ ہسپتال سے پچھلی جانب چوڑی سی گلی تھی۔ اِس گلی کے آخری کونے پر ایک بڑا سا باغیچہ آ جاتا تھا۔ یہاں کنیروں اور کچھ پھولوں کے پودے لگے تھے۔ ایک بہت بڑا شیشم کا درخت صحن میں موجود تھا۔ سامنے ایک برآمدہ تھا۔ وہاں دو تین کرسیاں پڑی تھیں اور کمروں کے دروازوں کی کنڈیاں کھلی تھیں۔ ایک خاتون وہاں جھاڑو دے کر کرسیاں صاف کرنے لگیں۔ ڈاکٹر لطیف صاحب نے مجھے ایک کرسی پر بٹھا دیا اور بولا، ضامن صاحب ڈاکٹر فرح یہیں رہتی تھی۔ یہ آج سے تین سال پہلے کی بات ہے، مَیں نے نیا نیا ایم بی بی ایس کیا تھا۔ ایک دو سال دوسری جگہوں پر گزار کر یہاں آیا تھا۔ اِس ڈسپنسری میں میرا تبادلہ ہو گیا تھا۔ میڈم فرح صاحبہ مجھ سے ایک سال پہلے یہاں آئی تھی اور مَیں اُس کے اسسٹنٹ کے طور پر کام کرتا تھا۔ وہ بہت اچھی ڈاکٹر کے ساتھ عمدہ خاتون بھی تھی۔ میرا بہت خیال رکھتی تھی۔

مَیں نے کنگ ایڈورڈ سے میڈیکل کر کے دو سال اِدھر اُدھر گزارے پھر یہاں آ گیا اور اُس

وقت سے اب تک یہیں ہوں۔ اِس کی سب سے بڑی وجہ میڈم فرح ہی ہے۔اُن کے قتل پر مجھے بہت بڑا صدمہ ہوا۔ وہ مجھ سے کافی بڑی تھی لیکن سچ پوچھیں تو مَیں اُس کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا اُس کے کیا مسائل ہیں۔ مجھ سے اپنے متعلق کچھ بات نہیں کرتی تھی۔ اُس کے دماغ میں خدا جانے کیا چلتا رہتا تھا۔ کبھی سامنے بیٹھی کسی اور ہی سوچ میں ڈوب جاتی۔ مَیں نے بہت دفعہ اُس سے پوچھنے کی کوشش کی مگر اُس نے مجھے سختی سے منع کر دیا کہ اُس کے ذاتی حالات کے بارے میں کوئی بات نہ کروں۔ اِدھر مَیں اپنی طرف سے بے بس ہوتا جا رہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ اِس بات کا اُسے بھی احساس تھا۔ ایک دن مجھے بلا کر کہنے لگی، ڈاکٹر لطیف تم اپنے آپ پر کنٹرول کرو۔ کچھ چیزیں فطرت اپنی طاقت سے کرواتی ہے اُن پر انسان کی ذاتی خواہشات کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ تم میری فکر چھوڑو اپنے مریضوں پر دھیان کیا کرو۔ لیکن ضامن صاحب سچ بتاؤں تو مَیں آہستہ آہستہ خود مریض بنتا جا رہا تھا۔ پھر وہ اکثر ہسپتال سے غیر حاضر رہنے لگی۔ ہفتہ ہفتہ چھٹیوں پر چلی جاتی۔ اُس کا گھر کہاں تھا۔ مَیں نے بہت دفعہ پوچھنے کی کوشش کی مگر اُس نے نہیں بتایا بلکہ ایک دن مجھ سے بگڑ گئی۔ بولی ڈاکٹر لطیف تمھیں مجھ سے ذلیل ہونے کی خواہش ہے کیا؟ اپنے کام سے کام رکھا کرو۔ میرے معاملات میں دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مَیں سہم کر چُپ کر گیا۔ دوسرے دن وہ پھر غائب ہو گئی اور پورے تین ماہ کی چھٹیاں لے گئی۔ میرا خیال تھا وہ مجھ سے اُکتا گئی ہے اور تبادلے کی کوشش میں ہے چنانچہ مَیں نے اُن سے بات کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ایک دن آدھی رات کے وقت ایک جیپ پر آئی اور مجھے بلا بھیجا۔ مَیں رات کے دو بجے یہاں پہنچا، دیکھا اُس کی حالت بالکل بدلی ہوئی تھی۔ چہرے کی ہڈیاں نکلی ہوئی تھیں۔ بال خشک تھے اور صحت نہایت خراب ہو چکی تھی۔ مَیں حیران تھا، اِسے اچانک کیا ہو گیا ہے۔

آپ میری اِس طویل داستان سے بیزار تو نہیں ہو رہے؟ ڈاکٹر لطیف نے ایک دم بات روک کر کہا۔

ہرگز نہیں ڈاکٹر صاحب آپ بات جاری رکھیں، مَیں آپ سے زیادہ غمناک ہوں۔ اگر مجھے معلوم ہوتا ڈاکٹر فرح اِس قدر جلد رخصت ہو جائے گی اور مجھے معاملے کی سنجیدگی کا پتا ہوتا تو مَیں وہ پانچ کا نوٹ ضرور سنبھال کر رکھتا اور آج آپ کو دکھاتا جو پہلے دن اُس نے مجھے اُس وقت دیا تھا جب مَیں محض دس برس کا تھا۔

مَیں یہیں بیٹھا تھا اِسی کُرسی پر۔ ڈاکٹر دوبارہ بولا، وہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ مجھے اُس نے صرف اُسی دن میرے نام سے پکارا، کہنے لگی لطیف مَیں تمھیں ایک دردناک کہانی سناتی ہوں۔ اُسے یادرکھنا اور میری دو امانتیں ہیں۔ اُنھیں تلاش کرنے کی کوشش کرنا۔

وہ کیا کہانی تھی۔ مَیں نے بےصبری سے ڈاکٹر لطیف کی طرف دیکھا۔

ڈاکٹر فرح کی شادی ایک ڈاکٹر کے ساتھ ہوئی تھی لیکن اُس سے ایک بیٹے کے بعد اُس کی طلاق ہو گئی تھی۔ یہ وہی جنید ہے جو آپ کے گاؤں سے ایک زینت نامی لڑکی کو لے گیا تھا۔ یہ لڑکی وہاں ڈسپنسری کی ایک نرس عدیلہ کی بیٹی تھی۔ جنید اُسے لے کر سیدھا اپنے والد کے پاس پہنچا۔ ڈاکٹر فرح اپنے بیٹے کی تلاش میں اُس تک پہنچی مگر اُس کے خاوند زبیر نے جنید کو اپنے ساتھ نہیں کسی اور جگہ رکھا ہوا تھا اور ماں سے نہیں ملنے دیا اُسے صاف کہہ دیا کہ وہ نہیں جانتا جنید کہاں ہے۔ دراصل اُس کے دماغ میں کچھ اور چل رہا تھا۔ جنید کے والد زبیر اور جنید نے آپس میں یہ طے کیا کہ ڈاکٹر فرح کو پتا نہ چلے کہ وہ یہاں کراچی میں اُس کے پاس ہے۔ ڈاکٹر فرح نے بہت کوشش کی کہ اُسے جنید مل جائے مگر اُس کے سابقہ خاوند نے کسی بھی طریقے سے اُسے ملنے نہیں دیا۔ ڈاکٹر فرح کے لیے جنید کے حوالے سے سب سے بڑی فکر اُس کے کزن طلال احمد کی طرف سے تھی۔ طلال خانیوال کے ایک بڑے زمیندار کا بیٹا تھا اور ڈاکٹر فرح کا دشمن تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا اُس کی ملکیتی زمین رشتے داروں میں تقسیم ہو جائے۔ اُس نے اپنے باپ کے ساتھ مل کر ڈاکٹر فرح کے والد اور اُس کی سوتیلی والدہ اور اُس کے چچا کو قتل کر دیا۔ اُن دِنوں ڈاکٹرِ فرح کالج کے آخری سال میں تھی اور گھر پر نہیں تھی۔ اِس لیے بچ نکلی۔ وہ اپنے آپ کو چھپا کر غائب ہو گئی۔ اُسے اصل فکر یہ تھی کہ زبیر جنید کو جائداد کی وصولی کے چکروں میں ڈال کر اُس کی جان کو خطرے میں نہ ڈال دے۔ وہ جانتی تھی زبیر ایک لالچی انسان ہے۔ اُس کی ڈاکٹر فرح کے ساتھ طلاق کا سبب بھی یہی تھا۔ وہ جنید کو دونوں طرف سے چھپائے پھرتی تھی یعنی اپنے کزن طلال سے اور اپنے خاوند سے لیکن ضامن صاحب ہونی کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔ جنید ایک دن اپنے باپ کے پاس چلا گیا۔ وہاں اپنی ماں سے چھپ کے رہا۔ وہیں اُس کے بچے ہوئے لیکن جنید کی سوتیلی ماں کو منظور نہیں تھا کہ جنید اُس کے خاوند کا مال کھائے۔ اُس کی اپنی اولاد بھی ہو چکی تھی۔ حالات کشیدہ ہوتے گئے۔ اب جنید اور اُس کے باپ نے وہی جائداد حاصل کرنے کی کوشش کی جس سے ڈاکٹر فرح بھاگ کر نکلی تھی۔ باپ بیٹے نے خانیوال جا کر عدالت میں جائداد کی بازیابی کا مقدمہ کر دیا۔ اِس مقدمے کی تیسری تاریخ

پر جنید قتل ہو گیا اور جنید کا والد کہیں غائب ہو گیا۔ دو گولیاں جنید کے والد کو بھی لگیں مگر وہ بچ نکلا۔ اُس کی خبر میڈم فرح کو ہوئی۔ وہ تین ماہ تک مسلسل اپنے بیٹے کی لاش پر روتی رہی۔ پھر ایک دن خانیوال جا کر اپنے کزن طلال کو قتل کرنے کی کوشش کی۔ اُس نے طلال پر ایک پسٹل سے دو فائر کیے اور بھاگ نکلی۔ وہ یہاں کیسے پہنچی اِس کی خبر مجھے بعد میں ہوئی۔ اُس نے اُسی شام طلال پر فائر کیے تھے جس رات وہ یہاں پہنچی تھی۔ اُس رات وہ سمجھ چکی تھی کہ وہ مرنے والی ہے۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اُس نے ایک ایجنٹ سے ایک پسٹل حاصل کر لیا تھا۔ پھر گھر میں اُس پر سائیلنسر لگا کر نشانے لگایا کرتی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا اُس کی مصروفیتیں کیا تھیں۔ پھر جیسا کہ مَیں نے آپ کو بتایا ہے، وہ چھ مہینے کے لیے بالکل غائب ہو گئی اور جب آئی تو طلال کو اپنی طرف سے قتل کر کے آئی تھی۔ طلال کا قتل چھوٹی بات نہیں تھی۔ ڈاکٹر فرح کہنے لگی مَیں صبح اذان کے وقت یہاں سے چلی جاؤں گی لیکن اُسی رات صبح ہونے سے پہلے اُسے پولیس نے پکڑ لیا۔ خیر یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ اصل ظلم یہ ہوا کہ ڈاکٹر فرح کے فائر طلال کو لگے ضرور تھے مگر وہ بچ نکلا تھا جس کی خبر ڈاکٹر فرح کو نہیں تھی۔ اُسے معلوم ہی نہیں تھا کہ صرف فائر مارنے سے انسان مرتا نہیں ہے۔ وہ ڈاکٹر ہونے کے باوجود یہ نہیں سمجھ سکی کہ وہ عادی قاتل نہیں تھی چنانچہ اُس کے فائر ٹھیک جگہ پر نہیں لگے تھے اور طلال ہسپتال میں جا کر بچ گیا تھا اور ایک ماہ بعد ہی چلنے پھرنے لگا تھا مگر فرح کو اِس بات کی خبر نہیں ہوئی۔ وہ اپنی قبر میں لیٹی ابھی تک اپنے آپ کو طلال کا قاتل سمجھ رہی ہو گی کیونکہ اُسی رات پولیس نے اُسے یہاں سے باہر نکالتے ہی گولی مار دی۔ بعد میں مجھے خبر ہوئی کہ اُس کے قتل میں ہمارے محکمے کا بھی ہاتھ تھا۔

طلال احمد اپنے علاقے کا بااثر زمیندار ہونے کے ساتھ ایک سیاستدان بھی تھا اور پچھلے دو الیکشن جیت چکا تھا اور حکومتی ایوان کا حصہ تھا۔ پولیس آئی جی اور ڈائریکٹر محکمہ ہیلتھ اِس میں ملوث تھے ورنہ انھیں کیسے پتا چل سکتا تھا کہ ڈاکٹر فرح طلال کو قتل کرنے کے بعد یہاں موجود ہے۔ اُسے تو اُن کے خاندان والے بالکل نہیں جانتے تھے۔

اب میرے سامنے مکمل اندھیرا ہے۔ زینت کدھر ہے، اِس سے مجھے سروکار نہیں۔ مَیں تو بس اِس ہسپتال میں بیٹھا ہوں اور جب تک یہ ہسپتال ہے۔ ڈاکٹر فرح میرے ساتھ ہے مَیں اکثر اُس سے باتیں کرتا ہوں۔ آپ ہنس رہے ہوں گے۔ ایک ڈاکٹر خود مریض بن کر مریضوں کا علاج کیسے کرے گا لیکن وہ علاج مَیں کر رہا ہوں۔

ڈاکٹر صاحب مجھے بہت افسوس ہوا کہ مَیں نے آپ کے زخموں پر نمک چھڑک دیا۔ اصل میں ذاتی طور پر مَیں خود ایک مریض ہوں۔ اِس کے بعد اُسی چوک پر آ کر کھڑا ہو گیا ہوں جس کا پھاٹک بند ہے اور سامنے کوئی رستہ کھلا نظر نہیں آتا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب آپ نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کون سی دوائیں تھیں جنھیں آپ نے ڈھونڈنا تھا۔ مَیں نے اُس سے متجسس انداز میں پوچھا۔

ڈاکٹر نے اپنا پہلو بدلا، یہی تو اذیت کی بات ہے، اِس سے پہلے کہ وہ اُن امانتوں کے متعلق کچھ بتاتی، پولیس نے چھاپا مار دیا اور اُسے یہاں سے گرفتار کر کے نکل گئی۔ ڈاکٹر فرح کو یہ سب بتانے کی مہلت ہی نہیں ملی۔

ڈاکٹر لطیف نے ایک بار پھر میرے سامنے ایک مکمل خلا رکھ دیا تھا جس میں مجھے رنگ بھرنے تھے مگر میرے ہاتھ میں کسی رنگ کی کوئی سبیل نہیں تھی، نہ مُوقلم تھا نہ کینوس تھا۔ اب میرے لیے سب سے بڑی مشکل زینت کو ڈھونڈنا تھا۔

آپ کسی امانت کا ذکر کر رہے تھے۔ ڈاکٹر نے اب اپنا سوال دہرایا جسے مَیں نے سمجھ لیا تھا کہ ڈاکٹر لطیف نظر انداز کر چکا ہے مگر مَیں اُس کے سوال پر ایک دفعہ چونکا ضرور تھا۔ یعنی وہ ابھی تک نہیں بھولا تھا کہ ہمارے پاس کسی کی ایک امانت محفوظ ہے۔ اب مَیں نے سیدھی طرح سے ڈاکٹر کو بتانا مناسب سمجھا اور کہا، ڈاکٹر صاحب۔ بات یہ ہے کہ وہ امانت اصل میں ڈاکٹر فرح کی بجائے زینت کی تھی۔ مَیں زینت تک پہنچنے کے لیے ڈاکٹر فرح کی تلاش میں نکلا تھا۔ وہی ایک واحد ذریعہ تھا جس سے مَیں اُس تک پہنچ سکتا تھا مگر آپ نے مجھے ایک اور ہی دردناک صورتِ حال سے دوچار کر دیا ہے۔

اُس کی خبر شاید آپ کو ڈاکٹر فرح کے سابقہ خاوند زبیر سے مل جائے اگر وہ اب تک زندہ ہوا۔ یہ کہہ کر ڈاکٹر لطیف نے ایک دم مجھے پھر سے تازہ دم کر دیا۔

لیکن یہ زبیر صاحب کہاں ہو سکتے ہیں۔ اُس کی خبر کہاں سے مل سکتی ہے؟ مَیں نے فوراً پوچھا۔

اُس کی خبر کراچی سے ملے گی۔ وہیں ابھی تک ہوگا۔ وہ شدید زخمی سُنا گیا تھا۔ مجھے ڈاکٹر فرح نے اُن کا پتا بتا دیا تھا۔

تو کیا مجھے اُس کا پتا مل سکتا ہے؟ مَیں نے بے چینی سے پوچھا۔

پھر آپ اُس تک کیوں نہیں پہنچے، مَیں نے ڈاکٹر سے عجیب سا سوال کر دیا۔

مَیں اُس کے پاس کیا لینے جاتا؟ ڈاکٹر نے جواب دیا اور واقعی اس کا جواب ٹھیک تھا۔

آپ مجھے اُن کا پتا دے سکتے ہیں؟

جی ہاں مل جائے گا۔

یہ کہہ کر ڈاکٹر لطیف اُٹھ کر اندر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد ایک ڈائری کے ساتھ واپس لوٹا۔ یہ ڈائری ڈاکٹر فرح کی ہے، اُس نے بیٹھتے ہی کہا، اِس میں جو پتہ درج ہے وہ آپ نوٹ کر لیں۔

مَیں نے جلدی سے جیب سے کاغذ نکالا اور پتا لکھنا شروع کر دیا۔ ایم اے جناح روڈ سے پچھلی جانب آرام باغ۔ اُس کے بالکل سامنے ایک چھوٹا بازار نکلتا ہے جسے رام تلاؤ روڈ کہا جاتا ہے۔ اِسی رام تلاؤ روڈ کے آخری کونے پر آرام باغ کے بالکل سامنے کچھ فلیٹ ہیں۔ اُنھی فلیٹوں میں چار بٹا دو نمبر کا فلیٹ ڈاکٹر فرح کے سابقہ خاوند اور اُس کے بیوی بچوں کا ہے۔ آپ وہاں سے ضرور کچھ خبر حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ کہہ کر ڈاکٹر لطیف واپس کمرے میں چلا گیا اور جب واپس آیا تو ڈائری اُس کے ہاتھ میں نہیں تھی۔

مَیں نے اُس کے بیٹھنے سے پہلے ہی کہا، ڈاکٹر صاحب آپ کا بہت زیادہ شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے کچھ نہ کچھ خبر دی ورنہ بالکل ہی مایوس لوٹتا اور ڈاکٹر فرح اور جنید کی موت کا مجھے اتنا صدمہ ہوا ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ اب آپ مجھے اجازت دیں تو مَیں چلوں۔

ضامن صاحب آپ اِس وقت کہاں جائیں گے؟ یہیں رُکیے اور صبح کی بس سے چلے جایئے۔ یہاں سے صبح سات بجے لاری نکلے گی، وہ آپ کو جڑانوالہ لے جائے گی۔

مَیں ڈاکٹر لطیف صاحب کے اِس احسان پر ممنون ہو کر وہیں بیٹھ گیا۔ واقعی اب بہت اندھیرا ہو گیا تھا۔ بیٹھے بیٹھے بالکل خبر نہیں ہوئی تھی کہ ہم تین گھنٹے باتیں کرتے رہے تھے۔ رات بارہ بجے سو گئے۔ مَیں جب سے شہر کی ہوا میں اٹھنے بیٹھنے لگا تھا میری نیند رات آٹھ بجے سے منتقل ہو کر دس بجے آنا شروع ہو گئی تھی مگر آج اِس سے بھی دو گھنٹے دیر سے سویا تھا۔ دوسرے دن صبح اُٹھتے ہی دیکھا تو ڈاکٹر لطیف ناشتے کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ ناشتے میں روٹیاں اور مٹن اور انڈوں کا آملیٹ تھا۔ ہم دونوں نے خموشی سے ناشتا کیا۔ آخری لقمے کے ساتھ ہی ڈاکٹر لطیف نے مجھ سے پوچھا، تو اب آپ کراچی جائیں گے؟

جی ہاں ارادہ تو وہیں کا ہے، مَیں نے جواب دیا۔

مَیں آپ سے کچھ کہنا چاہوں گا، ڈاکٹر لطیف نے جھجکتے ہوئے اگلے جملے کہے، ڈاکٹر فرح اور اُس

کے بیٹے جنید کے قتل کی اصل میں تمام ذمہ داری اِسی حرامی زبیر پر آتی ہے۔

مَیں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں، کاش اُسے سزا مل سکتی مَیں نے ڈاکٹر کی تائید کی۔ اچھا مَیں چلتا ہوں ڈاکٹر صاحب، یہ کہہ کر مَیں کرسی سے اُٹھ گیا اور دروازے سے باہر نکلنے لگا۔

اُسی لمحے ڈاکٹر لطیف کی آواز دوبارہ سنائی دی، ٹھہریے ضامن صاحب، یہ لیتے جایئے، یہ بھی ڈاکٹر فرح کی ایک امانت ہے۔

مَیں نے مُڑ کر دیکھا تو ڈاکٹر کے ہاتھ میں بریٹا 70 ماڈل پسٹل تھا۔ اِسے لیتے جایے، یہ ڈاکٹر فرح کا ہے۔ اِسی کے ذریعے اُس نے طلال پر فائر کیے تھے۔ ضرورت پڑ جاتی ہے۔

مَیں کچھ دیر ڈاکٹر لطیف کی طرف دیکھتا رہا، اُس کے بعد اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر وہ پسٹل اُس سے لے لیا اور کہا، ڈاکٹر صاحب ایک بات پوچھوں؟

جی پوچھیے، ڈاکٹر نے میری طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

ڈاکٹر فرح کی وہ ڈائری آپ نے مجھے نہیں دی۔ یہ بندوق تھما دی ہے۔ آپ نے یہ کیسے اندازہ لگا لیا میرے لیے لکھی ہوئی چیز کی بجائے یہ جان لیوا شے زیادہ مناسب ہے۔

اگر آپ نہیں رکھنا چاہتے تو واپس کر دیجیے، مَیں نے تو آپ کے سفر کی حفاظت کے لیے دیا تھا۔ ڈاکٹر لطیف نے انتہائی شرمندگی سے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا لیکن مَیں نے وہ پسٹل اُسے دینے کی بجائے اپنی جیب میں رکھ لیا اور کہا شاید ضرورت پڑ جائے۔ اُس کا وہ جملہ کہ زبیر کو سزا ملنی چاہیے۔ اب میرے دماغ میں اچانک اپنے معنی کی تفہیم کے ساتھ واضح ہو چکا تھا۔

باہر نکلے تو سامنے ایک 1960ء ماڈل چھوٹی ویگن کھڑی تھی۔ مَیں نے اُسے دیکھ کر کہا یہ کیا ہے؟

ضامن صاحب یہ آپ کو اپنے شہر چھوڑ آئے گی۔ مَیں نے اِسے کرایہ ادا کر دیا ہے، ڈاکٹر لطیف نے وضاحت کی۔

میں ڈاکٹر لطیف کا شکریہ ادا کر کے ویگن میں بیٹھ گیا۔

(۳۸)

میرے علاقے کا ریلوے اسٹیشن شہر کے جنوبی حصے میں تھا مگر اِس سے بھی آدھا کلومیٹر جنوب میں جی ٹی روڈ ہونے کے سبب یہ اسٹیشن عین شہر میں آ گیا تھا۔ وینس چوک کو عبور کرتے ہی سامنے اسٹیشن کی پٹڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ اسٹیشن کی عمارت برٹش دَور کی ہیبت کو ابھی تک محفوظ رکھے ہوئے تھی۔ اسٹیشن سے آدھا کلومیٹر دائیں اور آدھا کلومیٹر بائیں جانب برگدوں کے اتنے سایہ دار درخت تھے کہ گھنٹا بھر بارش برسنے کے باوجود نیچے پانی نہیں گرتا تھا۔ یہیں ٹاہلیوں اور نیم کے بے پناہ درختوں کی چھاؤں نے بسیرے جما رکھے تھے۔ اِس چھاؤں میں پٹڑی کے دونوں جانب اور اسٹیشن پر لکڑی کے بنچ پڑے تھے۔ اِن پر اِکا دُکا مسافر سو بھی جاتے تھے۔ ریل پر دُور دراز کے سفر کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔ مَیں کراچی کو ایک دوسرا ملک تصور کرتا تھا۔ اکثر ہمارے دیہاتوں کے لڑکے اپنی روٹی روزی کے لیے کراچی ہی کا رُخ کرتے تھے اور وہاں سے پیسے بھیجتے تھے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ کوئی لڑکا گھر سے کراچی رزق کمانے نکلا ہو اور خالی آ گیا ہو۔ وہاں اُسے کیسے اور کتنی آسانی سے کام مل جاتا تھا یہ بات میرے لیے عجوبہ تھی۔ مَیں نے سمندر کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن میرے خیال میں وہ رزق کا سب سے بڑا دیوتا تھا جو کراچی میں بیٹھا مُن برسا رہا تھا اور لوگ جھولیاں بھر کر لا رہے تھے۔ اگر آپ یہ کہیں کہ اِس بار مَیں کراچی جانے کے کئی مقاصد رکھتا تھا تو بے جا نہ ہوگا۔ اگرچہ میرا اوّلین مقصد وہی تھا کہ زینت کو تلاش کر سکوں مگر کہیں زیریں سطح پر اپنے روزگار اور ایک بڑے شہر میں رہنے کی تمنا بھی موجود تھی۔ مَیں

نے ریلوے اسٹیشن جانے سے پہلے حبیب علی کی دکان کا رُخ کیا۔ اگرچہ اِس کے کسی ایک فیصد بھی مشورے پر مَیں نے عمل کیا تھا مگر مجھے اِس کے ساتھ کی گئی گفتگو سے ایک قسم کا اطمینان محسوس ہوتا تھا۔ دُکان پر پہنچا تو حسبِ معمول حبیب علی وہیں تھا، مجھے دیکھتے ہی اُٹھا اور سلام لے کر ایک طرف بٹھا دیا۔ وہ ایسے ملا جیسے اُسے یقین ہو کہ مَیں ناکام لوٹا ہوں اور اگلے لائحہ عمل کی گفتگو کے لیے تیار ہوں۔

حبیب صاحب، مَیں نے تھکے ہوئے انداز سے اُسے مخاطب کیا، انسان بعض اوقات کچھ ایسے دُکھ پال لیتا ہے جو راہ میں پڑے اُس سامان کی مانند ہوتے ہیں جسے مسافر لاوارث سمجھ کر اُٹھا لے۔ پھر تمام سفر اُس کا وزن سر پر رہتا ہے۔ گھر پہنچ کر معلوم ہوتا ہے یہ سامان تو گزرے زمانوں کے سِکے ہیں جن کے عوض کچھ خریدا نہیں جا سکتا۔

جی ہاں، حبیب علی نے جواب دیا، لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے مسافر اپنے گھر اُسی بےکار سامان کے سبب لوٹتا ہو ورنہ کبھی لوٹنے کا خیال بھی نہ آئے اور تمام عمر سفر میں رہے۔ پھر جب گھر یاد آئے تو راستہ ہی گم ہو جائے۔

حبیب علی تمھیں پتا ہے؟ مَیں نے مایوسی کے ساتھ کہا، بعض اوقات گھر کی دیواریں انسان کے جسم میں سوئی کے دھاگے کی طرح سی جاتی ہیں۔ باہر جانے لگو تو دیواریں بھی باہر کھنچتی ہیں، پھر اُنھیں اپنی جیل بنا لو یا پھاڑ کر نکل جاؤ۔

کیا تم شہر سے بیزار ہو گئے ہو؟ حبیب علی نے تشویش کے ساتھ مجھے دیکھ کر کہا۔

مَیں کبھی اِس شہر سے بیزار نہیں ہو سکتا۔ یہاں میرا باپ ہے، میری ماں ہے، دادی ہے، حاجی فطرس علی ہیں، پھاٹک والا چوک ہے، اِس شہر کے پیپل اور نیم کے بوڑھے درخت ہیں، اُن درختوں کے چوراہوں اور چوکوں میں پھیلتی ہوئی ٹھنڈی چھاؤں ہے اور حبیب علی تم بھی ہو۔ لیکن اِن سب کے ہوتے ہوئے ایک کوہِ ندا کھینچ رہا ہے۔ مجھے ڈر لگتا ہے ایک بار نکلا تو واپس نہیں لوٹ سکوں گا اور گم ہو جاؤں گا۔ مَیں نے حبیب علی سے آنکھیں چراتے ہوئے کہا۔

تم گُم نہیں ہو سکتے ضامن، حبیب علی نے میرے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ میری جان یہ شہر چھوٹا ہے مگر اِس چھوٹے شہر میں تیرا بہت کچھ ہے۔ یہ جملے اُس نے ایسے الطاف کے ساتھ ادا کیے کہ میرا دل ایک دم موم ہو گیا اور آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اُس کے ساتھ حبیب علی نے اُٹھ کر مجھے گلے لگا لیا۔

مَیں نے کہا، جیسے مجھے لگتا ہے مَیں ساری عمر ریت سے کھیلتا رہوں گا۔ سبز پانیوں تک کبھی نہیں

پہنچ پاؤں گا۔ ہر دوسرے لمحے میرے ایک غم میں دوسرے کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس چھوٹے سے سفر میں بھی سیکڑوں دُکھ اور تڑپا دینے والی کہانیوں کی گٹھڑیاں باندھ لایا ہوں۔

یار آج تجھے کیا ہو گیا ہے؟ حبیب علی نے کہا، اتنی مایوسی کی باتیں کرنے کا مطلب ہے کہ تم نے ہر کام میں حوصلہ چھوڑ دیا ہے۔ ابھی زندگی شروع ہوئی ہے۔ تمھیں پتا ہے ہم تمام دوست اصل انسان تمھیں ہی سمجھتے ہیں۔ ہم اپنی اپنی روزی کے دھندوں پر بیٹھے تمھیں ایک آزاد پرندے کی طرح اُڑتا ہوا دیکھتے ہیں اور رشک کرتے ہیں۔ مَیں دیکھ رہا ہوں ایک دن تو بڑی بڑی پروازوں کے بعد لوٹ کر ہماری طرف آئے گا پھر نئی پرواز پر نکل جایا کرے گا۔ ہم یہاں اِنھی گلیوں میں، اِن گلیوں کی میلی اینٹوں پر پاؤں چٹخاتے گاہکوں کے ساتھ صبح شام قیمتوں کے کم زیادہ پرتے کر دینے والی وہی باتیں کرتے رہیں گے جنھیں کوئی شریف آدمی دوسری بار سنے تو منہ پر تھوک دینا چاہے۔ خوش ہو جا اپنی زندگی کے پھیلے ہوئے ساحلوں اور دریاؤں پر۔

یہ کہہ کر وہ تھوڑی دیر کے لیے چُپ ہو گیا اور مَیں اُسے ٹک ٹک دیکھتا رہا۔ اصل میں تاندلیانوالہ میں پاگل عورت سے لے کر جنید اور ڈاکٹر فرح کی موت کی خبر نے مجھے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ کتنی جلدی یہ قسمت کے پھاڈی زندگی کے کھیل سے باہر ہو گئے تھے۔ اِتنے میں حبیب علی دوبارہ بولا۔

آ بیٹھ کھانا کھائیں۔ بڑا احرامی ہے عین اُسے وقت دُکان پر آتا ہے جب میرا کھانا گھر سے آتا ہے اور بیوی اتنی کنجوس ہے، ایک بندے سے زیادہ کا نہیں بھیجتی۔ اوئے لڑکے جا کر چھامی ہوٹل والے سے ایک قیمے کی پلیٹ اور لے آ اور سُن، آتے ہوئے چائے کا آرڈر دیتے آنا۔

حبیب علی کی یہی باتیں میرے دل کے لیے مرہم تھیں۔ مجھے لگا مَیں نئے سرے سے تر و تازہ ہو گیا ہوں۔

ریل کا پتا کرو کراچی کب نکلتی ہے؟

ریل کا ابھی وقت نکل گیا ہے۔ رات یہاں میرے پاس ہی رہو۔ کل بارہ بجے نکلے گی اُس پر چلے جانا۔ ہم آج ٹکٹ بُک کر لیتے ہیں۔ ٹھیک ہو گیا؟

اِسی لڑکے کو بھیج دو لے آئے گا، مَیں نے کہا۔

تم فکر نہ کرو، یہ بتاؤ، فرسٹ کلاس لینا ہے یا اکانومی؟

میاں تیسرے درجے کا چاہیے۔ مَیں نے ڈانٹ کر کہا، مَیں کپڑا نہیں بیچتا۔

کیا اُس میں اونٹ لے کر جانے ہیں؟ حبیب علی نے ڈانٹا۔

فی الحال تو ہم دیہاتی لوگ خود اونٹ ہیں۔ ہمارے ہوتے ہوئے اونٹ کی کیا اوقات، مَیں نے کہا۔ اتنا سرمایہ میرے پاس نہیں بھائی۔

اچھا اپنی تفصیل بتاؤ، شاہ کوٹ میں کیا ہوا؟ حبیب علی نے جب دیکھا کہ میری طبیعت معمول پر آ گئی ہے تو اُس نے اصل سوال کیا، جسے مَیں خود بتانے کے لیے تیار تھا۔ پھر مَیں نے اُسے وہ تمام گفتگو بتا دی جو شاہ کوٹ میں وہاں کے ڈاکٹر لطیف سے ہوئی تھی۔

ضامن میاں ایک بات یاد رکھنا، کراچی میں ایسی کوئی حرکت نہ کرنا جو تمھیں آسان لگے، کیونکہ آسان کاموں کی پشت پر بڑی مشکلیں کھڑی ہوتی ہیں۔ میرے دوست، زندگی جتنا ہمارے سامنے ہوتی ہے اُس سے کئی گنا اوجھل ہوتی ہے۔ ہم دیکھی ہوئی اشیا پر فیصلے دیتے ہیں، وہیں اَن دیکھی حقیقتیں اژدھے کی طرح سامنے آ کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ اپنا یہ ہتھیار مجھے دے دو۔ بعض اوقات انسان کو اُس کی بے سروسامانی مشکلوں سے محفوظ رکھتی ہے۔ وہ سالا ڈاکٹر خود چوہا بن کر اپنے دھندے پر بیٹھا ہے اور تمھیں قربانی کا بکرا سمجھ کر پستول دے رہا ہے۔

مَیں نے ڈاکٹر لطیف سے لیا ہوا پستول حبیب علی کے سامنے رکھ دیا۔ اُس نے اُٹھا کر اُسے دراز میں ڈال دیا۔ یہ پستول دیتے ہی ایسے لگا جیسے میں انتہائی ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ اب مجھے ایک بات سمجھ آئی اُس نے میرے لیے سپیشل ویگن کیوں کروا کر دی تھی۔ میرے پاس ایک نامعقول ہتھیار کے سبب راستے میں انہونی صورتِ حال کے پیشِ نظر ایک تو اُس نے مجھے رات کے وقت آنے نہیں دیا اور دوسرا گاڑی کرا دی تھی۔ اب اگرچہ یہ باتیں اُس نے اخلاص کے ساتھ ہی کی ہوں لیکن مَیں حبیب علی کی بات پر یقین کر چکا تھا ڈاکٹر مجھے واقعی قربانی کا بکرا بنانے کے چکر میں نہ ہو۔ اب یہاں ہوا یہ کہ ڈاکٹر لطیف کے ہاں جو کچھ میرے دل میں زبیر کے خلاف نفرت کا لاوہ ابھرا تھا اُس کا کہیں نام و نشان بھی نہیں تھا۔ ہو سکتا تھا، اُسے دیکھ کر وہی نفرت دوبارہ اُبھر آتی اور مَیں ایسے کنویں میں گر جاتا جس سے باہر نکلنے کی سیڑھیاں نہیں تھیں۔

کھانا کھانے کے بعد مَیں نے کہا، حبیب میاں مَیں ذرا شہر کے دوستوں تک چکر لگا لوں۔ تم یہیں بیٹھو اور گاہکوں کو پریشان کرو۔ مَیں وہاں سے نکل کر سیدھا حاجی فطرس علی کے مکان پر آ گیا۔ حاجی صاحب نے ظہرین ادا کر لی تھی اور یہی اُن کے پاس آنے کا مناسب وقت تھا۔ چوک سے بائیں

ہاتھ ہو کر مَیں اُسی صفویاں گلی میں داخل ہو گیا، جسے گلی کہنا مناسب نہیں تھا کہ یہ ایک سڑک کی طرح کھلی اور چوڑی گلی تھی اور نیم اور پیپل کے سایوں سے بھری ہوئی تھی۔ اپریل کے آغاز کے سبب موسم میں شدت نہیں تھی۔ ہوا نہایت فرحت بخش اور دل آویز چل رہی تھی اور اِدھر سہ پہر ہو چکی تھی۔ حاجی فطرس صاحب پورا موسم سرما اور مئی کے پہلے ہفتے تک قیلولہ نہیں فرماتے تھے۔ حبیب علی کے ساتھ بیٹھے بیٹھے تین گھنٹے نکل گئے تھے۔ کل بارہ بجے کی ریل سے نکلنا تھا اِس لیے کافی فرصت تھی اور اِس فرصت کا سب سے اچھا مصرف سوائے حاجی فطرس علی کے اور کون ہو سکتا تھا۔ اِس کا اپنا ہی مزا تھا۔ ایک طرف شہر بھر میں اُس کی طہارت اور صداقت کی قسمیں چلتی تھیں دوسری طرف اُن سے دنیا کے کسی بھی موضوع پر بات کرنے میں ہچکچاہٹ نہیں تھی۔ اُنھوں نے زندگی کے کچھ اُصول بنا رکھے تھے۔ اُن میں سے ایک یہ تھا کہ سفر میں جانے سے پہلے اپنے تمام دوستوں کو سلام کر کے اور تمام دشمنوں کو معاف کر کے نکلو۔ تمام دوستوں کو سلام کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔ مَیں نے صرف اُن میں سے حبیب علی اور اِنھی فطرس صاحب کو سلام کرنا فرض کفایا سمجھ کر ادا کر دیا۔ حکیم صاحب اپنے چھوٹے تخت پر بیٹھے تھے، تخت کے اُوپر ایک جائے نماز قسم کا ایرانی قالین بچھا تھا۔ نماز کا وقت ہوتا تو وہیں سجدہ ریز ہو جاتے اور دوست احباب گپیں ہانکا کریں اُن کی بلا سے۔ حکیم فطرس صاحب مجھے دیکھتے ہی شاداب سے ہو گئے اور خوش آمدید کہا، مَیں نے اُن سے سلام لیا اُس کے بعد پہلو کی لکڑی والی چوکی پر بیٹھ گیا۔ حکیم صاحب کے پاس اِس وقت سید باقر شاہ اور سید غضنفر نقوی بیٹھے موجودہ سیاسی حالات پر بحث کر رہے تھے۔ اُن کا موضوعِ بحث اُس وقت کے وزیرِ اعظم کی پھانسی تھی۔ مَیں خموشی سے اُن کی گفتگو سُن رہا تھا۔ یہ تینوں اگرچہ اِس وقت کے سیاسی منظر نامے سے ہراساں تھے مگر حکیم حاجی فطرس کا کہنا تھا، وزیرِ اعظم کی پھانسی وہ تمہید ہے جس کے بعد موجودہ صدر پورے قرآن کی تفسیر لکھنے جا رہے ہیں لہٰذا یہ سیاسی ایشو ہرگز سیاسی نہیں رہے، جلد مذہبی شکل اختیار کرنے والے ہیں۔ مَیں خموشی سے آدھا گھنٹا اُن کی گفتگو سنتا رہا۔ گفتگو میں تھوڑا وقفہ ہوا تو حاجی فطرس صاحب میری طرف دوبارہ متوجہ ہوئے، ہاں میاں ضامن آج کہاں اتنے دِنوں بعد نمودار ہوئے۔ میاں لمبی تعطیلیں نہ کیا کرو یہاں کلیجے میں ورم آتے ہیں۔ مَیں ہنس دیا۔ تب اُن کی توجہ اپنے شاگرد کی طرف ہوئی، ارے بھائی میاں ضامن کو انجیر کا کٹورہ پلاؤ۔

حاجی صاحب اِس وقت تو چائے پیوں گا۔ مَیں نے اصرار کیا۔

میاں وہ بھی پلا دیں گے، یہ موسم انجیر کے پینے کا ہے۔ صفرائی ہے طبیعت بہل جائے گی۔ ذرا

چوکی یہاں تخت کے قریب کرلو، فطرس صاحب بولے، جعفر کی پُڑیوں میں مخل ہوتے ہو۔

ہاں، اوہ، مَیں نے چوکی تھوڑی سی آگے کھسکا لی۔ واقعی پیچھے حاجی صاحب کا شاگرد جعفر پُڑیاں باندھنے میں مگن تھا۔ اُس کی کہنیاں میرے سر کو چھوتی تھیں۔

حکیم صاحب، مَیں کراچی جا رہا تھا، سوچا آپ کو سلام کہتا جاؤں۔ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد مَیں نے کہا۔

ہائیں وہاں کیا ہے؟ حاجی صاحب کے ساتھ سید غضنفر نقوی بھی چونکے۔

ایک آدمی کی خبر لینی تھی۔

کوئی رشتے دار ہے کیا؟

جی نہیں وہاں ہمارا کون رشتے دار ہوگا۔ بس ایک آدمی کی امانت والدہ کے ہاں پڑی ہے، اُسے ڈھونڈتا پھرتا ہوں۔ پھر یہ بھی سوچ رہا ہوں وہیں روزگار کا ٹھکانا کرلوں۔

میاں ایک بات کہوں؟ اِتنے میں شاگرد نے شربت میرے حوالے کردیا، کراچی جاؤ ضرور مگر لوٹ کے پنجاب آ جاؤ۔ یہ رزق ضرور دیتا ہے مگر لوہے اور ریت میں ڈوبا جاتا ہے۔ جیسے اِس کے حالات ہیں، ایک دن فطرت کو کھا جائے گا۔ وہاں چھونے کو مٹی نہیں ملے گی اور تم مٹی کے رنگوں کے آدمی ہو۔

مَیں نے ہنس کر کہا، حاجی صاحب آپ بھی فلاسفر ہو گئے ہیں۔ اب روٹی کا دھندا مٹی دیکھے یا پیٹ؟ وہاں بڑے لوگ پنجاب سے گئے اور وہیں رہ گئے۔ خود ہمارے گاؤں کے تین چار کو تو مَیں دیکھتا ہوں اب تک نہیں لوٹے اور ہر مہینے اُن کے گھر میں منی آرڈر کھلتے ہیں۔

یہی تو مَیں کہتا ہوں، وہیں رہ جاؤ گے۔ اِدھر مجھے دیکھو، سب رشتے کے لوگ وہیں ہیں مگر مَیں نے پنجاب کو سینے سے لگا لیا ہے اور نکل کے نہیں گیا۔ کرانچی جاؤں بھی تو ایک دو روز کے بعد بھاگ نکلتا ہوں۔ حاجی صاحب ایک ہی سانس میں بول گئے۔ رہی منی آرڈروں کی بات تو اِس بابت میں تم سچے ہو، مگر وہ صرف دیہاتی لڑکے تھے اور تم دیہاتی ہونے کے ساتھ ضامن علی بھی ہو۔ بہت فرق ہے۔ وہاں اِن درختوں اور سبزوں کو ترس جاؤ گے۔

لیکن سمندر بھی تو ہے، مَیں نے کہا۔

پانی کی کشتیاں اور سمندروں کے گھیراوے اچھے نہیں ہوتے۔ سمندروں میں آنکھیں رنگوں کی

تمیز کھو دیتی ہیں اور کشتیوں میں مٹی کے لمس چھوٹ جاتے ہیں۔

مگر یہاں کیا کروں گا؟

کچھ نہ ہو تو یہیں ایک دُکان کتابوں کی جمالینا۔ اچھی چل نکلے گی۔ اچھا یہ بتاؤ چلے ہو تو کچھ دن رُکنے کا بندوبست کیا ہے؟ وہاں کیوں کر رہو گے اور کس کے پاس؟ حاجی صاحب نے بات بدلی۔

یہ مَیں نے نہیں سوچا؟ میں حیران تھا اِس بابت مجھے خیال ہی نہیں آیا تھا۔

اچھا ایک کام کرو، کراچی صدر میں ہمارے ایک چچا زاد ہوتے ہیں سید قنبر علی نقوی۔ مَیں اُنھیں رقعہ لکھ دیتا ہوں، ہفتہ تک تو ٹھہرا رکھیں گے۔

ضرور لکھیے، مجھے ایک طرح سے اطمینان سا ہو گیا۔ اُسی وقت اُنھوں نے رقعہ لکھ دیا۔ شربت مَیں نے پی لیا تھا۔ اِتنا فرحت بخش شربت حکیم فطرس صاحب کے علاوہ کہیں نہیں مل سکتا تھا اور اب چائے چلی آتی تھی۔ قریب شہاب چائے والے کا ہوٹل تھا یہاں سے تمام دن حکیم صاحب کے ہاں چائے آتی تھی۔ اصل پوچھو تو یہ ہوٹل حکیم صاحب کی برکت سے کھلا ہوا تھا۔ شہاب نے چائے کے علاوہ کھانے کے واسطے بھی کچھ چیزیں الگ رکھی تھیں۔ اِن میں قلاقند بھی تھی اور یہاں کی قلاقند تحصیل بھر میں جانی جاتی تھی۔ اُسی وقت سید حکیم فطرس صاحب نے پاؤ بھر کی دو قلاقند منگوالی۔ اب ہم نے چائے کے ساتھ قلاقند کے مزے لیے۔ مَیں عمر میں حاجی صاحب سے کافی چھوٹا تھا۔ اُن کے ملنے جلنے والوں میں ایک مَیں ہی تھا جسے کم عمری میں یہ اعزاز تھا کہ حاجی صاحب کی محفل میں بیٹھ جاؤں مگر کتنے ہی عرصے سے میری حیثیت وہاں سوال کرنے والے کی سی ہو گئی تھی۔ اب مَیں نے اپنی رائے اور جرح کی تھوڑی ہمت اختیار کی تھی، وہ بھی حاجی فطرس صاحب کے حوصلے کے سبب ورنہ اُس جگہ بیٹھنے سے میرے اندر جو کچھ بین المذاہب صلح کل کا تصور قائم ہوا تھا اُس کا متحمل مَیں اکیلے رہ کر یا صرف کتب بینی کے شعور سے حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ کتاب آپ کی بہت بڑی اُستاد ہے مگر کبھی سابقہ اور پختہ کتاب خواں ایسی پتے کی بات کرتا ہے کہ اُس پر ہزاروں کتابیں نثار ہو جاتی ہیں۔ ایسا کئی بار ہوا کہ مَیں نے حاجی صاحب کے سامنے اپنے مخالف کے بارے میں نفرت کا اظہار کیا، جس پر بات چیت کے دوران حاجی فطرس علی نے مجھے میرے اِس عمل سے کبھی نہیں روکا مگر جب وہ اپنے نظریاتی مخالف کے متعلق گفتگو کرتے تو اُن کا لہجہ اُس کے متعلق انتہائی دوستانہ اور ہمدردانہ ہوتا تھا۔ یہ بات مَیں اکثر محسوس کرتا تھا۔ اب مَیں خود اِسی عمل کو شعوری طور پر اختیار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اِسی طرح کی کئی اور باتیں مَیں

وہاں بیٹھے لاشعوری احساس میں پا گیا تھا۔

دیہاتی لڑکوں کی اکثریت ایسی محفلوں سے عمومی طور پر بیگانہ رہتی ہے۔ دیہاتی لڑکے شہر آ کر اپنی جان پہچان بنا بھی لیں تو ایسے لوگوں میں بناتے ہیں جن میں بیشتر دکاندار اور کاروباری ذہنیت کے حامل ہوتے ہیں۔ وہ شہر کو محض معاشی اور مادی ضروریات کا منبع سمجھ کر اُسی پر اکتفا کر لیتے ہیں اور علمی سر چشموں کو ڈھونڈنا تو ایک طرف اُن کے گمان میں بھی نہیں ہوتے۔ جس کے سبب اُن کی ذات میں ایک طرح کی ناپختگی تمام عمر تک رہ جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ شہری اور دیہاتی لوگوں میں ثقافتی بُعد کے سبب شناسائیاں کم ہیں۔ جو ہیں وہ مکمل جانثاری اور وقت مانگتی ہیں۔ آج اُسی کا صلہ تھا کراچی میں ایک ہفتے کا سامان ہو گیا تھا۔

ہمیں بیٹھے ہوئے بہت دیر ہو گئی۔ سید باقر شاہ صفوی اور سید غضنفر علی نقوی کچھ دیر پہلے ہی اُٹھ کر چلے گئے تھے۔ شام کی اذان ہونے کو تھی اور یہ وقت حاجی فطرس کے امام بارگاہ جا کر نماز پڑھنے کا تھا۔ اُن کا اُصول تھا مغربین وہیں ادا کرتے تھے۔ مجھے معلوم تھا، یہیں بیٹھا رہا تو مروت میں حکیم صاحب کے ساتھ امام بارگاہ جانا پڑے گا۔ اُن کے ساتھ امام بارگاہ جانا میرے لیے بہت گراں تھا۔ مجھے نماز پڑھنے میں عار نہیں تھی مگر وہاں ایک نماز کے بعد اُسی وقت دوسری نماز۔ پھر دونوں کے درمیان اور بعد میں بیسیوں وظائف میں کم سے کم دو گھنٹے نکل جاتے تھے۔ اِدھر مَیں نے کبھی ایک نماز پانچ منٹ سے اُوپر نہیں پڑھی تھی۔ چنانچہ جلدی سے اجازت لے کر اُٹھ کھڑا ہوا اور کہا، حاجی صاحب ان شاءاللہ دُعا کیجیے جلد واپس آ جاؤں۔

حاجی صاحب نے گلے مل کر رخصت کیا اور مَیں سید ھارتی گلی سے نکل کر غوثیہ مسجد والے چوک سے ہوتا ہوا کالج کی سڑک پر ہو گیا۔ یہاں پہنچ کر اچانک طبیعت ایسی بہلی کہ کمپنی باغ میں آ گیا۔ کمپنی باغ میں درختوں کے پتے اور کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ یہ سماں اتنا جلا بخش اور نہال تھا کہ دل نے زور سے تقاضا کیا کہ چلو کمپنی باغ میں گھوم لو۔ یہ باغ ہمارے شہر میں ایک روح کا تلازمہ کرنے والا تھا۔ رات دس بجے حبیب علی کے مکان پر سونے کے لیے چلا گیا۔

(۳۹)

مَیں خیبر میل ریل کے تیسرے درجے کے چھ نمبر ڈبے میں سوار تھا۔ اِس میں سیٹوں کی بجائے لکڑی کے لمبے بنچ تھے۔ ایک بنچ لکڑی کی سات فٹ لمبی اور تین اِنچ چوڑی کئی تختیوں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ اِن بنچوں کی ایک خوبی جو گرمیوں کے موسم میں نظر آتی ہے وہ یہ کہ اِن پر بیٹھنے والا آرام میں رہتا ہے۔ گرمی اور حبس کا شکار نہیں ہو پاتا۔ اکانومی کلاس کی سیٹوں پر چڑھی ہوئی فوم اور ریکسین چوتڑوں کو پسینے سے شرابور کر دیتی ہیں اور حبس کے پھیلانے کا باعث بنتی ہیں۔ میرا ٹکٹ سنگل تھا۔ ویسے بھی تیسرے درجے کی کلاس میں برتھ کا تصور نہیں ہوتا مگر ڈبے میں مسافر زیادہ نہیں تھے۔ ریل کا یہ ڈبا نوے سواریوں پر مشتمل تھا مگر اِس میں مشکل سے چالیس کے لگ بھگ ہوں گی۔ ریل کے تمام ڈبوں کی یہی حالت تھی۔ مَیں اپنے گاؤں کی ڈسپنسری، کالج اور سکول میں اِسی طرح کے بنچوں پر بیٹھتا آیا تھا اِس لیے اُن پر بیٹھنے اور سونے میں کوئی دقت نہیں تھی۔ مَیں اپنی طرف سے دل میں اُن پر ہنس رہا تھا جو اکانومی یا ائیر کنڈیشن کلاس میں جا کر اپنے پیسے ضائع کرتے تھے۔ میرا یہ ہنسنا شاید اِس لیے بھی مناسب تھا کہ بعض اوقات انسان اپنی احساسِ کمتری کو دبانے کے لیے اپنے سے برتر کی آسائش کو اُن کے لیے تکلیف دہ تصور کرنے لگتا ہے۔ صفائی اور واش روم بھی کسی طرح اکانومی کلاس سے کم نہیں تھا بلکہ اُس سے بہتر تھا۔ اِس میں صرف دو آمنے سامنے سیٹیں تھیں۔ سونے کے لیے کوئی برتھ نہیں تھی۔ یہ بھی اچھا ہی تھا ورنہ برتھ پر سوار ہونے والا شخص نیچے والے کے سر پر بیٹھا محسوس ہوتا ہے۔ یہ احساس ذہنی

حد تک ہی نہیں اُس کا وزن بھی محسوس ہوتا ہے۔ ریل کے چلتے ہی شہر کا منظر نظروں سے اوجھل ہو کر کھیتوں اور کھلیانوں میں بدلنے لگا۔ ریل گاڑی شہر سے نکل کر ایسے تیز بھاگنے لگی جیسے شور مچاتا ہوا اژدھا بڑھا جا رہا ہو اور اپنے راستے کی ہر شے روندتا جاتا ہو۔ اُس کے مدھم ہچکولوں نے مجھے راحت میں مبتلا کر دیا۔ رات کے چونکہ بارہ کا وقت تھا، اس لیے ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ مجھے سردی لگنے لگی۔ مَیں نے حبیب علی کی وہی چادر اوڑھ لی جسے کچھ ہی دیر پہلے اُس سے لینے سے انکار کر رہا تھا۔ یہ دنیا بعض اوقات اُن لوگوں کی وجہ سے کتنی آسان ہو جاتی ہے جنھیں ہم اکثر اپنی بے توجہی سے ضائع کر دیتے ہیں۔ مَیں نے ریل کی اپنے اِردگرد کی تمام کھڑکیاں نیچے گرا دی تھیں مگر سردی برف کے گولوں کی طرح بڑھنے لگی تھی۔ مَیں یہ چادر اپنے اِردگرد لپیٹ کر سیٹ پر لیٹ گیا۔ میرے سامنے دو ادھیڑ عمر آدمی بیٹھے سو رہے تھے۔ اُنھوں نے اپنے اُوپر بھی چادریں لپیٹی ہوئی تھیں۔ مَیں سونے کی کوشش کرنے لگا مگر ہوا چادر کے ریشوں سے عبور ہو کر جسم تک آنے لگی۔ تھوڑی دیر آنکھ لگنے کے بعد پھر کھل جاتی۔ اِسی سوتے جاگتے میں صبح کے آثار نمودار ہونے لگے۔ کچھ ہی دیر میں سورج کی شاخیں پھیلنے لگیں۔

مجھے خانیوال جنکشن دیکھنے کا شوق تھا مگر وہاں سے گاڑی رات اور بے چینی کے عمل میں نکل آئی تھی۔ اب جتنے شہر اور قصبات اور دیہات چل رہے تھے، کم و بیش تمام ایک جیسے تھے۔ باہر نظر دوڑانے میں کئی طرح کی کیفیات مجھ پر گزر رہی تھیں۔ اِس تیز اور اندھا دھند چلتی گاڑی کے سامنے باہر کا منظر کچھوؤں کی طرح رینگتے ہوئے انسان، ٹیلوں کی طرح ساکت و صامت مکان اور حیرانی کی حالت میں کھڑے درخت بہت کم تر لگتے تھے۔ گاڑی کسی بھی اسٹیشن پر دو منٹ سے زیادہ نہیں رُک رہی تھی، نہ لیٹ ہو رہی تھی۔ آج تک جتنا سفر بسوں میں کیا تھا اُس میں لاری کا ایک ہی جگہ پر کھڑے ہو کر سواریوں کا انتظار کرنا بیٹھی ہوئی سواری کے لیے اذیت ناک ہو جاتا تھا لیکن ریل میرے لیے ایک خوش کن منظر تھا۔ انگریز بادشاہوں نے کتنا اچھا کام کیا تھا۔

سورج کافی اوپر چڑھ آیا تھا اور شعاعوں نے شاخوں کی بجائے دھوپ کے پتوں کا رُخ دھار کر دور تک سفید اور گرم پرتو پھیلا دیے تھے جس کا اثر گاڑی میں آنے لگا تھا۔ اِس ہلکی تپش نے مجھے راحت کا احساس دیا اور میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ یہ نیند کا غلبہ تھا۔ مَیں ریل میں سے باہر کے منظروں کو دیکھتے رہنے کا متمنی تھا مگر نیند نے پسپا کر دیا اور میں سو گیا۔ حبیب علی کی چادر میرے سر پر تھی۔ مَیں اُسے لپیٹ کر نچنت ہو گیا۔ کتنی دیر سویا رہا، یہ اندازہ تب ہوا جب ریل حیدرآباد کو عبور کر چکی

تھی اور ابھی کچھ ہی گھنٹوں میں کراچی آنے والا تھا۔ مجھے ایک گونا بہت افسوس ہوا کہ سندھ کی بستی دیکھے بغیر گزر گئی لیکن ایک اُمید ابھی تھی کہ واپسی کا عمل اُس کے منظروں سے کروں گا۔ میں ڈھائی گھنٹے سندھ کے مضافات دیکھتا رہا۔ علاقہ بُرا نہیں تھا مگر وہ پنجاب والی ہری بھری رونق بھی نہیں تھی۔ پھر کچھ ہی دیر بعد گاڑی کراچی کے صدر اسٹیشن پر جا کر رُک گئی۔ میرے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ وہی چادر تھی جسے لے کر نکلا تھا۔ چادر مَیں نے گلے میں لپیٹ لی اور باہر نکل آیا۔ ہیں یہ کیا؟ کراچی اتنا بڑا شہر اور اِس کا اسٹیشن لاہور سے کئی گنا چھوٹا بلکہ ہمارے ہی شہر کے اسٹیشن کے برابر تھا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ البتہ ایک خوشی ضرور ہوئی کہ نیم، بیریوں اور پہاڑی کیکروں کے درخت اتنے زیادہ تھے کہ لاہور سے کراچی تک کسی بھی اسٹیشن پر اتنے درخت نہیں تھے۔ اسٹیشن کے دائیں بائیں اور سامنے چار سے پانچ درخت پیپل کے بھی موجود تھے۔ شام کے پانچ کا وقت تھا، یعنی ریل نے مجھے سترہ گھنٹوں میں کراچی لا پہنچایا تھا۔

اسٹیشن کے سامنے درختوں کے نیچے بیسیوں تانگے کھڑے تھے۔ اُن کے کوچوان اردو اور بہاری میں سواریوں کو آوازیں لگا رہے تھے۔ میرے لیے اہم بات یہ تھی کہ کسی طرح ایم اے جناح روڈ کی طرف نکلوں اور سب سے پہلے اپنے کام کو انجام تک پہنچاؤں۔ مَیں جب بھی کسی ایسے مقام کے نزدیک ہوتا تھا جہاں سے زینت کے وجود کی توقع کی جا سکتی تھی میرا دل زور سے دھڑکنے لگتا تھا۔ زینت کو دیکھے ہوئے کتنے برس بیت گئے تھے مگر اُس کے چہرے کی ایک ایک لائن مجھے یاد تھی۔ یہ بات عین برحق تھی کہ اب اُس کے ساتھ میرا کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں تھا، نہ آئندہ ایسی کسی خواہش کا تصور رکھتا تھا مگر نہ جانے کیوں ایک بے اختیار کشش اُس طرف کھینچتی چلی جاتی تھی اور یہ نام میرے دل کی دھڑکن تیز کر دیتا تھا۔ جب تک میں کراچی نہیں پہنچا تھا دنیا کے دیگر مسائل اور اُنھی کے متعلق خیالات نے گھیرے رکھا مگر یہاں اُترتے ہی میرے دل و دماغ کا مسئلہ زینت بن چکی تھی۔ مَیں دو کشمکشوں میں گرفتار تھا۔ اول یہ کہ زینت سے ملاقات ہوگئی تو اُس سے سامنا کیسے ہوگا اور اُسی کے درمیان یہ ڈر کہ زینت سے ملاقات نہ ہو پائی تو کدھر جاؤں گا۔ مَیں مختلف تانگوں کے درمیان سے گزر رہا تھا اور خیالات کے انبار تلے دبا ہوا یہ باور نہیں کر رہا تھا کہ کون سا تانگہ ایم اے جناح کی طرف جائے گا۔ میں ریلوے اسٹیشن کے بیرونی گیٹ پر جا کر رُک گیا۔ اب مجھے خیال آیا کہ مَیں تمام تانگے پیچھے چھوڑ آیا ہوں حالانکہ وہ مجھے پکار کر پوچھ رہے تھے۔ مَیں اُسی وقت واپس ہوا اور دوبارہ تانگوں کے درمیان آ کر

کھڑا ہو گیا۔ ایک تانگے والے سے پوچھا، میاں کون سا تانگہ ایم اے جناح روڈ کی طرف نکلے گا۔ اُس نے ایک تانگے کی طرف اشارہ کیا لیکن ساتھ ہی کہا، میاں بابو! یہاں سے وہاں کے لیے تانگہ مت لو، بہت دیری ہو گی۔ اِدھر سے باہر نکلو، سامنے والی سڑک کے دائیں ہاتھ ہو جاؤ۔ تھوڑی دیر میں لاری آئے گی، اُسی پر بیٹھ جائیو، سیدھی ایم اے جناح کی طرف لے جائے گی۔ مَیں اُس بھلے مانس تانگے والے کی بات سُن کر اُدھر چل دیا اور باہر نکل آیا۔ آسمان پر ہر طرف سرمئی بادل چھائے ہوئے تھے۔ سڑکیں بہت چوڑی اور نہایت پُرسکون اور خموش تھیں۔ عمارتیں زرد رنگ کے پتھروں کی تھیں۔ یہ بھورے اور زرد رنگ کے پتھر بہت خوبصورت اور پروقار نظر آتے تھے۔ عمارتوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی چوڑی سڑکوں پر جو چوک اور چوراہے قسم کے رستے نکلتے تھے، اُن کی ہیبت لاہور سے کہیں زیادہ تھی اور ہمارا شہر تو کسی بھی طرح اِن کا مقابلہ نہیں کرتا تھا۔ تمام عمارتیں مختلف یورپی مگر رومن اسٹائل کے آرکیٹکچر اور ہیبت سے مزین تھیں۔ سچ تو یہ ہے پہلی نظر میں اِس شہر نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ اِکا دُکا چلتی ہوئی گاڑیاں، لاریاں اور تانگے اتنے خموش اور پرسکون تھے، جیسے اجنبی دنیا کے شہر کی سواریاں ہوں۔ سڑکیں انتہائی صاف تھیں البتہ سڑکوں پر ہمارے شہر کی نسبت درختوں کی کمی نظر آئی۔ نیم اور برگد اور پیپل کے درخت گاہے گاہے نظر آ رہے تھے لیکن یہ اتنے زیادہ نہیں تھے کہ نظروں پر چھا جاتے۔ مجھے یہ شہر ایک بڑے مُلک کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اِتنا کھلا اور دُور کا منظر ہر طرف دوڑ رہا تھا۔ مَیں سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر ابھی نظارا کر ہی رہا تھا کہ ایک دُہری چھت والی لاری چلتی ہوئی ہلکے سے قریب آ کر رُک گئی۔ یہ ایم اے جناح ہی کی طرف جا رہی تھی۔ مَیں اُس پر سوار ہو گیا۔ لاری اتنی کھلی اور ہوا دار تھی کہ اُس میں کھڑے ہونے پر بہت لطف آیا۔ مجھے نہیں معلوم تقسیم کے بعد لوگوں نے کراچی کا رُخ اِس کی خوبصورتی کے سبب کیا تھا یا روزگار کے سلسلے میں مگر میرا خیال تھا مجھے کراچی میں رہنا پڑے تو روزگار کی نسبت اِس کی پروقار ہیبت کو ترجیح دوں گا۔ ساحلوں کی ہوا ایسی چل رہی تھی جیسے نرم رُو اور سُرخ و سپید پریوں کے دوپٹوں کے پھریرے اُڑتے ہوں۔ سرمئی بادلوں کے درمیان اُڑتے ہوئے سمندری بگلوں اور چیلوں کی بلند پروازیں اِس حسن کو دوچند کر رہی تھیں۔ لاری نے پندرہ منٹ میں مجھے ڈاؤ میڈیکل کالج کے سامنے اُتار دیا۔

یہ علاقہ خوبصورت عمارتوں کی ایک نئی دنیا تھی۔ سڑک کے دونوں طرف ایک سے بڑھ کر ایک پتھر کی تراشیدہ زرد عمارتوں کے ماتھے دیو قامت پہاڑیوں کی طرح جھانک رہے تھے۔ مجھے یہاں

سے آرام باغ کی طرف نکلنا تھا۔ یہ باغ برٹش دور کی یادگار تھی اور ایم اے جناح روڈ کے پچھلی جانب اِس کا دہانہ تھا۔ مَیں ڈاؤ کالج کے دائیں ہاتھ سے ہو کر سیدھی سڑک پر ہو گیا اور وہاں کچھ دیر چل کر ایک شخص سے آرام باغ کا مین گیٹ پوچھا۔ اُس آدمی نے مجھے وہیں سے ایک گلی چھوڑ کر بائیں طرف مڑنے کو کہا۔ مَیں اُس چوڑی گلی میں چلتا گیا۔ تھوڑی دیر بعد آرام باغ کے مرکزی دروازے کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ یہ باغ اللہ جانے کب بنا مگر خوبصورت تھا۔ بے شمار نیم اور پیپلوں کے پیڑ یہاں موجود تھے۔ اِس کے دائیں پہلو پر ایک مسجد تھی۔ بائیں طرف سامنے کی جانب کئی کھلے گراؤنڈ تھے۔ کچھ نئی مارکیٹیں بن رہی تھیں۔ یہاں ایک سمت رائے روڈ کے سامنے فلیٹس کی ایک بلند عمارت تھی۔ یہ عمارت کم و بیش چالیس سال پرانی تھی۔ اِس کے فلیٹ نمبر 21 میں ڈاکٹر فرح کا خاوند زبیر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ موجود تھا۔ مَیں تھوڑی ہی دیر میں فلیٹ کے سامنے تھا۔ میرے ماتھے پر ہلکے پسینے کے قطرے نمودار ہو چکے تھے۔ یہ وہی خاندان تھا جس نے کئی خاندانوں کو تباہ کر دیا تھا البتہ اِس وقت زبیر اور اُس کی بیوی کا خیال مجھ سے مختلف تھا۔ مَیں سیڑھیاں چڑھتے ہوئے آخر اُس فلیٹ کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ یہ ایک صاف ستھری اور انتہائی قیمتی عمارت تھی اور کسی بھی صورت لوئر مڈل کلاس کی طاقت سے باہر تھی۔ فلیٹ کا دروازہ دیودار کی لکڑی کا تھا اور بہت چوڑا تھا۔ اُسے مہنگی سیاہ پالش سے چمکایا گیا تھا۔ مَیں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری، گلے کو تر کیا اور اُس کے بیرونی گول کُنڈے کو ہلکا سا جھٹکا دیا جو خاص اِسی مقصد کے لیے بنایا گیا تھا۔ گھر والوں کو خبردار کرنے کے لیے یہ پرانی طرز کی گویا گھنٹی تھی۔ تھوڑی دیر میں اندر سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ کون ہے؟

جی مَیں ضامن ہوں، زبیر صاحب سے ملنا تھا؟ مَیں نے معتدل آواز میں کہا۔

کون ضامن؟ اندر سے وہی آواز دوبارہ سنائی دی اور کس زبیر سے ملنا ہے؟

اِس جواب کو سُن کر مَیں گھبرا گیا، تو کیا یہ زبیر کا گھر نہیں تھا؟ کیا میرا تمام سفر اور محنت یونہی غارت گئی؟ میرے جسم میں ایک طرح سے کپکپی طاری ہو گئی۔

زبیر صاحب کا دوست ہوں، مجھے خبر ملی تھی وہ یہیں رہتے ہیں۔

جی یہیں رہتے ہوں گے، مگر پندرہ دن سے ہم رہ رہے ہیں۔ یہ فلیٹ ہم نے خرید لیا ہے۔ نسوانی آواز دروازے کے پیچھے سے آ رہی تھی اور اب مجھے یہ آواز پہلے سے بُری معلوم ہونے لگی تھی۔

کچھ خبر ہے کہاں چلے گئے ہوں گے؟

جی نہیں، جب ہم نے خریدا تو بالکل خالی تھا۔ آپ ایسا کریں ٹیلی فون آفس میں اُن کے نام سے پتا کرلیں۔ اگر وہ ٹیلی فون استعمال کرتے ہوں گے تو اُن کا موجودہ پتا وہاں سے مل جائے گا۔

یہ آفس کہاں ہوگا؟ بتا دیں تو آپ کا شکرگزار ہوں گا۔ اصل میں میرا یہاں کوئی واقف نہیں ہے۔ بہت دُور سے آیا ہوں۔ پنجاب کے ایک چھوٹے سے شہر سے۔ ابھی گاڑی سے اُتر کے یہیں آیا ہوں اور رات ہی واپس جانا چاہتا ہوں۔ یہ جملے مَیں نے اتنی انکساری سے ادا کیے کہ عورت کا دل پسیج جائے۔

میرے اِس سوال پر تھوڑی دیر کے لیے خموشی چھائی رہی اُس کے بعد پھر آواز آئی، آپ یہاں رُکیے گا۔ مَیں بتاتی ہوں۔ اُس کے قدم دُور جاتے سنائی دیے۔ میرا دل بجھ چکا تھا۔ جو کچھ اُمید نظر آئی تھی اُس میں اندھیرا بہت ہو گیا تھا۔ مجھے لگا اب کوئی چیز صاف دکھائی نہیں دے گی۔ تھوڑی دیر میں وہ خاتون دوبارہ دروازے کے قریب آتی دکھائی دی۔ اِس بار اُس نے دروازہ کھول دیا لیکن دروازہ کھول کر اندر بلانے کی بجائے دروازے پر ہی کھڑی ہوگئی۔ خاتون نہ بہت زیادہ خوبصورت تھی نہ بدصورت البتہ لاہوری خواتین کی نسبت اِس کی صحت کمزور نظر آ رہی تھی۔ ابھی تک کراچی میں مجھے موٹاپے کی شکار کوئی خاتون نظر نہیں آئی تھی، نہ لاری میں اور نہ سڑک کے اردگرد۔ ایک کاغذ اُس کے ہاتھ میں تھا۔ اُس پر ٹیلی کمیونیکیشن کا پتا لکھا ہوا تھا۔ یہ پتلے بازؤوں اور ذرا نکلتے قد والی خاتون تھی۔ مجھے ایک دم اِسے دیکھ کر کچھ شبہ ہوا، اِس کی شکل کسی سے ضرور ملتی تھی۔ کسی ایسے شخص سے جسے مَیں نے دیکھا تھا مگر یاد نہیں آ رہا تھا۔ مجھے شبہ ہوا کہیں گڑبڑ ہو رہی ہے۔ اُسی وقت اُس نے مخاطب کر کے کہا، یہ اُس دفتر کا پتا ہے، آپ یہاں سے پتا کر سکتے ہیں لیکن... پھر خموش ہوگئی۔

مَیں نے محسوس کیا وہ کچھ لڑکھڑا رہی ہے اور کاغذ دیتے وقت کسی پس و پیش میں ہے۔ مَیں نے اُس کے ہاتھ سے کاغذ لے لیا اور پیچھے ہٹنے سے پہلے آخری کوشش کی، محترمہ دیکھیے! اگر آپ اِس سے زیادہ میری مدد کرسکیں تو شاید بہت آسانی ہو جائے۔ اِس وقت یہ آفس تو لازمی کھلا نہیں ہوگا اور مَیں رات ہی واپس نکل جانا چاہتا ہوں۔

وہ کچھ لمحے سوچتی رہی پھر بولی، آپ کیوں آئے ہیں؟ اِن سے کیا کام تھا؟

اُس کی اِس ہلکی سی توجہ کے باعث مجھے ایک دم حوصلہ ہوا، مجھے لگا مَیں اپنی منزل کے قریب ہوں۔ میری والدہ اِن کی بیگم کی سہیلی تھی۔ اُس نے کچھ اپنی امانت والدہ کے ہاں رکھی ہوئی تھی، وہ ہم

اُن کے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔

مَیں نے دیکھا وہ میری بات سے متاثر نظر آ رہی تھی۔

ایک کام کرو، وہ بولی، یہاں سے نیچے جاؤ، پہلے فلور کا 2 نمبر فلیٹ اُنھی کا ہے، لیکن خبر دار میرا نہیں بتانا کہ مجھ سے پتا لیا ہے۔ آپ کہنا مَیں نے ٹیلی کمیونیکیشن والوں سے پوچھا۔

جی بہتر ایسا ہی ہوگا۔ مَیں یہ کہہ کر نیچے اُتر آیا۔

تھوڑی دیر بعد فلیٹ نمبر 2 کے سامنے کھڑا تھا اور میرا دل دھڑک رہا تھا۔ سامنے کھڑے ہو کر مَیں نے کچھ آیات پڑھیں پھر کنڈی کھٹکھٹا دی۔ پہلی دفعہ کی کُنڈی شاید کسی نے نہیں سنی۔ مَیں نے دوبارہ کُنڈے کو ہلایا تو ایک لڑکے کی آواز سنائی دی، کون؟

جی مَیں ضامن ہوں آپ کے اَبا سے ملنا ہے، مَیں نے آہستہ سے کہا۔

وہ تو گھر پر نہیں ہیں، اُس کے ساتھ ہی اُس نے دروازہ بھی کھول دیا۔ یہ پندرہ سال کا لڑکا تھا، نہایت خوبصورت اور دیکھتے ہی مَیں نے پہچان لیا، یہ جنید کا چھوٹا بھائی تھا۔ یہ کائنات کتنی واضح ہے۔ ہر چیز اپنی وضاحت اور دلیل کے ساتھ اِس میں موجود ہے۔ آپ چیزوں کی تقسیم کو اُن کے واضح فرق کے باوجود کتنی جلدی پہچان لیتے ہیں۔ کس قدر عجیب بات تھی ایک ایسا لڑکا جسے میں کم و بیش آٹھ سال سے بھول چکا تھا، عین اُسی رنگ و جمال کا اُس کا چھوٹا سائز میرے سامنے موجود تھا حالانکہ نہ اِن کی ماں ایک تھی، نہ روپے ایک سے۔ بس درمیان میں ہلکی سی ڈور تھی جسے آپ اُن کا باپ کہہ لیں۔

میں بہت دُور سے آیا ہوں۔ اُن سے ضروری ملاقات ہے۔ مَیں نے آگے بڑھ کر کہا۔

میرے اِس جملے کے ساتھ ہی ایک خاتون دوڑتی ہوئی آئی اور لڑکے کو ڈانٹتے ہوئے بولی، طیب دروازہ کیوں کھولا؟ دروازہ بند کرو۔ اُس کے ساتھ ہی وہ دروازے کو بند کرنے کے لیے دوڑی، لڑکا ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ خاتون دوبارہ بولی، آپ کون ہیں اور یہاں اندر کیوں گھسے چلے آتے ہیں لیکن اس سے پہلے کہ وہ دروازہ بند کر کے پیچھے چلی جاتی مَیں نے دروازے کو زور سے پکڑ لیا۔

آپا جی بات سنیں آپ اتنا غصے کیوں ہو رہی ہیں۔ مَیں نے ذرا نرم لہجے سے بات کرنے کی کوشش کی مگر دروازے پر اپنی گرفت مضبوط رکھی۔

آپ کو اُن سے کیا کام ہے اور اِس گھر کا پتا کہاں سے لیا؟ دروازہ چھوڑیے۔ اُس کا غصہ ویسے ہی تھا۔

بی بی جی آپ کیوں مشتعل ہو رہی ہیں۔ چھوٹی سی بات سُن لیں پھر دروازہ بند کر کے چلی جائیں، مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ وہ اتنی محتاط کیوں تھی۔ بار بار لڑکے کو بھی ڈانٹ رہی تھی کہ اُس نے بلاوجہ دروازہ کیوں کھول دیا۔

ہاں بتائیے، یہیں بتائیے جلدی سے۔ آخر زچ ہو کر وہ تیزی سے مجھ سے مخاطب ہوئی۔ آپ ٹبہ ولی بخش سے آئے ہیں؟

اب مجھے اُس کی گھبراہٹ کی سمجھ آئی لیکن اتنے عرصے میں وہ یہ بات سمجھ چکی تھی کہ مَیں کسی قسم کا متشدد انسان اُن کے دروازے پر نہیں آیا تھا اور نہ میرا کوئی وہاں دوسرا ساتھی تھا۔

آپ ایک منٹ دیں گی تو مَیں تمام بات آپ کے سامنے رکھ دوں گا۔ مَیں کسی ٹبہ ولی بخش کو نہیں جانتا۔ مَیں منٹگمری کی ایک تحصیل سے آیا ہوں اور والدہ نے مجھے بھیجا ہے۔

کیوں بھیجا ہے؟ اُسے میرے خاوند سے کیا کام؟ عورت نے گھبراہٹ سے پوچھا۔

اُسے آپ کے خاوند سے کوئی کام نہیں ہے البتہ زینت سے کام ہے۔ اُس کی ایک امانت میری والدہ کے پاس پڑی ہے وہ اُس کے حوالے کرنی ہے۔ امانت دراصل زینت کی ماں عدیلہ کی تھی۔ پچھلے دنوں عدیلہ فوت ہو گئی۔ اب وہ امانت ہمارے سر پر بوجھ ہے۔ وہ اُس کی بیٹی کو سونپ دینا چاہتی ہے۔

ہمیں کچھ نہیں چاہیے، عورت دوبارہ بولی۔

یہ عورت بہت ہی تیز اور مشتعل قسم کی تھی یا ڈری ہوئی تھی کہ اُسے اپنی چھوٹی سی حماقت سرزد ہونے کے سبب بڑی آفت کا یقین تھا۔ بہت زیادہ تذبذب کا شکار نظر آ رہی تھی۔ اچھا دروازہ چھوڑیے اور اندر آ جائیے۔

مَیں نے دروازہ چھوڑ کر اندر قدم رکھا۔ اُس نے دروازہ جلدی سے لاک کر کے اُسے دوبارہ گھمایا کہیں لاک کھلا تو نہیں رہ گیا۔ اُس کے بعد مجھے ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ یہ ڈرائنگ روم بہت بڑا اور نہایت آرائشی تھا۔ قالین اور میزیں اور صوفے واقعی اپر مڈل کلاس کی اپروچ کو ظاہر کرتے تھے۔ مجھے بالکل تجربہ نہیں تھا، فلیٹ کوئی شے ہوتی ہے اور ایک ہی عمارت میں کئی خاندان بستے ہیں۔ اپنی زندگیوں کو آزاد کہنے والے لاک زدہ دروازوں میں قید ایک دوسرے سے مکمل بے خبر تھے۔ یہ لوگ تو ایسے تھے کہ دروازوں کی زنجیروں سے بندھے ہوئے تھے۔ اِن کی بڑی آزادیوں کے پیچھے بڑی زنجیریں موجود تھیں۔ اُنھیں دیکھنے والے دیکھ نہیں سکتے محسوس کر سکتے ہیں۔

جی اب بتایے کون سی امانت ہے؟ ہمیں کسی امانت کی ضرورت نہیں۔عورت کی بے چینی بڑھی جا رہی تھی۔

امی وہ امانت آپ کو کب دے رہے ہیں؟ وہ تو زینت آپا کی بات کر رہے ہیں۔آخر عورت کا بیٹا اپنی امی کی سرزنش کرنے لگا۔

شٹ اپ، تجھ سے چپ نہیں رہا جاتا؟ عورت نے اپنے بیٹے کو ایک بار پھر سختی سے ڈانٹا۔

تو آپ زینت کی امانت کے سلسلے میں ہمارے گھر کیوں آئے ہیں؟ وہ غصے سے بولی۔

آپ کے گھر اِس لیے آیا ہوں کہ جنید آپ کا سوتیلا بیٹا یعنی زینت کا خاوند ہے اور شاید آپ ہی کے گھر رہتا ہے اور اُس کی بیوی زینت ہے۔مَیں نے جان بوجھ کر جنید کے قتل سے بے خبری سے کام لیا کہ عورت مطمئن ہو جائے۔وہ میرے اِس جملے پر ہلکی سی نرم ہوئی۔

آپ کو نہیں پتا جنید قتل ہو چکا ہے؟ وہ تعجب سے بولی۔

ہائیں، مَیں نے تھوڑا بہت ڈراما کرنا مناسب سمجھا اور حیرانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا، آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ مجھے سمجھ نہیں آیا؟

اُس کے کزن نے اُس کو قتل کروا دیا ہے۔ڈاکٹر فرح اِس حادثے کے کچھ ہی دنوں بعد زینت اور اُس کے بچوں کو یہاں سے لے گئی تھی۔وہ اُوپر والے فلیٹ میں رہتے تھے۔وہ بولتی چلی گئی۔اُوپر 21 نمبر فلیٹ اُن کا تھا۔اب وہاں میری بہن رہتی ہے۔

مَیں اُس کی اِس اطلاع پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔چند وقفے اِسی طرح گزرے تھے کہ مَیں نے اُسے پوچھا، کیا آپ اُن کے نئے ٹھکانے کی کوئی خبر دے سکتی ہیں؟

وہ اُن کو کہاں لے گئی تھی اِس کی ہمیں خبر نہیں۔طیب کے والد نے اُنھیں ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی لیکن نہیں ملے۔مَیں نے سُنا ہے جنید کے قتل کے بعد اُس کی والدہ کا بھی قتل ہو گیا تھا۔

'سُنا ہے' کا لفظ اُس نے ایسے بولا جیسے وہ اُن سے بالکل لاتعلق تھی اور کسی بھی معاملے میں اُس کا شوہر یا وہ خود مدتوں سے شریک نہیں تھے۔خدا جانے وہ یہ تاثر مجھ پر کیوں پیدا کرنا چاہتی تھی۔اُس کے خیال میں ایک معمولی سی احتیاط ابھی تک باقی تھی کہ اگر مَیں کسی طرح سے اُن کے دُکھ کا مداوا کرنے والا یا جاسوس ہوں تو یہ جان لوں کہ اِس سارے قضیے میں فرح کا سابقہ شوہر اور اُس کی بیوی بالکل بے گناہ تھی۔اتنے میں اُن کا ملازم [illegible] اور مختلف قسم کے بسکٹ اور مٹھائیاں سامنے لا

رکھیں۔ یہ کسی طرح اُس کے نارمل ہونے کی دلیل تھی۔ مَیں کافی دیر سے بھوکا تھا۔ چائے اور مٹھائی میرے لیے ایک قسم کا ایندھن تھا۔ مَیں چائے پینے لگا اور ایک مٹھائی کا ٹکڑا اُٹھا کر منہ میں ڈال لیا اور اِس ترشی نظر سے، کہ اُسے احساس نہ ہو حسن کا جائزہ لے رہا ہوں۔ یہ خاتون کسی طرح بھی ڈاکٹر فرح کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ حسن و جمال میں تو کسی بھی طرح اُس کی ہم پلہ نہیں تھی۔ پھر خدا جانے زبیر نے اِس کے بدلے ڈاکٹر فرح کو کیوں طلاق دے دی لیکن نہیں، اِس کی وجہ سے خود ڈاکٹر فرح نے اپنے خاوند کو چھوڑ دیا تھا۔ مَیں نے نہ چاہتے ہوئے بھی پاؤں سے سر تک اُس کا جائزہ لے لیا۔ وہ اُسے محسوس کرنے سے عاجز تھی اور مسلسل ایسی کشمکش میں تھی جس میں کسی خطرے کا اعلان محسوس ہو رہا ہو۔

آپ یہ بتا سکتی ہیں زینت کراچی میں ہی ہے یا یہاں سے چلی گئی ہے؟ مَیں نے نا اُمیدی سے ایک سوال اور کیا۔ مجھے پتا تھا جب مدعا غائب ہو جائے تو ایسے سوالات بے معنی ہوتے ہیں۔ مَیں نہ تو سراغ رساں تھا اور نہ میرے پاس ایسے وسائل تھے کہ اُن کا استعمال کر کے اپنے مقصد تک پہنچ جاؤں۔ مَیں جان چکا تھا زینت اب مجھے ملنے والی نہیں ہے۔ جب وہ اپنی ماں کے مرنے پر نہیں آئی اور نہ اُسے اطلاع ہو سکی تو میرا اِس طرح اُسے ڈھونڈنا واقعی بے سود کوشش تھی مگر اِس خاتون سے ایسے سوال کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

میرے سوال پر اُس نے پہلو بدلا، دیکھیے بھائی، مجھے اتنا پتا ہے کہ زینت اپنے بچوں کے ساتھ یہاں سے چلی گئی تھی۔ وہ تو رات کے وقت ہی نکل گئی تھی۔ اُسے خطرہ تھا فرح کا کزن طلال جنید کو قتل کرنے کے بعد اُن تک پہنچے گا۔ اِس لیے ہم نے خود اپنا مکان بدل لیا اور مجھے حیرت ہے آپ یہاں بھی پہنچ گئے ہیں لیکن زینت تو یہاں سے رات کے وقت نکلی تھی۔ اب نہیں معلوم وہ کراچی میں ہے یا کسی اور شہر میں چلی گئی ہو۔ مَیں اتنا جانتی ہوں اب اُن کے سلسلے میں ہمارے ساتھ کوئی اور شخص رابطہ نہ رکھے۔ آپ سے بھی میری یہ التجا ہے کسی کو اِس مکان کا نہ بتایئے گا۔

کیا مَیں آپ کے خاوند سے مل سکتا ہوں؟ مَیں نے آخری سوال کر کے ایک طرح سے اپنا سفر ختم کر دیا۔

خدا کا واسطہ ہے آپ یہاں سے چلے جائیں۔ میرے خاوند یہاں نہیں ہیں۔ وہ اپنے کام کے سلسلے میں باہر گئے ہوئے ہیں۔ نہ اب وہ کسی سے ملنا چاہتے ہیں۔ ہمارے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ اُٹھی اور اپنے بیٹے کو کہنے لگی طیب بیٹا اپنے انکل کو دروازے تک چھوڑ آؤ۔

اِس کا مطلب تھا اب اُسے میرا یہاں ایک لمحہ ٹھہرنا بھی گوارا نہیں تھا۔ مَیں اُٹھ کھڑا ہوا۔ پھر کچھ ہی لمحوں بعد اُن کے فلیٹ سے باہر نکل کر دوبارہ ایم اے جناح روڈ پر آ گیا۔ بجلی کے بلب کھمبوں کے ساتھ پوری سڑک پر قطار در قطار روشنیاں جما رہے تھے۔ سمندری ہوائیں چل رہی تھیں اور صاف ستھری سڑکوں پر اِکا دُکا کاریں، ڈبل ڈیکر لاریاں اور تانگے چلے جاتے تھے۔ میرا اِس شہر میں کوئی واقف نہیں تھا۔ دو چار لوگوں کے نام سے شناسا تھا، جنھیں پڑھ رکھا تھا یا اُن کے نام کامریڈوں سے سنے تھے۔ وہ کراچی میں رہتے تھے۔ اُن کو آپ واقف کار تو کسی صورت نہیں کہہ سکتے البتہ یک طرفہ شناسائی کے حوالے تھے لیکن مَیں ایسے حوالوں کا کبھی قائل نہیں رہا تھا اور کامریڈوں کا تو بالکل بھی نہیں تھا۔ اِن کے رویے ہر شہر، ہر محلے اور ہر گلی میں ایک ہی جیسے تھے۔ ہومیو پیتھک دواؤں کی طرح سود و زیاں سے ماورا۔ ویسے بھی مجھے جو کچھ اِن سے اپنے شہر میں تجربہ ہوا تھا، یہاں کسی طرح اُن کی طرف جا کر وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مَیں بہت دیر کراچی کی اِن روشن اور کھلی سڑکوں پر آوارہ پھرتا رہا۔ یہاں کی ہوائیں ایسی تھیں کہ اُن میں ہوا ہو جانے کو جی چاہتا تھا۔ اِس آوارہ خرامی میں مجھے کچھ پتا نہیں چلا کب رات کے دس بج گئے تھے۔ یعنی میں ڈھائی گھنٹے پھرتا رہا تھا۔ اب مجھے حکیم فطرس صاحب کے چچازاد سید قنبر علی شاہ کی طرف جانا تھا اور یہ کراچی صدر میں تھے۔

(۴۰)

مَیں ایم اے جناح روڈ پر چلا جا رہا تھا۔ اِس عالم میں جانے کتنا فاصلہ طے کر گیا۔ میرے دماغ میں دو باتیں چل رہی تھیں اور اُن دو میں سے کسی ایک کے بارے میں فیصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ اول یہ کہ مجھے آج ہی اِس شہر سے نکل جانا چاہیے، دوم سید قنبر علی نقوی کی طرف چلا جاؤں۔ وہاں دو تین دن رہ کر مزید ایک بار اُنھیں ڈھونڈنے کی کوشش کروں۔ اِس عرصے میں شاید مل ہی جائیں یا اگر وہ نہ ملیں تو مجھے یہاں کام مل جائے۔ اِس طرح تھوڑی تھوڑی دیر بعد میرے دل و دماغ اپنے فیصلے تبدیل کرنے لگے۔ اگر دن کا سماں ہوتا تو مَیں شہر میں تھوڑی بہت سیر کر کے اِس کے خط و خال دل میں اُتارنے کی کوشش کرتا۔ رات کے عالم میں تو سارے شہر ایک جیسے ہو جاتے ہیں۔ آخر مَیں ایک شخص سے اسٹیشن کا پتا پوچھ کر اسٹیشن جانے والی لاری کے انتظار میں کھڑا ہو گیا اور تھوڑی دیر بعد ہی مجھے وہ لاری مل گئی۔ آج شام جب مَیں کراچی اسٹیشن پر پہنچا تھا تو مَیں نے ایک غلطی کی کہ وہاں سے واپسی کا ریل ٹائم ٹیبل نہیں پوچھ سکا۔ بہرحال مَیں رات گیارہ بجے دوبارہ ریلوے اسٹیشن پر آیا۔ ٹائم ٹیبل کا پتا کیا تو خبر ہوئی ریل کل دن ایک بجے لاہور کے لیے نکلے گی۔ مجھے ایک گونا مایوسی ہوئی لیکن ایک خوشی بھی تھی کہ چلو اچھا ہوا۔ مَیں یہ ایک رات سید حکیم حاجی فطرس علی کے رشتے داروں کے ہاں گزار کر صبح اُردو بازار جاؤں گا اور کچھ کتابیں دیکھ کر واپس نکل جاؤں گا۔

اب مجھے آدم جی داؤد جی روڈ کے پاس خوجہ شیعہ اثنا عشری مسجد کے قرب میں جانا تھا اور یہ جگہ

اسٹیشن سے کافی دور تھی۔ ایک دفعہ تو میرے جی میں آئی یہیں اسٹیشن پر رات بسر کروں اور اُس وقت تک انتظار میں رہوں جب تک گاڑی لاہور کے لیے روانہ نہیں ہو جاتی لیکن وقت کافی تھا اور کوئی کام بھی نہیں تھا۔ مَیں پیدل چلتا ہوا، نیشنل بینک آف پاکستان کی عمارت کے سامنے آ گیا۔ یہاں سے بندری گر روڈ کو عبور کر کے کریو بی ایل کی عمارت کے سامنے سے گزر کر دوبارہ ایم اے جناح روڈ پر آ گیا۔ یہ فاصلہ کم بیش ڈیڑھ گھنٹے میں طے کیا۔ اتنے کھلے روڈ اور صاف سڑکوں پر چلتے ہوئے مجھے ایک عجب لطف کا احساس ہو رہا تھا۔ اگر چہ تھکاوٹ زیادہ چھا چکی تھی لیکن خدا جانے کیوں مَیں نے گاڑی تانگے یا لاری میں بیٹھنا مناسب نہیں سمجھا۔ ایک ڈر یہ بھی تھا اگر حکیم فطرس علی کے رشتے داروں نے ٹھہرانے میں ہچکچاہٹ کا اظہار کیا تو کم از کم رات کا باقی حصہ تھوڑا رہ جائے گا اور مَیں وہیں سے پیدل اسٹیشن کی طرف چل پڑوں گا۔ اِس طرح کراچی کی گلیاں بھی ناپ لوں گا اور رات بھی گزر جائے گی۔ ایک بات مجھے بہت اچھی لگی تھی۔ رات کے اِس لمحے یہاں کسی بھی پولیس کے آدمی یا نگرانی کرنے والے نے میری طرف نہیں دیکھا تھا۔ اکثر لوگ پیدل سفر پر تھے۔ سائیکلوں کا رواج بہت تھا۔ سڑکوں پر نیم، برگد اور پیپل کے علاوہ ایک اور بھی درخت جا بجا نظر آ رہا تھا لیکن مجھے اُس کا نام نہیں آتا تھا۔ کچھ بیریاں بھی نظر آ رہی تھیں مگر ایسی نہیں کہ اِن کے سبب اِن چوڑی سڑکوں پر چھاؤں بھر جائے۔ اب مَیں چلتے ہوئے دوبارہ ایم اے جناح روڈ پر آ گیا تھا۔ یہاں سے ایک سیدھی سڑک چائے والی گلی سے ہو کر اور پاریا سٹریٹ کو عبور کر کے خوجہ مسجد کے قریب نکلتی تھی۔ یہ فاصلہ اسٹیشن سے کم سے کم پندرہ کلومیٹر تھا اور اُسے مَیں پیدل طے کر گیا تھا۔ اِس میں تین گھنٹوں کی مسافت کام آئی۔ خوجہ مسجد کے بالکل عقب میں اُن کا مکان تھا۔ یہ مکان سنگل اسٹوری تھا اور بہت کشادہ اور خوبصورت تھا۔ مکان کے سامنے ایک چھوٹا سا چوک بنا تھا۔ اِس میں پیپل کا ایک درخت رات کی سمندری ہوا میں پتوں کی تالیاں بجا رہا تھا۔ ساتھ ہی ایک کھمبا موجود تھا۔ اِس کی چوٹی پر لگی ہوئی بڑی لائٹ چوک اور مکان کو یکساں روشن کر رہی تھی۔ یہ مکان بھی زرد پتھروں سے بنا تھا اور یونانی طرز کی تعمیر لیے ہوئے تھا۔ کراچی میں یہ ایک مرکزی جگہ تھی اور میرے خیال میں کافی مہنگی تھی مگر میرے لیے یہ وقت کاروباری حساب کتاب سے سوچنے کا نہیں تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کراچی ایک ٹلک ہے۔ مَیں اِس ٹلک کو دبے قدموں دیکھ رہا تھا۔ میرا یہ تجربہ شاید میرے لیے آخری ہو کیونکہ زینت کے یہاں سے بے خبری کی صورت میں دوبارہ اِس شہر میں لوٹنے کا احساس بھی ختم ہونے والا تھا۔

خوجہ مسجد کے پچھلی جانب پہنچ کر مجھے احساس ہوا یہاں سیٹیاں بجانے والے چوکیدار بھی موجود ہیں۔ ایک چوکیدار میری طرف باقاعدہ بڑھ رہا تھا لیکن مجھے کوئی خوف نہیں تھا۔ میرے پاس یہاں آوارہ گردی کا ایک جواز موجود تھا۔ چوکیدار میرے قریب آیا تو مَیں نے اُس کے بولنے سے پہلے ہی پوچھا، مجھے سید قنبر علی نقوی صاحب کے گھر جانا ہے۔ اگر آپ تفتیش پر تیار کمزور شخص کو پہلے ہی ایک دو سوال کر دیں تو اُس کے بولنے کی قوت شل ہو جاتی ہے۔ یہی مَیں نے اُس وقت کیا تھا۔ وہ چوکیدار اب اِس بات کا پابند ہو گیا تھا کہ میری تفتیش کی بجائے میری مدد کرنے کی کوشش کرے۔ البتہ اُس نے یہ پوچھنے کی ضرورت ضرور محسوس کی آپ کہاں سے آئے ہیں اور کیوں آئے ہیں۔ مَیں نے اُسے اپنا مدعا بتانا وقت کا ضیاع سمجھا۔ فقط یہ کہا اُن سے ہمارے دُور کے تعلقات ہیں۔ چوکیدار میرے آگے چل پڑا اور ایک گھر کے دروازے پر پہنچ کر کنڈے کو کھٹکھٹا دیا۔ تھوڑی دیر بعد اندر سے آواز آئی، کون ہے؟

میرے بولنے سے پہلے ہی چوکیدار بول اُٹھا، سید جی پنجاب سے آپ کا مہمان آیا ہے۔ ضامن علی اِس کا نام ہے۔

ارے بھائی کون ضامن علی؟ دروازہ کھلنے پر سید جی نے باہر جھانکا، اب مَیں فوراً آگے بڑھا، سید جی مَیں منٹگمری کی ایک تحصیل سے آیا ہوں۔ یہاں ایک کام آیا تھا۔ حاجی فطرس علی میرے مشفق ہیں۔ اُنھوں نے کہا تھا آپ کے ہاں ٹھہر جاؤں، یہ رقعہ بھی اُنھوں نے دیا ہے۔

حاجی قنبر علی نقوی ایک دراز قامت، سفید داڑھی اور سر پر چوگوشیہ ٹوپی جمائے ہوئے تھے۔ میرے ہاتھ سے رقعہ لے کر اُسے دیکھنے لگے۔ اُن کے رقعہ دیکھنے کے درمیان مَیں نے مزید کہا۔ بس ایک آدھ رات ہی رُکوں گا۔ کل ایک بجے واپسی کا ٹکٹ ہے۔ اگر رات کے بسر کرنے کو ٹھکانا ملے تو۔

ارے بھائی کاہے کو ٹھکانا نہیں ہوگا؟ ایک رات کیوں جب تک ٹھہرو آپ کا گھر ہے۔ یہ کہہ کر اُنھوں نے چوکیدار کا شکریہ ادا کیا اور دروازے کی راہ چھوڑ دی۔ میرے مولا کے مہمان ہو بھائی چلے آؤ۔ حاجی صاحب کا کیا حال ہے؟ یہ کہہ کر وہ مجھے گھر کی ڈیوڑھی میں لے گئے۔ مَیں دروازے کے اندر ہو گیا۔ تب اُنھوں نے لکڑی کا دروازہ بند کر دیا۔

(۴۱)

یہ سید قنبر علی نقوی کا گھر نہیں، حویلی تھی۔ ڈیوڑھی تیس فٹ لمبی اور پندرہ فٹ چوڑی تھی۔ پتھر کے ستونوں اور پتھر کی دیواروں سے آراستہ تھی۔ اِس کے دائیں طرف ایک کمرہ تھا۔ سامنے ایک چوڑا صحن تھا۔ صحن بھی تمام سُرخ پتھر کا فرش تھا۔ مکان تقسیم سے پہلے کا تھا اور کسی امیر ہندو کا رہا ہوگا۔ میرے خیال میں اِس طرح کی تمام الاٹ منٹیں اُس وقت کے کمشنر کراچی کی کرامات تھیں۔ قنبر شاہ صاحب مجھے دائیں طرف کے حصے میں لے گئے۔ یہاں لکڑی کے دو تختوں کا دروازہ تھا جسے تانبے کے زنجیر اور لکڑی کی بلیاں لگی ہوئی تھیں۔ دروازے کی زنجیر کھلی تھی اور بلیاں چڑھی تھیں۔ شاہ صاحب نے دونوں بلیاں گرا کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے ایک نہایت عالی شان ڈرائنگ روم دکھائی دے رہا تھا۔ ولائتی صوفے اور ہندوستانی مسہریوں کی دائیں بائیں قطاریں تھیں۔ بیچ میں دو بڑے بیڈ لگے ہوئے تھے۔ قنبر صاحب نے مجھے اشارہ کیا کہ جوتے اُتار کر بیڈ پر چلا جاؤں۔ یہ رات کا پچھلا پہر تھا۔ اِس وقت مجھے شرمندگی نے گھیر لیا تھا، اچھے بھلے بزرگ کو رات کے اِس پہر باولا کر رہا ہوں۔ اگر آوارگی اور تذبذب کے بغیر آ جاتا تو بے چارا نیند کا ماندہ نہ ہوتا اور اب مجھے بھی نیند نے مکمل اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ مَیں نے اپنے جوتے دروازے کے ساتھ ہی اُتار کر رکھ دیے اور فرش پر پڑی سفید چاندنی سے ہوتا ہوا بیڈ پر چلا گیا۔ چاندنی کے نیچے کوئی بہت نرم قالین تھا۔ ایسے گھروں میں قیمتی قالینوں کے اُوپر اکثر چاندنیاں بچھا دی جاتی ہیں تا کہ قالین کے رنگ خراب نہ ہوں اور خاص مہمانوں کی آمد پر اُٹھائی

جاتی ہیں۔ مَیں نے اپنے پاؤں پسار کر بیڈ پر کر لیے۔ تب شاہ صاحب گویا ہوئے، کیا لیجیے گا کھانا بھیا۔

اُن کی زبان سے مجھے بھیا کہنا عجیب سا لگا مگر یہ لوگ عموماً اپنے سے چھوٹوں کو یوں ہی خطاب کرتے ہیں۔ مجھے معلوم تھا، وہ کچھ کھانا مہیا کرنے کی طرف رجوع کریں گے لیکن اِس وقت کھانا کھانے کی طرف ایک تو خود مائل ہونا مشکل تھا دوسرا خواہ مخواہ شاہ صاحب اور اُن کے اہلِ خانہ کو تکلیف دینا تھی۔ مَیں نے جواب دیا، شاہ جی اِس وقت بالکل کسی شے کی حاجت نہیں بس سونا چاہتا ہوں اگر آپ اجازت دیں۔

پھر بھی کچھ تو لیجیے گا، شب کے سائے میں مہمان کا بھوکے سونا کچھ عجیب سا لگتا ہے، شاہ صاحب نے روایتی میزبانی کا پاس رکھنے کی کوشش کی۔

شاہ صاحب مَیں پنجاب سے آیا ہوں اور بلا شبہ ایک بے تکلف آدمی ہوں۔ کچھ ضرورت ہوتی تو ضرور کہہ دیتا۔ آپ آرام کیجیے، مَیں نے آپ کو اِس وقت زحمت دی۔ مَیں بس سونا چاہتا ہوں۔

اچھا بھیا سو جائیے، البتہ یہ ہم کچھ خشک میوہ رکھے جاتے ہیں، طلب ہو تو بلا تکلف لیجیے گا۔ کمرے کے دائیں پہلو حوائج کے واسطے طہارت خانہ ہے۔

جی بہت خوب شاہ صاحب اور اُس کے بعد وہ نکل گئے۔ اُنھوں نے دروازہ خود ہی آہستہ سے بند کر دیا اور مَیں نے اندر سے بکی چڑھا دی۔

آنکھ کھلی تو دن کے نو بج رہے تھے، حیرت تھی مجھے کسی نے اُٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مَیں نے طہارت خانے میں جا کر غسل کیا اور واپس کمرے میں آ گیا۔ اب مجھے یہ خبر نہیں تھی کہ اپنے میزبان کو کیسے بتاؤں میں جاگ گیا ہوں۔ چند لمحے میں بائیں طرف کے صوفے پر بیٹھا رہا پھر اُٹھ کر دروازے پر دستک دی۔ میرے دستک دیتے ہی سید قنبر علی شاہ کمرے میں داخل ہو گئے۔

میاں اُٹھ لیے، اُنھوں نے آتے ہی فرمایا۔

جی شاہ صاحب، جاگ گیا ہوں۔ مَیں نے نہایت ادب سے کہا۔

چلیے پھر ناشتا کیجیے، یہ کہتے ہی وہ باہر نکل گئے۔ اُن کے باہر نکلتے ہی مَیں نے کمرے کا از سرِ نو جائزہ لینا شروع کر دیا۔ یہ بجا طور پر ایسا کمرہ تھا جس میں مذہبی کلینڈر اور دیواروں پر نقش شدہ ایسے قالین اور تلواریں لٹکی ہوئی تھیں جن پر آئمہ طاہرین کے اسمائے گرامی اور علم اور شبیہیں جا بجا نظر آ رہی

تھیں۔ اِن میں کچھ علَم طلائی کے، کچھ چاندی کے نقش شدہ پتروں پر تھے اور کچھ کپڑوں پر۔ تھوڑی دیر میں ایک نوکر کے ہاتھ کھانے کی ٹرے آ گئی۔ اُن میں بے شمار چٹنیاں، سالن اور اچار اور حلوے اور نان، روٹیاں شیرمال بھرے ہوئے تھے۔ مَیں حیران تھا اتنا مال کیسے کھا سکتا تھا۔ مَیں نے کبھی ایسا کھانا نہیں کھایا تھا جس میں ایک روٹی اور اُس کے اُوپر سالن کے علاوہ کچھ اور ہو مگر یہاں تو ناشتے کے نام پر دنیا بھر کے خوان ایک بڑے ٹرے میں دھرے ہوئے تھے۔ ناشتا مزے کا تھا، ناشتے کے دوران شاہ صاحب میرے ساتھ کھاتے رہے اور تب تک منہ ہلاتے رہے جب تک مَیں نے اپنا پیٹ نہیں بھر لیا۔ تھوڑی دیر میں ہم ناشتے سے فارغ ہو گئے اور ملازم سامان اُٹھا کر لے گیا۔ تب شاہ صاحب نے مجھ سے پوچھنے کی زحمت کی، میاں ضامن صاحب آپ کو اپنے کسی کام میں ہماری ضرورت ہو تو بتایئے گا۔ آج شام کھارادر میں ہمارے ملیح آباد کے ایک شاعر مرثیہ پڑھیں گے۔ وہاں چلنا ہو تو کہیے گا۔ جب تک یہاں رہنا ضروری سمجھیں یہ کمرہ آپ ہی کے تصرف میں ہو گا۔

جی شاہ صاحب آپ نے جس قدر محبت اور اپنایت سے مجھے جگہ دی، اِس کا احسان مند رہوں گا۔

ارے بھیا کیوں شرمندہ کرتے ہیں؟ حاجی صاحب کے کیا حالات ہیں؟ قنبر شاہ نے میری شکرگزاری سے درگزر کرتے ہوئے کہا۔

جی اچھے ہیں، کہتے تھے دو ماہ بعد آئیں گے۔ مَیں نے جواب دیا۔

حاجی صاحب، اگر آپ بُرا نہ مانیں تو ایک کام کہہ سکتا ہوں؟ مَیں نے اب کے ڈرتے ڈرتے کہا۔

جی ضرور کہیے۔

ایک صاحب کا پتا کرنا تھا، مل نہیں رہے، اگر کچھ امداد اِس معاملے میں ہو جائے تو شکرگزار رہوں گا۔

بتایئے، کچھ کر سکے تو ضرور، حاجی قنبر علی نے کہا۔

مَیں نے زبیر کے پتے والا کاغذ اُن کے حوالے کر دیا۔ اِن صاحب کی اگر کچھ خبر لگے تو میرے لیے بہت بات ہو گی۔

تو کیا آپ نے کل اِس کی معلومات نہیں لی؟

لی تھی مگر اُن کی بیگم صاحبہ نے مجھے زیادہ نہیں بتایا۔ اصل میں یہ شخص ایک ایسی خاتون کا سابقہ خاوند ہے جس کا بیٹا قتل ہو گیا ہے۔ اگر آپ کے پاس وقت ہو تو مَیں آپ کو سب کہانی سنا دوں، مَیں نے قنبر شاہ صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

جی سنایئے ہمارے پاس وقت بہت ہے بس ذرا شام سے پہلے کہانی ختم ہو جائے، وہ ہنس کر بولے۔

اُن کے مسکرانے کے ساتھ مَیں بھی مسکرا دیا پھر اُنھیں وہ تمام بات بتا دی جو عدلیہ سے شروع ہو کر اُس کی بیٹی کی امانت تک تھی۔ مَیں نے بات پوری کرنے میں مشکل سے دس منٹ لیے ہوں گے لیکن ایسے کہ سید قنبر علی شاہ کو ہر بات کی سمجھ آ گئی۔ تب وہ بولے، دیکھیے بھیا، ہم ابھی آپ کی زینت کی معلومات لیتے ہیں۔ یہاں کمشنر صاحب کے ساتھ ہمارے کچھ روابط ہیں۔ اُن سے کہہ کے آپ کو اِس آدمی کا کھوج بھی لگاتے ہیں۔ خاتون جس کا نام زینت ہے، مل گئی تو آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔

قنبر شاہ صاحب کی بات سُن کر میں شاد باغ ہو گیا جیسے تمام صورت حال ایک دم سدھر گئی ہو۔ وہ کمرے سے باہر نکل گئے، اِدھر مَیں زینت کو شام تک اپنے سامنے بیٹھا دیکھنے لگا تھا۔ اِس خیال میں نہ جانے کیا اول فول نقش بنتے رہے۔ ایک بار تو یہ بھی جی میں آیا مَیں اُس سے شادی کرنے لگا ہوں اور یہی قنبر علی شاہ صاحب ہمارا نکاح پڑھوائیں گے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے اِنسان ایک لفظ کی امید سے پوری کتاب کی تیاری باندھ لیتا ہے، یہی حالت اِس وقت میری تھی۔

کچھ دیر بعد شاہ صاحب دوبارہ کمرے میں داخل ہوئے اور بولے، ہم نے اپنے ملازم کو پیغام دے کر بھیج دیا ہے۔ شام تک سب اطلاع مل جائے گی۔ آپ نے اِتنی دیر میں کراچی دیکھنا ہے تو یہاں سے تانگہ لیجیے اور گھوم آیئے۔ ہاں آج مغربین کے بعد کھارادر میں شاعرِ انقلاب مرثیہ پڑھیں گے، سننے کی چاہت ہو تو مغرب سے پہلے گھر لوٹ آیئے گا۔

جی حضور، ایک اور بات کہنا تھی، مَیں نے حوصلہ پا کر کہا۔

جی کہیے؟ وہ متوجہ ہوئے۔

یہ شہر مجھے ایسے لگتا ہے، میری معاش کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ مَیں نے گریجوایشن کی ہے۔ اگر کہیں سے جاب کی سبیل ہو جائے تو اور بھی عمدہ بات ہو گی۔

میرا یہ جملہ سُن کر سید قنبر علی شاہ واپس ہوئے اور صوفے پر بیٹھ گئے اور بولے، میاں ضامن

بھیا، ایک بات سُن لیں، کراچی میں بہت کچھ اچھا بھی ہے اور بہت اچھا نہیں ہے۔ آپ کو یہاں آئے ایک دن ہوا ہے اِس لیے نہیں سمجھ پائے۔ ایسا کرو آج تمام دن یہاں چل پھر دیکھو، شام کو جب آؤ تو مجھ سے بات کرنا۔ یہاں پرندے ہیں مگر سمجھ لیجیے کانچ کے ہیں، لوگ ہیں مگر کانچ کے ہیں۔ ہوائیں کانچ کی ہیں کہ ہر شے ٹوٹتی جاتی ہے۔ یہ جادو پچھلے پانچ برس سے شروع ہوا ہے۔ کشادہ چیزیں سکڑ رہی ہیں اور گھٹن پھیل رہی ہے۔ مَیں تو اُس دن سے پناہ کی جستجو میں ہوں جب ہوائیں دھواں اُگلیں گی اور سبزہ گاہوں میں خاشاک اُگے گی۔ رہی کام کی بات؟ آپ کو کام تو خیر ضرور مل جائے گا مگر فطرت سے تعلق ٹوٹ جائے گا۔ مَیں آپ کی طبیعت کو ایک لمحے میں پا گیا مگر آپ کراچی کو ایک سال میں نہ پا سکو گے۔ رہنا لازم ہی ہوا تو یہاں کچھ دن ٹھکانا ہم تمھیں ڈھونڈ دیں گے مگر ملازمت خود ڈھونڈو گے۔ کمشنر صاحب ہمارے دوست ہوتے ہیں لیکن ہم اُنھیں وہ کام نہیں کہتے جن میں اپنی ذات کی نفی منظور ہو۔ سیدھی بات کہوں تو شہر چند برسوں میں وہ نہیں رہے گا جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ بہت کچھ بدل رہا ہے۔ آگے آپ کی مرضی ہے۔ اب آ جایئے شہر دیکھ آیئے۔ مَیں شام تک گھر ہی ہوں۔ ڈیڑھ بجے آئیں گے تو کھانا تیار ہوگا۔

یہ کہہ کر وہ چُپ ہو گئے، مَیں نے اتنے میں جوتے پہن لیے اور اُٹھ کر باہر نکلنے لگا۔ مَیں شاہ صاحب کی تمام بات سمجھ چکا تھا، وہ میری ملازمت کے سلسلے میں کچھ مدد کرنے سے انکار کر چکے تھے۔ دوسرے لفظوں میں کہہ رہے تھے واپس پنجاب چلا جاؤں۔ خواہ مخواہ بات کہہ کر وزن کم کیا تھا۔ اِتنے میں اُنھوں نے ڈیوڑھی سے باہر تک چھوڑا۔ دیکھا تو باہر ایک تانگہ کھڑا تھا۔ مَیں حیران کہ تانگہ یہاں کیا کر رہا ہے اور کیسے آیا ہے؟ مَیں نے مُڑ کر شاہ صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ ہنسے اور بولے یہ وکٹوریہ والا ہے، آپ کو جہاں جانا ہے، لے جائے گا۔ ہمارے مہمان ہیں۔ مَیں شکریہ ادا کر کے تانگے پر بیٹھ گیا اور کہا، میاں ذرا پہلے اردو بازار لے چلو۔ اُس کے بعد جو دیکھنے لائق جگہیں ہیں وہ دکھا دو اور شام سے پہلے واپس لے آیئے گا۔

وکٹوریہ والے کی مونچھیں لہوری گجروں کی طرح تھیں مگر زبان دکنی طرز کی تھی۔ اُس نے ایک چھانٹا گھوڑے پر لہرایا اور بولا چل میرے دُمدار۔ پہلے جرا صدر سے ہو کے اردو بجار جا نکلو۔ گھوڑا چلنے لگا۔ مَیں آگے بیٹھا ہوا تھا۔ ہجوم تو ضرور تھا مگر جس قدر کھُلا یہ شہر تھا، ہجوم اُس کے سامنے اُونٹ کے منہ میں زیرہ تھا۔ تانگہ بھاگے چلا جاتا تھا اور مَیں وکٹوریہ والے سے باتیں کیے جاتا

تھا۔ میاں اب کرانچی کیا رہ گیا۔ کرانچی ہووے تھا گورا ٹائم میں جا پھر ایوب ٹائم میں اور اُس سے پہلے پہلے۔ اب تو کرانچی گھسیاروں کی منڈی بن گیا۔

مجھے تو اب بھی یہ شہر بہت خوب لگا ہے۔ دیکھیے نا ہوائیں کتنی اچھی چل رہی ہیں اور پرندے اُڑ رہے ہیں۔ کاروبار بھی کھلا ہے۔ آپ لوگوں کو سواری بھی ملتی ہے۔

ہاں بوا، یہ باتاں تو ہووے یہاں۔ پر مَیں کھووں ہوں، جب سے بنجابی لوگاں یہاں کا اُتر گیا ہے، شہر میں گند بھرا جاوے۔ روج روج گند بھرا جاوے۔ اللہ مافاں کرے۔ یاں ایک اور قوماں یا جوج ماجوج کی بھاونت برس ریا ہیں۔ یہ پٹھان لوگاں ہے۔ بجار پہ قبجہ، منڈی پہ قبجہ، آڑھتاں پہ قبجہ۔ مچھلیاں سمندراں پہ قبجہ۔ ہم تو اِنہاں قبجہ قوم کھویں ہیں۔

بھیا وہ مفت تھوڑی یہاں بیٹھے ہیں، کام کرتے ہیں؟ مَیں نے وکٹوریہ والے کی باتوں میں مزا لیتے ہوئے کہا۔

ہاں دیکھ لیو، کام کرتے کرتے ایک دناں میں پورے سہر کو باندھ لیویں گے۔ یہ کھلی سڑکاں دیکھتے ہو؟ پہلاں اِس ساں بھی کھلی تھیں۔ اب تو کبھی کبھی میرا وکٹوریہ پھنس جاوے۔ ابھی یہاں اردو بجار جاویں گے، دیکھ لیو دکاناں کے باہر دکاناں ہوویں گی۔ وکٹوریہ اندر نہ جا پاوے گا۔ پہلے اِس سرے سے گھوماں اُس سرے سے نکلاں۔

بات اُس کی ٹھیک تھی، کہیں کہیں شہر میں تجاوزات نظر آ رہی تھیں اور یہ بات خطرے سے خالی نہیں تھی کہ آنے والے دِنوں میں اِسی طرح رجحان رہا تو شہر واقعی برباد ہونے جا رہا تھا۔ اب ہم صدر بازار سے گزر رہے تھے۔ یہاں بھانت بھانت کی ریڑھیوں نے سڑک کو کھانا شروع کر دیا تھا۔ سورج تیز چڑھ آیا تھا اور اب موسم رات کی نسبت کافی تلخ اور تیز ہو گیا تھا۔ دھوپ کی چبھن خاص زیادہ تھی۔ وکٹوریہ کے اوپر کپڑے کی چھتری تنی تھی ورنہ اس دھوپ میں واقعی ننگے سر نا گواری کا احساس ہوتا۔ البتہ ہوا رات کی طرح نہ سہی مگر تھی ابھی بھی بہت رُوح پرور۔ گھٹن نہیں تھی۔ کراچی میں مجھے بس اردو بازار اور سمندر دیکھنے کی ہوس تھی۔ اردو بازار اِس لیے کہ مَیں جتنے ڈائجسٹ اور ناول پڑھتا آ رہا تھا یا جو کچھ کا مریڈوں کا لٹریچر پڑھا تھا اور مذہبی کتابیں پڑھی تھیں، اُن پر جو پبلشنگ اور پریس کا پتا درج ہوتا تھا وہ اکثر اُردو بازار کراچی کا ہوتا تھا۔ میرے لیے یہ جگہ ایک اساطیری حیثیت رکھتی تھی۔ سمندر دیکھنے کی تمنا اِس لیے تھی کہ ایک تو یہ لفظ مٹی اور زمین سے سراسر الگ تصور پیش کرتا تھا۔ ایک ہیبت، ڈر اور ہولناکی کا

ایسا تصور جس میں ڈوب جانا اور فنا ہو جانا ہی کشش تھی۔ مَیں نے سمندر کے بارے میں صرف سُن رکھا تھا۔ کہانیوں میں، کتھاؤں میں اور ناولوں میں۔ اِس لیے اُسے دیکھنے کی شدید خواہش پیدا ہوئی تھی۔ اِس لیے بھی دیکھنے کی تمنا تھی کہ کس کو خبر ہے میر سمندر کے پار کی۔

لو بوا، یہ آ گیا اردو بجار۔ ایک جگہ اُس نے تانگہ کھڑا کر کے کہا۔ مَیں تانگے سے نیچے اُتر آیا اور سامنے ایک چوک میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ اِدھر اُدھر کتابوں کی دکانیں نظر آ رہی تھیں مگر میں کس دکان میں جاتا؟ بس اِدھر اُدھر پھر کر اور گھوم کر اُسے دیکھنے کی تمنا تھی۔ یہاں چوک میں ایک طرف ایک کتابوں کی بڑی دکان تھی۔ اِس کے سامنے ایک برگد کا بڑا سا پیڑ تھا۔ اِس کی لمبی جڑیں اِدھر اُدھر پھیلی ہوئی تھیں۔ اُن جڑوں کے درمیان ایک چائے کا کھوکھا تھا۔ یہ کھوکھا موٹے لکڑی کے تختوں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ کھوکھے کے آگے لکڑی ہی کی بنچیں پڑی تھیں۔ دن کے گیارہ بج چکے تھے۔ مَیں تھوڑی دیر اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ ایک کتاب پسند آئی، اُس کی قیمت آٹھ روپے تھی۔ وہ کتاب اُٹھا لی اور واپس کھوکھے پر آ بیٹھا۔ وہیں میرا وکٹوریہ والا بیٹھا تھا۔ مَیں نے کھوکھے والے کو دو چائے کے آرڈر دیے۔ چائے ویسے تو اچھی تھی مگر دودھ اِس میں بہت کم تھا۔ مجھے اِس برگد کے درخت کے نیچے لکڑی کے بینچوں پر بیٹھ کر چائے پینا اتنا اچھا لگا جی چاہا یہیں بیٹھا رہوں اور چائے پیتا رہوں۔ برگد کی شاخیں اور پتے نیچے تک پھیلے ہوئے تھے۔ اُردو بازار کی یہ مارکیٹ کافی کھلی تھی۔ اِس میں جا بجا نیم کے درخت بھی نظر آتے تھے۔ یہ چوک تو بہت ہی مسحور کر دینے والا تھا۔ بات سچ تھی کہ اِس شہر کا مزاج ہمارے پنجاب کے شہروں سے بہت مختلف تھا مگر مَیں نے سوچ لیا تھا کہ اگر زینت کی خبر آج شام یہاں سے مل جائے اور وہ یہیں ہو تو میرا اِس شہر میں رہنا ٹھہر گیا ہے۔ ایک کپ میں نے وکٹوریہ والے کو پلایا اور ایک خود پیا۔ اُس کے بعد دو چائے کے کپ اور پیے اور ایک گھنٹا وہاں بیٹھا رہنے کے بعد اُٹھ پڑا۔ اب مَیں وکٹوریہ والے کا قریباً دوست بن چکا تھا۔ اُس نے اپنی رام کہانیوں کے ساتھ جو کچھ شام پانچ بجے تک مجھے دکھایا اُس میں کے پی ٹی برج، کلفٹن کے علاقے، ایمپیریس مارکیٹ کی کھلی سڑکیں، کراچی جم خانہ، لیاری، وکٹوریہ روڈ، کلرک سٹریٹ، ایم اے جناح روڈ اور سمندر کا ساحل شامل تھا۔ مَیں اتنے بڑے شہر سے جیسے جیسے گزرتا جا رہا تھا، ایسے لگتا تھا جیسے پورب سے پچھم کے زمانے دیکھ رہا ہوں۔ یہ ایک شہر نہیں کئی جہانوں کی دنیا تھی کہ ایک جگہ سمٹ گئی تھی۔ سمندر کی لہریں اور اُن سے اُٹھتی ہوئی جھاگ میرے دل میں ایک طوفان برپا کرنے والی کیفیت سے دوچار کر رہی تھی۔ شام ساڑھے پانچ بجے ہم واپس قنبر

علی شاہ صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ مجھے نہیں معلوم شاہ صاحب نے اُسے کتنے پیسے میں لیا تھا۔ البتہ میں نے پیسے دینے کی کوشش کی تو اُس نے نہیں لیے۔ بولا شاہ صاحب سے ہمارا حساب یاں ہے۔ گویا آج میں نے کراچی دیکھ لیا تھا اور اُن سے کہیں زیادہ تجربہ کار ہو چکا تھا جو ہمارے شہر کے ایک کھوکھے میں بیٹھ کر دنیا کے تاریک اور روشن شہروں کی کہانیاں سناتے نہیں تھکتے تھے۔

مَیں نے سید صاحب کا دروازہ کھٹکھٹایا تو اُن کا ملازم فوراً باہر نکلا اور مجھے ڈیوڑھی میں سے گزار کر اندر لے گیا۔ کمرے میں پہنچا تو دیکھ کر حیران ہوا کہ وہاں ایک اور شخص سید قنبر علی شاہ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی شاہ صاحب بولے، لیجیے صاحب یہ ضامن صاحب آ گئے ہیں۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوئے، ضامن بھیا یہ آپ کے زبیر صاحب ہیں۔ ہمارے دوست نے اِنھیں ڈھونڈ کر یہاں بھیج دیا ہے۔

زبیر خاں ایک وجیہہ شکل وصورت کے مگر عام آدمی معلوم ہوتے تھے۔ اُن کی عمر خاصی پختہ تھی۔ رنگ کھلا سفید اور بالوں کو خضاب کیا ہوا تھا۔ چوڑے پائنچوں کے پائجامے کے اُوپر بازوؤں والی گہرے رنگ شرٹ تھی۔ مونچھیں باریک اور چھوٹی تھیں۔ میری طرف دیکھ کر بولے، ضامن صاحب السلامُ علیکم۔

مَیں نے اُن کی طرف ہاتھ بڑھا کر سلام لیا اور صوفے کے سامنے پڑی اُس چوکی پر بیٹھ گیا جس پر قالین پڑا تھا۔ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ زبیر خان دوبارہ بولے، آپ کل گھر گئے تھے۔ بیگم نے بتایا تھا۔ مَیں گھر پر نہیں تھا مگر آپ کا سُن کر بہت رنجیدہ ہوا کہ آپ سے ملاقات نہیں ہو پائی۔

زبیر خان جب بات کر رہا تھا مَیں نے اُس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اُس پر پچھتاوے کی پرتیں تہہ در تہہ چڑھی تھیں۔ اِسی اثنا میں سید قنبر علی شاہ اُٹھ کر باہر چلے گئے۔ یہ اچھی بات تھی۔ مجھے نہیں معلوم زبیر خان میرے سامنے کس حیثیت سے بیٹھا تھا؟ بنیادی طور پر میرا اُس کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ وہ مجھے کسی بات کا جواب دہ نہیں تھا۔ نہ اُسے ایسا مجرم کہا جا سکتا تھا جس میں معاشرتی طور پر عوام الناس کے حقوق پر حرف آیا ہو۔ پھر بھی مَیں دیکھ رہا تھا، وہ قدرے گھبرایا ہوا اور جلدی میں لگتا تھا۔ بعض اوقات ایسا انسان جسے جرم کرنے کی عادت نہ ہو وہ اخلاقی طور پر اپنے کسی ناپسندیدہ فعل کو جرم سمجھ کر بچوں تک سے ڈرنا شروع کر دیتا ہے۔ مَیں اِس وقت فقط اتنا چاہتا تھا، اُس سے زینت کا پتا چل جائے مگر وہ جنید اور ڈاکٹر فرح کے قتل کے ذمہ دار کی حیثیت سے میرے سامنے بیٹھا تھا اور مَیں اُس کو ایک طرح سے ڈرا

دینے والی طاقت کی طرح دیکھ رہا تھا۔ یہ بھی ایسا عجوبہ تھا جو دنیا میں اکثر ہوتے ہیں۔ ایک بے ضرر مگر نامعقول انسان ذرا سی اخلاقی طاقت ملنے پر اوقات سے باہر ہو جاتا ہے۔ اِس وقت قنبر علی شاہ کے پاس میرا ٹھکانا نہ ہوتا اور اُس کے کمشنر سے تعلقات نہ ہوتے تو میری حیثیت ڈاکٹر زبیر خان کے سامنے ایک مسافر چیونٹی کی طرح ہوتی۔

زبیر خان نے ایک لمحہ خاموشی اختیار کی اور کہا، ضامن صاحب مَیں نے آپ کا نام سُنا ہے، آپ کے بارے میں جنید نے مجھے اچھی طرح بتایا تھا لیکن اِس خبر کو ایک مدت گزر چکی ہے۔ آپ حق رکھتے ہیں، مَیں آپ کو بتاؤں اصل معاملہ کیا تھا؟ دراصل مجھ سے زیادہ جنید اور اُس کی والدہ کے قتل میں خود جنید اور میری موجودہ بیوی زیادہ قصور وار ہیں۔ بعض اوقات انسان اپنے اردگرد تعمیر کی ہوئی دیواروں کو اُن سے لگاؤ کے سبب نہیں توڑ سکتا اگرچہ اُن کے درمیان اُس کا دم ہی کیوں نہ گھٹ رہا ہو۔ جنید ہر صورت وہ زمین حاصل کرنا چاہتا تھا جو واقعی اُس کا حق تھا اور ایسا نہیں تھا کہ مَیں نے اُسے اُس زمین کی خبر دی تھی، یہ اُسے پہلے سے پتا تھا۔ اُسے اپنے خاندان اور اپنے حالات کے بتانے کی غلطی خود ڈاکٹر فرح نے کی تھی۔ اُس وقت جب وہ ابھی پانچویں درجے کے سکول میں جاتا تھا۔

مگر جب وہ زینت کو لے کر آپ کے پاس چلا آیا تھا تو آپ اُسے روک سکتے تھے کہ وہ ٹبہ ولی بخش نہ جائے۔ مَیں نے ڈاکٹر زبیر خان کے عذر کو کچلنے کی کوشش کی۔

جی ہاں روک سکتا تھا اگر میری بیوی اور خود جنید پر زمین کی ہوس سوار نہ ہوتی۔ مَیں جنید کو اکیلا بھی چھوڑ دیتا تو وہ تنہا ٹبہ ولی بخش کا رُخ اختیار کرتا۔ گرم خون نوجوان کے سر میں شور کرتا ہے تو خدا اور باپ دونوں لایعنی ہو جاتے ہیں۔ اُسے مَیں نے فرح سے دور نہیں کیا تھا، وہ اُس وقت تک اُس سے نہیں ملنا چاہتا تھا جب تک زمین کی ملکیت حاصل نہیں کر لیتا۔ یہ اُس کی ضد تھی۔ اُدھر اِس تمام قضیے کا ذمہ دار ڈاکٹر فرح صرف مجھے سمجھے بیٹھی تھی۔

زبیر صاحب کیا آپ جانتے ہیں آپ نے ڈاکٹر فرح کا غم بانٹنے میں ایک قدم کی حرکت نہیں کی۔ آپ کے تمام عذر ٹھیک ہوں گے مگر اِسے کہاں لے جائیں کہ صرف آپ اور آپ کے موجودہ خاندان کی وجہ سے فرح کا نشان تک مٹ گیا ہے۔

کیا جنید میرا نشان نہیں تھا؟ اِتنا جملہ کہتے ہوئے ڈاکٹر زبیر خان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

مَیں آپ کی اِس بات کو مان لیتا اگر آپ نے اُس کے قتل کے بعد ڈاکٹر فرح کو قتل نہ ہونے دیا ہوتا اور خود جنید کے قاتل کو عدالت میں یا خود انجام تک لے کر جاتے۔ مَیں جانتا تھا، زبیر خان مجھے قائل کرنے کا پابند نہیں تھا مگر مَیں فرح کے معاملے میں اُسے معاف کرنے کے لیے تو بہرحال تیار نہ تھا۔

ڈاکٹر زبیر نے ایک تیکھی نظر سے میری طرف دیکھا اور بولا، ضامن بیٹے آپ مجھ سے بہت چھوٹے ہو۔ اِتنے چھوٹے کہ اشیا کو اُن کی گہرائی میں سمجھنے سے قاصر ہو۔ جنید کے قتل کے وقت دو گولیاں میرے بھی لگی تھیں۔ آپ میرے دوسرے بیٹے اور بیوی سے مل چکے ہو۔ وہ کتنے سہمے اور ڈرے ہوئے ہیں۔ مَیں نے طلال احمد پر جنید کے قتل کی ایف آئی آر تو کروا دی تھی مگر میرے قتل کی ایف آئی آر شاید آپ بھی نہ کرواتے۔ مَیں اِس معاملے میں بہت بزدل تھا اور طلال کے کمزور ہونے کے وقت کا انتظار کر رہا تھا۔

آپ مجھے صرف زینت کے بارے میں خبر دے سکتے ہیں۔ یہ آپ کی کرم فرمائی ہوگی۔ مَیں نے ایک دم بات کا رُخ بدل کر زینت کے متعلق سوال کیا جس کی اُسے توقع اچانک نہیں تھی۔

مَیں اِس معاملے میں ابھی خود اتنا بے خبر ہوں جتنے آپ ہیں۔ مجھے دو سال ہو چکے ہیں اُسے تلاش کرتے ہوئے۔ کیا آپ نہیں سمجھتے جنید کے بچے میرا اپنا خون ہیں۔ اُن کی زندگی کی طلب مجھے آپ سے زیادہ عزیز ہے۔ فرح اُنھیں یہاں سے ایسے وقت میں لے کر گئی جب مَیں ہسپتال میں زندگی اور موت کے درمیان تھا۔ تب سے اب تک مجھے اُن کی خبر نہیں ملی۔ مجھے یقین کی حد تک احساس ہے کہ وہ کم از کم کراچی میں نہیں ہیں ورنہ شہر مانوس چہروں کو زیادہ دیر پوشیدہ نہیں رکھتے۔

ڈاکٹر زبیر کے اِس جواب پر میری تمام گفتگو اُس بے کار وقت کی طرح ہو گئی تھی جسے بے دماغی میں گزار دیا گیا ہو۔ اُسی وقت یہ احساس بھی پوری شدت کے ساتھ مجھ پر غالب آ گیا کہ مجھے اِسی رات واپس نکل جانا چاہیے، حتیٰ کہ کھارادر کی مجلس بھی نہ سُنوں۔ زینت کے متعلق میرے جسم میں آئی ہوئی اتنی توانائی ایک دم ہوا ہو گئی تھی۔ مَیں وہ سُست رفتار کچھوا بن کر رہ گیا جسے اپنی سمت بھول گئی تھی۔ اِتنے میں چائے اور کچھ دوسرے لوازمات آ گئے جن میں قلاقند اور حلوے تھے۔ سید قنبر علی شاہ بھی تشریف لے آئے۔ اب کے ڈاکٹر زبیر نے بتانا شروع کیا کہ کل وہ اصل میں ایک کام کے سلسلے میں حیدر آباد گئے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر میں ڈاکٹر زبیر نے رُخصت چاہی اور مَیں نے اُس سے سلام لیا اور کمرے ہی میں بیٹھا رہا۔ مَیں اصل میں اب جلدی اُس سے جدا ہونا چاہتا تھا اور ہرگز دیر تک اُس کا سامنا نہیں

کرسکتا تھا۔ حتیٰ کہ دروازے کے باہر تک چھوڑنے کا بھی۔ سید قنبر علی شاہ نے اُسے باہر جا کر رُخصت کیا اور مروت میں آکر مجھ سے اتنی بے اعتنائی کی شکایت بھی نہیں کی۔ وہ سمجھ چکے تھے مَیں اِس شخص سے اُس کے عُذر قبول کر لینے کے بعد بھی دوستانہ رویہ اختیار نہیں کرسکتا تھا۔ رخصت ہوتے وقت ڈاکٹر زبیر یہ بات محسوس کیے بنا نہیں رہا تھا۔

ڈاکٹر زبیر کے رخصت ہونے کے بعد شاہ صاحب میرے سامنے صوفے پر بیٹھ گئے اور مجھ سے کرانچی کی سیر کے بارے میں پوچھنے لگے۔ مَیں نے بتایا سیر تو بہت اچھی رہی اور کراچی بھی ایک اساطیری شہر ہے مگر اب میرا کرانچی رہنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ کل رخصت ہونا چاہوں گا بلکہ آج ہی رخصت ہو جاتا مگر آج علامہ صاحب کا خطبہ اور مرثیہ سننے کے لیے ایک رات مزید ٹھہرنا چاہوں گا۔

بسر و چشم، سید قنبر علی شاہ نے میری طرف مسکراتے ہوئے کہا، مولا نا کی مجلس اور حضرت کا مرثیہ ضرور سنیے گا۔ اِس میں شفا ہے مولا کی طرف سے۔ آپ کرانچی آئے ہیں تو اِس نعمت سے محروم نہ رہیے گا۔

جی شاہ صاحب مَیں تو کرانچی ہی سے محروم نہیں رہنا چاہتا تھا مگر زینت کی اُمید باقی نہیں رہی اس لیے طبیعت اچانک منغض ہوگئی۔ مَیں نے تاسف اور خجالت کے ملے جلے احساس سے جواب دیا۔

بھیا کراچی بدل رہا ہے، تم جلد دیکھو گے یہ شہر یاجوج ماجوج سے بھر جائے گا۔ ایسی ایسی مخلوق آنے والی ہے کہ ہم لوگ پتھر کے ہو جائیں گے۔ جیسے جیسے مولا دشمن لوگ چلے آتے ہیں اور لا لا کر بسائے جاتے ہیں، ایک دن اِن ہواؤں میں آگ برسے گی۔

وہ کیسے؟ مَیں نے پوچھا، مجھے تو سب کچھ بہت خوب نظر آتا ہے۔

آپ کو آئے دن ہی کے ہوئے بھیا؟ ہم سے پوچھو جو پچھلے پینتیس سال سے یہیں پھرتے ہیں۔ جب بستی کا نگہبان ہی بستی کو دشمن سمجھے تو میاں کس سے گلہ؟ ایسے خبیث گروہ در گروہ بسائے جاتا ہے کہ ہر ایک کی بغل میں سامانِ سفر نہیں، بارود کی گٹھڑی دبی آتی ہے۔ کچھ لوگوں کی دشمنی میں پوری بستی کو جلانے کی ٹھان رکھی ہے۔

خیر خدا رحم کرے آپ پر بھی، آپ کے شہر پر بھی، مجلس کتنے بجے ہوگی؟ مَیں نے بات بدل دینا مناسب سمجھا۔

ساڑھے سات بجے حضرت صاحب بیٹھیں گے اور ٹھیک آٹھ بجے علامہ صاحب۔ ہم یہاں

سے پونے سات کے عمل پر نکلیں گے۔ اچھا ایک گھنٹا ہے تب تک آرام کیجیے۔ ہم ذرا والدہ محترمہ کی خبر لے آئیں۔ یہ کہہ کر اور آداب کر کے سید قنبر علی شاہ کمرے سے نکل گئے۔ مَیں کمرے میں پڑی کتابوں کا نئے سرے سے جائزہ لینے لگا۔ یہاں ایک سے بڑھ کر ایک کتاب پڑی تھی۔ ان میں اکثر میرے لیے بالکل نئی تھیں۔ ایک کتاب "التعلیقات الصلواۃ و الفلکث النجات" کو مَیں نے اُٹھا لیا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ اِس کتاب کا مَیں نے بہت سنا تھا مگر اِس کا نسخہ کہیں سے ہاتھ نہیں آیا تھا۔ اسے پڑھتے ہوئے مجھے ایک گھنٹا نکل گیا اور خبر تک نہ ہوئی۔ اُس وقت پتا چلا جب سید قنبر علی شاہ دوبارہ کمرے میں وارد ہوئے، مجھے دیکھ کر السلامُ علیکم کہا اور بولے ارے بھیا، جلدی کیجیے، وقت تنگ ہے۔

مَیں نے کتاب الماری میں رکھتے ہوئے کہا، شاہ صاحب آپ کے دولت خانے میں تو دولت کے انبار لگے ہیں۔ یہ کتاب مدتوں ڈھونڈی مگر آج آپ کے ہاں پائی۔

بھیا یہ ہمارے ابا میاں کی لائبریری کا تحفہ ہے۔ لکھنؤ سے آیا ہے۔ آپ فکر مند نہ ہوئیے، ہم آپ کو اِس کی ایک نقل بھجوا دیں گے۔ اتنے میں مَیں نے جوتے پہنے اور چلنے کے لیے تیار ہو کر اُن کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ باہر وہی وکٹوریہ والا کھڑا تھا۔ اُس نے ہمیں کچھ ہی لمحوں میں کھارادر کی امام بارگاہ میں اُتار دیا۔ یہ بہت بڑی امام بارگاہ تھی۔ لوگ جوق در جوق چلے آتے تھے۔ اِس ماحول کو دیکھ کر ایسا لگا، لکھنؤ یہیں چلا آیا ہے۔ کچھ شیروانیاں پہنے تھے، کچھ کُرتوں میں تھے، کچھ سوٹ میں تھے۔ ایک ہجوم تھا کہ سیلاب کی صورت میں امام بارگاہ میں اُمڈا آتا تھا۔ مَیں نے پنجاب میں لاکھ مجلسیں سنی تھیں مگر یہ شان ہی نرالی تھی۔ سید قنبر علی شاہ ہر ایک سے سلام لے کر آگے بڑھے جاتے تھے۔ اُنھوں نے امام بارگاہ میں داخل ہوتے ہی علم کو چھوا، چراغِ مراد جلایا چند لمحے مناجات کیں۔ مَیں اُن کی پیروی میں وہی کچھ کرتا جاتا تھا۔ اُس کے بعد وہ امام بارگاہ کے دالان میں داخل ہو گئے اور عین منبر کے سامنے جا کر بیٹھ گئے۔ ہم اتنا قریب تھے کہ مشکل سے پانچ گز کا فاصلہ ہوگا۔ مَیں اُن کے پہلو سے چمٹا ہوا تھا۔

مجلس شروع ہو چکی تھی۔ پہلے تین سوزیوں نے سلام پڑھا۔ اُس کے بعد حضرت مرثیہ گو شاعر نعرہ حیدری کے سائے میں منبر پر آن کر بیٹھ گئے۔ اول اُنھوں نے تین رباعیاں پڑھیں۔ اُس کے بعد مرثیہ کے بند شروع کیے۔ پہلے آواز کچھ آہستہ تھی لیکن آہستہ آہستہ زور بڑھتا گیا۔ تب ایسا جوش پڑا کہ الامان۔ امام باڑے کی چھتیں اُڑی جاتی تھیں۔ ہر ایک اِس طرح کلام کی لَے میں ڈوب گیا تھا کہ دنیا و مافیہ کی خبر نہیں تھی۔ الفاظ کی نشست و برخواست، لحن کا زور، معنی کی بلندی اور پے بہ پے برستے رجز کے

نغمے دل کی وادیوں میں آگ لگا رہے تھے۔ مَیں اِس قدر محویت میں چلا گیا کہ کچھ نہ پوچھیے۔ مولا حسین کی مجلس اور اُس میں ڈوبے ہوئے لوگوں کی سرشاری ہرگز وہ شخص محسوس نہیں کر سکتا جو ایسی محفلوں سے نہ گزرا ہو۔ یہ مرثیہ گھنٹا بھر جاری رہا۔ آخر بین اور سلام اور دعا کے بعد حضرت منبر سے نیچے اُتر آئے۔ لوگ چیخیں مار کر رو رہے تھے۔ کچھ روتے جاتے تھے اور شاعر کے ہاتھ چومتے جاتے تھے۔ مَیں خود بھی ہاتھ چومنے کی کوشش میں تھا مگر ہجوم اتنا تھا کہ آگے نہ ہو سکا۔ مُڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔ اِس کے بعد جنھیں سننا تھا آنے والے زمانوں میں لوگوں کو بس اُن کے دیکھنے کی حسرت رہ جائے گی۔ لیجیے کچھ ہی لمحوں یہ ہنگام فرو ہوا اور منبر پر علامہ صاحب آ گئے۔ علامہ صاحب نے جیسے مجلس پڑھی اُس کے بیان کی طاقت مجھ میں نہیں۔ بس اتنا کہے دیتا ہوں نہ پہلے کبھی ایسی مجلس سنی نہ آئندہ سُن سکوں گا۔ مَیں نے خود بھی رو رو کر زینت کے مل جانے کی دعائیں کیں اور مجھے اُس وقت یقین بھی ہوا دعائیں اکارت نہیں جائیں گی مگر ایسا یقین صرف دلاسے کے لیے بہترین اثاثہ ہوتا ہے۔

رات ساڑھے دس بجے ہم واپس شاہ صاحب کی حویلی میں آ گئے لیکن اِس خیال کے ساتھ کہ بعض مواقع انسان کو زندگی میں ایک بار ہی میسر آتے ہیں وہ بھی بغیر کسی ارادہ و کوشش کے۔ کتنی عجیب بات ہے مَیں کیا لینے آیا تھا اور کیا لے کر جا رہا تھا۔ اِس مرثیہ اور مجلس کے خطاب نے عجیب طرح سے میری کایا کلپ کی تھی مگر مجھے اُس کا قطعی شعور نہیں تھا۔ مَیں تسلیم کرتا ہوں، لفظ صاحبِ لفظ سے کہیں پارسا اور طاقتور ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے جس شخص کو آپ سُن رہے ہوں وہ کردار میں کہیں فعال نہ ہو مگر ہزاروں کو فعال کر دے۔ یہ بھی ممکن ہے ایک فعال ترین شخص ایک بھی شخص کی زندگی میں ہلچل پیدا نہ کر سکے۔ کل دن ایک بجے مجھے اپنے شہر کی طرف روانہ ہونا تھا۔ میرے پاس سید قنبر علی شاہ کے گھر میں رہنے کے لیے فقط دس گھنٹے باقی تھے۔ اُن دس گھنٹوں کو مَیں مکمل سمجھ لینا چاہتا تھا۔ سید قنبر علی کی زندگی میں، اُس کی کتابوں میں، اُس کی ڈیوڑھی میں، اُس کے ہمسائے میں کھڑے پیپل اور چوک کے مابین کائنات میں۔ کیونکہ اگلے دوپہر بارہ بجے مجھے یہاں سے ہر صورت نکل جانا تھا۔

(۴۲)

صبح کے چار بجے ریل خانیوال پہنچی اور مَیں وہیں اُتر گیا۔ صبح کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ ریلوے اسٹیشن قریب قریب ویران تھا۔ اِکا دُکا سواریاں اِسی ریل پر چڑھ رہی تھیں۔ دو چار کراچی سے آنے والی سواریاں میرے ساتھ اُتر گئیں۔ یہ عمارت برٹش تثلیث اسٹائل کا نمونہ تھی۔ اسٹیشن کے سامنے کئی ایک برگد اور بہت جھنڈ ٹاہلیوں کے درخت تھے۔ اُن پر بیٹھے پرندے صبح کاذب کے نغمے گا رہے تھے۔ ایک دو تانگے والوں کے علاوہ یہاں کوئی ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میری سمجھ نہیں آئی اِس وقت کیا کروں۔ اچانک مجھے احساس ہوا جب تک صبح طلوع نہیں ہوتی نماز پڑھ لی جائے۔ اسٹیشن کے دائیں پہلو ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ اُس کے صحن میں ایک بہت بڑا بیری کا درخت کھڑا تھا۔ بیری پر چڑیوں کے چہچہے اِس قدر تھے کہ تنہائی کا احساس نہیں رہا تھا۔ مَیں مسجد میں داخل ہو گیا۔ مسجد میں ایک امام مسجد یا متولی تھا جو محراب کی دیوار کے ساتھ پشت لگائے اُونگھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا لیکن جب مَیں ایک صف پر کھڑا ہوا اور نماز کی نیت سے ہاتھ باندھ لیے، مولوی صاحب بڑبڑائے، بابو جی ابھی جماعت میں دس منٹ پڑے ہیں۔ مَیں نے اُس کی بات پر توجہ دیے بغیر کہا، شکریہ بابا جی، مَیں جماعت کے ساتھ نماز نہیں پڑھتا۔ اُسے میری بات سمجھ نہیں آئی اور ایک طرف منہ بسور کے بیٹھ گیا۔ جیسے ہی مَیں نے اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ چھوڑے اُس نے میری طرف سے مکمل منہ پھیر لیا اور دوزانو ہو گیا۔ میری نماز ختم ہوئی تو مولوی صاحب کی جماعت شروع ہو گئی۔ پندرہ سولہ لوگ مولوی کے پیچھے نمازی

تھے۔ مَیں زیارت پڑھ کر باہر نکل آیا۔ اب ہر طرف سویرا ہو چکا تھا البتہ سورج طلوع نہیں ہوا تھا اور دس پندرہ منٹ میں ہونے ہی والا تھا۔ اسٹیشن کے احاطے سے باہر نکل کر ایک بازار کی طرف چل دیا۔ یہاں بہت سے سائیکل رکشا چلانے والے کھڑے آوازیں لگا رہے تھے۔ مَیں کبھی سائیکل رکشا پر نہیں بیٹھا، نہ اب بیٹھنے کا ارادہ تھا۔ یہ سواری پاکستان کے جنوبی علاقوں کے علاوہ کہیں نہیں تھی۔ خانیوال اور ملتان میں اِس کا رواج تقسیم کے وقت پڑا تھا۔ ہریانہ، دہلی اور اُس کے مضافات کے رہنے والوں میں اب بھی یہ سواری چلتی ہے اور وہاں سے یہاں ہجرت کرنے والوں نے اِس کی بنیاد ڈالی ہے۔ خانیوال ملتان کے قریب ہے اِسی لیے یہاں بھی رواج پا گئی۔ مجھے بالکل عجیب سا لگا۔ ایک لولے لنگڑے آدمی کی طرح دوسرے کے کاندھوں پر سوار ہو جاؤں جب کہ وہ سوکھا سڑا آدمی خود اُٹھانے کے لائق ہو۔ مجھے اِس سواری میں اپاہج پن سا نظر آیا اور قریب سے گزر گیا۔ چند لمحے بعد ایک کھلا بازار میرے سامنے تھا۔ اِس بازار میں دُور تک کوئی درخت اور سائے کا نشان نہیں تھا۔ فی الحال مجھے سائے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی مگر درختوں کا یہاں ناپید ہونا عجیب نحوست کا سماں معلوم ہو رہا تھا۔ ایک طرف ایک بڑا سا چوک تھا۔ اُس میں ایک خراس چل رہا تھا۔ خراس میں اونٹ گھیرے میں تیز چلے جاتا تھا اور بھاری پتھروں کے پڑ گھوم رہے تھے اور آٹا نکل کر بوری میں گر رہا تھا۔ اِس طرح کے اونٹوں اور بیلوں سے چلنے والے خراس ابھی تک بہت سے گاؤں میں رہ گئے تھے۔ شہروں میں اِن کی جگہ بجلی کی چکیاں لے رہی تھیں۔ خراس اور اُس میں چلنے والے اونٹ کی گھنٹیوں کی آواز نے مجھے اپنی جانب کھینچ لیا۔ مَیں وہیں کچھ دیر کھڑا ہو گیا اور اُنھیں غور سے دیکھنے لگا۔ یہ ایک خوش کُن آواز کا منظر تھا۔ خراس کی ہودی پر ایک چھوٹا لڑکا بیٹھا چھڑی سے اُونٹ کو مہمیز دے رہا تھا۔ لڑکے کی عمر مشکل سے دس سال ہوگی۔ لڑکا ہودی میں بیٹھا وقفے وقفے سے اُونگھ لیتا تھا۔ نیند سے اُس کی آنکھیں بند ہو جاتی تھیں مگر پھر ایک جھٹکے سے اُٹھ جاتا۔ لڑکے کے والد نے اُسے صبح ہی کچی نیند سے اُٹھا دیا تھا کہ اُس کے اونٹ کو ہانکا لگائے۔ اب لڑکا سو بھی رہا تھا اور اُونٹ کو ٹھوکے بھی لگا رہا تھا اور ہودے میں بیٹھا جھولے بھی لے رہا تھا۔ خراس کیکر کے ایک موٹے تنے کے ساتھ لگا ہوا تھا اور یہ تنا سر سے پاؤں تک آٹے اور مٹی کی گرد میں لپٹا تھا۔ جس طرح کے گرد آلود اِس شہر کے بازار تھے اُسی طرح کی ملی جُلی کیفیت اِس میں بھی تھی۔ تھوڑی دیر بعد مَیں وہاں سے آگے چل دیا۔ قریب ہی ایک ریڑھی ناشتے کی لگی تھی۔ مجھے بھوک نے کافی دبا رکھا تھا، سوچا پہلے ناشتا کر لیا جائے۔ مَیں اُسی ریڑھی کے قریب رکھی ایک لکڑی کی چوکی پر بیٹھ

گیا۔ ایک اور آدمی وہاں بیٹھا ناشتا کر رہا تھا۔ سورج اب کھل کر سامنے آ گیا تھا اور تپش کا احساس بڑھنے لگا تھا۔ اُس کے پاس بڑے پائے کا شوربہ اور چاول تھے۔ مَیں نے ایک چاولوں کی پلیٹ لی۔ اُس پر اُس نے شوربے کا ڈونگا بھر کے ڈال دیا۔ شوربہ والے چاول بے حد مزہ دے رہے تھے۔ عموماً اس طرح کے ریڑھی والے جس قدر اچھا ناشتا دیتے ہیں اعلیٰ ہوٹلوں میں بیٹھنے والے اُس کا لطف نہیں لے سکتے۔ ناشتے کے دوران مَیں نے اُس سے پوچھا، چاچا جی یہاں سے پیرووال جانا ہو تو کیسے جائیں گے؟

اُس نے مجھے ایک نظر دیکھا اور بولا، بیٹا یہاں سے تھوڑے فاصلے پر آگے چلیں گے تو غلہ منڈی آئے گی۔ غلہ منڈی کے سامنے ایک دو ڈڈو لاریاں کھڑی ہوں گی۔ یہ پیرووال ہی جاتی ہیں۔

مَیں نے بابے سے زیادہ باتیں کرنا مناسب نہ سمجھا اور چاولوں کا آخری چمچ منہ میں ڈالا۔ وہیں پڑے تانبے کے گلاس سے گھڑے میں پڑا ہوا پانی پیا اور اُس کی بتائی ہوئی سمت کی طرف چل پڑا۔ دس بارہ منٹ چلنے کے بعد مجھے وہ اڈہ نظر آ گیا۔ غلہ منڈی کے سامنے ایک وسیع میدان میں بسیں کھڑی تھیں۔ یہ دو تین لاریاں تھیں۔ البتہ اِن پر ہار سنگھار کافی ہوا تھا۔ مَیں نے سامنے جا کر ایک آدمی سے پیرووال جانے والی بس پوچھی اور اُس پر چڑھ گیا۔ لاری نے ایک گھنٹا انتظار کروایا۔ اُس کے بعد ڈیڑھ گھنٹا مزید چلی۔ راستے میں بہت سے گاؤں میں قیام کرتی ہوئی دس بجے کے قریب پیرووال پہنچ گئی۔ پیرووال نہ تو کوئی شہر تھا، نہ اِسے قصبہ کہا جا سکتا تھا۔ ایک بڑے گاؤں کی طرح ضرور تھا۔ اب سورج کافی زیادہ اُبھر آیا تھا اور گرمی محسوس ہونے لگی تھی۔ مَیں نے یہاں ایک آدمی سے قریب جا کر پوچھا، میاں جی مَیں نے ٹبہ ولی بخش جانا ہے، یہاں سے کیسے جایا جائے؟ اُس آدمی نے ایک دو بار مجھے دیکھا، پھر اپنے حقے سے دوبارہ گھونٹ لیا اور بولا، چھوہرا، ٹبہ ولی بخش یہاں سے کافی دُور ہے۔ کم سے کم بیس میل ہے اور یہ تانگوں والے اڈے سے جا کر پوچھ، وہیں سے کوئی تانگہ جاتا ہو گا، لاری واری تو کوئی نہیں جاتی۔

مَیں اُس کی بتائی ہوئی جگہ پر گیا تو بارہ تیرہ تانگے کھڑے تھے، کچھ پر سواریاں بیٹھی تھیں۔ ایک تانگہ مجھے ٹبہ ولی بخش جانے والا بھی مل گیا مگر اُس پر کوئی سواری نہیں تھی۔ یہ ایک بوڑھی عمر کا کوچوان تھا۔ اِس نے گھوڑے کو اچھے طریقے سے پال رکھا تھا۔ سر پر کھدر کا ایک صافہ تھا۔ رنگ سیاہ تھا اور داڑھی کے بال ایسے سفید تھے جیسے ٹھوڑی کے نیچے روئی لٹکی ہوئی ہو۔

مَیں نے کہا، بابا جی ٹبہ ولی بخش جانا ہے، کب تک نکلو گے؟

بولا، پتر جب چاہو گے نکل چلیں گے؟

آپ کی سواریاں کب پوری ہوں گی؟ یہ سوال مَیں نے ایک خدشے کے تحت کیا تھا کیوں کہ یہاں تو دُور تک اُس طرف جانے والی سواری کے آثار نہیں تھے۔

بابے نے ہنس کر کہا پُتر سواریاں تو اپنے وقت پر ہی پوری ہوں گی۔ ایک دو گھنٹے لگ ہی جائیں گے۔

پھر اگر سالم چلو گے تو کیا لو گے؟ مَیں بھی اب پوری تیاری کر چکا تھا۔

بارہ روپے دے دینا، لے بھی آؤں گا اور چھوڑ بھی آؤں گا۔ بابے نے ایسے کہا جیسے اُسے اُمید نہ ہو اتنے پیسوں میں جانے کی۔

پیسے بہت زیادہ تھے لیکن مَیں نے کہا چلیے آج گھر کو اُلٹ ہی دیں۔ تھوڑی دیر سوچ کر مَیں نے چھلانگ ماری اور تانگے پر بیٹھ گیا۔ کوچوان تانگے کی سیٹ سے نیچے اُترا۔ اُس نے گھوڑے کے آگے پڑا ہوا لوسرن کا چارہ اور بچا کھچا پھک مِلا دانہ سامنے سے اُٹھایا اُسے ایک بوری میں ڈال کر ہودے میں رکھ دیا۔ اُس کے بعد گھوڑے کو لگام سے پکڑ کر حوض تک لے گیا جہاں پانی تھا۔ گھوڑے نے اپنی کنوتیاں اُوپر اُٹھا کر پانی پینا شروع کر دیا۔ اِس عرصے میں کوچوان اُس کے جسم پر ملائمت سے ہاتھ پھیرتا رہا۔ تھوڑی دیر میں گھوڑا پانی پی کر سیر ہو گیا اور مالک کی طرف منہ پھیر کر ایسے کھڑا ہو گیا جیسے کہتا ہو کہ اب مَیں تیار ہوں۔ کوچوان نے لگام گھوڑے کے منہ میں دوبارہ ڈالی اور اُسے سیدھا کر کے تانگے کا منہ مشرق کی سمت پھیر دیا اور مجھے کہا، لو جی باؤ جی اب اِس میرے دلارے کی ٹاپیں دیکھنا۔ مالک بڈھا ہے پر گھوڑا جوان رکھا ہے۔ گھوڑے نے سڑک پر ٹاپیں بھرنا شروع کر دیں۔ یہ ایسی سڑک تھی جس پر پکی اینٹوں کا نیا نیا سولنگ لگا تھا۔ گھوڑے کی کھُریاں بھی نئی تھیں۔ یہ اچھا ہی تھا کہ مَیں اکیلا تھا، پوری رات ریل پر سفر کرتے گزری تھی۔ تانگے میں بیٹھنے سے ایسے لگا جیسے سفر ختم ہو گیا ہو۔ یہ واحد سواری ہے جس میں تھکاوٹ کا احساس نہیں ہوتا۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آدمی اپنے گھر کی چارپائی پر بیٹھا ہو اور وہ ہچکولے کھائے جا رہی ہو۔ گھوڑا دھلکو دھلکو دوڑنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی، کوچوان بولا، باؤ جی، آپ کو اِدھر پہلے نہیں دیکھا؟

دنیا کا کوئی کوچوان دیکھ لیں وہ گفتگو کا آغاز یہیں سے کرے گا کہ آپ پہلے نہیں دیکھے گئے۔ اگر اُسی کے علاقے سے ہیں تو کہے گا آج کدھر کے چکر ہیں؟ مجھے معلوم تھا اِس کے بعد گفتگو کا سلسلہ

شروع ہونے والا ہے۔ مَیں اُس کے لیے تیار تھا۔ مَیں نے کہا بابا جی مَیں آج پہلی بار یہاں آیا ہوں۔ یہ میرا علاقہ نہیں ہے۔

خیر ہووے پتر کہاں سے آئے ہو؟ تانگے والے نے ایسی شرافت سے پوچھا کہ مَیں اُس کی آواز پر داد دیے بغیر نہیں رہ سکا۔ مَیں نے جواب دیا، ضلع منٹگمری کی ایک تحصیل، پھر اُس سے بھی آگے ایک گاؤں سے آیا ہوں۔

اچھا اچھا، یہ اگلا ضلع منٹگمری ہے۔

جی ہاں وہی ہے۔

ٹبے میں کوئی کام تھا یا خط پتر دینا ہے؟

نہ کوئی وہاں رشتے دار ہے اور نہ خط پتر دینا تھا، مَیں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا، ایک مصیبت میں ہوں۔ کوئی گم ہو چکا ہے اُسے ڈھونڈتا پھرتا ہوں۔

اللہ نہ کرے کون گم ہو گیا؟

ہمارے گاؤں کی ایک لڑکی تھی، وہ کہیں دُور سے ٹبے کی رعایا والوں کی رشتے دار تھی۔ مَیں نے کہا شاید یہیں نہ ہو۔

پتر بڑی عجیب باتیں کرتے ہو، بابے کوچوان نے حیرانی سے میری طرف دیکھا، ٹبے والے تو نزدیک کے رشتے دار نہیں بنے، دُور سے اِن کا کیا واسطہ اور لینا دینا۔

کیوں نزدیک والوں کو کیا ہوا؟ مَیں نے کوچوان کو ذرا ہلانے کے لیے بھولے پن سے سوال کیا۔

بابے نے میری طرف دیکھے بغیر گھوڑے کو ایک چھانٹا لہرایا اور بولا، بس پتر ذکر کرتے ہوئے زبان جلتی ہے۔ کہتے ہیں نا کمر سیدھی نہ ہو تو پڑ میں نہ جایے۔ مَیں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ بڈھے وارے ہڈیاں نہیں جڑتیں۔ یہ چودھری تو ثابت ثبوتے بندے ہضم کر گیا۔ مَیں تو اس کے لیے ایک ٹانگ کے برابر بھی نہیں۔

مَیں کوچوان کی بات پر ہنس دیا، بتاؤ بھلا بابا جی آپ بھی بادشاہی کرتے ہیں۔ چودھری اژدھا تھوڑی ہے، جو بندے ہضم کرتا ہے۔

میاں چھوہرے تجھے کیا پتا اِس کے جبڑوں کا۔ یہ دانت نہیں منہ میں کیل رکھتا ہے۔ جس پر چک

ڈالتا ہے چبا کر میدہ کر دیتا ہے اور پلٹ کے اِس کا بال بیکا نہیں ہوتا۔

کون چودھری بابا جی؟ یہاں کوئی چودھری بھی ہیں؟ جو بندے کھا جاتے ہیں۔اب میں بابا جی کو پورا کھولنا چاہتا تھا۔

تُسیں میرا خیال ہے بالکل ہی نئے ہو۔اِس علاقے کو نہیں جانتے۔مَیں سمجھا تھا ٹبے والوں سے کوئی رشتہ ناتہ ہے۔

اب شاید بابا جی مطمئن ہو چکے تھے کہ مَیں کسی کو نہیں جانتا۔تھوڑی دیر تک گھوڑے کی ایال پر ہاتھ پھیرتے رہے۔پھر بولے، بیٹا ایس ٹبے کی لمبی کہانیاں ہیں۔بڑے بڑے بیبے بندے کھا گئے ایہہ سورے۔اپنے سگے بھائیوں اور چچوں کو نہیں چھوڑا۔

کس نے نہیں چھوڑا؟

اِسی چودھری طلال نے، الٰہ بخش کو مار دیا، صادق بخش کو مار دیا۔کچھ تو یہ کہتے ہیں سگے پیو کو بھی اِسی نے قتل کیا ہے۔اللہ بخشے پہلا قتل تو بھائی کا خود اُسی احمد بخش نے کروایا تھا۔خیر اپنی سگی پھوپھی کو مار دیا، پھوپھی زاد کے بیٹے کو قتل کر دیا۔ابھی تھوڑے دن پہلے اپنی بہن کو زہر دے دیا اور کہہ دیا اُسے محرقہ ہو گیا تھا۔اِس زمین کے بدلے میں اِس نے کنبے کا ایک فرد نہیں چھوڑا۔جب تک اِس کا باپ حیات تھا، پھوپھی بچی ہوئی تھی۔اُس کے مرنے کے بعد اللہ جانے کس نے سبق پڑھایا، ایک دن صبح ہوئی تو رعایا کو پتا چلا پھوپھی زہراں کا دل بند ہو گیا اور وہ مرگئی۔سب رعایا کو پتا تھا، چودھری طلال نے اُس کا گلا گھونٹا ہے پر چلتی توپ کا منہ کس نے دیکھا ہے۔

اِس ٹبے کے آس پاس دو میل میں اب اِس کے علاوہ کسی کا رقبہ نہیں۔سب سے اپنی من مانی قیمت پر لے لیا۔جس نے پیار سے نہیں دیا، اُسے اللہ والی بستی ٹور دیا۔اللہ جھوٹ نہ بلوائے اپنے سگے چھوڑ کر چالیس پچاس تو اللہ والی بستی میں پہنچائے ہیں۔

یہ اللہ والی بستی کہاں ہے؟

بابو جی گورستان کی بات کر رہا ہوں، تُو بھی بیٹا بہت سادہ ہے۔بابا کو چوان میری سادگی اور انجان پن سے مزے لے رہا تھا۔

کیا پولیس یا سرکار بکار میں خبر نہیں ہوتی؟ جس طرح آپ نے مجھے بتا دیا ہے، اِس طرح کوئی سرکار کو اور پولیس کو بتا دے تو بھی کچھ کوئی پوچھنے والا نہیں ہے؟

بھائی بیبا، آپ کیسی باتیں کرتے ہیں؟ اول تو جب سے چودھری صاحب نے بڑا الیکشن جیتا ہے پورے ضلع کی سرکار مدار اِس سے پوچھ کے چلتی ہے۔ اُوپر سے ایک اپنا بیٹا فوج میں افسر بھرتی کروا دیا۔ پچھلے دِنوں اِس نے فوج کے جرنیلوں کی بڑی دعوت کی، اُنھیں اپنے جنگلوں میں شکار کھیلایا۔ تین دن تک یہاں ٹبہ ولی بخش خود چھاؤنی بنا رہا۔ مَیں دو سال صدر کینٹ میں تانگہ چلاتا رہا ہوں۔ اتنے فوجی دو سال میں وہاں نہیں دیکھے جتنا یہاں تھے۔ سُنا ہے صدر صاحب تک اِس کی پہنچیں ہیں۔ وہ کچھ بنا رہا کہ کیا بتائیں؟ کوئی اِدھر اُدھر پھٹک نہیں سکتا تھا۔ جن جرنیلوں کی دعوت کی تھی اُنھیں جیپیں بھی خرید کے دیں۔ بالکل نئی جیپیں تھیں۔ سُنا ہے وہی افسر تھے جو اِس کے بیٹے کو بڑا جرنیل بنانے میں سفارشاں کر سکتے ہیں بلکہ اُنھی کے قلم سے آگے جائے گا۔ اب کچھ ہی وقتوں میں میجر صاحب ہو جائے گا۔ چھوٹا بیٹا سرکاری افسر بنانے کے واسطے اُسے لاہور کے بڑے کالجوں میں انگریزی پڑھا رہا ہے۔ خود ہی بتا اب کون جا کر اِس کے کولہو میں سر دے۔ ہماری تو کوئی سپاہی نہیں سُنتا۔ اردگرد کا الکا تلکا سب چودھری طلال کے رہن پڑا ہے۔

آپ یہاں کب سے رہ رہے ہیں؟ مَیں نے بوڑھے کوچوان سے ذرا اِدھر اُدھر کی چھیڑ خانی کرنے کے بعد اصل سوالوں کی طرف آنے کی کوشش کی۔

مَیں تو میاں بیبے نسلوں سے اِدھر ہی ہوں۔ میرا باپ اللہ بخشے صالح علی سردار احمد بخش کے باپ نور بخش کا بیلی تھا۔ اُس کی واہی بیجی کو دیکھتا تھا۔ خانیوال کی منڈی میں وہی اجناس منڈی میں لے کر آتا تھا۔ اُس وقت مَیں پندرہ سولہ سال کا تھا اور باپ کے ساتھ منڈی میں آتا تھا۔ نور بخش کے مرنے سے کچھ عرصہ پہلے میرا والد مرا تھا اور سرداری سب سے بڑے بیٹے احمد بخش کے پاس آ گئی۔ یہ طبیعت کا ذرا سخت تھا اِس لیے مَیں سب سے چھوٹے صادق بخش کے ساتھ کام کرنے لگا۔ وہ میری ہی عمر کا تھا مگر بچارے کی اولاد نہ ہوئی۔ آخر مارا گیا۔ سارے ٹبے کو پتہ تھا کیسے مرا؟ مگر کوئی منہ کھولے تو منہ میں زہر بھر جائے۔ اُس کے بعد اللہ بخش مرا پھر خود احمد بخش بھی مر گیا۔ جب احمد بخش مرا، یہ کہتے ہیں دل کے اٹیک میں مر گیا پر مَیں تو اُسے قتل ہی کہوں گا، اُس وقت مَیں نے ڈر کے مارے ٹبہ چھوڑ دیا اور تانگہ بنا لیا۔ تب سے اب تک زبان کو تالا لگایا اور گھوڑے کی لگام پکڑ لی ہے۔ کہیں ساری نشانیاں ہی نہ ختم کر دیں۔ احمد بخش کے قتل کے بعد زمین چودھری طلال کے قبضے میں آ گئی۔ اُس کے پرانے نوکروں کو اُس نے چلتا کیا۔ نہ بھی کرتا تو وہ خود اُس کی نوکری میں نہ رہتے۔ اب تیرے سامنے پھوٹ بہا ہوں۔ کسی

سے کہہ نہ دینا، بوڑھا ہو گیا ہوں چار دن اور زندہ رہ لوں۔

اتنے میں اُس نے ایک جگہ گھوڑے کو تھوڑی دیر روکا۔ وہاں ایک رہٹ چل رہا تھا۔ کوچوان نے گھوڑے کے منہ سے لگام نکالی۔ مَیں تانگے پر ہی بیٹھا رہا۔ اُس نے تانگے کے ہودے سے لوہے کی بالٹی لی اور رہٹ سے پانی بھر کر گھوڑے کے سامنے رکھ دیا۔ گھوڑا پانی پینے لگا۔ اِسی اثنا میں دس پندرہ جیپ نما گاڑیاں وہاں سے گزریں۔ اُنھیں دیکھ کر کچھ دیر وہ سہا کھڑا رہا۔ جب اُن کی دھول غائب ہو گئی تو کوچوان نے پانی کی بالٹی گھوڑے کے آگے سے اُٹھائی۔ اُسے دوبارہ ہودے میں رکھا اور لگام منہ میں ڈال کر گھوڑے کو دوبارہ ہشکارا بھرا۔ گھوڑا پھر سے چل پڑا۔ تب اُس نے دوبارہ اپنی زبان کا قفل کھولا، یہ وہی طلال چودھری جا رہا تھا۔ ایک مہینہ پندرہ دن پنڈی رہتا ہے، کہتے ہیں اُسے وڈے لوگوں نے چھوٹوں سے بچنے کے لیے اسلام کی وردی چڑھا دی ہے اور اسلام آباد کر دیا ہے۔ دسو، جس شہر کا نام ہی اسلام آباد ہو وہاں یوحنا آباد اور چوہڑ کانے کا بندہ کیسے رہ سکتا ہے۔ یہ طلال چودھری جس کا لین دین ہی قصائیوں کا ہے یہ بھی اُسی شہر کا پکا ممبر ہے۔ ایک دو دن ٹبہ میں گزارتا ہے۔ جب یہاں پر ہوتا ہے سیکڑوں افسر اِس سے ملاقات کرنے آتے ہیں۔ اب تو اِس نے آس پاس کی زمینیں بھی خرید کر پورے پانچ ہزار کلے (ایکڑ) رقبہ جمع کر لیا ہے۔ اِتنا رقبہ تو کسی بادشاہ کے پاس نہیں ہوتا۔ اب سنا ہے اُس پر ایک مل اور شیلر بھی لگانے لگا ہے۔ یہ پیروال تک کے آس پاس اِسی کے شیلر ہیں۔ آلو کی فصلیں اور کماد کی فصلیں پہلے ہی اِس کی اپنی بہت ہیں۔ سفید رنگ کی چینی نامی بلا کوئی نکلی ہے، اُس کے کارخانے لگنے سے اِس کی دولت میں اور بھی خزانہ جمع ہو جائے گا۔

اچھا یہ بتا، اِس کا کوئی چچا زاد نہیں ہے؟ مَیں نے بابے کو اب کریدا۔

کیوں نہیں تھے؟ سب کچھ تھا، پر اب نہیں ہیں۔ تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے۔ اِس نے اپنے چچا کی ایک بیٹی ڈاکٹرنی فرح بی بی کو قتل کرایا ہے۔

وہ کیسے؟ اب میں اپنے مدعا پر پہنچ چکا تھا۔

اُس کی زمین ابھی تک اُس کے نام پر تھی۔ اِس بی بی نے اللہ جانے کسی بندے سے شادی کی۔ اُس میں ایک بیٹا پیدا ہو گیا۔ یہ بی بی تو باپ کے مرنے کے بعد یہاں کبھی نہیں آئی پر ایک دن اُس کا بیٹا اور خاوند اپنا دعویٰ لے کر آ گئے۔ مَیں تو کہتا ہوں اُن کی آئی ہوئی تھی اور موت کے فرشتے نے بہانہ بنایا تھا۔

اچھا وہ بھی مار دیے؟ میں نے حیرت کا اظہار ایسے کیا جیسے بالکل معصوم ہوں۔

لو جی، اُن پر حملہ ہوا، فرح بی بی کا لڑکا تو موقع پر ہی چل بسا۔ لڑکے کا باپ سُنا ہے مہینہ بعد مر گیا۔ ایک دن وہ اپنے بیٹے کا بدلہ لینے کے لیے خود آ گئی اور شیرنی کی طرح گھر میں گھس کر چودھری طلال پر فائر کھول دیا۔ دو گولیاں اُس کے سینے میں لگیں۔ چودھری طلال بلی کی طرح گھر کے کمرے میں گھس گیا اور کنڈی چڑھا لی۔ حیرت ہوئی کہ گولی کی آواز بالکل نہیں آئی تھی۔ رات کا وقت تھا، کسی کو کان و کان خبر نہیں ہوئی۔ بی بی فرح نے سمجھا سؤر مر گیا ہے۔ وہ اُسے وہیں چھوڑ کر نکل گئی۔ اُس وقت تک تو کسی نے شور نہیں مچایا لیکن جب گھر سے نکل کر جیپ پر بیٹھی اُس وقت گھر کی نوکرانی نے شور مچایا کہ چودھری طلال کو فرح بی بی مار گئی ہے۔ سب دوڑ کر اندر بھاگے۔ دروازہ کھولا تو چودھری طلال خون میں لت پت اندر پڑا تھا۔ سب کو لگا وہ مر چکا ہے مگر گھریلو ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر نبض دیکھی تو چل رہی تھی۔ اتنے میں پورے ٹبے اور آس پاس کے گاؤں میں نقارہ بج گیا۔ چودھری طلال کو اُٹھی کی کار میں ڈال کر ہسپتال لے گئے اور وہ بچ گیا۔ دونوں گولیاں پسلیوں میں لگی تھیں۔ تھوڑا اُوپر دل پر لگ جاتیں تو اُسی وقت چل نکلتا۔ سُنا ہے حرامزادوں کی رسی دراز ہوتی ہے۔ فرح بی بی نے وار تو پورا کیا تھا پر پورا پڑا نہیں ورنہ ٹبے کی کہانی بدل جاتی مگر ایک قصہ ہو گیا۔ چودھری بلی کی طرح جیسے بھاگا ہو گا، کاش وہاں ہوتے، دیکھ کر مزا بہت آتا۔ طلال کے سامنے کوئی نہیں کہتا پر اُس کے بعد اِس کی دلیری کا پول سب کھل گیا۔ ٹبے میں کوئی گھر ایسا نہیں جو اب اِسے بلی نہ کہتا ہو۔

بُڈھا کوچوان اُس چھوٹے سے واقعے پر اپنے دل کا ساڑ نکال رہا تھا۔ کمزور آدمی اِن چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی دل کو دلاسا نہ دے سکے تو مر نہ جائے۔ پھر کیا ہوا؟ مَیں نے کہانی میں بہت دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔

تھوڑے دِنوں میں چودھری بچ گیا۔ اب اُسے تلاش ہوئی کہ فرح کا پتا چلائیں۔ پولیس نے تو اُسی دن ریکی شروع کر دی تھی مگر اُن کو ایک مہینہ پھر بھی لگ گیا۔ سب کو پتا تھا فرح بی بی کسی ہسپتال میں ڈاکٹر ہے۔ اِنھوں نے تمام ہسپتالوں کی پڑتال شروع کر دی اور ایک دن وہ شاہ کوٹ سے پکڑی گئی۔ چودھری کی پنجاب کے پولیس افسر سے بڑی دوستی تھی۔ کئی بار وہ شکار کھیلنے یہاں آ چکا ہے۔ اُس نے چودھری صاحب سے کہا، چودھری جی آپ فکر نہ کریں ڈاکٹرنی کا علاج ہم جلد کر لیں گے۔ سب کہتے ہیں اُسے پولیس پکڑ کر لے جا رہی تھی مگر یہاں بچے بچے کو پتا ہے پولیس کی وردی وہاں کے تھانیدار نے

خود چودھری طلال کے بندوں کو پہنائی تھی۔ وہ پولیس وردی میں گئے اور فرح بی بی کو پکڑ لیا اور رستے میں ذبح کر دیا اور خبر اُڑا دی ڈاکٹر فرح کے بندوں نے راستے میں اُسے چھڑانے کے لیے پولیس پر حملہ کیا تھا۔ اِس لیے حملہ آوروں کی گولی سے مرگئی۔ اِس حساب سے چودھری نے سب کا پتا ہی کاٹ دیا۔ اب اُس کے علاوہ کوئی اُن کے خاندان کا والی وارث نہیں رہا۔

تو کیا ڈاکٹر فرح کے بیٹے کی کوئی اولاد نہیں تھی؟ جیسے جیسے ٹبہ ولی نزدیک آ رہا تھا، میری منزل قریب ہوتی جا رہی تھی۔

اب وہی تو چکر ہے، چودھری طلال اُنھی کی کھوج میں پچھلے ڈھائی سال سے ٹکریں مار رہا ہے اور وہ مل نہیں رہے۔ سُنا ہے اُس کی اولاد ہے پر وہ کہاں ہے اِس کی خبر کسی کو نہیں۔ چودھری طلال نے اپنا ہر وسیلہ استعمال کر لیا ہے۔ دیکھیں، سانپ سے کبوتر کے بچے کب تک بچتے ہیں؟ پہلے سنتے تھے کراچی میں ہیں مگر وہاں نہیں ملے۔ کراچی کے سب وزیروں مشیروں کو طلال نے اِس کام میں امداد کے لیے کہا۔ کراچی کی تمام کالونیوں کو ڈھونڈا۔ نئی آبادیوں میں بندے دوڑائے مگر اُن کو پتا نہیں آسمان کھا گیا ہے یا زمین نگل گئی ہے۔ جب تک چودھری اُن کو ڈھونڈ نہیں لیتا، اِسے چین نہیں آئے گا۔ کئی لوگ کہتے ہیں فرح بی بی نے اُنھیں اِس ملک سے باہر بھیج دیا تھا۔ اب چودھری طلال کو فکر ہے کہیں ایک دن پاس سے ہی نہ نکل آئیں اور زمین کا تقاضا کھڑا کر دیں۔ دیکھیں کیا بنتا ہے۔ میاں میری دعا ہے جب تک مَیں جیتا ہوں اللہ اُنھیں اِس اژدھے کے منہ سے دُور ہی رکھے، بہت دُکھ ہوا اِس ٹبے کی بربادی دیکھ کر۔

اب تانگہ نہر کے پُل پر پہنچ چکا تھا۔ سامنے نہر کے دونوں کناروں پر سُنبلوں کے اُونچے اُونچے درخت تھے۔ اِن کے لال رنگ کے موٹے موٹے پھول گر کر عجیب سماں باندھے ہوئے تھے۔ نہر کی پٹڑی انتہائی صاف تھی اور اِس میں چلتا ہوا پانی اُس سے بھی زیادہ صاف تھا۔ یہ اپریل کے ابتدائی دن تھے۔ تانگے نے نہر کا پُل عبور کر کے بائیں کنارے پر چلنا شروع کر دیا۔ اُوپر اور نیچے گرے ہوئے موٹے موٹے لال پھولوں کے ڈھیر سُنبلوں کی بکھری ہوئی چھاؤں میں عجیب بہار دے رہے تھے اور تانگے پر چلتے ہوئے کوچوان مجھے ٹبے کی دردناک کہانی سُنا رہا تھا۔ دُور تک کھیتوں میں پھیلی ہوئی صبح کی خوشبو اور بیلوں کی گھنٹیاں کہیں کہیں کانوں کا رُخ اپنی طرف پھیر لیتی تھیں۔ بیچ میں کہیں جب طلال کی سفاکی پر میرا دھیان جاتا تو خوف کی لہر پورے جسم میں پھیل جاتی البتہ یہ اچھا ہوا تھا کہ اُس کا قافلہ

ہمارے پاس سے گزر کر خانیوال کی طرف گیا تھا۔ یہ قافلہ اول تو اسلام آباد کی طرف روانہ ہوا تھا۔ اگر صرف خانیوال تک ہی گیا تھا تو جب تک لوٹتا ہمیں واپس ہو چکا ہوتا۔ اب ٹبہ چار پانچ کلومیٹر ہی رہ گیا تھا۔ بابے نے ایک نظر نہر اور پھر دُور تک لگے کپاس اور آلوؤں کے کھیت کی طرف دیکھ کر کہا، یہ ساری زمین اور فصلیں اور میلوں تک پھیلی ہوئی رعایا چودھری طلال کی ہو چکی ہے۔

اتنی دُور تک؟ مَیں نے حیرت سے کہا، اتنی زمین تو پنجاب میں کسی کے پاس نہیں ہوگی۔ پنجاب میں کوئی نواب تو آج تک نہیں سُنا۔

باؤ جی، یہ کون سا اِس کی سب اپنی ہے اور حلال کی کمائی ہے؟ حرام سے جوڑی ہے۔ کوچوان میرے نام بدل بدل کے لے رہا تھا۔ سرکاری بابو، فوجیں اور وڈے وڈے سیاسی لوگ یہ حرام مال اکٹھا کرنے میں اِس کے مددگار رہے ہیں۔ کئی معصوموں کا خون اِس کی گردن پر ہے۔ جس کی زمین چاہتا ہے اُس سے اونے پونے خرید لیتا ہے۔ کوئی نہ دے تو بندے کا پتا ہی نہیں چلتا۔

یہ بھی تو ہو سکتا ہے فرح کا کنبہ بھی اِس نے چپکے سے ٹھکانے لگا دیا ہو اور اب اُوپر اُوپرے اُن کی پڑتال پر لگا ہوا ہو۔

اللہ نہ کرے فرح کے پوتے اِن کے ہاتھ آئیں۔ کوچوان نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا، اُس بچاری نے اللہ جانے اُن کو موسیٰ کی طرح دریا میں بہا دیا ہے یا کسی کھوہ میں دفن کر دیا ہے۔ جہاں وہ نوکریاں کر چکی ہے، ہر جگہ طلال بخش نے اُنھیں ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے۔ کراچی، ایک پوری پلٹن پیچھے لگا دی۔ منٹگمری کے ایک گاؤں میں تین سال رہی تھی، وہاں بھی گئے۔ شاہ کوٹ اور لاہور میں ہر جگہ اُن کو تلاش کیا مگر نہیں ملے۔

بابا جی، ایک بات بتاؤ، اگر وہ غائب ہیں اور اِس سے اپنی جائداد کا تقاضا بھی نہیں کرتے تو اِسے کیا تکلیف ہے؟ اُنھیں اُن کے حال پر چھوڑ دے۔ خود ہی مر کھپ جائیں گے۔

بیٹا تجھے نہیں پتا یہ شخص لالچ میں اندھا ہے۔ مَیں تو کہتا ہوں، زمین کا ٹکڑا سانپ کے منہ میں بھی ہوگا تو نکال لے گا۔

تو کیا اب فرح کی قبر یہیں ٹبہ ولی بخش میں ہے؟ مَیں نے بے نیازی سے پوچھا۔

ہاں جی، غریبنی اِسی ٹبے کے قبرستان میں ہے۔ اپنے باپ کے ساتھ پڑی ہے شوہدی۔ ٹبے کے دوسری طرف دو فرلانگ پر قبرستان ہے۔ وہاں کسی سے بھی قبر کا پتا پوچھ لیں۔ پر نہ ہی پوچھیں تو بہتر

ہے، تجھے اُنھی کا بندہ سمجھ لیں گے، نئی مصیبت میں پڑ جائے گا۔

اور اُس کا بیٹا بھی وہیں ہے؟ مَیں نے جرأت کر کے یہ بھی پوچھ لیا۔

ہاں جی وہ بختاں مارا بھی وہیں ہے۔ تینوں کی قبریں ایک ساتھ ہی ہیں۔ سجی طرف سے قبرستان جائیں تو آخری کونے پر ایک لمبی کھجور کھڑی ہوگی۔ اُس کھجور کے نیچے اُن تینوں کی قبریں ہیں۔ تینوں پر اُن کے نام کی تختیاں لگی ہیں۔ کوچوان نے وضاحت کے ساتھ بتایا، شاید اُسے معلوم تھا مَیں قبرستان ضرور جاؤں گا۔ بعض خموشیاں ایسی ہوتی ہیں جن میں تمام اطلاعیں چیخ رہی ہوتی ہیں مگر اُن کے سننے والے اور سنانے والے دونوں خوف سے یا مصلحتوں کی دیوار کو سامنے پا کر اُس کو زبان نہیں دیتے۔ کوچوان کو صاف پتا چل چکا تھا مَیں کسی نہ کسی طرح اُنھی کے لیے آیا تھا جن کی کہانی وہ سنائے جا رہا تھا مگر کھل کر نہ اُس نے اظہار کیا نہ مَیں نے بتایا۔ اب ہم دونوں ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئے تھے۔ مَیں جنید کی قبر پر پہنچنے والا تھا مگر کس حیثیت سے، یہ مجھے بھی معلوم نہیں تھا۔ جنید کے بارے میں میرے دل میں نفرت کا طوفان محبت کے سیلاب میں بدل چکا تھا۔ اُس سیلاب کے چند قطرے میری آنکھوں سے بہنے کو بے چین تھے مگر مَیں اُنھیں دبائے ہوئے تھا۔ اُس نے اپنی طرف سے میرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی تھی، ہمیشہ محبت اور شفقت سے میری دل جوئی کرتا رہا تھا۔

تانگے نے ایک چھوٹے سے راجباہ کی پُل کو عبور کیا اور ایک دم چڑھائی میں چڑھتا چلا گیا۔ اِس چڑھائی پر دونوں جانب پہاڑی کیکروں اور جھاڑیوں کے پودے تھے جنھوں نے پوری سڑک کو ایک طرح سے چھپا لیا تھا۔ اِس سڑک پر بھی سولنگ لگا ہوا تھا۔ یہ مشکل سے آدھا کلومیٹر کی سڑک تھی۔ اِس کے بعد ایک کھلا میدان شروع ہو جاتا تھا۔ اِس میدان کے چاروں طرف کھیت تھے، وہی کھیت اور کھلیان جو مَیں نہر کے کنارے اپنے پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ پھر تانگہ اچانک ایک طرف مڑ گیا۔ اُس کے سامنے ہی ایک اُونچا گاؤں نظر آنے لگا۔ اُسے دیکھ کر کوچوان بولا، لے بیٹا یہی ٹبہ ولی بخش ہے۔ یہ ٹبہ کافی اونچا تھا اور بہت بڑا تھا۔ اِس کے چاروں طرف ٹاہلیوں کے بڑے بڑے درخت تھے۔ اُن کے نیچے گھیرے میں ایک پانی کا نالہ بہہ رہا تھا۔ ٹاہلیوں کے پتے چوڑے اور شفاف تھے جیسے سبز شیشے چمک رہے ہوں۔ دھوپ کافی چڑھ آئی تھی جس میں یہ چھاؤں بہت بھلی لگتی تھی۔ جس جگہ ہمارا تانگہ رُکا وہاں دو تانگے اور بھی کھڑے تھے۔ اُن کے کوچوان ایک لوہار کی دُکان پر بیٹھے تھے۔ یہ لوہار کی دُکان ایک بڑی بھٹی کی شکل میں تھی اور اُس پر ایک کھلا چھپر پڑا تھا۔ دُکان کے اردگرد لکڑی کے سوکھے تنے

اور گڈے کے ٹوٹے پہیے اور کچھ لوہے کے انجر پنجر نظر آ رہے تھے۔ دکان میں بھٹی کی آگ جل رہی تھی۔ اُس کے آس پاس پانچ چھ موڑھے پڑے تھے اور اُن پر کچھ بڈھے بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔

بابے عنایت نے تانگے کو اُس دُکان سے تھوڑا آگے جا کر ایک چوک میں کھڑا کر دیا اور بولا، لے بیٹا، ٹبہ آ گیا، کب تک لوٹ کر آ جاؤ گے؟ اس جگہ دو گڈے کھڑے ہوئے تھے۔ چوک میں دیسی بیریوں کے تین چار درخت اور ایک کھجور کا درخت تھا۔ سامنے ایک موچی بیٹھا تھا۔ اُس کی نظر سیدھی ہم پر تھی اور جوتے کو ٹانکے لگا رہا تھا۔ مَیں تانگے سے نیچے اُتر گیا۔ یہ ٹبہ ایک اونچائی پر بڑا سا گاؤں تھا اور بہت زیادہ پھیلا ہوا تھا۔ ٹبے کے اردگرد برسن اور کپاس کی فصلیں تھیں اور اُن کے درمیان بھینسیں کھلے عام چر رہی تھیں۔ ٹبے کی شادابی اور سرسبزی دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ مَیں سمجھ رہا تھا جس طرح اِس ٹبے والوں کی داستانیں سنی ہیں، یہ ایک بھوتوں کا علاقہ بن چکا ہوگا۔ بے چین روحیں یہاں بین کرتی ہوں گی اور ویرانیاں ہونکتی ہوں گی مگر یہ سب کچھ اُس کے برعکس تھا۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ جس جگہ تانگے نے مجھے اُتارا تھا، اُس کے سامنے سے ایک سڑک گھوم کر پورے ٹبے کا احاطہ کرتی تھی۔ مَیں اُسی سڑک پر چل پڑا۔ اِس سڑک پر اینٹوں کا سولنگ لگا ہوا تھا اور ٹاہلیوں کے درخت اِس کے دونوں جانب کھڑے تھے۔ جن کے نیچے صاف پانی کا نالہ بہہ رہا تھا۔ اُس نالے پر بیٹھ کر دو تین عورتیں کپڑے دھو رہی تھیں۔ یہ ٹاہلیاں بہت موٹی اور کالے تنوں والی تھیں۔ دائیں طرف اب ایک مسمی مالٹوں کا باغ نظر آ رہا تھا۔ اِس کے اردگرد کیکر کی کانٹے دار سوکھی شاخوں کی باڑ کی گئی تھی۔ دن کے گیارہ کا وقت تھا۔ سڑک تھوڑا سا موڑ کاٹ کر ٹبے کے اُوپر چڑھ رہی تھی لیکن مَیں سیدھا آگے نکلتا چلا گیا۔ یہ ٹبے کے نیچے نیچے گھیر کھاتی سڑک تھی۔ جب میں گاؤں کے عقب میں پہنچا تو عین جنوب کی طرف ایک چھوٹی سڑک جاتی تھی۔ مَیں اِسی سڑک پر ہو گیا۔ دو تین ایکڑ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد مجھے قبرستان نظر آ گیا۔ یہ کچی پکی قبروں کا قبرستان تھا۔ مَیں ہر چیز سے بے نیاز ہو کر اِس قبرستان میں داخل ہو گیا۔ اب میری نظریں کھجور کو تلاش کرنے لگیں مگر یہاں ایک کی بجائے چار کھجوریں کھڑی تھیں۔ قبرستان چھوٹا سا تھا اِس لیے مجھے سب کھجوروں کو دیکھ لینے میں کوئی وقت نہ لگتا۔ لیکن مجھے کوچوان نے بتایا تھا کہ جو آخری کونے پر کھجور ہوگی اور سب سے لمبی ہوگی اُسی کے نیچے ڈاکٹر فرح، جنید اور اُن کے نانا اللہ بخش کی قبر ہوگی۔ مَیں سیدھا آخری کونے پر پہنچ گیا۔ یہاں سنگِ مرمر سے بنی ہوئی تین قبریں ایک ساتھ موجود تھیں۔ مَیں نے دعا کے لیے ہاتھ بالکل نہیں اُٹھائے مگر اُن پر ایسے کھڑا تھا جیسے یہ میرے

قریبی رشتے دار ہوں۔ دائیں طرف اللہ بخش کی قبر تھی۔ اُس کے بائیں جانب یعنی درمیان میں ڈاکٹر فرح کی تھی اور اُس کے بعد جنید کی قبر تھی۔ جنید کی تختی پر نظر پڑتے ہی میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ یہ دنیا کیسی عجیب ہے۔ یہاں کی خوش نصیبیاں اگلے لمحوں کی بدبختیاں بن جاتی ہیں۔ عزتیں اپنے اندر ذلتوں کے جہان آباد رکھتی ہیں اور ذلتوں کے انجام پر عزتیں نمودار ہو جاتی ہیں۔ زندگی رونق کی جولانیوں پر موت کو چھو لیتی ہے۔

آنسو میرے گالوں پر بہنے لگے تو مَیں نے ایک دم وہاں سے رخصت ہونا چاہا۔ جنید کی قبر پر سیاہ پتھر لگا تھا جہاں اُس کی تاریخ وفات لکھی ہوئی تھی مگر قتل کی تاریخ موجود نہیں تھی بلکہ تینوں قبروں کی تختیوں پر تاریخ وفات درج تھا۔ مَیں نے سوچا کیا ایسے ہو سکتا ہے تینوں کی قبروں پر وفات کی بجائے قتل کی تاریخ کندہ کر دی جاتی مگر ایسا کیسے ممکن تھا۔ کچھ دیر کے بعد میں قبرستان سے باہر نکل آیا اور دوبارہ گاؤں کی طرف لوٹ گیا۔ اب ٹبہ پھر میرے سامنے تھا۔ میں نے اُس کا چکر کاٹا اور سیدھا مشرق سمت آ کر کھڑا ہو گیا۔ یہاں سے ایک چوڑی سڑک ٹبے کے اُوپر چڑھتی تھی۔ مَیں بھی اُس پر چڑھتا چلا گیا۔ مَیں نے پتلون اور قمیص پہن رکھی تھی۔ اِس لباس میں کچھ ایسا رعب تھا کہ مجھے ٹبے کے رہنے والے لوگ بس دیکھ رہے تھے اور چُپ تھے۔ اُنھیں گمان تھا کہ مَیں طلال بخش کا جاننے والا ہوں۔

مجھے حیرت تھی مَیں یہاں کیوں آیا ہوں اور کس لیے آگے بڑھتا چلا جا رہا ہوں؟ کسی کا جاسوس نہ سمجھ لیا جاؤں۔ لیکن یہ سب خیال ہی تھا۔ بعض گمان ایسے ہوتے ہیں کہ بھری کائنات میں وہ صرف اُسی کی ملکیت ہوتے ہیں۔ مَیں اُس چوک سے سیدھا آگے کی طرف چل پڑا جہاں میرے خیال میں چودھری طلال بخش کا ڈیرہ ہو سکتا تھا۔ مَیں چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ ایک بہت بڑا دروازہ نظر آیا۔ دروازہ بہت اونچی اور لمبی دیوار کو لگا تھا۔ اِس کے لکڑی کے پھاٹک اتنے بڑے تھے کہ اُنھیں ہاتھی بھی کھینچے تو مشکل میں پڑ جائے۔ اُنھی پھاٹکوں کے سامنے بہت بڑا ڈیرہ نظر آ رہا تھا۔ دروازہ کھلا تھا۔ مَیں نے دروازے کو عبور کیا اور صحن میں آ گیا۔ یہ بادشاہی مسجد کے صحن کی طرح کھلا اور پکا تھا۔ دونوں طرف بچھے ہوئے موڑھے اور بیچ میں بڑے بڑے حقے رکھے تھے اور وہ دہک رہے تھے۔ یہاں کئی لوگ بیٹھے تھے مگر چودھری طلال بخش نہیں تھا۔ حویلی یا اِسے ڈیرہ کہہ لیں، ایک سپاٹ عمارت تھی۔ اُس کی چھتیں بہت اونچی اور پُرہیبت لگ رہی تھیں۔

مجھے دیکھ کر کئی آدمی اپنی جگہ سے اُٹھ بیٹھے۔ اُنھیں ایک اجنبی کو یہاں آتے دیکھ کر عجیب نہیں لگا

تھا۔ وہ روز اجنبیوں کو دیکھنے کے عادی تھے۔ مَیں نے اُنھیں سلام کیا اور ایک موڑھے پر بیٹھ گیا۔ کچھ لمحے خموشی رہی پھر ایک شخص بولا، جی آپ کہاں سے آئے ہیں؟ یہ آدمی طلال بخش کا منشی معلوم ہو رہا تھا۔ مرکز میں بیٹھا تھا اور باقی ارد گرد اُس کی باتیں سُن رہے تھے۔ ایک آدمی کو تھوڑی دیر پہلے اُس نے ڈانٹا بھی تھا کہ کھاد کا حساب پورا نہیں دیا۔ مَیں منٹگمری کی ایک دور دراز کی تحصیل سے ہوں اور زراعت کی تعلیم حاصل کر رہا ہوں۔ آج حیدر آباد سے واپسی پر خانیوال اُتر گیا۔ مَیں نے سُنا تھا چودھری طلال بخش کی زمینوں کی پنجاب میں بڑی دھاک ہے اور اُس کی فصلیں پورے پنجاب میں بہت زیادہ پروڈکشن ایبل ہیں۔ وہی دیکھنے چلا آیا اور ماشاﷲ یہاں تو کمال ہوا ہے۔ واقعی اتنی ہری بھری فصلیں اور باغات دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ میری بات سُن کر وہ بہت پھول گیا اور بولا باؤ جی فصلوں کی حفاظت کرنے والا اپنے کام سے مخلص ہو تو فصلیں بھلا کیوں ہری بھری نہ ہوں۔ پھر اُس نے ایک طرف دیکھ کر ایک آدمی کو آواز دی، اوے دُودے، جلدی جا مہمان واسطے چائے پانی کا بندوبست کر۔

اچھا تو آپ فصلوں کے ڈاکٹر ہیں، اب منشی دوبارہ بولا۔

جی بس یہی سمجھ لیں، مَیں نے جواب دیا۔ مجھے حیرت تھی یہ ایک دم مجھے کس طرح کی بات سوجھی تھی کہ اپنے آنے کا مقصد اور مدعا اتنی صفائی اور پُر اعتماد جھوٹ سے بیان کر چکا تھا اور اُنھیں گمان تک نہیں ہو پایا کہ مَیں بلا مقصد یہاں جھک نہیں مارتا پھر رہا تھا۔ بعض اوقات دماغ کا لاشعور اپنے دباؤ میں ایسی نئی طرح نکالتا ہے کہ اُسے عام زندگی میں کبھی نہیں سوجھ سکتی۔ یہ کیا فلسفہ ہے اِس کا راز آج تک انسان کے احاطے سے باہر ہے۔ یہاں میرا زرعی ڈاکٹر تصور کر لینا بھی ایک عجیب آسانی اور عزت کا باعث بن گیا تھا۔

آپ چائے پانی پیو، پھر فصلوں کا دورہ کرواتے ہیں۔ مُنشی صاحب نے بڑے فخر سے اصل میں اپنی کارکردگی دکھانے کی کوشش کی کہ اِس عمل میں شاید طلال بخش کی اشیر باد زیادہ حاصل ہو جائے۔ تھوڑی ہی دیر میں چائے اور دوسرے لوازمات آ گئے۔ اِس ڈیرے پر میرا خیال ہے یہ لنگر ہر وقت تیار رہتا تھا۔ ورنہ اتنی جلدی چائے کا تیار ہو کر آنا مشکل تھا۔ مَیں چائے پیتا رہا، اُدھر وہ باتیں کرتے رہے۔ یہ باتیں بھی بہت دلچسپ تھیں۔ مَیں یوں تو خموشی سے چائے پی رہا تھا مگر اُن کی باتیں غور سے سُن رہا تھا۔

وہاں ایک شخص بہت باتونی تھا، صاف معلوم ہوتا تھا اُسے اِسی کام کے لیے رکھا گیا ہے۔ یہ

شخص سر سے گنجا تھا اور آنکھوں پر بڑے بڑے ابرو تھے، عمر پچاس سال ہو گی۔ ہر شے میں مبالغہ کرتا تھا۔ جب منشی مجھے چائے پانی کا پوچھ رہا تھا یہ چائے لانے والے لڑکے سے مخاطب ہو کر بولا، کاکا میرے لیے بھی پیالہ چائے لیتے آنا ورنہ پھر واپس جانا پڑے گا۔ منشی نے اُس کی طرف غصے سے دیکھا اور کہا، بدرے تیرا پیٹ کبھی نہ بھرے گا، چاہے تیرے سامنے کھانے کی دیگیں بھر کر رکھ دیں۔ کھا کھا کے اپنا پیٹ دیکھ، تندور ہو گیا ہے۔

منشی صاحب میرا تو پیٹ پھولا ہے، آپ کی قبر پھولے گی۔ اتنا حرام کھا بیٹھے ہو۔

بدرے کے اِس جملے سے وہاں بیٹھے سب نے محظوظ ہو کر قہقہہ مارا۔ معلوم ہوتا تھا یہ آدمی طلال کا نک چڑھا تھا اور اُس کے مسخروں میں سے تھا۔ منشی بدرے کی بات پر ایک بار شرمندہ سا ہوا پھر بولا۔ بدرے قبر کا معاملہ تو مرنے کے بعد آئے گا۔ تُو تو زندہ ہی بدبوئیں مارتا پھرتا ہے۔ جدھر سے گزر جاتا ہے۔ دو دو دن عورتیں ناک سے کپڑا نہیں ہٹاتیں۔

بدرے نے موڑھے پر بیٹھے اپنے چوتڑ کو ایک طرف کیا اور بولا، منشی ایک بات کہہ دوں، میری بدبو جس ٹیار نے ایک بار سونگھی اُس کے بعد خاوند سے طلاق ہی لی۔ دوبارہ اُس کے ساتھ نہ وَسی۔ اگر اعتبار نہیں تو تجربہ کر کے دیکھ لے۔

بدرے کا جملہ سُن کے منشی کا چہرہ سُرخ ہو گیا مگر وہ بولا نہیں لیکن اُس کی جگہ ایک اور آدمی بول اُٹھا، بدرے ذرا یہ تو بتا تیری اپنی بُڈھی ساری عمر کس کے گھر وَسی ہے۔ چودھری طلال کا نک چڑھا ایسے تو نہیں ہوا، بُڈھی کا کھٹیا کھاتا ہے۔

اوئے چپ کر اوئے ٹھوٹھیا۔ مری بُڈھی نہ عورتوں میں نہ مردوں میں۔ وہ میرے گھر وَسے یا چودھری کے۔ مَیں تو یہ کہتا ہوں، اب وہ اصل بُڈھی چودھری طلال کی ہے۔ مَیں نے تو دل سے طلاق دی ہوئی ہے۔ اب ہم مال سانجھا کر کے کھاتے ہیں۔ اِس بات پر سب نے ایک دم پھر قہقہہ لگایا لیکن مجھے اِس میں علم ہو گیا کہ اصل میں بدرا کیا چیز ہے اور کیوں منشی سے لے کر ہر آدمی اُس کی جگتیں برداشت کرتے ہیں اور اُس کی خدمتیں کرتے ہیں کیونکہ جب لڑکا چائے لے کر آیا تو بدرے کے لیے بھی پیالہ تھا۔

بدرے نے پیالہ منہ کے ساتھ لگایا تو منشی نے مجھے دوبارہ مخاطب کیا اور موضوع کو بدل دیا، کس سکول سے یہ زراعت کی ڈاکٹری کر رہے ہو بابو جی؟

میرے دماغ میں فوراً کوئی یونیورسٹی نہیں آئی لیکن جواب مَیں نے دے دیا اور کہا، مَیں یونیورسٹی سے فارغ ہو گیا ہوں اور اب اِسی طرح گھومتا رہتا ہوں، بس بنجارہ سمجھو۔ آپ کی فصلیں دیکھ کر لگا ہے کہ بہت عمدہ طریقے سے کاشت کرتے ہیں۔

ایک آدمی پاس ہی سے بولا، بابو جی چودھری طلال بخش صاحب ملکاں ملکاں سے بیج اور طریقے لاتے ہیں۔ گورے ولایت سے خود آ کر بھجواتے ہیں۔ یہ میری تیری زمین تھوڑی ہے کہ ٹانڈا ٹانڈا ہو۔ چودھری طلال کی زمین ہے، علاقے کے جدی پشتی نواب کی زمین ہے بھائی۔

ماما زبان چلانی کوئی ضرور ہوتی ہے، ملکاں ملکاں کے بیج کیا کریں گے جب کوئی کام کرانے والا ہی نہیں ہو گا۔ زمینیں کاشت کرانے کے لیے بھی راٹھ چاہییں، نہ تیرے جیسے جلا ہے کہ ونگے کوڑ سجھ بیٹھے تھے۔ جب دوسیانے بات کر رہے ہوں تو منہ پر چھِکا چڑھا لیا کر۔ مُنشی نے اُس کا ایسا ناطقہ بند کیا کہ وہ سکڑ کر بیٹھ گیا۔

اصل میں منشی کو اُس کے بیج گنوانے اور ولایت سے گورے آ کر زمین کاشت کرانے والی بات بُری لگی کہ اِس بات سے منشی کی اپنی کارکردگی پسِ پشت چلی گئی تھی۔ چلو آؤ جی بابو جی تمھیں تھوڑی سیر کروا دیں۔

منشی کی بات سُن کر مَیں اُٹھ گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا مَیں زیادہ دیر اِن کے بیچ بیٹھ کر اپنی کارکردگی صفر ہوتے دیکھوں اور مجھے آہستہ آہستہ یہ بھی یقین ہو گیا کہ اصل منشی یہ نہیں ہے۔ اصل منشی کوئی اور ہے اور یہ اُس کا اسسٹنٹ ہے۔ دو بندے اور بھی ہمارے ساتھ چل پڑے۔ پیچھے سے ایک لڑکے کی آواز آئی، سردار جی ویگن نکال لیں، دُور تک سیر کر لیں گے۔

مُنشی نے اُسے غصے سے دیکھا۔ بیٹھ جا اپنی جگہ پر، ویگن میں تیل تیرا پیو ڈالے گا؟ اسیں یہ ساتھ والی تھوڑی بہت دیکھ کے آتے ہیں۔

منشی کی جھڑک سے وہ کھسیانا سا ہو کر بیٹھ گیا اور ہم آگے چل پڑے۔ ڈیرے سے باہر نکل کر بائیں طرف مُڑ گئے۔ تانگوں والا چوک اب ہمارے شمال کی طرف رہ گیا تھا۔ ہم اُن کی نظروں سے مکمل اوجھل تھے۔ مَیں نے ابھی کوچوان کو کرایہ ادا نہیں کیا تھا اِس لیے مجھے یقین تھا، وہ وہیں میرا انتظار کر رہا ہو گا۔ مجھے اب یہاں زیادہ دیر ٹھہرنا نہیں تھا۔ ہم جا رہے تھے اور باتیں کرتے جاتے تھے۔ منشی صاحب ایک تنگ سڑک پر چڑھ گئے۔ یہاں سے سیدھی سڑک اتنی دُور تک دکھائی دے رہی تھی جہاں

تک نظر جاتی تھی۔ اِس سڑک کے دائیں طرف بھی ایک کھال بنی ہوئی تھی جس میں پانی چل رہا تھا اور بائیں طرف بھی ایک کھال تھی۔ اُس میں بھی پانی رواں تھا۔ کھالوں کے اُوپر دونوں طرف ٹاہلیوں کے درخت تھے۔ یہ درخت اتنے سایہ دار ہو گئے تھے کہ انھیں لگے ہوئے کم سے کم چالیس سال ہو گئے ہوں گے۔ بہار کے دن ہونے کے سبب ٹاہلیوں کے پتے چمکیلے اور نازک اور ملائم نظر آ رہے تھے۔ پتوں کے درمیان بہت گھنا بور نیچے گر رہا تھا۔ گھنی اور دور تک پھیلی ہوئی ٹاہلیوں کے پتوں اور بُور میں ہلکی اور میٹھی خوشبو سانسوں کو مہکا رہی تھی۔ سڑک کے دائیں طرف گندم کی فصل تھی اور بائیں طرف آلو کاشت کیے ہوئے تھے۔ یہ منظر اتنا دلفریب اور معنی آفرین تھا کہ ایک بار تو میرے دل سے طلال بخش کے لیے داد نکلی۔ اُس نے جیسے بھی یہ زمین حاصل کی تھی مگر اُسے بنانے اور سنوارنے میں کمال دکھایا تھا۔ میری زندگی جہاں بھی گزری تھی اور جس قدر علاقے مَیں نے دیکھے تھے، اتنی بھرپور کاشت کا نظام میری آنکھوں میں نہیں آیا تھا۔ ہم ایک جگہ رُک کر دائیں طرف کو مُڑے ہی تھے کہ ایک باغ نظر آیا۔ منشی صاحب اُس باغ کی طرف مُڑ گئے۔ یہ باغ امرودوں کا تھا اور اِس سے متصل بائیں جانب آموں کا وسیع باغ تھا۔ آموں کا باغ سیاہی مائل اور اِتنا گہرا اور گھنا تھا کہ دُور تک آسمان پر بادل اور گھٹا معلوم ہوتی تھی۔ میرا منشی کی باتوں پر بالکل دھیان نہیں تھا۔ مَیں فقط اُس کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا اور باغوں، فصلوں اور نہروں اور کھالوں کے جہان میں گم تھا۔ چلتے چلتے منشی نے کہا، یہ سب فصلیں نہایت تجربے اور محنت کا نتیجہ ہیں، پھر مسکرا کر بولا، آپ سمجھ رہے ہوں گے یہ آم، امرود، مالٹے اور فصلیں ہمارے مُلک کی منڈیوں میں جاتی ہوں گی۔

مَیں ایک دم چونکا، تو اور کہاں جا کر بکتی ہیں؟

یہاں والے چونی دونی کے بیوپاری چودھری صاحب کو کیا دیں گے؟ بھائی یہ سب مال عربوں میں اور انگلینڈ میں جاتا ہے اور اِس کے پیسے چودھری صاحب کو ریالوں میں آتے ہیں۔ آپ دیکھیں ایک ایک پھل اور پودے کی نگرانی مَیں خود کرتا ہوں، منشی کبیر صاحب تو اکثر چودھری کے ساتھ رہتے ہیں۔ یہ لال آلو اور یہ آم اتنا اچھا ہے کہ کمی کمین لوگوں کی اوقات نہیں ہے اِسے کھانے کی۔ بندر بچارے ادرک کا سواد کیا جانیں؟

باہر یہ مال کیسے جاتا ہے؟ اِس کے لیے تو پرمٹ لینا پڑتا ہوگا اور گورنمنٹ خود طے کرتی ہے اور کسانوں سے خود خرید کر آگے بیچتی ہے میرے خیال میں بدیسی تجارت تو منسٹری کے ہاتھ میں نہیں؟

میری بات سُن کر منشی کریم ہلکا سا طنزاً مسکرایا اور بولا، بھلا گورمنٹیں کس کی ہیں۔ مُلک کا کوئی وزیر نہیں جو طلال بخش کا دوست نہ ہو۔ اُن کے کام یہ کرتے ہیں اور اِن کے کام وہ کرتے ہیں۔ پچھلی دفعہ آپ نے سُنا ہوگا آلو ردی کے بھاؤ ہو گیا تھا لیکن ہمارا آلو اُسی قیمت پر بِک گیا۔

وہ کیسے؟ مَیں نے پوچھا۔

ہوا یہ تھا کہ زمینداروں نے آلو ضرورت سے زیادہ کاشت کر لیا۔ گورنمنٹ نے اول تو خریدا بہت کم اور جو خریدا وہ بالکل معمولی قیمت پر اور اُسے اسٹاک کر لیا۔ اب عالمی منڈی میں اتنی کھپت نہیں تھی تو وزیر صاحب نے منظوری لے کر ٹنوں من آلو سمندر میں پھنکوا دیا کہ گورنمنٹ کے سٹوروں میں جگہ نہیں ہے۔ اُس سے دو کام ہوئے، عالمی منڈی میں چودھری طلال بخش کا آلو اُسی بھاؤ نکل گیا اور مُلک میں بھی آلو کی قیمت مستحکم ہو گئی۔ اُس سے موٹے موٹے زمینداروں نے اپنا آلو سٹوروں سے نکالا اور مارکیٹ میں لے آئے۔

طلال بخش کا منشی اپنے کام میں ماہر ہونے کے ساتھ فقرے باز بھی بلا کا تھا۔ اب مَیں نے اپنی بات کرنے کا موقع ڈھونڈا۔

چودھری صاحب کا کوئی بھائی یا چاچا تایا نہیں ہے، کیا یہ ساری زمین اکیلے چودھری صاحب کی ہے؟

منشی نے ایک بار مجھے غور سے دیکھا اور مَیں سچ پوچھو تو ڈر گیا، لیکن اُس نے شاید دیکھتے ہوئے میری حیرانی کو جانچنا چاہا تھا اور بولا، بھائی کوئی اور مالک ہوتا تو وہ بھی یہیں ہوتا۔ کیا تمھیں لگتا ہے چودھری طلال بخش نے یہ زمین ٹھیکے پر کاشت کر رکھی ہے؟ میاں وہ جدی پشتی نواب ہے، دو چاچے اُس کے تھے۔ وہ بے اولاد تھے اور بچارے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اُن کی اولاد بھی نہیں تھی۔ چودھری طلال صاحب کو اُن کے مرنے کا بہت افسوس ہوا پر اللہ کے کاموں میں کوئی دخل نہیں دے سکتا۔ ہاں اُن کی ایک چچا زاد بہن تھی، پچھلے دِنوں یہاں آئی تھی۔ وہ ذہنی پاگل تھی، چودھری صاحب نے اُس کا علاج کرانے کی بڑی کوشش کی۔ امریکا سے ڈاکٹر منگوائے مگر اُسے شفا نہ ہو سکی۔ چودھری صاحب چاہتے تھے وہ یہاں آ کر رہے اور اپنے حصے کی زمینوں کو کاشت کرے مگر اُس بی بی کو اللہ جانے کیا دورہ پڑتا تھا۔ ایک دن چودھری ہی کے فائر مار دیے۔ وہ تو اللہ کا کرنا بچ گئے۔ اُسی دن وہ یہاں سے چلی گئی۔ پولیس نے اُسے پکڑنے کی کوشش کی۔ اُس نے اُن پر بھی فائر کھول دیا اور مقابلے میں ماری گئی۔

چودھری طلال نے ایس پی صاحب پر پرچہ کروا دیا کہ اُس نے جان بوجھ کر قتل کیا ہے مگر تمھیں تو پتا ہے پولیس اور عدالت اپنے بھائی بندوں کے خلاف کب سُنتی ہے۔ ایس پی چند دن بعد پھر بحال ہو گیا اور اب تک اُس کی کوئی خبر نہیں ہے۔ وہ ڈاکٹرنی تھی۔ اُس کی قبر بھی یہیں ہے۔ بھئی اللہ کے کاموں میں کوئی دخل نہیں دے سکتا۔ طلال بخش کے پاس سب کچھ اللہ کا دیا ہے مگر رشتے دار کوئی نہیں بچا۔ یہ اللہ کے راز ہیں کسی کو بھائی بہنوں سے نواز دیتا ہے اور مال منال نہیں دیتا اور کسی کو مال دیتا ہے تو کوئی رشتہ دار نہیں دیتا مگر اُس کے اپنے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ بڑا بیٹا فوج میں میجر صاحب ہونے والا ہے۔ چھوٹا بیٹا لاہور میں اسسٹنٹ کمشنر لگا ہے اور بیٹی امریکا میں پڑھ رہی ہے۔

چودھری صاحب کے بعد سیاست کون کرے گا؟

لو جی، بیٹوں میں کوئی نہ کوئی تو کرے گا۔ ورنہ بیٹی تو کہیں گئی نہیں۔ ویسے بھی ایک بات بتاؤں، باپ کی سیاست بیٹی ہی بہتر کرتی ہے۔ لوگ ہمدردی میں بھی اُسے ووٹ دیتے ہیں، بیٹی جو ہوئی اور چودھری صاحب کی بھی یہی سوچ ہے اپنے بعد بیٹی کو اِس میدان میں لائیں۔

منشی آدھی باتیں کر رہا تھا اور آدھی چھپا رہا تھا۔ مَیں دل ہی دل میں اُس کی صفائیوں پر داد دیے جا رہا تھا۔ ہم دو گھنٹے گھومتے رہے۔ مَیں نے اندازہ لگا لیا، چودھری طلال بخش کی ایمپائر اِس قدر بڑی اور لامحدود تھی کہ اُس کا فتح کرنا کسی کے بس کا روگ نہیں تھا۔ چودھری طلال نے قانون سے لے کر افواہوں اور وہاں سے پراپیگنڈے تک ہر طرف اپنے جال بہت وسیع اور عمدہ طرز پر پھیلا رکھے تھے۔ اُس کا مقابلہ کسی ہما شما کے بس کا روگ نہیں تھا۔ اب مَیں نے اُس سے آخری سوال کر دیا۔ کیا اُس پاگل بی بی کی اولاد بھی نہیں تھی؟ یہ سوال میں نے اتنے ڈر کے ساتھ کیا تھا کہ مجھے اِس کی سنجیدگی کا احساس تھا اور اگر منشی کو ذرا بھی شک گزرتا تو میری خیر نہیں تھی۔

کیوں نہیں تھے؟ اُس کا ایک بیٹا تھا۔ جنید اُس کا نام تھا۔ وہ اور اُس کا باپ اپنا دعویٰ لے کر آئے تھے کہ ہمارے حصے کی زمین دی جائے۔ چودھری صاحب نے تحصیلدار کو بلا کر صاف کہہ دیا میاں اِن کے حصے کی زمین جتنی بنتی ہے، اُنھیں دے دی جائے مگر جنید نے جس لڑکی سے شادی کی تھی اصل میں وہ اُسے بھگا کر لایا تھا۔ اُدھر لڑکی والے بہت بدمعاش لوگ تھے، وہ اُس کی تلاش میں تھے۔ جنید جس دن عدالت میں اپنی زمین پر وصولی کے دستخط کرنے گیا اُسی دن لڑکی والوں کے رشتے دار بھی پہنچ گئے۔ لڑکی کے بھائی نے اُسے گولیوں سے بھون ڈالا۔ چودھری کو بہت افسوس ہوا، اِدھر بی بی فرح

نے اُلٹا طلال بخش پر ہی شک کر لیا۔ اُسی کے سبب تو اُس نے چودھری صاحب کے فائر مارے تھے۔ سنا ہے اُس جنید کے دو لڑکے ہیں یا دو لڑکیاں ہیں۔ واللہ اعلم۔ اب چودھری صاحب کی ہر ممکن کوشش ہے انھیں کہیں سے ڈھونڈ کر اُن کے حصے کی زمین اُن کے حوالے کر کے خدا کے حضور سرخ رو ہو جائے۔ لوگوں کی زبانیں کون روک سکتا ہے؟ کہتے ہیں اپنے قبیلے کو خود طلال بخش نے ختم کیا ہے۔ یہ اتنا بڑا جہان دیکھ کر آس پاس کے زمیندار اُن سے حسد کرتے ہیں اور جھوٹ کی پریاں اُڑاتے ہیں۔

مَیں حیران تھا، انھوں نے ہر سوال کا جواب کس طرح سے تیار کر رکھا تھا اور لوگوں کو کس طریقے سے مطمئن کیا تھا۔ جھوٹ اپنے پراپیگنڈے میں سچ سے کہیں زیادہ متحرک اور زود اثر ہوتا ہے۔ تو کیا اُن لڑکوں کی خبر نہیں ملی؟ چودھری صاحب جیسے بندے کے لیے اُن کو ڈھونڈنا کون سا مشکل ہے؟ مَیں نے اب اپنی بات ختم کر دی اور عہد کیا، اِس کے بعد کوئی ایسا سوال نہیں کروں گا۔

میاں پہلے تو یہ ہی پکی خبر نہیں وہ لڑکے ہیں یا لڑکیاں۔ کوئی کچھ بتاتا ہے، کوئی کچھ۔ سیکڑوں یونین کونسلوں سے پیدائش کے رجسٹر نکلوا کے دیکھ لیے ہیں پر ابھی تک کوئی خبر نہیں۔ چودھری صاحب نے اُن کے باپ زبیر کی نگرانی کی ہوئی ہے جیسے ہی اُن تک پہنچے، چودھری صاحب کو خبر ہو جائے گی۔ شاید اللہ نے ڈاکٹر زبیر کو اِسی لیے زندہ رکھا ہے کہ وہ جنید کے بچوں کو چودھری طلال سے ملوانے کا سبب بن جائے۔ جتنا بھی چودھری صاحب کے اختیار میں ہے کوشش تو کر رہے ہیں باقی اللہ مالک ہے۔

ڈاکٹر زبیر کے زندہ رہنے کا سبب اور اُس کی نگرانی کا سُن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے یعنی اِنھیں میری سب خبر ہو جائے گی اور مَیں یہاں اِن کی اسٹیٹ میں دندناتا پھر رہا ہوں۔ یہ سوچتے ہی مجھ پر کپکپی طاری ہو گئی اور اب مجھے جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے رفو چکر ہو جانا چاہیے تھا۔ اتنے میں خود منشی نے کہا، اب واپس چلیں یا آگے بھی جانا ہے؟ منشی بھی شاید تھک گیا تھا۔

ہاں جی واپس چلیں، ان شاء اللہ مَیں دوبارہ آؤں گا، چودھری صاحب کب آتے ہیں ڈیرے پر؟

ہر ہفتے ایک دو دن کے لیے آتے ہیں۔ اصل میں اُنھوں نے اپنی لاہور والی کوٹھی آباد کر رکھی ہے۔ جب تک بڑے شہروں میں بڑی سرکاروں کے درمیان نہ رہا جائے سلطنت ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ اِس بات کا احساس اُنھیں ہے۔

ہم واپس ڈیرے پر آ گئے۔ یہاں کھانا تیار تھا، [illegible] کا عذر کر کے کھانا

کھانے سے انکار کر دیا اور واپس تانگے پر آ گیا۔ جس قدر بھی جلد ہو سکتا تھا اب مجھے یہاں سے نکلنا تھا۔ ورنہ مرنے میں کوئی کسر نہ رہتی۔ کوچوان میرے انتظار میں سوکھ رہا تھا۔ مَیں چھلانگ مار کر تانگے پر بیٹھ گیا اور کہا چل بابا چلیے اور بوڑھے کوچوان نے گھوڑے کو چھانٹا دکھا دیا۔ جیسے ہی مَیں پیروال پہنچا اور تانگے سے نیچے اُتر کر کوچوان کو پیسے دیے، اُس نے پیسے واپس کرتے ہوئے کہا، پُتر پیسے اپنے پاس رکھ اور ایک بات دھیان سے سُن لے۔ رہتی زندگی تک دوبارہ ٹبہ ولی بخش نہ آنا۔ سارے ٹبے پر ایک ہی خبر چل رہی ہے۔ ڈاکٹر فرح کی تفتیش کرنے والا کوئی آیا ہے۔ بابے عنایت کی یہ بات سُن کر میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہوئی اور مجھے ایک دم اتنی شدید پیاس لگی جیسے برسوں کا پیاسا ہوں۔ مَیں نے دل میں عہد کیا، اگر ابھی سلامتی سے گھر پہنچ گیا تو دوبارہ کسی طرح بھی اِس معاملے میں نہیں پڑوں گا۔ مَیں نے کوچوان سے رُخصت لی اور بظاہر لاری اڈے کی طرف گیا تا کہ وہاں سے خانیوال کے لیے بیٹھ جاؤں مگر ایک دو بازاروں کے اِدھر اُدھر دو تین چکر لگانے کے بعد پیدل ہی ایک اور طرف نکل گیا۔ مجھے خدشہ ہوا ہو سکتا ہے کوچوان نے تو مجھے معاف کر دیا ہو مگر منشی کا بندہ لاری اڈے پر بیٹھا ہو۔ مَیں نے پیدل میاں چنوں کا راستہ پکڑ لیا اور بجائے جی ٹی روڈ کے، تین میل ہٹ کر گاؤں گاؤں چلنے لگا تھا۔ یہ فاصلہ کم و بیش چالیس کلومیٹر تھا اور مَیں دو دن میں طے کر سکتا تھا۔ ایک رات چک تھری نو آر کی مسجد میں گزار کر اگلے دن شام کے وقت میاں چنوں پہنچ گیا۔ یہاں سے ایک لوکل ریل کے ذریعے اُسی رات دس بجے اپنے شہر اُتر گیا۔

(۴۳)

ڈاکٹر فرح اور اُس کی اولاد کے متعلق تمام خبریں میری والدہ اور دادی پر بہت شاق گزریں۔ کئی دن تک تو اُنھیں خموشی نے سکتہ کی سی کیفیت میں رکھا۔ اُنھیں میری زندگی بھی خطرے میں لگنے لگی۔ کئی دن تک شہر نہیں جانے دیا اور گھر سے نکلنے پر پابندی لگا دی۔ فرح اور اُس کے بیٹے کو مارنے والوں کے خلاف جتنی بددُعائیں اُنھیں یاد تھیں، دیتی رہیں مگر اِس طرح کی بددُعائیں تو شاید سارا ٹبہ ولی بخش دے رہا تھا۔ دادی اماں تو کئی دن تک ہر نماز کے بعد دشمنِ اہلِ بیت کے ساتھ ساتھ دشمنِ فرح پر بھی لعنت ملامت کرتی رہی پھر سکون میں آ گئی۔ مَیں اور میری والدہ زینت کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے۔ ہم دونوں کو غالب گمان یہی تھا اُنھیں بھی مار دیا گیا ہے ورنہ ایسی کون سی جگہ تھی جہاں سے طلال بخش جیسا ظالم اُنھیں ڈھونڈ نہ سکا تھا۔ ہمارے خیال میں اُن کی موت کو مکمل دبا دیا گیا تھا اور لوگوں میں یہ ہوائی اُڑائی تھی کہ وہ غائب ہو گئے ہیں۔ مجھے افسوس اِس بات کا تھا کہ زندگی میں ایک خواہش جو دل کی نچلی تہوں میں دبی تھی کہ زندگی کے کسی موڑ پر زینت سے ملاقات ہو گی، وہ مر چکی تھی۔ وہ جب سے جنید کے ساتھ گئی تھی، میرے دل میں سو نفرتوں کے باوجود ہلکی سی کسک اُس سے ملنے کی ابھی تک بیدار تھی۔ اب وہ مردہ ہو گئی۔ یہ ایسا سانحہ تھا جس نے میری زندگی میں بڑا نہ سہی ایک چھوٹے سے خلا سے دو چار کر دیا۔

اب مَیں اپنی طرف سے ایک ذمہ داری سے مکمل فارغ ہو گیا تھا اور میرے پاس کوئی چارہ نہیں

تھا کہ زمانے کے مزاج کے مطابق سوچنا شروع کروں۔ میرے پاس کوئی ملازمت نہیں تھی، نہ ڈھنگ کا کوئی ہنر تھا۔ میری تعلیم کی ڈگری محض ایک کاغذ کا ٹکڑا تھی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا میرے مُلک کی تعلیم، جس میں کچھ بھی سیکھنے کو موجود نہیں تھا، کا مقصد کیا تھا۔ اِس تعلیم میں انسان کو اپنی جہالت کی خبر اُس وقت ہوتی ہے جب وہ اپنی زندگی کے پندرہ بیس سال ضائع کر بیٹھتا ہے۔ اکثریت کو تو اس وقت بھی خبر نہیں ہو پاتی۔ وہ تمام عمر اُسی کی بنیاد پر اپنے آپ کو پڑھا لکھا سمجھتے ہیں۔ یہ تعلیم اُس سے کہیں کمتر تھی جو انسان اپنی مرضی سے تاریخ اور ادب کی ملی جلی کتابوں کے سہارے بے ترتیبی سے پا لیتا ہے۔ میرے پاس گریجوایشن کی ڈگری بھیک مانگنے کا لائسنس ضرور تھا۔ اُسے دکھا کر کسی دفتر میں چند روپوں کی بھیک لینے کے قابل سمجھ لیا جاتا۔ یہ مستقل اور ماہ بہ ماہ ملنے والی بھیک جسے بھکاری یا دوسرے لفظوں میں ملازم اپنی حلال کی کمائی سمجھتا ہے، مَیں بھی ہر حالت میں حاصل کرنا چاہتا تھا۔ پرائیویٹ کہیں جانے اور کام کرنے کی جگہیں اول تو بہت کم تھیں۔ اگر تھیں تو وہاں ہُنر مند افراد کے لیے بھی مشکل سے بانہیں کھلتی تھیں، مجھ جیسے بے ہُنر کے لیے تو یہ بھی نہیں تھی۔ اِس سب طرف کی مایوسی کے باوجود میرے دل میں ایک تھوڑی سی فرحت کا احساس تھا کہ ہمارے گھر میں جو کچھ عدیلہ کی امانت پڑی ہے اب اُس کا وارث میرے سوا کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ وراثت مجھے زبردستی سے نہیں قدرت کی طرف سے ملی تھی۔ اِسی خیال کے بیچ وہ کمینہ سا احساس بھی در آیا جسے ہر انسان کے مقدر کی بے محنت کا خمیازہ سمجھ لیں۔ مَیں رہ رہ کر کچھ ایسا سوچنے لگا جس کے بعد مجھے پہلے پہل تو شرمندگی گھیر لیتی تھی لیکن دو چار مہینوں بعد وہ شرمندگی ختم ہو گئی اور مَیں مسلسل اِس بارے میں تصور کرنے لگا کہ اچھا ہی ہوا زینت یا اُس کے بچے نہیں ملے۔ اب اُن کا سرمایہ میرے کام آئے گا لیکن مجھے اپنی ماں کی طرف سے خدشہ تھا کہ وہ شاید مجھے اُس رقم کو ہاتھ نہ لگانے دے لیکن اُسے سمجھانے میں حرج بھی کیا ہے۔ اب زینت کو کہاں ڈھونڈا جا سکتا تھا۔ میرے لیے بات کرنے کا موقع ہاتھ نہیں آ رہا تھا کہ امی یہ مال اب اپنا ہے اور ہمیں اِس کو استعمال کرنا چاہیے کیونکہ اُدھر میری والدہ دن رات وظائف سپارے اور آیات کا ورد کرتی جا رہی تھی کہ یا اللہ اُس کے پاس رکھی گئی امانت کو عدیلہ کے وارثوں تک پہنچانے میں اُس کی مدد کر۔ یہ ایک ایسی دعا تھی جو مجھے کوفت میں مبتلا کر دیتی تھی۔ سچ پوچھو تو اب مَیں زینت سے ملاقات کے معجزے کے لیے تو تیار ہو سکتا تھا مگر وہ سونا چاندی خرچ کرنے کے بعد جو ہمارے پاس پڑا تھا۔ اگر زینت کہیں موجود تھی تو اُس سے میری ملاقات ہونے سے پہلے اُس کی دولت سے فائدہ اُٹھا لینا چاہتا تھا۔ مَیں اُسے آسانی سے کہہ سکتا

تھا آپ ہمیں ڈھونڈنے کے باوجود نہیں ملی۔ اب اِس میں ہمارا کیا قصور تھا؟ یہ عُذر وہ خود بھی اور خدا بھی تسلیم کر لیتا کیونکہ خُدا کو معلوم تھا اُسے تلاش کرنے میں مَیں نے اپنی جان تک کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ میرے اخلاص کو پرکھنے کے لیے یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اب کچھ عرصے سے والدہ نے بھی دعائیں مانگنی کم کر دی تھیں۔

ایک دن مَیں نے اپنی ماں سے ڈرتے ہوئے پوچھ ہی لیا، امی جان اگر بالفرض جیسا کہ ہمارا خیال ہے عدیلہ کی بیٹی اور اُس کے بیٹے بھی مارے جا چکے ہیں تو یہ امانت جو تم رکھ کر بیٹھی ہو، اِسے کیا کریں گے؟

کیا مطلب ہے تمھارا؟ والدہ نے میری طرف غور سے دیکھا۔

مَیں نے جھجکتے ہوئے کہا، کیوں نہ اِسے غریبوں میں بانٹ دیا جائے۔ یہ گویا اُس دولت تک پہنچنے کے لیے مَیں نے رستہ اختیار کیا تھا۔

میری اِس بات پر وہ ہونق سی ہو گئی اور بولی ہائیں، تیرے منہ میں خاک۔ جب تک تجھے پتا ہی نہیں کہ وہ مر چکے ہیں یا زندہ ہیں تو مَیں کیسے اِس میں خیانت کروں؟ اگر خدانخواستہ اِس کے خرچ کرنے کے بعد وہ کہیں سے آ گئی تو مَیں خدا کو اپنا کیسے جہنمی منہ دکھاؤں گی۔ کبھی اُس سونے کے بارے میں دل میں خیال بھی نہ لانا۔ اُنھیں چوہے کھا جائیں تو کھا جائیں مگر وہ آگ تمھیں یا اپنے کسی بیٹے کو نہیں کھانے دوں گی۔

مجھے امی پر کافی غصہ آیا۔ یعنی جس امانت کے لیے مجھے زینت کی تلاش میں در در پھرایا، اُس کا معاوضہ مجھے کیا ملا؟ کیا میری ماں کو میرا ذرا خیال نہیں اور اُس زینت کا خیال ہے جو اُس کے بیٹے کو دھوکا دے گئی، اپنی ماں عدیلہ کو دھوکا دے گئی۔ پورے گاؤں کی عزت برباد کر گئی۔ مجھے زینت ایک دم زہر لگنے لگی۔ مَیں نے پلٹ کر اپنی ماں سے کہا، امی چوہوں کا تو مجھے پتا نہیں مگر اِس سونے کو مٹی ضرور کھا جائے گی۔ اب ایسا ہے کہ مَیں زینت کی قبر تلاش کرتا ہوں تم یہ سونا اُس کی قبر میں دفن کر دینا یا کوئی خود ہی زینت کی قبر بنا کر اُس میں دفنا دے کیونکہ وہ خود تو ملنے والی نہیں۔

ضامن مجھے تجھ سے یہ توقع نہیں تھی۔ اللہ جانے کون سا وقت تھا جس میں تو نے حرام کا لقمہ کھایا کہ تیرا خون حرام کھانے پر ضد کر رہا ہے۔ اگر تیری دادی کو اِس بات کا پتا چلا تو وہ اُسی وقت مر جائے گی اور اب تو مَیں نے وہ امانت ویسے بھی اُسی کے حوالے کر دی ہے۔ اگر تُو نے اُسے استعمال کرنا ہے تو پہلے

دادی کے مرنے کی دعا مانگ۔ یہ کہہ کر میری والدہ اُٹھ کر اندر چلی گئی اور مَیں وہیں بیٹھا رہ گیا۔

مجھے اندازہ نہیں تھا میری ماں کا ردِعمل اتنا سخت اور دوٹوک ہوگا۔ مَیں اپنا سامنہ لے کر رہ گیا۔ ابھی تو مَیں نے اُس مال کو غریبوں میں بانٹنے کی بات کی تھی اور اُس کی یہ حالت ہوئی کہ غصے سے پاگل ہونے لگی تھی۔ اگر خود استعمال کرنے کی بات کرتا تو نجانے کیسا طوفان اُٹھتا۔ یہ واحد موقع تھا جو مَیں نے اُس مال کو حاصل کرنے کے متعلق خیال کیا تھا۔ اُس کے بعد میری کبھی جرأت نہیں ہوئی کہ اُس کے بارے میں سوچوں۔ اب میرے لیے ایک ہی رستہ تھا اپنی ملازمت کے لیے کسی دروازے کو کھٹکھٹاؤں اور یہ دروازہ رضوان حیدر کا تھا۔

رضوان حیدر کمیونسٹ اور کامریڈ تھا لیکن جلد ہی محرم آنے پر مجلس اور ماتم داری میں مصروف ہو جاتا تھا۔ ایک بار تو ایسا مصروف ہوا کہ دوبارہ ہوسٹل میں نہیں آیا۔ البتہ اُسے مَیں امام بارگاہ اور سید فطرس علی کے مطب میں ملتا رہتا تھا۔ اُس کا بڑا بھائی انیس حیدر راولپنڈی کی ایک کپڑا بنانے والی فیکٹری میں اکاؤنٹ انچارج تھا۔ مجھے یقین تھا وہاں میری اچھی نبھے گی۔ مَیں اُسی دن رضوان حیدر کے ہاں گیا۔ اِس کی امام بارگاہ کے دائیں جانب اُسی کے احاطے میں دُکان تھی۔ یہ دودھ دہی اور برفی کی دُکان پورے شہر میں مشہور تھی۔ آج جمعہ کا دن تھا اور میرا ارداہ تھا جمعہ پڑھنے کے بعد رضوان سے بات کروں کہ اپنے بھائی کے نام میرے لیے سفارش کا رقعہ لکھ دے۔ مَیں نے سائیکل پکڑی اور شہر روانہ ہو گیا۔ جمعہ کی نماز ایک بجے کھڑی ہو جاتی تھی۔ وہیں حاجی سید حکیم فطرس علی سے بھی ملنے کا ارادہ تھا۔ کراچی سے آنے کے بعد کئی دن تک جیسا کہ مَیں کہہ چکا ہوں میری والدہ اور دادی نے گھر سے نہ نکلنے دیا تھا چنانچہ مَیں نے ابھی تک کراچی سے واپس آ کر سید فطرس علی کا شکریہ ادا بھی نہیں کیا تھا کہ اُن کے سبب مجھے کراچی میں نہ صرف رات کا ٹھکانا ملا بلکہ ایک شاندار انسان سے ملاقات کے ساتھ ساتھ پہلی بار اور شاید آخری بار دونا بغوں سے ملاقات بھی ہوئی اور ڈاکٹر فرح کے خاوند سے حالات کا پتا بھی چلا۔ آج جمعہ پڑھنے کے ساتھ یہ دونوں کام ہو جائیں گے۔ سچ تو یہ تھا جمعہ میرے لیے ثانوی تھا۔ اصل کام تو میری اِن سے ملاقات تھی۔ ویسے بھی مَیں اکیلا عبادت کو ثانوی حیثیت نہیں دیتا تھا۔ کم و بیش تمام نمازیوں کا قصہ یہی تھا۔ وہ عبادت کو جواز بنا کر کسی نہ کسی مالی یا جانی منفعت ہی چاہتے تھے۔ اگر مجھے رضوان اور سید فطرس علی کسی چرچ میں ملتے تو شاید مَیں امام بارگاہ کی بجائے عبادت کے لیے وہیں کا رُخ کر لیتا۔

مَیں سائیکل پر سوار شہر کی جانب بڑھ رہا تھا۔ مجھے ایک نمبر پھاٹک پر بہت سے پولیس والے ملے۔ اُنھوں نے روک لیا۔ مَیں حیران ہوا آج کیا معاملہ ہوا۔ ایک پولیس والے نے آگے بڑھ کر تلاشی لی۔ جب مجھ سے کچھ چیز برآمد نہ ہوئی تو کہا، اِدھر سے شہر میں جانے کی اجازت نہیں۔ آپ سیدھے لالہ زار جائیں اور وہاں سے چرچ بازار کے اُوپر سے نکل کر ٹھنڈی سڑک کا رستہ لیں اور شہر جائیں۔ مَیں نے کہا بھائی ہوا کیا کہ اتنی ناکابندی کر رکھی ہے اور شہر کے تمام رستوں پر پابندی کے کیا معنی۔ کہنے لگا، بھائی شہر کے حالات خراب ہیں۔

مگر کیوں؟ مَیں نے پوچھنے کے لیے اصرار کیا۔

میاں دماغ نہ کھا، جہاں سے کہا ہے اُسی رستے سے جاؤ۔ یہ کہہ کر وہ منہ دوسری طرف کر کے کھڑا ہو گیا۔

مَیں اُس کی بدتمیزی پر حیران نہیں ہوا۔ اِس طرح گفتگو کرنا اُن کی اخلاقی تربیت میں شامل تھا۔ البتہ جتنی عمر گزری تھی اِس طرح کے حالات خراب ہونا سمجھ میں نہ آئے۔ مَیں نے سنتری سے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور پھاٹک نمبر ایک سے دائیں مُڑنے کی بجائے سیدھا پرانی کچہری کا رستہ ناپ لیا اور لالہ زار کو پیچھے چھوڑ گیا۔ پرانی کچہری کے درمیان والی سڑک بہت سایہ دار ہونے کی نسبت سے مجھے بہت عزیز تھی۔ میرا اِسی پر آنا جانا زیادہ تھا لیکن مجھے آج امام بارگاہ جانا تھا تو مَیں کالج موڑ اور کمپنی باغ کی نکڑ پر جا کر سیدھا چرچ بازار کی طرف مُڑ گیا۔ یہاں سے امام بارگاہ بہت قریب تھی لیکن جیسے ہی آیا وہاں ایک اور پولیس کا ناکہ نظر آیا، یااللہ یہ کیا معاملہ ہے۔ سپاہی نے مجھے پھر روک لیا، کہنے لگا بھائی اِدھر ژکو کہاں دوڑے جاتے ہو؟

مَیں نے کہا میاں بھائی مسئلہ کیا ہے؟ ایسا ہی ایک ناکہ ایک نمبر پھاٹک پر تھا اور اب یہاں بھی ناکابندی ہے۔ اِدھر کیوں نہیں جا سکتا؟

وہ بولا یہاں سے امام بارگاہ کی طرف جانے کی پابندی ہے۔

ہائیں، بھلا کیوں پابندی ہے؟ میں نے حیرانی سے پوچھا، مَیں جمعہ پڑھنے جا رہا ہوں اور پولیس ناکے لگائے بیٹھی ہے۔

تو آپ جمعہ اِس مسجد میں پڑھ لو۔ یہ ساتھ والی عثمانی مسجد میں، وہ سختی سے بولا۔

یار آپ عجیب بات کرتے ہیں۔ اب مجھے غصہ آ گیا، مَیں جہاں جمعہ پڑھنا چاہتا ہوں وہیں

پڑھوں گا۔ آپ کون ہیں مجھے دوسری جگہ پڑھوانے والے؟

اِس لیے کہ آج امام بارگاہ کی طرف کا رستہ بند ہے۔ وہاں احتجاج ہو رہا ہے۔

کیوں احتجاج کس چیز کا ہو رہا ہے؟

پتا نہیں، کہتے ہیں زکوٰۃ نہیں دیں گے۔

سپاہی کی بات سُن کر مجھے ساری سمجھ آ گئی۔ یعنی بنکوں کے سودی نظام میں زکوٰۃ کی کٹوتی سے انکار کو عوام نے صاف یہ سمجھا تھا کہ شیعہ لوگ سرے سے زکوٰۃ ہی کا انکار کر رہے ہیں۔ تیسری دنیا اور اُن میں بھی خاص کر برصغیر کے لوگ حقائق بیان کرنے کی بجائے آسان اور مختصر بیان ہو جانے والی گفتگو کرتے ہیں۔ اُس گفتگو میں اکثر مدعا بالکل اُلٹ جاتا ہے۔ اصل میں کچھ دِنوں سے حکومت کے ساتھ شیعوں کا کئی معاملات میں اختلاف بلکہ اُسے فساد کہیے، چل رہا تھا۔ کچھ باتیں تو سمجھ میں آتی تھیں، مگر مَیں حیران تھا سب کچھ چھوڑ کر شیعہ زکوٰۃ کے معاملے پر اِتنے سیخ پا کیوں تھے؟

مَیں نے اپنے حواس بحال کیے اور کہا، دیکھو بھائی مَیں خود شیعہ ہوں اور امام بارگاہ میں جمعہ پڑھنے کی غرض سے جا رہا ہوں۔ اگر وہ اپنے کسی مطالبے کے لیے احتجاج کر رہے ہیں تو میرا وہاں جانا اور بھی واجب ہے۔ آپ براہِ کرم مجھے جانے دیجیے۔

اب سپاہی نے مجھے غور سے دیکھا اور بولا، اچھا تمھارا نام کیا ہے؟

میرا نام ضامن علی ہے۔ مَیں نے جواب دیا۔

والد کا نام؟

علی متقی ہے۔

والدہ کا نام؟

اب مجھے غصہ آ گیا لیکن مَیں جلدی سے یہاں سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا اور بولا کنیز زہرہ۔

یہ نام سُن کر اُس نے پاس کھڑے دوسرے سپاہی سے کہا، اِسے جانے دے۔ یہ بھی اُنھی میں سے لگتا ہے۔ اُس کے بعد وہ ایک طرف ہو گیا۔ مَیں نے جلدی سے دوبارہ سائیکل پر قدم رکھے اور امام بارگاہ کی طرف دوڑ لگا دی۔

امام بارگاہ کے سامنے سیکڑوں آدمی نعرے لگا رہے تھے اور حاکمِ وقت پر تبرے بھیج رہے تھے۔ دروازے کے دائیں طرف سُکھ چین اور نیم کے دونوں درختوں کے نیچے ہجوم بھرا ہوا تھا اور اُن

پر بیٹھنے والے پرندے ہوا میں چکر لگا رہے تھے کہ ہجوم غائب ہو تو شاخوں پر بیٹھیں۔ قریب گیا تو لوگوں کا ایک بڑا مجمع امام بارگاہ کے ساتھ والی گلی کے سامنے گھیرا باندھے کھڑا تھا۔ مجھے مجمع کے اکثر افراد جانتے تھے۔ مَیں اُس ہجوم کے افراد کو اِدھر اُدھر کر کے مرکز میں پہنچا تو سامنے کچھ لوگ حکیم حاجی فطرس علی کو گھیرے کھڑے تھے۔ اُنھیں جلوس کی قیادت کے لیے کہہ رہے تھے مگر وہ انکار کر رہے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ مَیں ذوالجناح کے جلوس کے علاوہ کسی جلوس میں حصہ نہیں لے سکتا۔ یہ جلوس اور اِس کا مدعا آخر کار فتنے کی شکل اختیار کر لے گا۔ مَیں بھی ایک طرف کھڑا اُنھیں دیکھتا رہا۔ شہر کے کئی رئیس شیعہ اُن سے اِس بات پر خفا بھی ہوئے جاتے تھے مگر وہ نہیں مان رہے تھے۔ خاص کر نوجوانوں نے اُن کے گرد گھیرا تنگ کیا ہوا تھا اور کسی کو نزدیک نہیں آنے دے رہے تھے۔ یہ نوجوان پہلے مَیں نے کبھی جمعہ کی ادائیگی کے لیے آتے نہیں دیکھے البتہ مجلس و ماتم میں ضرور پیش پیش ہوتے تھے۔

میرے شہر میں یہ اتنا شور شرابا اچانک اِسی بات پر کیوں پھیل گیا تھا، مجھے اِس کی نفسیاتی حقیقت کا بالکل ادراک نہیں تھا۔ مَیں تو اتنا جانتا تھا سید حکیم فطرس علی اگر اِس جلوس کی قیادت کرنے سے گریز کر رہے ہیں تو کوئی ایسی بات ہے جس کا ادراک کم از کم اِن مشتعل شیعہ نوجوانوں کو نہیں، نہ شہر کے رئیس شیعوں کو ہے۔ حاجی صاحب وہاں سے نکلنا چاہتے تھے۔ مَیں آگے نہیں جا سکتا تھا۔ اِس لیے اُن کے مکالمے سُن رہا تھا۔ میرے لیے یہ منظر ایک نہ سمجھ آنے والی بات تھی۔ حاجی فطرس علی کو مَیں خوب جانتا تھا۔ شہر کا کوئی فرد ایسا نہیں تھا جس سے حاجی فطرس کے تعلقات مذہب سے بالاتر نہ ہوں۔ اپنے حکمت خانے اور پھاٹک والے چوک کے درمیان یہ ایک ایسی دانائی تھی جسے جلوسوں سے دُور ہی رکھا جاتا تو بہتر تھا۔

(۴۴)

سید حکیم فطرس علی کو جیسے ہی نکلنے کا رستہ ملا وہ سید باقر شاہ کے مکان والی گلی سے ہو کر کھدر بازار آگئے۔ مَیں اُن کے پیچھے پیچھے تھا۔ میاں ننھا چوک کے پاس اُن کو جا لیا اور کہا حکیم صاحب آئیے سائیکل پر بیٹھ جائیے، وہ مجھے دیکھتے ہی حیران ہوئے کہ مَیں کہاں اُن کا پیچھا کرتا چلا آ رہا تھا۔ حکیم صاحب سائیکل پر بیٹھ گئے۔ آخر بڑی ردوقدح کے بعد حاجی صاحب وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ مَیں نے اپنی سائیکل غوثیہ مسجد والے چوک کی طرف کر دی اور سیدھے مطب پر چلے آئے۔ مطب پر اُن کے شاگرد بیٹھے تھے۔ کچھ مریض بھی موجود تھے۔ مَیں اُن کی کتابوں والی کُنج میں پڑے تخت پر جا بیٹھا اور ایک کتاب کھول لی۔ حاجی فطرس صاحب اپنے مریضوں کو دیکھنے لگے۔ ایک ایک کر کے اُنہوں نے دو گھنٹے میں سب مریض نپٹا دیے۔ اتنے میں سید غضنفر نقوی اور سید باقر شاہ صاحب بھی تشریف لا چکے تھے۔ مَیں خود بھی اُٹھ کر اُن کے قریب ہو گیا۔ غضنفر نقوی صاحب کو حاجی صاحب سے سخت شکایت تھی کہ اُنھوں نے جلوس سے برأت کا اظہار کیوں کیا۔ اِس سے تحریک کے ناکام ہونے کا خدشہ تھا جبکہ علاقے کے تمام نامور اور زمیندار شیعہ نے اپنے وسائل مہیا کیے ہیں۔ آپ اِس شہر میں قوم کی عزت ہیں، لوگ آپ پر اعتماد کرتے ہیں۔ اگر اِس وقت آپ قوم کو تنہا چھوڑ دیتے ہیں تو لوگ مذاق بنائیں گے اور آپ پر بھی طعنہ زنی ہو گی۔

حکیم فطرس صاحب نے سید غضنفر نقوی کی بات کو تحمل سے سُنا۔ اِس دوران اپنی معجون کی کچھ

بوتلوں پر ٹیگنگ کرتے جاتے تھے اور اُسی کے ساتھ چائے کی چسکیاں بھی لیتے جاتے تھے۔ سید غضنفر نقوی چپ ہوئے تو حکیم صاحب بہت سنجیدگی سے بولے، شاہ صاحب پہلی بات تو یہ ہے مَیں قوم کا لیڈر ہرگز نہیں ہوں۔ مَیں ایک حکیم ہوں، یہ مطب جس میں آپ آتے ہیں اور مجھ سے مل بیٹھتے ہیں، مَیں اپنی اِس چھوٹی سی دنیا کا مالک ہوں۔ مری قوم میرے وہ مریض ہیں جن کے پاس اول ہسپتال اور ڈاکٹروں کے واسطے روپے نہیں اور دوم وہ میری شکل دیکھ کر ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ مَیں یہاں سے نکل کر کہیں نہیں جانا چاہتا۔ آپ لوگ قوم کے لیڈر ہیں اِس شہر کی تحریک کے صدر ہیں۔ افسرانِ بالا سے اپنے مقامی لیڈر بن کر آپ لوگ پیش ہوتے ہیں۔ ایک عرصے سے اِس مقامی سطح پر آپ اپنا مقدمہ صحیح طریقے سے پیش کرتے ہیں اور مثبت نتائج حاصل کرتے ہیں یہی ہمارے لیے کافی ہے اور اِس کے لیے مَیں آپ کا شکر گزار ہوں، نہ صرف مَیں اِس شہر کے تمام وہ لوگ جو محرم کے دِنوں میں مشکلات کا شکار نہیں ہوتے۔ اِس کے علاوہ مَیں کہیں بھی آپ کے ساتھ کھڑا ہونے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ کیونکہ مَیں مجنونوں کی پڑیاں باندھ سکتا ہوں تلوار نہیں چلا سکتا۔ چنانچہ مجھے اِس شہر میں جلسے جلوسوں سے رہائی دیں۔ اِس شہر سے باہر تو کبھی نہیں جاؤں گا کہ مجھ میں اِن کاموں کی ہمت نہیں۔ یہ میری گلی، اِس گلی کے درخت، اِس گلی کی چائے کا ہوٹل اور یہ میرا مکان میرے بغیر اُداس ہو جاتے ہیں اور مَیں اِن کے بغیر اداس ہو جاتا ہوں۔ مجھے اِسی کائنات میں رہنے دیجیے۔

تو گویا آپ نے طے کر لیا ہے، آپ ملت سے باہر یہیں بیٹھیں گے اور قوم کی طاقت نہیں بنیں گے۔ غضنفر نقوی نے غصے سے حاجی فطرس کو طعنہ دیا۔

جی ہاں اگر آپ مجھے اپنے وجود اور اپنی ملت کی نفی کا طعنہ دیں تو مَیں اِس ناپسندیدہ گالی کو سہہ جاؤں گا مگر آپ لوگوں کے ساتھ جا کر اُس فتنے میں داخل نہیں ہوں گا جس سے باہر نکلنے کا دروازہ نہیں ہے۔ مَیں یہی دیکھ رہا ہوں۔ یہ علاقہ جسے ہم ہندو پاک کہتے ہیں چیونٹیوں کو وسیع پیمانے پر پیدا کرتا ہے۔ یہ چیونٹیاں بہت زیادہ غلہ اپنے بلوں میں جمع کر لیتی ہیں تو ہر بلا سے بے خبر ہو جاتی ہیں۔ اتنی غافل کہ پھر اُنھیں اچانک سیلاب بہا لے جاتا ہے۔ مَیں اُس سیلاب میں نہیں بہنا چاہتا۔ حاجی فطرس نے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

تو کیا ہم سب چیونٹیاں ہیں؟ سید باقر شاہ نے کہا۔

دیکھیے سید باقر کچھ چیزیں ایسی ہیں کہ مجھے اُن کے سمجھانے میں کم از کم آپ لوگوں کو ضرورت

نہیں اور نہ وقت ضائع کرنا ہے۔ آپ چیونٹیاں نہیں ہو سکتے۔ نہ آپ کو میں ایسی مثال دے سکتا ہوں مگر آپ کو لوگوں کو فنانس کرنے والے رئیس اور جاگیردار شیعہ ضرور وہ چیونٹیاں ہیں جن کے پاس بہت سا آٹا بنکوں میں جمع ہے۔ وہ اُس میں سے کچھ آپ کی جھولی میں ڈال کر اور آپ کے منہ سے تحریک کا نام دلا کر بچنت ہو کر سو جائیں گے۔ کچھ معاملات کی خبر مجھے ہے آپ شاید اُس کا احاطہ نہ کر پائیں۔

تو کیا آپ تحریک کے بانی مفتی صاحب پر بھی وہی الزام عائد کریں گے؟ باقر شاہ شدید جذباتی ہو کر بولے۔

جی نہیں مگر مفتی صاحب کو مَیں سیاسی طور پر محض ناواقف خیال کرتا ہوں۔ وہ ٹریپ ہوں رہے ہیں۔ حاجی فطرس نے منہ دوسری طرف کر کے کہا تا کہ جملے کی شدت کم ہو جائے مگر اُن کے اِس لفظ نے دونوں کو مضطرب کر دیا تھا۔ سید غضنفر نقوی صاحب اِس جملے پر ایک دم بھڑک کے بولے۔ حاجی صاحب ہمیں آپ سے یہ توقع تو ہرگز نہیں تھی کہ مفتی صاحب کے دماغ پر ہی شبہ کرنے لگے۔ آپ دیکھیے گا، یہ تحریک کامیاب ہو کے رہے گی اور ہم یہ نظام جس میں شرعی طور پر حکومت ناجائز کر رہی ہے نافذ نہیں ہونے دیں گے۔ یہ کہہ کر وہ دونوں غصے سے اُٹھ کر چلے گئے، پھر پیچھے مُڑ کر جاتے جاتے سید غضنفر شاہ نے مجھے دیکھا اور کہا، آپ چلیں گے یا آپ بھی حکیم صاحب سے بیعت ہیں۔ مَیں ایک دم اُٹھ کر کھڑا ہوا اور کہا، شاہ صاحب، مَیں آتا ہوں، آپ چلیے، آپ کے پیچھے آتا ہوں۔

وہ دونوں جب چلے گئے تو مَیں نے دیکھا حاجی فطرس علی کے چہرے پر کرب کے آثار نظر آ رہے تھے۔ وہ مسلسل اضطراب میں کبھی ایک شے کو پکڑتے اور کبھی دوسری شے کو۔ ایک دو بار اُنھوں نے بوتلوں پر غلط ٹیگنگ بھی کی پھر اُن ٹیگوں کو ہٹایا اور نئے سرے سے ٹیگ لگائے۔ مَیں کچھ دیر چُپ بیٹھا اُنھیں دیکھتا رہا۔ جب مَیں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ قرار میں آ گئے ہیں تو بولا، حاجی صاحب، آخر آپ کو جلسے اور جلوس میں جانے سے کیا چیز روک رہی ہے؟ محرم میں بھی تو آپ کے ہاتھ میں ذوالجناح کی باگ ہوتی ہے اور سارا شہر جانتا ہے آپ شیعہ ہیں۔ تو یہاں آپ غیر جانبدار کیوں رہنا چاہتے ہیں؟

دیکھو بھیا ضامن، حاجی صاحب نے اپنا منہ میری طرف کیا، اِس وقت جس صاحب کی حکومت ہے، اُس میں دو خصوصیات ایک جگہ جمع ہیں۔ وہ صرف ظالم ہی نہیں عیار بھی ہے۔ اُس نے شیعہ قوم کی طرف ایک جال پھینکا ہے اور یہ قوم اُس جال میں پھنسنے کے لیے بے چین ہے۔

مثلاً؟ مَیں نے وضاحت چاہی۔

اب وہ پوری طرح میری طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ مجھے ایک بات بتائیے، اِس مُلک کے جتنے شیعہ سرمایہ دار اور جاگیردار ہیں وہی کیوں اپنے وسائل استعمال کر رہے ہیں؟ اسلام آباد پہنچنے کے لیے لاریاں اور خرچہ بھیج رہے ہیں اور اِس تحریک کا ساتھ دینے پر اِس قدر زور دے رہے ہیں جیسے اُن پر قیامت آ گئی ہو؟ حالانکہ یہ اُمرا و اشرافیہ کبھی محرم کے جلوس میں نہیں دیکھے جاتے، کسی بھی وقت قوم پر کوئی ابتلا نظر آئے، یہ غائب ہوتے ہیں۔ قوم بھوکی مر رہی ہو اِن کی تجوریاں نہیں کھلتیں۔ پھر آخر اِس زکوٰۃ کے مسئلے پر ہی یہ کیوں باولے ہو گئے ہیں اور جعفری شریعت کو بچانے نکل کھڑے ہوئے ہیں؟ ان غریب بچوں کو اور جوانوں کو اپنے پیچھے لگا لیا ہے جن کی مدتوں سے ایک پھوٹی کوڑی بینک میں نہیں ہے۔ نہ کبھی زندگی بھر اُن کے اتنے پیسے بینک میں ہوں گے جتنے پر زکوٰۃ کٹتی ہے۔ بھلا پوچھیے تو یہ لوگ اتنے ہی دیندار ہیں تو اپنا پیسہ بنکوں میں سال بھر کیسے رکھے رکھتے ہیں کہ اُن پر زکوٰۃ کٹ جائے۔ وہ پیسہ تو اپنی قوم کے غریبوں کے حالات درست کرنے میں خرچ ہونا چاہیے۔ آپ ضامن ہیں۔ کتنے عرصے سے بے روزگار ہیں؟ مَیں نے خود آپ کو نہیں بتایا، خموشی سے یہاں کے کئی جاگیردار شیعہ حضرات سے اپیل کی کہ وہ ضلعی سطح پر اپنی دولت سے پڑھے لکھے شیعہ نوجوانوں کے لیے کوئی ادارہ قائم کریں مگر کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ میاں ضامن یہ لوگ ہمیں یعنی ہم سادہ لوح عوام کو استعمال کرتے ہیں۔

مَیں حاجی فطرس علی کی بات پر حیران رہ گیا۔ اِس طرف تو کبھی میرا دھیان نہ گیا تھا۔ مَیں نے کہا تو کیا مفتی صاحب کو بھی اِس بات کا اندازہ نہیں ہے کہ اِس مُلک کی اشرافیہ اُنھیں استعمال کر رہی ہے؟

جی ہاں یہ ضروری نہیں کہ ایک مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرنے والا مخلص آدمی سیاسی طور پر بھی اتنا ہی باشعور اور بالغ ہو جتنا مذہبی علوم اور قواعد میں وہ باشعور ہوتا ہے۔ مفتی صاحب کا مسئلہ یہ ہے وہ اپنے اخلاص کو تمام قوم کے اخلاص پر منطبق کر لیتے ہیں۔ وہ بلاشبہ علمی فوقیت کے باعث پوری قوم میں عزت اور وقار رکھتے ہیں اور یہ بات ہمارے مذہب کی اشرافیہ جانتی ہے۔

لیکن اِس میں تو ہماری اشرافیہ نے جال بُنا ہے؟ آپ حکومت کا نام کیسے لے رہے ہیں کہ اُس نے جال بُنا ہے؟ مَیں اپنی وضاحت چاہتا تھا۔

حکومت اِس وقت شیعہ قوم کو سُنّی قوم سے الگ کرنا چاہتی ہے۔ وہ ملک میں دو طبقوں کی الگ الگ حیثیت واضح کر کے یہاں فرقہ وارانہ کھیل جاری کرے گی۔ عام سُنّی اور شیعہ لوگ اپنے رسم و رواج

اور میل جول اور ثقافت میں ابھی تک تو ایک ہی قوم ہیں۔ اُن کے علما کے درمیان پھیلے ہوئے صدیوں کے اختلافات کا نہ تو عام شیعہ عوام کو ادراک ہے نہ عام سُنّی عوام کو۔ وہ بالکل لاعلم ہیں اور یہ جہالت اِس وقت یہاں نعمت ہے۔ اگر شیعہ زعما آج عام شیعہ لوگوں کو بہکا کر دارلحکومت میں اجتماع کر لیتے ہیں اور بالفرض اپنا مطالبہ بھی منوا لیتے ہیں تو اِس وقت کا صدر سُنّی قوم کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو جائے گا کہ دیکھو، یہ شیعہ کتنے طاقتور ہیں۔ وہ تم سے الگ ہیں۔ ایک دن تمھارے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔ چنانچہ اِن کو کچلنے کے لیے سب سُنّی ایک ہو جاؤ۔ یہی اُس کی کامیابی ہے۔ جسے ہماری اشرافیہ بھی نہیں سمجھتی۔ وہ اپنے معمولی فائدے کے لیے پوری قوم کو ایک بڑی قربانی دینے کے لیے آگے دھکیل دیں گے۔ مَیں یہ نہیں کہتا، شیعہ اشرافیہ اپنی قوم کا قتل چاہتے ہیں مگر وہ اپنی معصومیت اور تھوڑے فائدے کے لیے پوری قوم کو رسک میں ڈال رہے ہیں۔

اگر آپ کی بات مان لی جائے تو پھر دنیا کی کوئی قوم کسی طرح کی تحریک پیدا نہیں کر سکتی۔ کیونکہ اِس طرح کے رسک تو ہر تحریک میں موجود ہوتے ہیں۔ پھر خاموشی سے ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھنے کے سوا چارہ نہیں ہے۔ کسی انقلاب کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔

یہ بات تو مَیں نے نہیں کی کہ تحریک اور انقلاب کی کوشش نہیں کرنا چاہیے، ضرور کرنا چاہیے مگر تحریک اور انقلاب کیا صرف ہجوم اکٹھا کرنے اور تلوار کو رنگین کرنے سے آتا ہے؟ مَیں ایسے کسی انقلاب کو نہیں مانتا جس میں کسی ایک بھی معصوم کی جان بے سبب ماری جائے۔

آپ امام حُسین علیہ السلام کے خروج کو کیا کہیں گے؟ یہ میرا سوال تلخ تھا مگر مجھے کرنا تھا، چاہے اس میں حکیم صاحب ناراض ہی کیوں نہ ہوں۔

میاں وہ خروج کہاں تھا۔ وہ تو طاغوت نے امام کو اپنی اطاعت کی شرط پر زندہ رہنے کے لیے مجبور کیا تھا، جسے امام نے تسلیم نہیں کیا۔ یہ بات اُن کے لیے خروج پر دلالت کرتی ہے؟ امام اور انبیا کا کام خروج کرنا ہرگز نہیں ہے۔ اُن کا کام صرف عدل اور اخلاقی قوانین کی طرف رہنمائی کرنا اور ہدایت دینا ہے، جو انسان کو فلاح کی طرف لے جائے۔ خروج امام کو زیب ہی نہیں کیونکہ دین میں جبر نہیں، ہدایت میں جبر نہیں۔ اِس میں اگر کوئی اُن سے ہدایت نہیں لیتا تو امام اُس کے پیچھے تلوار لے کر نہیں پڑتے نہ اُسے ہدایت دینے کے پابند ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے اِس راہ میں کوئی ظالم اُنھیں اُن کے کام سے جبراً روکے تو ظالم کا حکم مان کر خاموش ہو جانا امام کے لیے ہرگز جائز نہیں۔ پھر اس کے نتیجے میں اُن

کی جان چلی جائے تو چلی جائے۔ ورنہ امام پر طاغوت کی اطاعت کا الزام آئے گا اور طاغوت کی اطاعت امام کے لیے کفر ہے۔ اِسے آپ لوگوں نے امام کا خروج سمجھ لیا۔ اگر اُن کے لیے ہر حالت میں خروج جائز ہوتا تو سب سے پہلے ہمارا پہلا امام خروج کرتا، پھر دوسرا امام خروج کرتا اور اس طرح ہمارے بارہ کے بارہ امام خروج کرتے۔ بھیا اُن کا کام خروج تھا ہی نہیں۔ اگر امام علیؑ کے دور کے حاکموں کی طرح امام حسینؑ کے وقت کا حاکم بھی امام کو بیعت کے لیے مجبور نہ کرتا، اُنھیں اُن کے حال پر چھوڑ دیتا تو یقیناً امام حسینؑ شہید نہ ہوتے۔ وہ اُسی طرح اپنی ہدایت کا کام جاری رکھتے جیسے ہمارے ماسبق اور مابعد آئمہ نے جاری رکھا۔ مسئلہ تب پیدا ہوا جب یزید نے امام کو بیعت کی شرط پر زندہ رہنے کا فرمان جاری کیا۔

تو آپ کے خیال میں انقلاب کی کہیں بھی اور کسی بھی خطے میں ضرورت نہیں ہے۔ یعنی حالیہ ایران کے انقلاب کو بھی ہم انقلاب نہیں بلکہ اشرافیہ اور وہاں کے آیت اللہ حضرات کا باہمی گٹھ جوڑ کہیں گے؟

جی نہیں وہاں اشرافیہ سے حکومت حاصل کرنے کے لیے ملاؤں اور مارکسیوں کا گٹھ جوڑ تھا۔ اِس میں بھی عوام اُسی طرح ایندھن بنے ہیں جیسے دنیا میں اِس طرح کے پہلے انقلابات میں بنتے آئے ہیں۔ کیا آپ جانتے ہیں، اِس انقلاب میں بھی نوجوان سب سے پہلے آگ کا جھونکا بنے؟ مَیں اُن کی زندگیوں کو اِس انقلاب سے زیادہ عزیز سمجھتا ہوں۔

اگر آپ کے یہ خیالات ہیں کہ کوئی تحریک اور کوئی انقلاب معنی نہیں رکھتا تو آپ ذوالجناح کی باگ کیوں پکڑتے ہیں؟

اِس لیے کہ مَیں سمجھتا ہوں میرا مظلوم امام راہِ عدل میں بے گناہ شہید کر دیا گیا حالانکہ اُس نے اعلان کیا تھا کہ اُس نے نہ کسی بے گناہ کا خون بہایا ہے، نہ دین سے پھرا ہے اور نہ کسی کا حق اُس کی گردن پر ہے۔ اب اگر اُس مظلوم امام کے حق میں آواز دینے پر یا اُس کے ناحق قتل کی گواہی دینے پر میرا خون کر دیا جائے تو مجھے قبول ہے لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ مَیں جعفری شریعت کی حفاظت کے نام پر اشرافیہ کے پیسوں کی رکھوالی پر بیٹھ جاؤں اور اُن کے معاشی نظام کی حفاظت کا ذمہ لے لوں جبکہ مَیں دیکھتا ہوں اُن میں سے اکثر نے اپنی دولت ظلم اور حق تلفی میں جمع کر رکھی ہے۔ کیا میرے امام نے زندگی میں اتنا مال جمع کیا ہے کہ اُس کی زکوٰۃ نکلی ہو؟ اگر یہ امام کے سچے پیروکار ہیں تو اِن کی زکوٰۃ ہی کیوں نکلی۔

آپ کے خیال میں انقلاب اور تحریک کے کچھ معنی بھی ہیں یا یہ دونوں الفاظ بے معنی ہیں؟
جی ہاں، میرے نزدیک اِن الفاظ کے معنی اصطلاحی نہیں لغوی ہیں۔ تحریک سے میری مراد متحرک ہونا، یعنی اپنے لیے اور اپنے اہل کے لیے علم، پاک معاش اور اخلاقی طور پر فعال ہونا ہے۔ یہی معنی انقلاب سے مَیں اخذ کرتا ہوں کہ اپنی ذات میں انقلاب لانا، اپنے اردگرد میں اپنی بساط کے مطابق چیزوں کو منقلب کرنا۔ اِس شہر میں کتنے نوجوان شیعہ ہیں جو اِس وقت زکوٰۃ کے مسئلہ پر نعرہ زنی کر رہے ہیں مگر اُنھوں نے کتاب کے نام پر ایک قاعدہ بھی نہیں پڑھا اور اپنے اردگرد دھوپ کو چھاؤں میں منقلب کرنے کے لیے ایک پودا بھی نہیں لگایا۔ کیا کتاب کو رواج دینا یا درخت لگانا انقلاب اور تحریک نہیں ہیں؟ مگر یہ کہ ایسے کاموں کے لیے نعرے دلچسپ اور خون کو گرما دینے والے نہیں ہیں۔ نہ اِس طرح کے انقلابات کے لیے اشرافیہ کے وسائل خرچ ہوں گے۔ نہ ان کے لیے گونا گوں نعرے ایجاد ہوں گے۔

حاجی صاحب مجھے حیرت ہے، آپ سب کچھ سے انکار کر رہے ہیں۔ اگر قومیں اپنے جذبات کو سینے میں جگہ نہ دیں تو نابود ہو جائیں۔ اُن کی پہچان ختم ہو جائے۔

ارے میاں کس چاند کی باتیں کرتے ہو۔ قوم نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ ایک طرف تم پوری انسانیت کو ایک بتاتے ہو پھر قوم قوم کی مالا جپتے ہو۔ جذباتی ہو کر جنگ و جدل اور نیزہ بازی کرنے والوں کا آج نشان کہاں ہے؟ ایسی قومیں تو خبریں نہیں بن سکتیں۔ قومیں کتاب اور علم سے بنتی ہیں۔ یہی کچھ نظریہ آپ کے اُن کامریڈ دوستوں کا ہے جنھیں مزدوروں اور کسانوں کے حقوق کا رہ رہ کر غم کھائے جاتا ہے۔ یہ ملوں اور فیکٹریوں میں برابر کا حصہ چاہتے ہیں مگر کبھی یہ نہیں کہیں گے مزدور مزدور ہی کیوں ہے؟ وہ مزدور سے اُوپر اُٹھ کر ایسا دانشور کیوں نہیں بنتا جسے اپنے حقوق اور فرائض کا خود پتا ہو؟ اُسے یہ بتانے سے کہ آپ فیکٹری پر قبضہ کر لو، یہ کیوں نہیں کہا جاتا اپنی آزاد معیشت کے لیے ایسے ذرائع اور ہنر ڈھونڈو جس میں اُس کے اپنے حقوق کا خود بخود تحفظ ہو۔ اگر ایک سے چھین کر دوسرے کی طرف پھیرو گے تو آپ کے پاس کیا دلیل ہے کہ جس کو دو گے وہ اُسے ناجائز استعمال نہیں کرے گا۔ تم کہاں تک اُس نظام کو برقرار رکھ سکو گے؟ مَیں اِس کے طویل جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتا کہ یہ ایک دو جملوں میں حل ہونے والے مسائل نہیں ہیں مگر ایک بات ضرور کہوں گا، دنیا کے ہر نظام میں اخلاص موجود ہے مگر اُس نظام میں موجود افراد نام و نمود اور اقتدار کی قربت چاہتے ہیں۔ یہ بات ہر انسان کو اُس کے اصل سے

گمراہ کرنے کے لیے کافی ہے۔

آپ مجھے ہمارے آج کے اِس جلوس کی مثال دے کر سمجھائیے۔ مَیں نے گویا حاجی فطرس علی کو ایسی مشکل میں ڈال دیا جس میں کم از کم یہاں اُنھیں جذباتیت تو مل سکتی تھی مگر وہ ثانی الذکر الزام نہیں دے سکتے تھے۔

مَیں آپ کو کسی مثال سے نہیں سمجھا سکتا۔ آپ ایک کام کیجیے، ہماری اِس شہر کی عزاداری کی انجمن میں جتنے افراد ہیں، اُن کے ڈرائنگ روموں میں چلے جائیے۔ آپ کو اُن کی دیواروں پر اخباروں کے تراشے سجے نظر آئیں گے جن میں اِن کا کوئی فوٹو لگا ہو یا نام ہی لکھا ہو گا اور یہ تخصیص نہیں، نیکوکار و بے نماز سب کی یہی حالت ہے۔ چاہے وہ اخبار اِسی شہر کے محلے کا ہی کیوں نہ ہو۔ کیا یہ عزاداری اخباروں کے تراشے اکٹھے کرنے کے واسطے کرتے ہیں؟ یہ ایک مثال ہے کسی بھی سیاسی، مذہبی اور نظریاتی تحریک کو سمجھنے کے لیے۔ جسے آپ تحریک کہتے ہیں اُس میں موجود سب سرکردہ و گمنام افراد کی یہی حالت ہے۔

باتیں بہت دلچسپ چل رہی تھیں کہ اتنے میں حاجی فطرس صاحب کی عصر کی چائے اور اُس کے ساتھ قلاقند آ گئی۔ چائے ایک بڑی کشتی میں لگ کر آئی تھی۔ اِس وقت ہم دونوں ہی بیٹھے تھے۔ حاجی صاحب نے مسکرا کر کہا، ضامن بھیا آج آپ نے دماغ بہت کھالیا، اب لیجیے قلاقند کھائیے اور ساری کھائیے کہ اِس وقت آپ کے مقدر کی خوبی کے سبب کوئی اور کھانے والا موجود نہیں۔

مَیں حاجی صاحب کی بات پر ہنس دیا اور چائے کے ساتھ قلاقند اُٹھالی اور کہا شاہ صاحب یہ تو خیر مَیں نے آج بہت بدتمیزی کی آپ کے ساتھ جبکہ کراچی والی سب باتیں بتانے کی بیچ ہی میں رہ گئیں۔ اُن کے علاوہ ایک اور بھی کام تھا لیکن پہلے کراچی کا قصہ سُن لیجیے کہ اول تو آپ کی عنایت سے وہاں ہر طرح کا آرام رہا۔ اُس کے بعد مَیں نے حاجی صاحب کو سب کہانی کہہ دی جسے وہ بہت تحمل سے سنتے رہے۔

تو اب کیا ارادہ ہے؟ حاجی فطرس علی نے متفکر انداز میں پوچھا۔

اب کچھ بھی کہوں، آپ کوئی نہ کوئی قدنکالیں گے۔ کسی کام پر لگنا چاہتا ہوں، والد صاحب پچھلے کئی مہینوں سے یوں تو منہ سے کچھ نہیں کہتے مگر اُنھیں میری معاش کی فکر لاحق ہے۔

اب میری طرف کوئی حکم نکلتا ہو تو کہو۔

جی ضرور کہوں گا۔ فی الحال رضوان حیدر سے اِس بابت بات کی جاسکتی ہے۔ اُس کا بڑا بھائی کسی بڑی فیکٹری میں اکاؤنٹ انچارج ہے۔ اگر یہ اُس کے نام کا رقعہ دے تو بہتر ہوگا۔

ہاں بھیا وہ ضرور کچھ کر گزرے گا لیکن دیکھو، ایک بات سمجھا دوں، یہ فیکٹریاں دماغ سے نہیں ہاتھوں سے چلتی ہیں۔ جاؤ ضرور مگر دیکھ لیجیے، کام میں دل نہ لگے تو چھوڑنے میں دیر مت کیجیے گا ورنہ سب عمر برباد ہو جائے گی۔ ذلت دو طرح کے انسان بہت اُٹھاتے ہیں اور تمام عمر اٹھاتے ہیں۔ ایک ناپسندیدہ بیوی والا، دوسرا ناپسندیدہ نوکری والا۔

یہ کہتے ہی حاجی فطرس علی نے اپنے ایک شاگرد کو آواز دی، وے لمڈے جاؤ ذری دیر کو رضوان حیدر کو بلا لائیو۔ اُس نے سردل اور ودان وہیں پھینکا اور رضوان کو بلانے نکل بھاگا۔ اِدھر مَیں اُٹھا اور کہا اِتنے میں حبیب علی سے مل لوں۔

(۴۵)

اکتوبر کے ابتدائی دن تھے۔ شام کا دھندلکا گہرا ہو رہا تھا۔ سورج ڈوبنے کے قریب تھا۔ مَیں خیبر میل سے اُتر کر سامنے والی سڑک پر چلنے لگا۔ مَیں پہلے کبھی اِس شہر میں نہیں آیا تھا۔ پنڈی میرے لیے بالکل نیا شہر تھا۔ یہاں میرے پاس رہنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ صرف میری جیب میں رضوان حیدر اور حاجی فطرس علی کے دو خط انیس حیدر کے نام تھے۔ مَیں نے بغیر کسی شخص سے پوچھے سامنے والی چوڑی سڑک پر چلنا شروع کر دیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا مِل کس جگہ واقع ہے اور اسٹیشن سے کتنا فاصلہ ہے۔ مَیں بس اتنا جانتا تھا، وہ راولپنڈی میں ہے اور مجھے وہاں جا کر کام ڈھونڈنا ہے۔ راولپنڈی میں فوکسی ٹیکسیاں اور سوزوکیاں اور ویگنیں سواری کے لیے اِکا دُکا چل رہی تھیں۔ مَیں ٹیکسی پر تو کسی صورت سفر نہیں کر سکتا تھا کہ میری جیب سے بھاری تھی البتہ ٹرالی نما سوزوکی پر ضرور بیٹھتا لیکن اُس سے پہلے مجھے فیکٹری کا پتا پوچھنا تھا۔ ہمیشہ میری مصیبت یہ رہی ہے کہ مَیں کسی جگہ کا پتا پوچھتے ہوئے کافی دیر لگا دیتا ہوں۔ یہاں بھی یہی ہوا۔ مَیں دل میں خیال کرتے ہوئے کہ کس شخص سے پتا معلوم کروں، دو میل سیدھا چلتا گیا۔ پھر ایک جگہ رُک گیا۔ مجھے بالکل خبر نہیں تھی اِس شہر کے دائیں بائیں کیا جگہیں ہیں اور کون کون سی عمارتیں ہیں۔ کبھی ٹھہر جاتا تھا، کبھی چل پڑتا تھا۔ ایک جگہ سڑک پر ٹریفک کافی تھی۔ سوزوکی والے نے میرے پاس رُکتے ہوئے پوچھا، کہاں جانا ہے؟ مَیں نے اُسے پتا بتایا، اُس نے بٹھا لیا اور ایک روپیہ کرایہ لیا اور آدھ گھنٹے بعد ایک چوک میں اُتار دیا۔ سوزوکی والوں کی زبان عجیب لگ رہی تھی

اور کچھ سمجھ نہیں آیا، کیا گڑبڑی مار کر چلا گیا ہے۔ اب شام کو رات نے آغوش میں لے لیا تھا۔ اِدھر مَیں ایک بڑے چوک میں کھڑا تھا۔ اِس کے ارد گرد کسی فیکٹری کا نشان نہیں تھا۔ دُور کچھ مکانات نظر آ رہے تھے۔ اُس نے مجھے ایسی جگہ اُتارا تھا جہاں فیکٹری کو رستہ تو جاتا تھا مگر فیکٹری وہاں موجود نہیں تھی۔ دُور سے ایک آدمی چلتا ہوا قریب آ رہا تھا۔ یہ شخص شکل وصورت میں وجیہہ مگر اپنے کے لحاظ سے بہت کم تر تھا۔ مَیں نے تھوڑی دیر اُس شخص کا انتظار کیا کہ قریب آئے تو اُس سے پتا پوچھ کر آگے چلا جائے۔ وہ قریب آیا۔ مَیں نے اُسے روکنے کی کوشش کی تو مجھے گالیاں دینے لگا اور اُسی طرح گالیاں دیتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ یہ ایک نہایت عجیب بات تھی۔ اتنے میں ایک دوسرا شخص قریب آ گیا۔ مَیں نے اُس سے سابقہ شخص کی شکایت کی تو اُس نے کہا میاں یہ ریٹائرڈ افسر ہے۔ اِدھر قریب ہی رہتا ہے۔ اِسے کوئی کام کہہ دے یا کسی جگہ کا پتا پوچھ لے تو اُسے اپنی ہتک سمجھتا ہے اور بے دریغ گالیاں دینے لگتا ہے۔ اب لوگ مذاق سے بھی پوچھنے لگے ہیں اور یہ اُنھیں گالیاں دیتا ہے۔ یہ پاگل ہو چکا ہے۔ مجھے اِس بات پر تعجب نہیں ہوا۔ میرے ایک افسر ماموں کی بھی یہی حالت تھی بلکہ ہمارے ہاں کے تمام معززین کی یہی صورت ہے۔ اب اُس نے پتا بتاتے ہوئے کہا، جہاں آپ کھڑے ہیں یہاں سے فیکٹری کم سے کم تین کلومیٹر ہے۔ اگر ناک کی سیدھ میں چلے جائیں تو سڑک کے دائیں ہاتھ اُس کی دیوار آ جائے گی۔ پہلے فیکٹری کی کالونی آئے گی اُس کے بعد فیکٹری کا گیٹ آئے گا اور اگر آدھ گھنٹا انتظار کر لیں تو شاید اُدھر جانے والی سوزوکی مل جائے۔ میرا خیال ہے آپ پیدل ہی چلے جائیں۔ وقت اور پیسوں کی بچت ہو گی۔ ابھی آپ جوان ہیں۔ سُنا ہے یورپی لوگ مسافر کو صرف رستہ بتاتے ہیں، مشورہ نہیں دیتے مگر یہاں مشورے کے بغیر رستہ نہیں بتاتے۔ مَیں جوان تو تھا مگر ٹانگیں لکڑی کی نہیں لگا کر لایا تھا۔

آسمان پر بادل بہت گہرے چلے آئے تھے۔ رخصت ہونے والی گرمی کے دن تھے۔ بارش اور ہوا کے سبب خنکی پھیل جاتی تھی۔ میرے کاندھوں پر ایک کالے رنگ کی چادر تھی۔ یہ چادر میرا واحد سرمایہ تھا جو ہلکی بارش اور رات کی سردی سے بچانے کے کام آ سکتی تھی۔ میرا منہ مغرب کی طرف تھا۔ مَیں کافی دیر چلتا رہا۔ اردگرد ویران علاقے اور چھوٹی چھوٹی کئی بستیاں آئیں مگر فیکٹری آنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ مَیں نے کئی لوگوں سے پوچھا وہ یہی کہتے بس تھوڑی دُور اور آگے جاؤ گے تو فیکٹری آ جائے گی۔ بالآخر دو گھنٹے کی مسافت کے بعد وہاں پہنچا تو رات کے دس بج چکے تھے اور فیکٹری کا گیٹ بند

تھا۔ ایک چوکیدار اُس کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اُس نے مجھے قریب تو آنے دیا لیکن جب میں نے اُسے انیس حیدر کی بابت پوچھا تو وہ اُس سے مکمل بے خبر تھا۔ کہنے لگا، کل آئیے گا۔ اب میں یہ رات کہاں بسر کرتا، اِس بابت مجھے کچھ پتا نہیں تھا۔ اردگرد نہ کوئی سرائے، نہ شب بسری کے لیے ٹھکانا اور نہ دوست تھا۔ آٹھ گھنٹے رات پڑی تھی۔ یہاں کی رات وسطی پنجاب سے کہیں سرد تھی۔ آخر ایک طرف منہ کر کے چل پڑا۔ آدھا گھنٹا اِدھر اُدھر بے کار چہل قدمی کرتا رہا۔ ایک جگہ پہنچا تو ایک کچی کوٹھڑی سی نظر آئی۔ سامنے ایک ریڑھی کھڑی تھی۔ نزدیک جانے پر کھلا کہ کوٹھڑی کی چھت تو تھی مگر دروازہ نہیں تھا۔ پاس ہی ایک دوسری کوٹھڑی بھی تھی۔ مَیں نے اُس طرف جا کر دیکھا تو یہاں دوسرا منظر تھا کہ دروازہ تھا لیکن چھت نہیں تھی۔ یہ عجیب طرح کا کمبی نیشن تھا۔ مَیں واپس اُسی چھت والی کوٹھڑی کے پاس آ گیا اور بارش سے بچنے کے لیے کوٹھڑی میں گھس گیا۔ اِس میں ایک بات کا ڈر مجھے ضرور تھا کہ ویران کوٹھڑی کے اندر سانپ یا دوسری مضر شے موجود نہ ہو۔ مَیں نے کبھی سگریٹ نہیں پی تھی۔ اِسی وجہ سے اپنے پاس کبھی ماچس بھی نہ رکھی تھی۔ اب یہاں میرے پاس روشنی کے لیے کوئی شے نہیں تھی۔ مَیں کوٹھڑی کے اندر داخل ہو کر تھوڑی دیر دیوار کے ساتھ سکڑ کر کھڑا ہو گیا مگر کب تک؟ ٹانگیں جواب دینے لگیں اور ابھی رات بہت بھاری تھی۔ البتہ کوٹھڑی میں آنے سے میرے جسم کو ہلکی سی حرارت ضرور پہنچی۔ یہ اچھی بات تھی۔ تھوڑی دیر میں کوٹھڑی کے اندر کا ماحول مجھ پر کھلنے لگا۔ یہاں دیوار کے ساتھ لگ کر ایک کتا لیٹا تھا۔ اِس سے صاف ظاہر تھا کہ اب میں یہاں کسی صورت لیٹ نہیں سکتا۔ ویسے بھی کچی زمین پر لیٹنے سے کپڑوں کی تباہی ہو جاتی۔ اُسی لمحے ایک خیال دماغ میں کوندا۔ مَیں نے سوچا یہ ریڑھی کس کام آئے گی۔ باہر نکلا اور ریڑھی کو کھینچ کر کوٹھڑی کے اندر کر لیا۔ اپنی چادر سے اُس کو ایسے جھاڑا کہ چادر کو بھی مٹی کم سے کم لگے۔ پھر اُس پر چڑھ کر لیٹ گیا۔ بھوک نے بہت ستا رکھا تھا۔ آدھی رات تک نیند نہیں آئی مگر رات کے دو بجے ایسے سویا کہ پھر صبح آٹھ بجے آنکھ کھلی۔ دیکھا تو وہی کتا میری بغل میں لیٹا تھا۔ اُس میں سے بدبو بھی آ رہی تھی، بدبو پر تھوڑا غور کیا تو کتے کو ڈانٹا مگر وہ اپنی جگہ ہی لیٹا رہا، بس ذرا سا کسمسایا ضرور۔ مَیں حیران کہ یہ کیسا کتا ہے جسے مَیں خواب کی حالت میں تکیہ سمجھ کر ساتھ چپکائے رہا۔ دیکھا تو اُسے کیڑے پڑے ہوئے تھے۔ اب مجھے قے آنے لگی، کراہت سے میری بُری حالت ہو گئی۔ خدا جانے یہ ریڑھی پر کیسے چڑھا تھا اور میرے ساتھ چپک کر سو گیا تھا۔ کُتا ایک عرصے سے تنہائی کا شکار تھا۔ جسم میں کیڑے پڑنے کے سبب اُس کے ہم جنسوں نے اُسے اپنے سے دھتکار کر دُور کر دیا تھا۔ یہ

سوچ کر مَیں ایک دم کانپ گیا۔ فطرت کس قدر ظالم اور سرد مہر ہوسکتی ہے۔ اب چاروں طرف روشنی ہو رہی تھی۔ مَیں ریڑھی سے نیچے اُترا اور جلدی سے باہر نکل کر پانی ڈھونڈنے لگا مگر نزدیک پانی نظر نہیں آرہا تھا چنانچہ اُسی راستے پر چل پڑا جس سے یہاں پہنچا تھا۔ دس پندرہ منٹ چلا ہوں گا کہ مجھے کتے کے خیال نے ایک دوسری طرف سے دبوچ لیا۔ پتا نہیں کب سے بھوک اور پیاس سے بے حال تھا اور سکڑ کر ہڈیوں کا پنجر ہوگیا تھا۔ مَیں کبھی چلتا، کبھی ٹھہر جاتا۔ آخر ایک ہی دم واپس ہوگیا۔ کچھ ہی قدموں پر ایک ریڑھی کھڑی تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا اڈہ تھا۔ مَیں نے اُس نان چنے والی ریڑھی سے چار نان خریدے اور واپس ہوگیا مگر اُس جگہ اب وہ کتا نہیں تھا۔ کافی دیر اِدھر اُدھر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملا۔ مَیں نے نان وہیں پھینکے اور دوبارہ واپس ہوگیا اور فیکٹری کے دروازے پر پہنچ گیا ہاں البتہ ایک جگہ پانی کے نل پر اپنے آپ کو اچھی طرح سے صاف کرلیا تھا۔ مَیں کم سے کم دو کلومیٹر فیکٹری سے دُور نکل آیا تھا۔

فیکٹری کا لوہے کا گیٹ قلعے کی مانند بہت بڑا اور ہیبت ناک تھا۔ اُس میں سے کئی ٹرک باہر نکل رہے تھے اور کئی اندر داخل ہورہے تھے۔ مَیں نے گیٹ والے کو انیس حیدر کا نام بتایا۔ اُس نے میرا نام پتا ایک رجسٹر پر درج کیا اور انیس حیدر کے دفتر کا پتا بتانے کی بجائے ساتھ چل پڑا۔ مَیں اُس کے پیچھے ہولیا۔ یہ آدمی آگے آگے چلتا جاتا تھا۔ مختلف راہداریوں پر کبھی ایک گراؤنڈ کو عبور کرتا کبھی دوسرے کو۔ مَیں حیران تھا انیس حیدر کا آفس گیٹ سے آدھے کلومیٹر دُور تھا۔ یہ ایک وسیع اور خوبصورت لان کے درمیان تھا۔ کیاریوں میں رکھے ہوئے زرد، سُرخ اور قرمزی گیندے کے پھول دُھوپ میں بہت چمک رہے تھے۔ کہیں گلابوں کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ چاروں طرف شہتوتوں کے پودے تھے۔ پودے زیادہ نہیں تھے مگر ہرے بھرے بہت تھے۔ آخر وہ آدمی ایک آفس میں داخل ہوگیا جسے سفید قلعی سے خوب انڈا کیا گیا تھا۔ انیس حیدر کا آفس تین کمروں پر مشتمل تھا۔ مجھے باہر ڈیسک پر بٹھا کر وہ آدمی اندر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد باہر آکر مجھے اندر جانے کے لیے کہا۔ خود گیٹ کی طرف واپس چلا گیا۔ مَیں نے پہلے کمرے میں داخل ہوکر وہاں بیٹھے اپنی ہی عمر کے لڑکے سے کہا، انیس صاحب کو میرا یہ رقعہ پہنچا دیجیے۔ اُس نے مجھے دیکھ کر کہا آپ کا رقعہ اندر پہنچ گیا ہے۔ تھوڑی دیر بیٹھیے وہ بلا لیں گے لیکن چند لمحوں بعد اُسے خدا جانے کیا خیال آیا، مجھ سے رقعہ لے لیا اور اُٹھ کر اندر چلا گیا۔ پھر کچھ ہی دقت میں انیس صاحب نے مجھے اندر بلا لیا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی جان پہچان اور حاجی فطرس علی اور

اپنے بھائی کے حالات سنے۔ چائے اور بسکٹ سے تواضع کی۔ اتنے میں میرے کچھ کاغذات تیار ہو گئے تھے جو دراصل میرے کام کے لیے منظوری تھی جو فنانس نے دی تھی۔ چونکہ یہ فنانس کا نوکری کا سفارشی تھا اس لیے کاغذات فوراً تیار ہو گئے اور مجھے ایک کارڈ تھما کر انیس حیدر نے خوش آمدید کہا۔ پھر ایک آدمی کو بلایا اور کہا اسے فلاں انجینئر کے پاس لے جائیے۔ اب کے ہم دونوں واپس اسی گیٹ کے رستے کی طرف چل پڑے جہاں سے مَیں اس آفس تک پہنچا تھا۔ گیٹ سے کافی پہلے دائیں ہاتھ کو لوہے کے اُن بڑے بڑے اہراموں کی طرف مڑ گئے جن کے اندر بھاری مشینیں چل رہی تھیں۔ ان کی آواز کان کھائے جاتی تھی اور اِدھر اُدھر کام کرنے والے سیکڑوں مزدور اور ورکر اپنے اپنے فوجی نما پاجامہ لباس میں کام پر لگے تھے۔ وہ اسے ڈونگری کہتے تھے۔ ہم دونوں کچھ ہی دیر میں اس بھاری مشینوں والے ایک حصے میں چلے گئے اور وہاں موجود ایک قبر نما کمرے میں داخل ہو گئے جہاں ایک آدمی بیٹھا کچھ کاغذوں پر قلم سے لکھ رہا تھا یا حساب کتاب کر رہا تھا۔

السلام علیکم رمضان صاحب، میرے ساتھ جانے والے آدمی نے اُسے مخاطب کیا۔

وعلیکم، کہہ کر اُس نے مجھے اور اُسے غور سے دیکھا جیسے اُس کے کام میں دخل اندازی کر کے اچھا نہیں کیا۔

سر اس کا نام ضامن ہے، اِسے سر ظفر صاحب نے بھیجا ہے۔ آپ اِسے کام پر لگا دیں اور ابھی سے اِس کی پریذنس شو کر دیں۔ یہ اس کی شفٹ کا کارڈ ہے، اُس نے کارڈ اُسے تھماتے ہوئے کہا۔

ہم م م، انجینئر نے مجھے اُس جبری قیدی کی طرح دیکھا جسے نئی نئی نمبرداری ملی ہو اور اب اختیارات دکھانے کا وقت ہو۔ اِس کی شکل بھی قیدیوں سی تھی۔

ٹھیک ہے چھوڑ دو۔ انجینئر نے ایسی بے نیازی سے کہا کہ مجھے اُس کے لہجے سے ہی ذلت کا احساس ہوا۔

لڑکا مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ اب مَیں کھڑا تھا لیکن وہ میری طرف متوجہ ہونے کی بجائے مسلسل اُن کاغذات دیکھ رہا تھا جن پر اُلٹی سیدھی لائنوں کے گراف بنے تھے۔ یہ انتظار کی ایسی حالت تھی جس میں سزائے موت کے قیدی کے گلے میں رسی تو ڈال دی گئی ہو مگر اُسے کھینچنے میں وقت باقی ہو۔ قیدی رسی کے گلے میں ڈلنے اور کھینچنے کے درمیانی وقت میں جو کچھ محسوس کرتا ہے اصل وہی اُس کی سزا ہوتی ہے ورنہ رسی کھنچ جانے کے بعد تو سزا ختم ہو جاتی ہے۔ ویسی تو نہیں مگر کچھ اُن سے ملی جلی محسوسات تھیں

جس کا ادراک وہاں کھڑا رہنے پر مَیں کر رہا تھا۔ انجینئر کا سر تمام گنجا تھا، پینٹ اور ٹائی پہنے ہوئے تھا مگر دونوں بلکہ شرٹ سمیت سب چیزیں مشینوں کے تیل سے داغدار تھیں۔ مَیں آدھا گھنٹا وہیں کھڑا رہا اور وہ اپنے کام میں ایسے مگن رہا جیسے قیامت تک ہم دونوں اپنی اپنی جگہ کھڑے رہیں گے اور یہیں سے اُٹھیں گے۔ پھر اچانک اُس نے اپنے کاغذ سمیٹے اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور میری طرف نہایت حقارت سے دیکھا۔ پھر ایک دم کمرے سے باہر نکل کر بولا چلیے آپ کو کام پر چھوڑ دوں۔ مَیں اُس کے پیچھے ہو لیا۔

تب انجینئر صاحب نے مجھے ایک بہت بڑے رولر کے پاس کھڑا کر دیا۔ اُس رولر پر نیا بننے والا کپڑا ایک بڑی مشین سے نکل رہا تھا اور ایک بڑے چرخ پر لپٹا جا رہا تھا۔ وہاں ایک لڑکا کھڑا گنگنا رہا تھا جو انجینئر کو دیکھتے ہی سنجیدہ ہو گیا۔ اُس نے مجھے حکم دیا، اِس رولر پر تمھارے دو کام ہیں۔ ایک یہ کہ جہاں کہیں چھِدا ہوا کپڑا نظر آئے وہیں یہ ساتھ پہلو والا بٹن دبا دو، رولر بند ہو جائے گا۔ اُس کے بعد بائیں طرف کے اِس لال رنگ کے بٹن کو دباؤ۔ اُس سے ہارن بج اٹھے گا، اِس کا مطلب ہے کپڑے میں گڑ بڑ ہو رہی ہے۔ ہارن سُن کر کاریگر یہاں پہنچ جائے گا۔ اگر کپڑا صاف آ تا رہے تو بہت اچھا۔ اُس صورت میں جب یہ رولر کپڑے سے پورا بھر جائے تو اِسے بند کر کے اپنے پاؤں کے نیچے والا گیئر دبا دیں۔ اِس حالت میں یہ رولر نکل کر دوسری طرف چلا جائے گا اور دوسرا رولر خود بخود چڑھ جائے گا۔

اِس سارے عمل کے بعد اُس نے ایک لڑکے کو میرے پاس کھڑا کر دیا کہ میرے کام کا جائزہ لیتا رہے۔ جہاں کوتاہی کروں فوراً سمجھائے۔ یہ پورا کام مجھے ایک گھنٹا لگا کر عملی طور پر سمجھایا اور وہاں ڈیوٹی لگا کر چلا گیا۔ پہلے تو مجھے کام معمولی لگا لیکن جیسے جیسے وقت بڑھتا گیا، میری بیزاری اور تھکاوٹ میں اضافہ ہوتا گیا۔ شام تک ایسے ہو گیا کہ مَیں انسان کی بجائے اُسی رولر کا ایک پرزہ ہوں۔ اول تو ہر وقت عین رولر پر نظریں جمائے رکھنا، پھر ہمہ وقت کھڑے رہنا کہ بیٹھنے کی وہاں گنجائش نہیں تھی۔ گنجائش اس لیے نہیں تھی کہ آدمی کسی بھی وقت سو سکتا تھا یا ذہن دوسری جانب متوجہ ہو سکتا تھا۔ اِس عمل میں اگر چھِدے ہوئے کپڑے کی ایک لاٹ نکل جائے تو لاکھوں روپے کا نقصان تھا۔ یہ مجھ جیسے مزدور کی سات پشتیں بھی نہیں چکا سکتی تھیں۔ پھر رولر پر کپڑا پورا ہونے کے بعد اُسے بند کرنے کا کام بھی کرنا تھا۔ اگر رولر کے بالائی کناروں پر لگے لال نشان سے کپڑا اُوپر چلا جائے تو اُس کے پھٹنے اور تھان کے تھان تباہ ہونے کا خطرہ بہت تھا۔ ایک رولر میں کم و بیش پانچ سو تھان کا کپڑا لپٹتا تھا۔ مجھے چھِدے ہوئے کپڑے کے لیے پورے دن میں دس سے بارہ دفعہ بٹن دبانا پڑے اور رولر اُتارنے کے لیے سولہ بار ایسا کیا۔

اِن اوقات میں میرے ہاتھ گویا آن آف کے سوئچ بن چکے تھے اور ٹانگیں کاٹھ کے پہیے ہو گئے۔ اس ایک دن کے دوران پورے دماغ میں لوہے اور کپڑے کی کلیں کھڑی ہو گئیں۔ اِس کے علاوہ فیکٹری کے اندر بے تحاشہ اور کانوں کو کھا جانے والا شور تھا۔ یہ شور دماغ کے مختلف خانوں میں زبردستی ایسے داخل ہوتا تھا جیسے کسی طلبا تنظیم کے لڑکے نعرہ بازی کے دوران لاتیں مارتے ہوئے کلاس روم میں داخل ہوتے تھے۔ اِس کے علاوہ بدبو اور گرمی کا ایک سیلاب تھا، جس سے تین چار دن تک دھوپ میں پڑے مُردے کی سی باس آتی تھی۔ اِس بدبو اور مشینوں کے بے ہنگم شور کے درمیان وہاں کام کرتے مزدور بھی ایک دوسرے کو اونچی آواز میں پکارتے تھے۔ اونچا پکارنے والی اُن کی یہ عادت فیکٹری سے باہر نکل کر بھی اُسی طرح جاری رہتی تھی۔

دوپہر ایک بجے مجھے ایک ٹوکن دیا گیا۔ یہ میرے کھانے اور فیکٹری کی کالونی میں رہنے کے لیے تھا۔ ٹوکن اُن غیر شادی شدہ مزدوروں کے لیے ہوتا تھا جن کے پاس شہر میں رہنے کی جگہ نہیں تھی۔ نہ وہ اپنا کھانا گھر سے لا سکتے تھے۔ اِس پیتل کے ٹوکن کو ہر وقت پاس رکھنا تھا۔ اُس پر نمبر لگا ہوا تھا۔ میرے ٹوکن کا نمبر 92 سی تھا۔ یعنی مَیں فیکٹری کا سی کلاس ورکر تھا۔ دوپہر کا کھانا کھاتے ہوئے ایک لڑکا، جو میرے قریب ہی ایک دوسرے رولر پر کام کر رہا تھا، مجھ سے بات چیت کرنے لگا۔ اُس کا نام سجاد تھا۔ وہ کام کرنے کے دوران تھوڑی ہی دیر میں واقف ہو گیا تھا۔ لڑکے نے پوچھا آپ کا کوئی رشتے دار یہاں بڑا افسر ہے؟

مَیں نے کہا نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ بس ایک دوست کا بھائی فیکٹری کا اکاؤنٹ انچارج ہے۔

اِسی لیے یہ سب ہوا، اُس نے کہا۔

بھئی کیا ہوا، یہاں تو کچھ بھی نہیں ہوا، کیا مسئلہ ہو گیا؟ مَیں حیران تھا یہ کیا کہہ رہا ہے۔

وہ بولا، آپ بہت خوش قسمت ہیں۔ آپ کا ٹوکن آج ہی بن گیا ورنہ دو دو مہینے ٹوکن بننے میں لگ جاتے ہیں اور جہاں آپ کو کھڑا کیا ہے، یہاں کھڑا ہونے میں بھی ایک سال لگتا ہے ورنہ پہلے پہل ایسی دوزخ میں رکھتے ہیں کہ کام کی بجائے مرنے کو جی چاہتا ہے۔

مَیں نے پوچھا، تو کیا اِس سے بُری جگہ بھی اس فیکٹری میں کوئی ہے؟

وہ ہنس دیا، ارے بھائی کیسی باتیں کرتے ہو۔ اگر تمھیں رنگ کرنے والی یا دھاگا پالش کرنے

کی جگہ پر لے جایا جائے تو پھر تم تو آج ہی مر جاؤ گے۔ یہ آپ کے کالے بال اور بھوری آنکھیں دو دن میں ہی بے نور ہو جائیں گے۔

تو آپ نے وہاں کام کیا ہے؟ مَیں نے پوچھا۔

ہاں پورے دو دو سال وہاں کام کیا۔ پھر ایک سال لگا دیا کئی سفارشیں کرا کے یہاں پہنچا ہوں۔ وہ مسکرا کر بتانے لگا۔

اچھا تو یہ ٹوکن کی وجہ سے مجھ سے پیسے نہیں لیں گے؟ مَیں نے متجسس انداز سے پوچھا۔

ابھی آپ کا نام درج ہو گیا ہے۔ اب آپ کی کھانے پر اِسی ٹوکن کو دکھانے کے بعد حاضریاں لگیں گی اور یہاں اُدھار چلتا رہے گا۔ جب تنخواہ بنے گی تو پہلے اُس سے پیسے کٹیں گے۔ پھر آپ کو باقی پیسے دے دیں گے۔

اور رہنے کے پیسے بھی کاٹیں گے؟ مَیں نے تشویش سے پوچھا۔

وہ بھی کاٹیں گے لیکن اُس کا حساب مہینے کے بعد ہوتا ہے۔ وہ رقم تھوڑی ہے۔ اگر ٹوکن نہ ملتا تو آپ کی ساری کمائی کھانے میں اور رہنے میں کٹ جانی تھی۔ جس کے پاس ٹوکن نہیں ہوتا اُسے یہاں کھانا عام ہوٹلوں کی طرح بلکہ اُس سے بھی تین گنا مہنگا ملتا ہے۔

تم بھی یہیں رہتے ہو فیکٹری کی کالونی میں؟ مَیں نے پوچھا۔

ہاں مَیں بھی یہیں رہتا ہوں۔ آپ کا بارہ نمبر کمرہ ہے۔ یہ میرے ساتھ والا ہی ہے۔ یہاں بھی ایک اور لڑکا رہتا ہے۔ مَیں تمھیں چھٹی کے بعد وہاں لے چلوں گا۔

کام کا حساب کب ہوتا ہے؟

حساب جمعرات کو ہوتا ہے۔

ابھی ہم بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ گھنٹی بج گئی اور ایک گھنٹا گزرنے میں گویا چند لمحے ہی لگے تھے۔ تمام مزدور سرپٹ فیکٹری کے گیراجوں کی طرف دوڑ پڑے۔ گھنٹی بجنے کے دو منٹ کے اندر وہاں پہنچنا ہوتا ہے۔ ایک منٹ بھی لیٹ ہو جائیں تو ایک گھنٹا کی مزدوری کٹ جاتی ہے۔ سجاد نے مجھے خبردار کیا کہ جلدی دوڑو۔

ایک گھنٹے کی مزدوری کیوں کٹ جاتی ہے؟ یہ کیا بات ہوئی، مَیں نے احتجاجاً کہا۔

اس لیے کہ مشینیں چل پڑیں گی۔ آپ نہ پہنچے تو آپ کی مشین پر کون کام کرے گا؟ کام خراب

ہو گیا تو آپ کا پتہ صاف۔ سجاد نے طنز سے کہا، یہ کہہ کر وہ خود بھی دوڑ پڑا۔ اُس کے پیچھے مَیں بھی۔

شام پانچ بجے چھٹی ہوئی تو مزدور بھیڑوں کی طرح ایک قطار میں کھڑے ہو گئے۔ کئی ایسے مزدور جو سپروائزر یا جن کی اُجرت ذرا دوسروں سے زیادہ تھی اُن کے پاس اپنے ٹفن تھے جن میں وہ گھر سے کھانا لائے تھے۔ کچھ کم اجرت والے مزدوروں کے پاس فقط چھوٹا سا کپڑا تھا جس میں اپنے کھانے کو دو روٹیاں اور اُس کے اُوپر اچار یا اِسی طرح کی ترکاری رکھی ہوتی ہے، وہ ساتھ لیے آگے بڑھ رہے تھے۔ اب انھیں فیکٹری سے باہر نکلنا تھا مگر اپنی باری پر۔

فیکٹری مالکان کی نظر میں مزدور اِتنے ایماندار نہ تھے کہ اُنھیں بغیر جامہ تلاشی کے باہر نکلنے دیا جاتا اور تلاشی اتنی صبر آزما تھی کہ تین چار سو مزدوروں کو باہر نکلنے میں کم سے کم ایک سے ڈیڑھ گھنٹا انتظار کرنا ہوتا تھا۔ جو مزدور سب سے پہلے گیٹ پر چلا جاتا اُس کی تلاشی پہلے ہو جاتی۔ اِس مقصد کے لیے تمام مزدور ایک دوسرے سے بڑھ کر گیٹ کی طرف بھاگ رہے تھے اور اپنی باری پہلے نمٹانے کی کوشش میں تھے۔ مجھے چونکہ پہلے اِس قسم کا تجربہ نہیں تھا اِس لیے مَیں نے بھاگ کر گیٹ پر پہنچنے کی کوشش نہیں کی اور جب وہاں پہنچا تو اتنی طویل قطاریں جمی کھڑی تھیں کہ اُنھیں دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ یہ سچ تھا مَیں نے اپنی زندگی میں چوری نہیں کی تھی مگر فیکٹری والوں پر یہ بات ثابت کرنے کے لیے میرے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ ویسے بھی سی کلاس آدمی کے ثبوت اپنی سی کلاس اتھارٹی کے سبب قابلِ توجہ نہیں ہوتے۔ جب میں ایک گھنٹے کے شدید اور بیزار کر دینے والے عمل سے گزر کر گیٹ پر پہنچا تو چوکیدار نے میری جیبوں اور کمر کے پہلوؤں کو اس طرح ٹٹولا کہ میرے پاس خجالت کے سوا کچھ نہیں بچا۔ مَیں اُس ذلت کے حصار سے کیسے نکل سکتا تھا جس کے لیے مَیں نے کبھی محنت نہیں کی تھی۔ یہ چوکیدار جسے مالکوں نے ایک سراغی کتے کا کام سونپا تھا اگرچہ میری ہی طرح بانجھ انسان تھا مگر اُسے بہر حال یہ فخر حاصل تھا کہ وہ دھرتی کے اپنے جیسے کیڑے مکوڑوں کی تذلیل کر سکتا تھا۔ چوکیدار میری تلاشی لے رہا تھا اور مَیں اُسے تلاشی دے رہا تھا۔ یہی وہ فاصلہ تھا جو صدیوں سے سرمایہ دار نے ہم دونوں کے درمیان پیدا کیا ہوا تھا۔ اس فاصلے کو کوئی انقلاب، کوئی تحریک، کوئی نظریہ نہیں مٹا سکتا۔ ہاں مگر نفرت کے کئی فاصلے مزید بڑھ سکتے ہیں۔ اُس کا یہ اعزاز کہ اُس پر مالکوں کو اعتبار تھا، ایک حقارت بن کر میری عزتِ نفس پر ٹوٹ پڑا تھا اور مَیں بے بسی سے اُس عمل سے گزر رہا تھا۔ مَیں اِس تلاشی کے دوران جتنے لمحے کتنی تذلیل کے دریا پار کر چکا تھا یہ اُسے بالکل خبر نہیں ہو سکتی۔ پورے دن میں کام کی

تھکن اور دماغ کی توجہ کا ایک جگہ رُک جانا پہلے ہی جان لیوا عمل تھا، اُس پر گیٹ سے نکلتے وقت لی گئی تلاشی نے مجھے زندگی ہی سے بیزار کر دیا تھا۔

باہر نکلا تو سجاد احمد میرے انتظار میں کھڑا تھا۔ اُس کا میرے لیے پہلے دن سہولت کار بن جانا میری سمجھ سے باہر تھا۔ اُسے یہ خبر مل چکی تھی کہ فیکٹری کے اندر میری ایک اہم آدمی سے شناسائی ہے مگر مَیں اُس لڑکے کو موقع پرست تصور نہیں کر سکتا، وہ ایک اچھا انسان بھی ہو سکتا تھا۔ یہ سوچ لینا کہ محض مجھ سے اپنے کسی مطلب کے لیے میرے ساتھ تھا، ایک کمینے پن کی علامت تھی جو میرے دماغ میں سرایت کر گئی۔ وہ مجھے لے کر آدھ کلو میٹر چلتا رہا۔ پھر ایک گیٹ میں داخل ہو گیا۔ یہ فیکٹری کی رہائشی کالونی تھی۔ ہم مختلف گلیوں سے گزر کر ایک جگہ پہنچ گئے جہاں نہایت چھوٹے چھوٹے ایک منزلہ فلیٹ تھے۔ اِن کی چھتیں بھی بہت نیچی تھیں۔ یہ فلیٹ ایک لمبی گلی میں آمنے سامنے تھے۔ گلی میں کسی قسم کا کوئی درخت اور گھاس کی پتی تک نہیں تھی۔ ہم جن گلیوں سے گزرے تھے سب کی یہی حالت تھی۔ گلیوں کے فرش ٹوٹے ہوئے تھے۔ بعض جگہ جڑوں والی لمبی گھاس اُگ رہی تھی۔ اُس نے مجھے ایک فلیٹ کے سامنے کھڑے ہو کر کہا، یہ تمھارا فلیٹ ہے۔ اِس میں دو کمرے ہیں اور ہر کمرے میں دو مزدوروں کی گنجائش ہے۔ آپ اِسے دو قیدیوں کی گنجائش بھی کہہ سکتے ہیں۔ مَیں فلیٹ کے اندر داخل ہوا تو ایک دم گھبراہٹ میں میری سانس بند ہونے لگی۔ فلیٹ میں بے تحاشہ گند اور کچرا پڑا تھا۔ جو کوئی بھی اِس میں رہتا تھا نہایت واہیات قسم کا آدمی تھا۔ اُسے نظر انداز کر کے جب کمرے میں داخل ہوا تو ایک مزدور لیٹا ہوا ریڈیو پر پنجابی گانے سُن رہا تھا۔ مجھے اُس کی شکل اور انداز سے اتنی کراہت ہوئی کہ فوراً بھاگ کر باہر آ گیا اور سجاد سے کہا، بھائی مجھے اپنے کمرے میں جگہ دے دو، اِس کمرے میں ہر گز نہیں رہنے والا۔ وہ ہنس دیا اور بولا، چلو ایسا ہے کہ میرے ساتھ والا خوش بختی سے اپنے گھر گیا ہوا ہے۔ وہ تین دن بعد آئے گا، اتنی دیر آپ میرے کمرے میں رُک جاؤ لیکن آپ کو جو کمرہ ملا ہے یا تو آپ اپنے جاننے والے سے کہہ کر بدلوا لیں ورنہ یہیں رہنا پڑے گا۔ مَیں نے کہا خیر کل دیکھی جائے گی۔

(۴۶)

کام کا دوسرا دن شروع ہوا تو وہی یکسانیت دوبارہ شروع ہوگئی۔ آج سب سے بڑھ کر ایک نئی بکواس سامنے آئی کہ وہاں کام کرنے والے ایک سپروائزر نے بہت منغض کیا۔ کبھی اِدھر سے آتا اور ہدایات جاری کرتا، کبھی اُدھر سے آنکلتا اور ہدایات کے ساتھ جھڑکیوں کا سلسلہ شروع کر دیتا۔ رُولر سے اِتنے فاصلے پر بیٹھو، کپڑے کو غور سے دیکھو، رولر کو گل پر چڑھانے سے پہلے دیکھ لو کہیں سے ٹوٹا تو نہیں؟ ارے دیکھو وہ اُدھر کیا دیکھ رہے ہو؟ اِسی پر نظر رکھو جیسے مسلسل ایک فلم دیکھ رہے ہو۔ رُولر کے پاس کھڑا ہونے کے لیے ریس کار چلانے والے ڈرائیور سے بھی زیادہ فوکس رکھو وغیرہ۔

مَیں اُس سے اِتنا بیزار ہوا کہ اُسے ایک دفعہ تو کھری کھری سنانے ہی والا تھا کہ سجاد نے اشارے سے مجھے روک دیا۔ اللہ اللہ کر کے دوپہر ایک بجے کا گھنٹا بجا۔ مَیں نے جلدی سے رُولر کو بند کیا۔ اب ہم کھانے کی طرف دوڑے تاکہ جتنا ہو سکے اِس ایک گھنٹے میں اپنے آپ کو فرصت میں محسوس کریں۔ سجاد نے کھانے کی ٹیبل پر بیٹھتے ہی کہا، یہ بہت بدتمیز ہے اور ایم ڈی کا منہ چڑھا ہے۔ چھٹی پر گیا ہوا تھا، آج آیا ہے۔ اِسے جواب دینے کا مطلب اپنی نوکری پر لات مارنا ہے۔ آپ خموش ہو کر سنتے رہیے۔ وہ آپ کو نیا سمجھ کر رعب جھاڑ رہا ہے۔ دو چار دن بعد ٹھیک ہو جائے گا۔

میاں سجاد اِسے نہیں پتا مَیں کون ہوں؟ مَیں اِس کے جبڑے توڑ دوں گا، مَیں نے غصے سے کہا۔

میرے بھائی ضامن، آپ زیادہ سے زیادہ کیا ہو سکتے ہیں؟ اُس کے سامنے تو ایک مزدور ہیں

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ایک مزدور ہیں۔ یہاں جسے دیکھیے یہی کہے گا تُو مجھے نہیں جانتا؟ بھائی میرے جو شخص یہاں مزدوری کر رہا ہے وہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ اگر کچھ اور ہوتا تو یہاں کیوں ہوتا؟ ہاں یہ کہہ سکتے ہو، تُو مجھے نہیں جانتا یہاں میرے دوست کا بھائی اکاؤنٹ انچارج ہے اور یہ بات وہ پہلے ہی جانتا ہے۔

سجاد نے ایک لمحے میں میری تمام اکڑ نکال دی۔ یہ سالا مزدور کم فلسفی زیادہ تھا مگر میرا یہ کہنا ''وہ مجھے نہیں جانتا، مَیں کون ہوں'' شاید وہ نہیں سمجھ سکا تھا۔ وہ تو کیا خود مَیں نہیں سمجھ سکا۔ مَیں کسی کو بھی سمجھا نہیں سکتا تھا سوائے فطرس علی اور حبیب کے۔ یہ دونوں جانتے تھے مَیں کون ہوں بلکہ سمجھائے بغیر جانتے تھے مگر اُن کے جاننے کا فائدہ فقط میری دلجوئی کی صورت میں ہوتا تھا۔ عملی طور پر میرے لیے دونوں ایسی ہستی کی مانند تھے جنھیں سوچ کر زندہ رہنے کو جی چاہتا تھا۔

ایک ہفتہ اِسی حالت میں گزر گیا۔ مَیں نے اپنا کمرہ تبدیل کر کے سجاد کے کمرے میں مستقل بستر جما لیا۔ یہ لڑکا مجھ سے ذرا چھوٹی عمر کا تھا مگر تجربہ کار تھا اور اپنے کام میں ماہر تھا۔ سپروائزر سے کبھی جھڑکی نہیں کھاتا تھا۔ پیسے کا حساب کتاب رکھتا تھا۔ اپنی ماں کو دو ہفتے بعد خط لکھتا تھا۔ اس کی ماں نواب شاہ کے ایک گاؤں میں رہتی تھی۔ لڑکے کا رنگ ملیح اور نین نقش اچھے تھے۔ ایک ہفتے میں اُس نے مجھے اپنے بارے بہت کچھ بتا دیا تھا۔ سچ یہ ہے کہ مَیں اُس کا دوست بن گیا۔

جمعرات کے وقت مجھے اپنی مزدوری ملی تو اِس میں سے میرے کھانے کے علاوہ پچاس روپے مزید کٹوتی ہوئے تھے۔ مجھے اِس کٹوتی پر بہت غصہ آیا۔ مَیں دوبارہ کیشئر کے پاس گیا اور کہا بھئی یہ پچاس روپے کس کھاتے میں کاٹ لیے ہیں؟ اُس نے انتہائی بے نیازی سے جواب دیا، یہ مزدور یونین کی ممبرشپ کے کٹے ہیں۔

لیکن مَیں نے تو کوئی یونین جوائن نہیں کی۔ مَیں نے اپنی طرف سے اُسے ایسی خبر دی جسے سنتے ہی میرا خیال تھا وہ اپنی غلطی پر نظرِ ثانی کرے گا۔

میری بات سُن کر اُس نے اپنے پہلو میں بیٹھے ایک اور شخص کی طرف دیکھا۔ یہ بھاری مونچھوں اور سفید رنگ کا ہٹا کٹا آدمی تھا۔ اُس نے کہا، کاکا، یہ رقم اِس لیے آپ کی مزدوری سے کاٹی ہے کہ آپ کو فیکٹری میں کوئی مصیبت درپیش ہو تو یونین بروقت آپ کی مدد کو پہنچے۔

مجھے آپ کی کوئی مدد نہیں چاہیے۔ آپ میرے پیسے واپس کریں۔ مَیں نے یہ بات ایسے کہی جیسے دُکان پر کھڑا کوئی شے نہ خریدنے کا حکم سنا رہا ہوں۔

اُس نے گھور کر میری طرف دیکھا اور دوسرے مزدور سے کہا، جاؤ میاں طائفے چھوکرے کو لے جا کر سمجھاؤ۔ یہ اپنی اماں کے گھر نہیں کھڑا، فیکٹری میں کام کر رہا ہے۔

اُس کا حکم سُن کر اُس دوسرے آدمی نے میرا بازو پکڑا اور ایک طرف لے گیا۔ کہنے لگا بھائی اگر اِس فیکٹری میں کام کرنا ہے تو اِن یونین والوں سے پنگا مت لو۔ یہ جو تمھاری بھوری آنکھیں اور چکیلے سُرخ و سپید گال ہیں چند دِنوں میں پھیکے ہو جائیں گے۔ ابھی تک تمھیں ہاتھ نہیں لگا تو یہ سمجھو یہاں کے جی ایم صاحب کی سفارش چل رہی ہے۔ ورنہ اِن یونین والوں کی مرضی کے بغیر یہاں پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔ ابھی تم نے تھوڑی بہت بھی ضد کی تو پہلے تیری ٹھکائی کرائیں گے۔ اُس کے بعد چوری کا الزام لگا کر تمام مزدوری دبا لیں گے اور فیکٹری سے چلتا کریں گے۔ چپ کر کے اپنا کام کرو اور یہ پچاس روپے ہر مہینے دیتے رہو۔

یہ تو سراسر بدمعاشی ہے، مَیں کسی طرح اِس بے رحم نظام کا حصہ نہیں بنوں گا۔ آپ لوگوں کی شکایت کروں گا۔ مَیں نے اُسے ڈرانے کی کوشش کی۔

وہ میری بات پر مسکرایا۔ تو کیا آپ سے پہلے یہ کارِ خیر کسی نے نہیں کیا؟ جایئے، جی ایم سے کہیے۔ اگر فیکٹری مالک آپ کا ماموں ہے تو شاید نجیب صاحب کچھ رعایت کر دیں۔

وہ پورے مذاق کے موڈ میں تھا۔ مَیں نے فوراً وہاں سے نکلنے میں عافیت سمجھی لیکن ہر ہفتے اتنے پیسوں کی کٹوتی میری سمجھ سے باہر تھی۔ جس قدر اِس فیکٹری میں مزدور کام کرتے تھے، اُن کے کتنے پیسے بنتے ہوں گے جو یہ مونچھوں والے ڈکار جاتے ہوں گے۔ میرے دل میں ایک بات آئی، کیوں نہ اِن کے خلاف مزدوروں کو منظم کیا جائے، مَیں سیدھا اپنے کوارٹر میں آیا اور غصے سے اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔

سجاد میرے اِس غصے کو بھانپ گیا اور پوچھنے لگا کیا ہوا؟

مَیں نے بھرے ہوئے دل سے کہا، یار سجاد آپ نے بتایا نہیں یہاں عجیب ظلم چل رہا ہے۔ کیشئر کے پاس ایک سانڈ نما آدمی بیٹھا تھا، اُس نے میرے پچاس روپے کاٹ لیے، کہتا ہے یونین فنڈ میں جمع ہوں گے۔

اچھا کاٹ لیے؟ وہ ہلکا سا مسکرایا، آپ کو بھی معاف نہیں کیا۔ بھائی یہ سب کے کاٹتے ہیں۔

تو مزدور احتجاج کیوں نہیں کرتے؟

وہ تو سچ کہتا ہے۔ سجاد تلخی سے بولا۔

کیا مطلب؟ مَیں ہکا بکا ہو کر اُسے دیکھنے لگا۔

ضامن تم شکر کرو، سجاد نے بولنا شروع کیا، مَیں نے پہلے دن کہا تھا تم قسمت والے ہو۔ تمھیں بتاؤں مجھ سے پورے چار مہینے یہ لوگ ریپ کرتے رہے ہیں۔ پھر بندے کو ویسے ہی عادت ہو جاتی ہے۔ خدا کی قسم مَیں اپنے علاقے میں بھوک کی خودکشی سے نکلنے کے لیے یہاں آیا تھا اور وہ سب کچھ سہا جو تمھیں صرف بتایا جا رہا ہے۔ واپس اِس لیے نہیں گیا کہ وہاں صرف بھوک کی موت ہے۔ اگر میری اکیلی ذات ہوتی تو وہ بھی سہہ لیتا مگر اپنی ماں کے علاوہ ایک بہن اور دو چھوٹے بھائیوں کو بھوکا مرتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

سجاد کی بات سُن کر مَیں بالکل ہی ساکت ہو گیا۔ یہ عجیب انکشاف تھا۔ اب مجھے سمجھ آئی کہ فیکٹری میں کام کرنے والے کچھ لفنگے متواتر میری طرف دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں کیا اشارے کرتے تھے۔ مَیں چند ثانیے چپ لیٹا رہا۔ پھر سجاد سے دھیمے سے کہا، آپ نے اِس بات کی شکایت کیوں نہیں کی؟

کس سے کرتا؟ اُس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

فیکٹری کے مالکان سے۔ میں نے کہا۔

اُن کو کیا سوجھی ہے کہ سانپ کی بانبی میں ہاتھ ڈالیں۔ مالکان کچھ کہیں گے تو یونین کوئی بہانہ کر کے فیکٹری میں ہڑتال کروا دے گی۔ فیکٹری کا کام ٹھپ ہو جائے گا۔

ہڑتال کیسے کروائے گی؟ جب مزدور اُس ہڑتال کا حصہ نہیں بنیں گے۔ مَیں نے گویا حل نکال لیا تھا۔

کیا آپ سمجھتے ہیں مزدوروں میں اتنی ہمت ہے وہ یونین کے خلاف ایک ذرہ برابر چل سکیں؟ مزدور بچارے مشکل سے اپنی لگی ہوئی دہاڑی کیوں گنوائیں گے۔

اِن کی طاقت وہی مزدور ہی تو ہیں، اگر وہ ساتھ نہیں دیں گے تو اِن کی طاقت ختم ہو جائے گی۔ مَیں نے کہا۔

ہرگز نہیں، وہ مزدور تو خود اپنی طاقت نہیں، یونین کی طاقت کیسے ہو گئے؟ سجاد نے جواب دیا۔

تو یونین کی طاقت کون ہے؟ عدالت اور مل مالکان؟ مَیں نے طنزاً اُنے پوچھا۔

یار میاں ضامن آپ بہت بھولے ہو۔ یہ یونین بنواتے ہی مل مالکان ہیں اور مزدوروں کے

حقوق کے نام پر بنواتے ہیں۔ اُنھیں ہزار یا دو ہزار مزدور قابو کرنا مشکل ہوتا ہے چنانچہ وہ ایک یونین بنوا دیتے ہیں جن میں کرتا دھرتا اُن کے اپنے ہی آدمی ہوتے ہیں۔ اگر چہ وہ مزدوروں میں سے ہوتے ہیں مگر وہ پرانے گھاگ قسم کے مزدور ہوتے ہیں اور مالکان اُنھیں اپنا بنا لیتے ہیں۔

یعنی یہ مزدور یونین اصل میں مزدوروں ہی کے خلاف کام کرتی ہے، میں نے وضاحت چاہی۔

جی ہاں آپ یہ کہہ سکتے ہیں لیکن تھوڑا بہت یہ لوگ مزدوروں کے بھی کام آجاتے ہیں۔ سجاد نے جواب دیا۔

وہ کیسے؟

جتنا میرا تجربہ یہاں ہے اُس حساب سے مزدوروں کو فیکٹری میں کام کرتے ہوئے دو طرح کی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ ایک مشکل فیکٹری مالکان کی طرف سے ہوتی ہے کہ بغیر وجہ کے جب کرائسس میں ہوئے تو مزدوروں کو نکالیں گے یا مزدوری اور الاؤنس میں گڑ بڑ کر جائیں گے اور اسی طرح کی چھوٹی موٹی چیزیں مگر یہ بہت کم ہوتی ہیں۔ اگر معاملہ پیچیدہ نہ ہو اور مالک کو نقصان نہ ہو رہا ہو تو یونین کا صدر اِس کے حل کے لیے مالک سے اِس حد تک بات کر سکتا ہے کہ مزدور کو تھوڑی بہت رعایت دلوا دے یا قرضہ دلوا دے۔ اگر مالکان کے خسارے میں جاتا ہے تو خود یونین کا صدر اُسی مزدور کی ایسی درگت بناتے ہیں کہ مالکان کے کہنے سے پہلے وہ خود چھوڑ دیتا ہے اور اپنے حق سے دست بردار ہو جاتا ہے۔ دوسری سطح یہاں کے ملازموں کی اور مزدوروں کی اپنی دشمنیاں اور دوستیاں ہیں۔ اِن کے اپنے درمیان سو طرح کے معاملات چل رہے ہوتے ہیں مثلاً ابھی آپ کو کمرے کے تبدیل کرنے کی ضرورت تھی۔

اِس میں مالک کے نہ فائدے کی بات ہے نہ نقصان کی۔ تو یہ کام یونین صدر بھی کروا کے دے سکتا تھا مگر اُس کے لیے آپ سے چند روپے لے لیتا۔ چونکہ یہاں آپ کا ایک دوست بھی ہے اِس لیے مفت ہو گیا۔ تو اِس طرح کے مزدوروں کے آپس کے معاملات میں یونین چھوٹا موٹا جھگڑا چکا دیتی ہے۔ اِس میں مالکوں کی طرف سے کسی استحصال کی ذمہ داری نہیں ہوتی۔ اگر ہوٹل میں کھانا ٹھیک نہیں اور یونین صدر اُس میں شامل نہیں تو کھانے کی شکایت دور ہو سکتی ہے مگر یہ سب اُس صورت میں ہے کہ یونین کا صدر زیادہ ہی کرپٹ نہ ہو۔ ورنہ ہر کام میں یونین کے صدر اور مرکزی کابینہ کا اپنا منافع چل رہا ہوتا ہے۔

کیا ہم اپنی ایک مزدور یونین نہیں بنا سکتے؟ میں نے گویا حل پیش کیا۔

ہاں بنا لو! مزدور یونین کے خلاف ایک اور مزدور یونین۔ مگر اس کے لیے تمھیں فیکٹری مالکان سے بھی زیادہ طاقت چاہیے۔ سجاد نے میری طرف طنز سے دیکھ کر جواب دیا۔

ہمیں اسی طرح باتیں کرتے ہوئے نیند آ گئی۔ اگلے دن میرا پہلے یہ خیال تھا، انیس حیدر صاحب سے اِس بابت شکایت کروں مگر مجھے فی الحال کام کی ضرورت تھی چنانچہ اپنی ڈیوٹی پر آ گیا۔ اِسی طرح کئی ہفتے اِسی شعبے میں گزر گئے اور میں ایک رُولر کی طرح کا چارج کیا ہوا پرزہ بن گیا جو متواتر اپنی ڈیوٹی میں گم تھا۔ اِسی حالت میں میرا دن گزرتا اور اُسی حالت میں رات خواب آتے تھے۔ پھر یہاں مجھے ایک سال نکل گیا۔ مَیں روز کام چھوڑنے کا عہد کرتا مگر اگلے دن پھر کام پر آ جاتا۔ اِس عالم میں شام آتے ہی تھکا ہوا سو جاتا اور اگلے دن پھر وہی حالت۔ اِس عرصے میں دو بار گھر کا چکر لگایا۔ پورے گاؤں کی گلیوں میں گھومتا پھرا، گاؤں کے مضافات میں ٹاہلیوں کی چھاؤں میں لیٹا، شہر میں گیا، کئی کئی پہر پھاٹک والا چوک میں لکڑی کے تختوں پر گزارے، وہاں کی قفلیاں کھائیں، برف لال، سبز اور پیلے رنگوں کے گولے چوسے، کمپنی باغ اور چرچ روڈ، ٹھنڈی سڑک، نہروں کے کنارے اور شہروں کی گلیاں گھومیں۔ حبیب علی اور حاجی فطرس علی سے بھی ملا، کئی کئی پہر اُن کی مجلسوں میں بیٹھا اور اب تو کئی کامریڈوں سے بھی ملا مگر اُنھیں حکماً منع کر دیا کہ وہ مزدور اور سرمائے پر ہرگز میرے سامنے بات نہ کریں۔

میرے والدین کو معلوم تھا مَیں اپنے کام سے مطمئن نہیں ہوں مگر وہ بھی خاموش تھے کہ کسی اور طرف سے کام کی توقع نہیں تھی۔ دوسرا سرکاری دفتروں میں درخواستیں دے رکھی تھیں لیکن وہاں سے بغیر شناسائی کے نوکری ملنا محال تھی۔ والد صاحب البتہ خوش تھے کہ مَیں متواتر پیسے بھیج رہا ہوں۔ اگرچہ یہ پیسے بہت کم تھے مگر اُنھیں اُمید تھی مَیں ترقی کر جاؤں گا اور پہلے سے بہتر آمدنی حاصل کر سکوں گا اور جب تک شادی کو پہنچوں گا تب اپنے ہونے والے بیوی بچوں کو سنبھال لوں گا۔ اب مَیں فیکٹری کے رموز بھی سمجھنے لگا تھا اور ایک طرح سے احتجاج کی ہمت بھی پیدا ہو گئی تھی۔ مَیں نے اپنے پاس ایک تیز دھار چاقو رکھ لیا تھا جسے استعمال کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا استعمال کی نوبت آ گئی تو کیا اِسے استعمال کر بھی سکوں گا یا نہیں؟ کالونی میں سب سے بڑا مسئلہ پینے کے پانی کا تھا۔ اُس کے لیے دُور سے پانی کے کین بھر کر لانا ہوتے تھے۔ فیکٹری کی ڈیوٹی کے بعد یہ بھاری کام مجھے بہت

کوفت پہنچاتا تھا۔

پھر ایک دن میرا شعبہ بدل دیا گیا۔ وجہ یہ ہوئی کہ مَیں یونین کی طرف سے ہر ہفتے اپنے پیسوں کی کٹوتی پر چیخ پڑا اور انیس حیدر کے حضور جا کر شکایت کر دی۔ میری شکایت سُن لی گئی مگر اُس کے ساتھ ہی اگلے دن مجھے رُولر سے اُٹھا کر ایسی جگہ بھیج دیا گیا جسے جہنمیوں کی بستی کہا جا سکتا ہے۔ وہاں کا سپر وائزر پہلے سے بھی زیادہ منحوس تھا۔ اُس کی شکل بگڑ کر دوزخیوں جیسی ہو چکی تھی۔ آپ اُسے لاکھ بار سپر وائزر کہہ کر دل کو دلاسا دیں، وہ خود بھی یہی دلاسے دیتا تھا مگر وہ بھنگیوں سے زیادہ غلاظت پسند ہو چکا تھا۔ یہ شخص کپڑوں کو رنگ کرنے والے سیکشن کا افسر کہلاتا تھا۔ وہاں بھٹیوں میں جلتی ہوئی مسلسل آگ، چھڑے اور اُبلتے ہوئے رنگوں کی مرداروں جیسی بدبو اور کانوں کی نسیں مسل دینے والا شور اُس جگہ کو نہایت کریہہ کر چکا تھا۔ سپر وائزر کے بقول اُسے یہاں کام کرتے تیس سال ہو چکے تھے اور یہ بات وہ بہت فخر سے بتاتا تھا۔ چودہ گھنٹے کام کرنے کے بعد اُس کی شکل اُن مدقوق کتوں جیسی ہو چکی تھی جنھیں کیڑے پڑے تھے اور وہ دائمی عذاب میں تھے۔ نہایت بد ہیئت اور کریہہ شکل کا یہ سپر وائزر مجھے بار بار ہدایات اور نصیحتوں اور جھڑکیوں سے ہلاک کر رہا تھا۔ اُس کا کہنا تھا اُس نے سخت محنت اور لگن سے کام کرنے کے بعد اپنی تنخواہ پانچ ہزار کروائی تھی۔ مجھے نہ تو اُس کی تنخواہ سے سروکار تھا، نہ سخت محنت اور لگن سے واسطہ تھا۔ مَیں جانتا تھا یہ شخص مسلسل ایک دوزخ میں زندہ ہے اور یہیں فوت ہو گا پھر اتنی تنخواہ کا اِسے کیا فائدہ تھا؟ ایک اور بڑی ذلت تھی جس کا مَیں سامنا نہیں کر سکتا تھا، یہ سپر وائزر اور وہاں کام کرنے والے اُس کے دوسرے ساتھی ایک ساتھ مجھے کئی کام کے آرڈر دیتے تھے جنھیں انجام دینے کے لیے مجھے ایک دن میں کم از کم ستر گھنٹے درکار تھے چنانچہ اُن کے انجام نہ پا سکنے پر بے دریغ تضحیک اور تمسخر سے جملے بازی کرتے پھر ہنستے تھے۔ وہیں جنسی طور پر ہراس بھی کر رہے تھے۔ ایک بار مَیں نے یونین صدر سے اُن کی شکایت کی تو اُس نے مجھے حقارت سے رد کر دیا۔ پھر تمام دن کام کرنے کے بعد گیٹ سے باہر نکلتے وقت چوکیداروں کی تلاشی الگ مصیبت تھی۔

ایک دن انیس حیدر صاحب ایک انجینئر کے ساتھ فیکٹری کے ٹُور پر آئے۔ میری حالت دیکھی اور بے نیازی سے آگے نکل گئے۔ اُنھیں ایک مزدور کے ساتھ بات کرنا شاید اپنی ہتک لگی ہو۔ عجب بات تھی جنھیں شاید اپنے شہر میں ہوتے ہوئے مشکل سے اپنے سامنے بات کر سکنے کے قابل سمجھتا، وہ محض ایک افسرانہ شان سے میرے سامنے سے گزر گئے اور مَیں وہی ضامن جس کے آگے اِن کے

بھائی رضوان حیدر کو ایک بچے کی سی فرمانبرداری کا مظاہرہ کرتے مدت گزر چکی تھی، آج اُسی کے سامنے بے توقیر کھڑا تھا اور اُس نے بے رحمانہ طریقے سے نظر انداز کر دیا تھا۔ مَیں اِس حالت پر بہت رنجیدہ تھا اور اُسی لمحے فیصلہ کر لیا کہ آج کا دن میرے لیے اِس جہنم سے نجات کا مرحلہ ہے۔ ذلت کبھی کبھی اپنے عروج پر واقعی نجات بن جاتی ہے۔ چنانچہ دوپہر کے وقت مَیں ایسی آزادی اور جرأت کے ساتھ انیس حیدر کے کمرے میں داخل ہوا جس کا اندازہ اُس کا عملہ نہیں کر سکتا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتے کہ مَیں یوں بے باکانہ اُن کے کمرے میں کیسے آ گیا اور کیا چاہتا ہوں؟ مَیں نے کہا، سر مَیں آج سے فیکٹری میں کام نہیں کروں گا۔ اگر شام تک کی اُجرت مل جائے تو آج شام تک کے لیے ٹھہرنے کو تیار ہوں۔ ورنہ اِسی وقت سے میرا استعفیٰ سمجھیں۔ استعفیٰ کا لفظ ادا کرتے ہوئے مَیں ایک دفعہ جھجکا کہ یہ لفظ ایک مزدور کو زیب نہیں دیتا مگر انیس حیدر نے اُس لفظ کا بُرا نہیں مانا۔ ہو سکتا ہے مجھ سے پہلے بھی فیکٹری کے مزدوروں سے اِس قسم کے جارحانہ لفظ سنتا ہو۔ انیس نے کہا، ضامن صاحب بیٹھیے، یہاں بیٹھیے، میرے سامنے۔ مَیں اُن کے کہنے پر سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ تب وہ بولا، ضامن صاحب سنیے، مَیری یہاں ایک حیثیت ہے۔ مَیں جانتا ہوں آپ میری اُس بے نیازی سے دل برداشتہ ہوئے ہیں جو مَیں نے رنگسازی کے ڈیپارٹمنٹ میں ظاہر کی مگر دیکھیے یہاں مَیں کھلے عام مزدور سے سلام دعا رکھوں گا تو باقی تمام لوگ اپنی بدتمیزیوں میں بہادر ہو جائیں گے اور میرے لیے یہ بات فیکٹری اصولوں کے خلاف ہے۔

مَیں نے جواب دیا انیس صاحب، اِسی لیے مَیں آپ کو زیادہ زحمت نہیں دینا چاہتا۔ فیکٹری اُصول واقعی مزدوروں یا اگر مناسب ہو تو انسانوں سے زیادہ اہم ہیں۔ ہو سکے تو آج ہی میرا حساب کر دیجیے مَیں نہیں رُکوں گا۔

میری بات سُن کر اُس نے ایک لڑکے کو آواز دی، شفیق، ذرا دو کپ چائے لاؤ۔ تھوڑی دیر میں چائے آ گئی۔ اُنھوں نے ایک کپ مجھے دیا اور دوسرا خود پینے لگے۔ اُس کے ساتھ ہی ایک طویل پند شروع کر دیا اور وعظ کے ساتھ سمجھایا آپ کو جلد سپروائزر بنا دیا جائے گا اِس لیے کام ہرگز نہ چھوڑیں۔ آئندہ دس سال میں جس قدر تم کام سیکھ چکے ہو گے، اِن فیکٹری مالکان کی مجبوری بن جاؤ گے۔ پھر یہ تمھارا ہر نخرہ برداشت کریں گے۔ اُس کے بعد جلد تمھیں مزدور یونین میں کوئی عہدہ دلوانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یونین میں جانے اور یہاں کام کرنے میں ایک سہولت ہو جاتی ہے۔

زیادہ تر دوسروں سے ہی کام لینا پڑے گا اور جو کچھ یونین والے یونین فنڈ میں بچت کرتے ہیں، اُس میں سے بھی آپ کو حصہ ملا کرے گا۔ بس آپ چند دن اور صبر کر لیں۔ مَیں نے اُس کی تمام باتیں تحمل سے سنیں مگر چائے ختم ہوتے ہی دماغ سے سب کچھ نکل چکا تھا۔ مَیں جانتا تھا مزدور جب کام سیکھ جاتا ہے تو اُس کا کام کو چھوڑ دینا مزدور کے لیے کم مالک کے لیے زیادہ نقصان دہ ہوتا ہے لیکن اب اُنھیں یہ نقصان اُٹھانا ہی تھا۔

مَیں نے کہا، مجھے یہاں سپروائزر رہنا بھی پسند نہیں چنانچہ میرا حساب کر دیجیے اگر تکلیف نہ ہو، میرے لیے آپ کی یہی فیور بہت ہے اور مہربانی کا سبب ہے۔ پھر اگلے ہی دن مَیں دوپہر کے وقت کام چھوڑ کر نکل آیا کہ اُس وقت مجھے اپنے بقایا جات مل چکے تھے جن کا کریڈٹ بہرحال انیس حیدر کو دینا چاہیے۔

مجھے یہاں کام کے دوران اسلام آباد کے ایک علاقے میں ایک ایسی فیکٹری کا پتا چلا تھا جس میں پتھر تراشے جاتے تھے۔ مَیں وہاں آزادی کے ساتھ کام کر سکتا تھا۔ بدبو اور تلاشی وغیرہ کا کوئی جھنجھٹ نہیں تھا۔ مُرداروں جیسا بیزار کر دینے والا حبس نہیں تھا۔ مَیں اِس فیکٹری سے نکل کر سیدھا وہیں چل نکلا۔ مِل سے باہر نکل کر ایک ویگن پر بیٹھا اور پیرودھائی آ گیا۔ یہاں سے مَیں نے پیدل ہی سٹون کٹنگ فیکٹری کا رُخ کر لیا۔

پتھر کی کٹنگ والیاں چھوٹی چھوٹی فیکٹریاں اسلام آباد سے لے کر آگے ایبٹ آباد اور مانسہرہ تک چلی گئی تھیں۔ جہاں مجھے سٹون کٹنگ فیکٹری کا پتہ بتایا گیا تھا وہ جگہ ایسے مقام پر تھی جس کا اندازہ اسلام آباد کے مقامی اچھے طریقے سے کر سکتے تھے مگر مَیں ہر دو سو میٹر کے بعد کسی سے پوچھنے کی کوشش کرتا تھا اور وہ مجھے ایک الگ ہی مقام کی طرف رہنمائی کر دیتا تھا چنانچہ اُس تک پہنچنے کے لیے ایسے رستے بھی اختیار کرنا پڑ رہے تھے جو وہاں نہیں جاتے تھے۔ راستہ بتانے والے مسلسل بھٹکا رہے تھے۔ پھر بھی مجھے معلوم تھا مَیں پہنچ جاؤں گا اور بالآخر رات نو بجے اُس فیکٹری میں پہنچ گیا۔ یہ جگہ آئی ایچ ٹین کے ویران علاقے میں تھی۔ یہاں ایک ریلوے کی لائن بچھائی جا رہی تھی اور دوسری طرف مسلسل ویرانی کا ہونکا تھا۔ سارا دن پیدل چلتے ہوئے یہاں پہنچا تھا اور تھکاوٹ سے بُرا حال تھا۔ سٹون کٹنگ فیکٹری کے سامنے بہت بڑا جنگلی شہتوتوں کا جنگل تھا۔ مَیں نے ایک صاف جگہ دیکھ کر اپنی چادر بچھائی۔ میرے پاس دو کتابیں تھیں۔ اُنھیں سر کے نیچے رکھا۔ دوسری چادر اُوپر رکھی اور سو گیا۔ مِل میں کام

کرنے کے بعد یہ پہلی رات تھی جس میں مجھے ایک آزادی کی سرشاری کا احساس ہوا۔ اگلے دن سورج کی تیز کرنوں نے جگایا اور بتائے ہوئے نقشے کی طرف دوبارہ چل پڑا اور اُس فیکٹری کے گیٹ کے سامنے آ گیا۔ اِس کے چاروں طرف چھوٹے بڑے پتھروں کے ڈھیر لگے تھے۔ گیٹ کے اندر بکھرے ہوئے پتھروں کے سبب ایک کھنڈر اور ویرانے کی سی فضا تھی۔ اِسی وسیع ویرانے میں پتھر کاٹنے والی وہ مشینیں نصب تھیں جن کے گرد سفید گرد نے گھیرا باندھا ہوا تھا۔ گیٹ پر کوئی چوکیدار نہیں تھا مَیں اندر داخل ہو گیا۔ سامنے ایک آفس بنا تھا۔ یہاں محض تین کمرے تھے۔ باقی جگہ کھلے آسمان میں پھیلی ہوئی تھی اور سنگِ مرمر کے پتھروں کے چھوٹے بڑے کئی ڈھیر اِدھر اُدھر بکھرے تھے۔ اِن میں کچھ کچرا تھا اور کچھ کام کے پتھر تھے۔ مَیں فیکٹری کے مالک سے ملاقات کے لیے اُس کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ چھدری داڑھی والا ایک چالیس سالہ جوان تھا۔ اُس نے تھوڑی دیر میری کہانی سنی۔ مزدوری طے کی اور اُسی دن کام پر لگا دیا مگر شام تک مجھے اندازہ ہو گیا، یہ گرد میرے گردوں اور پھیپھڑوں کو زیادہ دن چلنے نہیں دے گی۔ وہاں موجود تمام مزدور یرقان اور سانس کی بیماری میں مبتلا تھے۔ اُنھی مزدوروں نے مجھے بتایا کہ کچھ دن پہلے ایک مزدور اِسی بیماری میں جاں بحق بھی ہو چکا تھا۔ اِس کے باوجود میں نے پورا دن یہاں کام کیا لیکن رات کو سونے کے لیے جو کمرہ ملا وہ فیکٹری کی گرد سے بھی زیادہ پریشان کُن تھا۔ اُس میں نمی بہت تھی۔ یہ نمی فرشوں اور دیواروں میں اتنی زیادہ چڑھی کہ سانس نہیں لی جا سکتی تھی۔ اِس کے سبب کھٹمل اور کیڑے مکوڑوں نے جنم لے رکھا تھا۔ یہ کھٹمل کھجور کے پتوں سے بُنی چارپائی کے بان میں سیکڑوں کی تعداد میں گھسے ہوئے تھے اور سونے کے دوران وہاں سے نکل کر انسان کے ہر اُس جگہ داخل ہونے کی کوشش کرتے تھے جس میں سوراخ تھا۔ ایک کمرے میں پانچ چارپائیاں تھیں اور ہر چارپائی پر دو بندے سوتے تھے۔ فیکٹری میں زیادہ تعداد افغانی لڑکوں کی تھی۔ یہ تمام لڑکے اِسی آئی ٹین کی اردگرد جھونپڑیوں سے اکٹھے ہوئے تھے۔ اِنھیں یہاں کام کرنے میں دو فائدے تھے کہ ایک کام مل گیا تھا دوسرا رہنے کے لیے جگہ میسر تھی کیونکہ اِن کی اپنی جھونپڑیوں میں پہلے ہی کافی ٹھنسا ٹھنسی تھی۔

مجھے اُنھی افغانی لڑکوں کے درمیان ایک چارپائی دے دی گئی جس پر ایک لڑکا اور سوتا تھا۔ یہ سب کام ختم ہونے کے بعد نہا دھو کر اور صاف کپڑے پہن کر بس اڈے کی طرف جانے کے لیے تیار ہو گئے اور مجھے بھی ساتھ لے جانے کے لیے کہنے لگے مگر مَیں اُن کے وہاں جانے کی منطق نہیں سمجھ سکا

اور جانے سے انکار کر دیا۔ اِسی دوران بارش ہونے لگی جس میں انھیں بھی جانے کا موقع نہ ملا۔ پھر اس بارش نے رات وہ اُدھم مچایا کہ الامان۔ آندھی اور طوفان کے ساتھ ساری رات برستی رہی۔ یہ بارشیں تب بھی بہت زیادہ ہو رہی تھیں جب مَیں مِل میں کام کر رہا تھا۔ وہاں جس روز بارش ہوتی ساری مِل کالے رنگ کے دُھویں سے بھر جاتی۔ یہ سیاہ دُھواں مِل کی دیواروں پر تہ در تہ جم کر نہایت وحشت ناک ہو گیا تھا جو بارش کے برسنے سے مزید مایوسانہ کیفیت سے دوچار کر دیتا جس کی وجہ سے مجھ پر ڈپریشن طاری ہو جاتا۔ مَیں وہاں اکثر بارش کے نہ ہونے کی دعا مانگتا تھا کہ مجھے یہ کالک اپنے وجود میں گھستی ہوئی محسوس ہوتی۔

اِس رات کی بارش نے اُس سے بھی زیادہ ڈپریس اور مجبور کر کے رکھ دیا۔ اِسی رات ایک پریشان کُن بات جو سامنے آئی وہ اِس سے بھی زیادہ حیرت ناک تھی۔ یہ تمام افغانی لڑکے، جو مجھ سے عمر میں تو کم تھے مگر جنسی تلذذ کے شیدا تھے، اِنھوں نے نہایت بے باکی سے اپنے کپڑے اُتار دیے اور اس نیم تاریک، کالے اور سیم زدہ گیلے بدبودار کمرے میں ایک دوسرے کے ساتھ جفتی میں مصروف ہو گئے۔ یہ تمام لڑکے نہایت دلیری سے برہنہ ہو کر اور کھلے پن سے آپس میں سیکس کرنے لگے۔ ایک لڑکا جو میری چارپائی پر لیٹا تھا مجھے شدت سے دعوت دینے لگا۔ مَیں پہلے ہی چارپائی کے کھٹملوں اور بدبو میں سانس بند ہونے سے پریشان تھا دوسرا اچانک یہ عذاب میرے لیے ناگوار ہو گیا۔ مَیں اُٹھ کر دروازے کے پاس آ کر نیچے فرش پر بیٹھ گیا۔ فرش پر بارش کی بوچھاڑ سے پانی پھر رہا تھا۔ مجھے یہاں بیٹھنے میں بہت کراہت محسوس ہوئی اور باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگا لیکن بارش نے طوفان برپا کر رکھا تھا۔ آخر وہاں دروازے کے پاس کھڑا رہا۔ یہ حالت دیکھ کر اُس لڑکے کو آخر کار مجھ پر ترس آ گیا۔ اُس نے مجھے کہا آپ آ کر لیٹ جائیں، کچھ نہیں کہوں گا۔ یہ کہہ کر وہ دوسری چارپائی پر چلا گیا اور اپنے ہم مشربوں کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ اُس کے بعد مَیں نے یہ تمام رات جاگ کر اور کھانس کر نکالی اور صبح کی اذانیں ہوتے ہی وہاں سے نکل بھاگا۔ میرے ایک دن کی مزدوری بھی وہیں رہ گئی۔

مَیں کسی ایسے معجزے کی تلاش میں تھا جو جلد ایک باوقار پیشے سے منسلک کر کے معاشی فراغت سے ہم کنار کر دے۔ ظاہر ہے یہ معجزے کتابوں کی دنیا میں رونما ہو سکتے ہیں مگر عملی زندگی میں اِن کا وجود نہیں تھا۔ واپس بھی نہیں جانا چاہتا تھا۔ مَیں صبح کی اذان کے وقت وہاں سے نکلا تھا۔ چلتا ہوا سورج نکلنے تک فیض آباد پہنچ گیا۔ یہاں بہت سی بسیں لاہور اور اُس سے آگے جا رہی تھیں۔ بے ارادہ طور پر

مَیں ایک بس میں بیٹھ گیا۔ پھر شام تک اپنے شہر پہنچ چکا تھا۔

گاؤں پہنچا تو میرے سامنے صدمے کا اژدھا منہ کھولے کھڑا تھا۔ ہمارے گھر کے سامنے لوگوں کا ایک ہجوم نظر آ رہا تھا۔ مجھے بتایا گیا رات میری دادی فوت ہو گئی ہے۔ وہ کئی دن سے بیمار تھی اور مجھ سے ملنے کے لیے بے تاب تھی مگر کئی بار فیکٹری میں رابطہ کرنے کے باوجود مجھ تک اطلاع نہ پہنچ سکی۔ اُنھیں بتایا گیا کہ مَیں فیکٹری چھوڑ کر جا چکا تھا۔ میرے والد کو حیرانی تھی اگر مَیں فیکٹری سے چلا گیا ہوں تو گھر کیوں نہیں آیا؟ یا ہمیں تار اور ٹیلی فون کے ذریعے اطلاع کیوں نہ پہنچائی۔ مَیں گھر میں داخل ہوا اور دادی کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ فطرت بعض کام ایسی دانائی سے کرتی ہے کہ اُس میں نقص کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ ایسے واقعات سیکڑوں نہیں لاکھوں گنے جا سکتے ہیں کہ اپنی تکمیل کے دوران کسی بھی عیب سے مبرا ہوئے ہیں اور حیران کن بات یہ ہے کہ انسان اُن پر یقین نہیں کرتا مگر وہ انسانوں کی خواہشات کے برعکس ہیں۔

دادی کا جنازہ اُٹھنے ہی والا تھا کہ مَیں پہنچ گیا تھا۔ تمام لوگ کہہ رہے تھے خدا کو منظور تھا کہ مَیں اُس کے جنازے پر ضرور پہنچوں اِسی لیے اُسے دفنانے میں اتنی دیر ہوئی۔ مَیں نے پہنچ کر اپنی دادی کا منہ دیکھ لیا۔ میری دادی سفید لٹھے میں ایسے پڑی تھی جیسے بچہ پیدا ہونے کے بعد سفید کپڑے میں لپیٹ کر چارپائی پر لٹایا جاتا ہے۔ مَیں اُسے اُٹھانے کے لیے آگے بڑھا مگر مجھے چارپائی کے ارد گرد بیٹھی عورتوں نے روک دیا۔ مَیں نے دادی اماں زینب کے چہرے سے لٹھا ہٹا کر (مَیں اُسے کفن ہرگز نہیں کہوں گا) اُس کے پُرسکون چہرے پر اپنا منہ رکھ دیا اور دیر تک روتا رہا۔ تب کچھ عورتوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر دُور جا کر بٹھا دیا۔ میرے والد صاحب نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا پھر ہم دونوں باپ بیٹا جی بھر کر روئے۔ اُس کے بعد جنازہ اُٹھا کر لے چلے اور مَیں جنازے کے ساتھ ساتھ، کبھی روتا جاتا تھا کبھی درود پڑھتا جاتا تھا۔ دادی اماں کی ایک ایک بات وقفوں کے ساتھ ساتھ اگلے پچھلے زمانوں سے دل و دماغ میں ریل پیل ہو رہی تھی۔ جنازے کے لیے ہم نے حاجی فطرس علی کو شہر سے بلوایا۔ اُن کے یہاں آ کر جنازہ پڑھانے میں یوں تو کوئی دلیل نہیں تھی مگر مجھے ایک حوصلہ ضرور ہوا تھا۔ حاجی فطرس علی مغربین پڑھنے کے بعد واپس چلے گئے اور مَیں دوبارہ آ کر اُس چارپائی پر لیٹ گیا جس پر میری دادی لیٹتی تھی۔ میری امی رہ رہ کر بین کرتی تھیں اور والد صاحب پر ایک خموشی چھائی ہوئی تھی۔

چھٹے دن ساتویں کا ختم تھا۔ ساتویں میں ہمارے بہت سے رشتے دار و غیر رشتہ دار جنھیں یہ زعم تھا

کہ وہ رشتہ دار ہیں مگر کبھی مَیں نے اُن کی شکل نہیں دیکھی تھی، تشریف لائے۔ وہ رشتے دار میری دادی کے ساتھ بیسیوں قسم کی نوازشوں اور عنایتوں کے واقعات گنواتے رہے۔ کسی کا دعویٰ تھا کہ اُسے میری دادی نے ہندوستان میں کئی سال گود میں کھلایا تھا۔ کسی کو مٹھائی دی تھی اور کسی کو جب ملتی تھی دعائیں دیتی تھی۔ مَیں نے یہ رشتہ دار اپنی زندگی میں پہلی ہی بار دیکھے تھے۔ اِنہی میں ایک واجد علی تھا۔ یہ لاہور میں کسی اونچے عہدے پر تھا۔ اِس کا دعویٰ تھا اگر بچپن میں ایک دفعہ میری دادی اُسے کان سے پکڑ کر سکول نہ چھوڑ کے آتی تو آج وہ بھی ایک بدھو کی طرح پلے داری کر رہا ہوتا۔ اُس نے میرے والد سے کہا، اُن کا ایک دوست اسلام آباد میں سیکرٹری کے عہدے پر کام کرتا ہے اور بڑا افسر ہے۔ اُسے ایک بااعتماد پی اے کی ضرورت ہے۔ میرا خیال ہے ضامن کو اُس کے پاس بھیج دینا چاہیے۔ میرا والد اِس سفارش پر بہت خوش ہوا۔ مجھے بھی بے حد خوشی ہوئی کہ ایک بار فیکٹریوں کی بیماری سے جان چھٹی اور تین مہینے بعد مَیں اسلام آباد میں پہنچ گیا۔

(۴۷)

تین ماہ بعد ایک گھوسٹ قسم کے اخبار میں وزارتِ خارجہ کی طرف سے ٹائپسٹ کی خالی آسامی کا اشتہار چھپا۔ مجھے پہلے ہی بتا دیا گیا تھا، اِس طرح کا ایک اشتہار آئے گا۔ آپ اُس کے لیے درخواست دے دیں۔ مَیں نے احتیاطاً دو ماہ لگا کر شارٹ ہینڈ اور ٹائپنگ سیکھ لی مگر میری ٹائپنگ کی رفتار اچھی نہ بن سکی تھی۔ اشتہار چھپنے کے بعد مجھے ایک آدمی بھیج کر اسلام آباد بلا لیا گیا اور ٹیسٹ کے لیے باقاعدہ خانہ پُری کی گئی۔ یہ جگہ اسلام آباد کے مشرق کی طرف نئے تعمیر کیے گئے ایوانِ صدر اور اسمبلی ہال کے بائیں طرف تھی۔ اِسے ڈی بلاک کا نام دیا گیا تھا اور بے شمار درخت لگائے گئے تھے۔ یہ درخت مقامی نہیں تھے لیکن اونچے اور سایہ دار ضرور تھے۔ اِن درختوں کے پتے نیم کے پتوں کی طرح تھے مگر یہ نیم کے پیڑ بہر حال نہیں تھے۔ اِن کے علاوہ بے شمار جنگل نما شہتوت تھے مگر یہ بھی شہتوت نہیں تھے بلکہ شہتوت کی طرح کا کوئی پودا تھا۔ اِس کے پتوں کی شکل تو شہتوت ہی کی تھی مگر شہتوت کے پتے کی چمک اور چکناہٹ اِس میں نہیں تھی نہ یہ پھل دیتا تھا۔ عجیب بے فیض سا پودا تھا لیکن اس کا سایہ بہت زیادہ تھا۔ مجموعی طور پر یہ علاقہ بہت زیادہ خوبصورت تھا البتہ عمارتوں کی حالت بہت بُری تھی۔ تمام عمارتیں اگرچہ نئی تھیں مگر بڑے سائز کے مرغیوں کے ڈربے تھے۔ انتہائی گھٹیا قسم کا آرکیٹکچر تھا۔ اِن عمارتوں کو دیکھنے سے آنکھوں پر ایک بوجھ سا بڑھ جاتا تھا۔ درختوں اور عمارتوں کی دیواروں پر ہری کائی سی چڑھی تھی۔ اِس کے سبب ایک ٹھنڈک کا احساس ضرور ہوتا تھا۔ اِس کا مطلب

تھا یہاں بارشیں متواتر ہوتی تھیں۔

ہمیں ٹیسٹ لینے کے لیے ایک بڑے سے کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ میرے سامنے ایک کھڑکی تھی۔ جس سے پوری وادی کی مارگلہ پہاڑیاں سروں پر چڑھ رہی تھیں۔ یہ انتہائی سرسبز اور بادلوں کے درمیان سُرمئی ہو گئی تھیں۔ میرے ساتھ پندرہ لڑکے اور بھی اِس آسامی پر اپنے آپ کو پیش کرنے بیٹھے تھے۔ مَیں دل ہی دل میں اُن کی سادہ لوحی اور کمترین سطح کی حماقت پر مسرت کا اظہار کر رہا تھا۔ یہ بے وقوف کتنے مسکین، احمق اور بے خبر تھے۔ تیسری دنیا میں اپنی نالائقی کے باوجود دوسروں پر فوقیت حاصل کر لینا قابلِ فخر سمجھا جاتا ہے۔ ہم جن پر فوقیت حاصل کرتے ہیں اُنھیں احمق سمجھ کر اُن کی تحقیر کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہم شعوری طور پر نہیں کرتے بلکہ یہ بات صدیوں کی نسل در نسل خوشامد اور چاپلوسی نے ہمارے اندر راسخ کر دی ہے جو لاشعوری طور پر ایسے موقعوں پہ ظاہر ہوتی رہتی ہے۔

میرے ساتھ ٹیسٹ دینے والے بچارے خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع کر رہے تھے حالانکہ یہ سیٹ میرے لیے مختص تھی بلکہ اس کا اشتہار ہی میرے لیے اپروو ہوا تھا۔ اِس کے باوجود مَیں ڈر بھی رہا تھا کہیں اِن میں سے کوئی ایسا لڑکا نہ نکل آئے جو مجھ سے بھی بڑی سفارش رکھتا ہو۔ مَیں اپنے اردگرد ٹیسٹ دیتے ہوئے لڑکوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ انتہائی اچھی رفتار سے ٹائپ کر رہے تھے۔ دو لڑکوں نے تو دس منٹ کے اندر اے فور سائز کے دو دو صفحے بھر دیے تھے۔ موٹی عینک لگائے ہوئے یہ دونوں لڑکے انتہائی نفیس بھی تھے۔ شاید بھائی ہوں۔ فی منٹ کم سے کم ساٹھ الفاظ لکھ گئے تھے۔ مَیں خاص طور پر اِن سے ڈر گیا تھا۔ کہیں نوکری یہی لڑکے نہ لے جائیں مگر سیکرٹری صاحب جیسا کہ پہلے کہہ چکے تھے اُنھیں بااعتماد لڑکے کی ضرورت تھی نہ کہ پروفیشنل کی۔ چنانچہ یہ بات مجھے حوصلہ دے رہی تھی۔ خدا کا شکر تھا ابھی تک اِس ملک میں پروفیشنل ازم نہیں آیا تھا ورنہ مَیں اِس ملازمت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا۔ اِس ٹیسٹ کے تین دن بعد شارٹ لسٹ لگی، اُس میں اُنھی لڑکوں کے ساتھ میرا نام بھی تھا۔ پھر اگلے ایک دن بعد مَیں واحد لڑکا تھا جسے انٹرویو کے لیے بلایا گیا اور حیران کُن بات یہ تھی کہ جو ورق مَیں نے ٹائپ کیا تھا اُس کی بجائے اُن لڑکوں میں سے ایک کے ٹائپ کیے ہوئے دونوں ورق سامنے پڑے تھے جن پر میرا رول نمبر درج تھا۔ اِس صورت میں مجھے یقین ہو گیا کہ اِس نوکری کا اہل صرف مَیں ہی ہوں۔ انٹرویو میں مجھ سے گھر اور والد کے متعلق معلومات لی گئیں اور اُسی وقت نوکری کی خوشخبری سنا دی گئی۔ اگلے دن میرا اپائنٹ

منٹ لیٹر تیار ہو گیا۔

سیکرٹری صاحب نے ابھی تک مجھے اپنے کمرے میں نہیں بلایا تھا۔ صرف ایک باراُس کا سامنا ہوا تھا۔ وہ بھی تین مہینے پہلے وہاڑی میں اُس کے وسیع وعریض آموں کے باغات میں جہاں وہ اپنی زمینوں کو دیکھنے آیا تھا۔ میرے والد کا دوست مجھے اُس کے پاس لے گیا تھا تا کہ ایک نظر دیکھ لے کہ مَیں اُس کے اعتماد کا ہوں بھی یا نہیں۔ وہاں اُس نے مجھ سے ایک دو معمولی باتیں کر کے اوکے کر دیا تھا۔

اب یہاں وزارتِ خارجہ کے دفتر میں مجھے چودھویں سکیل کے کلرک کی حیثیت میں کام کرنا تھا۔ مجھے بتا دیا گیا تھا گھبرانا بالکل نہیں، صاحب بہت اچھے ہیں۔ آؤ بھگت اچھے طریقے سے شروع ہو چکی تھی۔ مَیں ایڈمن آفیسر کے حوالے کر دیا گیا۔ یہ عجیب شکل کا آدمی تھا، سر پر سادہ کپڑے کی گول ٹوپی تھی۔ بھری ہوئی داڑھی تھی۔ موٹی عینک لگا تا تھا۔ اِس کی ناک اتنی موٹی اور بھدی تھی کہ دیکھنے سے کراہت آتی تھی۔ ماتھے پر نماز کے سجدوں کے سبب نہایت سیاہ رنگ کا داغ تھا جو ناسور کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ یہ داغ اُس کی ناک کی مناسبت سے ٹھیک تھا۔ بے ڈھنگی ناک پر عینک نے مزید گڑھا ڈال دیا تھا۔ عینک کی کمانیوں کے سبب یہ گڑھے اُس کے کانوں اور کن پٹیوں پر بھی تھے۔ اُس نے عینک کو موٹے سیاہ دھاگے سے باندھ کر گلے میں لٹکا لیا تھا۔ اب اُس کا ہاتھ بار بار عینک کو ناک پر اور ناک سے نیچے گرانے میں مستقل حرکت میں رہتا تھا۔ عینک پر بندھا ہوا سیاہ دھاگا اُس کی موٹی گردن میں ایک پھندے کی طرح جھول رہا تھا۔ مَیں نے پھانسی کی سزا پانے والے مجرم کبھی نہیں دیکھے مگر اِس کی گردن پر سیاہ دھاگا دیکھ کر سب سے پہلے مجھے پھانسی کی رسی کا خیال آیا۔

ایڈمن آفیسر نے ہیڈ کلرک کو بلا کر مجھے اُس کے حوالے کرتے ہوئے کہا، نجیب اللہ یہ لڑکا اپنے ساتھ رکھ لو اور ایک ہفتے بعد رپورٹ کرو کہ اِسے کام آ گیا ہے کہ نہیں؟ فائل کی نمبرنگ، ٹیگ لگانا، اُس پر نوٹ لکھنا، اعتراض لگانے کا طریقہ، کون سی فائل آگے بڑھانی ہے کون سی روکنی ہے، کون سی فائل کس شعبے کے حوالے کرنی ہے اور صاحب کے موڈ سے لے کر دفتر کے ماحول تک ہر شے کی اِسے خبر ہو۔ نجیب اللہ نے ایڈمن آفیسر کی بات بہت دھیان سے سنی اور کہا سر آپ فکر نہ کریں، اِسے پندرہ دن کے اندر پوری کلرکی آ جائے گی۔ سمجھیں یہ اُسترا ہو گا۔ ٹھیک ہے جایئے، ایڈمن آفیسر نے آخری الفاظ اتنی بے نیازی سے کہے کہ مجھے اُس کے اِس فقرے سے اپنی توہین محسوس ہوئی۔ جیسے کہہ رہا ہو یہ پُرزہ لے

جائے، مٹی کے تیل سے اچھی طرح صاف کر کے اِسے موٹر میں فٹ کر دیجیے۔ اُسی وقت مجھے اس دفتر میں بیٹھے تمام کلرک اور افسر اپنی اپنی جگہ پر موٹر میں فِٹ ہوئے پرزے لگے۔ بڑے بڑے اور چھوٹے چھوٹے سب پرزے تھے۔ یہ ایڈمن آفیسر تو گاڑی کا سائیلنسر تھا۔ اِس کے خراب ہونے کی صورت میں گاڑی کا دم گُھٹ جاتا ہوگا۔ تھوڑی دیر پہلے جب صاحب ڈائریکٹر نے مجھے اُس کے حوالے کیا تھا تو انتہائی عزت سے پیش آ رہا تھا لیکن ہیڈ کلرک کے حوالے کرتے ایسی بے نیازی برتی جیسے کوئی شخص اپنا کتا دوسرے کو بیچ کر اُس سے لاتعلق ہو جائے۔ ہم کمرے سے باہر نکلے تو ایڈمن آفیسر نے نجیب اللہ کو دوبارہ آواز دی، ہم دونوں اُس کی آواز پر مُڑے۔ نجیب اللہ نے مجھے وہیں روک دیا اور خود کمرے میں داخل ہو گیا۔ مَیں دروازے کے ساتھ کھڑا تھا۔ ایڈمن آفیسر نے نجیب اللہ سے کہا، اِسے سکھانے میں کوتاہی نہیں کرنی، صاحب کا خاص بندہ ہے۔

سر آپ بے خوف رہیں، مَیں اُسی وقت سمجھ گیا تھا۔ نجیب اللہ کی آواز میں تیقن تھا۔

ٹھیک ہے جائیں اور پندرہ دن سے زیادہ نہیں لینے۔ ایڈمن آفیسر نے حکم دیا جس کا نام مَیں ابھی تک نہیں جان سکا تھا۔

جی مَیں سمجھ گیا۔ نجیب اللہ کسی نادیدہ ہُنر پر فخر سے بولا۔

یہ گفتگو ختم ہوئی تو نجیب کمرے سے باہر نکل کر بولا، ضامن صاحب میرے پیچھے آ جائیں۔ وہ دور تک نظر آنے والے کوریڈور میں چلنے لگا۔ رستے میں کئی چھوٹے چھوٹے کلرکوں نے اُسے سلام کیا۔ نجیب اللہ مجھے ایک بڑے کمرے میں لے گیا۔ یہاں چھ میزیں اِدھر اُدھر لگی ہوئی تھیں۔ اِن کی کوئی ترتیب نہیں تھی۔ ہر میز کے آمنے سامنے دو کرسیاں رکھی تھیں۔ ایک کرسی کام کرنے والے کی اور ایک کرسی ملاقاتی یا سائل کے لیے۔ مشرقی اور شمالی دیوار کے ساتھ لوہے کی بڑی الماریاں پڑی تھیں۔ الماریوں کے علاوہ کئی ریک بھی تھی۔ یہ ریک لوہے کے تھے۔ میزیں ساری لکڑی کی تھیں۔ نجیب اللہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک کُرسی پر بیٹھنے کو کہا اور خود میرے سامنے بیٹھ گیا۔ چار پانچ کلرک پہلے بھی یہاں موجود تھے اور اپنے کام میں لگے تھے۔ ہر ایک کے سامنے ایک بڑا رجسٹر تھا اور میزوں پر بھاری فائلوں کے جتھے پڑے تھے۔ وہ اُن پر نظریں جمائے اِس طرح کام میں مصروف تھے جیسے خورد بین سے وائرس تلاش کر رہے ہوں۔ اِسی دوران سر اُٹھا کر ایک دوسرے کو لطیفہ بھی سنا دیتے تھے۔ ہر کلرک کی آنکھوں پر عینک چڑھی تھی۔

نجیب اللہ نے مونچھوں کے دونوں کونے ایک بار اُوپر چڑھائے۔ اچھی طرح سے اُن کی نوکیں بنائیں۔ پھر اپنے سر سے ٹوپی اُتار کر میز پر رکھی اور دائیں ہاتھ کی اُنگلیوں کو جالے کی طرح ایک دوسرے میں پھنسے ہوئے بالوں میں پہلے دائیں پھر بائیں گھمایا، پھر جیب سے کے ٹو کا سگریٹ نکال کر تیلی سے اُسے دائیں ہاتھ کی انگلی اور انگوٹھے سے گول کیا۔ اُس کے بعد اُسے بھی میز پر رکھ دیا۔ پھر اپنی بڑی سی بستے جیسی جیب سے ماچس کی ڈبیا نکالی، وہ بھی میز پر رکھ دی۔ پھر ایک منٹ تک غور سے میری طرف دیکھتا رہا پھر بولنے لگا۔ اُس کے بولنے کا انداز ایسے تھا جیسے وہ ایک فلاسفر تھا۔ اُس کا آفس کائنات تھی اور وہ کائنات کے رموز جانتا تھا۔

دیکھو میاں، یہاں کلرکی کرنے کے چند اُصول ہیں۔ یہ اُصول اُن سے مختلف ہیں جو کتابوں میں لکھے ہیں۔ اگر نوکری کرنی ہے تو میری چند باتیں لکھ کر اُنھیں اپنے گلے میں لٹکا لو اور کانوں میں تیل کی طرح انڈیل کر باہر سے روئی ٹھونس کر ڈھک دو۔ پہلا اُصول یہ ہے کہ یہ آفس تمھارے لیے ایک قبر ہے۔ اِس قبر کا ہر راز اِسی تک رہے۔ دفتر کی کوئی بات دفتر کے گیٹ سے باہر نہ جائے۔ اِسی میں دفن ہو۔

اپنے افسر کے کام پر اعتراض مت کرو چاہے وہ ملک کا سودا ہی کر رہا ہو۔ یاد رکھو صاحب کو سزا کبھی نہیں ہو سکتی اور سبارڈی نیٹ کبھی بچ نہیں سکتا۔ افسر کے کسی کام کی ٹوہ میں نہ لگنا، ورنہ نوکری سے فارغ یا تمام عمر کرپشن کے الزام میں جیل جاؤ گے۔

تم سمجھ رہے ہو گے یہ آفس گورنمنٹ کا ہے، اِن الماریوں میں پڑی فائلیں، یہ کرسیاں، یہ میزیں، یہ دیواریں اور اِس آفس کا تمام سرمایہ اِس ملک کا ہے۔ ٹھیک ہے، کتابوں میں اور سیکشن نوٹ بکس میں یہی لکھا ہے لیکن اصل میں سیکرٹری ہی اِس کا مالک ہے۔ اگر وہ کہے اِن دیواروں میں لگی اینٹیں اُٹھا کر میرے گھر لگا دو۔ تو ایک لمحے کی دیر مت کرنا۔ یہ ساری دیواریں اُٹھا کر وہاں لگا آنا۔ محبِ وطن بننے کی سیڑھی ہمیشہ غداری کے کنویں میں اُترتی ہے۔ ہم یہاں گورنمنٹ کی نوکری کرنے نہیں آئے، اپنے باس کی نوکری کرنے آتے ہیں۔ جسے گورنمنٹ کہتے ہیں وہ یہاں کا فقط باس ہوتا ہے۔ اصل اُسی کی نوکری کرنے آتے ہیں۔

اپنے باس کو مت یاد دلاؤ کہ اُس نے فلاں فائل پر ابھی تک سائن نہیں کیے۔ جو فائل آپ کا باس روک لے، چاہے ایک سال، دو سال یا ساری عمر روکے رکھے، اُس کو بھول جاؤ اور جس فائل پر اُسی دن دستخط کر دے تم اُسے اپنے پاس مت روکنا ورنہ بے موت مارے جاؤ گے۔

صاحب کمرے میں جس وقت بلائے اُس وقت جانا۔ بلا وجہ اُس کے کمرے میں جانے کی کوشش نہ کرنا۔ ضروری کام ہے تو اُن کے پی اے سے کہنا، تمھاری صاحب سے ملاقات کرائے۔ اگر ڈیوٹی صاحب کے ساتھ لگی ہے تو جلد دفتر پہنچ جاؤ اور اُس کے گیٹ میں انٹر ہونے سے پہلے گیٹ پر موجود ہو۔ آگے بڑھ کر صاحب کا دروازہ کھولو۔ باہر نکل کے چل پڑے، تب اُن کے بریف کیس کو گاڑی سے نکالو اور اُن کے کمرے تک پہنچاؤ۔ صاحب گاڑی پر بیٹھنے کا ارادہ کرے تو اُن کا بریف کیس پانچ منٹ پہلے گاڑی میں پہنچ جانا چاہیے۔ جب تک گاڑی چلی نہیں جاتی وہیں کھڑے ہو جاؤ۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے صاحب کو عین اُس وقت کوئی چیز یاد آتی ہے جب وہ جانے لگتا ہے۔ اگر کوئی فائل چاہیں کہ اُن کے بریف کیس میں ڈال دو تو اُسے فوراً بریف کیس میں ڈال دو اور سمجھ لو اہم فائل ہے۔ پھر اُس کی بابت سوال مت کرو۔ چاہے وہ تمام فائل کاپی ہو جائے۔

صاحب کو مشورہ نہ دو، چاہے کتنی ہی حکیمانہ بات تمھارے دماغ میں موجود ہو۔ جس کام کو صاحب کہیں کہ اُسے کرو تو کسی بھی قانونی شق کے مطابق ممکن بناؤ لیکن صاحب سے مت پوچھو کہ کیسے کریں یا یہ کہ نہیں ہو سکتا۔ کام لے کر بار بار پی اے کے کمرے میں جانے کی ضرورت نہیں۔

دیکھو، اِس آفس کے دو سیکرٹری ہیں۔ ایک صاحب خود اور دوسری اُن کی بیگم۔ اُن کی ضروریات کا خیال رکھنا تمھاری اور صرف تمھاری ذمہ داری ہے۔ گاڑی سے لے کر یونیورسٹیوں کی فیس اور گروسری کے سامان وغیرہ۔ لیکن تمام چیزوں کا ذکر صاحب سے نہیں کرنا کہ اُن کے گھر کی ضروریات کہاں سے پوری ہو رہی ہیں۔ جب تک خموشی سے پوری ہوں گی سب ٹھیک۔ اگر صاحب کے سامنے ذکر کیا تو وہ ایماندار ثابت ہوں گے اور تم اِس جگہ نہیں ہو گے۔ ضروریات کے پورا کرنے میں کوتاہی کرد گے تو بھی نہیں ہو گے۔

یہ دفتر تمھارا ہے۔ آپ اِس کے حقیقی نوکر ہیں اور اِس دفتر کے عملے کے علاوہ بس یہ سمجھ لو باقی تمام دُنیا اِس دفتر کی دُشمن ہے۔ اُن سے تم نے اس کی ہر شے چھپانی ہے۔ تمھیں بالکل رفاہِ عامہ کا علمبردار بننے کی ضرورت نہیں۔ ایمانداری سے کام کرنا چاہتے ہو اور سائلوں کی خدمت کرنے آئے ہو تو وہ خدمت اپنی حدود میں رہ کر کرتے جاؤ۔

نجیب اللہ کی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی اور مَیں نے پوچھنا مناسب سمجھا، میری کون سی حدود ہیں؟ ذرا اُن کی وضاحت بھی کر دیں تو آپ کی مہربانی سر۔

نجیب اللہ دوبارہ بولا، مثلاً تمھارے سائل کا کوئی کام ہے، جس کے کرنے کا صرف تمھارے پاس ہی اختیار ہو اور اُس کے لیے تم کسی کو جواب دہ نہیں، نہ اُس سے لیے گئے پیسوں کو تم نے اوپر تک جمع کروانا ہو، نہ اُس سائل کی تمھارے باس کے ساتھ کوئی رنجش ہو تو سمجھ لو وہ تمھاری حدود میں ہے۔

مَیں نے نجیب اللہ کی اُن باتوں پر مسلسل سر ہلا کر داد دی۔ یہ تمام باتیں ایسی تھیں جن کی واقعی مجھے ضرورت تھی اور پہلے خبر نہیں تھی۔

اب تم نے سب سے پہلے ایک کام کرنا ہے۔ نجیب اللہ نے دوبارہ کہا۔

مَیں اُس کی طرف منہ کیے بیٹھا غور سے دیکھتا رہا۔ اُس نے کام کے متعلق ہدایات جاری کرنا شروع کیں لیکن اُس سے پہلے آخری کونے میں بیٹھے ہوئے ایک چالیس سال کے کلرک کو آواز دی جو رجسٹر پر کچھ فائلوں کے نمبر درج کر رہا تھا۔ رفیق صاحب ذرا ایک منٹ یہاں تشریف لائیے گا؟

جی سر، کہہ کر رفیق اپنی فائلیں وہیں چھوڑ کر ہمارے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

یہ آپ کے نئے کولیگ ہیں۔ اِس کا نام ضامن علی ہے۔ اِس کی آنکھیں بھوری ہیں، بال سیاہ ہیں، گال چکنے ہیں مگر ہم نے اِن سے صرف آفس کا کام لینا ہے۔ اِنھیں جلد سے جلد کام سکھانا ہے۔ اتنا کہہ کر اُس نے ایک بار مجھے آنکھ ماری، پھر مجھ سے مخاطب ہوا، ضامن علی آج سے آپ اِن کی ٹیبل پر بیٹھ کر کام کریں گے اور سیکھیں گے لیکن اِس سے پہلے آپ دونوں ایک کام کریں۔ یہ دیواروں کے ساتھ لگی الماریاں دیکھ رہے ہو؟ سب سے پہلے آپ نے ایک فہرست تیار کرنا ہے۔ اُس میں اِن الماریوں میں پڑی فائلوں کے نام اور اُن کے عہدوں کی تاریخی ترتیب کے ساتھ تقسیم کرنی ہے۔ یہ سب فائلیں بے ترتیبی سے پڑی ہیں۔ آپ دونوں نے پہلے چپڑاسیوں کی فائلیں الگ کر لینی ہیں بلکہ وہ پہلے ہی الگ الماری میں ہیں۔ اُن کو تاریخی اعتبار سے ترتیب دینا ہے۔ ہمارے پاس 1950ء سے پہلے کا ریکارڈ نہیں ہے۔ آپ نے دائیں سے بائیں طرف فائلیں ترتیب دینا ہیں اور سب سے نیچے والے خانے سے آغاز کرنا ہے۔ پھر اُس سے بعد بھرتی ہونے والے کی فائل، پھر اُوپر کا خانہ پھر اُس سے اُوپر کا خانہ۔ چپڑاسیوں کے بعد آپ نے لوئر گریڈ کلرکوں اور اپر گریڈ کلرکوں کی فائلیں دو نمبر الماری میں لگانی ہے۔ سولہ اور سترہ اور اُٹھارہ گریڈ والے آفیسر جو کلرکوں سے ترقی کر کے آئے ہیں یعنی ڈی ایم جی سے نہیں ہیں، اُن کا خانہ الگ بنا لیں۔ سترہ، اُٹھارہ اور انیس ڈی ایم جی گریڈ والوں کا خانہ الگ بنا لیں۔ بیس، اکیس اور بائیس گریڈ کے سیکرٹریز کی فائلیں یہاں نہیں ہیں، وہ اسٹیبلشمنٹ ڈیپارٹمنٹ

میں ہیں۔ اُنھیں ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں سے ایک رجسٹر لے لیں۔ اُس پر اُن کے نام اور فائل نمبر درج کرتے جائیں۔ جب ایک الماری مکمل ہو جائے اُس پر اُس کے خانے کا ٹیگ لگا دیں۔ یہ کام آپ نے دو دن میں نمٹانا ہے۔

جی بہتر سر، مَیں نے کہا اور ہم نے کام کا آغاز کر دیا۔ اُس کے بعد پورا دن ہم اِسی کام پر لگے رہے۔ لوگ اور سائل آتے جاتے رہے مگر ہمیں اُن میں سے کسی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اِس کام کے دوران مَیں نے محسوس کیا، فائلوں کے بندھے ہوئے دھاگے، اُن کے گتے، اُن میں پڑی بوسیدہ اور نئی درخواستیں اور نوٹس بہت زیادہ تھے۔ بعض ملازمین کی فائلیں اتنی بھاری ہو گئی تھیں کہ ایک سے دو فائلیں بنانا پڑی تھیں۔ کسی کی سب سے بھاری فائل کا مطلب یہ تھا کہ وہ شخص کام چور بھی ہے، چھٹیوں پر رہتا ہے، فنڈ لیتا ہے، مکان کے لیے قرضہ لیتا ہے، مسلسل ڈیپوٹیشن کے چکر میں ہوتا ہے یعنی جو کچھ اُس کے لچھن تھے، سب فائل میں درخواستوں اور نوٹس اور پیروں کی شکل میں درج تھے۔ بعض کی فائلوں میں اُن کے بے ترتیب ہوئے کاغذات ترتیب میں کرتے ہوئے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض ملازم نوکری ملنے کے دوسرے ہی دن ڈیپوٹیشن پر کسی دوسرے محکمے میں کئی گنا بھاری تنخواہ پر چلا گیا ہے اور پچھلے دس دس سال سے ڈیپوٹیشن پر ہے۔ اُس کی خاص وجہ مجھے میرے ساتھی کلرک نے یہ بتائی کہ یہ سب سیکشن بک کے کمال ہیں۔ اُس میں ملازمت کے متعلق ایسے قوانین ہیں کہ کرپشن نہ ہو سکے اور لوگ اپنے عزیزوں کو بلاوجہ فائدہ نہ پہنچا سکیں مگر اُسی سیکشن بک میں اُن قوانین کو پامال کرنے کے رستے بھی دیے گئے ہیں۔ فرض کیا ایک محکمے میں نوکری دینا آسان ہے، دوسرے محکمے میں نوکری پر رکھنے کے قوانین مشکل ہیں۔ صاحب لوگ اپنے عزیزوں کو یا جنھیں وہ نوکری دینا چاہتے ہیں آسان محکمے میں بھرتی کروا کر ڈیپوٹیشن پر لے لیتے ہیں کیونکہ سیکشن بک میں ایک محکمے سے دوسرے میں جانا قانونی پکڑ میں نہیں آتا اور ڈیپوٹیشن پر لینا مشکل کام نہیں فقط محکمے کے سیکرٹری کے اپروول کی ضرورت ہے۔ چونکہ تمام صاحب لوگ ایک دوسرے کو ابلائج کرتے ہیں، اِس لیے یہ کام چلتے رہتے ہیں۔

تو اِن پر کوئی اعتراض نہیں کرتا اور قوانین کی یہ شقیں ختم نہیں کی جا سکتی؟ یا پھر انھیں فول پروف بنا دیا جائے۔ مَیں نے ایسے ہی سوال کر دیا حالانکہ مجھے معلوم تھا میرا یہ سوال بے معنی ہے۔ اپنے ہی جیسے کلرک سے اِس طرح کیا احمقانہ گفتگو کر رہا تھا۔

رفیق نے ہنس کر جواب دیا، اِن چیزوں پر کیسے اعتراض ہو سکتا ہے؟ کیا دریائے ستلج کے

کنارے جھونپڑی میں رہنے والا کوئی شخص یہ اعتراض اُٹھائے گا؟ کیا کوئی عام آدمی ایسا کوڈ کی باریکیاں جانتا ہے؟

مَیں نے حیرانی سے کہا، مَیں سمجھا نہیں؟

میاں جن کے حق یہ لوگ کھاتے ہیں اُنھیں اِن دفتروں تک نہ آگہی ہے نہ رسائی ہے۔ نہ وہ اِس دنیا سے واقف ہیں۔ اُنھیں یہ خبر نہیں کہ اسلام آباد کے فلاں نمبر کمرے میں فلاں فائل کے بیچ پر اُس کا معاشی اور سماجی قتل ہو چکا ہے۔ یا اُس کی آزادی سلب کر لی گئی ہے۔ اُسے بالکل اطلاع نہیں۔ وہ مظلوم شخص اُس فلاں دفتر میں موجود فلاں فائل تک تب پہنچے جب اُسے یہ بھی معلوم ہو کہ اِس طرح کے کوئی محکمے بھی ہیں اور اِس طرح کے کوئی دفتر بھی ہیں۔

تو یہ جو اکثر عدالتوں میں ایک دوسرے کی حق تلفی کے مقدمے دائر ہوتے ہیں یہ کیا ہیں؟

یہ تو غاصبوں کی ایک دوسرے کے درمیان مقدمہ بازی ہوتی ہے۔ رفیق نے بے نیازی سے جواب دیا، آپ کیا سمجھتے ہو، یہ ہمارے دفتر کے پانچ چھ سو عملے کا کام کیا ہے؟ کیا یہ عوام کے لیے کام کر رہے ہیں؟

تو کس کے لیے کام کر رہے ہیں؟

بھائی اِن میں سے ننانوے فی صد ملازم ایک دوسرے کی تنخواہیں، چھٹیاں، الاؤنس اور خدمتیں بنا رہے ہوتے ہیں۔ یعنی دفتروں کے ملازم دراصل اپنے ملازموں کے لیے کرنے والے کام کو اصل کام سمجھتے ہیں اور کرتے ہیں۔ چھوڑو یار کس چکر میں پڑ گئے ہو۔ یہ لو فائل نمبر تیس بٹا تین 57۔

ہم نے اسی طرح کی گفتگو کرتے ہوئے دو دن میں تمام فائلوں کو ایک ترتیب میں کر دیا بلکہ اُس سے بڑھ کر ایک اور کام کیا کہ اِن لوہے کی الماریوں پر لگی ہوئی پان اور سپاری کی تھوکوں کو رگڑ کر دھو دیا۔ یہ تھوکیں اِن الماریوں پر اُنھی وقتوں سے جمی ہوئی تھیں جب دارالحکومت کراچی سے اسلام آباد منتقل ہونے کے ساتھ بے شمار کلرک عملہ بھی اپنے پان سپاریوں کے ساتھ پنڈی شفٹ ہو گیا تھا۔ علاوہ ازیں چھتوں پر لگے مکڑی کے جالوں اور پنکھوں پر جمی ہوئی مکھیوں کی گھن بھی کھرچ ڈالی۔ اِس کام کے کرنے کے بعد مجھے مسرت ہو رہی تھی کہ نجیب اللہ اِس صفائی والے اضافی کام پر داد دے گا لیکن تیسرے دن اُس نے دفتر کو دیکھا تو گویا صفائی دیکھی ہی نہیں۔ میرا خیال ہے اُسے صفائی سے کچھ غرض ہی نہیں تھی بلکہ وہ تو ایک طرف، خود سیکرٹری صاحب کو بھی غرض نہیں تھی۔ وہ جس کوریڈور سے گزر کر

روزانہ اپنے کمرے میں جاتے تھے، اُس کی دیواروں پر بھی پان کی پیکیں نظر آ رہی تھیں مگر وہ سونگھ کر آگے نکل جاتے تھے۔ نجیب اللہ فائلوں کی الماریوں کو ہلکا سا دیکھ کر اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔ اُس کے بعد دوپہر تک اُس نے سوائے گندے لطیفوں کے، جو اُس نے کمرے میں بیٹھے اپنے دیگر کلرک بھائیوں کو سنائے تھے اور کچھ کام نہیں کیا۔ دو تین بار البتہ کچھ فائلیں اُٹھا کر ایڈمن آفس کی طرف ضرور گیا۔ مجھے اُس کے رویے سے عجیب سی بے پروائی کی بُو آئی جیسے آج وہ میرے کسی کام پر ناخوش ہو لیکن جیسے ہی دوپہر کی چھٹی گزر کر دو بجے کے بعد کام شروع ہوا تو اُس نے مجھے دوبارہ اپنی میز کے پاس طلب کیا اور دس سے پندرہ فائلوں کا پلندہ میرے حوالے کرتے ہوئے بولا، ضامن میاں یہ فائلیں لو۔ انھیں ایک ایک کر کے کھولو۔ اِس میں مختلف قسم کی درخواستیں ہیں۔ اُن کے بیٹھ کر اپروول نوٹ بناؤ۔ آپ کے ساتھ آج یہ نوٹ کا کام نذر محمد کریں گے۔ انگریزی تو کچھ تھوڑی بہت آتی ہے نا؟

جی کچھ کر لوں گا، مَیں نے کہا اور فائلوں کا پلندہ اُٹھا کر بغل میں دبا لیا۔ نذر محمد تھوڑی دیر بعد میرے پاس آ گیا۔ اُس نے دو سے تین فائلوں کے نوٹ پیرے بنانے میں میری معاونت کی پھر اُٹھ کر چائے کا سامان کرنے لگا۔ ایک چپڑاسی کیتلی میں چائے اور کچھ بسکٹوں کے پیکٹ لے کر آ گیا۔ اُس نے ایک دراز سے آٹھ پیالیاں نکال لیں۔ چائے کی سب سے پہلی پیالی اُس نے نجیب اللہ کی میز پر رکھی پھر دو کلرکوں کو دیں۔ ایک پیالی اُس نے میری میز پر بھی رکھ دی۔ فائلوں پر نوٹ لکھنے کا کام بہت آسان تھا لیکن اتنا زیادہ تھا کہ مجھے شام تک وہاں بیٹھنا پڑا۔ یہ شاید ایک ہفتہ کا کام تھا جسے کرنے کے لیے وہ روز سوچتے تھے۔ اِسی دوران شام کے ساڑھے پانچ ہو گئے۔ نجیب اللہ نے جاتے ہوئے وہاں مجھ سمیت کام میں مصروف ایک اور آدمی کو کچھ ہدایات دیں کہ آج کام مکمل کر کے ہی اُٹھنا ہے اور دفتر سے نکل گیا۔ شام کے وقت قریب پورا اسکرٹریٹ خالی ہو چکا تھا۔ جیسے ہی شام سات بجے باہر نکلنے لگا ہمارے دفتر کا ایک آدمی آگے بڑھا، اُس نے کہا، سر آپ کا نام ضامن علی ہے؟ مَیں نے کہا، جی مَیں ہی ضامن ہوں۔ وہ بولا سر مجھے حکم ملا ہے آپ کو ڈرائیونگ سکھاؤں۔ آپ نے ایک گھنٹا مجھے دینا ہے۔ مَیں حیران تھا، مجھے ٹائپسٹ رکھا گیا ہے، کلرک رکھا گیا ہے یا ڈرائیور رکھا ہے؟ مَیں سر جھکا کر اُس کے ساتھ ایک گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اُس نے گاڑی مارگلہ روڈ پر ڈال دی اور سٹیرنگ مجھے تھما دیا۔

اُس کے بعد تین مہینے تک مَیں یہی کچھ کرتا رہا۔ پہلے تمام دن دفتر کی فائلوں میں مغز ماری کرتا۔ اُس کے بعد ڈرائیونگ سیکھتا۔ رہنے کے لیے مجھے آفس کے ایک کمرے میں جگہ دے دی گئی۔ یہ کمرہ

اصل میں ویٹنگ روم کا ایک حصہ تھا۔ مجھے حکم دیا گیا سورج نکلنے سے پہلے اپنا بستر اُٹھا کر الماری میں بند کر دیا کروں۔ مَیں نے اپنا ایک وقت رکھا تھا کہ جب ملازمین آفس آنا شروع ہوتے اُن سے آدھ گھنٹا پہلے بستر اُٹھا کر ویٹنگ روم کو صاف کر دیتا اور آفس کے غسل خانے میں نہا کر کینٹین پر ناشتا کرنے نکل جاتا۔ تین ماہ میں اِس نتیجے پر پہنچا کہ ہمارا یہ دفتر اگر کسی کام میں دلچسپی رکھتا ہے تو وہ اپنے اور اپنے جیبوں کے مفادات کا تحفظ تھا۔ عوام سے نہ اِن کو غرض تھی، نہ عوام کو اِن سے غرض۔ مَیں نے تین ماہ میں ہر کام سیکھ لیا۔ پھر ایک دن میری ڈیوٹی خاص صاحب کے ساتھ لگ گئی اور مجھے حکم ملا کہ اپنا بستر اُٹھا کر میری کوٹھی پر لے آؤ۔

(۴۸)

مَیں اپنے بستر اور چند کتابوں کے ساتھ صاحب کی کوٹھی میں منتقل ہو گیا۔ کوٹھی ایک کنال کے رقبے میں تھی۔ انتہائی خوبصورت جگہ پر تھی۔ ایف سکس تھری کی دس نمبر سٹریٹ میں کونے والی یہ کوٹھی اپنے اردگرد کی تمام کوٹھیوں میں زیادہ نمایاں نظر آ رہی تھی۔ لان اور پچھلی طرف کے حصے میں سرو کے پودے تھے۔ باغیچے میں انار، ناشپاتی اور سیب کے پودوں کی کاشت کی گئی تھی۔ پورا لان مختلف پھولوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ پھول مقامی نہیں تھے۔ کوٹھی کے سامنے جیکرانڈا اور وہی نیم نما بڑے بڑے درخت تھے۔ یہ گلی اور اِس کے آس پاس کی تمام گلیاں نہایت صاف اور درختوں سے بھری ہوئی تھیں۔ کوٹھی کے پچھلی جانب کی دو گلیاں چھوڑ کر ایک پارک تھا جس میں گلِ مہار، جیکرانڈا اور اِسی طرح کے بیسوں درخت اور پھول تھے۔ سائے اور گھنی چھاؤں کے اعتبار سے یہ جگہ اسلام آباد کی کسی بھی دوسری جگہ سے زیادہ خوبصورت تھی۔ سامنے کی دو گلیوں کے بعد چند قدموں کے فاصلے پر کہسار مارکیٹ تھی۔ مجھے کوٹھی کے عقب میں موجود سرونٹ کوارٹر کے دو کمروں میں سے ایک کمرہ دے دیا گیا۔ دوسرے کمرے میں ایک نوکر رہتا تھا۔ یہ نوکر بائیس تیئس سال کا ایک لڑکا تھا اور مری کے عباسی قبیلے سے تھا۔ اِس کا کام صاحب کے کتوں کی دیکھ بھال کرنا تھا۔ اُن کے پاس دو کتے تھے۔ اُن میں سے ایک ڈوگوار جنٹائنو تھا اور دوسرا روٹ ویلر تھا۔ دونوں کتوں کی نسل بھی صاحب کی طرح اعلیٰ خاندان سے تھیں اور صاحب نے کسی برطانوی سفیر سے مول لیے تھے جب وہ اپنی ملازمت سے سبک دوش ہو کر واپس جا رہے تھے۔

صاحب دن میں ایک بار اُن میں سے کبھی ایک کتے کے ساتھ اور کبھی دوسرے کے ساتھ شام کو چہل قدمی کرنے باہر نکلتے۔ کتوں کو سنبھالنے والا عباسی لڑکا صاحب سے سو میٹر کے فاصلے پر پیچھے چلتا۔ اگر کسی جگہ صاحب کو اچانک کسی دوست کے ساتھ گپ شپ کرنا ہو اور کتے اُسی جگہ حوالے کرنا پڑیں تو نوکر اُنھیں وصول کر لے۔

سیکرٹری صاحب کی بیٹی اور اُن کی بیوی لان میں اکثر چہل قدمی کرتیں پھر کمروں میں چلی جاتیں۔ مین گیٹ سے اندر ہو کر ایک سیدھی گلی صاحب کی کوٹھی کی پچھلی جانب سرونٹ کوارٹر میں جاتی تھی۔ مَیں بغیر اِدھر اُدھر دیکھے سیدھا اپنے کوارٹر کا رُخ کرتا۔ مجھے اور عباسی لڑکے کو مالی کی طرف سے لان میں گھومنے کی اجازت نہیں تھی۔ ویسے بھی مجھے لان کبھی پسند نہیں رہے تھے۔ مَیں تو کھیتوں کھلیانوں کا آدمی تھا۔

میرا کام پہلے کچھ دن تو فقط صاحب کے ساتھ دفتر جانا اور وہاں سے اُن کا بریف کیس لے کر واپس کوٹھی پر آنا رہا۔ بعض اوقات دفتر کی پک اپ پر کوٹھی میں آتا مگر اکثر صاحب اپنے ساتھ ہی لے جاتے۔ اُن کا میرے ساتھ سلوک عجیب طرز کا تھا۔ نہ ملازموں والا برتاؤ تھا اور نہ گھر کے فرد کی حیثیت سے تھا۔ کئی دن تک مجھے سمجھ نہیں آئی آخر مجھ پر اِس طرح کی عنایت کا سبب کیا ہے؟ گھر میں پکا ہوا کھانا خانساماں میرے کمرے میں لے آتا۔ البتہ دوپہر کے وقت مجھے دفتر کی کینٹین سے کھانا پڑتا تھا۔ سیکرٹری صاحب کی بیٹی کا نام نویزا تھا۔ نہایت خوبصورت، لمبے قد اور نازک اعضا کی مالک تھی۔ گھنگھریالے بال تھے اور آنکھوں میں بلیو لینز لگا کر رکھتی۔ مَیں اس کی آنکھوں کو نیلی سمجھتا تھا مگر جب کچھ دن اس نے اُنھیں سبز بنا لیا تو مجھے خبر ہوئی کہ لینز نام کی کوئی شے ہے جو آنکھوں کا رنگ بدل دیتی ہے اور یہ باہر کے ملکوں سے آتی ہے۔ اُس کا نام بھی عجیب تھا۔ یہ نام مَیں نے پہلی بار سُنا تھا، شاید کوئی فرنچ قسم کا تھا۔ سیکرٹری صاحب کو کلچر اور زبان تو فرنچ پسند تھی مگر اُن کے تعلقات زیادہ تر امریکنوں سے تھے۔ پہلے فرسٹ سیکرٹری پھر آہستہ آہستہ سفیر کے ساتھ رابطہ ہو گیا تھا۔ نویزا کا بوائے فرینڈ بھی ایک امریکی تھا۔ اُس کا نام فلپس تھا۔ یہ ایک اونچے لمبے قد کا خوبصورت جوان تھا اور ایمبیسی میں کام کرتا تھا۔ یہاں کے کم و بیش تمام اکیس اور بائیسویں گریڈ کے سیکرٹریوں کی یہی حالت تھی کہ اُن کے لڑکے اور لڑکیوں کی تمام دوستیاں فارنرز کے ساتھ تھیں اب یہ الگ بات تھی کہ فارنر امریکی ہے یا یورپین۔ میرے صاحب کا گریڈ یوں تو اکیس تھا مگر پچھلے دو سال سے کسی بڑی سفارش پر بائیس گریڈ والی سیٹ

میں کام کر رہے تھے اور اُنھیں توقع تھی کہ ٹھیک تین سال بعد اُن کا گریڈ بائیس ہو جائے گا۔ اُس کے لیے اُنھوں نے مختلف جگہوں میں سفارشوں کے جال پھیلا رکھے تھے۔ جس سیکرٹری کی بچی یا بیٹے کی امریکن کے ساتھ راہ و رسم ہوتی وہ اُسی قدر احساسِ برتری میں ہوتا تھا اور اُس کی ترقی میں رکاوٹ مشکل ہوتی تھی۔ یہ بات مجھے سیکرٹریٹ میں کام کرتے واضح ہو چکی تھی۔ دوستی کا یہ موقع اُنھیں اُن پارٹیوں میں ملتا تھا جس میں سیکرٹری اور ایمبیسیڈرز ایک دوسرے کے گھروں میں اپنے بچوں سمیت آتے جاتے تھے۔ ایمبیسیڈرز کے لیے پارٹیز کرنا اِس لیے اہم تھا کہ اُنھیں ملک کے اندر اپنی پالیسیز کو نافذ کرنے کے لیے یا گنجلک معاملات کو حل کرنے کے لیے راہیں ملتی تھیں۔ دوسری طرف سیکرٹریز کی فیملیز کے لیے امریکن اور یورپین ویزے اور فارن نیشنلیٹیز مل جاتی تھیں۔

کوٹھی میں ہر ہفتے کسی نہ کسی کی دعوت ہوتی تھی مگر مجھے اُس میں کبھی شامل ہونے کے لیے نہیں کہا گیا۔ مجھے پہلے دن کی ٹریننگ میں سمجھا دیا گیا تھا جب تک صاحب کسی شے کے بارے میں شامل ہونے کے لیے نہ کہیں، اُس جگہ سے دور رہیں۔ یہ بات میں نے اپنے پلے باندھ لی تھی۔ مجھے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ مَیں اپنے گھر میں ماہ بہ ماہ تنخواہ بھیج رہا تھا اور گاؤں کے تمام لوگوں میں میرے والد کا معیار اور مقام بلند ہو گیا تھا۔ اُن کے خطوں سے پتا چلتا تھا کہ وہ میرے بارے میں نہ صرف مطمئن تھے بلکہ بہت زیادہ خوش بھی تھے۔ اب میرے پاس زیادہ کام نہیں تھا۔ صاحب نے اپنے گھر میں اپنے ایک خاص کمرے میں ایک مشین نصب کر رکھی تھی۔ جس پر ایک فائل کی ہو بہو کئی فائلیں نقل تیار ہوتی تھیں۔ میرا کام اُن کی نقلیں تیار کرنا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی کام نہیں تھا۔ یہ نقلیں کیوں تیار کی جاتی تھیں اور کن کو دی جاتی تھیں، اِس معاملے میں مَیں بالکل بے خبر تھا۔ صرف اپنے کام سے غرض رکھتا تھا اور دوسری طرف سر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ صاحب بھی مجھ سے اس کے علاوہ دوسرا کوئی کام نہیں لیتے تھے۔ اِس لیے شام کے بعد میں کچھ ہی فاصلے پر موجود میلوڈی مارکیٹ میں موجود میلوڈی بک ڈپو پر چلا جاتا تھا۔ یہ کتاب گھر بہت پرانا تھا اور نہایت عمدہ جگہ پر تھا۔ مجھے یہاں سے دو سہولتیں تھیں۔ ایک تو دکاندار سے میں اپنی پسند کی مفت کتاب حاصل کر کے پڑھ سکتا تھا۔ دوئم وہاں موجود دکاندار سے میرے دوستانہ تعلقات ہو گئے تھے۔ دکاندار کا نام عابد حسین تھا۔ یہ آدمی ایک طرح سے مجھے سید فطرس علی کا متبادل مل گیا تھا۔ اگرچہ سید صاحب کی طرح ہر فن مولا نہیں تھا مگر میرے لیے اسلام آباد میں اس کا وجود نعمت تھا۔ پہلے پہل مَیں صرف اِس کی دکان پر کتاب کی غرض سے گیا تھا لیکن آہستہ آہستہ تعلقات

اور مزاج شیر وشکر ہو گئے۔ اب میری اکثر یہ کوشش ہوتی کہ جلد کام ختم ہو اور مَیں میلوڈی بک ڈپو پر چلا جاؤں۔ یہ ادبی اور دیگر کتابوں کی ایسی مرکزی جگہ تھی جہاں سے اردگرد کے تمام لوگ کتابیں حاصل کرنے آتے تھے۔ قریب ہی ایک چائے کا ہوٹل تھا۔ اُس سے تمام دن چائے آتی۔ عابد صاحب گاہکوں سے گفتگو بھی کرتے، کتابیں بھی بیچتے اور دُنیا کے ہر موضوع پر سیر حاصل تبصرے بھی کرتے۔ مَیں بلا ناغہ یہاں آنا شروع ہو گیا۔ بک شاپ پر کچھ صحافی بھی آتے تھے۔ کئی صحافی عابد حسین کے دوست تھے۔ اُن کی نسبت سے میری اُن سے بھی دوستی ہو گئی جن میں سب سے زیادہ میل جول الطاف صاحب سے ہوا۔

الطاف صاحب ایک بڑے اخبار میں کالم لکھتے تھے اور دُکان پر کبھی کبھی آتے تھے۔ مہینے میں ایک آدھ دفعہ لیکن جب آتے محفل خوب جم جاتی تھی۔ اِسی میلوڈی مارکیٹ کے دوسری طرف پریس کلب تھا۔ پریس کلب ایک چھوٹے سے فلیٹ میں ایک سڑک کنارے واقع تھا۔ اُس کے آگے چوڑی اور دورویہ سڑک تھی۔ یہ سڑک بھی درختوں کی چھاؤں میں واقع تھی۔ جو ایک طرف سیدھی آب پارہ میں جانکلتی اور دوسری طرف جی سکس کو عبور کر کے بلیو ایریا کو چھوتی تھی۔ میرا پریس کلب میں بھی چکر لگنے لگا اور مَیں ایک اخبار میں بے ضرر سے مضامین بھی لکھنے لگا۔ یہ مضامین ایک غیر معروف اخبار میں چھپنے کے سبب میرے دفتر کے کسی آدمی کو خبر نہ تھی کہ مَیں کیا کر رہا ہوں۔ نہ ہی میرے صاحب کو کسی قسم کی اطلاع تھی۔ وہ کتاب نہیں پڑھتے تھے البتہ بہت سی انگریزی کتابیں گھر میں رکھی ہوئی تھیں۔ انگریزی اخبار اور رسائل کو خوب چاٹتے تھے۔ اِسی عرصے میں مجھے پریس کلب کا ممبر بنا دیا گیا لیکن اِن مضامین کا معاوضہ وغیرہ کچھ نہ تھا۔ محض شاباش پر سب کچھ چل رہا تھا۔ مَیں جن چھوٹے موٹے اخباروں میں لکھتا تھا وہ سرکاری دفتروں اور پبلک اوپینین بنانے والے کسی فرد کے پاس اول تو پہنچ ہی نہیں سکتے تھے۔ اگر کسی طرح سے پہنچ ہی جاتے تو اِنھیں پڑھنے کی زحمت کوئی نہیں کرتا تھا۔ البتہ تیسرے درجے کے نائیوں کی دکانوں اور ڈھابوں پر اُن اخباروں کی کاپیاں مفت تقسیم کر دی جاتیں۔ اِس طرح ایسے اخباروں کی سرکولیشن بھی شو ہو جاتی اور اُس میں لکھنے والے میرے جیسے صحافی اُنھی حجاموں سے بال بنواتے اور اُنھی ڈھابوں پر بیٹھ کر چائے پیتے اور کھانے کھاتے اور وہاں پڑے اُس چیتھڑا اخبار کو کھول کر اپنے ہی لکھے مضمون کو پڑھنا شروع کر دیتے۔ تھوڑی دیر بعد چائے ختم ہوتی تو وہ کھلا ہوا صفحہ ٹیبل پر رکھ کر اُٹھ جاتے جس پر اُن کا مضمون چھپا ہوا ہوتا۔ بعض اوقات اپنے کسی دوست کو بھی ایسے ہی کسی

تو اُس کے پاس لے جا کر چائے پلاتے اور بے نیازی سے وہ اخبار اُس کے سامنے رکھ دیتے تاکہ وہ اُسے کھول کر دیکھ سکے۔

اب ہم جیسے نوواردوں کی تمیزی کہیں بھی لطافت رہی کہ اپنا ہی مضمون پڑھنے کے لیے ایسے ہی کسی ڈھابے کا انتخاب کرتا تھا البتہ پریس کلب میں نیا اخبار بھی اُن بڑے اخباروں کے ساتھ پڑے ہوتے تھے۔ یہ ایسی ہی بات تھی جیسے اقوامِ متحدہ میں امریکی صدر کے ساتھ سوڈان کا صدر بھی بیٹھا ہوتا ہے۔ یہی بات سوڈانی صدر کی تسلی کے لیے کافی ہوتی ہے کہ امریکی صدر کو اپنا ہم منصب کہہ لے۔ بڑے اخباروں کے بڑے صحافی پریس کلب میں شاذ و نادر ہی آتے۔ مجھے جب بھی موقع ملتا وہاں چلا جاتا تاکہ کسی بڑے صحافی سے ملاقات ہو جائے مگر اکثر ناکامی ہوتی۔ وہاں متواتر بیٹھنے والے اپنی دنیا میں خوش رہتے۔ اُن کے خیال میں صحافت یہی ہوا کرتی تھی۔ بہت سے نام تو محض سرکارِ مدار کے قصیدہ خواں تھے اور تحریر سے بالکل نابلد ہوتے تھے۔ وہ ایجنسیوں کی آشیرباد سے صحافت کے نام پر بیٹھے تھے لیکن میں دیکھتا تھا کہ اُن پر طعنہ زنی کرنے والے جب بھی انھیں دیکھتے، دوڑ کر اُن کے ساتھ کھڑے ہو جاتے۔ تاکہ اپنے اخبار میں اپنے ساتھ اُن کی تصویر چھاپ کر ہم منصب ہونے کی کوشش کی جائے۔ جس اخبار میں میرے مضامین چھپتے رہتے تھے اُن میں سے ایک نسخہ میں نے میلوڈی بک ہاؤس پر لگوا دیا تاکہ کم از کم وہاں کے بیٹھنے والے تو مجھے جان لیں اور اس کوشش میں کامیاب بھی ہو گیا۔

پھر میں نے آہستہ آہستہ پریس کلب جانا چھوڑ دیا۔ اس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ وہاں بیٹھنے والے کسی بھی صحافی کو کتاب یا کسی بھی قسم کی تحریر پڑھنے سے دشمنی تھی اور اُن میں چھوٹے بڑے صحافی کی تخصیص نہیں تھی۔ وہ اپنے کولیگ کی چھپی ہوئی تحریر بھی نہیں پڑھتے تھے اور بعض کی اس وجہ سے نہیں پڑھتے تھے تاکہ انھیں بتایا جا سکے کہ تم زیادہ اہم نہیں ہو۔ دوسری وجہ وہاں پر منغض کر دینے والی گروہ بندی اور خواہ مخواہ کی سازشیں تھیں۔ ان سب سے بڑی قباحت جس نے مجھے اُن سے دُور کیا تھا، ہر آدمی کو اُدھار مانگنے کی پھر واپس نہ کرنے کی عادت گداگری کی حد تک پروان چڑھی ہوئی تھی۔ اُن میں سے کچھ تو ایسے تھے کہ جیب میں پیسہ ہوتا تب بھی قرض مانگ رہے ہوتے تھے۔ اس میں اُن کا قصور کم تھا۔ اُن کے اخبار تنخواہ کم دیا کرتے تھے ... بڑے اخبار کے عملے کو چھ چھ ماہ تک تنخواہ نہیں دی جاتی تھی ... مجھے میلوڈی بک ڈپو پر بیٹھنے والوں میں زیادہ لطف آنے لگا ... مجھے کوئی کام نہیں دیا جاتا تھا۔ دو مہینے

پہلے سیکرٹری صاحب کی ترقی ہو کر وہ بائیس گریڈ میں چلے گئے تھے۔ پچھلے چار مہینے سے اُنھوں نے مجھ سے کوئی کام نہیں لیا تھا مگر اب کچھ دن سے کام زیادہ ہو گیا تھا۔ سیکرٹری صاحب فائلوں کی نقلیں اپنی نگرانی میں تیار کرواتے۔ کبھی ایک فائل اور کبھی تین تین فائلیں بنواتے تھے۔ پھر اصلی فائل کو اپنے اُسی بریف کیس میں رکھ لیتے اور باقی فائلوں کو دوسرے بریف کیس میں رکھ کر اُسے مقفل کر دیتے۔ بعض اوقات سیکرٹری صاحب کے ساتھ کسی دوسرے شعبے کا سیکرٹری بھی آ کر یہی کام مجھ سے لیتا۔ فائلیں تیار کرنے کا یہ کام مَیں نہایت مستعدی سے کرتا رہا۔ مجھے یہ فائلیں پڑھنے کا موقع کم ملتا تھا۔ اول تو فائلیں انگریزی زبان میں ہوتیں، پھر اُن کی کاپیاں کرنے کے دوران سیکرٹری صاحب میرے سر پر کھڑے ہوتے تھے۔ مجھے بھی زیادہ سروکار نہیں تھا۔ مَیں اپنا کام کیے رکھتا۔ یہ مشین ایک گول کمرے میں لگی ہوئی تھی۔ جس میں نہ تو کوئی کھڑکی تھی نہ کسی طرف سے روشندان تھا۔ مشین چلتے ہوئے چونکہ زیادہ گرمی بھی ہو جاتی تھی، اس لیے یہاں ایک ایئر کنڈیشنر لگا ہوا تھا۔

(۴۹)

سیکرٹری صاحب کا بائیسویں گریڈ میں ایک سال ہو گیا تھا۔ اِس سطح پر اُن کی طاقت اور اختیار میں کئی گنا اضافہ ہو گیا جسے میں نے واضح محسوس کیا تھا۔ اِس طاقت نے اُن کے دماغی اور جسمانی اطوار کو بھی تبدیل کر دیا تھا۔ اب وہ مجھے پہلے سے زیادہ کمتر حیثیت میں ڈیل کرنے لگے تھے۔ اِس دوران مَیں اُن کے اور اُن جیسے بیشتر سیکرٹریز کے کام کو سمجھ چکا تھا۔ اصل میں سیکرٹری صاحب نے مجھ پر کامل اعتبار کر لیا تھا اور اب وہ میرے کام کے دوران نگرانی نہیں کرتے تھے۔ فائلوں، خطوط اور نوٹس کو میرے بھروسے پر چھوڑ دیتے تھے تاکہ مَیں اُنھیں مکمل کر کے اُن کے بیگ میں رکھ دوں اور مَیں انتہائی چابکدستی سے یہ کام سرانجام دے دیتا تھا۔ اِسی دوران مَیں نے دو تین فائلوں پر اور خطوط پر سرسری نظر دوڑائی۔ یہ بہت حساس خطوط تھے جنھیں صرف وزیرِ اعظم اور اُن کی خاص کابینہ تک محدود ہونا چاہیے تھا مگر اُن کی نقلیں تیار ہو کر کہاں جا رہی تھیں؟ مجھے اِس معاملے میں تجسس ہوا اور اِس تجسس میں بہت سارے رازوں سے پردے اٹھنے شروع ہو گئے۔ اس معاملے میں سیکرٹری صاحب کی بیٹی نویزا اور بیوروکریسی کے مزید کئی لوگ شامل تھے کہ اپنے نجی مفادات پر مُلک نامی بکرے کو ذبح کیا جا رہا تھا۔ پھر اگلے چھ ماہ کے دوران ہی مجھے سمجھ آ گئی کہ وہ تمام کام جنھیں ہمارے حکمران یا سیاستدان کرنا چاہتے تھے اُنھیں بیوروکریسی اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ مل کر کیسے سبوتاژ کر رہی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ یہ کام وہ کسی بڑے منافع کے عوض نہیں بلکہ معمولی معاوضے، کبھی محض خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اور بعض

اوقات چند نجی مفادات، مثلاً اختیار اور نوکری میں ترقی یا فارن ملک میں رہائش اور اسی طرح کے چھوٹے چھوٹے مفاد کے لیے انجام دیتے تھے۔ پھر ایک دن مَیں نے ایک اہم فائل کی نقل اپنے لیے بھی تیار کر لی اور اُسے نہایت راز داری سے اپنے بیگ کی کتابوں میں رکھ لیا۔ مجھے نہیں پتا مَیں نے یہ حرکت کیوں کی مگر اتنا جانتا ہوں میرے دل میں حب الوطنی کا کوئی جذبہ نہیں تھا، نہ مَیں نے یہ کام کسی فائدے کے لیے کیا۔ بس عادتاً سمجھ لیں مجھ سے ہو گیا۔ حتیٰ کہ اِس حرکت کو ڈیڑھ ماہ گزر گیا۔

ایک دن میلوڈی بک ہاؤس پر مجھے ایک دوست ملا۔ یہ ویسے تو ادیب تھا لیکن اس کے مضامین بڑے اخبار میں چھپتے تھے۔ کبھی کبھی میلوڈی بک ڈپو پر آتے تھے۔ مَیں نے اِسے زبردستی اپنے دو مضامین پڑھا دیے۔ اُس کا خیال تھا مَیں اچھے اخبار میں لکھنے کے قابل ہوں اور وہ میری بابت اپنے اخبار مالک سے بات کرے گا لیکن اِس بات کو تین ماہ ہو چکے تھے اور ابھی تک اُس نے بات نہیں کی تھی۔ ایک دن وہی دوست میلوڈی بک ڈپو پر ملا اور بولا، ضامن! آج شام سات بجے اگر آپ میریٹ ہوٹل کی مین لابی میں چلے آؤ تو آپ کا تعارف میگزین ایڈیٹر سے کروا دوں گا۔ آپ کے مضامین کالم سے زیادہ ادبی رنگ کے حامل ہوتے ہیں۔ مَیں چاہتا ہوں میگزین کے لیے لکھو۔ میریٹ میں ایک سیمینار ہے۔ اُس میں خاص کراچی سے میگزین ایڈیٹر آئے ہیں۔ وہیں اُن سے مل لیں اور اپنی کوئی چیز بھی لیتے آئیں تاکہ اُنھیں دے دی جائے۔ مَیں نے اُن کا شکریہ ادا کیا اور کوٹھی پر آ کر ایک افسانے کی نوک پلک درست کی۔ میرا خیال تھا میرا یہ افسانہ اچھا تھا۔ چار ماہ پہلے لکھ کر رکھا تھا۔

میریٹ اسلام آباد کا فور سٹار ہوٹل تھا۔ ایف سکس فور کے انتہائی آخری کونے میں تھا جس کے آگے پی ٹی وی کے آفس کی عمارت شروع ہو جاتی تھی۔ آب پارہ سے سیدھا شمال کی طرف چلیں تو ہوٹل سے پہلے کم و بیش تمام سرکاری دفاتر دائیں ہاتھ ایک ترتیب سے آتے چلے گئے تھے۔ مَیں نے خود بھی ایف سکس سے آنا تھا چنانچہ سپر کے سامنے والے چوک سے ہوتے ہوئے اور کہسار مارکیٹ کو بائیں ہاتھ رکھ کر چلتا گیا۔ پھر وہاں سے ہوٹل پہنچ گیا۔ اِس کے اردگرد چناروں کے بہت سے درخت تھے۔ مَیں سات کی بجائے شام ساڑھے چھ بجے ہی لابی میں پہنچ گیا لیکن وہاں فی الحال کسی قسم کی تقریب یا سیمینار کا نشان تک نہیں تھا۔ مجھے اُس نے اصل وقت سے آدھ گھنٹہ پہلے بلا لیا تھا۔ اِدھر مَیں اُس سے بھی آدھ گھنٹہ پہلے پہنچ گیا۔ اب وقت گزاری کے لیے ہوٹل میں اِدھر اُدھر پھرنے لگا۔ سامنے باغیچے اور

چمن زار تھے۔ اُن کے بائیں جانب سوئمنگ پول، حوض اور فوارے تھے۔ چمن زار کے اندر بھی کئی قسم کے خوبصورت فوارے چل رہے تھے۔ یہ اُس وقت اسلام آباد میں نہایت عالی شان اور واحد فور سٹار ہوٹل تھا۔ اُسی کے مطابق اِس کی ہیئت بھی تھی۔ میری شروع دن سے ایک عادت پختہ ہو چکی تھی کہ اگر میرے پاس پانچ منٹ بھی فارغ ہوتے تو اُس میں بھی چہل قدمی یا تجسس کی کوئی شے دیکھنے میں صرف کر دیتا تھا۔ ہوٹل کے کوریڈورز اور لابیاں دیکھتا ہوا میں ایک سے دوسری پھر تیسری منزل پر جا پہنچا۔ ہر منزل میں سوئمنگ پول، چمن زار، حوض اور باغیچوں کے درمیان خوبصورت لابیاں، عرب ہسپانوی اور ایرانی امتزاج کے حوض، کافی، قہوے اور چائے کے مقامات پر ہائی ٹی کے سامان لگے ہوئے تھے۔ میرے پاس پریس کارڈ موجود تھا۔ اُسے ایک دو جگہ دکھانے کے بعد کسی نے پرسش نہیں کی۔

اب میں ہوٹل کی چوتھی منزل پر تھا اور ایک لان میں داخل ہوا۔ یہاں چاروں طرف پھولوں کی بیلیں اور راہداریوں میں موجود برجیوں پر لٹکی ہوئی مرمریں ہانڈیاں کثرت سے تھیں، ہانڈیوں پر بلبلیں، کوئلیں اور طوطیاں رنگ رنگ کی اُڑ اُڑ کر بیٹھ رہی تھیں اور بول رہی تھیں۔ سبز، زرد اور لال پیلے رنگ کی بیلیں مختلف میزوں کے بیچ میں پھیری گئی تھیں اِس لیے چیزیں صاف دکھائی نہیں دیتی تھیں اور نظر دور تک نہیں جا سکتی تھی۔ مَیں بیلوں اور برجوں سے بندھی ہوئی اور لٹکی ہوئی ہانڈیوں کے درمیان سے، جو کافی نیچے تھیں اور اُن سے سر ٹکرا جانے کا خطرہ تھا، آگے بڑھتا گیا۔ میرا ارادہ اُس حوض تک پہنچنے کا تھا جس کے کنارے کچھ مور اور کالے رنگ کی تیتریاں پھر رہی تھیں۔ جیسے ہی مَیں تھوڑا آگے بڑھا، اچانک ٹھٹھک گیا۔ تھوڑے فاصلے پر نویزا اور اُس کا امریکی بوائے فرینڈ اور تین مزید امریکی بیٹھے تھے۔ یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی مگر ایک بات اِس میں واقعی قابلِ ذکر تھی۔ وہی فائل جسے وزارتِ داخلہ کے ایک سیکرٹری صاحب لے کر آئے تھے اور اُس کی مَیں نے ایک نقل اپنے پاس رکھ لی تھی، عین وہی اُن کے سامنے اُسی ٹیبل پر موجود تھی۔ مَیں نے اُسی لمحے وہاں اپنے قدم روک لیے مگر اب دیر ہو چکی تھی۔ نویزا اور اُس کے بوائے فرینڈ نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ کچھ پریشان سی ہوئی لیکن فوراً ہی سنبھل گئی اور بولی، ضامن آئیے، آپ یہاں کیسے پھر رہے ہیں؟

جی مَیں ایک دوست کے لیے آیا تھا مگر وہ ابھی نہیں پہنچا، مَیں نے گھبراہٹ میں جواب دیا۔ سات بجے یہاں ایک سیمینار میں شرکت کرنا تھی۔ مَیں نے سوچا سیر کر لوں۔

مَیں نے جواب دے دیا تھا لیکن میرا جواب اتنا لڑکھڑایا ہوا تھا کہ زبان اٹک گئی تھی۔

ادکے، آپ جائیے اور اپنے دوست کو تلاش کیجیے، ہم کچھ بات کر رہے ہیں۔انھوں نے کسی بھی تذبذب کے بغیر حکم دیا۔

مَیں نے کہا، جی ٹھیک ہے، اور اُسی لمحے وہاں سے پیچھے ہٹ گیا۔ پھر قریباً بھاگتا ہوا نیچے لابی میں آگیا۔ اب سوا سات ہو چکے تھے۔ مَیں لابی میں پہنچا ہی تھا کہ سامنے میرے وہی دوست بیٹھے تھے اور اُن کے ساتھ ایک سیاہی مائل رنگ کا قصائی ٹائپ آدمی بیٹھا تھا، جو کہیں سے پڑھا لکھا نہیں لگتا تھا، مَیں اُن کے سامنے جا کر رُک گیا۔

الطاف حسن نے میری طرف دیکھا اور بولا، ارے بھائی آگئے، آئیے آپ ہی کا ذکر ہو رہا تھا۔ پھر دوسرے شخص کی طرف مخاطب ہو کر بولے، صفدر صاحب، یہی ضامن علی ہیں۔ آپ کے میگزین کے لیے انتہائی مناسب آدمی ہے۔ کچھ لائے ہو؟

جی سر، ایک افسانہ لایا ہوں۔ اُس کے ساتھ ہی مَیں نے اپنا ایک افسانہ نکال کر اُنھیں پیش کیا۔ الطاف صاحب نے وہ افسانہ مجھ سے لے کر سرسری دیکھا اور اُنھیں تھما دیا، صفدر صاحب اسے ضرور دیکھیے گا۔

ایڈیٹر نے افسانہ اُن سے پکڑ کر اپنے بیگ میں ڈال لیا جو اُن کی بغل میں موجود تھا اور مجھے ایک کارڈ جیب سے نکال کر دیا۔ یہ میرا ایڈریس ہے۔ آپ آئندہ بھی اسی پتے پر بھیجیں۔ اسے مَیں پڑھوں گا۔ بےفکر رہیں۔

اس کے بعد وہ دوبارہ باتوں میں لگ گئے، یہ باتیں وہ افغان وار اور پاکستانی پالیسی کے حوالے سے کر رہے تھے۔ اُن کی باتوں کے دوران مَیں وہاں کھڑا نہیں ہونا چاہتا تھا لیکن یہاں میرے دماغ میں ایک اور بات جگہ بنا چکی تھی۔ مَیں اپنے آپ کو ایک دم کلرک کی بجائے صحافی سمجھنے لگا۔ اس میں زیادہ قصور میری بجائے اُس مشرقی رویے کا تھا جس میں کنویں کا تیراک سمندر کی غوطہ خوری کو تیار ہو جاتا ہے۔ مَیں نے سوچا اگر یہاں مَیں الطاف صاحب کے سامنے دوستی سے بڑھ کر بھی کچھ انجام دوں تو شاید میرے افسانے کو میگزین میں چھپنے میں ایک فیصد شک بھی دُور ہو جائے۔ یہ وہ بےیقینی کی کیفیت ہوتی ہے جو پہلے پہل ہر شکست خوردہ انسان میں موجود ہوتی ہے اور آنے والے زمانوں میں اپنے اُوپر بہت اعتماد ہوتا ہے۔ اِسی کیفیت کے زیرِ اثر میں کچھ لمحے وہاں مزید کھڑا رہا۔ میری اِس حرکت پر الطاف صاحب کو محسوس ہوا کہ ایڈیٹر صاحب بُرا مانیں گے۔ اُنھوں نے مجھے دیکھا اور کہا کوئی اور کام؟

اِس کا مطلب تھا کہ آپ جا سکتے ہیں لیکن مَیں نے اثبات میں سر ہلانے کے کہا، جی سر ایک اور کام بھی ہے۔ اگر ایک قدم اُٹھ کر میری بات سُن لیں گے۔

الطاف صاحب یہ سنتے ہی بولے، سر ایک منٹ رُکیے گا اور اُٹھ کر مجھے کاندھے سے پکڑ کر آگے ہو گئے۔ ہاں بولو!

الطاف صاحب اِسی ہوٹل کی چوتھی منزل پر ایک صاحب اور خاتون اور اُس کے ساتھ کچھ گورے بیٹھے ہیں۔ ایک بار آپ اُنھیں دیکھ لیجیے اور فوراً۔

کیوں کیا بات ہے؟ الطاف صاحب نے تشویش سے پوچھا۔

پہلے آپ اُنھیں اور اُن کے سامنے میز پر ایک نظر دیکھ لیں کہ یہ کون شخص ہے۔ باقی بات بعد میں کریں گے۔ مَیں نے اُنھیں جلدی کرنے کے لیے کہا۔

ٹھیک ہے میرے ساتھ آؤ۔

مَیں اُنھیں ساتھ لے کر لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر میں ہم دوبارہ چوتھی منزل پر چلے گئے۔ ہم بہت آہستہ سے اُن سے کچھ فاصلے پر رُک گئے۔ مَیں نے دُور ہی سے اشارہ کر دیا۔ وہ فلاں جگہ بیٹھے ہیں اور مَیں اُن کے قریب نہیں جا سکتا۔ آپ جا کر دیکھ لیں۔

ٹھیک ہے آپ جا کر صفدر صاحب کے پاس بیٹھیں مَیں آتا ہوں۔ الطاف صاحب نے اُن کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

مَیں اُسی وقت ایڈیٹر کے پاس آ گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر بولے، ارے کہاں چھوڑ آئے اُنھیں؟

بس ابھی آتے ہیں سر، مَیں نے جواب دیا۔

صفدر صاحب نے ٹاکیوں میں لپٹی اپنی گول شیشوں کی عینک نکالی اور آنکھوں پر چڑھالی۔ عینک جس کپڑے میں لپٹی تھی وہ جس قدر بوسیدہ تھا، عینک کے شیشے اتنے ہی شفاف تھے۔ تب اُنھوں نے مجھ سے بات کرنے کی بجائے اپنے بستے سے میرا وہی مسودہ نکال لیا اور اُسے دیکھنے لگے۔ یہ ایک اچھی بات تھی۔ مجھے اِس کی بہت خوشی ہوئی کہ کم از کم وہ میری تحریر کو پڑھنے کی زحمت کر رہے ہیں۔ اُس کے بعد پانچ منٹ میں الطاف صاحب واپس لوٹ آئے اور خموش ہو گئے۔ مجھے بھی آنکھ کے اشارے سے خموش رہنے کی تلقین کی۔ اُس کے بعد ہم سب سیمینار کے لیے ہال نمبر تھری میں چلے گئے۔ یہ کانفرنس اصل میں صحافیوں ہی کی تھی اور اِس میں دوسرے ملکوں سے بھی کچھ اہم صحافی مدعو کیے گئے

تھے۔ اسے سعودی ایمبیسی نے فنانس کیا تھا تا کہ ایک دوسرے کی انڈرسٹینڈنگ سے پاک، ایران، افغان معاملات کو سمجھنے میں مدد ملے۔ مجھے حیرت تھی سعودیہ کو اس سب کچھ سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ کانفرنس رات آٹھ بجے سے گیارہ بجے تک جاری رہی۔ پھر الطاف صاحب نے اگلے دن شام پانچ بجے میلوڈی بک ڈپو پر ملنے کا کہہ کر مجھے رخصت کر دیا۔ مَیں واپس فلیٹ پر آ گیا۔

اگلے دن شام پانچ بجے میلوڈی بک ڈپو پر پہنچا تو الطاف صاحب مجھ سے پہلے وہاں موجود تھے اور چائے پی رہے تھے۔ میرے جاتے ہی وہ اُٹھے اور ہم باہر پیپل کی چھاؤں میں موچی کی دکان پر آ گئے۔ الطاف صاحب نے مزید دو پیالیاں چائے منگوا لی۔ موچی کی دکان پر لکڑی کی ایک بنچ پڑی تھی۔ الطاف صاحب نے موچی کو اپنے جوتے اُتار کر دیے اور کہا اِنھیں اچھی طرح صاف کر دے۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوئے اور بولے، یہ فلپ ہے، امریکن ایمبیسی کے فرسٹ سیکرٹری کے طور پر جانا جاتا ہے مگر ہماری اطلاع کے مطابق یہ سی آئی اے کا ایجنٹ ہے۔ اسے مَیں نے مختلف جگہوں پر بہت مصروف دیکھا ہے۔ بہت تیز لڑکا ہے۔ عموماً لڑکیوں کے ذریعے ہی کام لیتا ہے۔ اصل بات بتاؤ کیا ہے؟

الطاف صاحب مَیں نے اپنے سیکرٹری کے کہنے پر ایک نہایت اہم خط اور کچھ نوٹس کی نقلیں تیار کی تھیں اور اُنھیں ایک فائل میں رکھ کر فائل پر لال مارکر سے ڈبل نشان لگا دیا تھا۔ یہ مختلف نشان صاحب کے کہنے پر مَیں لگاتا تھا۔ یہ وزارتِ داخلہ کے خطوط ہیں جن کو وزیرِ اعظم اور اسٹیبلشمنٹ کے کچھ افراد کے درمیان ڈسکس ہونا ہے مگر وہاں سے پہلے یہ سب کچھ یہاں ڈسکس ہو رہا ہے۔ کل جب مَیں اُوپر گھوم رہا تھا عین وہی فائل اُن کے سامنے پڑی تھی اور یہ فلپس صاحب سیکرٹری صاحب کی بیٹی نویزا کے بوائے فرینڈ ہیں۔ اِسے وہ اپنا منگیتر کہتی ہیں۔ مَیں نے الطاف صاحب کو بتایا۔

اِن خطوط میں کیا لکھا تھا؟ کیا تم نے اِنہیں تفصیل سے پڑھا ہے؟

مَیں تفصیل سے نہیں پڑھ سکا البتہ یہ ہے کہ اِن میں کچھ اہم لوگوں کے نام لکھے ہیں جن پر گورنمنٹ کو شک ہے کہ وہ جمہوری طاقت کے خلاف ہیں اور اسٹیبلشمنٹ کے آلۂ کار ہیں۔ اِن میں ایک پنجاب کے وزیرِ خزانہ بھی شامل ہیں۔ اِس کے علاوہ ایک خط الیکٹرک اینڈ واٹر منسٹری سے متعلق ہے اور کسی ڈیم کا قصہ چل رہا ہے اور یہ رہی اُس فائل کی کاپی۔ مَیں نے اپنی تیار شدہ کاپی الطاف صاحب کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

ہوں، ٹھیک ہے آپ فکر نہ کریں اور اپنی زبان کنویں میں لے جائیں۔ اگر الفاظ نکلیں بھی تو کنویں کی دیواروں سے ٹکرا کر واپس آپ ہی کی طرف پلٹیں۔ مَیں اپنے کسی ایجنسی کے دوست سے بات کرتا ہوں۔ آپ ایک کام کریں، سیکرٹری صاحب کے گھر میں اُس فوٹو کاپی مشین کی ایک فوٹو اُتار کر لے آئیں لیکن اُس میں خاص گھر میں دیگر اشیا بھی نظر آنی چاہییں تا کہ معلوم ہو کہ واقعی یہ سیکرٹری صاحب کا ہی کمرہ ہے۔ ورنہ ایسے بھی چلے گا، لیکن یہ بات تو طے ہے کہ گھر میں ایک فائل کی کئی کاپیاں تیار ہوتی ہیں۔

جی اِس بات میں کوئی شک نہیں ہے، وہ تو مَیں خود کرتا ہوں۔

لیکن دیکھیے میرا ذکر درمیان میں نہ آئے، ورنہ نوکری داؤ پہ لگ جائے گی۔ یہ کہتے ہوئے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میری گردن بھی داؤ پر لگ چکی ہے۔

کیا آپ کچھ ایسا کام کر سکتے ہیں کہ آئندہ جب فائل کی دیگر کاپیاں تیار ہو رہی ہوں، آپ مجھے گھر کے اِس نمبر پر فون کر دیں۔

الطاف صاحب یہ ناممکن ہے۔ اول تو سیکرٹری صاحب خود وہاں موجود ہوتے ہیں پھر میرے پاس وہاں فون کہاں سے آئے گا؟ فون خاص صاحب کے کمرے میں ہوتا ہے اور وہاں جانے کی مجھے اجازت نہیں۔ اچھا پھر مَیں چلوں؟

ہاں جائیے اور مت گھبرائیے۔ آپ سمجھیں دو تین دن بعد آپ چھپنا شروع ہو جائیں گے اور کچھ دِنوں تک آپ کو پیسے دلوانے کی کوشش بھی کروں گا۔

مَیں نے اپنے تئیں الطاف صاحب کو ایک بہت بڑی انفارمیشن دے کر اخبار میں اپنے مضامین چھپنے کی راہ سیدھی کر لی تھی۔

اُس کے بعد مَیں وہاں سے پیدل کوٹھی کی طرف چل پڑا اور ساڑھے گیارہ بجے کوٹھی پر پہنچا۔ جاتے ہی سو گیا۔ صبح اُٹھا تو سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ پھر ایک ہفتہ مزید نکل گیا۔ اِس عرصے میں مجھے کوئی کام نہیں دیا گیا۔ یہ ایسی بات نہیں تھی جس پر پریشان ہوا جا سکتا۔ مَیں دو دو ماہ بھی فارغ رہتا تھا۔ اِس تمام عرصے میں میرا کام بس اسلام آباد کے کوچوں میں، پارکوں میں، لائبریریوں میں اور شاہراہوں پر گھومنا ہوتا تھا۔ کتابیں پڑھنا ہوتی تھیں اور اپنے افسانے یا دوسری اِدھر اُدھر کی بے ضرر چیزیں لکھنا ہوتی تھیں جس سے میرے مسودے بھر گئے تھے۔ اِس معاملے میں سیکرٹری صاحب نے

مجھے میری مصروفیت پر کبھی سرزنش نہیں کی نہ کوئی دوسرا کام کہا تھا۔

ایک دن رات دس بجے مَیں کوٹھی میں داخل ہوا۔ دیکھا تو نویزا لان میں چہل قدمی کر رہی تھی۔ اُس کی چہل قدمی میں انتظار اور پریشانی کی جھلک تھی۔ مَیں نے سمجھا فلپ نے دھوکا دیا ہے یا کوئی ایسی ہی وجہ ہوسکتی ہے کیونکہ الطاف صاحب مجھے بتا چکے تھے کہ وہ صرف لڑکیوں کو استعمال کرتا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی نویزا جلدی سے میری طرف آئی اور بولی، ضامن رُکو، مَیں وہیں رُک گیا۔ مجھے حیرانی تھی نویزا اس قدر بے چینی میں کیوں ہے؟ آپ کہاں گئے تھے؟

کہیں نہیں بس ایسے ہی باہر گھومنے کے لیے گیا تھا۔ مَیں نے جواب دیا۔

جس دن آپ مجھے ہوٹل ملے تھے، وہاں کیا کرنے گئے تھے؟ نویزا نے شدید غصے سے پوچھا۔

اب مجھے خطرہ ہوا، کیونکہ اُن کا یہ سوال میرے لیے بالکل غیر متوقع تھا کہ آج تک اُس نے میرے بارے میں پوچھنا تو درکنار توجہ بھی نہیں دی تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا، نویزا صاحبہ مَیں میریٹ میں ایک دوست سے ملنے گیا تھا۔

اور وہ دوست الطاف حسن ہے؟ نویزا نے فوراً سوال کیا۔

مَیں نے شدید ڈر اور لرزش کے انداز میں جواب دیا جی ہاں وہی تھے۔

اور اُسے آپ نے کیا دیا تھا؟ جلد بتایئے؟

اب میری زبان گنگ ہوگئی۔ مَیں خاموش کھڑا ہوگیا۔ کیسی عجیب بات تھی ایک مجرم کے سامنے گویا مَیں مجرم تھا۔

میری خموشی کو کچھ دیر سُنتی رہی پھر بولی۔ ہوں ٹھیک ہے۔ اب ایک کام کرو۔ فوری طور پر اپنا بستر اور کپڑے اُٹھاؤ اور ابھی اسی وقت یہاں سے نکل جاؤ اور سنو واپس دیکھنا بھی نہیں مُڑ کے۔

لیکن مَیں شرمندہ ہوں معاف کر دیجیے۔ مَیں نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

بے وقوف معافی کا نہیں، یہاں تیری زندگی کا مسئلہ ہے۔ اُس نے نہایت تنبیہ سے کہا، اگر ابھی یہاں سے نہیں نکلے تو آپ کے ساتھ مسئلہ ہوگا۔ شکر کرو ابھی پاپا گھر پر نہیں ہیں۔ مَیں نے آپ کے لیے ٹیکسی کھڑی کی ہوئی ہے۔ اپنے کپڑے اُٹھاؤ اور نکل جاؤ فوراً۔ ورنہ مر جاؤ گے یا پھر ساری عمر جیل میں سڑو گے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں؟

جی سمجھ گیا ہوں، میری آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ اچھی خاصی چلتی ہوئی گاڑی کا ایک دم انجن بیٹھ گیا تھا۔

اور یہ لو کچھ پیسے۔ نویزا نے کچھ پیسے میرے ہاتھ میں دے دیے۔ کوارٹر میں میرے پاس چند کتابیں اور تین جوڑے کپڑوں کے تھے۔ مَیں نے نویزا سے اگلا کوئی سوال نہیں کیا، نہ وہ بتانے کے موڈ میں تھی اور سرونٹ کوارٹر سے اپنے کپڑے، کتابیں اور دو چادریں ایک بیگ میں ڈالیں اور باہر نکل کر ٹیکسی بیٹھ گیا۔ اب میرے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ رات اِس وقت کس کا دروازہ کھٹکھٹاؤں۔ میرے سینے میں خوف کا ایک ایسا سیلاب جنم لے چکا تھا کہ مَیں اِس وقت ایک چیونٹی سے بھی ڈرنے لگا تھا۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور نویزا کے دیے ہوئے پیسوں کو گننے لگا، وہ کُل دو ہزار روپیہ تھا۔ اِس عرصے میں ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے تین بار پوچھا کہاں جانا ہے لیکن مَیں نے اُس کی آواز دھیان سے سنی ہی نہیں۔ چوتھی بار پوچھنے پر مجھے یاد آیا ڈرائیور کچھ پوچھ رہا ہے۔ کیا پوچھ رہا ہے؟ اس کا اندازہ لگا کر مَیں نے اُسے کہا، بھائی ریلوے سٹیشن لے چلو۔

صبح آٹھ بجے اپنے شہر کے مقامی اسٹیشن پر اُتر گیا اور ابھی مَیں ریلوے اسٹیشن کے بیرونی گیٹ پر پہنچا ہی تھا کہ دو آدمی آگے بڑھے۔ اُن میں سے ایک نے کالی شرٹ اور کالی ہی پینٹ پہن رکھی تھی۔ دوسرا شلوار قمیص میں تھا۔ دونوں ایک دم میرے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ کیا تم ضامن علی ہو؟ اُن میں سے شلوار قمیص والے نے مجھے پوچھا۔

جی ہاں۔ کوئی کام؟ مَیں حیران ہوا کہ یہ کون لوگ ہیں اور مجھے کیوں پوچھتے ہیں؟

جی آپ سے ایک کام ہے، اِدھر آئیے ذرا، سیاہ پینٹ شرٹ والے نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا اور ایک سمت لے کر چل دیے۔ جیسے ہی ہم اسٹیشن کے گیٹ سے باہر آئے سامنے کالے رنگ کی ایک بڑی گاڑی کھڑی تھی۔ اُس میں دو آدمی مزید بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کے چہروں کے بارے میں زیادہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ کس قدر کریہہ اور پُر ہیبت تھے۔

آپ اِس گاڑی میں بیٹھیے، شلوار قمیص والے نے کہا۔

مگر کیوں بیٹھوں؟ مَیں نے احتجاج کیا۔

کیوں کا جواب آپ کو اسلام آباد میں ملے گا۔ اِسی کے ساتھ ہی ایک سیاہ شرٹ اور پینٹ والے نے مجھے دھکا مار کر گاڑی کے اندر داخل کر دیا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ مَیں پھنس چکا ہوں۔ بیٹھتے

ہی شلوار قمیص والے آدمی نے کہا، ضامن صاحب، آپ ہماری حراست میں ہیں۔ ہم ایک ایجنسی کے آدمی ہیں۔ قومی راز کسی کے حوالے کرنے کے جرم میں آپ کو پکڑا گیا ہے۔ مکمل خموشی سے بیٹھیں۔ کوئی سوال جواب کرنے کی ضرورت نہیں۔ نہ ہی بولنے کی کوئی وجہ یہاں موجود ہے۔ ہم صرف آپ کو لینے آئے ہیں۔ باقی سب کام کچھ اور لوگ کریں گے۔ اگر آپ نے بولنے کی کوشش کی تو ہم آپ کے منہ اور آنکھوں پر پٹی باندھ دیں گے۔ اِس سے بہتر ہے آپ خود خموش بیٹھے رہیں۔

مَیں اُن کی بات اور رویے کو سمجھ چکا تھا۔ چنانچہ تہیہ کر لیا کہ نہیں بولوں گا۔ مجھے اب شدت سے میری ماں، باپ اور اُن کے ساتھ حاجی فطرس علی یاد آنے لگے۔ میری دادی کا باندھا ہوا امام ضامن میرے بازو پر ابھی تک بندھا تھا۔ شاید یہ میرے کام آئے مگر یہ تو بہت پرانا ہو چکا تھا۔ مجھے خبر نہیں تھی امام ضامن نیا باندھا جانے والا کام آتا ہے یا پرانے امام ضامن میں بھی وہی طاقت ہوتی ہے۔

(۵۰)

اسلام آباد میں داخل ہونے سے پہلے میری آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ دی گئی تھی۔ آنکھوں سے کالی پٹی کھلی تو مَیں ایک کمرے میں تھا۔ یہ کمرہ کال کوٹھڑی یا جیل بالکل نہیں تھی۔ محض ایک کمرہ تھا۔ نیم اندھیرے میں ڈوبا ہوا نہایت بوسیدہ کمرہ۔ کمرے میں داخل کرتے وقت نہ تو مجھے دھکا مارا گیا، نہ بدتمیزی کی گئی اور نہ مجھ سے کچھ کہا گیا۔ میرے بندھے ہوئے ہاتھ کھول دیے گئے۔ کمرہ نہ زیادہ تنگ تھا، نہ کھلا تھا، پندرہ بائی پندرہ کا ایک روم تھا اور ہر صورت تہہ خانہ تھا۔ اِس میں سیلن کی تیز بو ایک دم ناک کو چڑھ گئی تھی بالکل ویسے ہی جیسے پتھروں کی فیکٹری والے کمرے کی بُو تھی۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ ایک پرانا سا بیڈ تھا۔ بیڈ کے اُوپر میلا کچیلا میٹرس بھی تھا اور اُس کے اُوپر ایک چادر بچھی تھی۔ یہ دونوں چیزیں اتنی گندی اور بدبودار ہو چکی تھیں کہ اُنھیں دیکھنے سے قے آتی تھی۔ کمرے کے فرش پر ایک بیڈ کی چادر ہی کی طرح کا نہایت گندا کارپٹ بچھا تھا۔ اُس کارپٹ اور بیڈ پر بے تحاشہ کاکروچ دوڑتے پھر رہے تھے۔ جیسے اِنھیں کہیں سے پکڑ کر یہاں چھوڑا گیا ہو۔ سیلن سے تمام دیواریں فرش سے لے کر چھت تک کائی زدہ اور نم دار تھیں۔ سیم اتنی زیادہ تھی کہ یہ کسی دُہری بیسمنٹ کا کمرہ لگتا تھا جس کے اُوپر یا پہلو سے گندا نالہ گزرتا ہو۔ کمرے کی دیواروں اور چھت سے چونا اُکھڑ کر فرش پر اور بیڈ پر بکھرا پڑا تھا۔ اُس اُکھڑے اور گیلے چونے اور سیلن کی وجہ سے ہی یہاں ایک نمی زدہ شدید بو کا احساس تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد مجھے یہاں کھانسی اور سانس کی تکلیف شروع ہو گئی۔

مجھے اِس کمرے میں قید کرنے کے بعد شام تک کوئی نہیں آیا۔ میرے جسم میں موت کے بھیانک ڈر کے ساتھ تھکن اور گھٹن کے ملے جلے دباؤ نے بالکل بے حوصلہ کر دیا۔ مجھے اپنی زندگی اور جسم سے دہشت ہونے لگی۔ اِس احساس نے مجھے یہاں تک روند دیا کہ مَیں زندگی کے لیے ایک مکھی بننے کو تیار ہو گیا۔ شام کو میرے سامنے ایک برص زدہ گندمی رنگ کا آدمی آیا۔ اُس نے مجھ سے محض اتنا کہا کہ آپ کو آفس کی ایک اہم فائل چوری کرنے کے الزام میں پکڑا گیا ہے۔ جب تک آپ فائل کا پتا نہیں بتاتے، یہیں رہیں گے حتیٰ کہ یہیں مریں گے۔ اُس شخص نے میرے ساتھ کوئی مکالمہ نہیں کیا، نہ یہ پوچھنے کی زحمت کی کہ مَیں اپنے اُوپر لگائے گئے اِس الزام کو قبول کرتا ہوں یا تردید کرتا ہوں۔ اگر قبول کرتا ہوں تو فائل کہاں سے اور کیسے چوری کی ہے اور اُسے کہاں رکھا ہے یا کسے دیا ہے؟ وہ فائل کس قسم کی تھی اور مَیں نے کیوں چوری کی؟ اِس بابت بھی اُس نے کوئی مکالمہ نہیں کیا نہ بات کرنے کی زحمت کی۔ وہ مشکل سے دو منٹ وہاں رُکا اور چل دیا۔ جانے سے پہلے مَیں نے اُسے فقط ایک سوال کیا، مجھے مار دیا جائے گا یا زندہ چھوڑا جائے گا؟ جس کے جواب میں وہ ایک دفعہ مسکرایا اور بولا، مارا سانپوں کو جاتا ہے، چیونٹیوں پر صرف سپرے ہوتا ہے اگر وہ بہت زیادہ ہو جائیں۔ یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ یہ شخص جو کوئی بھی تھا اِسے تفتیش کرنے کا بالکل علم نہیں تھا۔ یہ بات بھی عین ممکن تھی جو لوگ مجھے یہاں لے کر آئے تھے اور جنھوں نے مجھے اِس کمرے میں قید کیا تھا وہ ایجنسیوں کے لوگ ہی نہ ہوں۔ اُس شخص کے جانے کے بعد دوبارہ مجھ سے کچھ نہیں پوچھا گیا۔ مَیں چوبیس گھنٹے انتظار میں رہا اور اس خیال میں تھا دوبارہ کوئی آدمی آتا ہے تو اُسے مَیں اصل کہانی سنا دوں گا کہ اصل میں فائل بیچنے والے کون لوگ تھے مگر وہاں نہ کوئی آیا، نہ مجھ سے پھر کبھی یہ بات پوچھی گئی۔ البتہ ایک آدمی پورے چوبیس گھنٹے بعد ضرور داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک جگ پانی کا تھا اور ٹفن تھا۔ مَیں نے ٹفن کھول کر دیکھا اُس میں چنے کی دال اور دو روٹیاں تھیں۔ مَیں نے اُس شخص کو بلانے کی کوشش کی مگر اُس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

کمرے کا دروازہ ٹھوس لوہے کا تھا۔ دائیں طرف ایک واش روم تھا۔ یہ واش روم ایک مدت سے استعمال نہیں ہوا تھا اور اِس میں بھی کاکروچ دوڑ رہے تھے۔ مجھے شبہ لاحق ہوا کہ اصلاً میں حبسِ بے جا میں ہوں اور ہو سکتا ہے مجھے یہاں مار بھی دیا جائے۔ یہ خیال آتے ہی میرے پورے جسم میں دوبارہ کپکپی طاری ہو گئی اور ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ مَیں شاید مرنے سے نہیں ڈرتا

تھا مگر اِس طرح کی مکمل گمنامی کی موت مجھے اچھی نہیں لگتی تھی۔ مجھے اپنی ماں کے بارے میں فکر تھی۔ شاید اُسے میرے مرنے کی بھی خبر پہنچے گی یا نہیں۔ وہ کیسی اذیت کے ساتھ میرا انتظار کرے گی اور اسی مسلسل انتظار میں خود مر جائے گی۔ گم ہو جانے والے بیٹے کی ماں کا رنج سمجھنے کے لیے شاید ادب اور نفسیاتی علم کام نہیں آ سکتا۔ اِس کے لیے ماں ہونا ضروری ہے اور وہ شاید اِس کائنات میں کوئی مرد نہیں ہو سکتا۔ مَیں اِس کمرے میں نمی اور سیم کی بُو میں بیٹھا نہایت تذبذب اور ذہنی اذیت میں تھا۔ دوسرا دن بھی اِسی طرح گزر گیا مگر کوئی شخص پوچھ گچھ کرنے کے لیے نہیں آیا۔ وہی گونگا شخص صبح شام میرا کھانا لے کر آ رہا تھا۔ مَیں نے ہر ممکن اُسے بلانے کی کوشش کی مگر وہ نہیں بولا۔ کمرے کا ٹائلٹ اور واش روم ایک ہی شکل میں تھا۔ یعنی وہی واش روم تھا اور وہی ٹائلٹ تھا۔ مجھے دو وقت کا کھانا دیا جاتا تھا۔ یہی میرے لیے کافی تھا کہ اِس بارہ بائی پندرہ کے کمرے میں بھی مشکل سے ہضم ہو رہا تھا۔ تیسرے دن مجھے بخار ہو گیا جو مزید تین دن رہا۔ تیسرے دن صبح کے کھانے کے وقت مَیں نے ایک روٹی کو اِس طرح کاٹا کہ اُس میں بخار کا لفظ بن گیا۔ وہ روٹی مَیں نے اُس گونگے کو واپس کر دی۔ تب وہ دو گھنٹے بعد دوبارہ آیا۔ اُس کے ہاتھ میں کچھ ٹیبلٹ تھیں۔ اُس نے وہ ٹیبلٹ میرے قریب رکھ دیں اور ایک جگ جو پہلے بھی میرے کمرے میں پڑا رہتا تھا دوبارہ پانی سے بھر کر لے آیا اور باہر نکل گیا۔ مَیں نے پانی کے ساتھ وہ ٹیبلٹ لے لیں اور اُس بیڈ پر لیٹ گیا۔ بیڈ اور چادر کے کاکروچ اور دوسرے کیڑے مکوڑے مَیں نے پہلے دن ہی صاف کر دیے تھے۔ ٹیبلٹ کھانے کے بعد کچھ ہی دیر میں مجھے نیند آ گئی۔ آنکھ کھلی تو رات کافی ہو چکی تھی۔ مجھے خبر نہیں تھی رات کا یہ کون سا وقت تھا۔ البتہ اِتنا تھا کہ میرا بخار بالکل اُتر چکا تھا اور کسی قدر طبیعت بھی بحال ہو گئی تھی۔ کمرے میں زیرو سائز کا بلب بلا تعطل چلتا رہتا تھا۔ اِس کی پیلی اور سرمئی روشنی کُبڑی اور بوڑھی عورت کی طرح ہر وقت مجھے گھورتی رہتی جس کی مٹیالی آنکھوں کی رہی سہی چمک بھی دھندلا کر گدلی ہو گئی ہو۔ مَیں سوچ رہا تھا یہ کوڑھی اور گندا کمرہ اور دھندلی روشنی کا ماحول مجھے پاگل کرنے کے لیے ترتیب دیا گیا ہے۔ مدقوق اور بے معنی روشنی میرے لیے ایک جسم کی حیثیت اختیار کر گئی تھی جسے ٹی بی ہو گئی ہو یا پھر ایسا لاعلاج کینسر جو میرے جسم میں چھوت کی طرح چپک گیا تھا۔ مَیں بعض اوقات اپنے جسم پر ناخنوں سے خراشنے لگتا جس پر ہلکے ہلکے دانے نکل آئے تھے۔ کمرے میں نہ گرمی تھی نہ سردی تھی لیکن اُس میں کثافت کی ایسی غلاظت ضرور تھی جسے الگ کرنے کے لیے مَیں اُسی واش روم میں بعض اوقات دو دو بار نہاتا تھا مگر وہ کثافت تھوڑی دیر بعد پھر گندا کر دیتی تھی۔ یہ کمرہ اور یہ

میلا بیڈ میرے لیے اب ایک تابوت تھا جس میں زندہ دفنا دیا گیا تھا۔

دو تین دن تک مجھے توقع رہی کوئی پوچھ گچھ کے لیے آئے گا مگر کوئی نہیں آیا۔ پھر مَیں نے یہ بھی خیال چھوڑ دیا۔ پھر دن گزرتے چلے گئے اور اب مجھے دِنوں کی گنتی بھول گئی تھی۔ وہ گنتی مجھے ضرور یاد رہتی اگر مَیں دوسرے دن بخار اور نیند کی گولیوں کے سبب اپنے سونے کا دورانیہ نہ بدلتا۔ مسلسل تین دن ٹیبلٹ کھانے کے بعد میرے سونے کے اوقات بدل گئے تھے۔ مجھے بالکل یاد نہیں رہا تھا کہ کب سویا ہوں اور کتنا عرصہ سویا ہوں۔ اب بہت سا عرصہ گزارنے کے بعد یعنی بہت دفعہ جاگنے اور بہت دفعہ سونے کے بعد یہ بھی خبر نہیں رہی تھی کتنے دن ہو چکے ہیں یا کتنے مہینے گزر چکے ہیں۔ پہلے پہل مَیں نے چیخیں مارنے اور دھاڑیں مارنے کا کام بھی کیا مگر یہ سب بے کار ثابت ہوا تھا۔ البتہ رونے دھونے اور چیخ و پکار سے میرا اپنا بوجھ ہلکا ضرور ہو جاتا تھا لیکن یہ بھی شروع شروع میں ہوا۔ اب کوشش سے بھی مَیں رو نہیں پاتا تھا۔ مجھے بالکل خبر نہیں تھی میری ماں اور باپ مجھے ڈھونڈتے ہوئے کہاں کہاں گئے ہوں گے۔ وہ کن لوگوں کے سامنے جا کر گڑگڑائے ہوں گے۔ اُن کا رونا اور آہ و بکا کرنا اُس دیوارِ گریہ کے سامنے تھا جسے رونے والوں کا مقصد بھول گیا تھا۔ مجھے کھانا دینے والا گونگا میرے لیے جو کھانا لاتا تھا، اُس میں ناشتا کون سا ہوتا تھا اور شام کا کھانا کون سا ہوتا، یہ سب مَیں اندازے سے پتہ لگاتا تھا۔ وہ بد بخت نہ میری آواز سنتا تھا نہ میرے اشارے سمجھتا تھا۔ اِس طرح کا جانور زندگی میں مَیں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ ایک دن شام کے وقت جیسے ہی وہ میرے لیے کھانا لے کر آیا مَیں نے اُس کا بازو پکڑ لیا اور بیٹھنے کے لیے کہا۔ اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ کھینچ کر اُلٹے ہاتھ کا ایسا تھپڑ میرے منہ پر مارا کہ مَیں چکرا کر رہ گیا۔ تھپڑ کھا کر مجھے کم از کم اتنا معلوم ہوا یہ ایک جاندار شے تھی مگر سانپ کی نسل سے کوئی اژدھا تھا جو میری آواز اور احساسات کو مسلسل نگل رہا تھا۔ میرے منہ سے خون جاری ہو گیا۔ مَیں دیدے پھاڑ کر اُسے دیکھنے لگا۔ اتنے میں وہ کمرے سے نکل گیا۔ مَیں کافی دیر ویسے ہی بیٹھا رہا۔ پھر اُٹھ کر واش روم میں آیا اور کُلیاں کرنے لگا۔

مَیں نے اپنے بیڈ سے کاکروچ اور کیڑے مکوڑے پہلے ہی دن صاف کر دیے تھے لیکن دوسرے پورے کمرے کو ویسے ہی گندا رہنے دیا تھا۔ اب مجھے احساس ہوا کہ یہاں فی الحال اپنی موت یا آزادی تک قیام کرنا ہے تو مَیں نے آہستہ آہستہ پورے کمرے اور واش روم کے تمام کاکروچ اور کیڑے لیٹرین میں بہا دیے لیکن سیلن اور بدبو دار نمی کو ختم نہیں کر سکا۔ یہ نمی دیواروں کی بنیادوں سے

لے کر چھت تک پھیلی ہوئی تھی جس نے مجھے ایک طرح کی پھپھوندی لگا دی تھی۔ میری داڑھی اور ناخن کتنے بڑھ گئے تھے، اِس کا اندازہ مجھے نہیں تھا البتہ داڑھی اب میرے سینے کو چھونے لگی تھی۔ مجھے حبسِ بے جا میں رکھنے والوں نے یہاں صرف اتنا کیا تھا کہ مَیں زندہ رہوں۔ اِس کے علاوہ اُنھیں مجھ سے کوئی غرض نہیں تھی۔ یہ سیکرٹری صاحب جسے میرا والد اپنا دوست شمار کرتا تھا، مجھے نہیں خبر والد صاحب کو میرے فائل لے کر روپوش ہونے کی صورت میں جیل بھجوا چکا تھا یا اُس پر رحم کھا کر اُسے اُس کے حال پر چھوڑ چکا تھا البتہ والدہ کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ اب تک رو رو کر مر چکی ہوگی ورنہ اندھی ہونے میں تو کوئی کسر نہیں رہی ہوگی۔ یہ سلسلہ اتنا دراز ہوا کہ بیڈ پر پڑا پڑا ایک کیچوا بن گیا۔ ایسا کیچوا جسے پتا نہیں کب کسی مچھلی کے چارے کے لیے کسی کانٹے میں پرو دیا جاؤں۔

پھر ایک دن توقع کے خلاف دروازہ کھلا۔ یہ دروازہ اُس منحوس اور لعنتی گونگے نے نہیں کھولا تھا جس کی شکل میرے لیے ایک سانپ کی شبیہ ہو گئی تھی۔ جو روزانہ اپنا اُگلا ہوا کھانا مجھے دیتا تھا۔ کمرے میں یہ نئے آنے والے دو ایسے سانڈ تھے جنھیں تہذیب نہیں سکھائی گئی تھی۔ اُن میں سے ایک نے آتے ہی مجھے نہایت گندی گالی دی اور کہا جلدی سے اُٹھو۔ دوسرا خاموش کھڑا رہا مگر اُس کے تیور بھی گالی دینے والے آدمی سے کم خطرناک نہیں تھے۔ مَیں اُن کی ہیبت اور بدتہذیبی سے ڈر گیا۔ ہو نہ ہو موت کا نقارہ بج چکا تھا۔ میرے لیے ویسے تو عزت اور انا کا مسئلہ پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ اب تو محض ایسا کیچوا تھا جسے مُرغیاں کھانے کے لیے بھربھری اور نرم زمین سے تلاش کر رہی ہوں۔ مَیں کانپتا ہوا کھڑا ہو گیا لیکن مسلسل گندے کمرے میں پڑے رہنے اور موت کے ڈر سے میری صحت انسان کی بجائے دق کے مارے ہوئے مریض کی سی ہو گئی تھی۔ کھڑا ہوتے ہی مَیں لڑکھڑا کر گر پڑا۔ ایک شخص نے آگے بڑھ کر میری آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھی۔ میرے ہاتھوں کو کمر کی پچھلی طرف باندھ دیا۔ پھر سہارا دے کر اُٹھایا اور چل دیے۔ دو منٹ بعد مَیں نے محسوس کیا مَیں کھلی فضا میں سانس لے رہا ہوں۔ ایک دم ہوا کا ایسا جھونکا میرے نتھنوں سے ٹکرایا کہ اُسی وقت مجھے زندگی کا احساس ہوا۔ میرا جسم جو سیم زدہ قبر کی روح بن چکا تھا ایسے لگا اُس میں جان ڈال کر کھلی ہوا میں اُچھال دیا گیا ہے۔ جہاں پرندوں کی وسیع اُڑانیں ہیں، درختوں، پھولوں اور انسانوں کے نرم لمس ہیں۔ کھلی ہوا میں سانس لینے کا احساس ہی زندگی کا احساس تھا۔ زندگی، آزادی، ہوا اور خوشبوؤں کو چھونے کے لیے قید کتنی بڑی کتاب تھی۔ یہ کتاب مَیں نے چند دِنوں میں مکمل کی تھی۔ اب مجھے نہیں معلوم اِس کے بعد مجھے ختم کر دیا جائے گا مگر مَیں دعوے

سے کہہ سکتا ہوں کئی مہینوں تک بدبو اور حبس میں رہنے کے بعد مجھے کائنات کی شفافیت کا یقین آیا۔ یہ کائنات کتنی شفاف اور بے داغ تھی جسے مجھ سے کئی دن تک الگ کر دیا گیا تھا۔ کچھ لمحوں بعد مجھے ایک گاڑی میں سوار کر دیا گیا۔ خدا جانتا ہے یہ دن کا وقت تھا یا رات کا مگر یہ ضرور بتا سکتا ہوں کہ مَیں جس جہنم سے نکالا گیا تھا وہاں دن اور رات کا کوئی امتیاز نہیں تھا فقط زرد اور مدقوق دنیا کا ایک ہی موسم تھا۔ آپ اُسے دوزخ کا کوئی درجہ کہہ سکتے ہیں۔ مَیں بہرحال وہاں سے نکال لیا گیا تھا۔ گاڑی آدھ گھنٹا چلتی رہی۔ اِس عرصے میں کسی نے کوئی آواز پیدا نہیں کی، نہ بات کی اور نہ ہی مجھ سے مخاطب ہوا۔ خدا جانے اب مجھے کہاں لے جایا جا رہا تھا لیکن مَیں یہ بات سوچ رہا تھا اگر موت آ چکی ہے تو خدا کا یہ شکر ضرور ہے اُس نے مرنے سے پہلے ہوا کے تازہ لمس میرے جسم کو چھوا دیے تھے۔ یہ فطرت کتنی فرحت بخش اور تر و تازہ تھی۔ یہ اِس سے بہتر ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ انسان اس قدر شفاف اور نتھری ہوئی فطرت کو جنم دینے پہ قادر نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا اگر کائنات خود بخود یا کسی انسان کے ذریعے وجود میں آتی تو ہر صورت میرے اُس کمرے سے مختلف نہ ہوتی جس میں خدا جانے میں نے کتنی زرد اور دھندلائی ہوئی جہنمیں گزاریں۔ آدھ گھنٹے بعد گاڑی ایک جگہ رُک گئی۔ اُن میں سے ایک شخص نے میرے ہاتھ کھول دیے اور مجھے حکم دیا گیا کہ پانچ منٹ ایک سو کی گنتی گننے کے بعد اپنی آنکھوں سے سیاہ پٹی اُتار لینا۔ اگر اِس عرصہ سے پہلے اپنے ہاتھ آنکھوں تک لے کر گئے تو آپ کو پٹی کھولنا نصیب نہیں ہو گی۔ اِس کا مطلب تھا مَیں آزاد کر دیا گیا تھا۔ پھر گاڑی کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ مجھے محسوس ہوا مَیں اکیلا رہ گیا ہوں مگر مَیں نے اُن کے حکم سے روگردانی کرنے کی جرأت نہیں کی اور سو تک گنتی پوری کرنے لگا۔ آخری ہندسے تک پہنچ کر میری سانس پھول چکی تھی۔ مَیں کچھ دیر اُسی طرح کھڑا رہا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا مَیں آزاد ہو گیا ہوں کیونکہ میرے نزدیک کسی شے کا احساس نہیں تھا مگر ہوا سے پتوں کے سرسرانے کی مسلسل ایک صدا تھی۔ مَیں نیچے بیٹھ گیا پھر آہستہ سے اپنی آنکھوں پر ہاتھ لے کر گیا اور سیاہ پٹی کھول دی۔ پٹی کھلنے کے بعد کوئی شے نظر نہیں آئی۔ البتہ دُور روشنی تھی جیسے ایک ہلکا جگنو دیکھ رہا تھا۔ کیا میری آنکھیں اندھی ہو چکی تھیں؟ مَیں نے اپنی آنکھیں آسمان کی طرف اُٹھائیں۔ خوشی سے ایک دم میری چیخ بلند ہو گئی۔ آسمان پر ستارے چمک رہے تھے اور ہوا میں خنکی کا احساس تھا۔ میری داڑھی اور سر کے بال ہوا کی لہروں کے ساتھ اُڑ رہے تھے۔ میری خوشی کی انتہا نہیں تھی۔ آسمان پر نظر آنے والے ستاروں نے مجھے دو پیغام دیے تھے۔ ایک میری آزادی کا اور دوسرا میری بینائی کی سلامتی کا۔ اب میں نہ تو اندھا رہا

تھا اور نہ کسی کی قید میں تھا۔ مَیں اس خوشی کے عالم میں ایک دم فضا میں بلند ہوا۔ مجھے آزاد کرنے والوں نے میرے لیے رات اور شہر سے دُور کسی جنگل کا انتخاب کیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے یقین ہو گیا کہ میرے آس پاس سناٹے کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ مَیں نے اندازہ لگانا شروع کر دیا مَیں کہاں ہوں مگر یہ ایک بے سود کوشش تھی۔ مجھے تو یہ تک معلوم نہیں تھا رات کا کون سا پہر ہے۔ مَیں اپنے سامنے کی سڑک پر چلنے لگا۔ سرکنڈوں، ببول اور جھاڑیوں کے درمیان یہ کچی سڑک پتا نہیں کس طرف جا رہی تھی مگر جہاں بھی جا رہی تھی مَیں اُسی طرف چلنے لگا اور مسلسل تین گھنٹے تک چلتا رہا۔ چاند کافی بڑا ہو گیا تھا۔ وہ میرے ساتھ آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ کافی دیر چلنے کے بعد میرے سامنے ایک چوک سا آ گیا۔ اس کے دو جانب پکی سڑکیں شروع ہو گئیں مگر یہ سڑکیں مقامی گاؤں کو جانے والی تھیں۔ چوک میں ایک کریانے کی دکان تھی اور ایک آدھ کسی دوسری شے کا کھوکھا تھا۔ اب مَیں تھک چکا تھا اور کسی جانب مُڑنے کی بجائے وہیں بیٹھ گیا۔ مَیں نے سوچا صبح ہو گی تو دیکھا جائے گا کہاں جانا ہے۔ اس چوک میں ایک کنارے پر دو تین ریڑھیاں کھڑی تھیں۔ اُن کے اُوپر مومی کاغذ دے کر اُنھیں کسی رسی سے باندھا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا اب مَیں آبادی کے پاس تھا مگر آس پاس کوئی مکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے بھوک نے بے حال کر رکھا تھا۔ مَیں نے اُن ریڑھیوں میں سے ایک سے مومی کاغذ ہٹا کر دیکھا تو اُس پر پیاز اور لہسن وغیرہ پڑا تھا۔ یہ میرے کسی کام کی نہیں تھیں۔ مَیں نے اُن ریڑھیوں کے پہلو میں ایک لکڑی کے تختے کو دیکھا۔ اُس کے نیچے لکڑی کے چوڑے پائے لگے تھے۔ میرے لیے یہ جگہ لیٹنے کے لیے اچھی تھی۔ مَیں تختے پر لیٹ گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ ہوا کے تازہ جھونکے اور سانس کی نرم خیزی نے مجھے جلد ہی مست کر دیا۔ مَیں تمام کلفتیں بھول کر نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

(۵۱)

میرے کانوں میں پہلے ہلکی سی غوں غاں ہوئی پھر وہ تیز ہونے لگی۔ پھر اچانک ایک شخص نے میرے کرتے سے پکڑ کر مجھے جھٹکا دیا۔ جھٹکے کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی۔ مَیں نے اپنی آنکھیں مَلیں اور سامنے غور سے دیکھا تو سات آٹھ آدمی اور دو تین لڑکے میرے اردگرد کھڑے تھے۔ میرے بڑھے ہوئے بال، ناخن اور گندے کپڑوں کو دیکھ کوئی مجھ پر نشئی ہونے کا الزام لگا رہا تھا۔ کوئی پاگل قرار دے رہا تھا۔ مَیں اُن کے درمیان ایک ایسے بے بس انسان کی طرح بیٹھا تھا جو بغیر ویزے کے دوسرے ملک میں پکڑا جائے۔ مجھے ڈر ہوا یہ لوگ جاسوس کہہ کر پٹائی نہ شروع کر دیں یا پولیس کے حوالے کر دیں جہاں دس نمبر جوتا پریڈ کے بعد ہی اپنی صفائی کا موقع ملتا ہے۔ مَیں نے جب اچھی طرح سے اپنے اردگرد نظر کی تو اتنا معلوم ہوا مَیں پوٹھوہار کے کسی علاقے میں ہوں۔ اِسی لمحے ایک آدمی نے آگے بڑھ کر میرا بازو پکڑ کر تختے سے نیچے کھینچا اور بولا، نیچے اُتر بھائی کہیں میری سبزی کے پھٹے پر پیشاب تو نہیں کر دیا؟

مَیں نیچے اُتر پڑا۔ تو اُس نے صاف تختے کو دیکھ کر کہا، اللہ کا شکر ہے پھٹا پلید نہیں ہوا۔ اللہ جانے یہ نشئی اِن دِنوں اتنے کہاں سے آ گئے ہیں؟

ایک دوسرا شخص بولا، میاں مجھے تو یہ آدمی نشئی نہیں پاگل لگتا ہے، اِس کے ہونٹ اور دانت نشئیوں والے نہیں ہیں یا پھر یہ مجذوب ہے، اِسے کچھ نہ کہو یار۔ پھر میری طرف مخاطب ہو کر بولا، بھائی

آپ بولتے بھی ہیں یا گونگے ہیں؟ کچھ بتاؤ کہاں سے ہو؟

مَیں بندھے ہوئے جانور کی طرح بیٹھا تھا۔ اب اِس سے پہلے کہ وہ میرے ساتھ مزید بدتمیزی کرتے یا مجھے تمسخر کا نشانہ بناتے، مَیں نے اُنھیں مخاطب کیا، بھائیو، مَیں نہ تو پاگل ہوں، نہ نشئی ہوں۔ تمھاری طرح کا عام آدمی ہوں۔

ہائیں، یہ تو اچھا بھلا ہے بھائی۔ (پھر میری طرف دیکھ کر مخاطب ہوا) بڑی صاف آواز ہے۔

مَیں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا یہ نشئی نہیں لگتا، ایک اور شخص نے کہا۔

مگر یہ تیری داڑھی کا جھاڑ اور سر کے بالوں کا جھونک کیا ہے؟ شکل تو افیونیوں جیسی بنا رکھی ہے۔

مجھے کسی نے اغوا کر لیا تھا اور رات یہاں چھوڑ گئے ہیں۔

اشکے بھئی، یہ تو اور ہی کہانی نکل آئی ہے۔ کوئی پیسے ویسے کا چکر تھا؟ وہاں پر ایک آدمی نے کہا۔

جی ہاں لیکن اُنھیں غلط فہمی ہوئی کہ مَیں امیر آدمی ہوں حالانکہ میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ آخر اُنھوں نے تھک کر مجھے رہا کر دیا۔ اُس کے بعد مَیں نے اُنھیں اپنا پتا اور پورا تعارف کرایا۔ تب ایک شخص آگے بڑھا اور بولا، بھئی آپ کے ساتھ تو بہت ظلم ہوا، کتنا عرصہ قید رکھا؟

یہ مجھے یاد نہیں رہا البتہ جب اغوا کیا گیا تھا تب اپریل کے دن تھے۔

اچھا، اب تو بھائی اکتوبر آ گیا۔ تو چھ ماہ باندھے رکھا۔ چل وہاں میاں اپنی شیو تو کرا لے۔ بندے کی شکل تو نکلے اور مَیں اُس آدمی کے ساتھ چل پڑا۔

یہ ایک چھوٹا سا اڈہ تھا، جہاں دو چار سبزی کی دکانیں تھیں۔ اُن کے پہلو میں ایک نائی کی چھپری تھی۔ مَیں نائی کی کُرسی پر بیٹھ گیا۔ یہ کرسی لکڑی کی ٹوٹی پھوٹی تختیوں سے بنی بوسیدہ سی تھی جس کے سامنے ایک شیشہ تختیوں ہی میں جڑا ہوا تھا۔ شیشہ بھی آدھا ایک طرف سے ٹوٹا تھا۔ جیسے ہی مَیں اُس نائی کی کرسی پر بیٹھا، وہی آدمی بولا، راجہ صاحب جاکت کی شیو بنا دے۔

مَیں نے کہا، بھائی میرے پاس پیسے نہیں ہیں، اِس جملے کے ساتھ ہی مجھے خیال آیا کہ نویزا نے جو پیسے مجھے اُس دن دیے تھے وہ میری اِسی جیب میں تھے، مَیں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو پیسے وہیں موجود تھے۔ مجھ میں خوشی کی ایک لہر اُٹھی، چلو کچھ بندوبست تو ہوا۔ مَیں نے کہا ہاں بھائی کچھ پیسے میری جیب میں ہیں ابھی۔ اب میری اچھی سی حجامت بنا دیں۔

ہاں کوئی بات نہیں کلین شیو کر دے جاکت ناں، وہ ہنس کر کہنے لگا۔

نائی نے پل بھر میں میرے تمام بال اُتار کر میرے سامنے رکھ دیے۔ مسلسل چھ مہینے کمرے کے اندر رہنے کے بعد میرا رنگ روئی کی طرح سفید ہو چکا تھا۔ شیو ہونے کے بعد میں ایک چکنا لڑکا نکل آیا۔ وہ آدمی مجھے دیکھتے ہی بولا، اشکے بھئی جوانا، منڈا تو سوہنا ہے۔ اب پیٹ بھر لے۔ پھر تجھے بساں اُوپر چڑھادیاں گے۔ اپنے شہر چل ونجیں۔

اُس کے بعد وہ مجھے ہاتھ منہ دھلا کر پاس والے ہوٹل میں لے گیا۔ یہ ڈھابہ قسم کا ہوٹل تھا۔ چنار کے بہت بڑے درخت کے نیچے چار پائیاں لگی تھیں۔ اُن میں سے کچھ چار پائیوں پر لوگ بیٹھے ناشتے میں مصروف تھے۔ اِن سب کی زبان پوٹھوہاری تھی۔ یہ بُھجی کی چار پائیاں عموماً بہت آرام دہ ہوتی ہیں اور بہت کھلی ہوتی ہیں۔ مَیں ایک چار پائی پر بیٹھ گیا اور سبزی کھانے کی خواہش ظاہر کی۔ تھوڑی دیر میں آلو مٹر کی پلیٹ کے ساتھ کٹے ہوئے پیاز اور تندور کی روٹیاں آ گئیں۔ مَیں نے آلو مٹر کے سالن سے کھانا کھایا۔ اُس کے فوراً بعد گُڑ والی چائے آ گئی۔ دونوں چیزیں بہت پر لطف محسوس ہوئیں۔ یہ کھانا کائنات کی سب سے لذیذ ترین شے تھی۔ رہائی کے بعد مجھے آزاد فضا میں چار پائی کے اُوپر بیٹھ کر کھانے کی نعمت کا احساس ہوا کہ یہ کیا شے ہوتی ہے۔

مَیں رات دس بجے کے قریب اپنے گاؤں پہنچا۔ اِس وقت تمام لوگ سو چکے تھے۔ ہمارا گھر گاؤں کے آخری کونے پر تھا۔ مَیں نہیں چاہتا تھا کوئی شخص مجھے دیکھے۔ اگر اپنے گھر گاؤں کے اندر سے گزر کر جاتا تو کوئی دیکھ لیتا۔ مَیں گاؤں کو بائی پاس کرنے کے لیے باہر سے اُن پگڈنڈیوں پر چلتا ہوا آخری گلی تک پہنچا جس میں ہمارا گھر تھا۔ مَیں کچھ دیر گھر کے سامنے کھڑا رہا۔ پھر دروازے پر دستک دینے کے لیے آگے بڑھا مگر دروازہ کھلا ہوا تھا۔ یہ حیران کن بات تھی ہمارے گھر کا دروازہ رات کے اِس وقت کھلا تھا حالانکہ میری والدہ اِسے دن کے وقت بھی کھلا نہیں چھوڑتی تھی۔ میرے دل میں درد کی ایک لہر سی اُٹھی اور دل دھڑکنے لگا، کہیں والد نے یہ گھر بیچ نہ دیا ہو۔ مَیں نے ڈرتے ہوئے اندر قدم رکھ دیا اور دروازے کو عبور کر کے ڈیوڑھی میں چلا آیا۔ اندھیرے کے باوجود ڈیوڑھی میں پڑی ہوئی چار پائی مجھے نظر آ گئی۔ انسان جس گھر میں پیدا ہو یوں لگتا ہے اُس کے در و دیوار دوڑ کر گلے لگتے ہیں۔ گھر کی چیزیں بول اُٹھتی ہیں۔ اِس منظر کو صرف دل کی آنکھیں پہچانتی ہیں۔ مَیں بھی اپنے اِس گھر کو بسا چکا تھا۔ میرے والد کی ایک چار پائی ہمیشہ یہاں پڑی ہوتی تھی۔ اگر اب بھی یہاں ہے تو یقیناً یہ گھر ابھی تک ہمارے پاس ہے۔ چار پائی پر کوئی لیٹا ہوا تھا۔ ''کوئی'' کا لفظ یہاں غیر مناسب ہی نہیں منحوس

بھی ہے۔ یقیناً میرے والد ہی لیٹے ہوئے تھے۔ مَیں آہستہ سے اُن کی چارپائی کے پاؤں کی طرف بیٹھ گیا۔ میرے بیٹھتے ہی والد صاحب کو محسوس ہوا کہ اُن کی چارپائی پر کوئی بیٹھا ہے، وہ ایک دم بجلی کی سی تیزی سے اُٹھے اور بولے ضامن ہے؟

مَیں آہستہ سے بولا، جی ابا مَیں ضامن ہوں۔

ضامن تم آ گئے ہو؟ یہ الفاظ اُن کے حلق سے انتہائی کرب سے نکلے گویا الفاظ کا پھندہ گلے میں پڑ گیا ہو۔ میرے والد کی آواز میں اتنی زیادہ لرزش اور بھاری پن تھا، مجھے خوف ہوا اُن پر شادی مرگ کی کیفیت طاری نہ ہو جائے۔

ابا مَیں آ گیا ہوں۔ اِن دو فقروں کے علاوہ پھر ہم دونوں کچھ نہیں بول سکے۔ میرے والد نے مجھے اپنی گود میں بھر لیا اور ایک ایسی چیخ بلند ہوئی کہ اُس کی آواز میرے دل کو چیرتی چلی گئی۔ اُن کی چیخ سُن کر نہ صرف ہمارے گھر ہی بلکہ پورے محلے کے لوگوں کے دوڑنے اور جاگنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میری والدہ صحن میں لیٹی ہوئی تھی اور جاگ رہی تھی۔ وہ بھی لڑکھڑاتی ہوئی ڈیوڑھی میں داخل ہوئی "میرا ضامن آ گیا، میرا ضامن آ گیا ہے، آ جا اماں زینب اپنے پوتے کو مل لے ضامن آ گیا ہے" کہتی ہوئی میری طرف دوڑی۔ اُس کا اماں زینب کو آوازیں دینا جو کب کی قبروں میں جا چکی تھی اور میرے فرقت و ہجر سے آزاد تھی، یوں لگا میری والدہ کی طرح گلوگیر ہو گئی ہو۔ والدہ اِس سے پہلے کہ مجھ تک پہنچتی ٹھوکر کھا کر ڈیوڑھی کے دروازے میں ہی گر پڑی مگر اُسی تیزی سے یہ کہتی ہوئی "اماں زینب تیرا ضامن آ گیا ہے" پھر اُٹھی۔ پھر اِس سے پہلے کہ دوبارہ گرتی مَیں جلدی سے اُٹھا اور اپنی والدہ سے لپٹ گیا۔ میرے لپٹتے ہی وہ چیخیں مار کر رونے لگی۔ میرا بھائی بھی آ گیا۔ وہ بھی رونے لگا۔ گھر میں اِس قدر کہرام مچ گیا کہ اُس میں کوئی شے منقش نظر نہیں آ رہی تھی۔ مجھے محسوس ہوا، میری والدہ، والد اور بھائی اور میرے چچازاد کے ساتھ گھر کے در و دیوار بھی رو رہے ہیں۔ میری اپنی حالت غیر ہو چکی تھی۔ مَیں والدہ کی گود میں سر رکھ کر جی بھر کے رونا چاہتا تھا اور رو رہا تھا۔ اتنے میں میرے چچا اور میرے چچازاد اور محلے والے سب ہمارے گھر میں داخل ہو گئے۔ پھر گاؤں میں ایک طرح سے نقارہ بج گیا کہ ضامن آ گیا ہے۔ ہماری ڈیوڑھی چند لمحوں میں انسانوں سے بھر گئی۔ والدہ مجھے اپنے سے جدا نہیں کر رہی تھی۔ اُس نے مجھے والد سے گویا چھین کر اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ مَیں نے والدہ کی گود میں لیٹے لیٹے اپنے بھائی کا ہاتھ کھینچ کر اپنے ساتھ لپٹا لیا کہ وہ پاس کھڑا روئے جا رہا تھا اور ابھی تک اُسے مجھ سے گلے ملنے

کا موقع نہیں ملا تھا۔ اُسی لمحے کسی نے بلب روشن کر دیا۔ اب ڈیوڑھی اور گھر کی ہر شے آنکھوں کی بینائی کو گھیرنے لگی۔ گھر تو وہی تھا لیکن اِس روشنی میں مَیں نے دیکھا گھر کی کوئی شے ترتیب میں نہیں رہی تھی۔ ہر شے گھر والوں کی بے نیازی اور بے پروائی کے صدمے سے گزر چکی تھی۔ میری والدہ اور والد نے میرے گم ہونے کے بعد شاید گھر کو فضول سمجھ کر اُس کے در و دیوار پر نظر نہیں کی تھی۔ تمام چیزیں ایک دم بوڑھی اور بدحال ہو گئی تھیں۔ والد اور والدہ کو مَیں نے پہچان تو لیا تھا مگر چھ ماہ کے اندر اُن پر سو سال کا بڑھاپا چڑھ گیا تھا۔ میرے اوسان خطا ہو گئے، دونوں کی صحت کس قدر گر چکی تھی۔ والدہ کے تمام بال سفید ہو چکے تھے اور والد تو بالکل بھی نہیں پہچانے جا رہے تھے۔ میرے لیے اُن دونوں کی شکلیں کتنی تبدیل ہو چکی تھیں۔ والدہ کے چہرے کی ہڈیاں اُبھر آئی تھیں۔ اُس کے بال سفید لکڑیوں کی طرح خشک ہو چکے تھے۔ خستہ ڈیوڑھیوں میں رہنے والوں کا خون اور ہڈیوں کا کیلشیم گویا ایوانِ بالا کے کوریڈوروں میں فائل بدست سیکرٹریوں، وزیروں اور اُن کی اولادوں میں منتقل ہو چکا تھا۔ یہ کیسا جرم تھا جس میں مجرم کے خلاف کوئی عدالت نہیں تھی۔

ایک کے بعد ایک ملنے والا آ رہا تھا۔ گاؤں میں جو سنتا تھا وہ رات کے اِس عالم میں بھی اپنی نیند اُجاڑ کر مجھے پوچھنے کے لیے جمع ہو رہا تھا۔ اُنھیں شاید میری محبت سے زیادہ میرے اغوا ہونے کی کہانی سے دلچسپی تھی۔ داستانیں سننے والے کتنے بے رحم سامع ہوتے ہیں۔ مظلوم سے زیادہ واقعات کی گتھیوں میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ جلد از جلد مجھ سے کہانی سننا چاہتے تھے۔ کچھ کو میری موت کا یقین بھی ہو چکا تھا۔ اب وہ اپنے اِس یقین کو مسمار ہوتا دیکھنے کے لیے ہمارے گھر کی طرف آ رہے تھے۔ کچھ انسان صرف حادثوں کی خبریں سننے سے دلچسپی رکھتے ہیں مگر وہ حادثے صرف غیروں کے ساتھ ہوں۔

چنانچہ لوگوں کی بے چینی مجھے ملنے میں کم اور میری کہانی سننے میں زیادہ تھی جبکہ والدہ اور ابا ابھی صرف اتنا جانتے تھے کہ اُن کا بیٹا گھر لوٹ آیا تھا۔ وہ کیسے اور کہاں اغوا ہوا؟ اِس بارے میں اُنھیں نہ تو پوچھنے کی ہمت تھی اور نہ ابھی مجھے بتانے کا یارا تھا۔ میری والدہ بار بار لوگوں کو پیچھے ہٹا رہی تھی اور میرا سر اپنی گود سے باہر نکلنے نہیں دے رہی تھی۔ جذبات سے اُس کے نہ تو آنسو رُک رہے تھے اور نہ وہ رونے سے خود کو قابو کر رہی تھی۔ مَیں دیکھ رہا تھا وہ اپنے آپ کو ہلکا پھلکا کرنا چاہتی تھی۔ مَیں خود بھی چاہتا تھا وہ غم کے بوجھ سے تھوڑی سُبک ہو جائے۔

رات کے دو بجے میرے چچا نے تمام لوگوں کو گھر سے باہر کر دیا تا کہ مَیں آرام کر لوں۔ مَیں

خود بھی تھک چکا تھا اور ابھی کوئی بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ صبح چار بجے کے قریب والدہ ہی کی گود میں میری آنکھ لگ گئی۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو دن بالکل روشن ہو چکا تھا۔ والدہ نے خدا جانے کب میرا سر اُٹھا کر اپنے زانو سے چارپائی پر رکھ دیا تھا اور میرے سر کے نیچے سرہانہ پڑا تھا۔ مَیں نے آنکھ کھولی تو وہ میرے سامنے بیٹھی تھیں اور میرے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھیں۔ چارپائی اور ڈیوڑھی کی بجائے کمرے میں تھی۔ والد صاحب ڈیوڑھی ہی میں لوگوں سے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ مَیں جیسے ہی اُٹھا والدہ نے ناشتا میرے سامنے رکھ دیا اور ہاتھ منہ دھونے کو کمرے ہی میں پانی مہیا کرنے لگی۔ مَیں نے والدہ سے کہا مَیں چولہے پر بیٹھ کر روٹی کھانا چاہتا ہوں۔ کمرے میں بالکل نہیں کھاؤں گا بلکہ اب کمرے میں سونا بھی نہیں چاہتا تھا۔ مَیں اُٹھ کر باہر نکلنے لگا تو والدہ نے میرا بازو پکڑ لیا جیسے مَیں بیمار ہوں اور والدہ مجھے اُٹھانا چاہ رہی ہو۔ جب ہم اُٹھ کر باہر چولہے پر آ گئے تو مجھے اُس ٹاہلی کے درخت پر ایک دم پیار آ گیا جس کے نیچے میری دادی کی چارپائی ہمیشہ پڑی رہتی تھی۔ مَیں اُسی ٹاہلی کے نیچے ایک تختی یعنی چوکی پر بیٹھ گیا۔ والدہ نے چولہے پر توا رکھ دیا اور روٹی پکانے لگی۔ میرا بھائی اور والد بھی چولہے پر آ بیٹھے۔ ڈیوڑھی میں بیٹھے ہوئے لوگ اُسی طرح بیٹھے تھے۔ اُنھیں میرے چچا کی بیوی یعنی میری چچی چائے بنا بنا کر پلا رہی تھی۔ ہمارے گھر کے صحن میں ایک نائی دیگ پکا رہا تھا۔ یہ میرے آنے کی خوشی میں نیاز پک رہی تھی۔ مَیں نے اپنے مکان کی چھت پر دیکھا علم لہرا رہا تھا۔ یعنی یہ گھر دوبارہ سے ہرا بھرا ہو گیا تھا۔ والدہ کے چہرے پر چمک ایک دم لوٹ آئی تھی۔ ناشتا کرتے ہوئے مجھے والد صاحب کے دل میں تجسس صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ کچھ پوچھنا چاہتے ہیں لیکن کوئی بات کرنے سے گھبرا رہے ہیں۔ وہ تھوڑی دیر بعد مجھے دیکھتے رہے پھر اُٹھ کر ڈیوڑھی میں چلے گئے۔ لوگ صبح سے اُن کے پاس خیر خبر کو آ رہے تھے مگر اُنھیں کچھ پتا ہوتا تو بتاتے۔ وہ محض حقہ پیتے ہوئے گاؤں والوں کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں کیے جاتے تھے۔ دوپہر تک دیگ پک گئی اور نیاز تقسیم ہونے لگی۔ والدہ کے پاس گاؤں کی عورتیں یکے بعد دیگرے ہجوم کرتی رہیں مگر مایوس ہو کر جاتی رہیں کہ اُنھیں ابھی تک والدہ نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ آخر دوپہر کے وقت چالیس پچاس لوگ جمع ہو گئے۔ اُن میں بچے بھی تھے اور ہر طرح کے لوگ جمع تھے۔ ایک بار میرے جی میں آئی کہ مَیں سب کے سامنے اُٹھ کر ایک تقریر کروں کہ مجھ پر کیا بیتی اور مَیں کس جرم میں پکڑا گیا تھا مگر مَیں باز آ گیا اور اپنے اِس احمقانہ خیال پر مسکرا دیا۔ مَیں سیاسی لیڈر یا مقرر نہیں تھا، نہ مجھے اِن لوگوں کو اپنی کہانی سنا کر ایشو پیدا کرنا تھا۔ نہ یہ لوگ جانتے تھے کہ کانفیڈینشل فائل کیا

چیز ہے۔ انھیں صرف اتنا پتا تھا کہ مَیں کسی غداری کا مرتکب ہوا ہوں اور اُس کے عوض پیسے لیے ہوں گے۔ پھر اُس کے بعد فرار ہو گیا۔

یہ تمام دن ایسے ہی نکل گیا۔ سہ پہر کے وقت مَیں باہر کھیتوں اور کھلیانوں کی طرف نکلنے لگا تو میری ماں نے مجھے روکنا چاہا کہ مَیں فی الحال باہر مت نکلوں، کہیں حادثہ پیش نہ آ جائے لیکن مَیں جانتا تھا اب مجھے کسی حادثے کا خطرہ نہیں تھا۔ مَیں اُن کے لیے ایک بار بے ضرر ہو گیا تھا اور دوسری بار وہ مجھے اپنے قریب نہ آنے دیتے۔ مَیں نے والدہ سے کہا، امی آپ فکر نہ کریں مَیں یہاں بس دس پندرہ منٹ کھیتوں میں گھوم لوں اور آپ اِسی دیوار سے پار دیکھتے رہیے گا آپ کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوں گا۔ یہ کہہ کر مَیں اپنے گھر کی اُسی چھوٹی کھڑکی سے باہر نکل گیا جو میرے بچپن کی یاد تھی۔

تیسرے دن صبح کے وقت مَیں، والد صاحب اور والدہ چولہے پر بیٹھے تھے۔ والد صاحب نے مجھے بتایا کہ اُنھیں کیسے پولیس تنگ کرتی رہی ہے اور کس طرح گھر کی پائی پائی پولیس کی نذر ہو چکی ہے۔ پولیس اُنھیں پکڑ کر لے گئی۔ کئی کئی گھنٹے کھڑے کیے رکھا اور ایک بار تو اُنھیں چت لٹا کر پولیس والے ٹانگوں پر چڑھ گئے۔ اِس تکلیف سے وہ تین ماہ تک چلنے پھرنے سے عاری ہو گئے۔ پولیس والے اصل میں میرے والد سے میرے بارے میں خبر حاصل کرنا چاہتے تھے کہ مَیں فائل بیچ کر کہاں چھپ گیا ہوں۔ ایک دفعہ خود سیکرٹری صاحب نے میرے والد کو سامنے بٹھا کر تین گھنٹے تک پوچھ گچھ کی۔ اُس کے بعد یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ جب میری کوئی خبر لگے اُنھیں اطلاع دی جائے۔

اِس تمام قضیے میں والد صاحب کی صحت اور آنکھوں کی بینائی پر بہت زیادہ اثر پڑا۔ دوسری طرف لوگوں کے طعنے اُن کا سینہ چیر رہے تھے۔ مَیں اپنے والد صاحب کی تمام باتیں سُن رہا تھا اور میرے سینے میں ایسی آگ بھڑک رہی تھی جیسے مجھے ایک بڑے تانبے کے برتن میں ڈال کر اُس کے نیچے ہلکی آنچ روشن کر دی گئی ہو۔

مَیں اپنی جگہ سے اُٹھا اور والد صاحب سے لپٹ گیا۔ میرا یہ اضطراری عمل ایسا تھا جس میں محض ایک جذباتی کیفیت تھی۔ اِس کا کسی شعور اور کیتھارسس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مجھ پر تو جو گزری گزر چکی تھی مگر میرے والد کو ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا جس میں ان کی کوئی غلطی نہ تھی۔ ایسا معاوضہ وصول کرنا پڑا تھا جس کے لیے اُس نے کوئی محنت نہیں کی تھی۔ اُن کی تمام باتیں اِس بات کی متقاضی تھیں کہ مَیں اپنے بارے میں محض صفائی پیش کروں اور اب اُس کا وقت تھا۔

مَیں نے والد صاحب سے کہا، ابا، شکر کر میری لاش اسلام آباد کے نالے سے نہیں ملی۔ اب مَیں اُن کے لیے بالکل بے ضرر ہو گیا ہوں تو مجھے چھوڑ دیا گیا ہے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ نہ تیرے مجرموں کے خلاف نہ میرے مجرموں کے خلاف۔ چیزیں جب اپنے مدار سے نکل جاتی ہیں تو اُن تک کوئی صدا اور کوئی لہر نہیں پہنچ پاتی۔ بس یوں سمجھو مَیں جسے چھ ماہ ذلت و رسوائی کے ساتھ ایک کوڑھ زدہ کمرے میں بند کیا گیا اور تُو جسے دردر پھیرایا گیا اور تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور یہ میری ماں، جو ہم دونوں کے زخموں کی گٹھڑی باندھ کر سر پر رکھے بیٹھی رہی، یہ سب محض گزری ہوئی ایک کہانی کا باب ہیں۔ اِنھیں باب سمجھ کر ہی خموش بیٹھ جائیں تو بہتر ہے۔ ہمارے ایک دوسرے سے جڑے ہونے کے سبب مَیں اب کوئی ایسی حرکت کر کے دوبارہ آپ تک رسوائی کا داغ نہیں پہنچا سکتا ورنہ مجھے کرب کا جو سامان میسر آیا ہے وہ مرنے کے ساتھ ختم ہو گا۔

اِن جملوں کے بعد میں نے اپنے والد صاحب سے تمام کہانی کہہ دی جو مجھ پر گزری تھی تا کہ وہ شانت ہو جائیں اور اُس احساس کو دل سے دھو دیں جو کانٹا بن کر اُن کے دل میں چبھو دیا گیا تھا۔

اِس کے بعد مَیں چھ ماہ گھر سے نہیں نکلا۔ البتہ حاجی فطرس علی، حبیب علی اور رضوان حیدر سے برابر ملاقات رہی۔ اب مَیں باقاعدگی سے امام باڑے بھی جانے لگا تھا اور شہر میں دوستوں کے ساتھ نئے سرے سے ملاقاتوں کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا تا کہ اُن کے دل میں میری طرف سے جو کچھ غبار تھا وہ دُھل جائے اور میری ذہنی حالت بھی ٹھیک ہو جائے۔ پھر ایک دن مجھے ملنے کے لیے الطاف حسن صاحب تشریف لے آئے۔

(۵۲)

اُنھوں نے مجھے جو کچھ احوال بتائے اُس کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔ مَیں نے جو فائل اُنھیں دی، وہ اُنہوں نے اپنے باس کے حوالے کر کے تمام رپورٹ پیش کر دی۔ وہ سمجھ رہے تھے باس اخبار کا ایڈیٹر ہونے کے ناتے اِس چیز کو ایک بڑے اسکینڈل کے طور پر چھاپے گا۔ یوں الطاف حسن کی شہرت کے ساتھ ساتھ اخبار اور صحافت کے وقار میں اضافہ ہوگا مگر ہوا یہ کہ اسکینڈل چھپنے سے پہلے ہی وہ فائل کسی سمجھوتے یا بارگیننگ کے تحت سیکرٹری صاحب کی میز پر چلی گئی۔ جس میں سورس سمیت ہر چیز اُنھیں بتا دی گئی۔ اِس بات پر ایڈیٹر اور الطاف صاحب کے درمیان جھگڑا پیدا ہو گیا اور اُنھیں اخبار سے فارغ کر دیا گیا۔ اُن کی بات میں اِس لیے بھی صداقت تھی کہ مَیں نے رہائی کے بعد اُس اخبار کو متواتر وزٹ کیا تھا مگر مجھے الطاف صاحب کا کالم کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ چنانچہ الطاف صاحب کا کہنا تھا کہ اُنھوں نے اپنا ایک اخبار نکال لیا ہے اور اُس کے لیے اُنھیں میری ضرورت ہے۔ میری والدہ کسی طرح راضی نہیں ہو رہی تھی مگر مَیں نے اُنھیں قائل کر لیا کہ اب وہ فکر مند نہ ہوں۔

مَیں دوبارہ اسلام آباد پہنچ کر اخبار کے ساتھ وابستہ ہو گیا۔ اِن کا دفتر بلیو ایریا کے ایک پلازے میں تھا۔ الطاف حسن اِس کے چیف ایڈیٹر تھے اور حسنات علی ایڈیٹر تھے۔ اِس کے علاوہ پندرہ لوگوں کا مزید عملہ تھا۔ اِن میں کاپی ایڈیٹر، پروف ریڈر، رپورٹر اور دو کالم نگار تھے۔ میرا کام میگزین کو ایڈٹ کرنا تھا۔ مَیں چند دن میں یہ کام سیکھ گیا اور عالمی ادب کی نئی پرانی کہانیاں ترجمہ کرا کر اِس میں چھاپنے لگا۔ ان کہانیوں کے علاوہ بھی میگزین میں بہت کچھ چھپ جاتا تھا مگر میری زیادہ توجہ کہانیوں پر تھی۔ اِس کی

وجہ سے یہ میگزین چند ہفتوں میں بہت مقبول ہو گیا اور مجھ سے تقاضا شروع ہو گیا کہ مَیں اسے ہفتے میں دو بار شائع کیا کروں۔ یہ ایک مشکل کام تھا مگر مَیں نے اپنے ساتھ ایک آدمی اور لے لیا۔ اُس کا کام ایک تو ترجمہ کرنا تھا اور دوسرا ادیبوں اور شاعروں کی طرف سے آئی ہوئی کہانیوں اور شاعری اور دیگر اصناف کو پہلی نظر میں الگ کر کے اور انتخاب کر کے میرے سامنے رکھنا تھا۔ مَیں اُس میں سے مزید انتخاب کرتا اور چھاپ دیتا۔

اِس طرح کے چھوٹے چھوٹے اخبار بہت زیادہ تھے۔ جن کا اصل کام خبر سے زیادہ خبر سازی ہوتا تھا۔ اِن اخباروں کی ڈکلیریشن اِسی لیے ہی لی جاتی ہے۔ اول یہ کہ مقامی سطح پر مختلف شعبوں کو ڈرا دھمکا کر اُن سے پیسے وصول کیے جائیں۔ دوئم اپنے صحافی ہونے کے امیج کو استعمال کر کے حکومت کے افسران کے ساتھ روابط میں رہا جائے۔ اکثر بڑے اخباروں میں بڑے لکھنے والوں نے اپنے یہ چھوٹے اخبار قائم کیے تھے اُنھی میں الطاف حسن تھا۔ جو حکومتیں اِن کا ڈکلیریشن دیتیں وہ ایسے اخباروں کے ایڈیٹرز سے ایک طرح کے خموش معاہدے کرتی تھیں کہ اُس کے کون سے حریف ہیں اور اُنھیں کیسے اِن اخبارات کے ذریعے دق کرنا ہے۔ یوں تو مقامی سطح پر بہت تھے مگر وہ اخبار محض اخبار ہی تھے اور صرف حجاموں کی دکانوں پر ہی دیکھے جا سکتے تھے مگر ہمارا اخبار میگزین کی وجہ سے ایک ادبی جریدہ بن چکا تھا اور اسلام آباد کے قرب وجوار کے ساتھ اردگرد کی بستیوں میں بھی پھیل گیا تھا۔ اگرچہ ایسے اخباروں کی کاپیوں کے بارے میں بہت سی چیزیں ایڈیٹروں کے پاس ہی راز رہتی ہیں جن میں اُس کی صحیح تعداد بھی ہوتی ہے لیکن عملی طور پر اِس کی تعداد کے بارے میں کوئی راز نہیں تھا اور اِس کی باقاعدہ اشاعت پانچ ہزار ہو گئی تھی۔ اکثر کاپیاں ڈاک کے ذریعے لوگوں کے گھروں تک جانے لگی تھیں اور دفتروں میں بھی پڑھا جانے لگا۔ یہ ترقی خبر کی وجہ سے بالکل نہیں ادب کی وجہ سے ہوئی تھی۔ بڑے اخبار زیادہ تر ادب کو تیسرے درجے کی چیز سمجھتے ہیں۔ مجھے اِس اخبار میں کام کرتے ہوئے دو چیزوں کا تجربہ ہوا۔ اول ادب یا ادیب کو اخبار میں اب کمتر سمجھا جانے لگا تھا۔ اُس کی جگہ سیاسی کالم نگاروں کو عزت سے نوازا جانا شروع ہو گیا تھا۔ یہ سیاسی کالم نگار شروع میں کرائم رپورٹر تھے۔ کبھی کبھی ڈائری لکھتے لکھتے کالم نگار بن گئے۔ حکومت ایسی تھی کہ اُسے ادب سے زیادہ سیاستدانوں کے خلاف پراپیگنڈے کا کام کرنا تھا اور وہ اِن کرائم رپورٹروں سے زیادہ بہتر طریقے سے کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ اخبار مالکان بھی چاہتے تھے کچھ ایسا لکھا جائے جس سے حکومت بھی خوش ہو اور اخبار کو اشتہار بھی زیادہ

ہیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے پرانے کالم نگار کھڈے لائن لگ گئے اور کرائم رپورٹروں نے اُن کی جگہ لے لی تھی۔ اِسی میں الطاف حسن بھی تھا۔ وہ جیسے تیسے اپنے نام کے سبب کالم نگاری کر رہا تھا مگر اُس کا کالم پڑھنے والے بہت کم رہ گئے تھے چنانچہ اُس نے اپنا یہ اخبار نکال کر حساب برابر کر لیا تھا اور اِس میں مَیں نے اپنے جوہر دکھانے شروع کر دیے تھے۔ اس عرصے میں مجھے جو تنخواہ ملنے لگی وہ اگرچہ میری سرکاری تنخواہ سے کم تھی مگر مَیں اِس میں گزارا کر سکتا تھا اور کام اچھے طریقے سے چل رہا تھا۔ اس میں جو سب سے بڑا فائدہ مجھے حاصل ہوا کہ میرے اسلام آباد کے تمام ادبی لوگوں سے روابط ہو گئے۔ یہ بہت عجیب قسم کے لوگ تھے مگر بے ضرر تھے۔ روزانہ کوئی نہ کوئی دوست میرے کمرے میں آ جاتا۔ اکثر بڑی محفل لگ جاتی اور رونقیں آباد ہو جاتیں۔ اِن میں سے ایک دو ہی بہتر افسانہ نگار تھے باقی دلجوئی کا کام کرتے تھے۔ اِسی طرح شاعروں کا حال تھا۔ بنیادی طور پر اِن شاعروں اور افسانہ نگاروں کی اپنی ٹولیاں تھیں اور ایک دوسرے کے خلاف حسد اور بغض سے بھری ہوئی تھیں مگر یہ حسد اور بغض کا بیان بہت دل فریب طریقے سے کرتے تھے۔ مَیں اکثر اُنھیں چھیڑ دیا کرتا پھر وہ ایک دوسرے کے خلاف پوری ادبی شان سے گفتگو کرتے۔ اِن میں سے جو اچھی ملازمت کر رہے تھے یا ایسے ادیب جن کا ادب صرف اُن کے پیسے اور عہدے کے سبب تھا، مَیں اپنے گزارے کے لیے اُن سے کچھ پیسے بھی وصول کر لیتا اور وہ اپنی تخلیقات کو میگزین میں دیکھنے کے لیے میری یہ خدمت بہت آسانی سے کر دیتے۔

میرے ساتھ طے تھا کہ مَیں رہائش دفتر ہی کے ایک کمرے میں رکھوں گا مگر چند دن کام کرنے کے بعد محسوس ہوا، میرے لیے یہ بات ممکن نہیں۔ آفس میں رہائش کا مطلب ہے کہ آپ چوبیس گھنٹے کام پر ہیں۔ ایسا نہیں کہ آپ کو ہر وقت کام پر بیٹھا رہنا ہے بلکہ ذہن میں یہ بات پختہ ہو جاتی ہے کہ مَیں کام کر رہا ہوں۔ دفتر کو چھوڑ کر دوسری جگہ رہنا دراصل فراغت کا ایک اطمینان دلانے والا رستہ ہے۔ اِس سارے معاملے میں جو بات اذیت دیتی تھی وہ الطاف حسن کے بیٹے حفیظ کا تکبر اور بدتمیزی تھی۔ یہ لڑکا کسی یونیورسٹی سے جرنلزم میں ماسٹر کر کے آیا تھا اور اب اخبار کو اپنی باندی سمجھ لیا تھا۔ اِس سے سب تنگ تھے۔ الطاف حسن سے ہلکی پھلکی شکایات بھی کر دیتے مگر اس کا اثر حفیظ پر کم ہی ہوتا۔ حفیظ اپنے احکامات بلا لحاظ علم و ادب اور عمر کے ہر ایک پر برابر چلاتا تھا، یہاں تک کہ اپنے باپ کے دیرینہ دوست حسنات علی کو بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ حسنات علی مجھ سے دس برس بڑا تھا اور الطاف حسن کے ساتھ اُس کے تعلقات دوستانہ تھے جنھیں اب حفیظ نے ملازمانہ کر دیا تھا۔ الطاف حسن اب دفتر میں بھی

کم ہی آتا تھا۔ اُسے جب سے دل کی بیماری ہوئی تھی، اُس نے ٹیلی فون پر ہی ہم سے سلام دعا شروع کر دی جب کہ حفیظ ہمارے سروں پر ہر وقت سوار رہنے لگا۔ ایک دن اُس نے مجھے کہا، ضامن صاحب آپ دفتر کو دفتر سمجھیں، سونے کا انتظام کہیں اور کریں۔ مَیں اُسی دن اپنا بستر اُٹھا کر کہیں اور لے گیا۔ اُس کے ساتھ ہی حسنات سے کہا، حضور اب میری نوکری کا بندوبست کہیں اور کروا دیں۔ حسنات نے اُسی دن فون پر ایک شخص سے بات کی۔ یہ عبادت علی تھا۔ کسی این جی او میں کام کرتا تھا۔ مَیں اُسی دن کام چھوڑ کر عبادت علی کے پاس چلا گیا۔ عبادت علی نے مجھے ڈھائی ہزار روپے ایڈوانس دیا اور کہا اُن کے لیے ایک ڈاکومنٹری تیار کروں جو بلوچستان کی معدنیات پر ہو اور مَیں یہ ڈاکومنٹری تیار کرنے کے لیے بلوچستان نکل گیا۔ مجھے وہاں کام کرنے میں دو مہینے لگے اور اِس نتیجے پر پہنچا مُلک کے مختلف حصے اور طبقے اور مسالک یہاں ایک دوسرے کے خلاف کام کرنے میں کتنی دلجمعی سے لگے ہوئے ہیں۔ اِس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اِس صوبے میں وسیع پیمانے پر مجرمانہ کارروائیوں کی منصوبہ بندی کرتے ہوئے اُن کے پاس سہولت، جگہ اور سامان کی ترسیل بہت آسان تھی یہاں تک کہ صوبے کے مقتدر لوگ بھی بھاری معاوضہ لے کر اُن کے ساتھ تعاون کرتے تھے۔ اِدھر ہماری ایجنسیوں کے مختلف کارندے اِن مجرمانہ کارروائیوں کو معمولی خیال کر کے اُن سے اپنا حصہ وصول کر رہے تھے اور بالکل پرسکون تھے۔ مجھے تشویش لاحق ہوئی اگر اِسی طرح کام چلتا رہا تو ایک دن اِس پورے جال کی گانٹھیں دانتوں سے کھولنا پڑیں گی۔ وہیں ایک دن مجھے خبر ملی کہ حسنات علی نے بھی اخبار چھوڑ دیا ہے اور اپنا ایک الگ سے آفس کھول کر کسی کمپنی کے لیے ایک رنگین رسالہ ایڈٹ کرنے لگ گیا ہے۔ کام ختم کر کے مَیں واپس لوٹا تو پتا چلا عبادت علی کسی کام کے سلسلے میں ملک سے باہر گیا ہے۔ اُس کے آدمی نے بتایا باقی رقم عبادت علی کے آنے پر ہی ملے گی۔ اب میرے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ رہا کہاں جائے؟ مَیں نے اپنے ایک پرانے کلرک دوست سے رابطہ کیا کہ کچھ دن کے لیے مجھے رہنے کو جگہ دے۔ اسلام آباد میں اکثر لوگوں نے ایک کمرے کے فلیٹ کرایے پر دے رکھے تھے۔ اُس نے مجھے کہا میرا ایک فلیٹ ہے، یہاں اپنا بستر لے آیئے۔ مَیں طے شدہ کرایے پر اُن کے فلیٹ پر چلا گیا۔ یہاں دو آدمی اور بھی رہتے تھے۔ مَیں نے جیسے تیسے وہاں اُن کے ساتھ گزارا کرنا شروع کر دیا۔ دو ماہ اِسی طرح گزر گئے۔ مَیں جب بھی عبادت علی کے دفتر جاتا پتا چلتا وہ مُلک میں موجود نہیں ہے۔ اب میرے پاس پیسے بالکل ختم ہو گئے۔ کئی دوستوں سے اُدھار لیے مگر اُدھار کے کھاتے کہاں تک چلتے ہیں۔

(۵۳)

مجھے اِس بوسیدہ فلیٹ میں چھ مہینے ہو گئے تھے۔ ایڈوانس کی لی ہوئی رقم پچھلے تین مہینے سے ختم ہو کر کم و بیش اِس سے دوگنا مجھ پر قرض چڑھ چکا تھا۔ گھر میں جتنا سرمایہ تھا وہ میرے حبس بے جا کے دِنوں میں پولیس اور میری تلاش میں لُٹ گیا تھا۔ وہ تمام ادبی اور غیر ادبی دوست جن کے لیے مَیں کبھی ناگزیر تھا کہیں گم ہو گئے تھے۔ صورت یہ پیدا ہو گئی کہ مجھے کوئی دوست اپنی طرف آتے دیکھتا تو رستہ بدل لیتا۔ اِدھر مَیں اپنے گھر میں ہرگز یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ مَیں معاشی بحران کا شکار ہو چکا ہوں۔ مَیں جانتا تھا میرا باپ بوڑھا ہو گیا ہے۔ اُسے کسی صورت کام نہیں کرنا چاہیے۔ اِدھر عبادت علی کی کوئی خبر نہیں مل رہی تھی۔ چند دوست ابھی تک مجھے مروّتاً پال رہے تھے۔ مَیں اُن سے قرض لے کر ابھی بھی گھر بھیج رہا تھا تاکہ اُنھیں محسوس ہو کہ مَیں منحوس نہیں ہوں اور اپنی معاشی حالت مستحکم رکھنے کی طاقت رکھتا ہوں مگر سچ یہ تھا کہ مَیں اب بہت بُری حالت میں تھا۔

یہ فلیٹ جس میں مَیں مقیم تھا اور متواتر اِس کا کرایہ بھی دے رہا تھا، دو کمروں اور ایک ڈرائنگ رُوم پر مشتمل تھا مگر تینوں کا رقبہ ڈیڑھ مرلے سے زیادہ نہیں تھا۔ ہم چار تھے لیکن سوائے غوں غاں کے مجھے ابھی تک کسی کے ساتھ بات کرنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ یہ تینوں کلرک تھے۔ عملی اور وضعی طور پر محض کلرک۔ اِن کی فکری اُپچ ہر طرف سے سمٹ کر اپنی بچت کی طرف سفر کرتی تھی۔ اِس بات نے اُنھیں بہت زیادہ کریہہ اور کنجوس بنا دیا تھا اور اِس میں شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ صبح کا ناشتا اِس

طرح ہضم کرتے جیسے سانپ مینڈکوں کو نگلتا ہے۔ کھانے کے بعد یہ حرام خور ڈکار لیتے تو مجھے تے آنے لگتی۔ مجھے تیسرا دن بغیر کھائے پیے گزر رہا تھا اور یہ بات یہ لوگ جانتے تھے۔ مَیں اِن کے سامنے موجود ہوتا تھا لیکن اُنھوں نے مجھے کسی وقت ذرا بھی دعوت نہیں دی۔ اِن کے پاس تنخواہ کے اچھے پیسے کے باوجود یہ لوگ پائی پائی کا حساب کرتے تھے۔ آپس میں چونی اِدھر اُدھر کرنے کے روادار نہیں تھے۔ میرے سامنے ایسے حساب میں جُت جاتے جیسے بڑی کمپنی کا بزنس چلا رہے ہوں۔ اِنھیں توقع تھی مَیں اِن کے ساتھ کچن کے معاملات میں شرکت کروں گا۔ ایک دن اُن میں سے کریہہ مونچھوں والے ایک کلرک نے مجھے یاددہانی بھی کروائی کہ اگر مَیں اُن کو کھانے کی شراکت داری حاصل کرنے کے لیے کچھ پیسے ایڈوانس دے دوں تو وہ میرے لیے بھی اہتمام کرلیا کریں گے۔ اول تو میرے پاس پیسے نہیں تھے۔ اگر ہوتے بھی تو اِن کی شراکت داری سے کہیں بہتر تھا مَیں کسی خارش زدہ کُتے کے کھانے میں شریک ہوجاؤں۔ اِن میں سے ایک کلرک کے علاوہ ڈرائیور بھی تھا۔ یہ شخص آفس کی ڈیوٹی کے بعد چار پانچ گھنٹے ٹیکسی چلاتا۔ فلیٹ پر آتا تو انتہائی بیہودگی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوتا۔ اُس کی کرخت شکل اور خبیث فطرت سے ایک خوف میرے دل میں بیٹھ گیا۔ اُس کی وجہ سے مَیں نے ڈرائنگ روم میں اپنی چادر بچھالی۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں میری کتابیں اور مسودے فرش پر ڈھیر تھے اور اِنھی کے درمیان ننگے فرش پر مَیں سو جاتا تھا۔ کتابوں اور مسودوں کے ڈھیر کے درمیان مجھے ننگا فرش ایک بیڈ کی طرح معلوم ہوتا تھا۔

کچھ عرصہ بعد پتا چلا یہ فلیٹ اور اِس طرح کے کئی فلیٹ گورنمنٹ کی ملکیت ہونے کے باوجود گورنمنٹ کے نہیں تھے۔ جنھیں یہ الاٹ ہوتے تھے، وہ اِنھیں آگے کرایے پر دے کر ایک ایک فلیٹ سے کئی گنا کرایہ وصول کرتے تھے اور خود اپنے نجی مکان میں رہتے تھے۔ اصل کرایے دار درپردہ ہاؤسنگ اتھارٹی کے ذمہ دار تھے جنھوں نے اِن فلیٹس کو اپنے اُن عزیز رشتہ داروں کے نام چڑھا رکھے تھے۔ اُن کے وہ رشتہ دار اسلام آباد میں ملازمت تو کرتے تھے مگر اُنھیں یہ معلوم نہیں تھا اُن کے نام گورنمنٹ کا فلیٹ بھی ہے جو کرایے پر چڑھا ہوا ہے اور اُس کا کرایہ ہمارے رشتہ دار کی جیب میں جا رہا ہے۔ پھر جو اِنھیں کرایے پر لیتا تھا وہ اِسے آگے کئی لوگوں کو کرایے پر دے رکھتا تھا اور اُن سے کئی گنا وصول کرتا تھا۔ اِس طرح کے سیکڑوں کلرکوں اور افسروں کا کاروبار چل رہا تھا۔

مجھے ننگے فرش پر سونا بہت مشکل ہوتا اگر میرے اردگرد کتابوں کے ڈھیر نہ ہوتے۔ یہ ڈھیر اُن

کلرکوں کو ردی لگتے تھے اور کسی ایسی صورت کے خواہش مند تھے جس میں یہ سب مسودے اور کتابیں آگ کی نذر ہو جائیں۔ ڈرائنگ روم میں سونے سے مجھے فائدہ یہ تھا کہ اُن کی منحوس شکلوں کو مسلسل دیکھنا نہ پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ نحوست پیدا کر دینے والی اُس گفتگو کو سننے سے بچا رہتا تھا جو وہ اپنی تنخواہوں کے الاؤنس اور رشتے داروں سے لڑائی جھگڑوں کے متعلق کرتے تھے۔ ناشتا کر کے یہ اپنے دفتروں کی طرف نکل جاتے لیکن الماریوں کو مقفل کرنا نہ بھولتے۔ اُن الماریوں میں اِن کی ایسی ضرورت کی اشیا موجود تھیں جن کی مجھے کوئی ضرورت نہ تھی۔ پچھلے تین دن سے مَیں شدید بخار اور سر درد سے تھا اور سوائے پانی کے دوسری کوئی شے حلق سے نہیں اُتری تھی۔ بھوک اور نقاہت نے میری طبیعت کو پامال کر کے رکھ دیا تھا اور سب کچھ برداشت سے باہر ہو چکا تھا۔ میرے پاس ایک اُٹھنی بھی نہیں تھی۔ میرے حواس جواب دے چکے تھے۔ مَیں فرش پر لیٹا اُن کے جانے کے انتظار میں تھا لیکن یہ حرام خور جاتے جاتے اِتنی دیر کر دیتے کہ مجھے شدید غصہ آنے لگتا۔ جیسے ہی ایک ایک کر کے وہ فلیٹ سے نکل گئے اور مجھے یقین ہو گیا کہ اب اُن کو اچانک اپنا کوئی کام یاد نہیں آئے گا، یا وہ فلیٹ پر بھول جانے والی شے کو دوبارہ لینے کے لیے نہیں پلٹیں گے اور پانچ کے بعد ہی اُن کا منحوس سایہ یہاں پڑے گا تو مَیں ننگے فرش سے اُٹھ کر کچن میں داخل ہو گیا۔ اُن کی چھوڑی ہوئی روٹیوں کے ٹکڑے اور پیاز کے چھلکے ڈسٹ بن میں پڑے تھے۔ خدا کا شکر تھا اِس میں دوسرا کچرا وہ نہیں ڈالتے تھے کہ روٹی کو اللہ کا رزق سمجھ کر ایک الگ بوری میں رکھ دیتے تھے۔ مَیں نے اُن کی چھوڑی ہوئی دو دن کی روٹیوں کے ٹکڑوں کو نکال کر ایک پتیلی میں ڈالا۔ اُس میں پانی اور نمک ڈال کر چولہے پر رکھ دیا اور اُبالنا شروع کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں اُن کا ملیدہ سا بن گیا۔ میری دانست میں ایسا کرنے سے ایک تو روٹی کے ٹکڑوں سے جوٹھا پن دور ہو گیا تھا اور ذائقہ بھی سوکھے ٹکڑوں سے الگ ہو گیا تھا۔ آگ پر پکنے سے تمام جراثیم بھی ختم ہو گئے تھے۔ تھوڑی دیر میں یہ ملیدہ تیار ہو گیا تو مَیں اُسے کھانے لگ گیا۔ یہ نمکین ملیدہ یا ملغوبہ شاید کسان اپنے بیلوں یا بھینسوں کے لیے بناتے ہوں گے مگر اُس انسان کو بھی یہ کھا لینے میں کوئی حرج نہیں تھا جسے پچھلے تین دن سے ایک ٹکڑا بھی نہ ملا ہو۔ مَیں نہیں جانتا مجھے اِس کا ذائقہ کیسا لگا مگر سر کا درد ایک پل میں دُور ہو گیا۔ یہ ملغوبہ کھا کر مَیں نے وہی برتن دھو کر ٹونٹی سے پانی پیا اور کچھ دیر کے لیے اپنی کتابوں اور مسودوں کے اُسی ڈھیر میں بیٹھ گیا جہاں سے تین دن تک اُٹھا نہیں تھا۔ اب میرے سوچنے کی قوت بحال ہو چکی تھی مگر یہ فکر ایسی نہیں تھی جس سے کچھ کار آمد شے لکھنے کے قابل ہو جاتا بلکہ اِس

قوت نے نئے سِرے سے عبادت علی کے متعلق سوچنے پر آمادہ کر دیا۔

مَیں بتا چکا ہوں عبادت علی کی اسلام آباد میں ایک این جی او تھی جو مُلک میں موجود اقلیت اور پسماندہ طبقات کے حقوق کے لیے کام کرنے کے عوض یورپ سے کافی کچھ فنڈ اکٹھا کر لیتی تھی۔ اُس کثیر فنڈ سے اسلام آباد کے پوش ایریا میں کوٹھی کے کرایے، تنخواہوں اور دیگر اخراجات نکال کر چند ہزار روپیہ اقلیتوں کے حقوق حاصل کرنے پر بھی لگا دینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ اِنھی چند ہزار میں سے اُس نے میرے لیے ایک ٹیلی فلم کا سکرپٹ لکھنے کا کام بھی نکال لیا تھا جس کا ایڈوانس پانچ ماہ پہلے ڈھائی ہزار مجھے مل چکا تھا اور باقی دس ہزار سکرپٹ اُس کے حوالے کرنے کے دوسرے دن ملنا تھا۔ یہ سکرپٹ میں نے اُن کو دو ماہ میں مکمل کر کے دے دیا مگر پیسے چھ ماہ گزرنے کے بعد بھی نہ مل سکے۔ اگر پچھلے چار ماہ سے بار بار چکر لگانے پر بھی مجھے نہیں ملا تھا تو اُس کی ایک ہی وجہ تھی کہ وہ بقیہ پیسے دینا نہیں چاہتا تھا۔ باقی وجوہات جیسا کہ اُس کا اپنی مصروفیات کی وجہ سے نہ مل سکنا بھی پہلی وجہ سے منسوب تھیں اور پچھلے ایک مہینے سے مَیں نے اُن پیسوں کا خیال ہی چھوڑ دیا تھا۔

یہ گداگرانہ ملغوبہ کھانے کے بعد مجھ میں تھوڑی سی جان پیدا ہوئی تو مَیں پہلے غسل خانے میں داخل ہو کر اُس صابن سے نہایا جو اُن تینوں میں سے کسی ایک کلرک کے کپڑے دھونے کے لیے تھا۔ یہ صابن اُس وقت میرے لیے غنیمت تھا۔ اِس میں موجود کاسٹک نے میرے جسم کی میل اور بُو ریگمار کی طرح صاف کر دی۔ اِس سب کچھ کے بعد جب میں فلیٹ سے نکلا تو گیارہ بج رہے تھے۔ میرے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ ویگن یا سواری لیتا۔ مَیں نے اِس جی ایٹ تھری کے بیہودہ فلیٹ سے نکل کر شاہراہِ فیصل کو عبور کیا اور سُپر کی طرف پیدل چل پڑا۔ یہاں سے پیدل جناح ایونیو پر پہنچ کر میرا رُخ بلیو مارکیٹ کے ساتھ ساتھ عین اُس طرف ہو گیا جہاں سے سیدھی سڑک جناح سُپر کو نکلتی ہے۔ یہ فاصلہ اتنا کم نہیں ہے کہ آپ ایک یا آدھ گھنٹے میں طے کر لیں لیکن اسلام آباد میں درختوں کی بہتات اور اردگرد کے جنگلات کے سبب ایک تو سائے کی کمی نہیں تھی، دوسرا آج بادلوں کی گہری تہیں پورے اسلام آباد پر چڑھی ہوئی تھیں۔ سعودی ٹاور کے پہلو سے نکلتی ہوئی سڑک پر ہو کر جناح سُپر جا نکلا۔ یہاں سے میری اگلی منزل سُپر مارکیٹ کا رائل پلازہ تھی۔ مَیں سسکتھ ایونیو کو عبور کر کے آخر دو بجے کے قریب جا پہنچا۔ یہاں مجھے یقین تھا حسنات سے ملاقات ہو جائے گی۔ الطاف حسن کے اخبار میں کام کرنے کی میری آخری مہینے کی تنخواہ حسنات نے وصول کی تھی اور مَیں وہاں سے تنخواہ وصول کرنے سے پہلے نکل

بھاگا تھا۔ حسنات ہی نے مجھے عبادت علی سے متعارف کروایا تھا اور اُسی کی ایما پر مَیں نے عبادت علی کے لیے کام کیا تھا۔ مجھے اُمید تھی حسنات میری تنخواہ نہ بھی دے پھر بھی کچھ رقم اُس سے ضرور وصول کر لوں گا۔ پلازے کی تیسری منزل پر پہنچ کر مَیں نے سیدھا حسنات کے دفتر کا رُخ کیا اور عین اُس وقت اُس کی میز کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا جب وہ کچھ ردی کاغذ ڈسٹ بن میں پھینکنے کے لیے جھک رہا تھا۔ مجھے سامنے دیکھ کر وہ ایک دم بوکھلا سا گیا۔ اُسی بوکھلاہٹ میں وہ اُٹھتے ہوئے کرسی کے ایک طرف گرتے گرتے بچا مگر سنبھل گیا۔ آیئے، ضامن علی صاحب، آپ تو خواب ہو گئے۔

حسنات صاحب یہ بھی آپ کی عنایت ہے، ہمیں خواب میں تو رکھتے ہیں۔

میرے اِس جملے پر اُس نے ایک کھسیانی سی ہنسی بنا کر منہ دوسری طرف پھیر لیا جیسے کوئی چیز اُٹھانے کے لیے دراز کھول رہا ہو مگر بات کا سلسلہ بھی جاری رکھا تا کہ مجھے اُس کی شرمندگی کا احساس نہ ہونے پائے۔

آج کل آپ کے حالات اچھے نہیں لگ رہے، کام نہ چھوڑتے تو کچھ آنے جانے کی اُمید تو رہتی۔

حسنات آپ نہیں جانتے یہ اُمید بیماری کی حالت میں شفایابی کے لیے تو رکھی جا سکتی ہے لیکن شہ رگ کٹ رہی ہو تو ایک لمحے کا انتظار بھی موت ہے۔ آپ کی اُمید آپ کے گھر میں موجود سرمائے کے سبب طول کھینچ سکتی ہے مگر جن کے چولہے پر مسلسل صاف پانی اُبل رہا ہو، وہ بہت دیر تک بھوکے پیٹ کو دلاسا نہیں دے سکتے۔

مَیں آپ کی حالت دیکھ کر نہ صرف دُکھی ہوا ہوں بلکہ شرمندہ بھی ہوں۔

وسیم ذرا نیچے سے دو چائے لاؤ اور سنو! بسکٹ بھی لے آنا۔ اُس کا حکم سُن کر ایک لڑکا دروازے سے نکل گیا۔

حسنات نے تمام کاغذ سمیٹ کر ایک طرف کیے اور مکمل طور پر میری طرف متوجہ ہو گیا۔ یقین جانئیے میرے پاس ابھی تک آپ کے لیے اتنے پیسے پیدا نہیں ہو سکے جن سے تنخواہ کا بار اُتار سکوں۔ میری اپنی دو ماہ کی تنخواہ ابھی وصول نہیں ہوئی۔ یہ سیٹھ لوگ اشتہارات کے بل ادا کرنے میں بخیل ہوتے ہیں جبکہ کسی چوک میں کھڑے ہو کر اِتنے ہی پیسوں کا کھانا پکا کر اُن نالائقوں کو کھلا دیتے ہیں جنھیں کام کرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ آپ جانتے ہیں یہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ اِنھیں ایسے ثواب کی

ضرورت ہوتی ہے جو خدا کی بجائے انسانوں سے داد کی طرح وصول پا سکیں جیسے ایک شاعر اپنی غزل کا معاوضہ چاہتا ہے۔ یہ بات کم از کم مجھے ضرور اذیت دیتی ہے۔

حسنات آپ کے یہ خیالات میرے لیے اُس وقت خوشگوار تاثر پیدا کریں گے جب میں معاشی طور پر مطمئن ہوں گا۔ مَیں نے جواب دیا۔ وہ ذلت بہت آسان ہے جس کا بار انسان جہالت کی وجہ سے اُٹھاتا ہے مگر ایسی ذلت جس میں معاشی بدحالی کا دخل ہو انسان کے لیے مستقل کرب بن جاتا ہے۔ میرے دوستوں کا اس میں بہت دخل ہے۔

اِسی عرصے میں چائے لے کر آنے والے لڑکے نے میز پر چائے رکھنے کے بعد میری طرف ایسے دیکھا جیسے مجھ پر احسان کر رہا ہو۔ مجھے اُس کی حرکات سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ نخوت کا شکار ہے۔ وہ بالکل خوبصورت لڑکا نہیں تھا پھر ایک ہی صورت ہو سکتی تھی کہ اُسے حسنات کا حکم بیگار لگ رہا ہو۔ جیسے ہی وہ کمرے سے باہر نکلا، مَیں نے سوال کیا، اِس لڑکے کو مَیں ایک لمحے کو برداشت کرنے کو تیار نہ ہوتا۔

میری بات پر حسنات مسکرا دیا، ضامن صاحب اس صورت میں، جب آپ اِسے ہر ماہ کی تنخواہ برابر دے رہے ہوں، واقعی نکال سکتے ہیں۔

ٹھیک ہے اب مطلب پر آیئے اور مجھے قسطوں میں ہی سہی کچھ پیسے ضرور دیجیے۔ آج میری حالت ایسی نہیں کہ مزید کچھ دن گزارا کر سکوں۔ میرا گھر تو خیر افلاس میں جاں بلب ہے ہی، ستم یہ کہ آج مجھے اپنی فکر پڑ گئی ہے۔

مَیں آپ کو اِس وقت شاید کچھ نہ دے سکوں۔ حسنات نے شرمساری سے جواب دیا۔

اِس پری خانہ قسم کے دفتر میں بیٹھ کر آپ مجھے کچھ نہ دیں گے تو پنڈی اسٹیشن کی سیڑھیوں پر کرسی جمالیں، مَیں نے تلخی سے کہا۔

حسنات ہنس دیا اور بولا، دراصل ابھی مَیں اِس جگہ جس شان و شوکت سے کام کرتا نظر آ رہا ہوں، یہ ایک کمپنی ہے۔ مَیں اِس میں ایک عام سا ملازم ہوں۔ یہاں تنخواہوں کی ادائیگی کی بجائے منافع اور دفتر کی آرائش زیادہ اہم ہوتے ہیں۔

کیا مطلب، مَیں سمجھا نہیں، مَیں نے تعجب سے پوچھا، یعنی لاکھوں روپیہ خرچ کر کے سیکڑوں روپیہ کی تنخواہ وقت پر دینے میں انھیں خسارہ نظر آتا ہے؟ یہ کیسی کمپنی ہے؟

میرے اس سوال پر حسنات علی نے پہلو بدلا اور فلسفیانہ انداز میں مخاطب ہوا، ضامن صاحب آپ بھولے پنچھی ہیں۔ یاد رکھیں جب ایک بزنس کمپنی کی بنیاد پڑتی ہے تو دراصل خلق خدا کے معاشی قتل کی بنیاد پڑتی ہے۔ کمپنی کا بھاری تنخواہ لینے والا ایم ڈی اپنی جاب کے کنٹریکٹ پر دستخط نہیں کرتا، وہ انسانوں کے معاشی قتل کے منصوبوں پر سائن کر رہا ہوتا ہے۔ خیر یہ باتیں آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں گی، یہ پچاس روپے جیب میں ہیں۔ اِن میں سے آدھے آپ رکھ لیجیے۔ حسنات نے اُن میں سے تیس روپے میرے سامنے رکھ دیے۔

یہ میرے لیے ناکافی ہیں، مَیں نے بیزاری سے کہا۔

آپ اِنھیں رکھیے اور ایک بات سنیے۔ اپنا کان اِدھر لائیے۔ حسنات نے میرے قریب ہوتے ہوئے کہا۔

آپ یہیں بتائیں، فی الحال مجھے اپنے کان کی ضرورت ہے۔ مَیں نے چڑ کر کہا۔

حسنات نے سر آگے کر کے نہایت رازداری سے کہنا شروع کیا، آپ کو ایک خوشخبری دیتا ہوں۔ فوری طور پر کویت ہاسٹل کے کمرہ نمبر 21 میں تشریف لے جائیے۔ آپ کو سکرپٹ کا تمام معاوضہ وصول ہو جائے گا۔

کیوں وہاں یو ایس ایڈ نے بدبختوں کے لیے امدادی بینک کھولا ہے؟

بالکل نہیں، وہاں عبادت علی چھپا ہوا ہے اور آج صبح ہی اُسے تین لاکھ کیش پہنچا ہے۔ اُس پر جس قدر قرض چڑھ چکا ہے اُس کا اندازہ آپ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ وہ دفتر کا کام وہیں بیٹھ کے کر رہا ہے اگر بغیر وقت ضائع کیے پہنچ جاؤ گے تو آپ کی تمام رقم نہ صرف وصول ہو جائے گی بلکہ مزید کام کا ایڈوانس بھی مل سکتا ہے۔ حسنات علی نے اطلاع دیتے ہوئے اپنی کمر گھومنے والی کرسی سے لگا کر مجھے تحسین آمیز نظروں سے دیکھنے کے لیے آمادہ کیا۔

حسنات کی بات سُن کر مجھے حیرت ہوئی اور ایک دم گویا مجھے کسی تیز وولٹ کا جھٹکا بھی لگا۔ کویت ہاسٹل کا تعلق ایک ایسے ادارے سے تھا، جو کسی طرح بھی عبادت علی کی ذہنی یا فکری اُپچ کے مطابق نہیں تھا، پھر وہ یہاں کیوں؟ کیا ایسا تو نہیں یورپ کی اکثر این جی اوز اِس مُلک میں بدویانہ سوچ کو پروان چڑھا رہی ہیں۔ حالیہ افغان وار میں اِس مُلک کی سیاست پر جس قدر امریکا کا عمل دخل تھا اُس نے ہمارے بیشتر دانشوروں کو یورپ کی نقب زنی کی طرف دھیان ہی نہیں دینے دیا یا وہ اُس جرم میں برابر

کے شریک تھے جس کے تحت ایک خاص عمل کے ذریعے متواتر برطانیہ کی پروردہ صحرائی ریاست کو ہمارے مُلک پر مسلط کرنا تھا۔ ہمارے وہ تمام دانشور جنھیں انگریزی کی کچھ شُدھ بدھ تھی اپنی اپنی این جی اوز کے کشکول لے کر یورپی مُلکوں کے دروازوں پر بیٹھ گئے تھے اور اُن سے ایسی خیرات وصول کرنے لگے جس کے لقمے خون کے ساتھ تر کر کے حلق میں اُتارے جاتے تھے۔ کویت ہاسٹل میں ریالوں کے ٹوکرے بھر کر آتے تھے اور خون کے دریاؤں پہ لد کر تعلیمی اداروں کی راہداریوں میں پھیل جاتے تھے۔ کیا عبادت علی کا کویت ہاسٹل میں قیام اِس بات کی دلیل نہیں کہ یہ لبرل ازم کا کُرتا پہنے ہوئے تعصّبانہ سوچ کی آبیاری میں مصروف ہے۔

اب مجھے یاد آنے لگا، ہر ماہ اُس کا دبئی اور سعودیہ میں آنا جانا اِسی سلسلے کی کڑی تھی۔ اُس نے مجھے سکرپٹ کا کام دیتے ہوئے یاد دلایا تھا کہ اُس کے اندر اسلام کے سوادِ اعظم کی فکر حاوی رہے تاکہ ہم حکومت کی طرف سے مشکلات کے شکار نہ ہوں اور میری این جی او کو کسی قسم کی گرفت میں نہ لے لیا جائے۔ اُس کا مقصد دراصل یہی تھا۔ مَیں اِس پورے معاملے کو دیکھ کر اب تقریباً کانپ رہا تھا اور لاعلمی کے سبب اُس سکرپٹ کے معاملے میں ایسی جانبداری کا شکار ہو گیا تھا جو اپنی ہی بقا کے خلاف تھی۔ خود عبادت علی کی بقا کے خلاف تھی۔

مَیں نے وہ تیس روپے جیب میں رکھے اور چائے کے بقیہ گھونٹ لینے لگا۔

آج کل کہاں رہتے ہو؟

ایک ایسی جگہ جس سے سانپ کی بانبی زیادہ بہتر ہے۔ مَیں نے جواب دیا۔

کیا مطلب؟ سمجھا نہیں۔

مَیں تین کلرکوں کے ساتھ ایک ایسے گھٹیا فلیٹ میں رہتا ہوں جس کے ساکنوں نے انسانوں کی بجائے منحوس قسم کے جانوروں میں پرورش پائی ہے۔ یعنی اِن دِنوں میرا اُٹھنا بیٹھنا کچھ سؤروں کے ساتھ ہے۔ اُن کا جوٹھا بھی اُن سے چھپ کر کھاتا ہوں، اپنی شرافت کی بنا پر نہیں بلکہ اُنھیں پتا چلے تو وہ اپنی روٹی کے بچے کُھچے ٹکڑے بھی ٹھکانے لگا کر دفتروں کو روانہ ہوں۔

میری باتوں کے دوران حسنات نے ایک بیل بجائی اور وہی لڑکا وسیم داخل ہوا، شاذب کو بلاؤ، اُسے دیکھتے ہی حسنات نے حکم دیا۔ وہ اُلٹے قدموں واپس ہو گیا۔

اچھا چلیں چھوڑیں آپ میرا ایک کام کر دیں۔ مَیں نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

مثلاً؟

مجھے ابھی اور اسی وقت ایک کمرہ رہنے کو چاہیے۔

اِس وقت؟ ایں خیر تو ہے۔

جی ہاں۔ کیونکہ مَیں اُس منحوس فلیٹ پر اب ایک لمحہ بھی رُکنا گوارا نہیں کروں گا۔

کیوں؟ وہاں سیلاب آ گیا ہے؟ حسنات ہنس کر بولا۔

اگر آپ اُس فلیٹ میں ایک رات گزار لیتے تو دوسری رات سے پہلے خودکشی کر لیتے۔ شریف آدمی کے لیے وہ جگہ سیلاب سے بدتر ہے۔ مَیں نہایت کمینے لوگوں کے ساتھ رہ رہا ہوں۔ کلرک یا ٹیکسی ڈرائیور ایک دوسرے کے لیے عجیب نہیں ہوں گے، مگر میرے جیسے اُن کے لیے عجیب ضرور ہیں۔

اِس لڑکے کو آنے دو، ابھی یہ مسئلہ بھی حل کر لیتے ہیں۔ حسنات نے انتہائی سکون سے کہا۔

کیا مطلب؟

بھئی مطلب سے غرض رکھو پُرسش سے نہیں۔ مَیں نے آپ ہی کے کام کے لیے اِس اُلو کو بھیجا ہے۔ حسنات نے خبردار کیا۔

ہمارے اِن چند مکالموں کے درمیان لڑکا شاذب آ گیا۔ اُس کے ساتھ ہی وہی وسیم تھا جس نے اسی عالم میں چائے اور بسکٹ میز پر دوبارہ رکھ دیے۔ مَیں نے دیکھا شاذب ایک چائے کا کپ لے کر باہر خود میز پر رکھ کر بڑی شان سے بیٹھ چکا تھا۔

اُس کو دیکھتے ہوئے مَیں نے حسنات سے کہا، یہ لڑکا کسی طرح سے بھی آفس بوائے نہیں لگتا۔

آپ کا اندازہ ٹھیک ہے۔ یہ ماڈل بننے کے لیے بے چین ہے اور مَیں نے اِسے وعدہ دے رکھا ہے۔ حسنات نے مجھے اوچھوں کی طرح آنکھ ماری کہ مَیں خود شرما گیا۔ بعض اوقات وہ عجیب بے ہودہ حرکت کر جاتا تھا جس کی توقع کسی کو نہ ہوتی اور بالکل دیہاتی گنوار لگتا تھا۔

اچھا تو یہ بات ہے، مَیں نے اُسے طنز سے کہا۔

یہ کچھ، وہ کچھ بات نہیں ہے، پھر شاذب سے مخاطب ہوا، شاذب چائے لے کر اندر آ جاؤ۔

شاذب نے اپنی چائے اُٹھائی اور اندر آ گیا۔ آتے ہی وہ تیسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ حسنات نے اُسے میری طرف اشارہ کر کے کہا، یہ ہمارے دوست ضامن علی ہیں، ویسے ہی منچلے جیسے خود ہم ہیں۔

جی سر مَیں اِن کے آرٹیکل پڑھتا رہا ہوں۔ لڑکا انتہائی نفاست سے بولا۔

ارے واہ بھئی۔ اچھا ایک کام کرو، اپنے دوست کو فون ملاؤ اور اِن کے لیے فلیٹ کا بندوبست کرو۔

سر یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں، ذیشان کا فلیٹ موجود ہے۔ اُن میں سے ایک کمرہ مَیں کہہ دیتا ہوں، یہ رکھ لیں۔ شاذب نے چمکتی سیاہ آنکھوں کو میری طرف گھما کر جواب دیا۔

آج ہی سے، مَیں جلدی سے بولا۔

اُنھیں تو کرایہ چاہیے، آج ہی ہو جائے گا۔

کہاں ہے؟ حسنات نے پوچھا۔

یہیں سپر میں۔ شاذب کے جواب دینے کا طریقہ آنکھوں کی تیز گردش میں پوشیدہ تھا۔

ایک کام کرو، یہ موٹر سائیکل لو اور جا کر پتا کرو، پھر مجھے مخاطب کیا، تب تک ضامن صاحب آپ عبادت علی کی طرف سے ہو آئیں۔ فلیٹ مل جائے گا سرمایہ بھی تو ہو۔

سر ایسی بھی کیا جلدی ہے؟ شاذب نے چابی میز سے اُٹھا کر اُس کا رِنگ اُنگلی میں گھمایا۔ باہر جاتے ہوئے اُس کی کمر کا انداز ایسا تھا کہ مجھ سے دیکھا نہیں گیا۔ مَیں نے شرم سے پھر اپنی نگاہیں نیچے کر لیں اور حسنات کو دیکھنے لگا۔

سنیے اگر وہ لڑکا وہاں ملے تو اُسے یہیں لیتے آیئے گا۔ حسنات نے شاذب کو پیچھے سے آواز دی۔

شاذب کے جانے کے بعد حسنات نے اپنا سگریٹ نکالا اور اُسے پنسل کی طرح دو تین دفعہ اُنگلیوں میں گھما کر ہونٹوں میں دبوچ لیا اور لائٹر سے اُسے آگ دی۔

ضامن صاحب آپ بھی عجیب چیز ہیں، کچھ تو زندگی کا لطف لیا کریں، سگریٹ، پان، شراب، کوکین کچھ بھی نہیں لیتے؟ زندگی کی کسی شے میں حصہ نہیں لیتے۔ حسنات نے مجھے طنز سے مسکرا کر کہا۔

اِن میں سے پہلی دو چیزیں غریبوں کی ہیں اور اگلی دو شُرفا کی، مَیں اِن دونوں میں سے نہیں ہوں۔ مَیں نے دوٹوک جواب دیا۔

حسنات نے میری طرف مسکرا کر دیکھا، آپ ولیوں میں سے ہیں۔

خیر ایسا بھی نہیں ہے۔ مَیں نے جواب دیا۔ حسنات میاں انسان کے لیے کیا موزوں ہے اور کیا نہیں؟ یہ سب اُس وقت پتا چلتا ہے جب لڑکپن سے نکل جاتا ہے۔ بدقسمتی سے عقل مندوں کو پہلی دونوں اشیا کی علت لڑکپن ہی میں پڑتی ہے، بھلا کیوں؟

خود ہی وضاحت فرمادیں، وہ سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہو گیا۔

کیونکہ اُنھیں فرصت بہت ہوتی ہے، مَیں بولنے لگا، جی ہاں، لڑکپن میں فراغت ایک ایسا عمل ہے جسے پُر کرنے کے لیے سوچنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ عقلمندوں کے سامنے جو شے بھی سامنے آئے اُسی سے اپنی فرصت کو دُور کرتے ہیں اور مجھے فرصت نہیں تھی۔ مَیں زندگی میں کبھی فارغ نہیں رہا۔ بعد میں بھی ایسا نہیں ہوا کہ مَیں بہت عقل مند ہو گیا ہوں۔ شاید اب مَیں سوچتا ہوں مجھے نشہ پیدا کرنے والی چیزوں کا ذائقہ اچھا نہیں لگے گا۔ ایسا نہیں کہ مَیں اِنھیں گناہ سمجھتا ہوں۔ ایسا ہوتا تو گناہوں کی کئی اقسام ان کے علاوہ بھی ہیں اور وہ مَیں کر رہا ہوں۔ بس یوں سمجھیں کہ مَیں اِن کے ذائقے سے ڈرتا ہوں۔ یہ ڈر شاید اُس ذلت کا بھی ہے جس کے بعد عزت کا تصور بے معنی ہو جاتا ہے اور مَیں وہ تصور بے معنی نہیں ہونے دیتا۔

ایسا تو نہیں کہ تمھیں نیکی کے احساسِ برتری نے گھیر رکھا ہے؟ اور اِن اشیا کے استعمال کو اپنی شرافت کے منافی سمجھ کر مطعون کرتے ہو۔

حسنات نے بہت باریک نکتہ پکڑا تھا جس کا حتمی جواب ممکن نہیں تھا مگر مَیں اُس کی دلیل کو قطع کرنے کے لیے بولا، احساسِ برتری؟ آہ، یہ بھی ہوسکتا ہے مَیں کسی برتری کے کچلے ہوئے احساس میں زندہ ہوں جو دراصل احساسِ کمتری کی ہی ایک شکل ہے۔ لیکن ایسی باتیں اُس وقت زیب دیتی ہیں جب انسان کو اپنی اگلے لمحے کی پستی یا بلندی کا اندازہ ہو۔ آپ نے دیکھا نہیں آج صبح ہی میری حالت کسی بھی احساسِ کمتری یا برتری سے ماورا تھی۔

میرا خیال ہے، وہ حالت دب گئی تھی اور ابھی جیسے ہی آپ کے پاس تیس روپے کی یافت ہوئی ہے فوراً کلرکوں کی نفسیات پر آپ کے بلیغ لیکچر ظاہر ہونے لگے ہیں۔ حسنات نے جواب دیا۔

حسنات کی یہ بات رد نہیں کی جا سکتی تھی، اُس کا جملہ نہایت کاٹ دار تھا۔ آج صبح ملغوبہ کھاتے ہوئے میرے جذبات میں لاشعوری ذلت کا احساس کہیں کلبلا رہا تھا۔ وہ دب ضرور گیا تھا مگر جیسے ہی مَیں فلیٹ سے نکلا تھا اُسے ایک لمحے کے لیے بھی نظر انداز نہیں کر سکا تھا۔ مَیں شاید اِس کی کوئی توجیح کرتا لیکن اُسی لمحے مجھے خیال آیا، مجھے فوراً عبادت علی کی طرف جانا چاہیے اور مَیں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کہا، حسنات صاحب آپ اُن لڑکوں سے نپٹیے اور کمرے کا بندوبست کیجیے۔ مَیں عبادت علی سے ہو کر سیدھا آپ کی طرف آتا ہوں۔ اتنا کہہ کر اُس کے دفتر سے نکل گیا۔

(۵۴)

حسنات کے آفس سے نکل کر مَیں کچھ لمحے سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ میرے دائیں جانب پارلیمنٹ کی وسیع اور چوڑی عمارت کھڑی تھی۔ اِس سفید رنگ عمارت کے ماتھے پر لکھے ہوئے کلمے کا اِس ملک کو کیا فائدہ ہوسکتا تھا بلکہ اِس عمارت ہی کا کیا فائدہ تھا؟ اِس طرح کی بے مقصد عمارتیں لوگ اپنی زبان اور ہاتھوں کی گرہیں کھولنے کے لیے بناتے ہیں۔ یہ تالیاں پیٹنے اور نعرے لگانے کو اچھی جگہ ہے۔ میرے لیے تو یہ بالکل ایک فضول شے تھی۔ بادل اتنے گہرے ہو گئے کہ ایک طرح سے اندھیرے کا گمان ہونے لگا۔ آسمان پر بادل کالے ہاتھیوں کی طرح بھاگ رہے تھے۔ سامنے کی سڑک سیدھی مارگلہ ہلز کی طرف نکلتی تھی۔ اِس پر کھڑے چناروں نے کالے بادلوں سے مل کر اسلام آباد کو اندھیرے میں ڈبو دیا تھا۔ میری جیب میں اِس وقت تیس روپے آ چکے تھے لیکن مَیں اِن کو کرایوں میں ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ویسے بھی موسم پیدل چلنے کے لیے بہت مناسب تھا۔ مَیں بس پر بیٹھنے کی بجائے سیدھا کہسار مارکیٹ سے نکل کر مارگلہ روڈ پر آ گیا۔ یہ سڑک سیدھی مغرب کی چلیں تو سکس ایونیو کو عبور کر کے ایف سیون میں داخل ہوجاتی ہے۔ مَیں اِسی سڑک پر مسلسل چل رہا تھا۔ میرے دائیں طرف ای سیون اور بائیں جانب ایف سیون تھا۔ مَیں ای سیون کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا شاہراہِ فیصل پر نکل آیا۔ پچھلے تین دن کی بھوک سے میرے بدن میں جو نقاہت پیدا ہو چکی تھی، صبح کے ملغوبے اور حسنات کی چائے نے وہ دُور کر دی تھی۔ جیسے ہی مَیں فیصل چوک پر پہنچا وہ سیکرٹری جس نے مجھے چھ ماہ تک حبسِ بے جا میں

رکھا تھا اور میرے والدین کو اذیت دی تھی کسی اپنے ہی جیسے حرام خور کے ساتھ کھڑا تھا۔ میرے دل میں ایک دم غصے کا لاوا پھوٹ پڑا مگر اِس سے پہلے کہ مَیں جرأت کر کے آگے بڑھتا اور اُس سے دُوبدو ہوتا وہ ایک گاڑی میں بیٹھ چکے تھے اور اِدھر ایک دم بارش شروع ہوگئی اور ایسی ٹوٹ کے برسنے لگی کہ ایک ہی لمحے میں پانی سے تر بتر ہوگیا۔ اُدھر وہ گاڑی چل پڑی۔ مَیں نے دل ہی دل میں اُن کے وہاں سے جلدی شکر ادا کیا۔ مَیں جانتا تھا میرے جیسے غریب کا کوئی پرساں نہیں تھا۔ اگر اپنے جذبات میں کچھ کر بیٹھتا تو کسی نئی مصیبت میں جا گرتا۔ مَیں کافی دیر وہیں رُکا رہا۔ مجھے بارش میں بھیگنے کی پروا اِس لیے نہیں تھی کہ یہ کپڑے محض کپڑے تھے، وضع داری کے نمونے نہیں تھے۔ مجھے بارش میں چلتے ہوئے اور بھیگتے ہوئے مزہ آرہا تھا۔ اِس عالم میں تھکاوٹ بھی دور ہوگئی تھی۔ سامنے فیصل مسجد نظر آرہی تھی۔ پچھلے کئی سالوں سے اسلام آباد قیام کے دوران مَیں فقط ایک بار ہی اِس میں داخل ہوا تھا۔ میرے دماغ میں اِس مسجد کے متعلق کچھ چیزیں گڈ مڈ تھیں۔ وہ اپنے سٹرکچر کے اعتبار سے نہایت عجیب تھی۔ اِس کے مینار اِس قدر پتھریلے اور اُونچے تھے کہ فقط سر میں ٹکرا جانے والے ستونوں کا سا خیال پیدا کرتے تھے۔ مَیں نے اپنے دائیں جانب چلنا شروع کر دیا اور اُس جنگل کے درمیان پہنچ گیا جہاں سے مارگلہ پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ مَیں اِس وقت بارش میں ڈوبا ہوا تھا۔ میرے قدم پہلے سے تیز ہو گئے۔ یہ علاقہ اتنا ہرا بھرا اور دل آویز تھا کہ اگر محض تنگدستی اور بیماری جیسی دو مصیبتیں انسان کو نہ گھیر لیں تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ مقام اُسے اچھا نہ لگے۔ ہاسٹل کی طرف جانے والی سڑک بالکل اِس جنگل کے درمیان سے گزرتی تھی۔ یہ ہاسٹل یونیورسٹی کا تھا جسے اسلامیہ کہا جاتا تھا اور ایک برادر اسلامی ملک کے پیسوں سے تیار ہوا تھا۔ مَیں اُسی بارش میں ایک پل رُکے بغیر چلتا رہا اور ہاسٹل کے گیٹ پر پہنچ گیا۔ یہاں کوئی دیوار نہیں تھی، چاروں طرف جنگل تھا اور اُس کے درمیان محض چار چار منزلہ فلیٹ بنا کر اُنھیں ہاسٹل کی شکل دی گئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں مطلوبہ جگہ پہنچ گیا۔ فلیٹ نمبر 8 کے سولہ نمبر کمرے میں عبادت علی موجود تھا۔ مَیں سیڑھیاں چڑھ کر کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا۔ دروازے پر بیل موجود تھی مگر مَیں نے اُس میں کرنٹ کے خدشے کے پیشِ نظر دبانا مناسب نہ سمجھا اور دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ پہلی دستک پر کوئی ہل چل نہ ہوئی۔ بارش اب ہلکی بلکہ بند ہو چکی تھی لیکن پرنالے اب بھی پانی برسا رہے تھے۔ مَیں نے چند لمحوں بعد دوسری بار دستک دی تو اندر سے کسی کے اُٹھنے کی آواز آئی۔ پھر ایسے لگا کوئی درز سے دیکھ رہا ہے۔ تب ایک ہی منٹ بعد دروازہ کھل گیا اور دوسری طرف سے خود عبادت علی

سامنے کھڑا تھا۔ اُس نے مجھے اندر سے دیکھ لیا تھا اِس لیے متعجب تو نہ ہوا البتہ کچھ پریشان ضرور ہوا کہ میں کیسے یہاں پہنچا۔ مَیں نے اُس کا استعجاب دور کرنے کی کوشش نہیں کی اور آگے بڑھنے کے لیے تھوڑی حرکت کی۔ عبادت علی نے فوراً رستہ دے دیا۔ مَیں بھیگے ہوئے کپڑوں کو تھوڑا نچوڑ کر اندر داخل ہو گیا اور بولا، عبادت صاحب پریشان نہ ہوں، میرے علاوہ یہاں سب خیریت ہے۔

عبادت علی پھیکی ہنسی ظاہر کرتے ہوئے اندر داخل ہوا اور بولا، لیکن آپ کیسے پہنچے؟

صرف پیدل۔ میرے پاس اگر حسنات کے دیے ہوئے تیس روپے موجود ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اُنھیں کسی سواری پر ضائع کر دوں۔ مَیں نے ایک ہی جملے میں اُسے تمام بات سمجھا دی۔

حسنات کا نام سنتے ہی عبادت علی کی پریشانی قریباً دور ہو گئی اور وہ کھل کر ہنسنے لگا۔ اوہ تو اچھا آپ کو اُس سالے نے یہاں بھیج دیا ہے۔ اِدھر بیٹھیے۔ یہ لکڑی کی کرسی پر۔

ہو سکے تو مجھے اپنی کوئی چیز پہننے کو دیجیے، پہلے مَیں اپنے وجود سے یہ سمندر دور کر دوں۔ ہاں ہاں کیوں نہیں۔ آپ ایسا کریں، واش روم میں چلے جائیں اور یہ لیں، یہ میری شرٹ اور پاجامہ پہن لیں، یہ خشک ہے۔

شکریہ اگر اِس وقت مجھے آپ یہ بھی کہہ دیں کہ یہ کپڑے اُس معاوضے کے عوض ہیں جو سکرپٹ کے عوض دینا تھا تو بھی مَیں مجبوراً اِسی پر اکتفا کر لوں گا۔ مَیں اُسے مسلسل طنز کے کچوکے لگا رہا تھا۔

چھوڑیے ضامن صاحب، اب آپ ایسا بھی شرمندہ نہ کریں۔ پہلے کپڑے بدل لیں۔ اُس کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔

مَیں کپڑے لے کر واش روم میں گھس گیا اور دو ہی منٹ بعد تبدیل کر کے باہر نکل آیا۔ عبادت علی نے ایک ملازم کو آواز دی جس کا نام رونق خان تھا۔

جی سر؟ ایک بڑی مونچھوں اور کٹورے جیسے سر والا سُرخ رنگ کا آدمی اندر داخل ہوا۔

یہ صاحب کے کپڑے باہر خشک ہونے کے لیے ڈال دو بلکہ ایسا کرو، دھوبی کے حوالے کر دینا اور اِس سے پہلے چائے تیار کرو۔

جی بہتر سر۔

اب وہ بالکل مطمئن لگ رہا تھا۔ مَیں جب واش روم میں کپڑے بدل رہا تھا، عبادت علی نے حسنات کا نمبر ملا کر اُسے آہستہ آہستہ جھاڑ پلانے کی کوشش کی تھی لیکن محسوس ہو رہا تھا کہ اُس ڈانٹ کا

حسنات پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ آخر عبادت علی نے کریڈل فون پر رکھ دیا اور کرسی پر آرام سے بیٹھ گیا۔
مَیں باہر نکل کر قریب کی کرسی پر بیٹھ گیا اور سر کو تولیے سے کھجانے لگا۔ مجھے کئی دِنوں کی ذلت کے بعد ہلکی سی راحت محسوس ہو رہی تھی۔ جس طرح حسنات نے اپنایت سے مل کر عبادت علی کی طرف بھیجا تھا، پھر یہاں جیسی ایک طرح کی توجہ ملی تھی اُس نے کچھ غم ہلکا کر دیا۔ یہ لوگ جیسے بھی تھے اُن کلرکوں میں سے نہیں تھے جہاں روٹی کے ٹکڑوں کی تقسیم اور حساب نچلے ترین درجے تک رکھا جاتا ہے۔
کرسی پر تسلی سے بیٹھنے کے بعد مَیں نے عبادت علی کے ساتھ گفتگو شروع کر دی۔

عبادت علی آپ اِس بات پر شرمندہ مت ہوں کہ آپ نے مجھ سے کام کروانے کے بعد اُس کا معاوضہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ایسی باتیں غیر مسلم معاشروں کو زیب دیتی ہیں۔

میری بات پر عبادت علی سٹپٹا گیا اور بولا، ضامن صاحب بات ایسی بیہودہ واقع ہوئی ہے کہ اُس کی آپ سے معذرت کرنا ضروری بھی ہے لیکن معاملات ایسے تھے کہ مَیں اُن میں پھنستا چلا گیا۔ میرا سارا روپیہ اُسی میں برباد ہو گیا۔ اب حالت یہ ہے کہ کسی کو بتانے کے لائق نہیں رہا۔ شاید آپ سے اپنا مدعا کھول لوں مگر اِس وقت پہلے وہ آپ کا قرضہ واپس کروں گا جو میرے ذمے ہے۔ باقی قصے اِس کے بعد ہوں گے۔

مَیں نے کہا، عبادت میاں مَیں یہ تو نہیں جانتا کتنا بڑا ادیب ہوں لیکن ایک امر کے متعلق میری رائے صائب جانو۔ ایسا ہو سکتا ہے ایک بے ایمان آدمی ایماندار ہو جائے لیکن علت میں مبتلا شخص کے لیے ممکن نہیں وہ علت کو چھوڑ دے۔ تمھارے متعلق مجھے کبھی گمان نہیں رہا کہ تم بے ایمان ہو لیکن تمھاری علتوں کے پیشِ نظر مجھے نقصان کا اندیشہ اور دھڑکا تھا۔ اسلامی این جی او میں کام کرنے والا شخص جھوٹا ہونا ضروری ہے اور جھوٹ بے ایمانی کے نہیں علت کے ذمرے میں آتا ہے۔ دوستوں کی محنت کا روپیہ اجنبی عورتوں میں ضرور لٹاؤ مگر دو چار آنے دوستوں کی جھولی میں بھی پھینک دو۔ وہ کم سے کم زندہ تو رہیں۔

عبادت علی چائے پیتے ہوئے اِس بات پر ایک دم ہنس پڑا جس کے سبب اُسے اچھو نے آلیا۔
چائے کیسی ہے؟

دفتروں کی چائے ہمیشہ خراب ہوتی ہے۔ خاص کر اُس کلائینٹ کو بہت خراب لگتی ہے جس کا بل مارا جائے۔

خیر ایسی بات بھی نہیں، عبادت علی اب کے اُٹھ کر بولا اور پہلو والے کمرے میں چلا گیا۔

تھوڑی دیر میں واپس آیا تو اُس کے ہاتھ میں کچھ پیسے تھے۔ عبادت علی نے پیسے میز پر رکھ دیے۔ یہ پندرہ ہزار ہیں، پانچ آپ کو پہلے دیا تھا۔ باقی پانچ اگر معاف کر دیں گے تو شکر گزار رہوں گا۔ جیب میں آئے تو وہ بھی چکا دوں گا ورنہ صبر سے بیٹھ جانا۔

مَیں نے ایک خشک شکریے کے ساتھ پیسے بغیر گنے اُٹھا کر جیب میں ڈال لیے اور مسکرا دیا۔

آپ اِنھیں گن لیں۔

گننے سے یہ پیسے زیادہ ہو جائیں گے تو اِس عمل کے کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ مَیں نے جواب دیا۔

اگر کم ہوئے تو؟ عبادت علی نے مسکرا کر کہا۔

پھر بھی آپ کا سابقہ عذر برقرار رہے گا کہ بس اب تو اتنے ہی ہیں۔

اور کچھ کہو؟

کہنے کو میرے پاس اِس وقت ایسی بات نہیں ہے جس سے آپ کے معاملات میں نکھار آئے۔ مَیں نے جواب دیا، ویسے بھی مَیں اخباروں کا رسیا ایسا دانشور نہیں جو پیٹ بھری بانجھ گائے کی طرح کبھی گوبر کرتا ہے اور کبھی پیشاب۔

عبادت علی اِس بات پر کھلکھلا کر ہنسا اور اپنی کرسی سے اُٹھ کر اُس شیشے کے پاس جا کھڑا ہوا جہاں سے باہر کا جنگل ایک خوشگوار ہوا کے جھونکوں میں لہرا رہا تھا اور باہر دیکھتے ہوئے بولا، ضامن علی ایک کام کرو، پاکستان کے جنوبی علاقوں میں سیلاب پر ایک ڈاکومنٹری لکھ دو۔

لکھ دیتا ہوں مگر پیسے ایڈوانس لوں گا۔ مَیں نے جواب دیا۔

عبادت علی نے میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا، اُس میں دو چیزوں کو مدِ نظر رکھنا ہے۔ سیلاب میں برادر اسلامی مُلک اور قطر کی بھرپور مالی امداد کا ذکر کرنا ہے اور ایک خاص تنظیم عوام کو مشکلات سے نکال رہی ہے۔ اُس تنظیم اور امداد کے بارے میں آپ کو تمام چیزیں مہیا کر دی جائیں گی۔

مَیں عبادت علی کی بات سُن کر سکتے کے عالم میں آ گیا۔ حیرانی سے اُسے دیکھنے لگا اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

کیا مطلب؟

اب اُس کا منہ میری طرف ہو چکا تھا، بھئی مطلب کو چھوڑو، یہ کام ہے اور اِس کے عوض ہمیں فنڈ ملے گا۔

لیکن ابھی سیلاب کی کوئی علامت نہیں۔ نہ کسی تنظیم نے کوئی امدادی خدمت انجام دی ہے، نہ فنڈ ملا ہے۔

اِس امر کو چھوڑو، بس سمجھ لو یہ سب ہو چکا ہے۔

کیا آپ پاگل ہیں؟

جی نہیں۔

پھر؟ کیا آپ کو الہام ہوا ہے؟

ہرگز نہیں؟ مگر آپ یہ تو جانتے ہیں جس سرزمین سے فنڈ آئے گا وہاں الہامات اور وحی کے سلسلے چلتے رہے ہیں اور اب وہیں سے سونے چاندی کی رحمتیں آ رہی ہیں۔

مگر اِس سے سیلاب کی آمد کیسے ہوگی بھائی؟ وہ تو آسمان سے ہی برستا ہے اور آسمان کسی برادر اسلامی ملک یا کسی تنظیم کی کوششوں کا نتیجہ نہیں ہے۔

دیکھو یہ باتیں آپ کی سمجھ سے بلند اور آسمان نشیں ہیں اور آپ ایک چھوٹے موٹے سکرپٹ رائٹر، زیادہ ادب سے نام لوں تو ایک ادیب اور بس۔

عبادت علی آپ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میرے قلم کی نوک کسی اژدھے کا پیٹ پھاڑنے کے لیے بھی کافی ہے۔ اِس کے باوجود آپ میری توہین کر رہے ہیں۔

نہ، بالکل نہیں۔ آپ کی توہین عبادت علی نہیں کر سکتا۔ مسئلہ یہ ہے کہ آپ کے قلم کی نوک کو اژدھے کے پیٹ کے قریب جانے کون دے گا۔ اگر جانے دیا گیا تو اِس بات کا بندوبست کر کے کہ آپ اُس قلم کو موقلم میں ڈھال دو گے اور اژدھے کے چہرے پر خوشگوار نقش و نگار بنا کر لوگوں کو بتاؤ گے، دیکھو یہ اژدھا کتنا خوبصورت قدرت کا شہکار ہے۔ جس سے دیکھنے والے پکار اٹھیں واہ واہ، کیسی خوبصورت پینٹنگ کا شاہکار ہے۔

عبادت علی مسکرایا، یاد رکھ یہ جو دانشوروں کے مضامین ہیں اور ادیبوں کے شہکار فن پارے ہیں، اِن سے وہ اپنے بچوں کے پچھواڑے صاف کرتے ہیں۔

پھر مجھ سے کیوں لکھواتے ہو؟

اس لیے کہ اپنے جیسوں کو مطمئن کر سکوں۔

یہ مجھ سے توقع نہیں کی جاسکتی۔ مَیں نے جواب دیا۔

توقع کیوں نہیں کی جا سکتی؟ عبادت علی نے کہا، کیا تم نہیں جانتے ہر ایک ادیب مارکیٹ کا محتاج ہوا کرتا ہے جیسے اخبار یا اُن کے مالکان اور سُنو یہ جو تم اپنی دانش اور فکر اور فلسفہ کی بکواس کرتے ہو، یہ سب اُس اشرافیہ کے چند افراد کی جوتیوں کے تلووں میں لگائے گئے اُن ٹانکوں سے کم اہمیت رکھتی ہے جسے سینے کے لیے ایک موچی آر خریدتا ہے۔ تمھاری تمام دانش کے فیصلے کسی شاہ یا شیخ زادے کے ایک بڑے محل کے ہزاروں کمروں میں سے ایک کمرے یا ہوٹل کی لابی میں بیٹھ کر طے کیے جاتے ہیں۔ تم لوگ شاہوں کے اعمال کے بعد سوچنا شروع کرتے ہو۔ وہ تمھیں ایک طرف کی سوچ کا رُخ دے کر اُس پر دن رات کے لیے کام پر لگا دیتے ہیں۔ تمھیں ٹرینڈ دیتے ہیں۔ تم اُس ٹرینڈ کے حق میں اور مخالفت میں لکھتے رہتے ہو اور وہ خود نیا قدم اُٹھانے کے لیے ایک نئے محل میں ایک نئی میٹنگ کے لیے بیٹھ جاتے ہیں۔ زیادہ باتیں کہنے اور سوچنے کی ضرورت نہیں، یہ کام کر دو۔ پچاس ہزار روپے مل جائیں گے اور کل آ کر ایڈوانس کے دس ہزار بھی لے جانا۔

کیا سیلاب کی امدادیں جنوبی علاقوں اور صوبہ سرحد کی بجائے کہیں اور نہیں پہنچ سکتیں؟

جی نہیں، کیوں کہ وہیں سے اُنھیں ہمدردیوں کی ضرورت ہے اور اُس کے عوض اُن لڑکوں کی جنھیں وہ تربیت دے سکیں۔

اُف میرے خدایا۔ مَیں نے پلیٹ میں پڑے ہوئے بسکٹوں میں سے چند بسکٹ اُٹھائے اور چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اچھا خدا حافظ، یہ مَیں آپ کے کپڑے لے کر جا رہا ہوں، اِس راز کے ساتھ کہ عبادت علی پاکستان کے کویت ہاسٹل میں برادر اسلامی مُلک کے لیے خدمات انجام دیتا ہے۔

سکرپٹ کے لیے ضرور سوچے گا۔

میری اُس سوچ پہ لعنت ہے۔

اُس کے فوراً بعد ہی مَیں فلیٹ سے نکل کر ہاسٹل سے باہر آ گیا اور اُسی راستے سے واپس ہولیا۔ میری جیب میں پیسوں کی موجودگی کے سبب خیالات اور رفتار میں طرفگی آ گئی تھی۔ سب سے پہلے جو بات دماغ میں کلبلانے لگی وہ اُن بدمعاش کلرکوں کے فلیٹ سے نجات حاصل کرنے کے متعلق تھی جس کا

انتظام حسنات کر رہا تھا۔ اتنے سارے پیسے میرے لیے ایسی رقم نہیں تھے جنھیں خرچ کرنے کے لیے بہانے ڈھونڈنے پڑتے۔ یہ تو بس ایک طرح سے استعمال کی جگہ بنا چکے تھے اب اُس میں اِنھیں فِٹ کرنا تھا اور آنے والے وقت کے لیے نئے سرے سے منصوبہ بندی کرنی تھی۔ ہوا کی خوش مزاجی اور نرم روی نے میری طبیعت کے اندر اب زیادہ ہی موج پیدا کر دی تھی۔ چاروں طرف بھرے ہوئے سبز پتوں کے جنگلی شہتوتوں کے درختوں میں دُھوپ کی ایک کرن بھی نہیں تھی اور بارش ابھی ابھی تھمی تھی۔ میں ایک غزل کے مصرعے گنگناتا ہوا سڑک پر آ گیا۔ دائیں ہاتھ میں کویت ہاسٹل سے تین چار سو میٹر دور ایک ڈھابہ نظر آیا۔ یہ ڈھابہ بارش کے سبب جاتے ہوئے مجھے بند ملا تھا مگر اب کھُل چکا تھا۔ کچھ لوگ بھی لکڑی کے بنچوں پر بیٹھے تھے۔ ڈھابہ سڑک سے بیس قدم ہٹ کے جنگل کے بالکل اندر تھا۔ ایسے ڈھابے پورے اسلام آباد میں جگہ جگہ موجود تھے۔ اِن کی اصل حیثیت تو ایک کھوکھے کی تھی جس میں فقط سگریٹ اور بسکٹ رکھنے کی اجازت تھی مگر سی ڈی اے کا عملہ اِن کے ساتھ باہمی معاشی امور کے تعاون کے سبب اِنھیں طعام ہوٹل بنانے میں مدد فراہم کرتا تھا۔ اِس طرح کے اسلام آباد میں ڈھائی تین ہزار کھوکھے ہوٹلوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ یہ شہر جس طرح سے مہنگا اور اشرافیہ کی آماجگاہ ہے، ملازمین کے لیے کھانے پینے میں مشکلات پیش رہتی تھیں۔ اِن کے سبب وہ سستی روٹی کھا سکتے تھے۔ میرے قدم آہستہ سے اُسی ڈھابے کی طرف اُٹھ گئے۔

(۵۵)

مَیں ڈھابے پر بیٹھا مسلسل اُس باتونی شخص کو سُن رہا تھا۔ اُس کی باتوں میں اُکتاہٹ اور دلچسپی کے امتزاج نے عجیب کیفیت پیدا کر دی تھی۔ یہ پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے بول رہا تھا اور ابھی اِس کے پاس بتانے کو بہت کچھ تھا۔ مارگلہ پہاڑوں کے دامن میں موجود اِس ہوٹل کے دائیں پہلو میں وسیع جنگلات کو کاٹتی ہوئی سڑک کویت ہاسٹل کی طرف نکل جاتی تھی۔ سڑک کے بائیں طرف بھرے درختوں کے سائے میں یہ ڈھابہ تھا۔ یہاں کی چائے بہت اچھی تھی لیکن مَیں صرف چائے پینے کے لیے دس کلومیٹر پیدل چل کر یہاں نہیں آیا تھا۔ واپسی پر مجھے یہ ڈھابہ چائے پینے کے لیے بہتر لگا۔ اِتنی سایہ دار اور کھلی جگہ پر لکڑی کے بنچوں کے اوپر بیٹھ کر کچھ دیر ایک دو کپ چائے پی لینے میں کوئی بُرائی نہیں تھی جبکہ کچھ دِنوں کے لیے میری معاشی حالت ٹھیک بھی ہو گئی تھی۔ مَیں پچھلے کئی دِنوں سے ایک بیزار کن کیفیت سے دوچار تھا۔ تین چار دوستوں سے بلاوجہ تُوتکار کے بعد اُن سے قطع تعلق کر چکا تھا۔ ایک اجنبی سے گالم گلوچ کے بعد ہاتھا پائی بھی کر بیٹھا۔ اُس کی وجہ سے بھرے مجمعے میں تماشا بن گیا۔ ابھی یہ سب چیزیں احمقانہ لگ رہی تھیں۔ ڈھابہ کسی پوٹھوہاری کا تھا اور مجھے یقین تھا پوٹھوہاری اچھی چائے نہیں بنا سکتے۔ اِس خطے میں سیکڑوں سال سے بکری اور گائے کے پتلے دودھ نے چائے میں گاڑھا پن نہیں آنے دیا تھا مگر مَیں ڈھابے کی فضا کی خوشگواری کے بدلے میں چائے کی بدذائقی قبول کرنے کے لیے تیار تھا۔ مَیں ایک لکڑی کے بنچ پر بیٹھ گیا اور کندھے سے لٹکا ہوا بوسیدہ بیگ اُتار کر سامنے والے بنچ پر رکھ دیا۔

ڈھابے پر دس بارہ لوگ بیٹھے ہوئے تھے مگر اُن کی موجودگی فی الحال یہاں کی کشادگی کو کم نہیں کر رہی تھی۔ سب لوگ اپنے اپنے بنچ اُٹھا کر دُور بیٹھے چائے کے ساتھ شغل فرما رہے تھے۔ میرے بیٹھتے ہی ایک شخص تھوڑی دیر مجھے گھورتا رہا۔ اِس کے جسم پر سُرمئی رنگ کا بوسیدہ اوورکوٹ تھا اور سر پر اُسی رنگ کا ایک ہیٹ تھا۔ یہ ہیٹ بھی بوسیدگی اور میل کی تہوں میں چھپ کر کالا ہو گیا تھا۔ اوورکوٹ اور ہیٹ میں پڑے ہوئے سوراخوں کو میل کچیل نے ڈھانپ رکھا تھا۔ پچاس کے پیٹے میں یہ شخص کچھ ہی لمحوں بعد اُٹھ کر میرے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے میرا گلے میں لٹکانے والا جھولا نہایت احترام سے اُٹھا کر اپنے دائیں طرف رکھ دیا اور معذرت کرتے ہوئے بولا، سوری حضور مَیں آپ کا سامان دوسری طرف رکھ رہا ہوں، اُمید ہے آپ میری اِس گستاخی پر بُرا نہیں مانیں گے۔ یقیناً اِس سے زیادہ بُرا ماننے والی بات یہ ہے کہ مَیں انتہائی اجنبیت کے باوجود آپ کے پاس بیٹھ گیا ہوں اور اجازت لیے بغیر گفتگو کر رہا ہوں۔

مجھے زندگی میں کسی اجنبی کو ایسی طرزِ تکلف اپناتے ہوئے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ یہ بات اگرچہ سچ تھی کہ وہ میری تنہائی میں جرم کا ارتکاب کر رہا تھا مگر اِس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ مَیں اپنی وضع دارانہ کیفیت کو برقرار رکھتا جو پچھلے کئی دِنوں سے غائب ہو چلی تھی۔ مَیں نے اُسے بولنے کی بجائے ماتھے کی خوش گوار سلوٹ اور مسکراہٹ سے اجازت دی جس کا وہ بہرحال محتاج نہیں تھا۔ اُس نے میری مسکراہٹ پر کوئی توجہ نہیں دی اور انتہائی بے نیازی سے اپنی بات جاری رکھی۔

یہ شخص چائے بہت اچھی بناتا ہے، یہی جسے آپ ڈھابے والا کہیں گے، یقین جانیں پہلے یہ ڈھابے والا نہیں تھا، جیسے مَیں اور آپ پہلے وہ نہیں تھے جو اب ہیں۔ کیا مَیں جھوٹ بول رہا ہوں؟ جی ہاں آپ میری بات سے اتفاق کریں گے ہمارے دِن تبدیل ہو رہے ہیں، مسلسل تبدیل ہو رہے ہیں۔ (کچھ توقف لے کر) کیا آپ نے اِسے چائے کا آرڈر دے دیا ہے؟ اوئے لڑکے اِدھر آ، (میرے طرف منہ کر کے) کیا اِسے دو چائے آرڈر کر دوں؟

میرا جواب سنے بغیر دوبارہ مخاطب ہوا، بیٹے اپنے باس کو دو چائے کہو۔ اچھی سی، شکر کم رکھے۔

جی تو مَیں کہہ رہا تھا، یہ تمھیں میرے جسم پر جو کوٹ نظر آ رہا ہے، یہ میرا اپنا ہے۔ دیکھیے، اِسے ہاتھ لگا کر دیکھیے۔ دیکھیے بھی، شرما کیوں رہے ہیں؟

اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اُس کوٹ کی پشم سے گھسانا شروع کر دیا جسے دُور ہی سے دیکھ کر مجھے

کراہت ہو رہی تھی لیکن اِس وقت اُس پشم کی نرمی سے ہاتھ میں ملائمت در آئی تھی۔ مَیں نے کوٹ کبھی خریدا تو نہیں تھا لیکن مجھے یقین ہے یہ کوٹ یہاں سے نہیں ملتا ہوگا۔ چند لمحوں بعد مَیں نے ہاتھ خود پیچھے کر لیا۔

یہ کوٹ مَیں نے برطانیہ سے پورے دوسو پونڈ میں خریدا تھا۔ میرا خیال ہے آپ برطانیہ نہیں گئے۔ آپ کو وہاں جانا چاہیے، اچھی جگہ ہے اور یہ ٹوپی بھی وہیں سے لی تھی۔

اُس نے سر سے ٹوپی اُتار کر میرے آگے کر دی، ٹوپی کے اُترنے سے ایک بدبو کی زوردار ہمک میرے دماغ میں گھستی چلی گئی۔ مَیں نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ اِس دفعہ اُس نے میرا ہاتھ ٹوپی کی پشم دکھانے کے لیے نہ پکڑا بلکہ اُسی وقت سر پر دوبارہ پہن لی۔ اُس نے ٹوپی جلدی سے اِس لیے پہنی کہ میری ٹوپی کے بارے میں ناگواری محسوس کی تھی بلکہ اُسے اچانک یاد آ گیا تھا کہ وہ بہت زیادہ گنجا ہے۔ ٹوپی کے اُتر جانے سے گویا وہ بالکل ننگا ہو چکا تھا۔ یہ احساس اُسے بعد میں ہوا تھا۔ اُس کا سر گولائی کی بجائے اُوپر سے چپٹا تھا۔ جیسے کسی پھوہڑ عورت نے ٹیڑھا میڑھا آلو چھیلا ہو۔ اُس نے داڑھی نہیں رکھی تھی مگر بالوں کی سفید چھینٹ بے ڈھنگے پن سے چہرے پر نمایاں تھی۔

اُبے چائے کیوں نہیں لاتا؟ آپ نے کھانا کھا لیا ہے؟ یہ آدمی دال نہایت اچھی بناتا ہے۔ میرا خیال ہے اِس نے دال بنانا باقاعدہ سیکھی ہے ورنہ آپ نے نہیں دیکھا ہوگا کہ ڈھابے والے کچھ اچھا بنانے کی قدرت رکھتے ہوں۔ دو پلیٹیں منگوا لوں؟

منگوا لو۔

ارے مجھے پہلے ہی پتا تھا آپ نے کھانا نہیں کھایا۔ لیجیے چائے آ گئی، ارے چائے پہلے لے آیا، ناشتے کے بعد لاتا۔ چلو کوئی بات نہیں، یہاں کی چائے جتنی بار پی جائے کم ہے۔

مَیں نے چائے اُٹھا کر چُسکی لی تو وہ واقعی کمال تھی۔ یہ باقاعدہ گُڑ سے بنائی گئی تھی۔ دودھ بھی خالص بھینس کا استعمال ہوا تھا۔ دونوں چیزیں اِس نے کہاں سے لیں؟ اِس بارے میں مجھے حیرانی تھی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے مرکزی شہروں میں دیسی اشیا کے استعمال کا رواج یہاں بھی اپنی جگہ بنا رہا ہو۔ مَیں نے اکثر دیکھا ہے گاؤں میں ایک نچلے درجے کا دیہاتی جو شے انتہائی سستے داموں استعمال کر رہا ہوتا ہے وہی شہر کے بزنس کلاس لوگوں میں مہنگے داموں بکتی ہے اور بعد میں اِسی طرح کے ڈھابوں میں عام ہو جاتی ہے۔

تو جناب ندیم صاحب مَیں کہہ رہا تھا۔

میرا نام ندیم نہیں، ضامن علی ہے۔ مَیں نے ٹوکا۔

اوہ، کوئی بات نہیں۔ نام تبدیل کرنے سے کچھ خاص فرق نہیں پڑتا۔

کیوں کوئی بات نہیں؟ اِس بار مَیں نے ایک واضح تلخی کے ساتھ جارحانہ رویہ اختیار کر لیا۔ لاشعوری طور پر مجھے اُس پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ زبردستی میرا مہمان بن چکا تھا۔ یہ بات کسی حد تک گوارہ تھی مگر بلاوجہ مجھ پر اپنی دانشوری مسلط نہیں کر سکتا تھا۔

نام سے بہت فرق پڑتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے نام اور شخصیت ایک جسم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ نام ایک امیج بن جاتا ہے۔ ایک واضح اور دوٹوک تصویر۔ ایسی تصویر جسے سنتے ہی دیکھ لیا جاتا ہے۔ مکمل اور اجمال کے ساتھ۔ آپ میرا نام لینے میں غلطی نہ کریں۔ نام خوبصورت پریوں کی صورت بھی اختیار کر لیتے ہیں اور بھیانک شیطان کی شکل بھی۔

مَیں نے دیکھا وہ میرے اِس اچانک ردِعمل پر گھبرا گیا تھا اور اِس طرح مجھے دیکھے جا رہا تھا جیسے سکتے میں ہو۔ اُسے شاید پہلے اِس طرح کے آدمی سے پالا نہیں پڑا تھا۔ وہ آسانی سے وہ تمام چیزیں حاصل کر چکا تھا جن کی اُسے اِس وقت مجھ سے ضرورت تھی مگر ہر آدمی میں اتنی مروت اور وضع داری ضرور ہوتی ہے کہ مطلب نکل جانے کے بعد چند لمحوں تک اپنے محسن کا شکر گزار رہے۔ یہی حالت اِس وقت اُس کی تھی۔ وہ حیران تھا اور سکتے میں تھا مگر یہ وہی چند لمحے تھے جن میں میرا رویہ ابھی متغیر نہیں ہوا تھا۔ جیسے ہی اپنی بات ختم کرنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ مَیں نے کچھ بلاوجہ اشتعال سے کام لیا ہے، مَیں مسکرا دیا۔ عین اُسی لمحے اُس کا سکتہ بھی ٹوٹ گیا۔ مَیں اُسے فی الحال خموشی اختیار کرنے نہیں دے سکتا تھا۔ وہ جواب میں مسکرا کر دوبارہ بولنا چاہتا تھا لیکن میں نے اندازہ لگایا کہ یہ وہ شخص نہیں رہا جسے اُس کی گفتگو کے دوران ٹوک دینے سے اچھے نتائج کی توقع ہو اور وہ دوبارہ ڈھنگ کے ساتھ اُسی روانی سے بولنا شروع کر دے۔ یہ ایسا شخص تھا جسے مہمیز کرنے کی ضرورت تھی۔ مجھے اُس کو فطری طور پر کہانی کی طرف موڑنا تھا جہاں سے اُس کی بات اپنی رفتار لے سکتی۔

تم کہہ رہے تھے، تم نے یہ کوٹ برطانیہ سے دو سو پونڈ میں خریدا ہے۔ کیا تم بتا سکتے ہو پہلے کیا تھے۔ وہاں کیسے پہنچے۔

وہ مسکرا کر بولا، سیدھی سی بات ہے، اپنے بزنس کے سلسلے میں۔ لیدر کا بزنس۔ میں یہاں سے

لیدر لے کر جاتا تھا۔ ایک دن پکڑا گیا۔ خواہ مخواہ پکڑا گیا۔ میرے بیگ سے چرس برآمد ہو گئی۔ آپ اگر یقین نہیں کریں گے تو کوئی بات نہیں، اِس کے لیے مَیں تیار ہوں مگر یہ حقیقت ہے مَیں نے وہ چرس صرف اپنے دوست کے لیے رکھی تھی۔ اُس کے شدید تقاضے پر لے کر جا رہا تھا اور مفت۔ آپ ہنس رہے ہیں، مجھے پتا تھا، آپ ہنسیں گے لیکن یہی ہوا تھا۔ وہ چرس ایک پاؤ سے زیادہ نہیں تھی اور اپنے دوست کو مفت دینا تھی۔ وہ پچھلے کئی سال سے مجھے اپنے فلیٹ میں شریک کر رہا تھا۔ ایک بار میں نے اُسے اپنے بیگ یعنی اُس کی چرس کو اپنے لیدر سے بھرے بیگ کے ساتھ شریک کر لیا۔ یہ آخری موقع تھا۔ مَیں دھر لیا گیا۔ اٹھائیس سال کے لیے۔ پورے اٹھائیس سال۔ آپ دیکھ لیں یہی کپڑے میرے اُس بیگ میں تھے۔ یہ کوٹ اور ٹوپی۔ جیل سے نکلنے کے بعد اُنھوں نے میرے حوالے کی اور مجھے شپ پر بٹھا کر اِس طرف روانہ کر دیا۔ پورے ایک مہینے بعد مَیں کراچی اُترا، وہاں میرا سب کچھ ختم تھا۔ ختم کا مطلب آپ جانتے ہیں؟ جب آپ کو اپنے عزیز ترین پہچاننے سے انکار کر دیں۔ آپ کی وہ مٹی بھی جسے تمھارے قدموں نے بے شمار دفعہ روندا ہو، وہ قدموں کو راہ دینے سے گریز کر دے۔ کیا آپ تسلیم کریں گے اُسی مکان میں جسے مَیں نے خود خریدا تھا، ایک دس منزلہ پلازہ کھڑا تھا۔ جی ہاں۔ پورا ٹاؤن ایسے بدل گیا تھا جیسے زندہ انسان مُردوں میں بدل جاتے ہیں۔

ارے واہ، کیسی خوشبو ہے اِس دال میں۔ بھئی قیامت مزہ ہوتا ہے۔ لاؤ بھئی دو روٹیاں جلدی۔ یہ بہت کم پیسوں کی ہے۔ صرف پانچ روپے میں دونوں کا پیٹ بھر جائے گا۔ اگر ہم نے دو چائے اور پی تو سمجھو سات روپے میں گزارا صاف۔ دیکھیے گا کھانا کھانے کے بعد چائے کیسے مزہ دیتی ہے۔ لیجیے یہ روٹی زیادہ خستہ ہے۔ یہ مرید عباس ہے، پندرہ سال تک اِس نے سیدن شاہ میں لنگر کا حلیم پکایا ہے، تب جا کر ایسی دال بنانے کے لائق ہوا ہے۔

دال واقعی مزے دار تھی۔ یہ ڈھابے والا جسے یہ شخص مرید عباس کا نام دے رہا تھا، بلاشبہ اچھی چیزیں بناتا تھا۔ یہ جو بھی کرتا ہو مجھے اِس سے غرض نہیں تھی البتہ مجھے اپنے بارے میں یقین تھا کہ مَیں زندگی کے ہر لمحے میں کبھی وہ نہیں رہوں گا جو پہلے تھا اور یہ حقیقت میرے جسم کے طبعی تغیر کے لیے نہیں فکر اور عملی کام کے حوالے سے سچ ضرور تھی۔ اِس لیے کہ کلرکوں کی بچی ہوئی روٹیوں کے ٹکڑے کھانے سے لے کر اب تک فقط چھ گھنٹے گزر رہے تھے اور اِنھی چھ گھنٹوں کے بیچ مَیں نے اپنے طور پر ہزاروں کایا کلپ کی تھیں۔ اِنھی تخیلات کے جھکولوں میں کئی لوگوں کو قتل، کئی تنظیموں کے لیے بیہودہ مضامین اور اُس

خاتون کا مقالہ لکھنے کا ارادہ بھی کیے بیٹھا تھا جسے کچھ مہینے پہلے بُری طرح دھتکار چکا تھا اور اب جیب میں پیسے آنے کے بعد اِس وقت کھانا کھاتے ہوئے میرے اندر ایک شاہانہ کایا کلپ یہ ہوئی تھی کہ مَیں اپنے نظریات میں پھر انسانیت کا محافظ بنا بیٹھا تھا اور ایک ایسے شخص سے بے وجہ گفتگو کو طول دیے جا رہا تھا جسے بُری طرح کوئی نفسیاتی عارضہ لاحق تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے اُسے فقط دو تین وقت کی چائے اور کھانا ہی درکار تھا۔ اُسی کے لیے کچھ باتوں کے متعلق عیاری کے ساتھ اُس نے جملے گھڑ رکھے تھے۔

ابھی چند ہی لمحے پہلے جب خود مَیں کھانے کا محتاج تھا تو مجھے ہرگز ایسے جملوں کا سلیقہ نہیں تھا جو اُن کلرکوں کے لیے ادا کرتا۔ مَیں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں، یہی کچھ یہ شخص اِسی تھوڑے بہت کھانے کے لیے ایسے ہی کلرکوں کا انتخاب کرتا تو نہ صرف بُری طرح ناکام ہوتا بلکہ اُن کو غضبناک کر بیٹھتا۔ یہ بات طے تھی کہ مَیں ایسا شخص کبھی نہ بن سکتا تھا جسے اپنے مالدار یا مفلس ہونے کے بعد دمڑیوں کا حساب رکھنا پڑتا۔ ہوٹل کے مالک مرید عباس کو مَیں نے دو تین بار دیکھا، وہ ڈھابے کے چبوترے پر بیٹھا گاہکوں کو بھرپور آنکھ سے دیکھتا۔ پھر جلد ہی اپنے کام میں مصروف ہو جاتا یا چھوٹے کو حکم دے کر اپنے طرف بلا کر کچھ ہدایات دے دیتا۔ مَیں نے اپنی ڈائیٹ کی خاطر چند لقموں کے بعد ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ شخص کھانا کھا رہا تھا۔ مجھے اندازہ تھا یہ آدمی بڑی مشکل سے کسی کا شکار کر پاتا ہوگا اور آج تو جیسے یہ کھا رہا ہے لگتا ہے صبح سے اِس کے جال میں کوئی نہیں آیا، مَیں نے اُس سے ایک سوال اور کر دیا۔

آپ اسلام آباد میں ٹھکانا کہاں رکھتے ہیں؟ میرا مطلب آپ رات کہاں گزارتے ہیں۔

وہ اُدھر۔ اُس نے ایک لوہے کے ٹین نما بے ڈھنگے چھپر کی طرف اشارہ کیا۔ یہ چھوٹا سا بلکہ آٹھ فٹ چوڑا اور اتنا ہی طویل جھونپڑا سا تھا۔ اُسے دیکھ کر میری ہنسی نکل گئی اور بولا، وہ مُرغیوں کا ڈربہ، وہاں رہتے ہو؟

جی ہاں اِسی ڈربے میں۔ اِس میں ایسا انتظام کیا ہے، بارش نہیں آتی۔ پانی کا ہر رستہ مَیں نے بند کیا ہے۔ آپ جانتے ہیں پانی اگر بے وجہ کہیں داخل ہو جائے تو بہت پریشانی ہوتی ہے، بہت پریشانی۔ آپ کو اندازہ ہے؟ مجھے اندازہ ہے، خیر چھوڑیے۔ اِسی ڈربے میں سوتا ہوں، خدا کی قسم بہت آرام دہ ہے اور دیکھیے پانچ سال سے اِسی میں سو رہا ہوں کچھ دقت نہیں ہوتی۔

کوئی سؤر یا سانپ کبھی نہیں آیا؟

ارے چھوڑیے بھائی آپ کہاں بھٹکے ہوئے ہیں۔ انسانوں کے ہمسائے میں کائنات کی کوئی

مخلوق رہنا پسند نہیں کرتی۔ ایک بات بتاؤں، اِدھر کان لائیے، اُس نے اپنا منہ بالکل میرے کان پر لگا دیا، جس سے مجھے کراہت ہوئی لیکن مَیں نے اِس کراہت سے زیادہ اُس کی گفتگو کو عزیز رکھا۔ یہ پورا علاقہ سؤروں سے بھرا ہوا ہے۔ وہ خیمہ نما سفید پتھروں کی کوٹھی، یہ نیچے سفید پتھروں کے آفس اور اِدھر ہمارے پیچھے یہ کویت ہاسٹل، سب اِسی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔

یہ بات کرتے ہوئے آخر میں اُس نے مسکرا کر اپنی دائیں آنکھ کو ایسے دبایا جیسے ایک مداری اپنے دائیں طرف کے آدمی کو دکھا کر بائیں طرف والے کو دھوکا دے رہا ہو۔ مَیں اُس کی اِس آخری حرکت پر ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔

(۵۶)

شام کے چار بج چکے تھے، میرا بہت سا وقت اِس آدمی نے کھا لیا تھا مگر بندہ تھا جی دار۔ اب مجھے ایسی کوئی جلدی بھی نہیں تھی لیکن جہاں سے آج صبح نکلا تھا مَیں ہرگز اُس جگہ رات گزارنے کے حق میں نہیں تھا بلکہ اُن کی گھٹیا شکلیں دیکھنے کا روادار بھی نہیں تھا۔ میرے لیے یہ بات کس قدر اطمینان بخش تھی کہ اب مَیں اُن سے آزاد تھا اور کسی بھی جگہ اپنا ٹھکانا بنانے کی قوت رکھتا تھا۔ اِس وقت بھی مَیں اِس خیال کے پیشِ نظر خوش ہو رہا تھا۔ اِس طرح کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہی زندگی کو بھرپور چارج کرتی ہیں۔ مَیں نے واپس شاہراہ فیصل پر آ کر وہی سُپر مارکیٹ کی بس پکڑ لی۔ بس والے نے مجھ سے پانچ روپیہ کرایہ لیا اور رائل پلازہ کے پاس چھوڑ دیا۔ اب پلازہ کی طرف اُٹھنے والے میرے قدم پہلے سے کہیں پُراعتماد اور خوش گوار تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں مَیں دوبارہ حسنات کے کمرے میں تھا۔ اُسی لڑکے نے دروازہ کھولا۔ یہ لڑکا مجھے نہیں معلوم اپنے کام میں کیسا تھا مگر حسنات کے کام کا ضرور تھا۔ حسنات کو یہ شوق کب اور کیسے لگا، مجھے اِس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ لڑکے نے میری طرف عجیب کسمساتی نگاہوں سے دیکھا مگر مَیں اُسے نظرانداز کر کے حسنات کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ وہ اُٹھنے کی تیاری میں تھا، مجھے دیکھتے ہی مسکرا دیا اور دُور ہی سے بولا، ضامن علی صاحب، لگتا ہے جیب بھر گئی ہے۔

جواب میں مَیں مسکرا دیا اور دڑانہ کمرے میں گھس گیا۔

اُس کے اشارہ کرنے سے پہلے ہی مَیں ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنی ٹانگیں دوسری کرسی پر پھیلا

دیں۔ تو جناب حسنات صاحب، آپ کے شکریے کے لیے صرف فون کرنا کافی نہیں تھا۔ یہاں چل کر پہنچ گیا ہوں اور واجب تھا کہ آج رات کا کھانا کھلانے کے علاوہ رات بھی آپ کے ساتھ گزاری جائے۔

ارے بھائی کیسی باتیں کرتے ہو؟ خیر تو ہے، پیسے پورے مل گئے کیا۔

جی ہاں اور اُس کے لیے آپ کا احسان ہے مجھ پر مابدولت کو جب چاہیے حکم کیجیے گا۔

کتنے ہیں؟

پورے پندرہ ہزار۔

لائیے اول تو میرے تیس واپس کیجیے اور اُس کے بعد پانچ سو مزید اُدھار دیجیے۔

مَیں نے بڑی فراخی سے جیب میں ہاتھ ڈال کر اُسے پانچ سو روپے ادا کر دیے اور کہا اسی میں سے اپنے تیس بھی کاٹ لیجیے گا۔

حسنات نے پیسے لیتے ہوئے شکریہ ادا کیا اور لڑکے کو دوبارہ آواز دی۔ شاذب، وسیم سے کہو بھاگ کر نیچے سے دودھ پتی اور اچھی سی برفی لے آئے۔

لڑکا کمرے میں آ گیا، حسنات نے اُن میں سے ایک سو روپے شاذب کو دیے۔ لڑکے کو دیتے ہوئے مسکراہٹ کا تبادلہ کیا۔

اور وہ میرے مکان کا مسئلہ؟ مَیں نے اُنھیں یاد دلایا۔

اُسے حل کر کے بیٹھے ہیں۔ حسنات نے شاذب کی طرف دیکھا اور کہا، شاذب جلدی جاؤ۔

آپ کے جانے کے بعد ایک لڑکا آیا تھا۔ وہ اپنا فلیٹ آپ کے ساتھ شیئر کریں گے لیکن لوگ بہت اچھے ہیں۔ تمھارا پہلا تجربہ دہرایا نہیں جائے گا۔ یہ دو بہن بھائی ہیں۔ ان کا والد چار سال پہلے امریکہ گیا اور وہیں دوسری شادی کر کے پہلی کو چھوڑ دیا۔ واپس نہیں آیا البتہ وہاں سے کچھ پیسے بھیج دیتا ہے۔ وہاں اُس کے دو بچے بھی ہیں۔ والدہ تین سال پہلے فوت ہو چکی ہیں۔ اُسے ملیریا ہوا تھا۔

ابھی حسنات یہ کہہ ہی رہا تھا کہ شاذب آفس میں داخل ہوا۔ اُس کے پیچھے ایک ٹین ایج لڑکا تھا، جس کی زیادہ سے زیادہ عمر سترہ اٹھارہ سال ہوگی۔ دونوں کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔ ساتھ آنے والا لڑکا بہت جاذب نظر اور سُلجھا ہوا لگ رہا تھا۔ اُس کی چھدری ہوئی پینٹ اور چیکس کی شرٹ، جو اتنی سکڑی تھی کہ اُس میں سے ناف صاف نظر آتی تھی۔ یہ لڑکا واقعی حسن کا نمونہ تھا۔ دونوں ہمارے

سامنے میز پر آن کر کھڑے ہو گئے۔

بیٹھیے، حسنات نے نئے آنے والے لڑکے کو خالی کرسی کی جانب اشارہ کیا اور وہ فوراً ہی بیٹھ گیا۔

کچھ لیں گے؟ حسنات نے پوچھا۔

جی نہیں شکریہ۔

یہ میرے دوست ضامن صاحب ہیں، ادیب ہیں اور اچھے آدمی ہیں۔

جی مجھے شاذب نے بتایا ہے۔

اب مَیں نے ایک عجیب سوال کیا، شاذب کیسے آپ کا دوست بنا؟

کچھ چیزیں بتانے کی بجائے دیکھنے سے بہتر سمجھی جا سکتی ہیں۔ کچھ دِنوں میں آپ اِس کا سبب بھی جان لیں گے۔ لڑکے نے انتہائی اعتماد سے جواب دیا۔

مَیں اِس کی بات پر حیران ہوا، یہ لڑکا جس کا نام شاذب ذیشان بتا رہا تھا، عقلی طور پر اپنی عمر سے زیادہ بڑا ہو گیا تھا۔ اِس کے جواب میں چھپا ضرورت سے زیادہ اعتماد ڈرا دینے والا تھا۔ اگر یہ لڑکا پہلے سے مجھ سے واقف ہوتا تو شاید مَیں اِس بات کا کچھ جواب دیتا مگر مَیں اِس لمحے اُن کلرکوں سے ڈرا ہوا تھا اور فی الحال اپنے کام سے غرض رکھنا چاہتا تھا۔ مَیں چپ ہی بیٹھا رہا اور کچھ جواب دینے کی زحمت نہ کی۔

ضامن کو اپنے لیے ایک کمرہ چاہیے، حسنات نے اُس کے جواب کو نظر انداز کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔ شاذب کہہ رہا تھا آپ کے پاس جگہ ہے۔ مَیں دعویٰ کرتا ہوں اِس سے زیادہ بے ضرر آدمی آپ کو کم ہی ملے گا۔

کمرہ مل جائے گا لیکن کچھ شرائط ہیں اور یہ شرائط کرایہ نامہ کی شرائط کی حدود سے باہر ہیں مگر ان پر سختی کرایہ نامہ کی اصولی شرائط سے زیادہ کرنا ہو گی۔

آپ کمرے کا کرایہ بتائیں، اُس کے بعد شرائط بیان کریں، حسنات کی بجائے اب کے مَیں نے خود گفتگو میں حصہ لیا۔

کمرے کا کرایہ پانچ سو ماہانہ ہو گا اور دو مہینے کے ایڈوانس کے ساتھ ہو گا۔ یعنی آپ پندرہ سو روپیہ ابھی مجھے دیں گے۔ ذیشان نے واضح کیا۔

ٹھیک ہو گیا، آگے بتائیں۔ مَیں نے کہا۔

باقی جو کچھ کرایہ نامہ میں طے کیا جاتا ہے وہی اور کچھ میری اپنی شرائط ہیں۔ ذیشان بولا۔
ہم شاید آپ کے ساتھ اسٹام کے چکر میں نہ پڑیں اگر آپ کو خدشہ نہ ہو تو اپنی شرائط بتا دیں۔
ہمارے فلیٹ کے دو کمرے ہیں۔ ایک ڈرائنگ روم ہے۔ سب کچھ فرنشڈ ہے۔ ہم نے اسے خود کرایے پر لیا ہے۔ میرے ساتھ میری آپی رہتی ہے۔ مجھ سے دو سال بڑی ہے۔ ہم دونوں ایک کمرے میں رہیں گے اور یہ صاحب دوسرے میں۔ لیکن جب بھی ہمیں ضرورت ہوگی ہم ان کا کمرہ بھی استعمال کر سکتے ہیں یعنی شیئر کر سکتے ہیں۔ ہم اِن کے کسی کام میں دخل نہیں دیں گے اور نہ یہ ہمارے کسی کام میں دخل دیں۔ ہمیں بچے سمجھ کر نصیحت اور نیکی بدی کے لیکچر نہیں دیں گے۔ ہم جو کچھ بھی کریں اور جیسے بھی رہیں، اُن سب چیزوں سے اِنھیں کوئی غرض نہیں ہوگی۔ اگر منظور ہے تو چلے آئیں ابھی اپنا سامان لا کر رکھ دیں۔

اُس کی باتیں سُن کر حسنات ایک عجیب احساس کے ساتھ اُسے دیکھ رہا تھا۔ مَیں خود محظوظ ہو رہا تھا۔ اِس سے پہلے کہ حسنات اُن کی پہلی شرط پر اپنے تحفظات کا اظہار کرتا مَیں نے فوراً کہا مجھے منظور ہے۔

حسنات نے ایک بے یقینی اور حیرانی کی حالت میں میری طرف دیکھا، لیکن ضامن صاحب آپ...

مَیں نے اُس کی بات فوراً کاٹ دی، چھوڑیے حسنات بھائی، مجھے کون سا اپنے کمرے میں دنگل کھیلنا ہے۔ سارا دن تو سڑکوں پر دھکے کھاتا ہوں، سونا ہی تو ہے۔ اِس کے ساتھ ہی پندرہ سو روپے نکال کر لڑکے کے سامنے رکھ دیے۔ لیجیے یہ رہا آپ کا کرایہ اور کچھ؟

ٹھیک ہے، ذیشان نے شاذب کی طرف دیکھ کر کہا، صاحب اپنا سامان لے آئیں، چاہے آج ہی۔

(۵۷)

فلیٹ کے دو کمرے اور ایک ڈرائنگ روم تھا لیکن مجھے ایک کمرے میں رہنے کی اجازت تھی بلکہ مجھے بتا دیا گیا تھا کہ اُنھیں جب بھی ضرورت پڑے گی، میرے کمرے کو بھی استعمال میں لا سکتے ہیں۔ مجھے اِس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ویسے بھی اُس وقت جب آدھا افغانستان جس شہر میں دھونس دیے بیٹھا ہو وہاں مشروط کوارٹر بھی غنیمت تھا اور مجھے ایسی شرائط میں قباحت نظر نہیں آئی۔ مَیں اُسی وقت شاذب کے ساتھ کلرکوں والے فلیٹ پر جا کر اپنا سامان اُٹھا لایا۔ سامان کی بابت کچھ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اُس کی فہرست بہت محدود تھی۔ چند کتابوں کے مسودے اور دو جوڑے پاجاموں کے ایک پلاسٹک بیگ میں باندھ رکھے تھے۔ اُن کو ایک طرف فرش پر رکھ دیا اور ڈبل بیڈ پر بیٹھ کر اطمینان کی سانس لینے لگا۔ فلیٹ نہایت عمدہ اور کشادہ تھا۔ اکثر جگہ پتھر اور لکڑی کا کام ہوا تھا۔ ڈرائنگ روم بھی نہایت دیدہ زیب تھا اور نئے پرانے انٹیک سے سجا ہوا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی اپر مڈل کلاس گھروں کا نقشہ ذہن میں بھر گیا۔ بیڈ کی چادر بُری نہیں تھی بلکہ اُس سے ہلکے پرفیوم کی خوشبو کمرے میں خوشگوار کیفیت پیدا کر رہی تھی۔ کمرے میں کسی قسم کی نمی یا سیلن کے آثار نہیں تھے۔ فرش کا کارپٹ اگرچہ سستا تھا مگر بے عیب اور نیا تھا۔ بیڈ سے دائیں طرف کی دیوار پر آویزاں ٹائم کلاک میں وقت بتانے کی اہلیت نہیں تھی۔ پچھلے دس منٹ سے اُس کی سوئیاں ایک ہی مقام پر رُکی ہوئی تھیں۔ مجھے پہلے اِس طرح کے کمروں میں رہنے کا اتفاق کبھی نہیں ہوا لیکن اِن چند لمحوں میں اِس کی مجموعی حالت سے اندازہ کر لیا تھا

کہ فلیٹ کے مالکان میں نمائش کی چھوٹی موٹی حس ضرور تھی۔ اُن کا ذوق عام لوگوں کی نسبت بہتر تھا۔ چھت پر جھولتا ہوا فانوس، ٹیبل لیمپ، سب سے بڑھ کر دیوار سے چپکی ہوئی جعلی پینٹنگز میرے اس تاثر کی تائید کرتی تھیں۔ مَیں نے یہ کمرہ جتنے پیسوں میں کرایے پر لیا تھا، اِن سب اشیا کے سبب مہنگا نہیں تھا۔ رہی پرائیویسی؟ تو پہلے بتا چکا ہوں معاشی مسائل کے شکار انسان کو ایسی واہیات فکر سے گریز کرنا بہتر ہے۔ کمرے کو اچھی طرح سے دیکھنے کے بعد مَیں نے اپنی چیزوں کو اِدھر اُدھر سے سمیٹ کر رکھ دیا۔ اِس سمیٹنے کو آپ ترتیب کا نام نہیں دے سکتے۔ وہ ایک عرصے سے اُنھیں نصیب نہیں ہوئی تھی۔ پھر وہ تھیں بھی کتنی؟ دو بیگ تھے، جن میں بیشتر مسودے اور دو جوڑے پاجاموں کے، دو شرٹیں یا ایک ٹوٹی ہوئی چپل تھی۔ اِن کے علاوہ ایک مفلر اور ایک سویٹر بھی تھا۔ سویٹر کا رنگ اِس طرح اُڑ چکا تھا کہ اُس کا اصلی رنگ کوئی نہیں بتا سکتا تھا۔ دونوں شرٹیں بھی ویسی ہی بوسیدہ اور گھسی ہوئی تھیں۔ اُن کے کالر اور کفیں کسی بھی وقت گریبان سے الگ ہو سکتے تھے۔ یہ سب کپڑے پچھلے آٹھ دن سے نہیں دُھلے تھے۔

مَیں کافی دیر کمرے میں خالی الذہن بیٹھا رہا جیسے بیوی کو طلاق دینے والا شخص کچھ دیر کے لیے سوچنے کے عمل سے آزاد ہو جاتا ہے۔ کمرے کی تمام لائٹیں ٹھیک تھیں۔ اُن کے سبب ہر شے تیز روشنی میں نہائی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد مجھے خیال آیا، کمرے میں واش روم بھی موجود ہے۔ یہ ایک ایسی چیز تھی، جسے ایک آوارہ کبھی دنیا کی کئی نعمتوں کے عوض بھی حاصل کرے تو خسارہ نہیں ہے۔ پبلک ٹائلٹ اور واش روم استعمال کرنے والا آدمی کبھی نفیس خیالات کا مالک نہیں ہو سکتا جو مجھے اکثر استعمال کرنا پڑتے تھے۔ اِن میں اتنی سرانڈ، گندگی اور بدبو ہوتی کہ اُس سے بہتر جگہ سؤروں کی مذبح ہو گی۔ فرش اور دیواروں سے چپکے ہوئے لیس دار مادے اور اُن سے اُٹھتی ہوئی کریہہ باس اگر ایک طرف دماغ کی بے توفیقی میں اضافہ کرتی ہے تو دوسری طرف آنکھوں کی جمالیات پر کیچوے کی لجلجی جھلی چڑھا دیتی ہے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ پبلک ٹائلٹ میں جانے کے بعد ہفتوں میری طبیعت خراب رہتی اور میری کوشش ہوتی کہ مَیں دیوار یا جھاڑی کے ساتھ اپنی ضرورت پوری کر لوں۔ مجھے اعتراف کرنے میں بالکل عار نہیں کہ مَیں سڑک پر پیشاب کرنے یا تھوکنے جیسے ناروا عمل میں اکثر مبتلا ہوا ہوں مگر کیا یہ بد اخلاقی گندے واش روم کو استعمال کرنے کا جواز پیدا کر سکتی ہے؟ پھر یہ کہ اُن واش رموں کی دیواروں پر لکھے گئے وہ جملے اور فون نمبرز کو مسلسل پڑھنے کے جبر سے کیسے نجات دلائی جا سکتی ہے جن سے کسی بھی قسم کے ادبی کام، افسانے یا ناول کا مسودہ تیار نہیں ہو سکتا۔ نہ اُن سے اِس تنگ واش روم میں جنسی تسکین کا کام لیا جا سکتا ہے۔

مَیں نے سب سے پہلے کپڑے دھونے کی طرف رجوع کیا۔ واش روم بہت صاف اور چینی کی ٹائلز سے تعمیر ہوا تھا۔ ٹائلیں چھت تک چڑھی تھیں۔ اِس میں کسی جانب گندگی کا احساس تک نہیں تھا۔ پانی کی فراوانی اور واش روم کی صفائی کے سبب مَیں نے پورا ایک گھنٹا اُس میں گزار دیا۔ اپنے تمام کپڑے دھو کر چاندی کی طرح چمکا دیے اور جسم پر جمی ہوئی صدیوں پرانی میل کو یوں کھرچتا رہا جیسے قسمت کے کُہنہ حروف مٹا رہا ہوں۔ ایک گھنٹے بعد جب میں نیکر پہنے کمرے میں داخل ہوا تو نہایت ہلکا پھلکا محسوس ہونے لگا۔ باتھ روم کی پچھلی جانب ایک بالکونی تھی۔ اُس پر گیلے کپڑے ڈال دیے۔ دھوپ زیادہ تو نہیں تھی۔ مَیں بالکونی میں کھڑے ہو کر دُور تک لوگوں کو دیکھنے لگا۔ نیچے پھیلی ہوئی سڑکیں اور اِن پر کچھوؤں کی طرح رینگتے ہوئے لوگ عجیب طرح کے ناجنس لگ رہے تھے۔ اِس پندرہ منزلہ فلیٹ کی گیارہویں منزل پر کھڑا مَیں ایک چھ فٹ قد کا آدمی ایک دم کتنا بڑا ہو گیا تھا۔ اُن پرندوں کی طرح بہت بڑا اور آزاد اور اونچا جن کے نیچے رینگتے ہوئے انسان کچھوے اور کیڑوں مکوڑوں کی طرح کتنے بے بس اور بونے تھے۔ یہاں سے پیدل اور گاڑیوں میں چلنے والوں کی رفتار کم و بیش ایک ہو گئی تھی۔ کوئی کم سُست رینگ رہا تھا کوئی زیادہ سُست تھا۔ اِس سے بھی عجیب بات یہ تھی کہ اُنھیں بالکل معلوم نہیں تھا اُوپر سے دیکھنے والے کسی بھی شخص کے لیے زمین پر چلنے والے تمام چھوٹے بڑے کیڑے مکوڑے ہوتے ہیں۔ مَیں پہلی بار اتنی بلندی پر کھڑا اُس کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا تھا جس میں ذلیل اور پست لوگوں کے لیے حقارت اور اقتدار ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں۔ جب وہ اونچے سٹیج پر کھڑے ہو کر نیچے کی طرف نگاہ پھیرتے ہیں تو اُنھیں سب لوگ ایک ہی جنس کے فقط کان دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے کان جو صرف سننے کے لیے بنے ہوں مگر مَیں تو یہ نام بھی دینے کو تیار نہیں تھا۔ یہاں کھڑے ہو کر مَیں نے ایک عجیب عمل کا ارادہ پختہ کر لیا۔ مَیں کبھی اونچی عمارت کے نیچے سے نہیں گزروں گا۔ مَیں کبھی اونچے سیاسی اسٹیج کے سامنے پیش نہیں ہوں گا۔ یہ عجیب بالکونی تھی۔ اتنی عجیب کہ مجھ پر ایک لمحے میں ہزار کہانیوں کے طلسم کھول گئی تھی۔

ہوا کی سرسراہٹ اور ہلکی دھوپ میں کپڑوں کو خشک ہونے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ مَیں واپس کمرے میں آ گیا۔ کمرے کی فرحت ایک عرصے بعد محسوس کر رہا تھا اس لیے سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا اور دل ہی دل میں یہ سوچ کر خوش ہو رہا تھا کہ جب چاہوں گا، سوؤں گا، اُٹھوں گا، نہاؤں گا اور دُھلے ہوئے کپڑے پہن کر باہر نکلوں گا۔ کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں ہو گا۔ مَیں دفتری ٹائم ٹیبل سے آزاد

ہونے کے سبب جب چاہتا اتوار بنا سکتا تھا۔ مَیں نے دو تین دن اتوار منانے کا ارادہ کیا اور بے فکر ہو کر لیٹ گیا۔ ٹائم پیس خراب ہونے کے سبب اُس کے سیل نکالنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کمرے میں بہت سی دیگر آرائشی چیزیں بھی موجود تھیں، خاص کر سنگھار میز، مگر مجھے اِن میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ایک الماری ضرور چاہیے تھی، وہ کمرے میں لکڑی کے فریم میں دیوار کے ساتھ ہی نصب تھی۔ اُس کی چابیاں ذیشان نے میرے حوالے کر دی تھیں۔ غرض ہر طرف سے مطمئن ہو کر مَیں سو گیا اور مزے سے نیند کا حساب چکانے لگا جو مدت سے میرے سر پر قرض تھا۔ شام چھ بجے سے اگلے دن صبح دس بجے تک سوتا رہا۔ دس بجے اُٹھ کر پھر باتھ روم میں داخل ہو کر نہانے لگا اور گیارہ بجے دُھلے ہوئے کپڑے پہن کر کچن کا رُخ کیا، جہاں کل عصر کے وقت ہی میں نے کھانے اور ناشتے کا سامان لا کر رکھ دیا تھا۔ یہ سامان چائے اور براؤن بریڈ پر مشتمل تھا۔ ٹماٹر، اَچار، پیاز اور لہسن کے امتزاج سے مَیں بغیر انڈے کے ایسا آملیٹ بناتا تھا جسے کھانے میں لذت جیسی بھی تھی براؤن بریڈ کے لیے بہتر پیسٹ بن جاتا تھا۔ اکیلا انڈا کھانے سے مجھے نفرت تھی۔ کچن میں میرے جانے سے پہلے کوئی موجود تھا۔ ایک لڑکی ناشتا بنانے میں مصروف تھی۔ اُس کی پُشت میری طرف تھی۔ غالباً وہ ناشتا بنا چکی تھی۔ وہ بریڈ اور آملیٹ بنا کر طشتری میں رکھ چکی تھی اور اب چائے چینک میں انڈیل رہی تھی۔ کچن نہایت کشادہ اور بہت صاف ستھرا تھا۔ یہاں دو اجنبی آزادی کے ساتھ گھوم سکتے تھے اور اُن کے جسم ایک دوسرے سے الگ رہتے۔ مَیں کچن کے دروازے پر کھڑا ہو کر اُس کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگا لیکن جیسے ہی وہ اپنی طشتری اُٹھا کر باہر نکلنے کو مڑی تو مجھے ایک خوبصورت منظر نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ تھوڑی دیر کے لیے مجھے سمجھ نہیں آئی، کیا دیکھ رہا ہوں مگر حیران کن چیز یہ تھی کہ اُس کی خوبصورتی میں میرے لیے ایک مانوسیت تھی۔ لڑکی نے بغیر کسی تاثر کے ''ہائے'' کہا اور کمرے سے نکل گئی۔ کچن میں پرفیوم کی خوشبو پھیل رہی تھی۔ یہ خوشبو اُس کے کپڑوں کے سبب تھی۔ پرفیوم یقیناً اُس نے تازہ نہیں لگایا تھا۔ خوشبو میں گزری ہوئی رات کی بوسیدگی تھی۔ مجھے یہ مہک اچھی لگ رہی تھی۔ اُس کی شکل ذیشان سے تھوڑی مختلف تھی، مگر مجموعی طور پر اُن کے بہن بھائی ہونے میں شک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ غور کرنے پر نقوش کی بعض شکلیں ایک جیسی تھیں۔ آنکھوں میں بھورے اور سبز رنگ کی ملی جلی اُداسی تھی۔ ابھی میری اُس پر اُچٹتی سی نظر پڑی تھی مگر ذیشان کو اچھی طرح دیکھ لینے پر اِسے اُس پر قیاس کیا جا سکتا تھا۔ نہیں اس سرسری نظر میں بھی مجھے اُس میں کوئی چیز ذیشان سے الگ نظر آئی تھی۔ مجھے لگا مَیں بے چین سا ہو گیا ہوں۔ یہ بے چینی اُس کی خوبصورتی کے حصار میں

آنے کی بالکل نہ تھی بلکہ مَیں نے اُسے کہیں دیکھا تھا اور یہ تاثر ذیشان کو دیکھنے پر نہیں اُبھرا تھا۔ مَیں اِسی حالت میں اپنا ناشتا تیار کرتا رہا۔ میری چائے عام گھروں کی چائے سے مختلف ہوتی ہے۔ آپ اسے بالکل بھی چائے نہیں کہہ سکتے۔ نہایت گاڑھے دودھ میں پتی ڈال کر گویا کڑھا ہوا کھویا ہوتا ہے۔ اُس دن بھی یہی ہوا بلکہ اِس سے بھی زیادہ تھا کہ میری چائے میں لڑکی کے متعلق سوچنے کی محنت بھی شامل تھی۔ مَیں ناشتا لے کر کمرے میں آ بیٹھا اور چائے پینے کے دوران اپنے ایک نئے افسانے کے مسودے پر نظرِ ثانی کرنے لگا مگر بار بار میری توجہ افسانے سے ہٹ جاتی تھی۔ میں آدھا صفحہ پڑھنے کے بعد محسوس کرتا تھا کہ میری توجہ افسانے کی بجائے لڑکی پر تھی۔ مَیں نے مسودے کو سامنے پڑی تپائی پر پھینک دیا اور بیڈ پر لیٹ کر چھت کو گھورنے لگا۔ میرے ذہن میں بے نام سا اضطراب پھیل کر پورے وجود کو اپنے حصار میں لے رہا تھا اور لحمہ بہ لحمہ یہ اضطراب شدید ہو رہا تھا۔ میری طبیعت بے قرار ہو گئی۔ مَیں شدت سے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ کون سی چیز تھی؟ یہ بات سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ کچھ ثانیوں کے بعد میری بے چینی اتنی بڑھ گئی کہ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ بہت دیر سوچتے رہنے کے بعد مجھے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ اِس اچانک پیدا ہونے والی بے قراری کا کوئی سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ میری چائے اِسی مصروفیت میں بے ذائقہ رہ کر معدے میں پہنچ چکی تھی۔ مَیں نے اِس صورتِ حال سے نکلنے کے لیے ایک نیند کی ٹیبلٹ لی اور سو گیا۔

اگلے دن صبح اُٹھتے ہی مَیں نے اپنے تمام کاغذات پر نظر دوڑائی اور سب کو ایک ایک کر کے دیکھنے لگا۔ کاغذات کو مسودات سے الگ کیا اور اُنھیں ایک ترتیب سے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ آج مجھے تمام دن اپنے ذاتی کام کے لیے وقف رکھنا تھا۔ سب سے پہلے مَیں چاہتا تھا کسی طرح سے جیب میں پڑے ہوئے پیسے گھر پہنچ جائیں۔ میرے والد کی آنکھیں بالکل جواب دے گئی تھیں اور پچھلی بار ڈاکٹر نے آپریشن کی جو فیس بتائی تھی، تب وہ میری پہنچ سے دُور تھی۔ مَیں جانتا تھا میرے والد اپنی آنکھوں کی بابت جھوٹ بول رہے تھے کہ ابھی اُنھیں آپریشن کی ضرورت نہیں ہے لیکن ڈاکٹر نے بتا دیا تھا آنکھوں میں سفید موتیا اُتر رہا ہے۔ اگر جلد بندوبست نہ کیا گیا تو اُن کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے جواب دے جائیں گی۔ یہ بات ڈاکٹر نے دو مہینے پہلے بتائی تھی۔ حیرت کی بات ہے مجھے اُس وقت ڈاکٹر کی بجائے والد کی بات پر یقین آ گیا تھا۔ شاید یہ پیسے نہ ہونے کے سبب ہوا تھا۔ یہ تمام دن مختلف نوعیت کے کام نپٹاتے اور ان خیالات کو ترتیب دیتے گزر گئے حتیٰ کہ اگلی رات نمودار ہو گئی۔ اِسی میں حیرت کی بات یہ

تھی کہ میری شدید خواہش کے باوجود ذیشان اور اُس کی بہن کو مَیں نے دوبارہ نہیں دیکھا۔ حالانکہ کافی دیر ڈرائنگ روم میں بھی بیٹھا رہا پھر یہ سوچ کر بالآخر اپنے کمرے میں چلا گیا کہیں مجھے اپنا سراغ رساں نہ سمجھ لیں۔ تب رات دوبارہ نمودار ہوگئی۔ مَیں چونکہ اپنے کھانے کا سامان پہلے ہی لا کر رکھ چکا تھا چنانچہ باہر نہیں نکلا۔ پچھلی رات مختلف خیالات کی وجہ سے اپنے والد کی آنکھوں کے متعلق کوئی بات یاد نہیں آئی مگر آج تمام دن گزارنے کے بعد وہ یاد زیادہ سے زیادہ ہوتی چلی گئی۔ اب تو مَیں سخت بے چین ہو گیا لیکن رات کے اِس پہر کتنی ہی جلدی کرتا والد کی آنکھوں کو ڈاکٹر کے سامنے نہیں لا سکتا تھا۔ صبح ہونے کا انتظار ہر حالت میں کرنا ہی تھا۔ مَیں ساری رات بے چین رہا اور جب نیند آئی تو خواب میں ایک ہولناک منظر تھا۔ مَیں اپنے والد کو ڈاکٹر کے پاس لے کر آیا اور اُسے آپریشن کے لیے کہا۔ ڈاکٹر نے اُن کی آنکھیں چیک کرنے کے بعد اُنھیں لاعلاج قرار دے دیا۔ ڈاکٹر نے کہا آپ کے والد بالکل اندھے ہو چکے ہیں۔ مَیں روتا ہوں اور اُن کا بازو پکڑ کر لیے لیے پھرتا ہوں اور اُنھیں کچھ نظر نہیں آ رہا۔ اِسی عالم میں مجھے اپنی آنکھوں سے نظر آنا بھی بند ہو جاتا ہے۔ پھر ہم دونوں باپ بیٹا ایک اندھیرے کنویں میں گر جاتے ہیں۔ کنویں میں مجھے کئی سانپ نظر آتے ہیں۔ مَیں ایک چیخ مارتا ہوں۔ اُسی لمحے میری آنکھ کھل گئی۔ مَیں نے اپنے منہ اور سینے پر ہاتھ پھیرا۔ مَیں پوری طرح سے پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ اِس خوفناک خواب نے مجھے نہایت کرب میں مبتلا کر دیا۔ مَیں بہت زیادہ بے چین ہو گیا۔ جلدی سے اُٹھا، گھڑی دیکھی، ابھی صبح کے چار بج رہے تھے اور سناٹے کا عالم تھا لیکن مَیں دوبارہ سونا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے کل ہی گاؤں نکل جانا چاہیے تھا مگر حیران تھا یہ خیال کل کیوں نہیں آیا۔ کیا مَیں بالکل بھول گیا تھا؟ فاصلوں کی دُوری کے سبب بعض اوقات نزدیک کے رشتے بھول جاتے ہیں۔ یہ بڑی عیب کی بات تھی لیکن یہ عین حقیقت تھی جب انسان کے پاس کچھ نہ ہو تو وہ کچھوے کی طرح سست ہو جاتا ہے مگر جیسے ہی اُس کے پاس معاشی فراغت آتی ہے اُسے اپنی تمام لٹی ہوئی حاجات ایک ایک کر کے یاد آنے لگتی ہیں۔ یہی اُس کے انسان ہونے کی خوبی ہے۔ مجھے کل جب رقم ملی تھی تو سب سے پہلے اپنے والد کی آنکھیں یاد آنا چاہیے تھیں مگر اُس کی بجائے مَیں اپنے رہنے کی جگہ کی بابت پریشان ہو گیا تھا اُس کے بعد مجھے ایک ایک ذاتی مسئلہ ازبر ہونے لگا مگر والد کی آنکھوں کا مسئلہ کہیں دُور جا کر یاد آیا۔ اب مَیں اِس کی بابت سخت شرمندہ ہونے کے ساتھ پریشان بھی تھا اور جلد سے پہلے گاؤں پہنچ کر یہ مسئلہ حل کرنا چاہتا تھا۔ مَیں نے اپنے جوتے پاؤں میں اڑسے اور جلدی سے اُلٹی ٹیڑھی قمیص پہن کر منہ پر

چھینٹے مارے اور گاؤں کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ یہ سب کیفیت ایف سکس ٹو کے بالمقابل سپر مارکیٹ کے پلازے کے اندر ایک فلیٹ میں تھی۔

سیڑھیوں سے نیچے اُترتے ہی مجھے مدھم اور کسی قدر پیلی لائٹوں نے اپنے حصار میں لے لیا۔ سامنے ایک طرح سے جھاڑ جھنکاڑ کا جنگل تھا اور سر پر بلند و بالا جنگلی شہتوتوں کے درختوں نے ماحول کو طلسماتی بنا رکھا تھا۔ یہاں اِس وقت کوئی ٹیکسی نظر نہیں آ رہی تھی۔ لیکن مَیں ہر صورت راولپنڈی کے بس اڈے پر پہنچنا چاہتا تھا جہاں سے سرکاری بسیں لاہور کے لیے نکلتی تھیں۔ مَیں نے اپنی رفتار تیز کر لی۔ جیسے ہی جی سکس تھری کی مرکزی مارکیٹ سے نکلنے لگا تو خالی پلاٹ کی جھاڑیوں میں سے سامنے سؤروں کا ایک گروہ نظر آیا۔ یہ سؤر نہایت پلے ہوئے اور کافی زیادہ تھے۔ مَیں نے اُن کے ڈر سے اپنی رفتار کم کر لی لیکن سؤر وہیں جم کر کھڑے ہوئے تھے۔ مَیں بھی اپنی جگہ کھڑا ہو گیا اور اِس حماقت پر دل ہی دل میں ملامت کرنے لگا جس کی بدولت ایک دم جذباتی ہو کر بھاگ کھڑا ہوا تھا حالانکہ جس قدر مجھے پیدل چلنے میں وقت درکار تھا اتنے میں اچھا خاصا سویرا ہو جانا تھا اور تب بڑی آسانی سے ٹیکسی یا ویگن کے ذریعے اڈے یا اسٹیشن پر پہنچ سکتا تھا۔ وہاں تھوڑی دیر ساکت کھڑا رہنے کے بعد مَیں واپس مڑا اور ایک دوسری گلی کی طرف چلنے لگا۔ یہ گلی جی سکس تھری کی ایک چھوٹی مارکیٹ کی طرف نکلتی تھی۔ مارکیٹ میں ہو کا عالم تھا۔ ایک دو کتے پڑے اونگھ رہے تھے اور کسی ذی روح کا نشان نہیں تھا۔ یہ مارکیٹ بھی چاروں طرف سے درختوں سے گھری ہوئی تھی اور بہت چھوٹی جگہ تھی۔ مَیں یہاں سے گزر کر اور دو مزید گلیاں عبور کر کے ایک چوڑی سڑک پر نکل آیا۔ یہ سڑک ایک طرف سے مارگلہ کو جاتی تھی اور دوسری طرف فیض آباد کو نکلتی تھی۔ مَیں بلیو ایریا کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ بلیو ایریا میں چند کپڑے، جوتوں اور قالینوں کی دکانوں کی جگہ تھی مگر ابھی سب بند تھیں۔ ایک دو گاڑیوں کی ورکشاپ بھی یہاں تھی مگر اُس پر زیادہ نہ تو کام تھا اور نہ کوئی متنفس نظر آتا تھا۔ یہ مارکیٹ اِس وقت تو مکمل بند تھی ہی، دن کے وقت بھی یہاں کوئی خاص ہجوم نہیں ہوتا تھا۔ اس کے بائیں کونے پر آخری پلازہ تھا۔ اُسی کے پہلو سے ایک سڑک سیدھی کہسار مارکیٹ کی طرف جاتی تھی اور دوسری بیگم سرفراز اقبال روڈ سے ہوتی ہوئی پارلیمنٹ ہاؤس اور سیکریٹریٹ کی طرف نکل جاتی تھی۔ یہ سب جگہیں مکمل جنگلات اور سؤروں کی اماجگاہ تھیں۔ مَیں نے مارکیٹ کے پاس آ کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ کوئی چیز دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ایک چوکیدار سیٹیاں مارتا ہوا میری طرف آ رہا تھا۔ مَیں وہاں کھڑا ہو گیا اور چوکیدار کا انتظار کرنے لگا۔ یہ ایک پٹھان چوکیدار تھا۔

ایک ہاتھ میں ڈنڈا اور دوسرے میں سیٹی لے کر چند لمحوں تک مجھے دیکھتا رہا۔

کون ہے؟ کیا دیکھتا ہے؟ پٹھان نے انتہائی کرخت آواز سے آخر سکوت کو توڑا۔

کیوں؟ آپ کو مجھ سے کچھ کام ہے؟

ہاں تم مارکیٹ میں اِس وقت خواہ مخواہ پھر رہا ہے، کوئی بات ہے؟

کیا رات کو صرف تم ہی پھر سکتے ہو، کوئی اور کیوں نہیں؟

اَم چوکیدار ہے، یہ ہمارا کام ہے؟ یہ مارکیٹ والا اِس کا ہمیں پیسہ دیتا ہے۔ تم بتاؤ نا، کیا کرتا ادھر؟

اِس پٹھان کا رویہ اِس قدر بد اخلاقی اور کرختگی کا آئینہ دار تھا کہ مَیں اُس سے ڈر گیا۔ مجھے یقین تھا اگر ایک آدھ جملہ اور جواباً اُسی طرز پر کہا تو پٹھان مجھے پکڑ کر لے جائے گا یا سر میں ڈنڈا مار دے گا۔ مَیں نے ایک نظر مشفقانہ سی پٹھان پر ماری اور کہا، خان صاحب مَیں راولپنڈی بس اسٹینڈ پر جا رہا ہوں، کسی ٹیکسی کو دیکھ رہا تھا۔

کہاں رہتا ہے؟

پٹھان میری بات سے تھوڑا سا دھیما ضرور پڑا لیکن تفتیش سے ہاتھ نہیں اُٹھایا۔ مَیں جانتا تھا ہر وہ آدمی جو عام حالت میں مجھ سے بھی ذلیل اور کمتر ہو اگر وہی موقع کا افسر ہو جائے تو اُس سے بات کرتے ہوئے اپنی عزت کو بحال رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اُس وقت دو ہی صورتیں ہوتی ہیں۔ اول سامنے والے کی طرح ہی گفتگو کو کرخت رکھا جائے اور اپنے آپ کو مصیبت میں مبتلا کر لیا جائے جس کے بعد مزید ذلت اختیار کی جاسکتی ہے یا خود کو منت سماجت کے سپرد کر کے تھوڑی ذلت پر قناعت کر لی جائے۔ پولیس مین، کلرک، بیوروکریٹ، چوکیدار اور بھنگی، یہ سب اپنے لیے ہمیشہ بدتمیزی اور بداخلاقی کا جواز رکھتے ہیں۔ ستم تو یہ ہے ڈیوٹی کے دوران خود اِن کا ہائی کمان افسر بھی اِن کی زد میں آسکتا ہے۔

اب مَیں اس پٹھان کے سامنے گڑگڑایا، میرے بھائی، میرے افسر مَیں پچھلی مارکیٹ کے ایک پلازے کے ایک فلیٹ میں رہتا ہوں اور اخبار میں کام کرتا ہوں۔ اِس وقت شدید پریشانی کی حالت میں ہوں اور اپنے گاؤں جا رہا ہوں۔ اگر آپ کا مجھ فقیر پر احسان ہو تو مَیں اپنے سفر پر روانہ ہو جاؤں؟

میری اِس درد بھری گزارش سے پٹھان کا ایک دم دل پسیج گیا۔

تو یوں کہو ماڑا یار پریشانی میں ہے۔ ابھی یہاں پچھلی طرف ایک ٹیکسی کھڑا ہے، آؤ تمھیں ٹیکسی

کرادوں۔ اُس کے بعد وہ ڈنڈے بجاتا ہوا اور سیٹیاں مارکر آگے چلنے لگا۔ پٹھان بولتا بھی جاتا تھا اور چلتا بھی جاتا تھا۔ تم ہمیں اچھا آدمی لگتا ہے۔ پریشانی تو سب کا ہے، ہمارا اپنا پریشانی بہت ہے۔ اُدھر کابل میں ہمارا سارا کاروبار تباہ ہو گیا، دو بھائی مارے گئے، سارا ستیاناس پھر گیا۔ ہمارا گیارہ بچہ اِدھر کچا آبادی میں رہتا ہے۔ ہم اپھغانستان سے اِدھر بھاگ آیا۔ اِن ہاتھوں سے ہم نے کافروں پر اِتنا بڑا بڑا گولے پھینکا پر فایدہ کچھ نہیں ہوا۔ مارا سب کچھ لٹ گیا۔ تم کہتا ہے ہم پریشانی میں ہے۔ ہم نے سوچا پریشانی میں تو ہم بھی ہے۔ جو بھی پریشانی میں ہے، وہ ہمارا بھائی ہے۔

او ٹیکسی والا؟

خان صاحب نے ایک ٹیکسی کے دروازے پر ڈنڈا مارتے ہوئے آواز دی۔ ڈرائیور اونگھ رہا تھا اور اُس پر نیند سوار تھی۔ وہ ہڑ بڑا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

جی؟ کیا بات ہے خان صاحب۔

سنو بھائی یہ ہمارا بھائی پریشان ہے، اِسے بس سٹینڈ پنڈی لے جاؤ۔ آؤ بیٹھو۔

میٹر چلتا ہے؟ مَیں نے پوچھا۔

میٹر ویٹر کو گولا مارو، ٹیکسی ڈرائیور سے پہلے ہی پٹھان بولا، یہ تمھیں بیس روپیہ دے گا۔

خان جی بیس روپے بہت کم ہیں؟ ڈرائیور آنکھیں ملتے ہوئے بولا۔

کم تو بیس سو بھی ہے۔ جتنا بھی مل جائے، کم ہے۔ یہ بڑی کوٹھیوں والوں کے پاس لاکھوں روپیہ ہے، وہ بھی کم ہے۔ بہت کم پیسہ ہے۔ پر تم بیس ہی لینا۔ پھر میری طرف خان نے دیکھ کر کہا، بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ۔ تم ہمارا بھائی ہے۔ اِدھر رات کا ڈیوٹی ہے ہمارا۔ دو سال سے اِدھر ہی ہے۔ کچھ کام ہو تو بتا دینا۔ ہم سب کر دے گا۔

مَیں ٹیکسی میں بیٹھ گیا، اِتنے میں اذانیں شروع ہو گئیں۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر مجھے کچھ سکون اور اطمینان نے آلیا۔ مَیں نے سیٹ سے ٹیک لگالی۔ ٹیکسی مدھم رفتار سے چلنے لگی۔ ہوا کافی ٹھنڈی چل رہی تھی۔

بیس منٹ میں یہ ٹیکسی راولپنڈی صدر میں بس اسٹینڈ پر پہنچ گئی۔ بس سٹینڈ زیادہ برا نہیں تھا۔ البتہ اِدھر اُدھر تانگوں کی بھرمار تھی۔ اُن میں سے اکثر کے کوچوان غائب تھے۔ گھوڑے تانگوں میں جُتے ہوئے اونگھ رہے تھے۔ چاروں طرف ایک سکون کا سا عالم تھا۔ گھوڑوں کے کوچوان زیادہ تر اڈے

پر موجود چائے کے ہوٹلوں میں بیٹھے چائے پی رہے تھے یا ناشتا کر رہے تھے۔ یہ کوچوان سال ہا سال کے بازاری کھانوں میں اِتنا رچ بس گئے تھے کہ اِنھیں گھر کا ناشتا بھی نہیں بھاتا تھا۔ ناشتا کرنے کے لیے اُٹھ کر اڈے پر چلے آتے اور اُسی وقت میں اپنے تانگے کو جوت لیتے کہ صبح اِس طرح ناشتے کے بہانے کام پر بھی نکلا جا سکتا تھا۔ یہ دراصل اِن کی عادت بن چکی ہوتی ہے۔ بس کے اڈے پر زیادہ تر اِدھر اُدھر جانے والے ویگنیں اور لوکل بسیں کھڑی ہوئی تھیں۔

مری، پشاور اور لاہور جانے والی بسیں بھی ایک قطار میں لگی تھیں۔ اِن سب کے ٹکٹ ایک ہی کاؤنٹر سے مل رہے تھے اور صبح کی وجہ سے یہاں کوئی رش نہیں تھا۔ اب دن کے آثار بھی نمودار ہو گئے تھے۔ مَیں نے ٹیکسی والے کو کرایہ ادا کیا اور دو روپے اُسے مزید دیے۔ اُس کے بعد چلتا ہوا لاہور جانے والی بس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ مَیں نے لاہور کا ٹکٹ خریدا اور آرام سے چار نمبر کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بیٹھا تھا کہ ناشتے کی خواہش ہوئی۔ مَیں بس سے اُتر کر ایک کھوکھے پر جا بیٹھا اور ایک پلیٹ سادہ چاول اور دال کے ساتھ ایک کپ چائے کا لے کر جلدی جلدی ناشتا نپٹایا۔ ناشتا اتنا اچھا نہیں تھا۔ لاہور کی نسبت پنڈی میں زیادہ کھانے کو ترجیح نہیں دی جاتی۔ واپس آ کر دوبارہ بس پر بیٹھ گیا۔ مجھے آدھ گھنٹا اور انتظار کرنا پڑا۔ چھ بجے بس لاہور کے لیے نکل پڑی۔ مَیں سیٹ کے ساتھ ٹیک لگا کر سو گیا۔ میرے لیے بس میں بیٹھ کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہونے کا یہ پہلا موقع نہیں تھا مگر اِس بار کہیں زیادہ تجسس اور پریشانی کی ملی جلی کیفیت تھی۔ مَیں تمام رات جاگتا رہا تھا۔ مَیں نے کئی بار اپنی جیب کو ٹٹولا، پیسے موجود تھے۔ اُنھیں اچھی طرح سے دیکھ بھال کر سکون سے سو گیا۔ مَیں جانتا تھا کم از کم چھ گھنٹے بس میں بیٹھنا پڑے گا۔ تب لاہور کا منہ دِکھے گا اور یہ چھ گھنٹے سوائے سونے کے کچھ نہیں کرنا تھا بلکہ کسی بھی قسم کی سوچ کے عمل سے بچنا تھا۔ رستے میں کئی جگہ بس رُکی مگر مجھے نیند نے اتنا زیادہ گھیر رکھا تھا کہ کچھ خبر نہ ہوئی۔ مَیں سویا ہی رہا۔ یہاں تک کہ بس ایک بجے کے قریب لاہور پہنچ گئی۔ گویا مَیں سات گھنٹوں میں لاہور کے بس سٹینڈ پر پہنچا تھا۔ لاہور بادامی باغ پر اُتر کر مَیں تھوڑی دیر کے لیے سامنے کے ایک ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ یہاں مَیں نے کھانا کھایا اور چائے پی۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں سے ایک بار مَیں نو نمبر کی ویگن پر بیٹھ کر اپنے رشتہ داروں کے ہاں گیا تھا۔ جو بعد میں مغل پورے کے نام سے مشہور ہوا۔ ہمارے بہت سے رشتہ دار اب بھی یہاں رہتے تھے مگر اب مجھے اُن سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مَیں جلد از جلد اپنے گاؤں پہنچ کر اپنی جیب کی رقم والد کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ تین بجے یہاں سے ایک بس مجھے لے کر

میرے شہر چل پڑی۔ یہ سرکاری بس دیکھنے کو پھٹیچر سی معلوم ہوتی تھی مگر اِس کا انجن جہاز کی رفتار سے چلتا تھا۔ بس میں لوہے کی سیٹیں تھیں۔ واحد سنگل سڑک تھی۔ یہ مین جی ٹی روڈ تھی جو میرے شہر کو جاتی تھی۔ اُس پر بس دوڑ رہی تھی اور رستے میں ٹریفک کی اِکا دُکا چیز گزر جاتی تھی۔ مَیں پورے چار ماہ بعد گاؤں جا رہا تھا۔

اپنے مقامی شہر پہنچ کر مَیں ایک مقامی بس پر بیٹھ گیا اور آدھے گھنٹے بعد اُس اڈے پر اُتر گیا جہاں سے تانگے میرے گاؤں کی طرف جاتے تھے۔ یہاں سے میرا گاؤں چار کلومیٹر تھا اور گاؤں میں آنے جانے کے لیے تانگے کی سواری واحد ذریعہ تھا۔ اڈے پر پہنچ کر مجھے ہر طرف اپنا اپنا نظر آنے لگا۔ اس جگہ بہت سے درختوں کی چھاؤں میں دو بڑی بڑی چارپائیاں بچھی تھیں جہاں اکثر سواریاں بیٹھ جاتیں۔ قریب ہی ایک نلکا لگا ہوا تھا۔ یہ نلکا پانی کے نالے کے کنارے لگا ہونے کے سبب اس کا پانی بہت ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ مَیں نے اُتر کر ایک بھرپور نظر سے اِس سارے منظر کو دیکھا اور اپنے دل میں اُتار لیا۔ یہ شہر اور یہ علاقہ نہ جانے کیوں میرے دل سے کبھی نکل نہیں سکا تھا۔ کئی سال سے باہر رہنے کے باوجود اِس جگہ کا وجود میرے وجود سے جدا نہیں ہوا تھا۔ مَیں یہاں اُتر کر ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اکثر تانگے والے مجھے جانتے تھے۔ یہ تانگے والے میرے گاؤں کی سواریوں کے علاوہ دوسرے گاؤں کی سواریاں بھی لے کر جاتے تھے۔

یہاں سے آگے دس بارہ گاؤں تھے جن کی سواریاں یہیں سے جاتی تھیں۔ مجھے گھر جانے کی جلدی تو تھی اور میں تانگہ سالم بھی کرا سکتا تھا لیکن مَیں نہیں چاہتا تھا کہ مَیں سب سے الگ بیٹھ کر جاؤں بلکہ بچپن کی طرح بھری ہوئی سواریوں کے تانگے پر بیٹھ کر جانا چاہتا تھا۔ اِس طرح لوگ جو کچھ آپس میں باتیں کرتے تھے وہ تانگے کی دھک دھک میں مجھے نہایت بھاتی تھیں۔ ایک سامنے تانگہ موجود تھا، جس پر ابھی دو تین سواریاں موجود تھیں۔ مَیں سوچ رہا تھا اِس تانگے پر بیٹھ جاؤں لیکن جب تک پانچ سواریاں پوری نہیں ہوتیں یہیں چارپائی پر ہی بیٹھنا چاہتا تھا۔ یہاں ایک چھوٹا سا چائے کا ہوٹل ایک آدمی نے بنا رکھا تھا۔ یہ چائے اول تو اُن تانگے والوں کو سارا دن لالچ لگائے رکھتی تھی۔ ہر تانگے والے کی خواہش ہوتی تھی کہ سواریاں اُتار کر سب سے پہلے چائے کے ہوٹل کا رُخ کرے۔ اُدھر جیسے ہی کوئی تانگہ سواریوں سے بھرا ہوا وہاں رُکتا، کھوکھے والا چائے کی کیتلی آگ پر رکھ دیتا۔ مَیں نے چائے دیکھی تو خوشبو کے ساتھ چائے کی صورت نے میری اشتہا میں اضافہ کر دیا۔ مَیں گو اِسی گاؤں کا تھا مگر میرا

واسطہ اِس گاؤں سے کٹنے کے سبب یہاں کے زیادہ تر لوگ مجھے پہچانتے نہیں تھے مگر ایسا بھی نہیں تھا کہ کوئی جاننے والا ہی نہ ہو۔ اُنھی تانگے والوں میں ایک میرا اہم جماعت محبوب علی عُرف موبا بھی تھا۔ یہ ساتھ والے گاؤں میں رہتا تھا لیکن پھر اِسی اڈے پر تانگہ چلانے لگا۔ اِس نے کب تانگہ چلانا شروع کیا، مجھے اِس بارے میں معلوم نہیں۔ مجھے دیکھتے ہی موبا دوڑتا ہوا آگے بڑھا۔ موبے کا خیال تھا، ضامن علی بڑے بڑے شہروں میں رہنے کی وجہ سے بہت مالدار ہو گیا ہے اور سالم تانگہ کرنے کا سب سے پہلے حق اُسی کا ہے۔ ہم پوری پانچ جماعتیں مل کر پڑھے تھے۔ مَیں نے موبے کو اپنی طرف آتے دیکھا تو سمجھ گیا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ میرے پاس آ کر گلے لگا اور بولا، یار ضامنے تم تو پورے پردیسی ہو گئے ہو۔ مہینوں بعد ہی کبھی شام نماشی آتے ہو اور چلے جاتے ہو۔

موبے کیا کروں، مَیں اکیلا تو نہیں سارے زمانے کا سفر ہی شام کی طرف ہے۔ ہر ایک کو شام تو ہونا ہے۔

محبوب ہنستے ہوئے بولا، بھئی پہلے دن سے ہی تُو فلسفی قسم کا بندہ ہے۔ کبھی سیدھا جواب نہ دینا، اِسی وجہ سے ایک دن ماسٹر خالق صاحب نے تجھے اُلٹے دیس کا بنجارہ کہا تھا۔ ہمیں دیکھ، یہاں سے بیس میل سے آگے آج تک نہیں نکلے، پینتیس سال کا ہو گیا ہوں اور تیرے ہاں کا ہی ہوں مگر کوئی بھی رات گھر سے باہر نہیں کاٹی۔ چل آ بیٹھ باقی باتیں تانگے میں بیٹھ کر کرتے ہیں۔

موبے میرا تو آج دل کرتا تھا، سواریوں کے بھرے ٹانگے میں سفر کرتا، مَیں نے اپنی خواہش ظاہر کی۔

اچھا، ابھی بھی کنجوسیاں؟ کبھی یاروں کو چونی کا منافع نہ دینا۔ آ بیٹھ۔ اُس کے ساتھ ہی وہ اپنے ٹانگے کی طرف بڑھا۔ مَیں نے اُسے تانگے کی طرف بڑھتے دیکھ کر آواز دی، موبے ذرا ٹھہر جا، دو گھونٹ چائے پی لیں پھر تیرے تانگے پر چلتے ہیں۔

لے بھئی رشید میاں ہمیں دو کپ چائے بنا دے، ایک میرے لیے اور ایک موبے کے لیے۔

مَیں نے رشید چائے والے سے کہا۔

محبوب میری آواز سُن کر واپس پلٹ پڑا اور بولا، اچھا تو بابو بننے کے بعد اسلام آباد میں جب چائے کی صلح مارتے ہیں تو آس پاس کے یاروں کا خیال نہیں کرتے؟ میاں چائے پلانی ہے تو ہم سب کے لیے بنواؤ۔ پھر ہوٹل والے کی طرف مخاطب ہو کر، دس کپ پورے بنا بھئی شیدے۔

مَیں محبوب علی کی بات پر ہنس دیا، بھئی تیرا بھی کوئی جواب نہیں موبے، پہلے دن سے ہی تو لُٹ مار پر لگا ہے۔

ضا منے لُٹ مار ہم تانگے والے کیا کریں گے؟ ہمیں تو یہی پتا ہے، پورے دن ہم اور گھوڑا ایک ساتھ جُتیں گے تو پندرہ روپے بنیں گے۔ اِس میں بھی یہ سمجھ، تانگے میں گھوڑا نہیں کوچوان جُتا ہوتا ہے۔ اِس کے علاوہ تو روزی کمانے کا طریقہ ہمارے خیال میں بھی نہیں آیا۔ لُٹ مار تو بڑے شہروں والے پڑھے لکھے کرتے ہیں جن کے پاس پیسہ بنانے کے کئی طریقے ہیں اور تو اور بھائی سُنا ہے سوچنے کے بھی ہزاروں وصول کر لیتے ہیں۔ اب تُو اپنی ہی بتا، سُنا ہے ایک صفحہ لکھتا ہے اور لال نوٹ سے بھی زیادہ روپے لے لیتا ہے۔ اللہ جانے اب اُس میں کیا الہام لکھتا ہے۔ کچھ ہمیں بھی سکھا دے۔

مَیں موبے کی باتیں سُن کر شرمندہ سا ہو گیا۔ اِتنے میں سارے کوچوان آ گئے۔ آدھے چارپائی پر بیٹھ گئے اور آدھے اُسی لکڑی کی بینچ پر آ کر بیٹھ گئے جو کھوکھے کے پاس پڑی تھی۔ سب ایک دوسرے سے گپیں ہانکنے لگے۔ اُن میں سے ایک بنچ پر دو ایسے آدمی بیٹھے تھے جو مَیں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ نہ یہ ہمارے گاؤں کے تھے۔ اُن کی شکلیں بھی ایک طرح سے پُراسرار سی لگ رہی تھیں۔ دونوں کی عمریں کم و بیش چالیس اور پچاس کے درمیان تھیں۔ مَیں نے سرگوشی میں محبوب علی سے پوچھا، یہ دونوں کون ہیں؟ اُس نے نفی میں سر ہلا کر اپنی لاعلمی ظاہر کی، کہنے لگا یہ پچھلے دو گھنٹے سے یہیں بیٹھے ہیں اور کہتے ہیں کسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ کم سے کم چار چار کپ چائے بھی پی گئے ہیں۔ یہ کہہ کر اپنے کان میں پھنسی میل نکالنے لگا۔ اِتنے میں چائے تیار ہو گئی، شیدے نے چینی کی پیالیوں میں چائے ڈال کر سب کو پیش کی۔ یہ چینی کی پیالیاں نئی نئی آئی تھیں اور زیادہ اچھی نہیں تھیں بلکہ یوں سمجھ لیں پکی مٹی کے اوپر فقط شیشے کی تہہ لپیٹ دی گئی تھی۔ میں نے چائے کا گھونٹ لیا، چائے واقعی اچھی تھی۔ اسلام آباد کی چائے اِس کے مقابلے میں جعلی معلوم ہو رہی تھی۔ مَیں سوچنے لگا واقعی پوش شہروں میں اچھی چیزیں بھی اپنی فطرت بدل لیتی ہیں۔ شام کا سُرمئی دھندلکا ہو چکا تھا۔ مَیں نے قریباً چائے ختم کر لی تھی۔ اِتنے میں سواریوں سے بھرا ہوا تانگہ گاؤں کی طرف سے آیا اور رُک گیا۔ سواریاں تانگے سے اُتر کر کوچوان کو پیسے دینے لگیں۔ مَیں اُنھیں نظر انداز کر کے اُٹھ کھڑا ہوا اور خالی پیالی بینچ پر رکھ دی اور جیب سے پیسے نکالنے لگا۔

کتنے پیسے ہوئے شیدے بھائی؟

دس پیالیوں کے چار روپے ہو گئے، شیدے نے برتن سنبھالتے ہوئے جواب دیا۔

مَیں جیب سے پیسے نکال کر ایک ایک روپے کو گننے لگا اور ابھی پیسے گن ہی رہا تھا کہ محسوس ہوا کوئی یکدم ہلچل ہوئی ہے۔ مَیں نے اپنی نظریں سامنے اُٹھائیں۔ تمام کوچوان بھاگ کر دُور جا کھڑے ہوئے تھے اور وہ دونوں اجنبی اڈے پر نئے آنے والے تانگے کے پاس کھڑے ہو گئے تھے جو ابھی ابھی آ کر رُکا تھا اور جس میں سے سواریاں اُتر رہی تھیں۔ اب وہاں کوئی سواری نزدیک نہیں تھی، نہ کوئی کوچوان پاس تھا۔ اُن دو میں سے ایک آدمی نے کوچوان کے گریبان سے پکڑ کر رکھا تھا اور قریب ایک فٹ بھر لمبے خنجر سے اُس کے پیٹ میں وار کر رہا تھا۔ دوسرا آدمی پستول ہاتھ میں لے کر اردگرد کے لوگوں پر تانے ہوئے تھا تاکہ کوئی نزدیک نہ آئے۔ مَیں اِس پورے منظر کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ تو اچانک انتہائی ظالمانہ قتل کی واردات ہو گئی تھی اور مقتول کو بھرے مجمعے میں کوئی بچانے والا نہیں تھا۔ کوچوان کے پیٹ سے خون نکل کر تانگے میں بہنے لگا اور وہ اُلٹ کر سیٹ پر گر گیا تھا۔ اجنبی جب خنجروں کے وار کر چکا تو پستول والے آدمی نے اُس کے دل کے پاس نال رکھ کر فائر کر دیا۔ فائر کی آواز کے ساتھ ہی تانگے میں جُتا گھوڑا سرپٹ گاؤں کی طرف بھاگ اُٹھا۔ گھوڑے کے بھاگنے کے ساتھ ہی وہ دونوں چلتے ہوئے سڑک پر آ گئے۔ اتنے میں ایک دُور کھڑی ہوئی کار نے حرکت کی اور پاس آ کر رُک گئی دونوں اجنبی اُس کار میں بیٹھ گئے۔ جاتے ہوئے اُنھوں نے اِدھر اُدھر تین چار فائر اور کر دیے۔ مجھ سمیت وہاں کھڑے ہوئے کسی آدمی کی جرأت نہ ہوئی کہ آگے بڑھ کر اُنھیں روک لے۔ کار چلنے سے پہلے خنجر سے وار کرنے والے آدمی نے بولا، آج اِس سؤر سے ہم نے اپنے بھائی صفدر کا بدلہ لے لیا ہے۔

اوہ میرے خدایا، اچھا تو یہ تانگے والا وہی حامد تو نہیں تھا؟ مَیں نے موبے سے کہا جلدی اپنا تانگہ آگے کرو۔ یہ حادثہ اتنی جلدی اور اچانک ہوا تھا کہ کسی کی سمجھ کام نہیں کر رہی تھی۔ زخمی بلکہ مردہ کوچوان کو گھوڑا لے کر گاؤں کی طرف بھاگ گیا تھا۔ اُس کی لاش اپنے ہی تانگے کی سیٹ پر ٹیڑھی پڑی تھی جبکہ قاتل ایک پل میں اپنا کام ختم کر کے نکل چکے تھے اور وہاں محض ایک سناٹا چھوڑ گئے تھے جس کے اردگرد سواریاں، کوچوان اور مَیں خالی ذہن اور ساکت آنکھوں سے کھڑے تھے۔ چند لمحوں بعد مَیں نے محبوب علی کو دوبارہ آواز دی۔ وہ اپنے گھوڑے کی باگ لے کر میرے پاس آ گیا۔ مَیں حیرت زدہ قدموں سے اُس پر سوار ہو گیا۔ اِس کے بعد ہمارا تانگہ بھی گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ ہمارے پیچھے

تین چار تانگے مزید بغیر سواریوں کے گاؤں کی طرف دوڑ پڑے۔ راستے میں جب کچھ فاصلہ گزر گیا، تو محبوب علی نے سکوت توڑا، ضامنے یہ قصہ کیا ہے؟

پہلے یہ بتا کہ کیا اِس کوچوان کا نام حامد حیات تو نہیں ہے؟

ہاں وہی تو ہے، محبوب علی نے جواب دیا۔

اگر وہی ہے تو مجھے اِس قتل کا سبب سمجھ آ گیا ہے۔ مَیں نے کہا۔

کون سا سبب ہے، میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اچانک بچارے پر موت کی وحی نازل ہو گئی؟ تو بہ تلوار جتنا خنجر ظالموں نے اُس کے سینے پر مگدر کی طرح چلایا۔ محبوب نہایت پریشانی میں تھا۔

اِس نے بھی ایک آدمی کو قتل کر رکھا ہے اور خدا کی قدرت دیکھو اُس قتل کا بھی عینی شاہد مَیں ہی تھا، مَیں نے محبوب کو مزید حیران کر دیا۔

ہائیں، کیا مطلب؟ تجھے تو بیس سال ہو گئے گاؤں سے نکلے ہوئے اور جب سے مجھے پتا ہے یہ حامد یہیں تانگہ چلا رہا ہے۔ کسی بندے کا قتل تو کجا جانور تک کو اِس نے نہیں مارا۔

یہ بیس سال سے بھی پہلے کی باتیں ہیں موبے میاں۔ تیری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ اِس نے خود ایک آدمی کو مارا تھا اور وہ بھی خنجروں سے۔ اُس کا نام صفدر ہی تھا۔ یہ دونوں آدمی یا تو اُس کے بھائی ہیں یا اُس کے رشتے داروں میں سے ہیں۔ صفدر کے قتل کے بعد وہ گاؤں چھوڑ گئے تھے کیونکہ گاؤں میں رہ کر قتل کا بدلہ نہیں لے سکتے تھے اور مجھے بس یہ حیرت ہے اُنھوں نے اُس قتل کا بدلہ اِتنے عرصے بعد کیوں لیا؟

تُو اُس قتل کا گواہ کیسے ہے؟ محبوب نے پوچھا۔

کیونکہ میرے سامنے ہوا تھا؟ مَیں نے نہایت بے پروائی سے جواب دیا۔

یا اللہ، کیوں قتل کیا تھا؟

ایک خاتون کا چکر تھا۔

کون سی خاتون؟

تُو اُسے نہیں جانتا۔ یہ ایک الگ مسئلہ ہے جس کے پیچھے سیکڑوں داستانیں بیٹھی ہونک رہی تھیں۔ وہ مسئلہ صرف ہمارے ہی گاؤں میں پیدا ہوا تھا۔

اچھا تو یوں کہو۔ وہ عورت زندہ ہے؟ کیا تمھارے گاؤں میں ہی ہے؟ محبوب علی کی دلچسپی اُس

میں بڑھ گئی تھی۔

ہمارے گاؤں میں نہیں ہے اور اُس کے زندہ ہونے میں بھی کسی یقین کا دخل نہیں۔

مطلب آپ کو نہیں پتا وہ زندہ بھی ہے کہ نہیں؟

جی ہاں، میرے گاؤں کے کسی بھی فرد کو اِس بارے میں لاعلمی ہے۔

اِنھی باتوں کے دوران ہمارا تانگہ بھی گاؤں میں پہنچ گیا۔ جب ہم دونوں ہسپتال کے پاس پہنچے تو حامد کا تانگہ اُس کی لاش سمیت ہسپتال کے پھاٹک کے باہر کھڑا تھا۔ گاؤں کے پانچ دس بچے تانگے کے اردگرد کھڑے تھے، باقی آہستہ آہستہ جمع ہو رہے تھے۔ ہم دونوں بھی تانگے سے نیچے اُتر آئے۔ کوچوان مر چکا تھا۔ اُس کی آخری سانسیں ابھی ابھی ہی ختم ہوئی تھیں۔ مَیں حیران تھا گھوڑا اپنے مالک کو لے کر سیدھا ہسپتال کیسے پہنچ گیا تھا، اِسے کیسے خبر تھی زخمی کو ہسپتال کے پاس لے کر جاتے ہیں؟ یہ بات عین قرین قیاس تھی وہ گھوڑا اِس تانگے کے ذریعے کئی مریضوں اور بیماروں کو یہاں لاتا رہا ہو۔ معاملہ انتہائی تعجب خیز تھا۔ ایک گھوڑا اپنے مالک کو اکیلا چار کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے ہسپتال میں لے آیا تھا۔ اب وہ خاموش کھڑا جیسے مالک کی میت پر رو رہا ہو۔ مَیں اور محبوب علی نے یہاں آکر ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی۔ مَیں نے نیچے اُتر کر اُسے تین روپے دیے اور اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ تانگے کے اردگرد بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے، مجھے اِس تانگے کے پاس کھڑے ہوئے عین سامنے وہ جگہ نظر آ رہی تھی جہاں پر حامد حیات نے خنجر سے صفدر کا پیٹ چاک کر کے مار دیا تھا۔ دونوں حادثوں کا وقت ایک نہیں تھا اور نہ جگہ ایک تھی مگر دونوں کا ایک ہی گواہ ہونا نہایت عجیب بات تھی۔ سچ پوچھیں تو مَیں دل میں گھبرا گیا تھا۔ یہ وحشت اِس قدر مجھ پر حاوی ہوگئی کہ میرے جسم پر پسینا آ گیا۔ پچھلا قتل غالباً میری دس سال کی عمر میں ہوا تھا اور اب مَیں پینتیس برس کا ہو گیا تھا، مجھے پچیس برس کا زمانہ ایسے یاد آ گیا جیسے ابھی اُسی عمر میں پہنچ گیا ہوں۔ مَیں مقتول اور ہجوم کو چھوڑ کر آہستہ روی سے چلتا ہوا اُس جگہ آن کر کھڑا ہو گیا جہاں مَیں نے دونوں کو لڑتے دیکھا تھا۔ ایک دم حامد نے خنجر نکال کر صفدر کو پے در پے گھونپ دیے تھے۔ آج وہی قاتل اپنے تانگے کی پشت پر لیٹا اپنے مقتول کا ہم وطن ہو چکا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ جب مَیں نے یہ قتل دیکھا تھا تو بالکل سہم گیا تھا۔ اُس کے سبب مجھے کئی دن بخار بھی رہا تھا۔

مَیں نے پلٹ کر دوبارہ تانگے کو دیکھا۔ لوگ اُس کے اردگرد گھیرا ڈالنے لگے تھے۔ شاید تھوڑی دیر بعد وہاں رونے پیٹنے والی عورتیں بھی جمع ہو جاتیں۔ عورتوں کا رونا پیٹنا مجھے ہمیشہ سے ڈپریس کر دیتا

تھا۔ مَیں سوائے مجلس کے بین کو کبھی نہیں دیکھ سکتا۔ اِسی خوف سے مَیں جلد گھر کے دروازے پر پہنچ کر گھر میں داخل ہو گیا۔ جیسے ہی گھر میں داخل ہوا مجھے در و دیوار کی سوندھی خوشبو نے اپنے حصار میں لے لیا اور ایک لمحے کے لیے کچھ بھی یاد نہیں رہا کہ ابھی کوئی حادثہ رونما ہوا ہے۔ وہ شیشم کا درخت جو میرے گھر کی جنوبی دیوار کے ساتھ کھڑا تھا، ویسے ہی ہرا بھرا تھا۔ شام ہو چکی تھی اور شیشم کی ٹہنیاں بالکل خموش اور ساکت کسی سائے کے حصار میں تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی چھوٹے بھائی نے بھاگ کر استقبال کیا۔ مَیں اُس کے گلے لگ کر ملا پھر جلدی سے والد اور والدہ کی طرف بڑھا۔ وہ دونوں بھی اُٹھ کر گلے ملے اور سر پر ہاتھ پھیر کر دعائیں دینے لگے۔ اِسی اثنا میں باہر سے بین اور گریہ کی صدائیں آنا شروع ہو گئیں۔ مرنے والے کی عورتیں تانگے کے پاس پہنچ چکی تھیں۔

یہ کیسا شور ہے، خدا خیر کرے؟ والدہ نے رونے کی آواز سُن کر حیرانی ظاہر کی۔

اماں حامد حیات قتل ہو گیا ہے، مَیں نے والدہ کے استعجاب کو فوراً ہی دور کر دیا۔

ہائیں وہ کیسے؟ میرے والد نے حقے کی نَے فوراً ایک طرف رکھ دی اور چارپائی سے اپنا صافہ اُٹھا کر سر پر باندھنے لگا جیسے باہر جانے کے لیے لپکا ہو۔

ابا آپ بیٹھ جائیں، مَیں سب کچھ بتا دیتا ہوں باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مَیں نے والد کے ارادے کو بھانپ کر فوراً کہا۔ اِسے صفدر موچی کے بھائیوں نے قتل کیا ہے، تانگوں والے اڈے پر۔ وہ دو لوگ تھے اور مَیں وہیں تھا۔ میرے سامنے اُنھوں نے اُسے پہلے خنجر سے وار کیے، پھر دل پر فائر کیا اور چلے گئے اور جاتے ہوئے بتا گئے کہ یہ صفدر کے قتل کا بدلہ ہے۔

ہائے ہائے اور تُو نے صفدر کا قتل بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور کئی دن بخار میں تڑپا تھا، میری والدہ کسی گہری حیرانی سے بولی۔ یا اللہ میرے بیٹے پر رحم کرنا۔ والدہ نے ایک دم اپنی گود میں میرا سر لے لیا اور رونے لگی۔ مَیں جانتا تھا وہ کیوں رونے لگی تھی۔ یہ بات سب جانتے تھے یہ دونوں قتل ایک طرح سے زینت کی وجہ سے ہوئے تھے مگر میرا زینت کے ساتھ کیا لگاؤ تھا، میری ماں کے علاوہ آج تک کسی کو خبر نہیں تھی۔ اِسی لیے یہ خبر سُن کر وہ ایک دم لرز سی گئی۔ کچھ ثانیوں بعد بولی، ضامن علی تُو باہر نہ جانا، جائیں سب جہنم میں۔ عدیلہ کی بیٹی تو گاؤں میں ایک ڈائن آئی تھی، شکر ہے جلدی دفع ہو گئی، اللہ جانے کتنوں کا کلیجا کھاتی۔ پتا نہیں کہاں دھکے کھاتی ہو گی، مَیں تو اُسی دن جان گئی تھی جب فرح کے بیٹے کو لے بھاگی۔ اللہ نے اچھا کیا ہمارے سر سے بلا ٹلی۔ اُس کے ساتھ ہی والدہ نے دوبارہ اپنے سینے

کے ساتھ بھینچ لیا۔

والد صاحب وہیں چارپائی پر بیٹھے والدہ کا سب رونا دھونا دیکھ رہے تھے۔ اُنھیں شاید پہلے ہی والدہ نے بتا دیا تھا کہ اُن کا بیٹا صرف دس سال کی عمر میں ہی زینت کے ساتھ کیا معر کے سر کرنا چاہتا تھا اِس لیے وہ اِس وقت والدہ کی باتوں پر زیادہ حیران نہیں ہوئے تھے۔

فاطمہ نہیں آئی؟ مَیں نے اپنی چچا زاد بہن کے متعلق پوچھا جسے بھائی کے ساتھ دس سال پہلے بیاہ دیا گیا تھا اور وہ بھائی کے ساتھ لاہور ہی میں تھی۔ اب اُس کے تین بچے بھی تھے۔

آئی تھی، والدہ نے جواب دیا، پرسوں ہی گئی ہے۔ تیرے آنے کی خبر ہوتی تو دو دن اور روک لیتی۔ بچوں کے سکول کی فکر کھائی جاتی تھی اُسے، کہتی تھی پہلا سکول چھڑوا دیا ہے۔ وہاں پڑھائی کے نام پر صرف فیسیں وصول کی جا رہی تھیں۔ شروع میں ایک آدمی کی باتوں میں آ کر ایک پرائیویٹ سکول میں تینوں بچے داخل کر دیے تھے۔ اب وہاں سے ایک دوسرے بڑے انگریزی سکول میں بھیجے ہیں۔ وہاں اُس سے بھی زیادہ لُوٹ مار ہے۔ جتنے میں ایک خاندان پلتا ہے، اتنے میں اُن کے ایک بچے کی فیس ہے مگر جلد ہی اُسے سمجھ آ جائے گی۔ مَیں نے تو سو بار کہا، سرکاری سکول میں بھیج دو مگر اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔

کوئی مشورہ مجھ سے بھی لے لیتی؟ آج کل کی عورتوں نے ماڈرن بننے کے نام سے لٹیروں کو گھروں میں داخل کر لیا ہے۔ اگلے پچاس سال اِنھی سکولوں سے علم کے بونے اور لوٹ مار کی کمپنیاں نکلیں گی دیکھ لینا۔

تم سے کیا پوچھتی؟ کہتی ہے انگریزی آئے گی تو بچے افسر بنیں گے۔

ہاں یہ تو وہ ٹھیک کہتی ہے۔ مَیں نے کہا، اردو پڑھنے سے تو واقعی صرف بابو بنتے ہیں اور آج کل بابوؤں کی وہ عزت نہیں جو انگریز دور میں تھی۔

ہاں مجھے تو یہ سب سوکھے کنویں کے کیڑے لگتے ہیں۔ افسر سانپ ہیں اور بابو لوگ اُن کے انڈے بچے ہیں۔ پھر عزت کون کرے گا؟ نہ بابا جیسی اِن کم بختوں نے ہمارے ساتھ کی اللہ دشمن کو بھی اِن کی صحبت سے بچائے۔

میرا والد خموش بیٹھا ہماری باتیں سُن رہا تھا لیکن باہر جانے کے لیے بے چین تھا تا کہ قتل کے معمے

بیٹا تُو بیٹھ میں آتا ہوں، یہ کہہ کر بغیر جواب سنے باہر نکل گیا۔ جیسے ہی والد صاحب باہر نکلے، والدہ نے کہا، ضامن تجھے پتا ہے، دونوں زینت کی ماں اور والد نے کیا مصیبتیں سہی تھیں اور کیسے قتل ہوئے تھے؟ پچھلے مہینے اُس کا نواسا جیل سے نکل آیا۔ اب یہیں گاؤں کے مشرق میں جوابازوں کے ساتھ رہتا ہے۔ شکل دیکھو تو ٹی بی ہوگئی ہے۔

والدہ کے اِس انکشاف پر مَیں ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ رہا ہو گیا؟

تو اور کیا۔ پورے بیس سال بھگتا لیے۔ عمر قید ہوئی تھی اب وہ پوری ہوگئی۔

مگر آپ نے پہلے تو یہ بات نہیں بتائی۔ مَیں تو اُسے سزائے موت دیے بیٹھا تھا۔

لو اور سنو، مَیں نے تجھے ایک بار کہا تو تھا جج کو پیسے دے کر موت سے عمر قید میں بدلوا گیا ہے۔

وہ تو شکر ہے اس کے پاس پیسے زیادہ نہیں تھے ورنہ تو عمر قید سے بھی نکل جاتا۔

اِس کی پیروی کس نے کی تھی؟ حیرت ہے مَیں نے کبھی اِس کیس کے بارے میں دلچسپی کیوں نہ لی تھی۔ اب جب والدہ بتا رہی تھی تو مجھے بہت دُکھ ہوا۔

پیروی اِس کی ماں صفیہ نے کی تھی۔ وہ بچاری بھی پچھلے سال مرگئی۔ اُس کے دوسرے خاوند نے بھی اُسے طلاق دے دی تھی۔ تب وہ پاکپتن کے ایک گاؤں میں چلی گئی تھی۔ دریا کے پار ہی پڑ جاتا ہے۔ کوئی نام ہے اُس کا، وہیں چلی گئی تھی اور پچھلے سال مرگئی اور یہ لفنگا اِدھر بھونکتا پھرتا ہے۔

تجھے اُس کے مرنے کی خبر کس نے دی؟

یہی جیجاں نے دی تھی۔ والدہ عجیب راز کھول رہی تھی۔ وہ ایک دفعہ اُسے ملی تھی۔ اُس کی بیٹی کی شادی ساتھ والے کسی گاؤں میں ہوئی ہے۔ کہہ رہی تھی صفیہ کڑماں ماری بھی وہیں رہتی ہے۔ بچے اللہ جانے کہاں ہیں؟

امی جیجاں کو بلا کر اُس کا پتا تو کر کہ اُن کا صحیح گاؤں کون سا ہے، میں نے کہا۔

مَیں نے پتا کیا تھا، وہ کہتی تھی اصل گاؤں کا مجھے معلوم نہیں، مَیں تو اُسے شہر کے ایک بازار میں ملی تھی اور گاؤں کا نام بھی پوچھا تھا مگر بعد میں بھول گئی۔ پتا بتا دیتی تو شاید وہیں کہیں سے زینت کی خبر مل جاتی۔ اُس بُڑھی کڑماں ماری کی جون ہی انوکھی بنی ہے، بیٹا جو بھی اِن سے ذرا سا بندھا، سمجھو مصیبت میں پڑ گیا، اللہ جانے کون سا پاپ کیا ماں دھیوں نے۔

امی پاپ کیا کرنا تھا بیچاریوں نے، تیرے سامنے یہیں رہی تھیں۔ ایک تو کسی پر مصیبت آتی

ہے اوپر سے لوگ باتیں کرتے ہیں، بھلا یہ بتا ہم نے کیا پاپ کیے تھے جو چاروں طرف سے لٹ گئے؟
میری بات پر والدہ تھوڑی سی شرمندہ ہوئی اور بولی۔ خیر مَیں عدیلہ کو تو قصوروار نہیں کہتی البتہ زینت کا قصور ضرور ہے اُسی کی وجہ سے یہ چن چڑھے ہیں، دو بندے قتل ہو گئے، خود چھوکرے کے ساتھ بھاگ گئی، بچاری ڈاکٹرنی کا ایک ہی بیٹا تھا اُسے بھی لے ڈوبی اور خود نہ آگے کی رہی نہ پیچھے کی۔ اب پتا نہیں مر گئی ہے یا جیتی ہے۔ ہمیں اپنی امانت کے عذاب میں ڈال گئی ہے۔ وہ آگ کوٹھے کے صحن میں دبا کر اُس کی حفاظت کر رہی ہوں۔

ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ والد صاحب آ گئے، اُن کے ساتھ میرا چچا زاد بھائی اختر بھی داخل ہوا۔ یہ تینوں خموش اور افسردہ معلوم ہو رہے تھے۔ مَیں اُس قتل کے بارے میں فی الحال نہ تو کچھ سننا چاہتا تھا اور نہ وہ کچھ بول رہے تھے۔ چچا زاد بھائی کی بیوی ثمینہ ہمارے چولہے پر بیٹھی روٹیاں پکا رہی تھی۔ اب یہ گھر ایک قسم کا ایک ہی ہو گیا تھا۔ آج اُس نے گوارے کی پھلیاں پکا رکھی تھیں، گوارے کی پھلیاں مجھے ہمیشہ سے بہت مرغوب تھیں۔ تھوڑی دیر خموشی چھائی رہی۔ اُس کے بعد میرے والد نے سکوت توڑا، چھ وار خنجر کے لگے ہیں اور ایک فائر عین دل کے اُوپر ہوا ہے، بچارا موقع پر ہی مر گیا تھا۔ لاش پوسٹ مارٹم کے لیے شہر لے جائیں گے۔ یہاں تو ممکن نہیں ہے۔

جیسی کرنی ویسی بھرنی، والدہ نے لقمہ دیا، اِس نے کون سا اُس پر ترس کھایا تھا۔ خنجروں سے مارا تھا صفدرے کو اور پرچہ بھی نہیں ہونے دیا تھا، بچاروں کو گاؤں چھوڑنا پڑا تھا۔

اب تو اُن کا اتا پتا بھی نہیں کہاں رہتے ہیں اور کہاں نہیں۔

مَیں نے اِس پورے واقعے سے نکلنے کے لیے بات فوراً بدلی، ابا آپ کی آنکھوں کا آپریشن کرانا ہے، کل تیار ہو جائیں۔ اِسی ہفتے آپریشن ضروری ہے۔

کیوں، کوئی خزانہ ہاتھ آ گیا ہے؟ میری آنکھوں کا گزارا ہو ہی رہا تھا۔ ایسے تھوڑا سایہ اور جالا سا ہے۔ باقی تو سب خیر ہے۔ والد نے گویا مجھے تسلی دے کر فارغ کر دینا چاہا۔

ہاں سایہ سا ہے اور کل کہنا دنیا اندھیر ہو گئی ہے۔ مَیں نے والد کو گویا اِس بات پر ڈانٹ ہی پلا دی۔ جب تک خزانہ ہاتھ نہ لگے تو علاج کرانا جرم ہے؟ آنکھوں سے جہان ہے۔ مَیں نے آپ کے ہاتھ کتاب کے بغیر نہیں دیکھے تھے۔ اب دروازہ پار کرتے بھی پہلے آگے ہاتھ لے جاتے ہو کہ دروازے کو چھو لے۔

وہ تو ٹھیک ہے بیٹا، لیکن تُو کون سا اسلام آباد میں سیکرٹری لگ گیا ہے۔ دہاڑی مزدوری میں مہنگے علاج نہیں ہوتے۔ تیرے سامنے ہی ڈاکٹر نے کافی سارے پیسے بتادیے تھے۔

اُن کا بندوبست کر کے ہی آیا ہوں، مَیں نے دوبارہ بات پر زور دیا۔ کل صبح تیار ہو جائیں۔ شاید لاہور جانا پڑ جائے، یہاں سفید موتیے کا علاج نہ ہو۔

مَیں جب یہ بات کر رہا تھا تو والدہ ایسے تشکر سے مجھے دیکھ رہی تھی جیسے واقعی خزانہ لے کر نازل ہوا تھا۔ اُسی کے ساتھ مَیں نے اپنی جیب سے سو روپے کے نئے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور والدہ کی جھولی میں ڈال دی۔ مَیں نے جب بھی کہیں سے کچھ کمایا، والد کی بجائے ہمیشہ والدہ کی جھولی میں رکھا۔ اتنے سارے پیسے اُس نے پہلی بار زندگی میں دیکھے تھے۔ والد بھی پیسے دیکھ کر حیران ہو گیا۔ ضامن یہ تو بہت سارے پیسے ہیں؟ میرا والد اور والدہ ایک دم بولے۔

جی ہاں اور یہ سب آپ ہی کے لیے ہیں۔ مَیں نے ہنس کر کہا۔

دیکھ لینا کوئی بُرا کام تو اللہ نہ کرے شروع نہیں کر دیا۔ والدہ نے خوف زدہ ہو کر کہا۔

اماں تجھے مجھ پر یقین نہیں، کبھی پہلے کوئی شکایت آئی ہے؟ یہ میری محنت کی اور حق حلال کی کمائی ہے۔

لیکن اتنے پیسے تو سال بھر مزدوری کرنے سے بھی نہیں ملتے۔ اب کے والد نے کہا۔

یہ مزدوری لکھنے پڑھنے کی ہے۔ مَیں نے جواب دیا، کسی کو کچھ لکھ کر دیا تھا۔ اُس کے پیسے ملے ہیں۔ کافی عرصے سے اَٹکے ہوئے تھے۔

لکھنے کی اتنی کمائی ہے تو اپنے بھائی کو اِسی کام پر لگا دے۔ ثمینہ نے علی اختر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

یہ کبوتر اُڑا لے، یہی کافی ہے، مَیں نے جواب دیا۔ نہ یہ کلرکوں کا کام ہے۔ یہ بس اور طرح کا حساب کتاب ہے۔

(۵۸)

طویل سفر نے مجھ پر تھکاوٹ کا اثر کیا تھا۔ اب کھانا کھا لینے کے بعد کسلمندی بڑھ گئی تھی اور مکمل غنودگی کا عالم ہو گیا تھا۔ مَیں چارپائی پر لیٹ گیا۔ جلد ہی نیند نے ایسے سنبھال لیا جیسے موت زندگی کو سنبھال لیتی ہے۔ آنکھ کھلی تو صبح کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ تھکاوٹ کے باعث نیند نے ایک لمحے کے لیے بھی کسی وجود کا احساس نہیں ہونے دیا۔ ایک وقت تھا جب اذان ہوتے ہی والدہ کان سے پکڑ کر اُٹھا دیتی تھی اور زبردستی مسجد میں بھیج دیا کرتی تھی لیکن آج والدہ نے نہ تو آواز دی اور نہ خود ہی تیز قدموں سے چلی۔ یہ ایک عجیب سی بات تھی بچپن میں ہر ماں کو اپنے بچے کی عاقبت اور عبادات کی بہت فکر ہوتی ہے لیکن وہی ماں اُس وقت عبادت سے بے نیاز ہو جاتی ہے جب وہ جوان ہو کر کسی معاشی مصروفیات کا حصہ بن جاتا ہے۔ اُسے اُس وقت نہ تو اُس کی مذہبی عاقبت کے خراب ہونے کا خوف ہوتا ہے، نہ وہ ایک لمحے کے لیے بھی اپنے بیٹے کے وجود کو بے چینی میں برداشت کر سکتی ہے۔

اگلے دن مَیں نے اپنے والد کو تانگے پر بٹھایا اور شہر کے بڑے ڈاکٹر کے ہاں لے گیا مگر اِس سے پہلے ہم سید فطرس شاہ کے مطب پر گئے جہاں سے میرے والد صاحب آنکھوں کی طاقت کی بحالی کی دوائیاں کھا رہے تھے۔ حکیم صاحب بھی والد کو آپریشن کا مشورہ دے چکے تھے مگر اپنی سی کوشش بھی کیے جا رہے تھے۔ حاجی فطرس صاحب اپنے مریضوں میں شدید طرح سے مصروف تھے۔ چنانچہ ہم اُنھیں تنگ نہ کرنے کے لیے وہاں سے جلد رخصت ہوئے اور ڈاکٹر امتیاز کے پاس آ گئے۔ ڈاکٹر امتیاز

اِس شہر میں واحد ڈاکٹر تھا جس پر بھروسا کیا جا سکتا تھا۔ اُس کا کلینک سو پچاس لوگوں سے ہر وقت بھرا رہتا تھا۔ یوں تو شہر میں ایک مفت ہسپتال بھی قائم ہو چکا تھا جو آنکھوں کے آپریشن کے لیے بہت اچھا اور سستا تھا مگر اب مَیں کسی قسم کا رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ میری والدہ نے مجھے دعائیں دے کر رخصت کیا تھا۔ ہم بارہ بجے کے قریب ہسپتال پہنچے چیکنگ کے وقت کی فیس ادا کی اور بیٹھ گئے۔ تین بجے کے قریب ہماری باری آئی۔ ڈاکٹر نے پندرہ منٹ چیک کرنے میں صرف کیے اور آخر کار آپریشن کا وقت دے دیا۔ یہ آپریشن اُسی کلینک میں نہیں ہونا تھا۔ لاہور میں کیا جانا تھا۔ آپ یہ سمجھ لیں اِس شہر میں گویا یہ ایک فرنچائز تھی جس کے مریض یہاں سے آگے بھیجے جاتے تھے لیکن اِس میں سہولت یہ تھی کہ مریضوں کو وقت لینے کے لیے لاہور نہ جانا پڑتا تھا۔ ڈاکٹر والد صاحب کی آنکھوں کے ٹیسٹ کے دوران مسلسل باتیں کرتا رہا۔ کچھ باتیں اُن کی آنکھوں کے متعلق تھیں اور کچھ ایسے ملکی حالات کے بارے تھیں جنھیں نہ ڈاکٹر جانتا تھا، نہ میرے والد صاحب۔

بابا جی یہ آنکھوں پہ سایہ کب سے لہریں مار رہا ہے؟

چھ مہینے تو ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹر نے کہا تھا سفید موتیا اُتر رہا ہے، جلدی آپریشن کروا لو، مگر غریبوں کے پاس علاج کے پیسے تب آتے ہیں جب اُسے میت کے لیے چاہیے ہوتے ہیں۔ آپ یہ سمجھ لیں ڈاکٹر صاحب اگر غریب نے مرنا ہو تو دو سال پہلے کفن کا بندوبست شروع کر دے۔

ڈاکٹر والد صاحب کی بات سُن کر ہنس پڑا لیکن بابا جی غریب کو کیسے پتا چلے گا کہ وہ دو سال بعد مر جائے گا؟

لو ڈاکٹر صاحب یہ پتا چلانا مشکل تھوڑی ہے؟ اگر غریب کی مرنے کی خواہش ہو اور چاہے کہ دو سال بعد زندہ نہیں رہنا چاہتا تو ایک طرف آپ جیسے ڈاکٹر سے چیک اپ شروع کروا دے، دوسری طرف کفن کا بندوبست شروع کر دے۔ چھ چھ مہینے بعد تین چار دفعہ آ کر چیک کرائے۔ اِدھر سے کفن دفن کا خرچ پورا ہو جائے گا اُدھر سے ڈاکٹر کی ڈاکٹری پوری ہو جائے گی۔

میرے والد کا مذاق سُن کر ڈاکٹر کو ایک دم ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ بزرگو آپ بھی کمال ہیں۔ آپ کا علاج تو مفت ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر صاحب میرا علاج مفت نہ کریں، بس ٹھیک کریں۔ علاج ٹھیک ہو گیا تو مَیں اُسے مفت ہی سمجھوں گا۔

اب کے ڈاکٹر نے میری طرف منہ کیا اور بولا، ضامن صاحب، آپ کے والد میں ایک دم پورا انسان زندہ ہے۔ جس جگہ حسِ مزاح کے ساتھ سنجیدگی جمع ہو جائے وہاں ولایت دو قدم رہ جاتی ہے۔

اب مجھے ایک جملہ سوجھا، ڈاکٹر صاحب، حسِ مزاح ہی تو سنجیدگی کی نقیب ہے۔ غیر سنجیدہ انسان کبھی پُرمزاح نہیں ہو سکتا۔

ڈاکٹر نے دوبارہ روئے سخن والد صاحب کی طرف پھیرا، بزرگو مُلکی سیاست کے بارے میں کیا کہتے ہیں آپ؟ ہمارے وزیرِ دفاع نے راجیو گاندھی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُسے للکارا ہے۔

میاں پہلے اِن دفاع والوں کی آنکھیں اور باقی اعضا اپنے اندر سے تو نکال لو جو وہ پچھلے پچاس سال سے ڈال کے بیٹھے ہوئے ہیں اور کسی طرح نکالنے پر آمادہ نہیں ہو رہے۔ پھر راجیو کی آنکھوں میں ڈالی گئی آنکھوں پر خوش ہو لینا۔ ڈاکٹر صاحب ہم وہ یتیم کے بچے ہیں جن کی سوتیلی ماں اپنے سگے بچے کو سزا دینے کے لیے ہمیں استعمال کرتی ہے۔

وہ کیسے؟ ڈاکٹر والد صاحب کی باتوں سے مزا لینے لگا تھا اور مَیں حیران تھا مَیں نے آج پہلی بار اُن کی حسِ مزاح کو دیکھا تھا۔

وہ ایسے کہ سگے بیٹے کو ڈرانے کے لیے سوتیلے کو چپتیں لگاتی ہے۔ باقی مجھے اِس سیاست سے کوئی لینا دینا نہیں جہاں دماغ کی بجائے صرف آنکھوں سے کام چلایا جائے۔ بعضوں کی آنکھیں نکالی جائیں اور بعضوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالی جائیں۔ اِدھر میری تو اپنی آنکھیں اب کہیں ڈالنے کے قابل نہیں رہیں۔ باقی رہے ہمارے وزیر دفاع صاحب، تو میاں فی الحال اُسے آنکھیں چھپانا چاہییں۔ آپ اچھے آنکھوں کے ڈاکٹر ہیں؟ ضامن تُو مجھے کہاں لے آیا ہے بیٹے۔

والد صاحب کی اِس بات پر ڈاکٹر اور مَیں دونوں ایک ساتھ قہقہہ مار کر ہنس دیے۔

ڈاکٹر اِسی طرح کی باتوں سے محظوظ ہوتا رہا اور آخر اُسے احساس ہوا کہ وقت کافی گزر چکا ہے اور مریضوں کی ایک لمبی قطار ابھی اُس کے کلینک کے باہر لگی ہوئی ہے۔ اُس نے والد صاحب کو کچھ گولیاں اور ڈراپس دیے اور کہا ایک ہفتہ یہ کھاؤ اور اگلے سوموار کو لاہور جا کر مال روڈ پر نعیم ویو آئی ہاسپٹل سے آپریشن کروا لو۔ آپ کا وقت طے ہو گیا ہے۔ ٹھیک دو بجے وہاں پہنچ کر ریسپشن پر یہ پرچی دکھا دینا۔ ان شاء اللہ اچھے نتائج نکلیں گے۔ آپ اپنے آپریشن کی فیس پچیس سو روپے ابھی جمع کروا دیں۔

پچیس سو کا نام سُن کر والد ڈاکٹر کا منہ دیکھنے لگا۔ ڈاکٹر صاحب، اتنا قہر؟ ابھی تو آپ مفت علاج کرنے کی باتیں کر رہے تھے۔ پچھلے مہینے ڈاکٹر صادق کو دکھایا تھا۔ وہ یہی کام ایک ہزار میں کر رہا تھا۔

باباجی شہر میں آدھے حافظ ڈاکٹر صادق کے ہی بنائے ہوئے ہیں۔ آپ کا علاج یہاں نہیں لاہور کے جدید ہسپتال میں ہونا ہے اور وہاں کی فیس یہی ہے، آپ سے کچھ زیادہ نہیں لیے۔

پھر اس سے پہلے کہ میرے والد کچھ اور بات کرتے، میں نے اپنی جیب سے پچیس سو روپے نکال کر ڈاکٹر کے حوالے کر دیے اور کہا، دیکھیے ڈاکٹر صاحب، اِن کو تو جرح کی عادت ہے، آپ بس انھیں فون کر دیں۔ ایسا کام نہ کریں جس میں رسک کی ذرا بھی گنجائش ہو۔ دوسری بات یہ کہ انھیں لے کر میرا بھائی جائے گا، مَیں کل اسلام آباد روانہ ہو جاؤں گا۔

آپ فکر نہ کریں جناب، اِن جیسے بندے کی آنکھیں دنیا پر ہمیشہ کھلی رہنی چاہییں۔ اگر یہ اکیلے بھی چلے جائیں گے تو پھر بھی وہی کچھ ہو گا۔ لیکن کسی کا ساتھ جانا بہرحال اچھا تھا۔ علاج تو ڈاکٹر نے ہی کرنا ہے لیکن آپریشن کے بعد اِن کو لے کر واپس آنا ایک مسئلہ ضرور ہے۔ ان شاءاللہ آپریشن کے ایک ہفتے بعد پٹی کھلے گی تو اِن کی آنکھیں باز کی طرح دیکھیں گی۔

ڈاکٹر کے کلینک سے نکل کر ہم دونوں گھر روانہ ہونے کے لیے تانگوں والے اڈے پر آ گئے۔ ویسے تو شہر سے گاؤں جانے کے لیے ایک بس بھی لے سکتے تھے لیکن یہ بس رابطہ سڑک اڈہ پر اُتار کر آگے نکل جاتی تھی۔ یہاں سے پھر تانگے پر بیٹھ کر چار کلومیٹر سفر کرنا پڑتا تھا۔ اِس سے بہتر تھا شہر سے ہی اُس تانگے پر بیٹھیں جو گاؤں میں لے جا کر چھوڑے۔ تانگوں والا اڈہ ہارنیاں والا چوک میں تھا۔ چھوٹا سا اڈہ تھا جہاں بیس سے پچیس تانگے ہر وقت موجود رہا کرتے تھے۔ تانگے شہر کے چاروں اطراف کے چھوٹے بڑے گاؤں سے آتے تھے۔ اڈے کے سامنے چارپائیوں کے بان، حقے کی نیچے بنانے والوں کی دکانیں اور فالودے اور ربڑی کی دکانیں تھیں۔ دولھوں کے ہار اور بینڈ باجوں کی دکانیں بھی اسی بازار میں تھیں۔ یہ بازار کافی کھلا تھا اور درختوں سے بھرا ہوا تھا، دور تک ٹاہلی اور پیپل کے درخت لائنوں میں دونوں طرف موجود تھے اور گہرا سایہ کیے رکھتے تھے۔ مجھے یہ بازار ہمیشہ سے بہت اچھا لگتا تھا۔ اِس کے آخری کونے پر بینک کی ایک شاخ کھلی تھی اور پہلے کونے پر سرور سوڈا واٹر کی دکانیں تھیں۔ ہارنیاں والا چوک میں تانگوں کے اڈے کے سامنے سے ہی ایک بازار گول چوک کی طرف نکلتا تھا۔ یہ بہت کھلا بازار تھا۔ اگر شہر کا سب سے کھلا بازار کہیں تو وہ یہی تھا اور مرکزی بھی تھا۔ اِس کے آخر میں جا

کر وہی گول مسجد آتی تھی جو اگرچہ پورے شہر کی سانجھی مسجد تھی مگر آج کل حکومت کی اشیر باد سے اس پر ایک خاص مکتبہ فکر نے اپنا قبضہ جما لیا تھا۔ اِس مسجد کے چاروں طرف بے شمار دکانیں تھیں۔ وہ سب کی سب دکانیں کپڑے، سٹیشنری اور مختلف اشیا بیچنے والوں کی تھیں اور بہت مصروف رہتی تھیں۔ اُن کی ساری آمدنی مسجد کی انتظامیہ کے پاس جمع ہوتی تھی اور اُس سے آگے اُن میں سے حصہ بخرہ کر کے کچھ انتظامیہ کی روٹی روزی کا سامان بنتا تھا اور کچھ عسکری تنظیموں کے لیے وقف کی جاتی تھی۔ یہاں ہمیں یاد آیا کچھ سامان لے لینا چاہیے۔ مَیں اپنی والدہ، بھائی اور بھابی کے لیے یہاں سے کچھ لینا چاہتا تھا۔ والد صاحب کے ساتھ تھوڑی دیر کے لیے یہاں رُک گیا۔ گول مسجد کی ایک کپڑے کی دُکان پر پہنچ کر مَیں نے چاہا پہلے والد صاحب کی گرم چادر اور دوسرا سامان خرید لوں، اُس کے بعد حبیب علی کی دکان پر جا کر اُس سے سب کے لیے کپڑا خریدوں گا اور اُس سے مل بھی لوں گا۔ ایک لڑکا آگے بڑھ کر چادریں دکھانے لگا۔ یہ گرم چادروں کی دُکان دوسری دُکانوں سے زیادہ بہتر تھی اور کپڑا ابھی اچھا تھا۔ مَیں نے تمام چادروں کا بھاؤ تاؤ کر کے چھ سو روپے کے قریب خریداری کر لی اور چلنے لگا۔ اُسی لمحے ایک لڑکے نے آ کر میرا ہاتھ تھام لیا اور بولا، بھائی صاحب، آپ کو جاوید ساقی صاحب بلا رہے ہیں۔ مَیں ایک دم ٹھٹھکا۔ ذرا سامنے دیکھا تو ایک دکان پر ایک دبلا پتلا آدمی بیٹھا ایک عورت سے کپڑے کا بھاؤ کر رہا تھا۔ مَیں اپنے والد کے ہمراہ اُس کی دُکان کے تھڑے پر آیا تو ایک دم حیران ہوا، یہ تو وہی جاوید کامریڈ تھا۔ ہم دونوں نے ایک دم پرجوش طریقے سے ایک دوسرے کو گلے لگایا۔

آؤ اوپر آؤ، جاوید ساقی نے میرا ہاتھ پکڑ کر تخت پر بیٹھنے کے لیے کہا۔

مَیں تھڑے پر بیٹھ گیا۔ میرے والد صاحب ابھی تک وہیں نیچے کھڑے تھے۔

جاوید ساقی اُنھیں دیکھ کر بولا، بابا جی؟

جی ہاں، میرے والد ہیں، ابا جی اوپر آ جائیں، مَیں نے اُن کے لیے جگہ چھوڑ دی۔

آئیے چاچا جی اِدھر بیٹھیں۔ جاوید ساقی نے اُنھیں دعوت دی۔

نہیں آپ بیٹھو، مَیں ذرا حقّے کا نیچہ بند دیکھ لوں۔

ابا جی بیٹھ جائیں ہم دونوں اکٹھے ہی اُدھر چلیں گے۔ وہیں سے تانگے پر بیٹھ کر گھر چلے جائیں گے۔

اچھا تو آپ نے بھی کپڑے کی دُکان بنا لی ہے۔ اچھی چلتی ہے؟ مَیں نے ذرا طنز سے پوچھا۔

اچھی ہے، دال روٹی چلی جاتی ہے۔ کپڑا خرید لیا ہے؟

ابھی نہیں خریدا۔ یہ گرم چادریں لی ہیں۔ میرا خیال ہے تم روس والوں نے یہ نہیں رکھیں، مَیں نے ہنس کر کہا۔

میری اِس بات پر جاوید ساقی بھی ہنس دیا اور اِسی اثنا میں اپنے ملازم سے بولا، بیٹے ذرا چھامی چائے والے کو تین دودھ پتی اچھی سی بول دے۔

کامریڈ کچھ عرصہ آپ کے آرٹیکلز کی تو دھوم مچی ہوئی تھی۔ ہمیں تو شروع سے ہی اندازہ تھا۔ وقت نے خوب نکھار دیا ہے۔ شگفتہ پن بھی ہے اور متانت بھی ہے۔ ورنہ لوگ لاؤڈ ہو جاتے ہیں۔

بس میاں آپ کامریڈوں ہی سے سیکھا ہے سب کچھ، مَیں نے ہنس کر کہا۔ آپ لوگوں کی طرف دیکھتا تھا، جو کچھ آپ لوگ کہتے تھے ویسا کہنے اور لکھنے سے پرہیز کرتا تھا۔ اِس لیے لاؤڈ ہونے سے بچ گیا۔ ورنہ نعرے رہ جاتے اور تحریر مر جاتی۔ نہ تم ملتے نہ یہ دھندا سوجھتا۔

چھوڑ یار، ہمیں مت چھیڑ۔ لیکن ایک بات آج بھی کہوں گا، ہماری سوسائٹی نے تجھے عقل کے پہیے ضرور لگائے تھے ورنہ گاؤں کا بیل ہی رہتا۔ جاوید ساقی نے اپنا حق جتایا۔

یہ تو ہے، مگر یہ کوئی کوئی ہوتا ہے۔ کہیں سے ایک کرن ہاتھ آئی۔ اُسے کمند بنایا اور سورج کے قلعہ پر چڑھ بیٹھا۔ اِس میں واقعی آپ کا ہاتھ ضرور ہے۔

بابا جی کویت سے آ گئے تھے؟ جاوید نے ابا جی کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

ہاں آنا ہی تھا، مَیں ہنس کر بولا، اِن کی ساری کمائی تو آپ کا انقلاب کھا گیا۔

انقلاب تو کامریڈ سب کو کھا گیا، جاوید تلخی سے ہنسا۔ سارے برباد ہو گئے۔ تو اچھا رہ گیا یہاں سے نکل گیا۔ کسی کام دھندے تو لگا۔ اِدھر ہمارا مارکسزم اور کمیونزم ہمارے ہی پچھواڑے میں گھس گیا۔

وہ کیسے؟ مَیں جاوید کی تلخ ہنسی کو بھانپ گیا۔

وہ ایسے کہ سب لوگ یہاں تنظیم کے انقلاب کے سہارے بیٹھے تھے۔ وہ تو نہ آیا اور جرنیل صاحب آ گئے۔ اُس کے بعد اکثر ڈپریشن میں چلے گئے۔ کامریڈ ایچ اے صاحب کو کینسر ہو گیا۔ بھوک اور کینسر دونوں کی پٹڑی میں دب کے کچھ ہی دنوں تڑپتا رہا اور مر گیا۔ کامریڈ راؤ نزاکت ہیروئن پہ لگ گیا۔ ایک دن گھوڑے شاہ قبرستان کی بارش سے ٹوٹی ہوئی ایک قبر میں مردہ پڑا ملا۔ لوگوں نے وہیں اُس پر مٹی ڈال دی۔ اللہ جانے اُس قبر میں پہلے کسی مولوی کی ہڈیاں تھیں یا پیر فقیر کی۔ کامریڈ وحید بٹ

کی ریلوے کی نوکری چلی گئی تھی۔ اُس کے بعد وہ بھی چرس کے سوٹوں میں بہہ گیا۔ ایک دن مَیں نے دیکھا ہاتھ میں تسبیح اور سر پر ٹوپی پہنے ایک مسجد میں داخل ہو رہا تھا۔ مجھ سے ہاتھ بھی نہیں ملایا، بولا بھائی یہ انقلاب کے چونچلے اُس وقت تک ہیں جب تک کھانے کو روٹی ملتی ہے۔ سمجھ تب آتی ہے جب نوکری چلی جائے۔ تمھارے بے تکلے بکواس کے پھڈے نے میری چلی چلائی اچھی بھلی نوکری کھالی۔ بڑی مشکل سے بھوکی مرتی بیوی نے اپنے پیر بھائی کے ترلے کر کے ڈاک کے محکمے میں دوبارہ پھنسایا۔ اب میری توبہ ایسی خرافات کا گھٹڑ اُٹھاؤں۔ میاں پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہوں اور بے نمازوں سے دس کوس دُور رہتا ہوں۔ کامریڈ یوسف باؤزر رانا صاحب کے باغیچے دیکھتا ہے اور رانا صاحب اللہ والی بستی چلے گئے۔ کامریڈ عبدالرحمٰن کو ایک دوائیوں کی فیکٹری میں نوکری مل گئی شیخ عبدالکرام کے ہاں۔ اب وہ اُس کا مارکیٹنگ منیجر ہے اور اچھا کما لیتا ہے، حج بھی کر آیا ہے۔ رانا عابد نے ویسے ہی زمین اپنی بیٹیوں کے نام لگا دی ہے۔ اپنے بھتیجے بھانجوں کا حصہ اُنھیں نہیں دیا، کہتا ہے بیٹیاں میری ہیں، زمین بھی میری ہے، یہ بھتیجے کون ہوتے ہیں۔ سب زمین میری بیٹیوں کو جائے گی۔ ہمارے انقلاب کا یہ نتیجہ نکلا ہے میاں ضامن۔

چلو خیر آہستہ آہستہ یہی کچھ انجام ہونا تھا، اب اپنی سناؤ، مَیں نے سنجیدگی سے کہا۔ سب کی داستان واقعی دلگداز تھی اور اب یہاں مذاق کرنا مناسب نہ تھا۔

مجھے تو دیکھ ہی رہے ہو۔ چھوٹے بھائی کو درزی بنوا دیا ہے۔ وہ موری بازار میں سلائی مشین لے کر بیٹھ گیا ہے۔ پانچ چھ اُس کے شاگرد ہو گئے ہیں۔ مَیں نے کپڑے کی دکان بنا لی ہے۔ صبح اُٹھ کر دکان پر چلا جاتا ہوں، شام آٹھ بجے ٹیوشن پڑھاتا ہوں۔ چاروں بچے جوان ہو گئے ہیں۔ گھر پر علَم لگا لیا ہے اور باقاعدہ مجلس سنتا ہوں۔ اِس بار زندگی رہی تو چہلم پر ماتم بھی کروں گا، زنجیر زنی کی ہمت نہیں۔ بھئی کچھ نہ سہی اپنے اجداد تو تھے۔

کافی دیر ہو گئی تھی۔ چائے پینے کے بعد مَیں نے دل میں خیال کیا کیوں نہ حبیب علی کی بجائے آج جاوید ساقی عرف کامریڈ سے کپڑا خرید لیا جائے۔ یہ نہ کہے مفت میں چائے پی کر روانہ ہو گیا۔ ویسے بھی جب کوئی انقلابی اپنے نظریے میں بُری طرح شکست کھاتا ہے تو وہ مادی طور پر بہت حساس ہو جاتا ہے۔ پھر اُسے اپنا پائی بھر کا نقصان برداشت نہیں ہوتا۔ مَیں نے ایسا خیال کرتے ہی کپڑے کے دو تھان کی طرف اشارہ کیا، جاوید یار یہ دو تھان ذرا مجھے دے دو، بہت عمدہ کپڑا ہے۔ کیا بھاؤ ہے؟

چھوٹے یہ تھان اُتار دے، بھاؤ تم سے کیا کرنا ہے کامریڈ۔

تھان اُتروا کر مَیں نے پانچ سو روپے جاوید ساقی کے ہاتھ میں دے دیے، لیجیے۔ یہ پیسے رکھیں۔

یہ زیادہ ہیں بقایا لے لیں۔

بقایا میری بھابی کو دے دینا، اچھا پھر ملتے ہیں، یہ کہہ کر ہم وہاں سے نکل پڑے۔

کل آؤ نا شام بیٹھتے ہیں راؤ عاطف کے ہاں۔ جاوید نے پیچھے سے آواز دی۔

نہیں مَیں اسلام آباد جا رہا ہوں، ایک مہینے بعد آؤں گا۔

ہم دونوں وہاں سے نکلے اور تانگوں والے اڈے میں آ گئے اور شام تک گاؤں پہنچ گئے۔

(۵۹)

اگلے دن شام پانچ بجے مَیں اسلام آباد پہنچ گیا۔ اسلام آباد اب مجھے اچھا لگنے لگا تھا۔ شاید کوئی وجہ تھی یا آب و ہوا کا اثر تھا۔ اب میری جیب میں اتنے پیسے تھے کہ دو تین مہینے آرام سے ڈھنگ کا کام ڈھونڈ سکتا تھا۔ یہ بھی سوچ لیا تھا اگر دوبارہ عبادت علی کا سکرپٹ لکھنا پڑے تو اُس سے بھی گریز نہ کروں گا۔ اِس شام مَیں بہت تھکا ہوا تھا۔ ریل کے سفر نے آٹھ گھنٹے لگا دیے تھے۔ راولپنڈی اسٹیشن سے ایک ویگن پر بیٹھ کر فیض آباد سے ہوتا ہوا آب پارہ آیا اور یہاں سے پیدل میلوڈی سے ہوتے ہوئے ایف سکس کی راہ لی۔ کم و بیش ایک گھنٹے بعد کہسار مارکیٹ کے پہلو میں موجود اُس فلیٹ میں پہنچ گیا جو کچھ دن پہلے میرے تصرف میں آیا تھا۔ مَیں آب پارہ سے پیدل نہ چلتا مگر موسم کی خوشگواری نے دامن میں اُٹھائے رکھا۔ فلیٹ پر پہنچ کر سیدھا اُس بیڈ پر گر گیا جسے اُس طویل محنت کے سہارے حاصل کیا تھا جو عام آدمی کو ہلاک کر دینے والی تھی۔ بیڈ پر گرتے ہی نیند نے آلیا۔

مجھے نہیں خبر کتنی دیر سویا رہا البتہ بیچ میں کہیں کہیں کروٹ بدلنے کی خبر مجھے تھی اور اِس میں کئی مرتبہ مَیں نے اپنے سرہانے کو ایک طرف سے دوسری طرف پھیرا تھا۔ اِس کا مطلب تھا اب کم و بیش نیند پوری ہو چکی تھی مگر رات ابھی باقی تھی۔ اُسی لمحے میرے کان میں ایسی آواز آئی جس سے احساس ہوا کہ میرے کمرے میں کوئی موجود ہے۔ میری بچپن سے عادت تھی کہ جس قدر بھی گہری نیند میں ہوتا، مجھے چونکانے کے لیے ایک ہلکی سی سرسراہٹ بہت تھی۔ مَیں نیند کے دریا کے عین کنارے پر سوتا تھا۔

میں نے آنکھیں کھولیں تو سامنے ذیشان کھڑا تھا۔ یہ وہی ذیشان تھا جس سے مَیں نے کمرہ اس شرط پر لیا تھا کہ فلیٹ کے مالک جب چاہیں اِس کمرے کو بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ مَیں نے ایک نیکر پہن رکھا تھا اور گلے میں ایسی باریک شرٹ تھی جس سے جسم کے تمام خدوخال نظر آ رہے تھے۔ یہ لڑکا نہایت نازک اور نرم شانہ تھا۔ جسم کی گولائیاں نوخیز لڑکی سے کم نہیں تھیں۔ اُس نے تھوڑی دیر اِدھر اُدھر تمام چیزوں کا جائزہ لیا اور میرے بیڈ پر بیٹھ گیا۔ مَیں نے اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اُس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا، آج میں یہیں سوؤں گا۔ مَیں نے اُسے خموشی سے ایک آنکھ دیکھنے کے بعد دوسری طرف کروٹ لی اور دوبارہ سونے کی کوشش میں ہوگیا۔ اِس وقت اُس لڑکے کی خوبصورتی کے تمام معاملات ایک طرف تھے لیکن ایک بات میرے لیے تشویش کا باعث تھی کہ لڑکے کے کمرے میں آنے کے بعد وہاں پرفیوم کی ایسی خوشبو کا احساس آ گیا تھا جو کسی بھی شخص کے لیے سیکس جیسی ہیجانی کیفیت کو ابھارنے کا ذریعہ تھی۔ مَیں نے چونکہ پہلے کبھی ایسی صورتِ حال کا سامنا نہیں کیا تھا اِس لیے مجھ پر اِس کا احساس زیادہ ہو رہا تھا۔ اِن باتوں کو وہ لڑکا، جس کا نام بتایا جا چکا ہے، خود مجھ سے بہتر جانتا تھا۔ ذیشان کو ہلکی سی شرمندگی کا احساس ہوا، جیسے وہ کہنا چاہتا ہو، سوری آپ کی طے شدہ شرط کے باوجود آپ کو بے آرام کرنے سے مجھے تکلیف ہوئی ہے۔ لیکن وہ یہ بات دل میں محسوس کرنے کے ساتھ زبان پر بھی لے آیا۔ سوری ڈیئر، مَیں نے سمجھا آپ بہت گہرے سو رہے ہیں۔ مَیں بھی آج یہیں سوؤں گا۔ ساتھ والا کمرہ مصروف ہے۔

کیا ٹائم ہوا ہے؟ مَیں نے پوچھا۔

گیارہ بج گئے ہیں، وہ بولا۔

اوہ، تو پانچ گھنٹے نکل گئے۔ ٹھیک ہے بھائی یہ آپ ہی کا کمرہ ہے۔ جہاں چاہے سوئیے لیکن مَیں نہیں جانتا آپ لائٹ آن کر کے سوتے ہیں یا نہیں مگر میری آنکھ لائٹ میں نہیں لگتی۔

ہاں ہاں وہ مَیں بند کیے دیتا ہوں۔ ہر شریف آدمی تمام بُرے کام بند لائٹ میں کرتا ہے۔

یہ جملہ کہنے کے بعد اُس نے لائٹ بند کر دی اور میرے ہی بیڈ پر لیٹ گیا مگر اُس کے جملے نے مجھے دو طرف سے بے چین کر دیا۔ اول یہ کہ واقعی مَیں شریف آدمی تھا اور یہ لڑکا میری شرافت کے بخیے اُدھیڑنا چاہتا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ کیا اُس کا طنز میرے آنے والے لمحوں کی کایا کلپ تھا؟ مَیں نے ذیشان کا جملہ سننے کے بعد اپنے آپ کو نہایت سنجیدہ کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ مَیں نہیں چاہتا تھا

لڑکے کے مساموں سے اُترتی ہوئی خوشبوؤں میں ڈوب جاؤں اور دامن کے اُن سفید دھاگوں کو آلود کر دوں جن کے بعد دن کے وقت خجالت پہچانے ہوئے اور نہ پہچان میں آنے والے تمام راستوں تک پیچھا کرتی ہے۔ میری نیند تمام ہو چکی تھی اور مَیں نے سوچا شاید اب بچی کھچی آبرو بھی کنارے لگ چکی ہے۔ مجھے لڑکے کے پاس سے آنے والی خوشبو نہایت مضطرب کر رہی تھی۔ مَیں نے اپنے آپ کو زبردستی سکیڑ لیا۔ مجھے ڈر تھا اور یہ ڈر کسی صورت پورا ہونے میں اپنی سی جدوجہد کر رہا تھا۔ مَیں سوچ رہا تھا، دوسرے کمرے میں جہاں اُس کی بہن اکیلی ہے اور اُسے کوئی دوسرا کام بھی نہیں ہے، لڑکے کا میرے کمرے میں چلے آنا کسی طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ تب اُسی وقت اپنے والد کی آنکھیں، حاجی فطرس علی اور گاؤں میں اُس قتل کا خیال آ گیا جس کے بعد کی صورت حال سے مَیں مکمل ناواقف تھا۔ لائٹ آف ہو چکی تھی۔ رات ابھی بہت باقی تھی۔ تھوڑی دیر میں میرے خیالات میرے ساتھ سرگوشیوں میں بے باک ہو گئے اور مجھے مکمل گھیرے میں لے لیا۔ اُسی حالت میں نیند نے پھر دبوچ لیا مگر نہیں رات کے کسی پہر مَیں پھر جاگ اُٹھا تھا۔ میری ٹانگوں اور سینے کے بیچ نرم انگلیوں کی سرسراہٹ نے میرے جسم کی آگ پر ایندھن رکھ دیا تھا۔ اِس ایندھن میں دو چہروں کا زیتون، دو مساموں کے پسینے سے بہنے والی کستوری اور دو لعاب سے ٹپکنے والا شہد شامل ہو چکا تھا۔ یہ تمام ایندھن میرے جسم کی آگ میں پھینک دیا گیا۔ اب یہ آگ ایسے بھڑک اُٹھی کہ مجھے نہ تو حاجی فطرس علی یاد رہا، نہ میرا باپ اور نہ والدہ۔ مجھے اُس وقت کسی اخلاقی جواز کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ مَیں نے خود کو اُس خوبصورت آگ میں شامل کر دیا۔ پھر ایک ہی دم وہ آگ بجھ گئی اور مَیں دوبارہ نیند کے سائے میں چلا گیا۔ میرے لیے اب یہ بے فائدہ تھا کہ مَیں کون سی حقیقتوں میں سے کس کا انکار کر رہا ہوں اور کس کو اختیار کر رہا ہوں۔

اب کے آنکھ کھلی تو روشنی طلوع ہو چکی تھی۔ میرے بیڈ پر وہ لڑکا موجود نہیں تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ رات مَیں نے خواب دیکھا ہے یا حقیقت تھی۔ مجھے ہر بات یاد تھی اور آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ جس شے کو مَیں نے حقیقت دیکھا ہو وہ کبھی خواب کی صورت ہو۔ کئی بار ایسا ہوا کہ غیر فطری چیزیں مَیں نے خواب میں دیکھیں اور خواب ہی میں اُن کے غیر حقیقی ہونے کی خبر ہو جایا کرتی تھی۔ مَیں نے اِدھر اُدھر دوبارہ نظر کی لیکن کوئی شخص نظر نہیں آیا۔ رات لڑکے کا بلاوجہ کمرے میں چلے آنا اور میرے بیڈ پر ایسے کپڑوں میں لیٹ جانا جو حواس کو برانگیخت کر دیں۔ پھر اُس برانگیختگی کو مکمل بے نقاب کر کے خوشی

سے کمرے سے نکل جانا ایسے عوامل تھے جنھیں مَیں نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے دماغ کے کونوں کھدروں سے بے پناہ خجالت اور شرمندگی نے گھیر لیا تھا مگر اس شرمندگی کے اندر اُس سرشاری کی مسرت شامل تھی جس سے مَیں زندگی بھرنا بلد رہا تھا۔ اگر یہ خجالت وقتی تھی تو پھر سرشاری طویل دورانیے کومحیط ہونے والی تھی۔ لیکن عین اُسی لمحے ایک اجنبی خیال نے مجھے چونکا دیا۔ یہ اُن دونوں سے زیادہ غیراطمینان بخش تھا۔ اِس خیال کے آتے ہی مَیں بہت زیادہ ڈر گیا۔ کہیں مَیں کسی جال میں تو نہیں پھنسا دیا گیا؟ یہ سوچ کر مجھے پسینا آ گیا۔ ایک سے بڑھ کر ایک گمان آنے لگا۔ کبھی دل کو تسلی دیتا تھا، ہوسکتا ہے وہ صرف سونے کے لیے آیا ہو اور باقی سب کچھ دونوں کی بے احتیاطی سے وقوع پذیر ہوا ہو۔ کبھی سوچی سمجھی سازش لگنے لگی۔ مَیں دوبارہ کمرے میں داخل ہو کر اپنے آپ کو گالیاں دینے لگا۔ پھر مجھے خیال آیا اصل میں اُس کی بہن کی کچھ سہیلیاں دوسرے کمرے میں موجود ہوں گی یا رشتے دار آ گئے ہوں گے اور سونے کے لیے کوئی جگہ نہ ہوگی لیکن رشتہ دار اِتنی صبح کہاں چلے گئے؟ سہیلیوں کی بات کہی جا سکتی ہے یا یہ دونوں باتیں نہ ہوں اور لڑکا بالکل اُسی لیے آیا ہو مگر ایسا ہونے کی صورت میں اکیلا کیوں چھوڑ دیا گیا۔ لڑکے نے کوئی واضح اشارہ کیوں نہ کیا؟ پھر اچانک میرا سر گھومنے لگا۔ کہیں حسنات نے میرے لیے کنواں تو نہیں تیار کیا؟ نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ حسنات اتنا گھٹیا کب سے ہوگیا؟ وہ خود جیسا بھی ہے دوسروں کے لیے اِس طرح کی حرکت اُس سے بعید ہے۔ پھر اُسے مجھ سے کوئی مطلب بھی نہیں اور نہ مَیں اتنا اہم ہوں کہ اِس طرح کا جال پھینک کر بلیک میل کریں۔

لڑکے کو کوئی مجبوری ہوسکتی ہے۔ پہلے دن کی وجہ سے اُسے بات کرنے میں شرم آتی ہوگی۔ آخر وہ ایک بچہ ہے۔ یہ کالج جاتا ہوگا۔ اُسی کے لیے اُسے تیار ہونا تھا شاید اِس لیے صبح اُٹھ کر چلا گیا اور مجھے خبر نہیں ہوسکی۔ مَیں اِن اُلجھنوں اور خیالات میں تھا کہ اِسی دوران مَیں واش روم سے فارغ ہوگیا۔ اب مجھے چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ صبح اُٹھ کر چائے پینا ایسا رُومانی عمل تھا جسے اکثر احباب نہیں جانتے۔ خائن گروہ دوست جن کے پاس اول چائے پینے کا سامان نہیں ہوتا یا پھر وہ گرم کی بجائے ٹھنڈا پینے کے عادی ہیں۔ مجھے ایسے لوگوں پر رحم آ رہا تھا جنھیں ٹی بیگ چائے کی علت پڑ چکی تھی۔ مجھے ٹی بیگ چائے سے ایک طرح سے نفرت تھی۔ یہ چائے حال ہی میں چائے کمپنیوں کی بدمعاشی کا نتیجہ تھی۔ فقط اپنی سیل میں اضافے کی گھٹیا ذہنیت کے پیشِ نظر اِنھوں نے چائے کی پوری کیفیت ہی تباہ کر دی تھی۔ پیسے ملتے لوگوں نے اپنا چائے کا سامان لا کر رکھ دیا تھا۔ مَیں کچن میں داخل ہوا اور چائے بنانے لگا۔ آپ اِسے

دودھ پتی کہہ سکتے ہیں۔ دودھ پتی بناتے ہوئے مجھے یہ خیال ہمیشہ پیشِ نظر تھا کہ دودھ میں شکر اور پتی عین اُس وقت شامل کی جائے جب دودھ اُبل پڑے۔ اِس طرح شکر اور پتی چائے میں ایسے مکس ہو جاتی ہیں کہ اُن کو آپس میں جدا نہیں کیا جا سکتا۔

چائے بناتے ہوئے مجھے بار بار ذیشان کا کمرے میں آنا، بیڈ پر بیٹھنا پھر... مگر پھر دوسرے خیالوں میں چلا گیا۔ سب سے پہلے میرے لیے اہم بات یہ تھی کہ اپنے اگلے کام کے لیے راستہ تلاش کروں لیکن مَیں جانتا تھا یہ راہ دفتر کی ملازمت کی طرف نہیں جانے دوں گا۔ مجھے اب ایسی نوکریوں سے نفرت تھی جہاں ایک متنفس بھی میرا باس ہو۔ چاہے میرا بھائی ہی کیوں نہ ہو۔ مَیں ہر حالت میں نو سے پانچ کی ڈیوٹی سے بچنا چاہتا تھا۔ دنیا میں اِس سے بڑی کوئی ذلت نہیں تھی۔ یونیورسٹی میں پروفیسر کی نوکری سے لے کر گتہ بنانے والی فیکٹری تک سب مزدوروں کی قسمت ایک دھاگے سے بندھی ہے۔ یہ دھاگہ مسلسل دماغ کی اُن شریانوں میں ہلتا رہتا ہے جو محکومی کے بعد ڈپریشن کے احکامات جاری کرتا ہے۔ مَیں فیصلہ کر چکا تھا اب صرف فری لانسر ہی رہوں گا۔ چاہے وہ گلیوں میں تھیٹر لگانے والوں کے لیے ڈراما لکھنا ہی کیوں نہ ہو۔

(۶۰)

مَیں نے ایک مدت سے اپنے کپڑوں کی استری اور جوتوں کو پالش کرنا چھوڑ دیا تھا۔ میرا خیال ہے اِس کام سے زیادہ فضول کچھ نہیں ہوسکتا۔ آج تک اپنے لباس کے متعلق کسی کی رائے نہیں سنی تھی۔ میرا خیال تھا جوتوں کی پالش اور کپڑوں کی استری پر رائے زنی کرنے والا آدمی ذہنی کمزوری کی چلتی پھرتی تصویر ہوتا ہے۔ اُس کی بات کو اہمیت دینا ضروری نہیں اور جو ذہنی تندرست ہے وہ اِس طرح کی خرافات پر توجہ نہیں دیتا۔ دونوں صورتوں میں مجھے اپنا وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔ مَیں فلیٹ سے نکلنے کے لیے تیار تھا کہ اُسی وقت مجھے محسوس ہوا پرفیوم کا ایک جھونکا کمرے میں داخل ہوا ہے۔ مَیں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو سامنے وہی لڑکی موجود تھی اور پوری آب و تاب سے موجود تھی۔ وہ سو کر ابھی اُٹھی تھی اور کچن میں داخل ہونے کے لیے جا رہی تھی لیکن مجھے دیکھ کر میری طرف مڑ گئی تھی، ہائے مسٹر ضامن، کہیں جا رہے ہیں؟

مجھے اُس کا اچانک مخاطب کرنا عجیب اور سرخوشی کی بات تھی مگر ایک خوف سے لرز گیا۔ کہیں ذیشان نے اِسے رات کی کتھا سنا نہ دی ہو مگر یہ ناممکن تھا۔ بھلا ایک بھائی اپنی بہن کو ایسا جرم کیوں بتائے گا جس میں بیشتر قصور خود اُسی کا ہو؟ یہ بات سوچ کر پھر مطمئن ہو گیا اور اُسے خود اعتمادی سے دیکھنے لگا۔ مَیں زندگی میں عدیلہ کی بیٹی کے بعد شاید عورت کو بھول گیا تھا۔ اول اِس لیے کہ ہمارے ماحول میں لڑکی کا کہیں وجود نہیں تھا۔ کالج، سکول اور اُس کے بعد جہاں کہیں بھی رہا وہ تمام وقت مردوں

کی صحبت میں گزرا۔ سیکرٹری صاحب کی بیٹی نویزا میں کچھ دن تک دلچسپی لی تھی مگر اُس نے میری طرف کبھی نگاہ بھر کر نہیں دیکھا تھا۔ مَیں اُس کے ویسے بھی معاشرتی اور سماجی قدوقامت کا آدمی نہیں تھا۔ میرا خیال ہے آخری وقت پر جو کچھ اُس نے میری مدد کرنا چاہی تھی وہ محض میری شکل وصورت میں ذرا سی دلچسپی کے باعث تھی مگر اُس کا سماجی شعور سراسر طبقاتی ہونے کے سبب اِس سے زیادہ میرے ساتھ راہ و رسم نہ بڑھا سکتی تھی اور نہ ہی بڑھایا تھا۔ آخری لمحے پر اُس کی ہلکی سی مدد البتہ کہیں دل کی آواز پر نکلی تھی اور بس مگر اِس فلیٹ پر آنے کے بعد ہر شے بدلنے کی طرف جا رہی تھی۔ تمام چیزیں اِنتہائی معمولی اور لطیف انداز سے منقلب ہو رہی تھیں۔ اُس کی آواز کے ساتھ ہی فوراً جو پہلا خیال میرے دماغ میں جھپکا وہ میرا لباس اور جوتے تھے۔ مجھے ایسے بے ڈھنگے اور بغیر استری شدہ کپڑوں میں اُس کے سامنے کھڑا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ چند لمحے میرا دماغ مکمل خالی رہا۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ اُس کے سوال کا جواب دینا ہے۔ پھر اچانک بولا، جی ہاں، ایک کام کے سلسلے میں کسی سے ملنا تھا۔ یہ کہتے ہی مَیں نے دروازے سے باہر نکلنے کی بجائے واپس کچن کی طرف مڑنا ضروری سمجھا اور اُس کے پیچھے کچن میں داخل ہو کر بولا، کیا آپ چائے بنائیں گی؟

جی ہاں، کیوں آپ کو کوئی اعتراض ہے؟ وہ قدرے بے نیازی سے بولی۔

میرا مطلب ہے آپ نے کام کرنے والی نہیں رکھی؟ مَیں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

رکھی تھی، بہت رکھی تھیں مگر سب چور نکلیں۔ کچی آبادیوں سے ملتی ہیں اور سب چور نکلتی ہیں۔ اب صرف صفائی والی رکھی ہے۔

جی ہاں۔ کچی آبادیوں والی چھوٹی چھوٹی چور بہت کچی چور نکلتی ہیں۔ پکے اور بڑے بڑے چور تو کوٹھیوں اور پلازوں میں ملیں گے۔ مَیں نے ہنس کر تلخی سے کہا اور وہ بھی ہنس دی۔

آپ نے چائے لے لی ہو گی؟ اُس نے جیسے جان چھڑانے کی کوشش کی ہو۔

اب مَیں نے فیصلہ کیا جیسے بھی ہو اِس کے ساتھ گفتگو کا عمل جاری رکھا جائے، اُس کے لیے چاہے مجھے ٹی بیگ چائے ہی کیوں نہ پینی پڑے اور کئی ایک پینی پڑیں۔ جی مَیں نے لے تو لی ہے مگر ایک اور پی سکتا ہوں۔ یہ کہتے ہوئے مَیں مسکرا دیا۔

وہ بھی مسکرا دی اور بولی، چائے تو جتنی زیادہ پی جائیں محض گرم پانی ہوا کرتی ہیں، شرفا کے لیے اچھی چیز ہے۔ اِن الفاظ کے کہنے کے ساتھ وہ چولہے پر اپنا برتن سجانے لگی اور صبح کے وقت تو غیر شرفا

بھی چائے ہی کا سہارا لیتے ہیں۔
اب میں اُس کے پاس ہی پہنچ چکا تھا، آپ باتیں بہت ذو معنی کرتی ہیں۔ مَیں نے مسکرا کر کہا۔
سُنا ہے آپ رائٹر ہیں اور کچھ لکھتے وکھتے بھی ہیں۔ اُس کا یہ جملہ ایسا ذلیل کرنے والا تھا جس کا
تنزیعین میرے دل پر لگا۔
جی ہاں مگر یہ بات شاید میرے علاوہ اِس شہر میں دوسرا کوئی نہیں جانتا۔ مَیں نے اپنا عذر بیان
کیا، کبھی ایک مقامی اخبار کا میگزین ایڈٹ کرتا تھا، تب تمام ادیب اور شاعر کہتے تھے کہ مَیں ایک عمدہ
رائٹر ہوں لیکن اِن دِنوں اُن کے بیانات نہ صرف پس منظر میں چلے گئے ہیں بلکہ اگر اُن سے ضد کر کے
پوچھا جائے تو اُن کی یادداشت جواب دے جائے گی۔
میری اس بات پر وہ کھلکھلا کر ہنسی، وہ کیسے؟ کیا اب وہ آپ کو ادیب ماننے سے انکار کر دیں
گے؟
جی ہاں، مروت کے دِنوں میں دیے گئے بیانات تعلق نہ رہنے پر آسانی سے واپس لیے جا سکتے
ہیں۔ مَیں نے بے نیازی سے کہا۔
اب مَیں نے اُس سے ایک سوال جو میرے دماغ میں کلبلا رہا تھا، آخر اُس سے پوچھنے کی
کوشش کی اور کہا، آپ سے ایک بات پوچھنا ہے۔
جی شوق سے پوچھیں۔ اِس کے ساتھ ہی اُس نے دونوں چائے کے کپ نہایت عمدہ ڈرائنگ
روم میں پڑے صندل کی لکڑی کے میز پر رکھ دیے۔
مَیں نے کہیں آپ دونوں کو دیکھا ہے لیکن ہزار بار سوچنے کے باوجود یاد نہیں آ رہا یہ واقعہ کہاں
ہوا ہے؟ اگر آپ نے بھی کہیں مجھے دیکھا ہو تو شاید یاد آ جائے۔
میرے اِس جملے پر وہ ایک طنزیہ مسکراہٹ بنا کر بولی، چھوڑیے ضامن صاحب، آپ بھی وہی
عام سے آدمی نکلے۔ بالکل بے کار قسم کے شریف، جنھیں اپنے تعارف کے لیے ایسے الفاظ کے علاوہ کچھ
نہیں ملتا۔ مَیں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے، مَیں آپ سے کہیں ملا ہوں، آپ بہت کیوٹ ہیں، آپ سے
کہیں ملاقات ہوئی ہے لیکن یاد نہیں آ رہا سوری۔ یہ وہ گھسے پٹے بدبودار منافق الفاظ ہیں جنھیں انتہائی
چغد لوگ مسلسل اور مکروہ انداز میں بولتے ہیں۔ آپ سیدھی بات کریں کہ مَیں آپ کو دیکھ کر اپنے شہوانی
جذبات پر قابو نہیں رکھ سکا۔ بلکہ اب تو آپ کو اِس طرح کے الفاظ بول کر تعارف حاصل کرنے کی

ضرورت ہی نہیں رہی۔ آپ اِس فلیٹ میں ہیں۔ آج نہیں تو کل اِس گھر کا حصہ ہیں۔ پھر کیا ضرورت ہے ایسے بے کار الفاظ بولنے کی۔ مجھے اِس طرح کے تعارف سے نفرت ہے، شدید نفرت۔ یہ کہتے ہی وہ فوراً اُٹھی اور نکل گئی اور مَیں اپنا سامنہ لے کر وہیں بیٹھا رہ گیا۔

واقعی وہ سچ کہہ رہی تھی، بے شک مَیں ضرور کسی مخمصے میں تھا مگر جب ایک ہی لفظ کی تکرار شدت اختیار کر جائے تو پہلے وہ اپنے معنی کھوتا ہے بعد میں مکروہ ہو جاتا ہے۔ وہ ناراض ہو چکی تھی اور اُس کی ناراضی ٹھیک تھی لیکن ایک بات اچھی ہوئی کہ یہ لمحے ایک دن ہماری گفتگو کو کسی موڑ پر ضرور لے کر جانے والے تھے۔ اب میں نے فلیٹ سے باہر جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور نئے سرے سے اپنا جائزہ لینے لگا۔ مَیں ڈرائنگ روم سے واپس اپنے کمرے میں آیا اور بیڈ پر دوبارہ بیٹھ گیا۔ ممکن نہیں تھا کہ مَیں اِس وقت باہر نکلتا جب کہ فلیٹ کی اصل مالک موجود تھی اور مجھے فی الحال اِسی سے مطلب ہو گیا تھا۔ مَیں جانتا تھا وہ دوبارہ کچن میں ضرور آئے گی۔ کم از کم دوپہر کے کھانے کے لیے یا پھر برنچ کے واسطے اور مَیں اُسی وقت باہر نکل کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ جاؤں گا لیکن اِس سے پہلے اپنے کپڑوں اور جوتوں کے بارے میں تشویش لاحق ہو گئی تھی اور ایک دم ہو گئی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ مَیں اپنے کپڑے اور جوتے درست کرنے کا بہانہ کر کے فلیٹ پر ٹھہرنے کا مقصد حاصل کر رہا تھا۔ کچھ عذر انسان اپنے آپ ہی سے کرتا ہے اور مسلسل کرتا ہے حالانکہ وہ بعض معاملات میں کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہوتا۔ مجھے یہاں ٹھہرنے پر ویسے بھی کوئی پوچھنے والا نہیں تھا مگر صرف دل کو تسلی دینے کے لیے اپنی کوئی مصروفیت چاہتا تھا مگر جیسا کہ بتا چکا ہوں میرے پاس استری ہی نہیں تھی اور نہ جوتوں کے لیے برش تھا مگر ایک بنیان تھی جسے دھونا زیادہ ضروری تھا لیکن وہ تو پچھلے دنوں گھر چھوڑ آیا تھا۔ مختلف چیزوں پر غور کرنے کے بعد آخر مَیں اپنے ایک افسانے کا مسودہ لے کر ڈرائنگ روم کے اُس صوفے پر بیٹھ گیا جس کے سامنے چھوٹی سی ٹیبل اِسی مقصد کے لیے رکھی تھی مگر لاکھ کوشش کے باوجود افسانے کی ایک لائن بھی نہیں لکھ سکا۔ سوائے ایک دو لایعنی فقروں کے جو مَیں نے بالآخر کاٹ دیے۔ اِسی میں مجھے دو گھنٹے نکل گئے تھے۔ اُسی وقت ذیشان اندر سے ظاہر ہوا اور میری طرف ہلکا سا مسکرا کر آگے نکل گیا۔ مَیں نے اُس کی مسکراہٹ سے حوصلہ پا کر کہا، آپ رات ہی کہیں اُٹھ کر چلے گئے تھے۔ مَیں صبح اُٹھا تو آپ نہیں تھے۔

جی، شیزو کا فرینڈ آیا تھا۔ اِس لیے مَیں آپ کے پاس آ گیا تھا۔ اُس کے جانے کے بعد مَیں اپنے بیڈ پر چلا گیا۔

ذیشان نے یہ جملہ ایسی سفاکی سے کہا کہ میرا سر چکرا گیا۔ یہ تو بالکل ایک عجیب بات ہو گئی تھی، یعنی یہ کیا کہہ رہا تھا؟ بوائے فرینڈ؟ تو شیزو کا بوائے فرینڈ بھی تھا۔ یہ بات مجھے ہضم نہیں ہو رہی تھی لیکن انھیں میرے ہضم ہونے نہ ہونے سے کیا تعلق؟ مَیں اُن کا کیا لگتا تھا۔

آپ بھی بہت مزے کے ہیں، سو سویٹ، وہ ہنس کر بولا اور مَیں نے منہ دوسری طرف کر لیا۔

مَیں نے بات دوبارہ گھما کر اُسی طرف پھیر دی اور پوچھا، شیزو آپ کی آپی ہے۔ آپی کی بات کر رہے ہیں، سگی آپی ہے نا؟

آپ بوکھلا کیوں گئے، وہ میری آپی ہے اور سگی آپی ہے؟ یہ کہہ کر وہ کچن میں چلا گیا۔ ادھر یہ بات سنتے ہی مَیں اپنے کمرے میں آ گیا اور بیڈ کا پایہ پکڑ کر نیچے ہی بیٹھ گیا۔ اُس کے بعد تمام دن مَیں کمرے سے نہیں نکلا۔ ایک تیز اور کاٹ دینے والی بے چینی مجھے کھانے لگی تھی۔ یہ کیسی بات تھی ابھی چند لمحے پہلے مجھے اپنی معیشت کی فکر تھی اور ابھی وہ ثانوی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ شام کے وقت مَیں دوبارہ ڈرائنگ روم میں نکلا۔ مَیں نے دیکھا شیزو صوفے پر بیٹھی کوئی انگریزی رسالہ پڑھ رہی تھی۔ اول میری ہمت نہیں پڑی اُس کے سامنے بیٹھ جاؤں۔ یہ ڈرائنگ روم اُنھوں نے مجھے استعمال کرنے کی اجازت ضرور دی تھی لیکن مجھے اِس بات کا ڈر تھا اُن کی موجودگی میں میرا یہاں بیٹھنا اُن کے لیے اذیت کا باعث تھا یا نا قابلِ برداشت تھا۔ صبح کے وقت شیزو کا غصہ کرنا میرے لیے ایک تلخ تجربہ تھا۔ اِس لیے میں کہیں سے بھی بات کرتے ہوئے سو طرح کے وسوسوں میں گِھر گیا۔ آخر مجھ سے نہیں رہا گیا اور مَیں بولنے لگا، شیزا مَیں صبح کی گفتگو پر شرمندہ ہوں۔ آپ بہت جلد غصہ کر گئیں مگر یہ بھی دیکھیے آپ کو بھی گفتگو میں پہل کرنے کا موقع ہی نہیں ملا اِس لیے آپ ایسے الفاظ کی تکرار سے بچی ہوئی ہیں۔ تمام مشکلات تو انھی کے لیے ہیں جنھوں نے آپ سے شرفِ گفتگو کا بہانہ ڈھونڈنا ہے۔ اب سب لوگ تو جینئس نہیں ہوتے کہ ہر لمحے اظہار کے نئے پیرائے استعمال کریں۔ مَیں بھی ایک عام سا آدمی ہوں۔

ضامن صاحب مَیں آپ سے ہرگز ناراض نہیں لیکن ابھی مَیں آپ سے بات کرنے کے موڈ میں نہیں۔ تھوڑی دیر میں میرا ایک فرینڈ آ رہا ہے۔ مَیں اُس کے ساتھ جا رہی ہوں۔ فی الحال آپ ٹینشن نہ لیں اور ریلیکس ہو جائیں۔

ابھی وہ یہ بات کر ہی رہی تھی کہ باہر سے گاڑی کا ہارن بجا اور اُس کے ساتھ ہی وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی لیکن جاتے ہوئے میرے سامنے اپنا ہاتھ کر دیا۔ اِس کا مطلب تھا مَیں اُس سے ہینڈ شیک کروں

اور وہ مَیں نے کیا۔ شیزا ہینڈ شیک کر کے فوراً ہی دروازے سے باہر نکل گئی لیکن اُس کے ہاتھ کا لمس میرے ہاتھ میں رہ گیا۔ مَیں اُسے جھانک کر دیکھنا نہیں چاہتا تھا وہ کس کے ساتھ گئی ہے۔ کیا یہ اُس کا وہی دوست تھا جو رات اُس کے ساتھ رُکا تھا یا کوئی اور تھا۔ کوئی اور کیوں ہوگا۔ وہ دو دو بوائے فرینڈ تھوڑی رکھتی ہوگی۔ اب وہ کب لوٹے گی؟ یہ میرے لیے مسئلہ ہوگیا تھا۔ کہیں سے ایسے ہی خیال سا آ کر رہ گیا کہ وہ خیریت سے واپس آ جائے۔

اب مَیں بھی باہر نکل گیا اور ایف سکس تھری سے ہوتا ہوا کہسار مارکیٹ کے سامنے اُس چھوٹے سے پارک میں آ بیٹھا جس کے پہلو سے ایک چھوٹی سڑک مارگلہ کی طرف نکل جاتی ہے۔ یہ پارک میرے لیے ایک طرح سے اہم تھا کہ اِس کے لوہے کے جنگلے کے ساتھ دنیا کے عظیم آرٹسٹوں کی پینٹنگز کی نقلیں لگی تھیں۔ اُن پینٹنگز کے دیکھنے سے مجھے لطیف سی سرشاری کا احساس ہوتا تھا۔ مَیں تھوڑی دیر پینٹنگز کو دیکھتا رہا اُس کے بعد واپس مڑا اور مارکیٹ کے پہلو سے نکلنے والی سڑک سے ہو کر مارگلہ کی طرف چلا گیا۔ یہاں سے میری منزل بے دھیانی میں سید پور کی طرف ہوگئی۔ سید پور اسلام آباد کے پہلو میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ نہ جانے اِسے یہاں کے شرفا نے کیوں اپنی ذہنی شرافت اور اَنا کی بچی کھچی تسکین کے لیے کھڑا رہنے دیا ہے۔ مَیں سید پور گاؤں کی درمیانی سڑک پر چلتا ہوا ایک تنگ گھاٹی میں داخل ہوگیا۔ یہ گھاٹی اُس مندر اور مسجد کے پہلو سے نکلتی ہے جو ایک دوسرے کے ساتھ بانہیں ملا کر پتا نہیں کن صدیوں کے نوحے پڑھتی ہیں۔ دونوں اپنے مرنے والے پجاریوں کی روحوں کو آوازے لگاتی ہیں مگر وہ روحیں کسی بھی جنت دوزخ سے الگ ایسے بھٹک گئی ہیں جیسے وہ اِن سے ناراض ہو کر بھاگ گئی ہوں۔ اُس گلی یعنی تنگ سی گھاٹی میں تھوڑا آگے جا کر دائیں طرف کے ایک نالے پر چڑھ گیا جو گھاٹیوں سے نکل کر پہلے گاؤں اور اُس کے بعد اسلام آباد کی بھول بھلیوں میں کھو جاتا ہے۔ اِس نالے کے اُوپر ایک جگہ چوڑا سا چوک بنا ہوا تھا جس پر ایک بڑا پیپل کا درخت اپنی جڑوں میں بانہیں بچھائے لہرا رہا تھا۔ اِس کے زرد اور خاکستری پتے چوک میں بکھر رہے تھے۔ میں اِس چوک نما پل پر ایک جگہ بیٹھ گیا اور بکھرتے اور اُڑتے ہوئے پتوں کی سرسراہٹیں سننے لگا۔

میرا ذہن دوبارہ شیزا طرف لوٹ گیا۔ اِس وقت تک مجھے فلیٹ سے نکلے صرف ڈیڑھ گھنٹا ہوا تھا اور شام کا اندھیرا چھا رہا تھا۔ مجھے پتا تھا ابھی تک وہ گھر نہیں لوٹی ہوگی مگر مَیں رات کے اِس اندھیرے میں یہاں بیٹھا رہا تو کسی حادثے کا شکار نہ ہو جاؤں۔ ہوا چل رہی تھی اور پتے کھڑکھڑا رہے

تھے۔ مجھے یہاں بیٹھے ایک بات شدت سے محسوس ہوئی کہ اسلام آباد شہر کی بنیاد جس نے بھی رکھی تھی
اُس کے انجینئرز کو درختوں کی کوئی جمالیات نہیں تھی۔ ورنہ کم از کم سید پور گاؤں ہی سے چوڑے پتوں کی
کھڑکھڑاہٹ اسلام آباد کے درختوں میں شامل کر لیتا۔ اب مَیں نے واپسی کا رستہ لیا اور بلوچستان
ہاؤس کے سامنے سے گزر کر اُس ویران رستے پر آ گیا جہاں سے سیدھی پگڈنڈیاں سیکرٹریٹ کی طرف
جاتی تھیں۔ یہ جگہ ابھی تک مکمل ویران اور جھاڑ جھنکاڑ سے بھری ہوئی تھی۔ یہاں نہ تو ابھی جاپانی توت
پہنچا تھا اور نہ یورپین پام آئے تھے۔ میرے خیال میں یہ جگہ ابھی پوری طرح پوٹھوہاری تھی۔ مَیں پچھلے نو
سال سے اِس شہر میں تھا مگر اِس جگہ پہلی بار میرا گزر ہو رہا تھا۔ اِس بالکل ویران اور عین سیکرٹریٹ کی
بغل میں کسی اُداس شخص کے لیے یہ ایک فطری جنگل تھا۔ اِس کے پیچھے سے ایک سڑک نئی نئی بنائی گئی تھی
جو سیدھی یہاں سے امام بری اور وہاں سے قائداعظم یونیورسٹی کی طرف جاتی تھی مگر اِس سڑک کو استعمال
کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی اور کسی خاص سبب سے بند کر دی گئی تھی بلکہ یہ رستہ سرے سے ہی بند تھا۔
ایک بڑا بیریئر یہاں لگا دیا گیا تھا اور کچھ کانٹے دار جھاڑیاں بھی رکھ دی گئی تھیں۔ اب میرے ایک طرف
سیکرٹریٹ اور دوسری طرف مختلف صوبوں کے ہاؤسز تھے۔ مَیں سب سے بے نیاز ہو کر چلتا ہوا عین
اُس سڑک پر آ گیا جہاں میریٹ ہوٹل تھا۔ پھر وہاں سے بھی نکل گیا اور رات آٹھ بجے فلیٹ پر دوبارہ
آ گیا۔ میرے دل پر ایک عجیب قسم کا بوجھ تھا۔ یہ بوجھ اُسی وقت پیدا ہوا تھا جب مَیں نے شیزا کو کسی
شخص کے ساتھ جاتے دیکھا تھا حالانکہ یہ ایسا معاملہ نہیں تھا کہ مجھے اُس کی فکر کرنی چاہیے تھی اور وہ رات
ایک اجنبی کے ساتھ گزار بھی چکی تھی جسے اُس کا بھائی بوائے فرینڈ بتا رہا تھا مگر کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں
کہ اُن پر اختیار نہیں رکھا جا سکتا۔ مَیں فلیٹ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو ذیشان اپنے دوستوں کے
ساتھ ڈرائنگ روم میں موجود تھا۔ اُس کے یہ دوست اُسی کی طرح ٹین ایج تھے مگر اُن کی ہیئت عام
لڑکوں سے مختلف تھی۔ ذیشان نے مجھے لاپروائی سے ہائے کہا اور اپنے دوستوں کے ساتھ مصروف ہو
گیا۔ یہ کچھ ڈرنک کر رہے تھے، سر پر قُلفی نما ٹوپیاں تھیں اور ڈانس اور رقص میں ایک دوسرے کو چوم
رہے تھے۔ میرے لیے یہ بالکل عجیب منظر تھا۔ مجھے اسلام آباد میں رہتے ہوئے کافی سال ہو گئے
تھے۔ بزنس کلاس فیملیز کو دیکھا تھا لیکن وہ لوگ ایسے معاملات میں ذرا منظم تھے۔ جس فیملی یعنی سیکرٹری
کے گھر میں مَیں نے قیام کیا تھا، ظاہر ہے وہ بھی ایسی ہی شب آفرینی کرتے ہوں گے مگر اُنھوں نے مجھے
کبھی اتنے قریب نہیں آنے دیا تھا کہ مَیں ... کر اس قسم کے ہنگامے میں شریک ہوتا لیکن یہاں کا

معاملہ عجیب تھا۔ یہ سات لڑکے تھے۔ پوری طرح سے انگریزی فضا میں ڈھلے ہوئے اور کسی سُرور میں بھی تھے کیونکہ اُنھوں نے مجھ پر کوئی توجہ نہیں دی۔ ایسی بھی توجہ جو ایک بلی کے بے وجہ دروازے کے اندر داخل ہوجانے پر اُس کا مالک دیتا ہے۔ میرے لیے یہ تمام عجیب تھا اور بے وضع بھی تھا۔ مَیں اُن سے کسی قسم کا سوال نہیں کرسکتا تھا نہ اُنھیں زیادہ غور سے دیکھنے کی جرأت تھی۔ مَیں نے تھوڑا سا مسکرا کر اُن کی طرف دیکھا اور اپنے کمرے کی طرف مُڑ گیا۔ اگرچہ میرا جی چاہتا تھا اُن کی چُہل بازی دیکھوں۔ اگر موقع دیں تو اُن میں شامل ہونے کی کوشش کروں مگر یہ سب کچھ ایسی باتیں تھیں جو صرف تصور کی جا سکتی تھیں۔ اُن لڑکوں کی عمر اور ہیئت کسی بھی صورت اجازت نہیں دے سکتی تھی کہ اُن کی نشاط انگیزی میری ثقالت کا بار اُٹھاتی۔

مَیں کمرے میں آ کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ شیزو ابھی تک نہیں آئی تھی۔ وہ کیوں نہیں آئی تھی؟ کب آئے گی؟ ایسے سوالات مَیں صرف سوچ سکتا تھا پوچھ نہیں سکتا تھا۔ ابھی تک رات کے نو بجے تھے۔ باہر ہنگامہ بہت تھا اور اندر بھی ایک ہنگامہ تھا۔ یہ ساتوں لڑکے اور اُن کے انداز و اطوار کسی بھی طرح جذبات کو انگیخت کر دینے کے لیے کافی تھے۔ مَیں ڈھائی سے تین گھنٹے چلتا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے نیند آ گئی اور مَیں سو گیا۔ پھر مجھے خبر نہیں ہوئی کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔ ہیجان اور اذیت میں نیند خدا کی کتنی بڑی نعمت ہے۔

(۶۱)

پتا نہیں رات کا کون سا پہر تھا۔ مجھے دروازہ کھلنے کی آواز آئی یا ویسے ہی آنکھ کھلی، مگر یہ کہ مَیں جاگ گیا تھا۔ اب جو مَیں نے اپنی گھڑی دیکھی، رات کے تین بج رہے تھے۔ مَیں اُٹھ کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا البتہ شیزا اور ذیشان کے کمرے میں ہلچل تھی۔ اِس کا مطلب تھا وہ ابھی آئی تھی، یعنی رات کے تین بجے۔ تمام لڑکے جا چکے تھے اور کسی قسم کا ہنگامہ نہیں تھا۔ میری نیند پوری ہو کر ختم ہو گئی تھی۔ ابھی مَیں سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے کچھ دیر باہر نکل کر چہل قدمی کرنی چاہیے یا واپس اپنے بیڈ پر جا کر لیٹ جاؤں اُسی وقت پھر کمرے کا دروازہ کھلا اور شیزا ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ شیزا کی آنکھوں میں سُرخی پھیلی ہوئی تھی۔ میری طرف دیکھ کر خواب ناکی سے سلام لینے کو جھکی اور ہاتھ آگے کر دیے۔ مَیں نے سلام لیا، تب اُس نے آگے بڑھ کر فریج کا دروازہ کھولا اور پانی نکالنے لگی، پانی کی بوتل نکال کر واپس مڑی اور بولی،

ضامن آپ اُٹھ گئے، یا ابھی تک سوئے نہیں؟ دیکھیے یہاں کی یہ روٹین یہی رہے گی۔ سوری آپ کو اِسی طرح برداشت کرنا ہوگا۔

نہیں کوئی بات نہیں، مَیں اِسی طرح کا عادی ہوں، آپ اب لوٹی ہیں؟ یہ سوال میرے منہ سے نہ جانے کیوں اچھل کر باہر آ گیا۔ وہ میری طرف دیکھنے لگی، پھر کچھ دیر ٹھہر کر دوبارہ بولی، جی ابھی لوٹی ہوں مگر مَیں اپنے بھائی کو بھی ایسے سوالات پوچھنے کی اجازت نہیں دیتی۔ آپ ہمارے پاس رہتے ہیں

اور بس۔ خواہ مخواہ کا انتظار کر کے نہ خود ڈسٹرب ہوں نہ ہمیں کریں۔ مَیں اپنی مرضی کی مالک ہوں۔ کب لوٹی، کیوں لوٹی، کہاں گئی تھی؟ آئندہ ایسے لفظوں کی تکرار نہیں کرنی، شریف بچے بنو۔ یہ کہتے ہی وہ دوبارہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اِدھر مجھے اُس کی دوٹوک وضاحت پر ایسی ذلت ہوئی کہ ایک بار دل چاہا اپنا سامان اُٹھاؤں اور ابھی یہاں سے نکل جاؤں۔ یہ بھی ہوسکتا تھا مَیں یہاں سے کبھی نہ نکل سکوں مگر مَیں نے کئی ایسے کام صرف تصور میں کیے ہیں۔ مَیں واپس کمرے میں آ گیا۔ شیزا کا رویہ کسی طور بھی ایسی لڑکی کا نہیں تھا جس کے اندر دل نام کی کوئی شے ہو۔ یہ بھی ہوسکتا تھا دل تو وہ رکھتی ہو مگر میرے ساتھ دل کی کیفیتوں کو شریک نہ بنانا چاہتی ہو۔ مَیں احتجاجاً بیڈ پر جانے کی بجائے باہر نکل گیا اور سامنے والے پتھر پر بیٹھ گیا۔ سٹریٹ کی لائٹیں زرد روشنی میں نہا رہی تھیں۔ سرد اور نرم ہوائیں درختوں کے پتوں کو پنکھے جھلا رہی تھیں۔ میرے دائیں پہلو میں کھڑا ہوا پاپلر کا اونچا درخت اِس طرح تالیاں بجا رہا تھا جیسے میری ذلت پر شادمان ہوا ہو۔ باہر کا موسم اتنا رومانی ہو کر مجھے کئی گنا بھاری اُداسی سے دوچار کر گیا تھا۔ دُور چوکیداروں کی سیٹیاں بج رہی تھیں۔ کہیں کہیں زندگی کا کوئی نشان موجود تھا مگر زیادہ تر زرد اور دھندلے اندھیرے میں درختوں کے وجود کی صریح عریانی تھی اور فلیٹ کی چوکی سے نیچے اُتر کر بیٹھا ہوا مَیں اکیلا آدمی۔ جس کی گیارہویں منزل پر خود فریبیوں کے وسیع جزیرے موجود تھے۔ ایک گھنٹا بیٹھے رہنے کے بعد مَیں دوبارہ لفٹ میں داخل ہوا اور اوپر فلیٹ کے دروازے پر آ گیا۔ دوبارہ کمرے میں واپس آیا اور لیٹ گیا۔ مجھے اپنے آپ پر شدید غصہ آ گیا تھا۔ خواہ مخواہ ایسی دلدل میں ڈوبنے جا رہا تھا جہاں سے واپسی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ شیزا میرے اندر کسی ورمے کی طرح سوراخ کر کے گھستی جا رہی تھی اور میرے جسم پر چمڑے کی زرہیں اُسے روک نہیں پا رہی تھیں۔ مَیں آنکھوں پر ہاتھ رکھتا تھا تو وہ دل کی راہ سے اُتر جاتی تھی۔ دل کو ڈھانپتا تھا تو دماغ کی گہرائیوں میں نکل جاتی تھی۔ اپنے بستر پر لیٹنے کے بعد مَیں نے کچھ دیر اِدھر اُدھر کی کروٹیں لینا شروع کر دیں اور دوبارہ شدت کے ساتھ شیزا کے لیے سوچنے لگا۔ مجھے اُس کا تصور کرنے میں انتہائی تکلیف کے ساتھ زیریں سطح پر لذت کا احساس بھی ہوتا تھا۔ اُسی حالت میں مَیں نے عبادت علی کا کام شروع کر دیا اور صبح آٹھ بجے تک یہ کام کرتا رہا۔ آٹھ بجے اُٹھ کر مَیں نے اپنی چائے بنائی اور ناشتا کیا۔ مجھے معلوم تھا دونوں بہن بھائی ابھی تک اپنے کمرے میں سوئے ہوئے ہیں اور آج وہ بارہ بجے سے پہلے نہیں اُٹھیں گے۔

مَیں صبح نو بجے کے قریب اپنے فلیٹ سے نکلا اور دروازے کو چابی لگا کر نیچے آ گیا۔ میرے

سامنے کی سڑک ابھی تک ویران تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا آج کون سا دن ہے جب سے مَیں اس فلیٹ پر آیا تھا میرے ساتھ ایسا ہی معاملہ چل رہا تھا۔ ذیشان اور شیزا کے علاوہ شاید دوسرے لوگ ابھی تک سوئے ہوئے تھے۔ آج دھوپ ذرا چمک کے نکلی تھی اور دن بالکل صاف تھا، پھر بھی لوگوں کا سڑک پر نہ ہونا عجیب سی بات تھی۔ میرا رُخ آج بھی بغیر ارادہ کے حسنات کے دفتر کی طرف تھا۔ یہ واحد آدمی تھا جس کے کمینہ ہونے کے باوجود مجھے اُس سے ایک گونا مانوسیت ہوئی تھی۔ مَیں اُس سے شیزا اور ذیشان کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ اُس کے ساتھ کام کرنے والا لڑکا، ذیشان کا ہم جولی ہو اور حسنات کو اُن کے بارے میں کچھ بھی خبر نہ ہو۔ حسنات اپنے اندر ایک ہی وقت میں نہایت متضاد خصوصیات رکھتا تھا۔ اپنے اور اپنے دوستوں کے عیب چھپانے میں ماہر اور لاتعلق لوگوں کے عیب ظاہر کرنے میں اُسے لطف ملتا تھا۔ ویسے تو یہ خوبی پوری قوم میں تھی مگر حسنات اِس کا اظہار شعوری طور پر کرتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے احساس ہوتا حسنات نے جان بوجھ کر مجھے اِس دلدل میں پھینکا ہے اور وہ سب جانتا ہے کہ وہ میرے ساتھ کیا کر رہا ہے؟ خیر اب جو کچھ بھی تھا مجھے کسی بھی طرح اِس فلیٹ میں رہنا تھا۔ اُس کے نتیجے میں جو کچھ بھی ہوتا مَیں کر گزرتا۔ اِس میں کوئی شک نہیں تھا مَیں پوری زندگی ایسے انسان کی طرح رہا ہوں جسے کم از کم آوارہ یا اِسی قسم کا آدمی نہیں کہہ سکتے مگر بعض اوقات ہر انسان میں ایک وقت آتا ہے کہ وہ دوسروں کے لیے سوچتے ہوئے آخر اپنے لیے بھی سوچنا شروع کر دیتا ہے۔ اِس وقت شیزا کے بارے میں مسلسل سوچنا دراصل میرا اپنے بارے میں سوچنے کے مترادف تھا۔

حسنات میں کئی علتیں ایک وقت میں جمع تھیں۔ وہ سب علتیں جو آفس کے ٹائی زدہ انسان میں پائی جاتی ہیں مگر اُن علتوں کے علاوہ کچھ ایسے مسائل بھی تھے جو عام آدمی میں نہیں ہوتے۔ وہ کنجوس بھی تھا مگر یہ بات بھی منکشف ہو چکی تھی کہ اُسے مصیبت زدہ کا احساس بھی رہتا تھا۔ اگرچہ آج تک مجھے خاص اِس کی معاشی دروبست سے کچھ فائدہ نہیں ہوا تھا مگر اُس کے ذریعے سے راستے ضرور پیدا ہوئے تھے۔ مَیں چلتا جا رہا تھا اور حسنات کے بارے میں غور کرتا جاتا تھا۔ آفس میں پہنچ کر مَیں نے سیدھا حسنات کے کمرے کا رُخ کیا۔ سامنے وہی لڑکا کھڑا تھا۔ ایک بات مَیں نے یہاں محسوس کی تھی حسنات کے آفس میں کام کرنے والے کسی بھی لڑکے نے آج تک مجھ سے ہم کلام ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شاید یہ اُن کے اصول تھے یا یہاں ویسے ہی ایک بُعد کی سی کیفیت لوگوں میں لاشعوری طور پر موجود تھی۔ آفس بوائے نے میرا ہنس کر استقبال کیا اور بغیر کسی ہچکچاہٹ سے حسنات کا کمرہ کھول دیا۔ پچھلی

کئی ملاقاتوں اور خاص دو چار دنوں کی واقفیت نے مجھے اس لڑکے کے بارے میں بھی مطمئن کر دیا تھا۔ مَیں میز کے سامنے پڑی کرسی کے بجائے سامنے پڑے لیدر کے صوفے پر بیٹھ گیا۔ حسنات ابھی تک آفس نہیں پہنچا تھا۔ البتہ آفس بوائے وہی وسیم تھا مگر اب کے وہ کافی تابعدار نظر آ رہا تھا۔

یہ تمھارا صاحب کب آئے گا؟ مَیں نے اُسے مخاطب کیا۔

بس سر آنے ہی والے ہوں گے۔ ابھی اُن کے آنے پر ہی آفس کی ڈاک جائے گی۔ سر چائے لاؤں؟ آفس بوائے وسیم نے نہایت اپنائیت سے پوچھا۔

ہاں کیوں نہیں یار، اچھی سی چائے پلا دو اور ہاں یہ پیسے لے جاؤ آتے ہوئے سامنے فردوس سویٹ سے دو کلو مٹھائی لیتے آنا اور سُنو وہ شاذب کہاں ہے؟

سر خیر ہے؟ وسیم معنی خیز انداز میں ہنسا، مَیں خجل سا ہو گیا، وہ شاذب تو سر بادشاہ ہے۔ سر حسنات سے بھی لیٹ آتا ہے۔

اچھا، نہیں کوئی ایسی بات نہیں۔ بس مَیں نے سوچا، آج آپ سب کو عیاشی کرا دوں۔

لڑکا وسیم پیسے پکڑ کر باہر نکل گیا۔ مَیں میز پر رکھے ایک رسالے کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ یہ رسالہ نیوی والوں کا تھا اور حیرت ناک بات اِس میں یہ تھی کہ شوبز کی کئی نعتیں اِس میں موجود تھیں۔ مجھے نیوی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ مَیں نے رسالہ وہیں میز پر رکھ دیا اور واپس صوفے پر نہایت آرام سے لیٹ گیا اور آنے والے تمام وقت سے ایک طرح کا بے خبر ہو کر سستانے لگا۔ ابھی کچھ لمحے گزرے ہوں گے کہ ایک لڑکا کمرے میں داخل ہوا۔ یہ لڑکا پہلو کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا، مَیں نے اِسے فوراً پہچان لیا۔ اچھا تو یہ اور شاذب دونوں یہیں کام کرتے ہیں۔ نہایت جاذب نظر اور پینٹ شرٹ میں سرو قامت کی مثال اِس سے بہتر کسی کو نہیں دی جا سکتی تھی۔ حسنات کا پی اے قسم کا تھا۔ پی اے قسم کا اِس لیے کہ مَیں جب سے اِس کے آفس میں آ رہا تھا اُس کے عملے کا کام طے شدہ کبھی نہیں لگا تھا۔ یعنی حسنات کسی بھی کام کے لیے کسی بھی لڑکے کو ذمہ داری دے دیتا تھا۔ لڑکے کے ہاتھ میں ایک پرچی تھی۔ یہ پرچی اُس نے میرے حوالے کرتے ہوئے کہا، سر یہ ظفر عالم صاحب ہیں۔ آپ کی طرف اُنھوں نے ایک پیغام بھیجا ہے۔ اُن کا کہنا تھا کہ آپ آئیں تو آج ہی اُن سے ملاقات کریں۔

مَیں نے لڑکے کے ہاتھ سے پرچی لے لی۔ اُس پر جی سکس تھری کی ایک کوٹھی کا پتہ لکھا تھا۔ لڑکا پرچی دے کر کمرے سے نکلنے ہی والا تھا کہ مَیں نے پوچھا، لیکن میاں یہ ظفر عالم صاحب کون

ات ہیں اور مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟

سر یہ مجھ سے زیادہ حسنات صاحب کو پتا ہے۔ مَیں اتنا جانتا ہوں ان کا اور حسنات صاحب کا مشترکہ پروڈکشن ہاؤس ہے اور ایک رسالہ بھی نکالتے ہیں۔ اِس سے زیادہ نہیں جانتا۔ مجھے ایک شخص یہ پہنچا دے گیا تھا۔ یہ بات کرتے ہوئے وہ مسلسل مسکرا رہا تھا۔ اُس کی مسکراہٹ رات کے واقعے سے جڑی ہوئی تھی۔ مَیں نے اُسے بالکل نہیں جتایا کہ یہ بات فی الحال نہ میرے لیے اور نہ اُن کے لیے مناسب تھی۔

اچھا اِدھر آؤ، مَیں نے اُسے واپس بلایا۔ میرے سامنے بیٹھ جاؤ۔

وہ آکر میرے پاس بیٹھ گیا اور بولا جی فرمایئے ضامن صاحب۔ اُس کے اِس جملے میں بھی ایک ادائے دل فریبی تھی۔

یہ بتاؤ، یہ ذیشان اور شیزا کون ہیں؟ شاذب اور آپ اور ذیشان کیسے ایک دوسرے کے دوست ہیں؟ ذیشان اور اُس کی بہن کا مکمل تعارف کیا ہے اور آپ لوگوں کی دوستی کیسے ہوئی اور یہ سب کیا قصہ ہے کہ رات کو آپ لوگ ذیشان کے فلیٹ پر عجیب وغریب پارٹی کر رہے تھے۔

وہ ہنس کر بولا، سر ابھی تک آپ کو پتا نہیں چلا؟

بھئی مجھے الہام تھوڑی ہوگا؟ مَیں پوری طرح سے ایسا انجان بنا جس میں ہلکی سی حیرت اور دھیمی سی بصیرت بھی موجود ہوتی ہے۔

اچھا آپ کو واقعی کچھ پتا نہیں ہے؟ مَیں نے تو سمجھا تھا حسنات صاحب نے آپ کو بتا دیا ہوگا۔

نہیں اُس نے تو نہیں بتایا۔ آپ بتا دیں۔ مَیں نے اپنے لہجے میں تھوڑی سی التجا بھی شامل کر لی تھی۔

ہم سب شوبز کے لوگ ہیں۔ مَیں بھی شام کو پروڈکشن ہاؤس میں کام کرتا ہوں اور ذیشان بھی وہیں کام کرتا ہے، اب وہ بولنے لگا، حسنات صاحب ہمارے باس ہیں اور ظفر صاحب بھی لیکن آپ انھیں بولیے گا نہیں کہ مَیں نے آپ کو بتا دیا ہے۔

لیکن اِس میں کیا مضائقہ ہے۔ کام میں کون سی برائی ہے کہ بتا دیا تو قیامت آجائے گی۔ مَیں نے اُسے تسلی دی۔ خیر نہیں بتاؤں گا۔ وہاں پروڈکشن ہاؤس میں آپ کیا کرتے ہیں؟

کچھ ایڈورٹائز ایڈز بناتے ہیں اور کمپنیوں کو بیچتے ہیں۔ اتنا کہہ کر وہ پھر چپ ہو گیا۔

آپ نے یہ نہیں بتایا کہ ذیشان اور شیزا آپ کو کہاں سے ملے تھے؟ مَیں اصل میں اپنی ہی کھوج میں تھا۔

ہم دونوں ایک گرائمر سکول میں اکٹھے پڑھتے تھے۔ وہیں شیزا بھی پڑھتی تھی۔تو ہم سب اِس فیلڈ میں اکٹھے آ گئے۔ ہمیں ظفر صاحب اور اُن کی بیگم ہی لے کر آئے اِس فیلڈ میں۔ ظفر صاحب کے بڑے لوگوں سے بہت تعلقات ہیں۔

وہ خود بھی بزنس کلاس ہیں اور اُن کا بہت بڑا کاروبار ہے۔ دو پروڈکشن ہاؤس چلا رہے ہیں۔

ظفر صاحب آپ کو کہاں سے ملے؟

اُن کی بیگم گرائمر سکول میں انگلش ٹیچر ہیں۔ وہ بہت سمارٹ لیڈی ہیں۔ اُنھیں نے ظفر صاحب سے ملاقات کرائی تھی۔

اچھا، شیزا اور ذیشان کے والدین کہاں ہیں؟ یہ یہاں اکیلے کیوں ہیں؟

اُن کے ڈیڈی لندن میں تھے۔ اُنھوں نے وہاں شادی کر لی اور ماما اُن کی فوت ہو گئی تھیں۔

یہ فلیٹ جس میں وہ رہتے ہیں، کرایے پر ہے یا اُن کا اپنا ہے؟

وہ کرایے پر ہے۔

یہ تو کافی مہنگا ہے۔ اِس کا کرایہ وہ کیسے افورڈ کرتے ہیں؟

دو سال تک تو شیزا کے ایک بوائے فرینڈ نے دیا تھا۔ پھر ظفر صاحب بھی دیتے رہتے ہیں۔ ذیشان بھی کما لیتا ہے اور اب آپ اُس میں حصہ ڈال رہے ہیں۔ بس اسی طرح سے ہو رہا ہے۔ پہلے ایک شخص کو دیا تھا۔ وہ بہت غنڈہ نکلا، اُسے پولیس سے مار پیٹ کروا کر نکالا ہے۔ دو ماہ خالی رہا اب آپ اُس میں حصہ دے رہے ہیں۔

اچھا مَیں جاؤں؟ حسنات صاحب آنے والے ہوں گے۔ آپ یہ باتیں حسنات یا ذیشان کو مت بتایئے گا۔

نہیں بتاؤں گا آپ فکر نہ کریں۔ یہ کہہ کر مَیں نے پرچی کو دوبارہ دیکھا اور حسنات کے کمرے سے باہر آ گیا۔ مجھے محسوس ہوا مَیں کچھ اہم ہوتا جا رہا ہوں۔ ابھی میرے کچھ ہی آرٹیکل چھپے تھے اور ایک عبادت علی کا کام کیا تھا۔ میرے مضامین ایسے کچھ فلسفیانہ نہیں تھے، بس یونہی سا قلم گھسیٹا تھا، جن میں ہلکی پھلکی عام زندگی کے مسائل سے وابستہ واضح باتیں تھیں۔ ہاں انداز ذرا شگفتہ تھا حالانکہ تیسری

دنیا کا لکھنے والا جب تک نہایت مبہم اور کنفیوز کر دینے والی تحریریں نہ لکھے تب تک ادیب نہیں کہلا سکتا مگر اِن چند کاموں کی وجہ سے مجھے پروڈکشن ہاؤس اور این جی اوز والے سنجیدہ لینے لگے تھے۔ حتیٰ کہ میرے لیے ایسی جگہ بھی ڈھونڈ دی تھی جہاں مَیں انتہائی اچھی حالت میں رہ سکتا تھا۔ یہ خوش آئند بات تھی لیکن یہ ظفر عالم صاحب اچانک کہاں سے برآمد ہو گئے تھے۔ مجھے یہ شخص اِس پورے سسٹم کا مرکزی کردار معلوم ہو رہا تھا اور اُس کی بیوی جسے وہ ٹیچر بتا رہا تھا۔ مَیں اچھی طرح جانتا تھا یہ شوبز ڈیزائننگ انڈسٹری دوسرے لفظوں میں سیکس انڈسٹری ہوتی ہے۔ تو کیا شیزا اور ذیشان بھی اِسی انڈسٹری سے وابستہ تھے؟ ظفر صاحب کا نام تو کبھی حسنات نے بھی نہیں لیا تھا۔ مَیں اِسی گومگو میں تھا کہ اُسی وقت حسنات دروازے سے داخل ہوا اور دیکھتے ہی مسکرا دیا۔

ہم دونوں واپس مُڑ کر حسنات کے کمرے میں آ گئے۔ حسنات نے بیٹھتے ہی چائے اور میری طرف سے مٹھائی کا آرڈر دے دیا۔ حسنات نے اپنا بریف کیس میز کی داہنی طرف رکھ کر گھومنے والی کرسی کو ایک بار پھر گھمایا اور میری طرف دیکھ کر بولا، ضامن صاحب آج کل آپ کی پانچوں گھی میں چل رہی ہیں۔ دیکھ لیجیے ہم نے آپ کو کہاں سے نکال کر حُسن کی وادی میں داخل کر دیا ہے۔ اب ہمارا حق مٹھائی کا تو بنتا ہے۔

مَیں حسنات کی بات سمجھ گیا لیکن پوری سنجیدگی سے کہا، حسنات مجھے سمجھ نہیں آئی آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ کس حُسن کی وادی کی بات ہو رہی ہے؟ مجھے تو ابھی تک حسن کی ح بھی نصیب نہیں ہوئی۔

اچھا، اررے، ہمیں بنایئے مت۔ خیر چھوڑیے۔ اُس نے بات درمیان ہی سے روک دی۔

اچھا، اِتنے دن فلیٹ میں رہتے ہو گئے ہیں، ذیشان کو آنے دو، ابھی نپٹتا ہوں۔ میاں حسن کی واردات نہیں چکھو گے تو کام کیسے اچھا کرو گے۔ یہ کہتے ہی اُس نے بیل دی۔ ایک بوڑھا آدمی اندر آیا۔

شاذب کہاں ہے؟

سر وہ تو ابھی نہیں آیا۔ بوڑھا نہایت مسکینی سے بولا۔

اِس کے ساتھ ہی چائے بھی آ گئی اور چائے کے ساتھ مٹھائی بھی تھی جس کے پیسے مَیں انھیں کافی دیر پہلے دے چکا تھا۔ لڑکے نے مٹھائی اور چائے میز پر رکھ دی اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

بھئی اگر یہ مٹھائی میرے پیسوں کی لے ہی آئے ہو تو اِسے لے جاؤ۔ ہمیں بھی کسی شے میں رکھ

کے دو اور باقی تمام لڑکوں کو بھی دو۔ مَیں نے بوڑھے کو ہدایت دی۔

ضامن صاحب خیر تو ہے آپ آج کیوں اِتنا سخی ہوئے بیٹھے ہیں۔

میاں قاسم، بابا ضامن کے ہاتھ ہماری بتائی ہوئی مچھلی عین کانٹے میں آ گئی۔ حسنات نے ہنس کر کہا۔

ہاں واقعی حسنات صاحب یہ ڈوبی ہوئی رقم ایسے نکلی جیسے چوری کا مال پولیس کے خزانے سے نکل آئے۔

اب اِن کو یونہی اُڑا نہ لینا۔ حسنات نے مسکرا کر کہا۔

ہم دونوں چائے پینے کے ساتھ باتیں کرنے لگے۔ میری خواہش تھی حسنات کو ذیشان اور شیزا کے بارے میں پوچھنے کے لیے راہ ہموار کروں مگر اچانک مجھے وہ پرچی یاد آ گئی۔ مَیں نے پرچی جیب سے نکال کر حسنات کے سامنے رکھ دی۔ یار یہ ظفر عالم صاحب کون ہیں، کیا بیچتے ہیں؟ آپ کے اس لڑکے نے مجھے یہ تھما دی ہے کہ وہ اپنے آفس بلاتے ہیں۔

ہنستے ہوئے بولے، یہ ظفر صاحب ہمارے ایک طرح سے کولیگ ہیں۔ آپ کو اچھی طرح سے جانتے ہیں۔ اِن کے دو پروڈکشن ہاؤس ہیں۔ اُن میں سے ایک میں میرا بھی حصہ ہے۔ پاک ملٹری کے لیے ایک رسالہ نکالنے کا کام بھی کرتے ہیں۔ اُنھوں نے بہت سی لڑکیوں کو ایڈورٹائزمنٹ کی دنیا میں کھپایا ہے۔ ملک کا مشہور شوبز رسالہ اِنھی کے نام کا ہے لیکن اُس کا مالک کوئی اور ہے۔ آپ نے اُس شوبز کے میگزین میں دیکھا ہوگا بڑی بڑی جاسوسی کہانیاں چھپتی ہیں جن کے ہیرو پوری دنیا میں تسلط قائم کرتے اور اپنے ملک کی جنگ لڑتے نظر آتے ہیں۔

جی جی، مَیں نے جواب دیا، اُن میں ہمارے جاسوس پرائے ملکوں میں انہونی قسم کی فتوحات کرتے ہیں۔ اُنھیں پڑھ کر بندے کے سینے میں ایک دم چار سو چالیس وولٹ کا کرنٹ دوڑ جاتا ہے اور اُسی وقت اُٹھ کر کسی ملک میں جاسوسی کرنے نکل جانے کو جی چاہتا ہے۔

جی ہاں وہی کہانیاں یہ صاحب لکھواتے ہیں، حسنات نے جواباً تائید کی، آپ کو بھی اِسی کام کے سلسلے میں بلایا ہے اور میرے ساتھ مشورے کے بعد بلایا ہے۔ چلے جائیے، بہت آسان اور پیسے والا کام ہے۔ وہیں پروڈکشن کے لیے سکرپٹ بھی ملتے رہیں گے۔ شیزا بھی وہیں ہوتی ہیں کچھ دیر کے لیے۔ ہمارے دوست ہیں لیکن اُن کے ساتھ کھیلنا مشکل ہے۔

مجھے آپ نے یہ بات پہلے کبھی نہیں بتائی؟ مَیں نے ایک قسم کا احتجاج کیا، حالانکہ مَیں معاشی اعتبار سے اتنا تنگ رہا ہوں۔

بھائی میرے یہ لمبی کہانیاں ہیں۔ ہر آدمی کو اپنا کنواں کھودنا ہوتا ہے۔ وہاں بہت سے لوگ تھے۔ مَیں نے کئی بار آپ کا ذکر کیا تھا مگر کیا آپ سمجھتے ہیں آپ اکیلے ہی معاشی مشکلات میں گرفتار ہیں اور سیٹھ لوگ آپ کی راہوں میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ میرے اپنے پیسے ڈوبتے ڈوبتے بچے ہیں۔ بڑی مشکل سے اُن کے ساتھ ایک دو شرطیں طے کر کے آپ کے نام پر راضی کیا ہے۔ حسنات نے مجھے ایک لمبی وضاحت دی۔

مگر ابھی تو آپ کہہ رہے تھے وہ میرے فین ہیں اور میرا کام پڑھتے ہیں؟ مَیں نے حسنات کو اُس کی بات یاد دلاتے ہوئے کہا۔

ہاں تو، کسی کی تحریر پسند کرنے کا مطلب ہے کہ اُس پر خزانے بھی بہا دیے جائیں؟ حسنات نے انتہائی بے دردی سے جواب دیا۔ بھئی بزنس چلانا اور بات ہے۔ کسی کو پسند نا پسند کرنا اور بات ہے۔ ویسے بھی یہ پروڈکشن اور شوبز کا کام ادیبوں کے بس سے باہر ہے اور آپ مکمل نہیں تو کم و بیش ادیب تو ہیں۔ خیر آپ اِن باتوں کو چھوڑو پہلے جلد وہاں پہنچو اور جو کام آپ سے کہیں وہ کرو اور دیکھو لمبے سوال جواب اور تجسس نما گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں۔ ادیبوں کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب ہمیشہ اُن کی متجسس گفتگو ہوتی ہے۔ بزنس مین بیچارا پہلے ہی مرحلے پر کام دینے سے ڈر جاتا ہے کہ کہیں زمانے میں ڈھنڈورا نہ پیٹتا پھرے۔ آپ پہلے بھی سراغرساں رہ چکے ہیں۔ یہ جملہ ادا کرتے ہوئے حسنات میری طرف دیکھ کر مسکرا بھی دیا۔

اچھا جا کر دیکھتا ہوں، مَیں نے جواب دیا، فکر نہ کریں مَیں نے یہ کام چھوڑ دیے ہیں۔ اِتنے میں چائے کے کپ خالی ہو کر رہ گئے تھے، لیکن جناب مَیں پہلے آپ سے جو کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں وہ تو کہہ دوں کہ مجھے رئیس صاحب سے ملوا دیں، اُن کے آفس کے میگزین کا ادبی حصہ سنبھال لوں گا۔

بھئی اُس کا خیال دل سے نکال دو۔ یہاں ایک سے بڑھ کر ایک چوتیا پڑا ہے۔ تمھیں وہاں کوئی کام نہیں کرنے دے گا۔ یہ ظفر عالم بہتر رہے گا پہلے اسی کو جا کر مل لو۔

مجھے محسوس ہوا حسنات دوستی کے سبب خود مجھ سے کسی قسم کی ڈیل نہیں کرنا چاہتا چنانچہ اُس نے کاروباری انداز میں مجھے ایسے آدمی کے آگے کر دیا ہے جو میرے ساتھ مروت کی بجائے دوٹوک انداز

سے بات کر سکتا تھا اور وہ ظفر عالم سے بہتر آدمی نہیں تھا۔ آخر میں وہاں سے نکل کر پیدل ہی ظفر عالم کے دفتر کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ جگہ جی سکس تھری میں ایک چھوٹی مارکیٹ کے بالمقابل بڑی کوٹھی میں تھی۔ اِس کے ایک طرف میلوڈی مارکیٹ تھی اور دوسری طرف نیچے نہایت خوبصورت مقام پر چند کوٹھیاں تھیں۔ یہ کوٹھیاں نئی ہی تھیں۔ اُن کے اردگرد پاپلر اور شرینہہ کے بے شمار درخت کھڑے تھے اور ہر طرف چھاؤں تھی۔ اِن کے درمیان اور سڑکوں پر جنگلی شہتوت کے علاوہ چیڑ اور پیپلوں کے بڑے درخت بھی تھے۔ سامنے سائے سے بھری ہوئی کھلی سی ایک گراؤنڈ تھی۔ اِسی گراؤنڈ سے ایک طرف بائیں ہاتھ کو جائیں تو ایک چھوٹی سی لیکن صاف ستھری گلی میں یہ دفتر تھا۔ اِس کے آگے ایک سیکیورٹی گارڈ کھڑا تھا۔ اسلام آباد میں اِکا دُکا ایسے گارڈ نظر آنے لگے تھے بلکہ یہ کہنا ٹھیک تھا کہ جس دفتر یا گھر کے سامنے کسی قسم کا سیکیورٹی گارڈ نظر آ رہا ہوتا، اُس کے متعلق یہ بات کہنے میں کوئی حرج نہیں تھا کہ یہ جگہ کچھ خاص اہمیت رکھتی ہے۔ سیکورٹی گارڈ عموماً اونچے ڈیل ڈول اور ہیبت ناک قسم کے رکھے جانے لگے تھے۔ اکثر اِن میں سے انسان کی بجائے حرکت کرتے ہوئے دیوہیکل بھیانک بُت ہوتے تھے۔ یہ بُت دیے گئے آرڈر کو اپنے اندر سال ہا سال کے گزرنے کے بعد بھی تر و تازہ رکھتے تھے اور اُس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں لاتے۔ اِن سے زیادہ گفتگو کرنا کسی بھی صورت فائدہ مند نہیں ہوتا۔ مجھے دیکھتے ہی سیکیورٹی گارڈ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

جی فرمایئے، کس سے ملنا ہے؟

ظفر عالم صاحب سے ملنا ہے، آپ اُسے جا کر میرا نام بتا سکتے ہیں۔ نام ضامن علی ہے۔

کیا کام ہے؟

وہ تو ابھی مجھے نہیں پتا۔ مَیں مسکرایا۔

عجیب آدمی ہے صاحب کے پاس اتنا فارغ ٹائم نہیں۔ سیدھا بات نہیں کرتا۔ ام یہاں کس لیے کھڑا ہے؟

دیکھیے بھائی خان صاحب، آپ اِس لیے کھڑا ہے کہ اپنے جیسے دوسرے آدمی کو اندر نہیں جانے دینا اور کسی سمجھدار کو روکنا نہیں۔ اپنے صاحب کو بتاؤ ضامن علی آیا ہے۔ جاؤ چلے جاؤ۔

میری بات اُس کی سمجھ میں غالباً نہیں آئی اور وہ ٹک ٹک دیکھنے لگا پھر اِس سے پہلے کہ گارڈ کا دماغ گھوم جاتا، مَیں نے وہی پرچی نکال کر اُس کے آگے کر دی، بھئی یہ لے جاؤ، اپنے صاحب کو بتاؤ،

اُنھوں نے مجھے خود بلایا ہے۔

اچھا تو یوں کہو نا صاحب نے خود بلایا ہے، گارڈ نے کاغذ کا پُرزہ مجھ سے لیتے ہوئے کہا۔ اُس کے بعد مجھے سیکیورٹی کے کمرے میں لے جا کر کہا، یہاں بیٹھ جائیے مَیں ابھی صاحب سے پوچھتا ہوں۔ اُس کے بعد انٹر کام پر اُس نے کسی سے میرے بارے میں گفتگو کی اور جب انٹر کام رکھا تو میری طرف منہ کر کے بولا، جائیے، صاحب اندر ہی ہیں۔

میرے لیے یہ تمام عمل توہین آمیز اور اذیت ناک تھا مگر اب مَیں ایسی چیزوں کا عادی ہو چکا تھا۔ چنانچہ گارڈ کی شہنشاہانہ تفتیش اور بے نیازانہ مزاج سے مرعوب ہوتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا اور کوٹھی کے اندر داخل ہو گیا۔ یہ کوٹھی اندر سے نہایت وسیع اور دالان اور وسیع ہال اور آرائش کے تمام سامان سے مزین تھی۔ مجھے تصور کرنے میں دقت ہو رہی تھی کہ یہ کوٹھی تھی یا آفس۔ مَیں نے بڑے بڑے آفس دیکھے تھے مگر ایسا بنگلہ نما آفس پہلی بار دیکھا تھا۔ کام کرنے والا عملہ بھی زیادہ نہیں تھا۔ درمیان کے ڈرائنگ روم میں ایک بہت بڑی قالین تھی اور اُس سے آگے ایک کھلا کمرہ تھا۔ ڈرائنگ روم میں ایک بڑی گول سی میز اور اُس کے آس پاس دو تین شاہی قسم کے موڑھے تھے، یہ موڑھے ایلیٹ گھروں کی زینت ہوتے ہیں۔ یورپ سے نئے نئے اِن کے رواج تیسری دنیا کے ملکوں میں ہو رہے تھے۔ اُسی ڈرائنگ روم میں ایک بڑی سی صوفہ سیٹ تھی۔ میرے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی ایک چھ فٹ قامت کا آدمی جس کی فرنچ کٹ داڑھی تھی اور ایک سگار ہاتھ میں تھا، سامنے والے کمرے سے نکل کر میری طرف بڑھا اور پُرتپاک انداز میں ہاتھ آگے کیا، مجھے ظفر عالم کہتے ہیں۔ مَیں نے ایک زمانہ دیکھ رکھا تھا، مجھے کسی طرح سے بھی یہ آدمی سویلین معلوم نہیں ہوا۔ خاص کر جب اُس نے ہاتھ ملایا تو اُس کے ہاتھ کی سختی کو ایسے محسوس کیا جیسے لوہے کی انگلیاں ہوں یا وہ شخص ایک کھلاڑی ہو۔ اُس نے سوٹ پہن رکھا تھا اور عینک کے شیشے اتنے شفاف تھے کہ مجھے پہلی نظر میں فریم نظر آیا تھا لیکن شیشے دکھائی نہ دیے تھے۔

آیئے ضامن صاحب بیٹھیے، اُس نے مجھے ایک طرف بٹھاتے ہوئے کہا۔

چائے لیں گے یا کافی؟

جو چیز آپ اچھی پلا سکتے ہیں منگوا لیجیے، میرے ہاں زیادہ نخرے نہیں ہیں۔ مَیں نے ہنس کر کہا۔

مَیں حقیقت میں اِس پوری فضا سے مرعوب ہو چکا تھا۔ مجھے اِس بات کا احساس تھا کہ یہ جگہ اور یہ دفتر کسی بھی طرح ایسے ہاتھوں میں نہیں ہے، جہاں میرے کام کا معاوضہ روک لیا جائے گا اور مَیں دوبارہ اُنھی فٹ پاتھوں پر پاؤں چٹخاتا پھروں، جیسے پہلے کرتا آیا ہوں۔ اُسی اثنا میں ایک لڑکا وہاں آ گیا۔ یہ ماڈل قسم کا لڑکا تھا۔ عورتوں کی سی ہیئت اور شکل وصورت کے علاوہ نزاکت کا معیار بھی وہی تھا۔ میری بات سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ یہ لڑکے جیسے میں حسنات کے ہاں دیکھ چکا تھا اور اب یہاں بھی یہ لڑکا ویسا ہی تھا، میرے خیال میں کھاتے پیتے گھروں کے ڈیسنٹ لڑکے تھے پھر یہاں یہ کیسے اِس طرح اِن کے احکامات کی تعمیل کرتے تھے۔ ایک طرف اِن کا لباس اور چلنے پھرنے کا انداز شہزادوں کی طرح نظر آتا تھا، دوسری طرف چائے اور کافی ڈھوتے تھے۔ لڑکا قریب آیا ظفر عالم نے اُسے کافی کا آرڈر دیا۔ رؤف بیٹے ذرا اچھی سی کافی بنا لاؤ۔ آرڈر سنتے ہی لڑکا چلا گیا۔

ضامن صاحب، مَیں آپ سے بہت عرصے سے واقف ہوں، آپ کے شگفتہ اور سُبک مضمون پڑھ کے مزا لیتا ہوں، کافی دِنوں سے وہ مضامین چھپ نہیں رہے تھے۔ پھر مَیں نے حسنات سے پوچھا، بھئی وہ آپ کے رسالے میں لکھنے والا آدمی کہاں گیا، اُس نے بتایا آپ معاشی مشکلات سے دوچار ہیں۔ آپ کو تو معلوم ہے یہ پروڈکشن ہاؤس ہے۔ مختلف ایڈورٹائزمنٹ اور دوسری چیزیں بنا کر بیچنا ہوتی ہیں۔ اِن میں آپ کو ہم ضائع نہیں کرنا چاہتے کہ جنگل لکھتے پھریں۔ البتہ اِدھر ہمارے پاس ایک کام تھا، مجھے خیال آیا کیوں نہ وہ کام آپ سے لیا جائے۔ آپ کی تحریر میں تاثیر بہت ہوتی ہے، ہمیں ایسے شخص کی ضرورت تھی جو یہ تحریریں لکھ سکے۔

مَیں نے اُن کی پوری بات سنے بغیر ہی کہا، کوشش کروں گا کام ذمہ داری سے پورا کروں۔ حسنات آدمی ٹھیک ہے لیکن شاید مَیں اُسے فالتو محسوس ہوا ہوں، اِس لیے اُس نے اپنی بجائے مجھے آپ کی طرف بھیج دیا۔

نہیں ایسی بات نہیں، اِس پورے سسٹم میں وہ بھی ہمارا پارٹنر ہے۔ آپ یہاں کام کریں گے تو سمجھیں حسنات بھی ہمارا کولیگ ہو گا۔ ظفر عالم نے میری بات بھانپ کر وضاحت کی۔ دراصل پرنٹ میڈیا کا معاملہ اِس ملک میں ہمیشہ سے کسمپرسی کا شکار رہا ہے۔ ایسی حالت میں کہ جب اخبار کے مالک کو مفت لکھ کر دینے والے بہت ہوں اُس وقت تنخواہ صرف ایسے لوگوں کو دی جاتی ہے جن کی ڈیوٹی چھ یا آٹھ گھنٹے میز کے کناروں سے گھسٹ کر گزرتی ہے۔ جن کا دفتر میں آنا جانا نہ ہو اُن کا کام بزنس مین یا

اخبار کو نظر نہیں آتا۔ بزنس چاہے سنجیدہ لکھنے والوں ہی کی بدولت کیوں نہ چل رہا ہو مگر اُنھیں تنخواہ دینے سے ایسے لگتا ہے جیسے جرمانہ ادا کیا جا رہا ہو۔ اب چاہے اِس میں خود آپ کے پرانے دوست الطاف حسن ہوں یا حسنات۔

یعنی آپ کا مطلب ہے کہ اخبار ایک بزنس ہے۔ مَیں نے ظفر عالم کو اپنی شکایت درج کرائی۔

جی ہاں مگر اب یہ بات ایسی سیدھی ہے کہ قابلِ تذکرہ بھی نہیں۔ البتہ آپ سے جو کام یہاں لیا جائے گا اُس میں آپ ایسی کسی صورتِ حال کے شکار نہیں ہوں گے۔

تو گویا مجھے یہاں میز اور کرسی کے کنارے لگنا پڑے گا۔ مَیں نے تشویش کا اظہار کیا، یعنی روزانہ ڈیوٹی پر آنا ہو گا؟

اُس نے ہنس کر کہا، آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے مگر آپ کسی کے جواب دہ نہیں ہوں گے اور ٹائم کی کوئی پابندی نہیں۔ اصل میں سامنے والی چیزیں یاد رہنا فطری بات ہے۔ آپ جتنے بھی اہم ہوں، اگر نظروں سے اوجھل ہیں تو آپ کا معاوضہ مارا جانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ پھر بھی آپ کو یہاں ایسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

(۶۲)

ظفر عالم کے دفتر سے نکلنے کے بعد میری طبیعت میں کچھ ٹھہراؤ آ گیا۔ یہ عصر کا وقت تھا میرے وہاں بیٹھے ہوئے یہ بات عیاں ہو چکی تھی کہ یہ لوگ شیزا سے بھی خوب واقف ہیں بلکہ اُس کے پاس مجھے رکھنے کا بھی اِن کا اپنا کوئی مقصد ہے جو مجھے سرِ دست سمجھ نہیں آ رہا تھا لیکن اب مَیں جان بوجھ کر بھی اِن کے ہاتھوں میں کھیلنا چاہتا تھا اگر وہ مجھے کھیلانا چاہتے ہوں۔ شیزا فی الحال مجھ سے دُور نہیں جا رہی تھی۔ مَیں اِس وقت ضرور سیدھا فلیٹ پر جاتا اور شیزا کو دیکھنے کی کوشش کرتا مگر مَیں اپنی طبیعت پر جبر کر کے اُس سے تھوڑا فاصلہ رکھنے کو ترجیح دے رہا تھا۔ دو بار اُس نے جس طریقے سے میری توہین کی تھی اِس بات کو دیکھتے ہوئے تیسری بار اپنے آپ کو اُس کے سامنے پھینک دینا نہیں چاہتا تھا۔ اِن تمام باتوں پر غور کرنے کے بعد اب مجھے خیال آیا کہ اپنے کچھ سابقہ دوستوں سے مل لیا جائے۔ ان میں سے میرا ایک دوست رضوان احمد مریڑھ چوک پر ایک مکان میں رہتا تھا۔ یہ سوچتے ہی مَیں آب پارہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہاں سے ایک لاری راولپنڈی صدر تک جاتی تھی۔ آب پارے سے مَیں لاری پر بیٹھ گیا اور آدھے گھنٹے میں مریڑھ چوک جا پہنچا۔ مجھے اُس کا گھر ڈھونڈنے میں دیر نہیں لگی مگر وہاں پہنچنے کے بعد میرے حواس مختل ہو کر رہ گئے۔ اُس کے گھر کی بجائے وہاں ایک پلازہ کھڑا تھا یعنی تین سال پہلے یہاں ایک مکان تھا۔ مَیں نے اردگرد کے لوگوں سے رضوان صاحب کے بارے میں پوچھا مگر اُن کی کوئی خبر نہیں ملی۔ تب میں بور ہو کر واپس اُسی طرح لاری پر بیٹھا اور اسلام آباد آ گیا لیکن مَیں ابھی فلیٹ

پر جانا نہیں چاہتا تھا۔ آخر زیرو پوائنٹ پر اُتر کر پیدل چل پڑا۔ زیرو پوائنٹ سے تھوڑا شمال مشرق کی طرف دیکھیں تو ایک بہت بڑے بینک کی عمارت بن رہی تھی۔ اُس کے پہلو میں ایک چائے کا ہوٹل تھا۔ مَیں نے سیدھا اُسی چائے کے ہوٹل کا رُخ کیا اور چائے کا آرڈر دے دیا۔ آدھ گھنٹا یہاں بیٹھ کر دوبارہ اُٹھا اور جی سیون سے ایف سیون کی طرف جانے والی سروس روڈ پر چلتا گیا۔ اِس کے دائیں اور بائیں جانب چیڑ کے درخت جوان ہو رہے تھے۔ اگر یہ درخت پورے اسلام آباد میں اِسی طرح لگا دیے جائیں تو برف باری کا امکان سو فیصد بڑھ جائے۔ پھر یہ شہر اپنی خوبصورتی میں کسی بھی یورپی شہر سے پیچھے نہیں رہ سکے گا مگر اسلام آباد کی موجودہ انتظامیہ اِن درختوں کی بجائے جھاڑیاں لگانے میں زیادہ دلچسپی رکھتی تھی۔ صاحب لوگوں کو درختوں کا سڑکوں پر پتے پھینکنا بہت بُرا لگتا ہے۔ اُن کے خیال میں چھوٹی صحرائی پھولوں کی جھاڑیاں پتے نہیں بکھیرتی مگر وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ جھاڑیاں چھاؤں بھی نہیں بکھیرتیں۔ اِنھی خیالوں میں بلیو ایریا کی سروس روڈ آ گئی۔ اب عشا کی اذانیں ہو رہی تھیں اور ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی اور مَیں ایف سکس کے شیزا والے فلیٹ کے سامنے کھڑا تھا لیکن ابھی فلیٹ میں داخل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ مَیں نے پورا دن کھانا نہیں کھایا تھا، البتہ چھ سات دفعہ چائے پینے کے بعد زبان چھدسی گئی تھی۔ پہلے کسی ہوٹل پر بیٹھ کر تسلی سے کھانا کھانا چاہتا تھا۔ میرے خیال میں ایف سکس ون کی مرکزی مارکیٹ سے بہتر کوئی اور ہوٹل نہیں تھی۔ مَیں سیدھا وہاں پہنچا اور ایک لکڑی کے بنچ پر بیٹھ گیا۔ یہ ہوٹل ایک چھوٹے سے شہتوتوں کے جنگل میں تھا اور نہایت سایہ دار جگہ تھی مگر مَیں رات اور سردی کے اِس پہر شہتوتوں کے سایے میں نہیں بیٹھ سکتا تھا چنانچہ سڑک پر کرسی لگا کر بیٹھ گیا اور ہوٹل والے سے سبزی کے ساتھ دو روٹیاں منگوا لیں۔

آخر اِدھر اُدھر کی آوارہ گردی کے بعد فلیٹ پر پہنچا۔ حسبِ توقع فلیٹ میں کوئی موجود نہیں تھا۔ میرے لیے یہ ایک عجیب نفسیاتی مرض بن چکا تھا کہ اب اُس فلیٹ میں اکیلے میرا دم گھٹنے لگتا تھا۔ کجا وہ دن کہ کسی کے سائے سے بھی ڈرتا تھا اور کجا یہ وقت کہ تب تک فلیٹ میں جانے سے ہول آتے تھے جب تک ذیشان یا شیزا میں سے کوئی ایک وہاں موجود نہ ہو۔ خاص کر شیزا کی موجودگی مجھے سرشار کر دینے کے لیے کافی تھی۔ اُس کی وہاں غیر حاضری یوں محسوس کرنے لگا جیسے فلیٹ میں میری روح نہیں ہے اور مَیں کسی مردہ خانے میں داخل ہو گیا ہوں۔ طوعاً کرہاً مَیں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کچن میں داخل ہو کر چائے بنائی اور اپنے بیڈ پر بیٹھ گیا۔ میرے لیے ایک اور المیہ جنم لے چکا تھا کہ اُس وقت تک

کوئی شے لکھنا تو درکنار قلم اُٹھانے کو بھی دل نہیں کرتا تھا جب تک شیزا وہاں نہ ہوتی بھلے وہ اپنے کمرے ہی میں ہو مگر اُس کو وہاں ہونا چاہیے تھا۔ یہ میری شدید خواہش ہو گئی تھی۔ ہوتے ہوتے رات کے بارہ بج گئے۔ مَیں ایک ذہنی اذیت کا شکار ہو کر رہ گیا تھا اور انتظار مجھے موت سے زیادہ شدید لگنے لگا تھا۔ آخر مَیں اپنے بیڈ سے دوبارہ اُٹھا اور چائے بنانا شروع کر دی۔ اس حالت میں رات کے ساڑھے بارہ ہو گئے۔ مَیں اپنی چائے لے کر بیڈ پر پہنچا ہی تھا کہ فلیٹ کے دروازے میں چابی لگنے کی آواز آئی۔ اُس کے ساتھ ہی میرا دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ مَیں بھاگ کر اپنے کمرے سے باہر نکلا اور ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ یہ میری اضطراری حالت کا دورانیہ تھا اور انتہائی مضحکہ خیز تھا۔ مَیں اتنی تیزی سے بھاگ کر ڈرائنگ روم میں پہنچا تھا جیسے کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو۔ میرے سامنے دونوں بہن بھائی کھڑے تھے۔ دونوں کے ہاتھ میں کئی بیگ پکڑے ہوئے تھے جن میں کپڑے اور پرفیوم قسم کی خریداری کی گئی تھی۔ وہ دونوں مجھے اتنی مضطرب اور تیزی میں دیکھ کر ایک دفعہ حیرت زدہ ہو گئے اور کمرے میں داخل ہوتے ہوتے رُک گئے، شیزا پیچھے مڑی اور بولی، ضامن صاحب خیر ہے، کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟

مَیں حواس باختہ ہو چکا تھا۔ اُسے جواب دینے کے لیے منہ کھولا تو محسوس ہوا میری سانس پھول گئی ہے، مَیں ہکلا کر بولا۔

ہوں، آں، نہیں کچھ نہیں ہوا، مَیں سمجھا پتا نہیں دروازے پر کون ہے۔ اس وقت رات گئے۔

میرے یہ الفاظ سنتے ہی وہ رُک گئی اور سامان اُس نے ذیشان کو دے دیا اور بولی، ذیشان آپ نے ضامن صاحب کو فلیٹ پر رہنے کی شرائط نہیں بتائی تھیں؟

مَیں نے اِنھیں بولا تھا اپنے کام سے کام رکھیں اور ہمارے کسی بھی فعل پر حیران نہ ہوں۔ نہ ہماری خاطر پریشان ہوں، ذیشان نے نہایت بے تکلفی سے جواب دیا۔

ضامن صاحب آپ نے سُن لیا؟ دیکھیے آپ ہمارے لیے بہت معزز ہیں۔ رائٹر ہیں اور کرایہ دار بھی ہیں اور بس۔ آپ جب بھی آئیں چابی آپ کے پاس ہے۔ آپ تو پھر غیر ہیں، مَیں خود اور ذیشان ایک دوسرے کے کسی کام میں دخل نہیں دیتے اور نہیں پوچھتے کہاں سے آئے ہیں؟ آپ کافی دنوں سے پریشانی میں چل رہے ہیں۔ دیکھیے ہمیں کچھ نہیں ہو گا۔ یہاں ہمارے بہت جاننے والے ہیں۔ فی الحال ہمیں آپ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ ہماری فکر مت کیجیے گا۔

جی شیزا، ذیشان اور آپ ایک دوسرے کے کاموں میں دخل اندازی تو واقعی نہیں کرتے ہوں

کہ مگر ابھی دونوں اکٹھے تو آئے ہیں؟ کیا یہ بات کافی نہیں کہ آپ ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں۔ جب کہ مَیں اتنے دنوں سے یہاں رہتے ہوئے صرف ڈرتے رہنے کے علاوہ کچھ نہیں کر رہا کہ خدا جانے آپ کس بات پر ناراض ہو جائیں گی۔

میرا جملہ سُن کر وہ ہنس دی اور بولی، نہیں ضامن صاحب مَیں آپ کو شاید جھڑکتی رہوں، ناراض نہیں ہوں گی۔ آپ ایک اچھے انسان ہیں۔ ہاں مگر تھوڑا سا بزرگوں کی طرح رہنا پسند کرتے ہیں اور گڈ نائٹ۔

یہ کہتے ہی وہ دونوں ہنستے ہوئے کمرے میں چلے گئے۔ اِدھر اِس ایک جملے نے میری پوری دنیا کا مزاج ہی ایک دم بدل کے رکھ دیا۔ پورا جسم توانا اور شادابی کی صورت اختیار کر گیا۔ ہر چیز نکھری نکھری معلوم ہونے لگی۔ اِس میں سب سے پہلا جو کام میرے دل میں آیا وہ یہ تھا کہ کچن کے برتن دھلے ہوئے نہیں ہیں۔ مَیں کچن میں داخل ہوا اور پانچ ہی منٹ میں تمام برتن دھو کر اور ٹاکی مار کے سب صاف کر دیے۔ پھر آپ ہی آپ ہنسنے لگا، کبھی گنگنانا شروع کر دیتا۔ یہ ایک عجیب فلیٹ تھا اور یہ عجیب دنیا تھی جس کی قربت مجھے سکون دیتی تھی مگر اُس وقت جب شیزا اُس میں موجود ہوتی اور اُس کی قربت ہی مجھے ڈراتی تھی جب شیزا وہاں نہ ہو۔ اُس رات کے بعد ذیشان تین چار بار مزید میرے کمرے میں دوبارہ آ کر سویا۔ جس کی بابت ہم دونوں خموش اور خواب کی حالت میں ملتے تھے لیکن پھر آہستہ آہستہ اُس نے یہاں سونا بند کر دیا اور اگر ضرورت پڑتی تو ڈرائنگ روم میں ہی سو جاتا تھا۔ اس کی وجہ سے مجھ میں گرم جوشی کی کمی تھی کیونکہ مصیبت یہ تھی، جب وہ میرے کمرے میں ہوتا عین اُسی وقت شیزا کا بوائے فرینڈ شیزا کے ساتھ ہوتا تھا۔ یہ بات میرے لیے عجیب مخمصہ پیدا کیے ہوئے تھی۔ میرا دماغ اُسی طرف لگا ہوتا تھا۔ میری حالت یہ ہو چکی تھی کہ قصائی سے گوشت کی خریداری کے وقت اُس سے، جانوروں پر رحم کھانے کی تقریر شروع کر دوں۔ کہیں شیزا اور ذیشان میرے لیے ایک ہو جاتے تھے اور کہیں دو الگ الگ قربت کے استعارے۔ ذیشان شیزا سے عمر میں چھوٹا تھا اور اُس نسبت سے گفتگو اور مزاج میں بھی تھوڑا سا لا اُبالی تھا۔ اُس کا پہلے دن شرائط طے کرنا دراصل شیزا ہی کی شرائط تھیں۔ کیونکہ اُن شرائط کی پاسداری کی ذیشان کی طرف سے کم شیزا کی طرف سے زیادہ یاد دہانی کرائی جا رہی تھی۔ میرے لیے اِس فلیٹ اور اِس دنیا میں جہاں اب مَیں اپنے معاش کے لیے داخل ہوا تھا نئے امکانات کے دروازے کھلنے لگے تھے۔ یہ دروازے زندگی سے لذتیں کشید کرنے کے ساتھ ساتھ اُسے سمجھنے کے لیے بھی اہم

تھے۔ مَیں نے شوبز کا نام سُنا تھا، اُس کے حسن کی کھلی روشنیاں دیکھنے کا ابھی تک موقع نہیں ملا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا اِس دنیا میں فقط نشاط ہے۔ غم کا کہیں گزر نہیں ہوتا۔ مَیں کسی فلم انڈسٹری سے وابستہ نہیں ہوا تھا مگر میرے جیسے انسان کو جو زندگی بھر ایک کال کوٹھڑی کی بدنصیبیوں اور سیاہیوں میں گھُٹ رہا ہو سوئی کے نا کے جیسا وہ سوراخ ہی کافی تھا جہاں سے ہوا کی تازہ جھونکیں آ رہی ہوں۔ مَیں ابھی تک کسی نسوانی جسم کی لذت کا تجربہ حاصل نہیں کر پایا تھا مگر اُس پرفیوم کی مہک سے اُن اجسام کی تابانیوں کا احساس ضرور کر رہا تھا جو شاید ایک دن اختلاط کی تپش سے ہمکنار کر سکتی تھیں۔ یہ شہر لامحالہ کراچی اور لاہور کی نسبت کم پُر پیچ تھا۔ اِس کی گلیوں میں جسموں کا جسموں سے چھو جانے کی نسبت فطرت سے چھونے کے امکانات زیادہ تھے۔ یہاں صورتیں دُور دُور سے نظر آتی تھیں اور غائب ہو جاتی تھیں۔ اُن صورتوں سے ٹکرانے کی بجائے اُنھیں دیکھنے کے مواقع زیادہ تھے۔ جبکہ مذکورہ دونوں شہروں میں دیکھنے کا موقع کم ملتا تھا اور ٹکراؤ زیادہ تھا۔ اُس کے بعد ایک نئے ٹکراؤ کی صورت بنتی تھی۔ جہاں انسان کو دیکھنے کی فرصت کم ملے اور تصادم زیادہ ہوں۔ وہاں ایک دن انسان اندھا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی لاہور اور کراچی میں اندھوں کی بستیاں پورے شہروں پھیلی ہوئی تھیں۔ جبکہ اسلام آباد کے اندھے مختلف باڑوں کے اندر تھے باقی شہر میں فطرت موجیں مارتی تھی۔ یہ ایک گاؤں تھا اور یہاں ابھی تک چیزیں چیزوں کو پہچانتی تھیں، لوگ لوگوں کو پہچانتے تھے۔ بُروں کی اپنی الگ بستیاں تھیں اور اچھوں کی اپنی بستیاں تھیں۔ اِس بستی میں گلے میں ٹائی کے پٹے بھی دیکھے جا سکتے تھے اور بغیر ٹائی کے قیدی بھی پہچانے جا سکتے تھے۔ میرے ساتھ یہاں جو کچھ پیش آ چکا تھا اگر کسی دوسرے شہر میں آتا تو مَیں اپنے مجرموں کو دوبارہ نہ دیکھ سکتا مگر یہاں اُس وقت کا منتظر ہوں جب اُنھیں کسی چوراہے پر روک کر اپنا حساب چکا لوں۔ خدا کا شکر تھا اِس شہر کے بنانے والوں نے یہاں چوراہے کثرت سے بنائے تھے۔ اُنھیں غالباً معلوم نہیں تھا ایک وقت آئے گا عوام کو اِن چوراہوں کی ضرورت پڑے گی۔ میرا خیال شیزا سے کسی اور طرف بھٹک گیا تھا۔ اِن بھٹکے ہوئے راستوں پر رات دو بجے مجھے نیند نے آ لیا۔ نیند کا غلبہ میرے لیے تمام غموں سے نجات کا سلسلہ ہوتا تھا۔ وہ مجھے تھوڑے وقت کے لیے ہی سہی مگر آتی ضرور تھی۔

(۶۳)

آج مجھے ظفر عالم کے پروڈکشن ہاؤس جاتے ہوئے تین ماہ ہو گئے تھے۔ مَیں اُس کے آفس کی چیزوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اِس عرصے میں مَیں نے دو تین جنگل بھی لکھے جنھیں شوٹ کر دیا گیا۔ میرے لیے یہ کام بہت آسان تھا اور نہ ہونے کے برابر تھا۔ یہاں مجھے موقع ملا کہ مَیں دوبارہ اپنے فکشن پر توجہ دوں۔ اِسی کے ساتھ مَیں تمام اخلاقی اقدار کو ایک طرف رکھ کر عبادت علی کا کام بھی کر رہا تھا۔ اُس کے لیے مجھے اُس کے کام کے سلسلے میں کم از کم ایک ماہ باہر وزٹ پر جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اِس عرصے میں مَیں نے ایک ٹائپ رائٹر بھی خرید لیا اور اُسے خود چلانا شروع کر دیا۔ میلوڈی میں ایک ہی دکان تھی جہاں میرا ٹھکانا تھا۔ مَیں وہیں سے کتابیں لیتا تھا اور وہیں سے کاغذ خریدتا تھا۔ عابد صاحب نہایت وضع دار انسان تھے۔ اب اُنھیں میری ضروریات کا خوب پتا چل چکا تھا۔ فارغ وقت میں اور دفتر سے آتے ہوئے واپسی پر وہاں جا کر بیٹھ جاتا۔ یہ میلوڈی بک ڈپو میرے لیے حاجی فطرس علی کا مطب ثابت ہوئی تھی۔ دُکان کے مالک عابد صاحب اور ایک دو احباب مزید، جن کا یہاں مستقل ٹھکانا تھا، میرے لیے ذہنی بلوغت اور مانوسیت کی علامت ہو گئے تھے۔ کتابوں کی دُکان کے پہلو میں وہی چائے والی دُکان جس کے اُوپر پیپل کا درخت اپنی بہار دکھا رہا ہوتا تھا، ایک ایسا دوست ہو چکا تھا جسے جاتے ہی مَیں ایسے چھوتا تھا جیسے اپنے ایک دوست کو گلے مل رہا ہوں۔ اُس کی شاخیں اور ٹہنیاں میرے ساتھ عین اُس ٹاہلی کی طرح باتیں کرنے لگی تھیں جنھیں مَیں ایک مدت پہلے اپنے گھر چھوڑ آیا

تھا۔ خاص کر پیپل کے اُوپر اڑتے ہوئے دُور آسمان کی نیلگوں بلندیوں میں کبوتر اور پہاڑی کوئیں مجھے مسحور کر دیتی تھیں۔ جس دن مَیں میلوڈی بک ڈپو پر نہ جاتا، ایک خلا کا احساس دامن گیر رہتا۔ اس شہر میں ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ راستے کھلے تھے اور آتے جاتے لوگوں سے پیدل کہیں نہ کہیں ملاقات ہو جاتی۔ ذیشان اور شیزا کے بارے میں اب میری طبیعت میں ٹھہراؤ سا آ گیا تھا۔ مَیں اُنھیں اُسی حالت میں قبول کرنے لگا تھا جس میں وہ چاہتے تھے۔ اگرچہ میرے دل میں ابھی تک اُن کے متعلق اِس تعلق سے آگے ایک کسک تھی مگر مَیں اُس کسک کو دل ہی میں رکھنا چاہتا تھا۔ مَیں نے ہر اُس حرکت اور سلوٹ کو مٹا دیا تھا جس سے میری اُن کے بارے میں ذرا سی بھی جستجو کا شائبہ نکلتا ہو۔ دونوں سے دن میں ایک دو بار ڈرائنگ روم میں ملاقات ہو جاتی تھی۔ وہیں دوستوں کی طرح باتیں کرتے تھے اور جھوٹ موٹ لڑتے بھی تھے مگر شیزا کی طرف سے کسی ایسے قرب کا کبھی اشارہ تک نہیں ہوا تھا جسے مَیں اپنائیت کا آغاز قرار دے سکوں۔

وہ اکثر اپنے کمرے میں بند رہتے اور باہر جاتے تو رات گئے لوٹتے تھے اور کوئی نہ کوئی اُن کے ساتھ ہوتا تھا۔ اکثر شیزا کی دوست لڑکیاں اور کبھی کبھی اُس کے مرد دوست جنھیں اب مَیں اچھی طرح پہچان چکا تھا، ساتھ ہوتے تھے۔ اِن مرد دوستوں میں دو لوگ زیادہ آتے جاتے تھے۔ اُن میں ایک فوجی آفیسر تھا اور ایک کسی سیکرٹری کا بیٹا تھا۔ مَیں شیزا کے اُن سے تعلقات اچھی طرح جانتا تھا لیکن سوائے کڑھنے کے میرا کوئی چارہ نہیں تھا۔ مَیں یہ بھی جان گیا تھا ظفر عالم اور اُس کی بیوی پروڈکشن ہاؤس کے ساتھ سیکس مارکیٹ کا بزنس بھی کرتے تھے۔ اُن کی یہ مارکیٹ ملک سے باہر بھی تھی۔ اس میں سیکس کی تمام اقسام پائی جاتی تھیں مگر یہ مہنگے داموں بکتی تھیں۔ اِن گیز، لیز بئین اور عام سیکس یعنی ہر قسم کی ضروریات اِن کے پروڈکشن ہاؤس میں چلتی تھیں۔ مَیں اُن کے آفس کے اندر محض ایک ایسا کیمرہ تھا جسے ایک اور کام بھی دے دیا گیا تھا کہ مختلف فنکشنز کا احوال شوبز کے رسالوں میں لکھوں۔ اُن تحریروں کو اُسی وقت انگریزی میں ٹرانسلیٹ کر کے انگریزی رسالوں میں بھیج دیا جاتا تھا۔ یہ رسالے زیادہ تر مڈل ایسٹ میں جاتے تھے اور اِن کے اندر نہایت اشتہا انگیز تصویروں کے ساتھ یہ تحریریں چھپتی تھیں۔ یہ تحریریں اِس طرح لکھنا ہوتی تھیں کہ کچھ چھپا بھی نہ رہے اور ظاہر بھی نہ ہو۔ اُس کے عوض انھیں فارن کرنسی میں پے منٹ ہوتی تھی اور یہ بہت زیادہ ہوتی تھی۔ اُس میں سے مجھے زیرہ برابر دے دیا جاتا تھا۔ پہلے پہل مَیں نے سمجھا تھا یہ تحریریں ہی اصل کام ہے جو اِن رسالوں میں چھپتی ہیں مگر کچھ

ہی عرصے بعد مجھ پر انکشاف ہوا کہ اُن تحریروں کے ساتھ چھپنے والی لڑکیوں اور لڑکوں کی تصویریں زیادہ اہم ہوتی تھیں۔ اُنھیں دبئی، عرب امارات اور سعودی عرب میں بطور ایکٹر پیش کر کے وہاں سے اچھی خاصی رقوم اینٹھ لی جاتی ہیں۔ یہاں سے بھیجی ہوئی لڑکیاں اور لڑکے ایک معاہدے کے تحت آتے اور جاتے تھے۔ کئی بار شیزا اور ذیشان بھی جا چکے تھے مگر پریشان کن بات یہ تھی کہ پروڈکشن میں ان کام کرنے والے تمام ملازموں کو اُس رقم کا عشرِ عشیر بھی نہیں ملتا تھا جو وہاں سے ملتی تھی۔

ایک دن مجھے ظفر عالم نے فلیٹ پر فون کر کے بتایا آج میریٹ ہوٹل میں فرانس اور دبئی کی معاونت سے ایک موسیقی پروگرام ہے۔ آپ وہاں پہنچیں گے اور شیزا آپ کو لیتی آئے گی۔ اُس کے پاس آپ کا پاس بھی موجود ہے۔ آج کے دن دفتر بند ہوگا کیونکہ ہم سب لوگ ہوٹل میں پروگرام کی مینجمنٹ میں مصروف ہیں۔ آپ لوگ رات نو بجے وہاں پہنچ جائیں۔ یہ بات میرے لیے نہایت خوش کن تھی۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا مَیں شیزا سے قریب ہوں۔ ظفر عالم کا مجھے یہ کہنا ہی میرے لیے طمانیت کا باعث تھا کہ وہ مجھے لیتی آئے گی اور میرا اجازت نامہ یعنی پاس اُس کے بیگ میں ہے۔ گویا یہ سمجھا جانے لگا تھا کہ مَیں شیزا کے پاس رہتا ہوں۔ اُس کا مجھے ساتھ لے کر جانا اور میرا پاس اپنے پاس رکھنا سُرخ موسموں میں رنگوں کی آمیزش کے مترادف تھا۔ اب مَیں شدت سے رات نو بجے کا انتظار کرنے لگا مگر یہ انتظار زیادہ دیر نہیں کرنا پڑا۔ صبح ساڑھے گیارہ بجے ہی میرے کمرے پر دستک ہوئی اور یہ شیزا تھی۔

مَیں کمرے سے باہر نکلا تو شیزا ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کے آگے کافی کا کپ اور آملیٹ رکھا تھا۔ گویا وہ کافی پہلے سے اُٹھی ہوئی تھی۔ مَیں جب بھی شیزا کا سامنا کرتا تھا دبا دبا رہتا تھا۔ جیسے مَیں اُس کا ملازم ہوں یا ایک بچے کی طرح ہوں۔ یہ حالت اُس نے مجھے پہلے دن سے ہی ڈانٹ ڈپٹ کے کی تھی۔ وہ اِس معاملے میں حق بجانب تھی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو ہوسکتا تھا مَیں اُس کے کرایے دار کی نسبت اُس کا خاوند بننے کی زیادہ کوشش کرتا۔ شیزا نے مجھے سامنے بیٹھنے کے لیے کہا، جب مَیں بیٹھ گیا تو بولی ضامن صاحب آج کل کیا ہو رہا ہے؟ بہت خاموش خاموش رہتے ہو۔ ایسے بھی ہونٹوں کو سی لینا اچھی بات نہیں۔

جی نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ اپنے دوستوں کے ساتھ گپ شپ رہتی ہے۔ گونگا تو مَیں ہرگز نہیں ہوا۔ مَیں نے اپنے جملے میں طنز کی لہر چھوڑ دی تھی۔

تو کیا ہم آپ کے دوست نہیں ہیں؟ شیزا نے یہ جملہ آملیٹ ملے ٹوسٹ کو چھری سے کاٹتے ہوئے ایسے ادا کیا کہ مَیں بھی اُس کے ساتھ کٹ کے رہ گیا۔

مَیں سامنے بیٹھا تھوڑا سا تلخی سے مسکرایا اور بولا، شیزا مجھے کم و بیش یہاں رہتے ہوئے چار ماہ گزر گئے ہیں اور مَیں ایک اچھوت کی طرح یہاں پر ہوں۔ آپ جانتی تو ہیں۔

ارے ضامن صاحب کیسی بات کرتے ہیں۔ اچھوتوں کو اپنے کچن استعمال کرنے کو نہیں دیا کرتے۔ پھر مَیں جب بھی آتی ہوں یا ذیشان، ہم دونوں آپ سے جیسے ہی سامنا ہوتا ہے سلام لیے بغیر تو نہیں نکلتے اور یہاں روز گپ تو ہوتی ہے۔

شیزا آپ کو خبر نہیں فقط سلام تک گفتگو رکھنا عوام کے ساتھ اشرافیائی حرکت ہے، یہ بات کہتے ہوئے مَیں مسکرا دیا۔

اچھا اب غصہ تھو کیے اور آج رات نو بجے ہم ہوٹل چلیں گے آپ کا اجازت نامہ میرے پاس ہے۔ شیزا نے یہ بات ایسے کی جیسے مجھ پر احسانات کی بارش کر رہی ہو۔ اِس کے باوجود مَیں نے اُسے نہیں بتایا کہ یہ عنایت آپ کی طرف سے نہیں ظفر عالم کی طرف سے ہے۔

مَیں نے کہا جی ضرور یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے، جو مجھ پر ہو گی۔

نہیں ضامن صاحب، آپ میرے لیے بہت اہم ہیں، شیزا نے یہ جملہ ایسے میری آنکھوں میں دیکھ کر ادا کیا کہ جگر میں جیسے تلواروں کے کاٹ چل گئے ہوں۔ اُس کی آنکھوں میں ٹھہری ہوئی سبز طمانیت اور رسانیت کی ہوا میرے لیے محبت کے کئی پیغامات چھوڑ گئی تھی۔ کچھ دیر کے لیے میری زبان سے کوئی جملہ نہیں نکلا۔ ہاں کچھ آنسو کشید ہونے لگے تھے کہ مَیں نے بزور اُنھیں روک لیا۔ لیکن شیزا نے میری آنکھیں فوراً پڑھ لیں اور دوبارہ مسکرا دی۔ اُس کے بعد اُس نے میری دن بھر کی مصروفیات کے بارے میں بات کرنا شروع کر دی۔ مَیں اُسے اپنے شب و روز کی ایک ایک تفصیل بتانے لگا اور تفصیلات کے ساتھ۔ اُس میں کہیں کہیں دلچسپ کہانی بھی گھڑ لیتا جسے وہ حیرت و استعجاب کے عالم میں سنتی اور کھلکھلا کر ہنسنے لگتی تھی۔ مَیں نے چاہا تھا یہ یہیں بیٹھی رہے اور بالکل نہ اُٹھے اور مَیں اُسے یونہی کہانیاں سناتا رہوں۔

ہم دو گھنٹے ڈرائنگ روم میں بیٹھے رہے۔ اِس عرصے میں ہم دونوں نے دو بار چائے بنا کر پی۔ اتنے میں ذیشان بھی باہر نکل آیا۔ وہ ابھی نہا کر نکلا تھا۔ اُس نے باہر نکلتے ہی مجھے اور شیزا کو باتیں کرتے

ہوئے دیکھا تو خوشگوار موڈ میں وہیں بیٹھ گیا اور بولا آپی آج ضامن صاحب سے بہت چہلیں چل رہی ہیں۔

جی ہاں اور آج ہم کھانا بھی خیام ہوٹل پر مل کر کھائیں گے، کیوں ضامن صاحب؟ وہ میری طرف سنجیدہ ہو کر بولی۔

ہائیں یہ کیا، ابھی مجھے تو آپ نے کہا نہیں اور ذیشان سے کہہ رہی ہیں۔ مَیں واقعی حیران ہو رہا تھا۔

آج آپ ہی کے ساتھ سارا دن شان سے گزرے گا ضامن صاحب، آپ بھی کہتے ہوں گے شیزا ہر وقت ڈانٹتی رہتی ہے۔

ارے واہ، ہُر ررررا۔ ذیشان نے عین اُسی اسٹائل میں خوشی کا اظہار کیا جو وہ اپنے دوستوں کے ساتھ اِس فلیٹ پر کرتا تھا اور مَیں انھیں اُس بیگار کرنے والے نوکر کی طرح دیکھتا تھا جو فقط فاصلے پر خدمت گزاری کا صلہ وصول کرتا ہے۔ میرے لیے یہ عنایت کسی صورت زندگی کے نئے سلسلوں کا آغاز تھی۔ ایسے سلسلے جن کا تصور مَیں نے چار ماہ پہلے اُس وقت کیا تھا جب اِس فلیٹ میں داخل ہوا تھا مگر وہ سلسلے ساحلوں پر اُبھرنے والی لہروں کی طرح ریت میں بیٹھ گئے تھے۔

تھوڑی دیر میں ہم تینوں اُٹھ کر اپنے کمروں میں چلے گئے اور خیام ہوٹل جانے کی تیاری میں لگ گئے۔ خیام ہوٹل سپر مارکیٹ ایم اے جناح روڈ پر تھا۔ یہ ہوٹل ایرانیوں کی شاندار میزبانی اور ثقافت کا تلازمہ تھا۔ کھانا کھانے کے بعد شیزا مجھے ایک شاپ پر لے گئی اور ایک شرٹ اور پینٹ خرید کر دی۔ مَیں نے اُسے پیسے دینے سے سخت منع کر دیا۔ اپنی طرف سے اُسے کچھ خریداری کروا دی اور ایک پینٹ شرٹ ذیشان کو بھی خرید کر دی۔ میرے لیے یہ بہت عجیب بات تھی کہ ایک دم اس قدر التفات سمجھ نہیں آ رہا تھا مگر اتنا ضرور تھا کہ مَیں اب نشاط انگیزی کے آخری کناروں پر اُڑ رہا تھا۔ میرے دل میں کہیں ایک بات موجود تھی کہ ایک دم اُن کی مجھ پر ایسی توجہ کسی نئی مصیبت کی آئینہ دار نہ ہو مگر مَیں ہر اُس مصیبت کو اُٹھانے کے لیے تیار تھا کہ یہ میرے لیے خواہش سے زیادہ تڑپ بن گئی تھی۔ خیام ہوٹل سے پانچ بجے ہم واپس فلیٹ پر پہنچے۔ شیزا نے کہا اب وہ کچھ دیر کے لیے آرام کر لیں تا کہ اُس کے بعد فنکشن میں جانے کے لیے تیاری کرنے کے قابل ہو جائیں۔ پھر نہ جانے رات کتنے بجے تک ہوٹل میں ہنگامہ چلے۔

ہم تینوں اپنے کمروں میں آئے۔ اب میرے لیے بہت کچھ سوچنے کو تھا۔ وہ تمام باتیں جنھیں میں تصور کر سکتا تھا، باری باری تصور کیے جاتا تھا۔ ایسے خیال و تصورات جو دیہاتی گنواروں کو اُس وقت آتے ہیں جب ہوا کا ہلکا سا جھونکا بھی موافق چلے۔ وہ اُس جھونکے کو بنیاد بنا کر صدیوں کے معاشی بحران کے خاتمے کا تصور باندھ لیتے ہیں۔ اِن خیالات میں انسان کے اندر فوراً پیدا ہو جانے والی نچی کمینگی بھی چلی آئی تھی۔ کبھی مجھے خیال گزر رہا تھا شیزا اب اپنے آپ کو مجھ سے باندھنا چاہتی ہے اور شادی کے لیے پر تول رہی ہے۔ اُسے شاید یہ معلوم ہو گیا ہے مَیں اُس کے لیے بے ضرر اور سوال نہ کرنے والا خاوند ثابت ہوں گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے اُس نے چار مہینے تک مجھے ہر طرح سے دیکھ بھال لیا ہو کہ مَیں کہیں اُس کے لیے مشکل پیدا تو نہیں کروں گا یا اُس کے پیسے پر نظر تو نہ رکھوں گا۔ اُسے یہ بھی اچھی طرح خبر ہو چکی ہے کہ میرا کام میری آمدنی سے زیادہ ٹھیک اور درست سمت میں ہے اور مَیں اب اُس سے کچھ زیادہ بھی کما سکتا ہوں۔ اِس کے علاوہ بھی سیکڑوں خیالات آتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد مَیں اُنھیں خود ہی رد کر دیتا تھا۔ انسانی دماغ میں بعض چیزیں کچھ ایسے لمحوں میں انتہائی آسان اور عملی لگتی ہیں جنھیں جذبات کے کتھارسس ہو جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی سوچنے پر وہ نہایت مضحکہ خیز اور ناممکن ہو جاتی ہیں۔ ہو سکتا ہے جس لمحے انسان ایسی چیز سوچ رہا ہو جو ناممکن ہو اور دماغ اُسی لمحے پوری طاقت سے انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہو مگر توقف کے بعد دماغ کے سوچنے اور کرنے کی صلاحیتیں آگے پیچھے ہو جائیں۔ یوں تصور شدہ حقیقت محض افسانہ بن کر رہ جاتی ہے۔ بہر حال یہ ایک دماغ کی نفسیاتی پیچیدگی ہے جسے اِس وقت مَیں خود سمجھنے سے قاصر تھا اور ہر شے کو جھٹک کر صرف اِس بات پر اپنا دھیان لے جاتا تھا کہ رات نو بجے مَیں نے بہر حال شیزا اور ذیشان کے ساتھ میریٹ ہوٹل میں جانا ہے اور وہاں ایک پارٹی اٹینڈ کرنا ہے۔ یہ پارٹی ہی وہ پہلی حقیقت ہے جو مجھے عام سطح سے اُٹھا کر کچھ خاص لوگوں کی نسبت میں لا کر کھڑا کرے گی۔ عجیب بات تھی میرا وہ ادبی کام جسے مَیں اپنا فخر سمجھتا تھا، اُس کی حقیقت اِن لوگوں میں محض اُس پیمپر سے زیادہ نہیں تھی جسے آج کل مغرب سے نیا نیا امپورٹ کیا جا رہا تھا۔ اُن بچوں کی شِٹ جذب کرنے کے لیے جنھیں کل ہمارے حکمران بننا تھا۔ خیر مجھے اُن میں اپنا مقام بنانے کی ایسی کیا تمنا ہو سکتی تھی بجز شیزا کے، کہ وہی میری منزل تھی۔ اگر وہ منزل اِسی رستے سے میری طرف بڑھ سکتی تھی تو یہ سب کچھ میرے لیے دوہرے منافع کی طرح تھا۔

(۶۴)

ہم ہوٹل کے تیسرے فلور کی مین لابی سے دائیں ہاتھ کے کوریڈور سے گزر کر مہاراجہ ہال میں داخل ہو گئے۔ کافی لوگ پہنچ چکے تھے۔ میرے خیال میں اِنھیں لوگوں کی بجائے پیس کہا جائے تو بہتر ہو گا۔ لباس کی چکا چوند اور نیم برہنگی کیفیتوں کے بیچ یہ متحرک سائے تھے جو ہال میں ایک دوسرے کو مل رہے تھے، متعارف ہو رہے تھے اور ''ہائے'' کے گھسے ہوئے لفظ کے ساتھ گالوں سے گالیں ملاتے تھے اور بوسے لیتے تھے۔ یہ سب لوگ یا اِن میں سے اکثر ایک دوسرے سے شناسا تھے اور پہلے بھی اِس طرح کی پارٹیوں میں ملتے رہے تھے۔ ظفر عالم اور حسنات بھی وہیں تھے۔ ظفر عالم کی بیوی آگے بڑھ بڑھ کر سب کو ایک دوسرے سے ملا رہی تھی اور اُنھیں بتاتی جاتی تھی، ہی از فرسٹ سیکرٹری اِن امیریکن ایمبیسی، اِنھیں ملیے جرمن سیکنڈ ایمبیسیڈر وغیرہ۔ یہ عورت مجھے نہایت عیار اور تعفن زدہ معلوم ہوتی تھی۔ ظفر عالم بعض جگہ اپنی بیگم کو وہیں چھوڑ کر کسی دوسرے شخص کی طرف بڑھ جاتا تھا۔ اکثر لوگ اپنی بیویوں اور بیٹیوں کے ساتھ آئے تھے۔ البتہ مقامی لوگوں میں سے کسی کے ساتھ اُس کا بیٹا نہیں تھا۔ بیٹی ہر کسی کے ساتھ تھی یا پھر میاں بیوی تھے۔ تین چار فارنرز کے ساتھ اُن کے بیٹے بھی تھے، جن کا تعارف اُن کے والدین اپنی بیٹیوں کے ساتھ کروا رہے تھے۔ میرا یہاں سوائے ظفر عالم اور شیزا کے کوئی دوسرا واقف نہیں تھا۔ شیزا جن دو چار کو خود جانتی تھی، اُن سے میرا تعارف کروایا اُس کے بعد اُس کی اپنی پہچان کی زنبیل پوری ہو گئی تھی۔ ظفر عالم نے میرا ایک دو فرسٹ سیکرٹریوں سے ضرور تعارف

کروادیا اور کسی خاتون سے بالکل بھی نہیں۔ اکثریت انگریزی زبان استعمال کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں شیزا مجھ سے الگ ہو کر کچھ برٹش اور ایک دو فارنر فرسٹ سیکرٹریز کے ساتھ گپ شپ میں مصروف ہو گئی۔ اُس کا بھائی ذیشان بھی ایک لڑکی کے ساتھ بات کرنے لگا جبکہ لڑکی کے باپ نے دو تین بار لڑکی کا بازو پکڑ کر اُسے ذیشان سے الگ کیا اور ایک فارنر ایمبیسیڈر کے بیٹے سے متعارف کروانے لگا مگر وہ لڑکی دوبارہ ذیشان کی طرف پلٹ آتی تھی۔ اِس پر اُس کا والد آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس سے خفا ہو رہا تھا۔ میرے لیے یہ بہت دلچسپ منظر تھا۔ آہستہ آہستہ لوگ مزید چلے آتے گئے۔ جن میں ملک کے وزرا، سیکرٹریز اور شوبز کے لوگوں کے ساتھ فارنرز بھی تھے۔ اب محفل جمنے لگی تھی۔ تمام لوگوں نے اپنی الگ الگ ٹولیاں جمالی تھیں۔ شیزا دو چار بار وقفے وقفے سے مجھے چھو کر کبھی اِدھر نکل جاتی تھی کبھی اُدھر کھسک جاتی تھی۔ یہی حالت ذیشان کی تھی۔ آخر کار شیزا نے ایک ایمبیسیڈر کو گھیر لیا اور اُس کے ساتھ مستقل گپیں لگانے لگی۔ اِس بات نے میرا سینہ چیر کے رکھ دیا لیکن بے بسی کا احساس بیان کرنے کی گنجائش آج تک الفاظ میں پیدا نہیں ہو سکی جو یہاں بتا سکوں۔ اِدھر ذیشان نے ایک چیک فرسٹ سیکرٹری کے بیٹے کے ساتھ بے تکلفی بنالی۔ تھوڑی دیر میں ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال لیے۔ اِس سے بس اتنا ہوا کہ مَیں ایک جانب ہو کر بیٹھ گیا۔ سب سے زیادہ متحرک ظفر عالم اور اُس کی بیوی تھی۔ جیسے وہ اپنی آڑھت پر کھڑے گاہکوں کو جنس کی خریداری پر آمادہ کر رہے ہوں اور اُن کے کمیشن میں اضافہ متوقع ہو۔ میرا چونکہ یہاں کوئی واقف نہیں تھا نہ مَیں وقعت کے اُس درجے پر تھا جہاں نوجوان لڑکی کے شاندار مستقبل کی تصویر بنا سکتا۔ ویسے بھی مجھے یہاں شیزا سے زیادہ کوئی لڑکی خوبصورت نظر نہیں آ رہی تھی اور مجھے معلوم تھا شیزا اِس کلاس کی ہرگز نہیں ہے۔ وہ بس ظفر عالم کے لیے تجارتی مچھلی پھانسنے کا محض ایک چارہ تھی، جسے ساتھ لے کر آیا تھا۔ شیزا نے جس فرسٹ سیکرٹری سے تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی تھی اُسے لے کر میری طرف آئی اور بولی، ہی از ضامن، مائی فرینڈ۔ فرسٹ سیکرٹری نے مجھے ایک طنزیہ حقارت سے دیکھ کر ہاتھ آگے بڑھایا اور ایسے سلام لیا جیسے مَیں نے شیزا کو اُس کے ساتھ دیکھ کر کسی غیرت مندی کا مظاہرہ کیا ہو۔ میرے خیال میں اُس کی مجھ سے تھوڑی سی تکدر کی کیفیت اُس اورنج جوس کی وجہ سے پیدا ہوئی جو میرے ہاتھ میں تھا۔ اُس محفل میں ڈرنک نہ کرنے کا مطلب سامنے والے کی توہین تھا مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ دونوں ایک دوسری جگہ جا کر کھڑے ہو گئے۔ انگریزی موسیقی چل رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد مجھے خبر ہوئی یہ فرنچ موسیقی تھی۔ یہ بات مجھے میری

ھی پر قہقہہ لگا کر حسنات نے بتائی ۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ مَیں برصغیر کی موسیقی کے علاوہ دُنیا کی ہر موسیقی کو انگریزی ہی سمجھتا تھا ۔ اِس میں میرا ذرہ برابر گناہ نہیں تھا ۔ مجھے اصل میں موسیقی کی زیادہ پہچان ہی نہیں تھی ۔ چونکہ ہمارے علاقے میں برٹش حکومت کر چکے تھے اور اب بھی کم وبیش عوام کے لیے اُنھی کا قانون تھا ۔ اُنھی کی زبان ہماری سرکار مدار میں چلتی تھی اور وہ ہمیں بالکل سمجھ نہیں آتی تھی ۔ اس لیے میں اور میرے جیسے لوئر مڈل کلاس یا مفلس لوگوں کے دماغ میں ہر نہ سمجھ آنے والی شے کا ناتا انگلش سے ملتا تھا ۔ رات کے دس بج چکے تھے ۔ ساٹھ سے ستر مرد و خواتین اور لڑکے لڑکیاں جمع تھے اور سب ایک دوسرے سے تعارف کے ساتھ ڈیٹ کنفرم کر رہے تھے ۔ خود شیزا کی ڈیٹ بھی چل رہی تھی ۔ اسی طرح دیگر لڑکیوں نے اپنے اپنے بوائے فرینڈز کا انتخاب کر لیا تھا ۔ جن کے بوائے فرینڈ پہلے سے تھے وہ اُنھی کے ساتھ بغل میں دبی دبی پھر رہی تھیں ۔ ایک آدمی جسے میں نے ایک دفعہ سرسری ایڈیشنل سیکرٹری کے طور پر وزارتِ خارجہ میں دیکھا تھا اور اب وہ فل سیکرٹری ہو چکا تھا ، اپنی بیٹی کو بار بار ایک فارن وزیر کے بیٹے سے ملواتا تھا مگر وہ لڑکی کچھ ہی لمحوں بعد دُور جا کر اکیلی کھڑی ہو جاتی تھی ۔ اِس بات پر سیکرٹری صاحب تھوڑا سا مضطرب نظر آ رہے تھے ۔ والدین ، جو زیادہ تر بیوروکریٹ تھے ، اِس بات پر خوش تھے کہ اُنھوں نے اپنی آج کی شام ضائع نہیں کی تھی ۔ ڈرنک کے ساتھ ساتھ عالمی اور خارجی امور بھی نبٹائے جا رہے تھے ۔ اُنھیں اپنے دل کو مطمئن کرنے سے کوئی روک نہیں سکتا تھا کہ وہ یہاں ملک کی خدمت میں اپنا وقت صرف کر رہے ہیں ۔

شیزا کے علاوہ بیگم ظفر عالم نے چار پانچ مزید لڑکیاں مختلف لوگوں کے ساتھ ان کر دی تھیں ۔ یہ سب لڑکیاں میرے خیال میں اُس کے سکول کی سٹوڈنٹس تھیں ۔ مجھے یہاں کوئی فوجی آدمی نظر نہیں آیا ۔ اُس کی شاید وجہ یہ ہو کہ اِس میں کچھ ایجنسیز کے آدمی بھی موجود تھے ۔ وہ سب ظفر عالم کو جانتے تھے ۔ ان میں صرف مَیں ایک ایسا تھا جسے وہاں پر اپنی موجودگی کی کوئی سمجھ نہیں آ رہی تھی ۔ مجھے ملک کا بڑا رائٹر کہہ کر متعارف کرایا جا رہا تھا مگر یہ عجیب بات تھی ۔ مَیں ادیب کیسے ہو سکتا تھا ؟ نہ اُن کے ساتھ ڈرنک کر رہا تھا اور نہ میرے پہلو میں کوئی لڑکی تھی اور جو لڑکی مجھے ساتھ لے کر گئی تھی وہ میرا پہلو چھوڑ کر کسی دوسرے کے ساتھ اٹکی ہوئی تھی ۔

ہال میں ایک جگہ اسٹیج تھا ۔ اسٹیج کے سامنے کرو موسوموز کی شکل میں داہنے اور بائیں گول میزیں لگی تھیں ۔ میزوں کے درمیان بہت سی جگہ خالی رکھی گئی تھی ۔ ہر میز کے درمیان میں ایک پھولوں کا

گلدستہ پڑا تھا اور اُس کے اردگرد ڈرنک کا کافی سامان موجود تھا۔ میز کے اردگرد تین کرسیاں تھیں۔ اُس پر چھ آدمیوں کے پینے کا سامان موجود تھا۔ ہال کی دائیں اور بائیں دیوار کے ساتھ بھی کچھ میزیں ڈرنک کے سامان سے بھری ہوئی تھیں۔ ہال کی بتیاں نہایت مدھم تھیں۔ کچھ چیز صاف دکھائی نہیں دیتی تھی۔ بتیاں کبھی ہلکی بجھ جاتی تھیں اور کبھی جل پڑتی تھیں۔ یہ اندھی روشنی مجھے مسلسل اذیت سے دوچار کر رہی تھی۔ مَیں اُس خواب زدہ شخص کی طرح تھا جسے بیداری کے بعد صرف سائے یاد رہ جاتے ہیں، اُن کی باتیں اور آنکھوں کے زاویے بھول جاتے ہیں۔ لوگ کافی زیادہ ڈرنک کر چکے تھے۔ اب اسٹیج پر موسیقی اور ڈانس کی ملی جلی کوئی شے شروع ہو چکی تھی۔ مَیں ایک میز کے کنارے بیٹھ گیا اور اُن باداموں اور دیگر لوازمات سے نپٹنے لگا جنھیں ڈرنک کے بغیر کھانے میں سراسر رسوائی تھی مگر مَیں اب ایسی کسی بھی حالت سے آزاد ہو چکا تھا۔ کیونکہ پچھلے مسلسل دو گھنٹے سے للچائے ہوئے بچے کی طرح اُنھیں گھور رہا تھا جسے کسی شے کے چھونے پر ڈانٹ ڈپٹ کا ڈر ہو۔ موسیقی کی طرح سٹیج پر ہونے والے رقص کی بھی مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی مگر ہال میں موجود اُنھیں دیکھنے میں ایسے مگن تھا جیسے اُس رقص کی جزیات پر سیر حاصل مقالہ لکھنے کی طاقت رکھتا ہوں۔ مَیں دعوے سے کہہ سکتا ہوں یہ موسیقی اور یہ رقص وہاں پر موجود اُن سب افراد کی نہ تو جمالیات کی تشفی کر رہا تھا اور نہ اُن میں ایسے کسی فن کو سمجھنے کی توفیق تھی۔ وہ محض ایک دوسرے کی آنکھوں میں اپنے وقار کو ثابت رکھنے کے لیے چبائے ہوئے جملے اور واہ، آہ کی گھٹیا آوازوں سے آلودہ کر رہے تھے۔ اِس داد سے لاکھ درجہ بہتر تھا وہ خاموش رہ کر ڈرنک سے لطف اندوز ہونا جو ایک بھینس کو بھی نشہ دینے میں کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ مجھے یہاں جو بات شدت سے محسوس ہو رہی تھی، وہ عمر کی زیادتی کا احساسِ کمتری تھا۔ ادھیڑ عمر اور موٹی عورتیں کسی نہ کسی طرح اپنے یا بیگانے مردوں کے ساتھ جسم کو مس کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے منتخب کیے گئے مرد کا ہاتھ تھامے رکھنا چاہتیں تھیں۔ یا اُن کے پہلو میں بیٹھی رہنا پسند کرتی تھیں۔ جبکہ مرد ہاتھ چھڑا کر کسی دوسری لڑکی کے ساتھ گپ شپ کرنے کی کوشش میں تھا۔ یہ ادھیڑ عمر خواتین لڑکیوں سے زیادہ نیم برہنگی کی حالت میں تھیں اور اِن کے میک اپ کا سٹینڈرڈ بھی اتنا شوخ تھا کہ اُس پر بعض اوقات اوور ہونے کا شائبہ ہوتا تھا۔ اِن خواتین میں سے اکثر کے خاوند مسلسل دوسری لڑکیوں میں دلچسپی لے رہے تھے۔ اِن خواتین کی حالت اُن بھیڑوں کی سی ہو گئی تھی جن کی بڑھاپے اور دودھ زیادہ دوہنے کے سبب ہڈیاں واضح ہو گئی ہوں اور اُن ہڈیوں کو چھپانے کے لیے اُن کی اون نہ اتاری گئی ہوتا کہ گاہکوں کی نظر میں بدنما نہ لگیں مگر

گاہک اُن کے دانتوں سے عمر کا اندازہ لگا لیتے تھے۔ ہال میں اِس وقت اپنی پسند کی عورتوں اور اپنی پسند کے مردوں کو حاصل کرنے کی ایسی دوڑ لگ چکی تھی جس میں کسی لحاظ اور پاس کا اعتبار نہیں تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو اپنے فیصلے کی سرکاری کرسی پر بیٹھے ہوئے نہایت سمجھ دار اور بارعب ہوتے ہیں۔ وہاں ان کی میز پر آئی فائل گویا کیکڑے کے منہ میں پھنس جاتی ہے۔

ڈرنک اور اُن میں ہلکے نشے کے بیچ ایک دوسرے کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر جھومنے کی سی حرکت پورے ہال میں پیدا ہو چکی تھی۔ اِسی کے بیچ ایک عورت کا خاوند دوسری عورت کے گالوں سے گال مَس کر رہا تھا اور اُسی میں ایک تابناک قسم کی سرشاری دونوں طرف پیدا ہو رہی تھی۔ یہ حرکت اور ہل چل ہال کے ایک کونے سے دوسرے تک پھیلی ہوئی اُس سمندر کی لہر کی طرح تھی جس کا پانی ایک ہی ہولے میں کبھی آگے جاتا ہے اور کبھی پیچھے ہٹتا ہے۔ کچھ دیر سے مَیں مسلسل شیزا کو تلاش کر رہا تھا اور وہ مجھے نظر نہیں آ رہی تھی۔ مَیں نے ایک کونے تک اُسے ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر وہ غائب تھی۔ وہ اچانک کہاں چلی گئی تھی۔ میرا خیال ہے اُس کے غائب ہونے کا دورانیہ وہ لمحے تھے جب مَیں ایک میز سے کچھ باداموں کی روغنی کھا رہا تھا۔ ذیشان البتہ اُسی خوبصورت چیک لڑکے کے ساتھ نشے کے عالم میں چمٹا ہوا تھا۔ وہ دونوں اُسی ہال میں بے خبر ہو جانا چاہتے تھے۔ شیزا اور سکاٹ لینڈ کا وہ سُرخ بندر اچانک کہاں غائب ہو گئے تھے؟ میرے لیے یہ لمحے اضطراب اور اذیت کے شروع ہو گئے تھے۔ مدھم اور جلتی بجھتی اندھی لائٹیں اُسے تلاش کرنے میں رکاوٹ بن رہی تھیں۔ مَیں نے ذیشان کو چیک لڑکے سے ایک طرف کر کے پوچھا، شیزا نظر نہیں آ رہی؟ وہ میری اِس خبر پر بجائے پریشان یا متجسس ہوتا، اُس نے اُلٹا مجھے ہی غصے سے گھور کر دیکھا کہ مَیں اُن کی مستی میں مخل کیونکر ہوا؟ کہنے لگا، لیٹس گو ل، آپ آرام سے موج کریں وہ آ جائے گی۔ مَیں واپس اُسی میز پر آ کر بیٹھ گیا اور مسلسل اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد اُٹھ کر ہال سے باہر آ گیا تاکہ باہر دیکھ کر اندازہ لگاؤں کہاں گئی ہو گی مگر وہ ہال سے باہر بھی نہیں تھی۔ تھوڑی دیر بعد مَیں نے محسوس کیا خود بیگم ظفر عالم اور تین چار لڑکیاں اور بھی غائب تھیں۔ یہ بہت معنی خیز بات تھی۔ رقص، موسیقی، ہنگامہ اور مستی شباب پر ہو گئی تھی اور اب مَیں اُن سیکرٹریز، بزنس مین، وزراء اور ایمبیسیڈرز کو دیکھ رہا تھا جن کی ہتھیلیوں پر اِس ملک کی لکیریں کھنچی تھیں۔ وہ اپنی کرسی پر کس قدر سنجیدہ شعور کے مالک اور قانون کی پاسداری کے ہراول دستے لگتے تھے۔ مَیں خود بھی ایک مدت اُن کے ساتھ کام کر چکا تھا اور اُن کے دفتروں میں انھیں کرسیوں پر بیٹھے بڑے بڑے قانونی نوٹس چڑھاتے

دیکھ چکا تھا۔ تو کیا وہ یہی لوگ تھے جو اِس وقت میرے سامنے ابھی ابھی کایا کلپ ہوئے بندر تھے۔ اِن کی بیویاں ایسی بندریاں تھیں جنھیں محض اِس لیے اہمیت تھی کہ اُن کے خاوندوں کے سر پر بائیس گریڈ کی ٹوپی کا پھپھوندا چڑھا ہوا تھا۔ اِن سب کو شیزا کی پروا نہیں تھی بلکہ اُنھیں اگر مَیں اپنے اضطراب سے خبردار کرتا تو وہ اُسے میری اِس بچگانہ حرکت پر ڈانٹ ڈپٹ کرتے اور دوبارہ اپنے رقص میں محو ہو جاتے۔

اب رات کے بارہ بج چکے تھے۔ ہوٹل انتظامیہ چونکہ ایسی پارٹیوں کے معمولات سے باخبر ہوتی تھی اِس لیے اُنھیں اندازہ تھا اِس مخلوق کے پیٹ میں اُتری ہوئی آگ کو ایندھن کب دینا ہے۔ چنانچہ ٹھیک بارہ بجے بوفے لگ گیا۔ مجھے ڈرنک کے بعد بوفے کی اہمیت کا سرے سے اندازہ نہیں تھا کہ اِس کا کیا لطف ہے اور کیسا احساس ہوتا ہے؟ مَیں نے کھانے کی طرف نہایت احتیاط سے ہاتھ بڑھایا تاکہ دیکھنے والوں کی نگاہیں مجھے اِس میدان میں مکمل بانجھ نہ سمجھ لیں مگر مَیں یہ دیکھ کر بددل سا ہو گیا کہ یہاں میری تمام احتیاط بے معنی ثابت ہوئی تھی کہ اُس پر کسی کی نظر نہیں گئی۔ نہایت ایلیٹ یہ پیٹ بھرا طبقہ کھانے کے معاملے میں ہمارے گاؤں کے اُن دیہاتیوں سے بالکل مختلف نہیں تھا جنھیں سال میں ایک بار مفت کھانے کی دعوت ملتی ہے۔ کھانے کے دوران میری نگاہیں مسلسل ہال کے دروازوں کی طرف اُٹھ رہی تھیں لیکن شیزا نہیں لوٹی تھی۔ میرا تمام کھانا برباد ہو گیا تھا اور سچ پوچھو تو یہ پارٹی میرے لیے اذیت کی رات بنی ہوئی تھی۔ شیزا نے کہیں جانا تھا تو مجھے بتا دیتی لیکن پھر مَیں یہ سوچ کر خود پر تلخی سے ہنسا کہ وہ کیوں بتا کر جاتی؟ یہی تو مجھ سے وہ چاہتی تھی کہ اُس سے اُن کی ذات کے بارے میں سوال نہ کیا جائے۔ وہ جس کے ساتھ بھی گئی تھی، اپنی ذات کے سوالوں کے جوابات اپنے وجود کو دے کر گئی تھی۔ مَیں خموشی مگر ذات کے حصار میں پیدا ہونے والی طغیانیوں اور کانوں کو کھا جانے والے شور و غل میں ایک دم اپنے آپ کو گالیاں دینے لگا۔ مَیں یہاں کیوں آیا تھا؟ یہ شیزا کون ہوتی تھی مجھے اذیت دینے والی اور مسلسل میری توہین کرنے والی۔ اگر اُس نے کسی کے ساتھ رات بسر کرنا تھی تو مجھے اپنی ذات کے ساتھ سمجھوتا کیے ہوئے کیوں ایک بار پھر کرب سے گزار رہی تھی۔ مَیں بھاگ کر ہال سے باہر نکل کر واش رُوم میں داخل ہو گیا اور چیخیں مار کر رونے لگا۔ مَیں واش روم کے فرش پر بیٹھ گیا اور دروازہ بند کر لیا۔ مجھے نہیں معلوم مَیں کیوں اتنا کرب میں مبتلا ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد مَیں ہلکا پھلکا ہو کر باہر نکل آیا اور اپنے منہ کو دھو لیا۔ ہال میں آیا تو لوگ کھانا ختم کر رہے تھے۔ اُسی وقت مَیں نے دیکھا شیزا ایک میز پر اپنے اُسی دوست کے ساتھ بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔ ہائیں یہ کہاں سے آ گئی تھی۔ مَیں ایک دم بھاگ کر اُس کے نزدیک چلا

گیا۔ اُس نے مجھے دیکھتے ہی کہا، ضامن کہاں چلے گئے تھے، کھانا نہیں کھایا؟ آؤ کھانا کھائیں اور مَیں اسی وقت سب کچھ بھول کر کھانا کھانے میں مصروف ہو گیا۔ مَیں نے ایک ذرا لمحے کے لیے بھی اُسے محسوس نہیں ہونے دیا کہ مَیں تمہارے لیے واش روم کا دروازہ بند کر کے چیخیں مار کر روتا آیا ہوں۔ تم کہاں چلی گئی تھیں؟ کھانا کھانے کے دوران مَیں نے محسوس کیا وہ اپنے ہاتھ کھانے کی طرف لے جاتے ہوئے عجب طرح کی جلدی میں تھی اور میری طرف دیکھ نہیں رہی تھی۔ اُس نے اپنے چہرے اور کپڑوں کی سلوٹوں کو کسی آئینے کے پاس جا کر اچھی طرح ٹھیک کیا تھا مگر ایک آدھ سلوٹ اور ایک دو بالوں کی بے ترتیبی ابھی بھی قائم تھی۔ مَیں حیران تھا مَیں اس قدر باریک نگاہی میں اتنی جلدی کیسے چلا گیا تھا۔ اس کے ساتھ مَیں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ انسان اپنے ذرا سے تعلق پر بھی کس قدر حق جتانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ سراسر انسان کے اندر چھپی ہوئی وراثت اور ملکیت کی خواہش تھی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھ سے آنکھیں اِدھر اُدھر پھیر رہی تھی۔ بلندیوں پر اُڑتا ہوا ہر ایک اپنی آنکھیں زمین کی طرف ضرور پھیرتا ہے۔ کھانے کے دوران ہم نے زیادہ باتیں نہیں کیں، بلکہ باتیں تو کی ہی نہیں تھیں۔

اب سب لوگ سافٹ ڈرنک پینے لگے تھے۔ بعض آئس کریم اور دوسرے میٹھے لوازمات سے سیر ہونے لگے۔ اِس طرح رات کے دو بجے پارٹی اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔ ہم ہوٹل سے باہر نکلے۔ اگرچہ ہمارا فلیٹ قریب ہی تھا مگر ظفر عالم نے ہمارے لیے گاڑی کا بندوبست کر رکھا تھا۔ گاڑی ہم تینوں کو فلیٹ پر چھوڑ آئی۔ شیزا اور ذیشان ابھی بھی مستی اور نشے کی کیفیت سے باہر نہیں نکلے تھے اور بار بار چُہل بازی کی طرف آمادہ تھے۔ شیزا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور اب وہ اُسے مسلسل پکڑے ہوئے تھی۔ مَیں نہیں بتا سکتا اُس نے مجھے کون سی لذتوں میں دوچار کر رکھا تھا۔ ہم چند ہی منٹوں میں فلیٹ پر پہنچ گئے۔ اندر داخل ہوئے تو ایک کائناتوں کے دَر وا کر دینے والی مسرتوں نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا۔ شیزا نے ذیشان سے کہا، ذیشان آپ جا کر کمرے میں سوئیں۔ اُس کے بعد اُس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور کہنے لگی ضامن اپنا کمرہ کھولو۔ مَیں نے کانپتے ہوئے جنونی ہاتھوں سے کمرے میں لڑکھڑاتی ہوئی چابی لگائی اور اُسے کھول دیا۔ شیزا نے کمرے کے اندر داخل ہو کر فوراً ہی دروازہ بند کر دیا اور ایک دم دھڑام سے میرے بیڈ پر گر گئی۔ مَیں نے واپس کمرے کو لاک کیا اور اُسی واحد بیڈ پر آ گیا جس پر نہ جانے مَیں نے کتنی کربناک راتوں کی اذیت سہی تھی۔ رات کے تین بجے تھے اور اب ہم نے اگلی صبح بارہ بجے سے پہلے نہیں اُٹھنا تھا۔

(۶۵)

رات مَیں نے شیزا کے جسم کے ہر گوشے سے روح کے ریزے چن کر اپنی زندگی کو دوام بخش دیا تھا۔ میری کیفیت اُس ہنس کی تھی جسے ہزاروں برس کی خوراک کے موتی ایک ہی رات میں ایک ہی جگہ مل گئے تھے اور مَیں اُنھیں ایک ہی رات میں کھا کر ختم کر دینا چاہتا تھا۔ شیزا کا جسم میرے لیے سُرخ شہد میں گھلا ہوا روغنی خمیر تھا جسے میں چوستا بھی رہا، چکھتا بھی رہا اور اُس کی خوشبوؤں کو مساموں میں بساتا بھی رہا۔ یہ دورانیہ کتنا طویل تھا یا کتنا مختصر تھا، دونوں کی قید مٹ گئی تھی۔

دن کے تین بج چکے تھے۔ شیزا ابھی تک پہلو میں لیٹی ہوئی تھی اور مَیں چاہتا تھا قیامت تک یونہی تین بجے رہیں لیکن ہم اِس بیڈ سے نہ اُٹھیں۔ اُس کے جسم اور کپڑوں کی تمام خوشبو میرے جسم اور میرے کمرے کی ہر شے میں اُتر چکی تھی۔ اُس نے بالوں میں کاسنی خوشبو لگا رکھی تھی اور کپڑوں میں خاکستری کستوری کا پرفیوم تھا جو خالص عرب ملکوں سے آتا تھا۔ اُس کے جسم میں خود اُس کی ایک خوشبو تھی اور مَیں نہیں جانتا وہ کیا تھی مگر آج کے بعد یہ جان چکا تھا کہ اب اگر شیزا نے مجھے اچانک چھوڑ دیا، جو کہ اُس سے بعید نہیں تھا، تو مَیں ہلاک ہو جاؤں گا۔ وہ عجیب لا اُبالی قسم کی لڑکی تھی۔ کبھی تو چار ماہ تک مجھے ایک گلہری جتنی اہمیت نہیں دی تھی اور کبھی ایک دم روح میں اُتر جانے والی تمام منزلوں سے گزار کر لے گئی تھی۔ ہم تمام رات سے اگلی صبح نو بجے تک نہیں سوئے تھے اور اُسے رات ہی بنائے رکھا تھا۔ وہ میرے بستر پر سوئی ہوئی تھی اور مَیں اُسے جذب کی حالت میں دیکھ رہا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا

اُس کے پاؤں چوم لوں، ہاتھوں کو بوسے دوں اور اُس کے چہرے پر اپنا چہرہ رکھ دوں مگر اُس کے نیند سے بیدار ہونے کے خوف سے دور رہا۔ مَیں نہایت آہستہ سے بیڈ پر سے اُٹھا اور واش رُوم میں داخل ہو گیا۔ مَیں نہا کر شیزا کے جسم کی خوشبو ابھی اپنے سے الگ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ غسل کی بجائے اپنے ہاتھ منہ اور دیگر اعضا کو دھویا اور کچن میں آ گیا۔

آج کے بعد ہمارے کمروں کی تقسیم گڈ مڈ ہو گئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا شیزا کا کمرہ ذیشان والا ہو گا یا میرا ہو گا۔ مَیں نے دل میں تہیہ کر لیا تھا شیزا کو آئندہ بھی کبھی سوال نہیں کروں گا، وہ کہاں جاتی ہے؟ کس کے ساتھ کیا کرتی ہے؟ مجھے اُس سے بس اتنی غرض ہو گی کہ وہ میرے لیے اپنے لمس بچا کر رکھتی ہے یا نہیں؟ مَیں نہ تو اُس کا خاوند تھا، نہ اُس سے خونی رشتہ تھا۔ نہ وہ مری رکھیل تھی بلکہ ہو سکتا تھا آئندہ چل کر مَیں خود اُس کا رکھیل ثابت ہوں۔ کل سے جس طرح مَیں اُس کے ساتھ تھا، یہ تمام باتیں شاید مجھے ہی اُس کا رکھیل ثابت کرتی تھیں مگر مجھے ایسے بے معنی اور فضول دیے گئے لفظوں سے کوئی غرض نہیں تھی جو معاشرے کے اذیت پسندوں اور جابروں نے اپنے سماج میں شامل کر دیے تھے۔ مَیں اُن تمام لفظیات سے باغی ہونے کا اعلان کرتا تھا جن میں کوئی خاتون کسی مرد کی جاگیر اور کوئی مرد کسی خاتون کا اثاثہ ہو۔ کم از کم اپنی حد تک مَیں آج یہی سوچ رہا تھا اور یہ آگہی کا در مجھ پر اِسی رات کھلا تھا۔ اب مَیں کتنا زبردست کام کیا کروں گا، کیسے اُڑا اُڑا پھروں گا۔ وہ لوگ کتنے بانجھ اور بد بخت ہیں جن کے ساتھ کسی لڑکی نے اُن کے بیڈ پر شب بسری نہ کی ہو جسے وہ دل کی گہری لائنوں تک چاہتے ہوں اور یہ مَیں تھا، مَیں ضامن علی، جس کے دماغ کے ریشے اتنے کمزور اور بے ترتیب نہیں تھے جتنے زمانے نے سمجھ رکھے تھے۔ مَیں ایک ذہین اور اشیا کے وجود کو اُن کی اصل میں جلد سمجھ لینے والا تھا۔ مَیں بولنا جانتا تھا مگر زمانے نے مجھے بولنے نہیں دیا تھا۔ مَیں راستوں کے نشیب سے منزلوں کی قاشیں کاٹ لینے کا ماہر تھا مگر دنیا نے میرے ہاتھ سے چاقو چھین لیے تھے۔ مَیں اپنی طرز کا شاعر تھا لیکن حاسدوں نے میرے لفظ ضبط کر لیے تھے۔ مَیں جانتا تھا سمندروں کا نیل آسمانوں میں کیسے گھل جاتا ہے لیکن سماج نے مجھے وضاحت کی اجازت نہیں دی تھی۔ مجھے سب خبر تھی رنگ کیسے بولتے ہیں اور مو قلم کیونکر لائنیں بناتے ہیں مگر دشمنوں نے میرے کینوس چوری کر لیے تھے۔ اب دیکھنا مَیں اپنی تمام چیزیں کیسے بازیاب کراتا ہوں۔ آج سے مَیں زمانے کو بول کر دکھاؤں گا، پتھروں سے مجسمے کھینچ کر باہر رکھ دیا کروں گا، آج سے میرے لفظ اپنے معنی کو اُڑائیں گے اور دنیا کے مدو جزر تک پہنچیں گے۔

مَیں اپنے کچن میں تمام تر سرشاری کے ساتھ سوچتا جا رہا تھا اور چائے بناتا جا رہا تھا۔ چائے بنانے کے بعد مَیں نے اپنے کاغذات لیے اور قلم اُٹھایا اور ڈرائنگ روم میں آ کر اُن تمام ایونٹس کو لکھنے لگا جس کے لیے مجھے ظفر عالم نے پارٹی میں شرکت کا شرف بخشا تھا۔ یہ میرے لیے زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔ میری یہ تحریر اُن کے رسالے میں اُن تصویروں کے ساتھ چھپنا تھی جنھیں ایک فوٹو گرافر پے در پے لے رہا تھا۔ دو گھنٹے کے بیچ مَیں نے وہ سب کچھ ایک ترتیب سے لکھ دیا لیکن اُس میں دو چیزیں درج نہیں تھیں، شیزا کا لال بندر کے ساتھ ہال سے کہیں نکل جانا اور میرا ہوٹل کے واش روم میں بیٹھ کر چیخیں مارنا۔ میرا خیال ہے یہی ایک چیز اُس تمام پارٹی کا حاصل تھی۔ یہی سچ تھا اور یہی اِس رپورٹ میں درج نہیں تھا۔ باقی سب تصنع تھا۔ یہ سب کچھ کل ظفر عالم کے آفس پہنچ کر اُسے دینا تھا۔ اب میرے لیے یہ کام اُس معاوضے سے زیادہ قیمت رکھتا تھا جو مَیں ظفر عالم سے وصول پاتا تھا۔

پانچ بجے دروازہ کھلا۔ سامنے شیزا کھڑی تھی۔ ابھی ذیشان باہر نہیں نکلا تھا۔ یہ لڑکا جب سوتا تھا تو لمبا سوتا تھا اور جاگتا تھا تو چوبیس گھنٹے جاگ کر فلمیں دیکھتا تھا۔ اکثر اپنے دوستوں کے ساتھ اِس کا جاگنا اور سونا، دونوں طویل ہوتے تھے۔ کبھی کبھار کالج جاتا تھا مگر انگریزی رسالے اور انگریزی فلمیں دیکھنے سے سروکار رکھتا تھا۔ اردو اُسے کم و بیش نہیں آتی تھی۔ اِس کے دوستوں کی حالت بھی اُسی طرح تھی۔ مَیں نے شیزا کو دیکھ کر سب کچھ ایک طرف رکھ دیا اور اُس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔

ضامن، تمھیں اچھا لگا نا؟ شیزا نے ایسے انداز سے بات کی کہ میرے لیے اُس کے عوض سوائے شکرگزاری کے کوئی شے نہیں تھی۔ مَیں نے جواب میں فقط اتنا کہا، شیزا مَیں اِس فلیٹ میں اِسی لذت کی محرومیوں کا نگہبان تھا جسے تم نے حریم بنا دیا۔ اب کس زبان سے شکرگزار ہوں۔

وہ لہک کر بولی، شکرگزاری کی کوئی ضرورت نہیں۔ ایک کام کرو میرے لیے ناشتا بناؤ، مَیں اتنے میں نہا لوں۔ مَیں نے اپنی ایک دوست سے ملنا ہے اور ایک مضمون کی اسائنمنٹ تیار کرنی ہے۔

تو کیا آپ پڑھ بھی رہی ہیں؟

جی ہاں کیوں نہیں پڑھ رہی؟ کیا آپ مجھے اَن پڑھ سمجھ رہے ہیں؟

نہیں میرا مطلب، مَیں نے آپ کو اور ذیشان کو کبھی یونیورسٹی آتے جاتے نہیں دیکھا، مَیں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

وہ مسکرا کر بولی، میرا انٹرنیشنل ریلیشن میں ماسٹر کا تھیسز چل رہا ہے۔ اچھا میرا امتحان چھوڑیں

اور ناشتا بنائیں ذرا۔ مَیں شاور لے لوں۔

مَیں اُسی وقت اُٹھا اور کچن میں دوبارہ چلا گیا۔ فریج سے انڈے اور بریڈ نکال لیے۔ چائے چولہے پر چڑھا دی اور آملیٹ کی تیاری میں لہسن، مرچ اور پیاز کی کترن کے ساتھ انڈے پھینٹنے لگا۔ مَیں اپنا ناشتا بھی اُس کے ساتھ بنا کر کرنا چاہتا تھا۔ بیس منٹ میں دونوں چیزیں تیار ہو گئیں۔ اِتنے میں شیزا بھی میرے واش روم سے شاور لے کے باہر آ گئی اور ہم دونوں ڈرائنگ روم میں آن بیٹھے۔ اُسی وقت ذیشان اپنے کمرے سے نکل آیا۔ اچھا تو آپ نے اپنے لیے ناشتا بنا لیا اور میرا؟ یہ کہہ کر وہ بھی ہمارے ساتھ بیٹھ گیا۔ یہ ہمارے ایک خاندان کی طرح رہنے کا پہلا دن تھا جو آگے چل کر کئی سالوں تک پھیل گیا۔

ناشتا کرنے کے بعد جسے اب شام کا کھانا ہی کہا جا سکتا تھا، شیزا جلدی سے تیار ہو کر فلیٹ سے باہر نکل گئی، ذیشان دوبارہ اپنے کمرے میں چلا گیا اور مَیں نے فلیٹ سے نکل کر آوارہ گردی کے سلسلے میں میلوڈی بک ڈپو میلوڈی کی راہ لی۔

مَیں سپر مارکیٹ سے میلوڈی کی طرف جانے والی سڑک کے ساتھ چلتا ہوا جیسے ہی پریس کلب کے پاس آیا، میری نظر پریس کلب کے سامنے دائیں ہاتھ ایک ڈھابے پر پڑی۔ چارپائی پر ایک آدمی بیٹھا تھا۔ کچھ کچھ اندھیرا ہو چلا تھا اِس لیے اُس کی شکل صاف دکھائی نہیں دیتی تھی مگر ذرا پہچانی ہوئی لگتی تھی۔ مَیں تھوڑا اُس کے نزدیک ہوا تو پہچان لیا۔ یہی وہ کویت ہاسٹل کے رستے میں پڑنے والے ڈھابے پر بیٹھا ہوا نیم خبطی شخص تھا۔ باتونی اور دلچسپ کردار۔ مَیں نے اُسے سلام کہا۔ اُس نے سلام کے لیے میری طرف منہ کیا اور ایک دم اپنی جگہ سے اُٹھا، ارے بھائی ضامن صاحب آپ یہاں کیسے آئے ہو؟ بھائی لگتے سیلانی بندے ہو۔ مجھے دوسری بار جو ملتا ہے دعوے سے کہوں گا وہ سیلانی ہو گا یا پاگل ہو گا۔ آیئے بیٹھیے بھائی مَیں نے وہ جگہ چھوڑ دی۔ وہاں غنڈے بہت ہو گئے تھے۔ سوچا کسی دن یونہی اُن سے تانبا کھا بیٹھوں گا۔ یہاں سے کہیں اور ٹھکانا کروں، اب دیکھو آپ یہاں مل گئے۔

ہاں مَیں بھی کہوں جب دوسری بار وہاں گیا تو تم نہیں ملے تھے۔ مَیں نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر تم نظر نہیں آئے۔ دل میں خیال آیا کہیں گزر ہی نہ گیا ہو۔ مَیں نے ہنس کر اُسے کہا، ابھی تک آپ نے چائے کا سوال نہیں کیا؟

ضامن صاحب، مَیں وہاں ہوتا تو اب تک گزر چکا ہوتا۔ اچھا باتیں ہوتی رہیں گی۔ چائے کہہ دوں؟

مَیں ہنسا، میری طرف سے؟

میاں ضامن صاحب اب شرمندہ نہ کیجیے، آپ صاحب لوگ ہیں۔ وہ تھوڑا خجل سا ہو کر بولا۔

مَیں بھی ہنس دیا اور کہا، ہاں کہہ دو۔

اور کھانا؟

کھانا اگرچہ مَیں کھا کر آیا تھا مگر اُسے کہا کھانا بھی کہہ دو، شاید وہ اِسی انتظار میں بیٹھا تھا کہ کوئی شریف آدمی بھٹکتا ہوا آئے اور اُسے کھانا کھلا دے۔

اب وہ ہوٹل والے کی طرف مڑا اور پکارا، ارے میاں دلاورے، پہلے ایک ایک چائے، پھر کھانا اور دیکھو مرچیں ذرا کم صاحب کا معدہ نازک چل رہا ہے۔ (مجھے ہلکی سی آنکھ مار کر) دیسی مرغی کا سالن کر دو۔ اوئے چھیدے یہ ٹیبل صاف کر، اُلو کے سپاہی کسی وقت آنکھوں سے بھی دیکھ لیا کر۔ گھنٹے بعد ٹیبل صاف کرتے ہو۔

وہ آرڈر دے رہا تھا اور مَیں اُسے دیکھ رہا تھا اُسے کتنی صفائی سے آرڈر دینا آتا تھا، یہ طریقہ مجھے اچھا لگا تھا۔

چھیدے کو ڈانٹنے اور ہوٹل کے مالک کو آرڈر کرنے کے بعد دوبارہ میری طرف متوجہ ہوا، ضامن صاحب بہت دنوں بعد ملنے کی معذرت۔ دنیا کی مصروفیت سو سو دھندوں میں اُلجھائے رکھتی ہے۔ خدا شاہد ہے اُس ڈھابے سے نکلنے کو جی نہیں کرتا تھا مگر کچھ دنوں سے کلاشنکوفوں کی باڑیں مکئی کے دانوں کی طرح اُڑتی تھیں۔

یار دیکھو، مَیں آپ کی شکل تو جانتا ہوں مگر نام آپ نے نہیں بتایا، مَیں نے اُس کی بات درمیان میں کاٹ کر کہا۔ مجھے معلوم تھا وہ بات کرنے کا موقع نہیں دے گا اِس لیے درمیان ہی سے پوچھ لیا تاکہ مخاطب کرنے میں آسانی رہے۔

بھائی ہمارا نام کیا پوچھتے ہو، وہ تاسف سے بولا، اماں نے اپنے باپ کے نام پر ندیم رکھا، ابا نے دادا کے نام پر کمال خاں کر دیا۔ محلے والوں نے دیموں اور یہاں اسلام آباد میں شناختی کارڈ پر جو کچھ نکلا وہ مہتاب خانم ولد فرزند علی ہے، اِس کے ساتھ ہی اُس نے شناختی کارڈ نکال کر دکھا دیا۔

واقعی اُس پر اُس کی نوجوانی کی تصویر لگی ہوئی تھی۔

وہ دوبارہ بولا، جگہ مقام اور والد کا نام بھی غلط ہے مگر اُسے کارمدار والوں نے شناختی کارڈ والوں

سے مل کر خاتون بنا دیا۔

اب چائے آ گئی تھی اور واقعی خوب تھی۔ مَیں نے چائے کا گھونٹ لیا اور ہنس کر پوچھا یہ سب کیسے ہوا؟

اُس نے چائے کے دو لمبے لمبے گھونٹ لیے اور کہا، یہ بہت دردنا کی سے ہوا۔

کیا آپ نے اِس کی تصحیح نہیں کرائی؟ مَیں نے سوال کیا۔

میاں ضامن آپ نوابوں سی باتیں کرتے ہو۔ اول تو مَیں نہ چور نہ ڈاکو کہ تھانے کچہری میں واسطہ پڑے۔ نہ مَیں غیر ملکاں جاؤں کہ پاسپورٹ بنانا پڑے، نہ کاروبار کا دھندا۔ یہاں اِن ڈھابوں پر اللہ نے رزق کا جال پھیلا رکھا ہے اور اُس کی رسی تیرے اِس بھائی دیمو کے ہاتھ میں ہے۔

ارے میاں چائے نہیں آئی؟ ہاں لے آؤ لے آؤ۔ ارے کدھر جاتے ہو؟ وہ ذرا کریم رول اُٹھاؤ ایک، آپ لو گے؟

نہیں شکریہ، میں نہیں لوں گا، مَیں نے انکار کرتے ہوئے کہا۔ آپ لے لیں پیسے مَیں دوں گا۔

ارے لاؤ بھئی جلدی دو لے آؤ، یہ کریم رول بہت میٹھے اور دیسی مکھن میں گندھے ہیں۔ وہ ڈھابہ کویت ہاسٹل کا بہت خوب تھا، کبھی فرانس دیکھا ہے؟ بالکل ویسی ہی سائٹ تھی مگر میاں چھوڑنا پڑا۔

کیوں چھوڑا؟ مَیں نے اُسے ذرا اور کریدا۔

بھیا ضامن ہوا یوں کہ اُس ہاسٹل کے لچھن تو مَیں پہلے ہی دیکھے بیٹھا تھا کہ خراب ہو رہے ہیں اور روز بہ روز توپ ٹینک جمع ہو رہے ہیں۔ مَیں سوچتا تھا ہمیں اِس سے کیا غرض۔ لیکن میاں ضامن کیسے بولوں۔ ایک روز وہ گولیاں چلیں جیسے ساون کے اولے برستے ہیں۔ مَیں ڈھابے کے پچھواڑے میں بیٹھا تھا۔ دو گولیاں یہ موٹی موٹی میرے کان کی بائیں لَو کو چھو کر نکل گئیں۔ یونیورسٹی کے دو گروپوں میں لڑائی ہوئی اور ڈھابے کو اُنھوں نے ایک گروپ کا مورچہ سمجھ لیا اور بھون کے رکھ دیا۔ وہاں میرے پہلو سے ہی ایک سؤر یوں چھپاک سے نکل کر بھاگا اور میں اُس کے ساتھ نکلا۔ بس یوں سمجھیے سؤر اور مَیں اکٹھے دوڑے اور ای سیون کے جنگل میں آن کر سانس برابر کی۔ سنا بعد میں دو بندے اُڑ گئے تھے۔ خود ڈھابے والے کے چوتڑ میں گولی لگی۔ مَیں اُسے دیکھنے ہسپتال گیا تھا۔ دو مہینے ٹھیک نہ ہوا۔

تب سے آپ وہاں نہیں بیٹھے؟ مَیں نے پوچھا۔

نہ، نہیں بیٹھا۔ میاں وہاں بیٹھنا ایک طرف رستہ تک نہیں ناپا۔ اُس دن سے اِسی ڈھابے پر

بیٹھک رکھتا ہوں۔ یہیں دوست ملنے والے چلے آتے ہیں۔ مجھے خبر تھی آپ بھی مجھے وہاں ملنے جاؤ گے، نہیں پاؤ گے تو پریشان ہو گے مگر اشکے بھئی آپ نے ڈھونڈ ہی لیا۔

ارے بھائی کھانے کو دیر کیوں ہوتی ہے؟ صاحب کو جلدی ہو گی۔ اُس نے ہوٹل والے کو دوبارہ ہانک لگائی، جیسے خدشہ ہو کہ مَیں کھانا کھلانے سے مکر جاؤں گا اور چائے کے پیسے دے کر اُٹھ نکلوں گا۔

اچھا آپ تو کہتے تھے، آپ بڑے ملکوں ملکوں پھرے ہیں اور آپ کے پاس ایک کوٹ بھی تھا، وہ دوسو پونڈ میں خریدا تھا۔ یہ کیا کہانی تھی پھر؟ مَیں نے اُسے تھوڑا سا خجل کرنا چاہا۔

کون سا کوٹ اچھا، وہ جو اُس دن پہنا تھا، بھئی وہ کوٹ بھی واقعی دوسو پونڈ کا تھا اور برطانیہ میں بھی رہا تھا لیکن وہی رہا تھا جس نے کوٹ خریدا تھا اور وہ مَیں نہیں تھا۔ آپ ہی کی طرح ایک دوست تھا۔ اُسی ڈھابے پر ملا تھا۔ ضامن صاحب ہاری ہوئی وارداتیں جھوٹ نہیں ہوتیں۔ اگر نام اور مقام بدل جائیں تو اور بات ہے۔ کبھی فلم دیکھی ہے؟

جی بہت دیکھی ہیں۔

بس سمجھیں جو کچھ ہیرو کر رہا ہوتا ہے، وہی کچھ اصل میں آپ کر رہے ہوتے ہیں مگر یہ سائنس اور روحانیت کے معاملے ہیں۔ آپ صاحب لوگ کہاں سمجھیں گے۔ وہ متوحش ہو کر بولا۔

سمجھ گیا بھئی کیوں نہیں سمجھوں گا، میں نے اُسے مزید خجالت سے بچانے کے لیے بات اور طرف نکالی، آپ رہتے کہاں ہیں اِن دنوں؟

وہ دُور دیکھو۔ وہی جھونپڑی دیکھو، میرا محل خانہ یہی ہے۔ چلیے دیکھیے گا؟

نہیں، ابھی وقت کم ہے پھر کبھی سہی۔

ہاں ضرور کسی دن آئیو، زیادہ آرام دہ نہیں ہے مگر میری چارپائی کو جگہ دیے بیٹھی ہے۔

اچھا تو اب مَیں آپ کو کس نام سے پکاروں؟

وہ میرے اِس سوال پر ایک دم رُک گیا اور مجھے غور سے دیکھ کر تھوڑی دیر چُپ رہا پھر سرد آہ بھر کر بولا، صاحب یہ سوال میرے یہاں، اُس نے اپنے عین دل کے اُوپر دو انگلیاں رکھیں، آریاں چلا دیتا ہے۔ یہ ایک لمبی داستان ہے۔

مَیں سننے کے لیے تیار ہوں، مَیں نے بھی سنجیدگی اختیار کر لی کیوں کہ اِس سے پہلے مَیں اُس کا

شناختی کارڈ دیکھ کر مسکرا چکا تھا۔ واقعی یہ عجوبہ بات تھی۔

آپ مجھے جس نام سے چاہیں پکاریں۔ میرا کوئی رہا تو ہے نہیں۔ نام دینے والے سب کو اللہ نے کھڈے لائن لگا دیا اور جس طرح لگایا اللہ کسی کو نہ لگائے۔

کس طرح کھڈے لائن لگایا؟ مَیں نے پرزور اصرار کیا۔

پھر کسی دن سہی، آپ یہ کھانا کھائیں بہت مزے کا ہے۔

آپ بتاؤ یار اسی دن بتاؤ۔ میرے پاس بہت وقت ہے۔ مَیں نے اُس سے اصرار کیا۔

پھر مَیں کئی دن تک سو نہیں پاؤں گا؟

آپ بتائیں۔ مَیں بضد ہو گیا اور کھانے سے ہاتھ روک دیا۔

سنیے ضامن صاحب میرا نام ندیم ہے۔ مجھے آج سے چھبیس سال پہلے ساہیوال کے سکول ننگل انبیا سے اغوا کر لیا گیا تھا۔ مَیں بہت خوبصورت لڑکا تھا۔ جہاد کے نام پر ایک اور ہی دھندے میں لگا دیا گیا۔ آپ سمجھ گئے ہیں نا۔ وہ کون سی جگہ تھی مَیں نہیں جانتا۔ آج تک مجھے نہیں پتا چلا۔ ہاں مگر 1985ء میں مَیں افغانستان سے یہاں واپس آ گیا۔ قسم لے لو مَیں نے اِس عرصے میں ایک بھی گولی چلائی ہو۔ اُس کے بعد مَیں ساہیوال گیا، وہاں سب کچھ اُجڑ چکا تھا۔ میرا نانا مر چکا تھا۔ ماں مر چکی تھی۔ سب برباد ہو چکا تھا۔

اُس کے بعد اِس ندیم نامی شخص نے مجھے اپنی ایک ایک چونکا دینے والی واردات سنائی جس پر کئی کتابیں لکھی جا سکتی تھیں۔ مجھے اُس کی کہانی سنتے رات کے بارہ بج گئے۔

اچھا تو یہی تھا وہ عماد کا دوست ندیم، مجھے حیرت پر حیرت تھی۔ یہ آسمان کی سطحیں کس طرح سے زمین کے ساتھ جڑی ہیں۔ انسانوں کے جنگل میں کتنی واضح ترتیب ہے۔ ہر شے پہچانی جانے والی۔ ہر دُکھ تلاش ہو جانے والا۔ ہر فیصلہ پڑھا جانے والا اپنے پورے سیاق و سباق کے ساتھ۔ یہاں اِس دنیا میں، اِس کائنات میں کوئی زاویہ الجھا نہیں تھا۔ تمام ظالم اور تمام مظلوم ہاتھ اپنی سیاہی اور سپیدی کے ساتھ پہچان رکھتے تھے۔ یہ وہی ندیم ننگل انبیا سکول سے اغوا ہونے والا، یہاں میرے سامنے بیٹھا تھا۔ مَیں نے آخر ایک آدمی کو تلاش کر لیا تھا۔ ایسا آدمی، جس کی ماں اُس کے کربِ جدائی میں پاگل ہو کر خدا جانے مر گئی تھی یا ابھی زندہ تھی۔ مَیں نے اُس سے تمام واردات سن کر کہا، کیا تمھیں اچھی طرح سے پتا ہے کہ تمھاری ماں مر گئی ہے؟

اُس نے دوبارہ مجھے غور سے دیکھا، کیا مطلب آپ کا؟

آپ نے اپنی ماں کی قبر دیکھی ہے؟ وہ کہاں دفن ہے اور آپ سے کس نے کہا وہ مر چکی ہے؟

نہیں مَیں اُس کی قبر تلاش کرتا رہا لیکن نہیں ملی۔ اُس نے مجھے بے چینی سے دیکھا مگر یہ سب آپ کیسے کہہ رہے ہیں؟

ندیم صاحب، آپ کا ایک دوست عماد بھی تھا۔

جی ہاں لیکن وہ تو سنا ہے مر گیا تھا؟

جی اور مَیں آپ کی ماں کو دیکھ چکا ہوں۔

ہائیں یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ وہ ایک دم اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کے منہ سے روٹی کا لقمہ نیچے گر گیا۔ پھر ایک دم میرے قدموں میں بیٹھ گیا اور اُس نے ایک چیخ ماری جس سے تمام ہوٹل ایک جگہ جمع ہو گیا۔ مَیں نے ہوٹل والوں سے کہا وہ اپنا کام کریں اور اُسے کاندھوں سے پکڑ کر سامنے بٹھایا مگر وہ بچے کی طرح مٹی پر چوکڑی مار کر بیٹھ گیا۔ اب مَیں نے اُسے کہا، ندیم صاحب مَیں نے آپ کی ماں کو پندرہ سال پہلے تاندلیانوالہ کے لاری اڈے پر دیکھا ہے۔ وہ پاگل تھی اور آپکے انتظار میں تھی۔ اب مَیں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ ابھی تک زندہ ہے یا نہیں۔ اُس کے بعد اُس کو تمام کہانی سنا دی۔

میری یہ بات سُن کر وہ بالکل ساکت ہو کر لیٹ گیا۔

رات تین بجے اُس نے پیسے مانگ تانگ کر ایک کار کرایے پر لی اور تاندلیانوالہ کی طرف نکل گیا اور مَیں فلیٹ پر آ گیا۔

(۶۶)

اُس پہلی رات کے بعد کوئی دن ہوگا کہ شیزا میرے کمرے میں نہ آئی ہو۔ البتہ اُس نے مجھے یہ باور کرانے میں کوتاہی نہیں کی کہ وہ صرف میری ملکیت نہیں ہے اور کبھی نہیں ہے۔ وہ اپنے دھندوں کو جیسا مناسب سمجھے گی کرتی رہے گی۔ نہ وہ مجھے کسی طرح سے پابند کرے گی کہ مَیں صرف اُسی کا ہو کر رہ جاؤں بلکہ اُسے اِس بات سے چڑ تھی کہ مَیں اُس کا انتظار کروں یا اُس کی وجہ سے کسی دوسری لڑکی کی طرف متوجہ نہ ہوں۔ یہ عجیب حالت میری سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ وہ مجھے دوسری لڑکیوں کی طرف نہ صرف متوجہ کرتی تھی بلکہ ہفتے عشرے بعد کسی دوسری لڑکی کو بھی لے آتی۔ مجھے یہ ماننے میں یا کہنے میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی کہ اُس کے اندر دوطرفہ کشش موجود تھی اور وہ چاہتی تھی کہ مَیں بھی اِسی نسبت کا قائل ہوں۔ ایک دو بار اُس نے اشارے سے مجھے ذیشان کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش بھی کی مگر پھر کسی وجہ سے اُس طرف سے مکمل خاموشی اختیار کر لی۔ اُس کی خاص وجہ خود ذیشان بھی تھا کہ وہ اب میری طرف بالکل متوجہ نہیں تھا۔ کافی عرصے سے سلام دُعا اور گفتگو کے علاوہ اُس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہو پایا تھا۔ یہ اچھی بات تھی کہ اُس نے مجھے اِس معاملے میں مکمل نظرانداز کر دیا تھا۔ شیزا کی اسلام آباد میں بہت زیادہ دوست تھیں۔ اُس کی یہ دوست زیادہ تر شوقین مزاج اپر مڈل کلاس کی تھیں، اُنھیں پیسے وغیرہ سے کچھ غرض نہیں تھی۔ ہلہ گلہ اور موج مستی کی قائل اکثر اِس فلیٹ کی زینت بنتی تھیں۔ مَیں کوشش کرتا تھا جب شیزا کی دوست فلیٹ پر آئیں مَیں وہیں موجود ہوں۔ چاہے وہ اُن کو مجھ سے ملانا

چاہے یا نہیں۔ کبھی کبھار وہ اُنھیں مجھ سے ملاتی بلکہ اپنے ہنگامے میں شریک کر لیتی تھی اور اکثر نہیں کرتی تھی۔ مَیں نے سب کچھ اُسی کی مرضی پر چھوڑ رکھا تھا اور کسی قسم کی خواہش یا اصرار کی جھلک نہیں پڑنے دیتا تھا۔ البتہ رات کے وقت شیزا نے میرے ہی کمرے میں سونے کی روٹین قائم کر لی تھی۔ ایک اور بات اُس نے ابھی تک نہیں کی تھی کہ وہ میرے کمرے میں کسی لڑکے کو نہیں لائی تھی۔ ایسا نہیں کہ اُس نے لڑکوں سے ملنا بند کر دیا تھا۔ وہ اُسی تسلسل کے ساتھ مل رہی تھی مگر کسی ہوٹل میں یا ذیشان کے کمرے میں جب وہ نہیں ہوتا تھا۔ اگر ہوتا تھا تو وہ اُس وقت میرے کمرے میں آ جاتا تھا۔ مَیں نہیں جانتا یہ چیز میرے لیے کتنی مناسب تھی اور کتنی غیر مناسب۔ مَیں صرف اتنا جانتا تھا مجھے اِس پورے منظر میں لطف آنے لگا تھا۔ مَیں یہ بھی چاہتا تھا ذیشان دوبارہ بھی میرے کمرے میں آ کر سوئے اور مَیں اُس سے کھل کر باتیں کروں اور ایسا ہوتا تھا لیکن اب میرے اور اُس کے درمیان ایک فاصلہ ضرور رہا۔ وہ فاصلہ جو شیزا کے اور میرے درمیان نہیں تھا۔ اب مجھے اِس فلیٹ میں آٹھ مہینے ہو گئے تھے۔ مَیں اُن بھائی بہنوں کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ دونوں سیکس ورکر تھے۔ وہ اِس کام میں کتنے عرصے سے تھے؟ اِس بات کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا لیکن اُن کی صحت اور چہروں کی جلد اور چکناہٹ سے بخوبی طے کیا جا سکتا تھا کہ کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی اور یہ بھی کہ وہ عام سیکس ورکروں سے بہت دُور رہنے والے، فقط اپر مڈل کلاس کے طبقوں سے روابط رکھتے تھے۔ میرے لیے جو انتہائی تشویش ناک بات تھی، وہ یہ کہ مَیں شیزا میں بُری طرح پھنس گیا تھا۔ مَیں اُس کے کہنے پر اکثر لوگوں کے بلا معاوضہ کام بھی کرنے لگا تھا۔ یہاں تک کہ اِس بات کا ظفر عالم کو بھی اندازہ ہو گیا اور وہ بھی مجھ پر کئی ایسے کاموں کا بوجھ لاد دیتا جنھیں مَیں کئی کئی راتوں کی نیندیں حرام کر کے انجام دیتا تھا۔ عبادت علی اب امریکا چلا گیا تھا۔ اُس کے دیے ہوئے پیسے ابھی تک میرے کام آ رہے تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ ظفر عالم مجھ سے بالکل ہی مفت کام لے رہا تھا مگر ایکسپلائٹ ضرور کرتا تھا۔ مَیں اپنے گھر میں متواتر خرچہ بھیج رہا تھا۔ کئی بار اپنے دوستوں کے لیے تحفے تحائف بھی لے کر گیا جن میں محبوب علی اور حاجی فطرس علی صاحب سرِ فہرست تھے۔ اِس فلیٹ میں ایک اور بات میرے لیے کسی قدر شروع شروع میں پریشان کن رہی تھی مگر اُس کا مسلسل سامنا کرتے ہوئے اب مجھے محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وہ بات اِس فلیٹ پر آنے والوں اور میرے متعلق تھی۔ اکثر مجھے اُن دونوں بھائی بہنوں کا بڑا بھائی سمجھ رہے تھے اور دلال کی حیثیت سے میرے ساتھ ڈیل کرتے تھے۔ فلیٹ میں جن لوگوں کا آنا جانا لگا تھا اُس میں یہ تصور کیا جانا عین واجب تھا کہ مَیں بھی اِنھی کا ایک

حصہ ہوں اور کسی علیحدہ خاندان سے نہیں ہوں۔ شیزا اور ذیشان کے گھر میں نہ ہونے کی صورت میں کئی بار فلیٹ کی گھنٹی مار کر مجھ سے پوچھا گیا کہ وہ کہاں ہیں۔ میرا اِس چیز سے انکار کرنا کس قدر غیر فطری تھا کہ مَیں اِس بارے میں خبر نہیں رکھتا۔ ایسا کئی بار ہوا کہ ذیشان کی بابت جب باہر نکل کر مجھے بتانا پڑا کہ وہ میرا کچھ نہیں بس دوست ہے اور یہ کہ اُس کی مصروفیت کی مجھے خبر نہیں، تو پوچھنے والے کے سامنے یہ کتنی مضحکہ خیز وضاحت تھی۔ میری اِس وضاحت پر کئی بار ملاقاتیوں نے مسکرا کر بھی دیکھا تھا مگر مجھے یہ سب کچھ منظور تھا کیونکہ مَیں بہت خوش تھا۔

شیزا جانتی تھی کہ اُس نے ایک شخص کے ساتھ کاروباری تعلق نہیں رکھنا ہے اور وہ شخص مَیں تھا۔ اُس نے یہ بات مجھ پر پچھلے آٹھ ماہ میں ثابت کر دی تھی۔ یہاں تک کہ پچھلے دو مہینے کا فلیٹ کا کرایہ لینے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ وہ جانتی تھی میرے معاشی حالات اُس کی نسبت اونٹ کے منہ میں زیرہ ہیں۔ شیزا کے کپڑے، پرفیوم، زیورات اور دیگر اخراجات ایسے تھے کہ اُن کے سامنے میری محدود آمدنی محض دل بہلانے کے لیے کافی تھی۔ مجھے یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ اپنے ساتھ اِس فلیٹ میں رکھنے کا مقصد اِس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ بعض معاملات میں اُن کا سہارا بنا رہوں۔ کم از کم شہر کے لوگوں کو احساس رہے کہ اِس فلیٹ میں دو بہن بھائی بے سہارا نہیں ہیں۔ اُن کی نگہبانی اور پشت پناہی کے لیے کوئی موجود ہوتا ہے۔ مَیں اُن کے اِس تاثر کو نہ صرف یہ کہ اپنے لیے قبول کر چکا تھا بلکہ اکثر مواقع پر ثابت بھی کیا تھا۔ مَیں کئی پارٹیاں اٹینڈ کر چکا تھا۔ اُن میں آنے جانے والے لوگوں کی شکلیں اور لہجے اور گفتگو میں گھِن کھانے والی تکرار اور کراہت پیدا کر دینے والی لفظیات کے کلیشے جنھیں وہ بار بار دہراتے تھے جان چکا تھا۔ مَیں ایسے لوگوں کے سامنے کھڑا اُن کے آغاز سے لے کر انجام تک کی گفتگو کو اُن کے بولنے سے پہلے دہرا سکتا تھا۔ اِن پارٹیوں میں مَیں سرکاری بابوؤں، اخباروں کے صحافیوں، بزنس مینوں، شوبز مینوں، منسٹروں، ایمبیسڈروں، سول کپڑوں میں سی ایس پی افسروں اور سب سے بڑھ کر اِن کی بیگموں اور اُن کے بچوں تک کے چال چلن سے ایسے واقف ہو گیا تھا جیسے خود اُن کے انداز و اطوار اور ڈائیلاگ کا تخلیق کار ہوں۔ مَیں یہ بھی جانتا تھا اِن میں شیزا کی حیثیت محض ایک سیکس ورکر کی تھی۔ یہی حیثیت اگرچہ اُن میں کئی افراد کی بیویوں کی بھی تھی مگر اُن کے لیے یہ الفاظ اِس لیے استعمال نہیں کر سکتے کیونکہ وہ کسی خاص وقت میں خاص شخص کے لیے یہ کام انجام دے کر واپس اپنے خاوند کے کمرے میں پناہ لے سکتی تھیں مگر شیزا کے لیے ایسی کوئی پناہ نہیں تھی، نہ وہ خاص وقت کے خاص کام سے واقف تھی۔ اُس نے

اپنی جو پناہ تلاش کی تھی وہ بھی ایک علامت تھی اور علامتیں کبھی حقائق کو تبدیل نہیں کیا کرتیں مگر مَیں اپنی اُس حقیقت میں خوش تھا اور جسم کی پہنائیوں میں کھو کر اُن تمام اخلاقیات کی لغت کو کھرچ کر الگ چکا تھا جنھیں زمانے کے بے بس اور محدود وسائل کے طبقات یاد رکھنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

ایک دن مَیں رات دس بجے فلیٹ پر واپس آیا، شیزا فلیٹ پر موجود تھی۔ وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی ایک انگلش فلم دیکھ رہی تھی۔ میرے وہاں داخل ہوتے ہی اُس نے مجھے فلم دیکھنے کی دعوت دی۔ مَیں نے اُسے ذیشان کی بابت پوچھا۔ وہ دو دن سے نظر نہیں آ رہا تھا۔ اُس نے بتایا وہ اپنے چیک دوست کے ساتھ کراچی گیا ہے اور وہاں سے وہ شمالی علاقوں کی سیر پر جانا چاہتے ہیں۔ شاید مزید پندرہ بیس دن تک نہ آئے۔ مَیں اُس کے ساتھ صوفے پر گویا لیٹ ہی گیا۔ اِس طرح کہ اُس کے بال میرے چہرے کے اُوپر پڑ رہے تھے۔ اب مَیں شیزا کے بالوں کی سدا بہار بھینی خوشبوؤں کا عادی ہو چکا تھا اور اکثر کوشش کرتا تھا اُن بالوں کی خوشبو اور لرزش میرے چہرے کے خط و خال کو چھو کر سرسراہٹ کا احساس دلائے۔ ہم دونوں کچھ دیر ایسے ہی پڑے رہے پھر وہ آہستہ آہستہ میرے اوپر جھکتی چلی گئی۔ تب کچھ ہی دیر میں اُس نے ریموٹ کے ذریعے فلم بند کر دی اور مکمل مجھ پر چھا گئی۔ یہ پہلی بار نہیں ہوا تھا کہ ہم ڈرائنگ روم میں ایک دوسرے کے ساتھ جذب ہوئے ہوں۔ یہ بھی پہلی بار نہیں ہوا تھا کہ ہم نے باہم ہونے کے ساتھ ڈرائنگ روم کی لائٹیں آف کی ہوں یا ذیشان کے کمرے اور کھلے یا بند دروازے کا دھیان کیا ہو۔ اب تو ذیشان بھی موجود نہیں تھا۔ ہم بہت دیر آپس میں گھتم گھتا ہوتے رہے اور آخرکار تھک کر اور چمٹ کر لیٹ گئے۔ اِسی عالم میں ہمیں نیند آ گئی۔ آنکھ کھلی تو دن کی پو پھٹ رہی تھی۔ چونکہ ہم صوفے پر ہی لیٹے ہوئے تھے اور اِسی عالم میں سو گئے تھے۔ اِس لیے جسم میں تھوڑی سی تھکاوٹ کا احساس جاگ رہا تھا۔ مَیں صوفے سے اُٹھ کر سامنے والے سنگل صوفے پر بیٹھ گیا اور نہانے کے لیے جسمانی اکڑاؤ لینے لگا۔ میری آنکھیں ابھی پوری طرح کھلی نہیں تھیں۔ شیزا ابھی جاگ گئی تھی لیکن اُس کے ارادوں سے صاف نظر آ رہا تھا کہ ابھی وہ صوفے سے اُٹھنے کے لیے تیار نہیں ہے اور آنکھیں مل کر وہیں دوبارہ سونے کی کوشش کرے گی۔ مَیں اُٹھ کر واش روم میں جانے کے لیے اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ عین اُسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ مَیں اکثر ٹیلی فون کا رسیور نہیں اُٹھاتا تھا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ مجھے کبھی کہیں سے کال نہیں آتی تھی۔ مَیں نے اپنا نمبر تین چار لوگوں کو دیا تھا۔ جن میں اول میرے والد تھے، پھر میرے شہر میں سید فطرس علی تھے۔ ان کے علاوہ نہیں تھا اور اِنھیں بھی مَیں خود ہی

فون کر لیتا تھا۔ چنانچہ ڈرائنگ روم میں پڑا ہوا فون کا رسیور بھی میرے کسی کام کا نہیں تھا۔ جب دونوں بہن بھائی گھر پر نہ ہوں تو اور بات تھی۔ تین چار بار گھنٹی بجنے کے بعد شیزا خود اُٹھی۔ اُس نے کسلتی آنکھوں سے فون اٹھالیا۔ پھر مجھے آواز دی۔ مَیں اپنے کمرے سے ہو کر واش روم میں داخل ہو رہا تھا۔

سنو ضامن، تمھارا فون ہے، بھاگ کے آؤ۔ شیزا نے کچھ اِس طریقے سے آواز دی کہ میرا کلیجا حلق میں آ گیا۔ پہلی بار مجھے اپنے شہر سے کسی کا فون آیا تھا اور یہ معمولی بات نہیں تھی۔ دو تین دن سے میری کیفیت یونہی اُداس اور بیزار تھی۔ ظالم معاشروں میں مفلوک حال انسانوں کی خوشیاں اتنی ادھوری ہوتی ہیں کہ ہر لمحہ کسی سانحے کا دھڑکا رہتا ہے۔ ایسے سماج میں خوشی کے لمحات بھی سوگواری کے خوف میں صرف کیے جاتے ہیں۔ مَیں بھاگ کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور جلدی سے فون اُس کے ہاتھ سے پکڑ لیا۔ ڈرتے ہوئے فقط میرے منہ سے جی نکلا۔

ضامن ہے؟ آگے سے میرے والد صاحب کی آواز تھی۔

جی ابا ضامن بول رہا ہوں، خیریت؟ مَیں نے لرزتے ہوئے کہا۔

بیٹا حاجی فطرس صاحب کو آج صبح نمازِ فجر کے وقت امام بارگاہ جاتے ہوئے کسی نے گولی مار دی ہے۔ وہ شہید ہو گئے ہیں۔ آج عشا کے بعد اُن کی نمازِ جنازہ ہے۔ میرا خیال ہے ابھی نکلو تو اُس وقت تک پہنچ جاؤ گے۔

مَیں والد صاحب سے زیادہ بات نہیں سُن سکا۔ یہ حادثہ ہی کافی تھا۔ اِس کے بعد مجھ میں سماعت کی قدرت نہیں رہی تھی۔ مَیں نے والد صاحب کو فقط اتنا کہا، جی مَیں ضرور پہنچ جاؤں گا اور رسیور کریڈل پر رکھ کر وہیں بیٹھ گیا۔ میرے حواس کہیں دُور کھو چکے تھے۔ کچھ دن سے انجانے خوف نے مجھے گھیرا ہوا تھا اور خوف کی اِسی خموشی کے اندر کتنا بڑا سفاک حادثہ چھپا ہوا تھا۔ مَیں کچھ دنوں سے سوچ رہا تھا حاجی صاحب سے ملے ہوئے کافی دن ہو گئے ہیں۔ پچھلی بار شہر گیا تھا تو اُن سے تب بھی ملاقات نہیں ہو سکی تھی کہ وہ کراچی گئے ہوئے تھے۔ اِس بار جاؤں گا تو پورے دو دن مسلسل اُن کے پاس وقت گزاروں گا۔ میرے دماغ میں بہت سے سوالات تھے۔ میرا خیال تھا یہ سب باتیں اُن سے زیرِ بحث لاؤں گا مگر یہ سب کچھ مَیں ایک خوف کے تحت تصور کر رہا تھا اور اُن سے ملنے کے ارادے باندھ رہا تھا۔ اب وہ خوف حقیقت کا اژدھا بن کر میرے سامنے آ گیا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو رواں ہو چکے تھے۔ شیزا نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر دلاسا دینے کی کوشش کی مگر وہ بھی زیادہ دیر دلاسا نہیں دے سکی کہ

ایسے موقعوں پر دلاسوں کے معنی کھو جاتے ہیں۔ درد بٹانے والوں کو درد بٹاتے ہوئے بھی احساسِ جرم کا احساس ہوتا ہے۔ مَیں کافی دیر سر جھکائے وہیں بیٹھا رہا اور شیزا بغیر کوئی لفظ ادا کیے میرے شانوں پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ پھر مجھے نہیں خبر مَیں کس وقت اُٹھا اور واش روم میں داخل ہو گیا۔ باہر نکلا تو شیزا چائے بنا چکی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اُس نے میرے لیے اپنے ہاتھ سے چائے بنائی تھی۔ مَیں اِس کیفیت کو محسوس کر چکا تھا کہ وہ میرے لیے غمزدہ ہو چکی ہے اور یہ دل میں اُس بڑے غم کے ہوتے ہوئے بھی مَیں محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

چائے پیتے ہوئے مَیں نے شیزا سے کہا، شیزا مَیں جلدی نکلنا چاہتا ہوں۔

ہاں جاؤ اور جلدی واپس بھی چلے آنا۔ اُس کا یہ جملہ ایسے لگا جیسے میرے دل پر لگی خراشوں کو شفایاب کرتا گیا ہو۔ مَیں نے نہانے کے علاوہ کوئی دوسری تیاری نہیں کی۔ جن کپڑوں میں تھا، اُنھی میں باہر نکلنے کے لیے چل پڑا۔ اُسی لمحے شیزا پھر بولی، باہر ٹیکسی کھڑی ہے، مَیں نے ٹیکسی منگوالی تھی۔

مَیں نے پھر محبت بھری نظر سے شیزا کو دیکھا۔ اُسے میرے غم کا احساس کتنی جلدی ہو گیا تھا۔ جب تک مَیں دروازے سے باہر نہیں نکلا حاجی فطرس علی کا چہرہ بھول کر مَیں شیزا میں مگن رہا اور جیسے ہی ٹیکسی میں بیٹھ کر روانہ ہوا، حاجی سید فطرس علی کی یادیں ٹوٹ کے میرے جسم و جان سے لپٹ گئیں۔ یہ کیا ہو گیا تھا؟ اچانک حاجی صاحب کا قتل میرے لیے کتنا اندوہ ناک تھا۔ جن لوگوں کے لیے مَیں اپنے شہر کی طرف لوٹا تھا، آج اُن میں سے پہلے انسان کا قتل ہو چکا تھا اور یہ ابتدا تھی، آگے کیا ہو گا؟ اِس بات کو سوچتے ہی میرے تمام جسم میں ایک جھرجھری سی آ گئی۔

شام پانچ بجے ہی مَیں اپنے شہر پہنچ گیا اور اب مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی، مَیں اپنے گاؤں جاؤں یا حاجی فطرس علی کے مکان پر جا کر اُن کی خون میں تر بتر لاش کا سامنا کروں۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھ میں اُن کی لاش کا سامنا کرنے کا ذرا بھی حوصلہ نہیں تھا۔ مَیں نے اُنھیں جس شکل و صورت میں اپنے آپ سے مخاطب ہوتے اور باتیں کرتے دیکھا تھا، مَیں اُس تصور کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مَیں سینے کے اندر حاجی صاحب کی ایک دنیا آباد رکھتا تھا اور نہیں چاہتا تھا وہ دنیا قبرستان میں تبدیل ہو جائے۔ مجھے آج تک جو تجربہ اپنے ملنے والوں کی لاشوں سے ملاقات میں ہوا تھا اُس سے یہی ثابت ہوا تھا کہ وہ تمام عرصہ جس میں اُنھیں مَیں زندوں کی صورت میں دیکھ چکا تھا اُن کے مردہ ہونے کے ایک پل نے اُس تمام دورانیے پر فتح حاصل کر لی تھی جو مَیں زندگی میں اُن کے ساتھ گزار چکا تھا۔ مجھے اُن کے وہ چہرے

بھول گئے تھے جو ہشاش بشاش اور زندگی سے بھرپور تھے اور وہ چہرے یاد رہ گئے جس میں اُنھیں لاش کی حالت میں چارپائی پر بے طرح پڑے دیکھا تھا۔ اِن سب میں میری دادی کا چہرہ میری آنکھوں میں مستقل ایک لاش بن کر ٹھہر گیا تھا۔ اب حاجی سید حکیم فطرس علی کا سامنا کرنا میرے لیے اُس سے بھی زیادہ اذیت ناک ہوسکتا تھا۔ مَیں نے پورے رستے طرح طرح سے اُنھیں سوچا اور ایک ایک پل کے لیے اُن کی باتیں میرے تصور میں زندگی سے معمور تھیں۔ اس لیے مَیں ایک ہی لمحے میں اُس تمام کیفیت کو کیسے ختم کرسکتا تھا؟

جس نے حاجی صاحب کو مردہ حالت میں دیکھنے کی تمنا کی پھر اُنھیں قتل کر دیا، مَیں اُس شخص پر اپنی فتح چاہتا تھا اور یہ فتح اِسی صورت حاصل ہوسکتی تھی کہ حاجی فطرس علی میرے لیے ہمیشہ زندہ رہیں۔ مَیں اُنھیں کبھی قتل نہ ہونے دوں، اپنے تصور میں بھی قتل نہ ہونے دوں۔ حاجی صاحب کا جنازہ عشا کے بعد تھا اور مَیں اِس جنازے میں اُن کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر کھڑا ہونا چاہتا تھا۔ مَیں چاہتا تھا، اِس جنازے میں شریک ضرور ہوں مگر یہ جنازہ حاجی فطرس علی کا ہرگز نہیں بلکہ حاجی فطرس علی میرے ساتھ کھڑے کسی پر دعائے خیر کہہ رہے ہیں اور مَیں آمین پڑھ رہا ہوں۔ جو ہمارے سامنے پڑا تھا وہ نہ جانے کون تھا۔ مَیں نے اپنے دل کو مضبوط کیا اور سیدھا گاؤں چلا آیا۔ جیسے ہی ہسپتال کے سامنے پہنچا میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ ہسپتال کے صحن میں کھڑے درختوں میں سے کسی درخت کی ایک ٹہنی تک وہاں باقی نہیں تھی۔ یہ جگہ ایک اُجاڑ صحرا معلوم ہو رہا تھا۔ اُس کے صحن میں اتنی دُھول تھی کہ وہاں جیسے دیو ہو نکلتے ہوں۔ یہ ایک دم کیا ہو گیا تھا؟ اور مجھے کسی نے خبر تک نہیں کی تھی۔ اردگرد کی دیواریں گر چکی تھیں۔ اِن کو درمیان سے ایسے کر دیا گیا تھا جیسے کوئی بڑا کبڈی کا میدان ہو۔ اِتنے سارے درخت کاٹ لیے گئے تھے اور تو اور وہاں ایک دو کمروں کے علاوہ ہسپتال کا کوئی کمرہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھے لگا میرا دل ڈوب جائے گا۔ یہ کیا ہوا تھا؟ اتنے میں ایک شخص پاس سے گزرا، بولا میاں کیا دیکھتے ہو بابو؟ مَیں نے اُسے روک کر پوچھا چاچا یہاں کے درخت اور کمرے کہاں گئے؟

وہ بولا، وہ تو چودھری یامین صاحب نے کٹوا کر فرنیچر بنوا لیا ہے اور اب یہاں وہ مرغی خانہ کھولنے لگا ہے۔

تو ڈسپنسری کیا ہوئی؟ مَیں جیسے رونے ہی والا تھا۔

اُس کی گاؤں والوں نے کہا ہمیں ضرورت نہیں۔ مریضوں کو شہر لے جایا کریں گے۔

ہائیں گاؤں والوں نے کہا؟ یہ کیا کہہ رہے ہو، وہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟

بھئی جب چودھری یامین صاحب نے کہہ دیا تو سمجھو گاؤں والوں نے کہہ دیا، وہ یہاں کا چیئرمین ہے۔

تو کیا وہ یہاں مرغی خانہ کھولے گا؟ گاؤں والوں کو بدبو نہیں آئے گی؟

وہ مسکرا کر بولا، لو اگر وہ مرغیاں کھاتے مرتے ہیں تو مرنے دیجیے اور ہنستا ہوا آگے نکل گیا۔

مجھ پر ایک موت کی کیفیت طاری ہو چکی تھی، مجھے حاجی فطرس علی گویا بھول ہی گئے اور ایک نئی مصیبت میں گرفتار ہو گیا۔ مَیں سوچنے لگا یہ کیسے ہو سکتا ہے ایک سرکاری ہسپتال کی جگہ کوئی چیئرمین اپنا ذاتی مرغی خانہ کھول لے اور عوام کے یا سرکار کے کان پر جوں تک نہ رینگے۔ میرا جی چاہ رہا تھا مَیں یہاں اِسی صحن میں لیٹ جاؤں اور چیخیں مار مار کر لوٹنیاں لوں۔ کم از کم میں اس پر مکمل حق رکھتا ہوں اور سچ پوچھو تو یہ میری بچپن کی جاگیر تھی جسے میں اجازت کے بغیر برباد کر دیا گیا تھا۔ کتنی جلدی حادثوں نے میرے سینے میں قبریں کھودنا شروع کر دی تھیں۔ مَیں حیران تھا اِس سینے میں اتنی جگہ کہاں ہے کہ سیکڑوں قبرستان اُس میں سما جائیں۔ کاش مَیں اِس چودھری یامین کا کلیجا چبا ڈالتا۔ اُسے جن لوگوں نے ووٹ دیے تھے اُنھیں زندہ مر جانا چاہیے تھا مگر گاؤں والے اُسی کو ووٹ دیتے ہیں۔ میرا تو نہ کسی ووٹ پر یقین تھا، نہ کسی نظریے کی پاداش میں نعروں کی گھٹڑی اُٹھا سکتا تھا۔ میں وہ تھا جسے دستاویزات اور آئین کی بوسیدہ فائلوں کی نہیں اپنی مٹی کی خوشبوؤں اور سبز پانیوں کی ضرورت تھی۔ مَیں اپنے مردہ قدموں کے ساتھ سڑک پار کر کے اپنے دروازے سے گھر میں داخل ہوا تو میری ماں گویا میرے انتظار ہی میں بیٹھی تھی۔ بھاگ کر ہمیشہ کی طرح گلے لگ گئی۔ ہمارے گھر میں ٹاہلی کا وہ درخت ویسے ہی ہرا بھرا موجود تھا۔ جسے مَیں بچپن میں کئی بار اُس کی شاخوں کی چوٹیوں پر چڑھ کر سر کر چکا تھا۔ یہ ٹاہلی کا درخت مجھے کوہ ہمالیہ کی چوٹی سے زیادہ پراسرار اور اپنی طرف کھینچنے والا لگتا تھا۔

مَیں کچھ دیر تک اپنی ماں کی گود میں سر رکھے لیٹا رہا۔ اُس کے بعد اُٹھ کر ٹاہلی کے تنے کو گلے سے لگا لیا۔ یہ میری دادی کی نشانی اور میری گرمجوشی کا سرمایہ تھا۔ شاید یہ درخت اُن چند نفوس میں سے ایک تھا جن کے لیے مَیں بار بار اپنے شہر کی طرف مراجعت کرتا تھا۔

میرا بھائی جو دو سال پہلے اپنی نوکری کے سلسلے میں لاہور میں مقیم تھا، آج بھی گھر میں نہیں تھا۔ مَیں جب گھر آتا تو اکثر وہ گھر پر نہیں ملتا تھا۔ اُس کا گھر آنا پندرہ دن بعد ہوتا تھا اور وہ بھی جمعہ اور

جمعرات کے دنوں میں۔ مَیں اسلام آباد آتے جاتے ہی اُسے ملتا تھا اور گھر پر ہماری ملاقات کم ہی ہوتی تھی۔ والدہ نے بتایا، میرے والد صاحب آج بارہ بجے ہی شہر چلے گئے تھے اور اب وہ حکیم صاحب کے جنازے اور تدفین کے بعد ہی لوٹیں گے۔ والدہ حاجی فطرس علی کے معاملے میں میری وابستگی کو جانتی تھی۔ اُس نے خدا جانے قاتلوں کو کس کس انداز میں لعنتوں اور گالیوں سے یاد کیا اور بار بار حاجی صاحب کی نیک طبیعتی کے واقعات سناتی رہی اور مجھے دلاسے دیتی رہی۔ اُسے حیرت تھی کہ مَیں ابھی تک حاجی فطرس علی کی لاش پر کیوں نہیں گیا تھا۔ مَیں دو گھنٹے والدہ کے پاس ہی بیٹھا رہا۔ اِس عرصے میں اُس کے ہاتھ سے پکا ہوا کھانا بھی کھایا حالانکہ مجھے کھانے کی ذرا بھی طلب نہیں رہی تھی مگر والدہ ایک ایسی گٹھڑی ہے جس کا غم تب تک ہلکا نہیں ہوتا جب تک بیٹا اُس میں بندھ نہ جائے۔ مَیں غائب دماغی سے اپنی والدہ کی طفل تسلیاں سُنتا رہا جبکہ میرا دماغ کبھی حاجی صاحب اور کبھی گاؤں کی ڈسپنسری کے درختوں، دیواروں اور پرندوں میں اٹک جاتا تھا۔ اچانک مَیں نے اپنی ماں سے ایک مہمل سا سوال کر دیا، امی آپ نے مجھے ڈسپنسری کے درختوں کی بابت کیوں نہیں بتایا؟ وہ تو سارے کٹ گئے ہیں لیکن مجھے پتا نہیں چلا۔ مَیں اپنے گاؤں میں آیا ہوں یا کسی صحرا میں پہنچ گیا ہوں۔

میرے اِس سوال پر والدہ میری طرف آنکھیں کھول کر دیکھنے لگی، بولی بیٹا تجھے اور مصیبتیں تھوڑی ہیں کہ ایک یہ بھی صدمہ تیرے جی کو پہنچاتی۔ اطلاعیں وہاں دی جاتی ہیں جہاں اُن کا مداوا بھی ہو سکے۔ یہاں کون تیری داد فریاد سنتا؟ مفت میں جی پھنکتا رہتا۔ ہسپتال کے سارے درخت دِتہ ترکھان کے آرے پر پڑے ہیں اور یامین کی بیٹی کا جہیز بن رہا ہے۔ سُنا ہے ہسپتال پر بھی کسی سے مل کر مرغی خانہ کھول رہا ہے۔ اللہ جانے اتنی مرغیاں کہاں سے لائیں گے؟ کہتے ہیں بجلی سے پیدا ہوتی ہیں اور اُن کو گند بلا کھانے کو دیتے ہیں جس کی بدبو دماغوں کو چڑھ جاتی ہے۔ ایسا گوشت کھائیں گے تو صاف سوچیں گے کیسے۔

پر آپ لوگوں نے اُنھیں درخت کاٹنے پر ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ آخر ڈسپنسری ہمارے گھر کے سامنے تھی اور درخت بھی گھر کے سامنے تھے۔ کم سے کم ابا تو بولتے۔

بیٹا تیرا ابا بولا تھا، یہاں سکول میں ڈی سی جب دورے پر آیا تو تیرے ابے نے آگے ہو کر ڈی سی سے کہا تھا۔ آگے سے اُس نے مذاق بنالیا، کہنے لگا چاچا جی آپ نے درختوں پر چڑھ کر کبوتر اُڑانے ہیں یا گھونسلے بنا کر رہنا ہے۔ کٹ گئے ہیں تو اور لگ جائیں گے۔ اِس بات پر وہاں سارے اُلکے تلکے

نے قہقہہ مار کر بات ہی ہوا کر دی۔ اُلٹا تیرا باپ بے عزت ہو کر گھر آ گیا۔ لوگ کہنے لگے جو گاؤں کے وارث ہیں جب وہ فیصلہ کر رہے ہیں کہ یہاں کیا بننا ہے اور کیا نہیں تو تیری کیا حیثیت ہے کہ اِس معاملے میں زبان کھولے؟ اب تو خود ہی بتا اکیلا تیرا باپ کس کولھو میں سر دیتا اور تو اور گاؤں میں کچھ عرصے سے ایک نیا مولوی آ گیا ہے۔ اُس نے پورے گاؤں میں الگ ہی بات چھیڑ دی ہے کہ ہم مسلمان ہی نہیں ہیں۔ تجھے کیا پتا اِس دفعہ کی نیاز میں آٹھ دس لوگوں کے علاوہ ہمارے ہاں سے کوئی نیاز کھانے والا بھی نہیں آیا اور تُو درختوں کے کٹنے کو رو رہا ہے۔ بیٹا تو غم نہ کھا، تُو کون سا یہاں رہتا ہے۔

مَیں والدہ کی بات سُن کر چپ ہو گیا۔ واقعی میرے باپ کی اِس گاؤں میں دو کوڑی کی حیثیت بھی نہیں تھی۔ سب چیزیں بدل رہی تھیں۔ اتنی تیزی سے بدل رہی تھیں کہ مَیں اُنھیں دانتوں سے پکڑنے کے لائق نہیں رہا تھا۔ نہ میرا باپ اُنھیں روک سکتا تھا۔ ایک بات مَیں نے اور بھی محسوس کی تھی کہ اِس بار مجھ سے بازار میں چلتے ہوئے ایک دو کے علاوہ کسی شخص نے سلام بھی نہیں لیا تھا۔ یہ انہونی نہایت خطرناک تھی۔

سات بجے گھر سے نکلا۔ سیدھا قبرستان گیا۔ وہاں پہلے اپنی دادی کی قبر پر فاتحہ خوانی کی اُس کے بعد عدیلہ کی قبر پر تھوڑی دیر کچھ آیتیں پڑھیں اور تب واپس گھر آ کر شہر جانے کے لیے تیاری کی۔ والدہ نے مکرر میرے اُوپر دعائیں پڑھ کر پھونکیں اور مجھے شہر کے لیے رخصت کیا۔ جب میں اپنے شہر اور گاؤں سے مستقل طور پر نہیں نکلا تھا اور خاص طور پر اغوا نہیں ہوا تھا تب تک والدہ کسی وقت مجھے رخصت کرتے ہوئے اِس طرح کے اعمال میں کوتاہی کر جاتی تھی مگر میرے اغوا کے بعد اُس نے ذرہ برابر بھی کوتاہی کرنا گناہِ کبیرہ سمجھ لیا تھا۔ پہلے حاجی فطرس علی کا جنازہ امام بارگاہ میں عشا کی اذان کے وقت پڑھا گیا۔ اُس کے بعد شہر کی جنازہ گاہ میں لا کر عوام الناس کے لیے رکھ دیا۔ مَیں اِن ہر دو جگہوں پر موجود تھا۔ اِسی دوران میری اپنے والد صاحب سے بھی ملاقات ہو گئی۔ اُنھوں نے مجھے حاجی صاحب پر لگنے والی گولیاں اور حملے کی تفصیلات سے حرف با حرف آگاہ کیا۔ مجھے اِس میں فوراً حاجی فطرس علی کی وہ باتیں یاد آنے لگیں جن میں اُنھوں نے اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ اِس ملک میں شیعہ کا ملک گیر احتجاج ریکارڈ کر کے اپنی طاقت کی نمائش حتمی طور پر ایجنسیوں کے ہاتھوں اپنے قتل کی مہر پر دستخط کرنے کے مترادف ہوگا اور اُس میں وہ بھی مارے جائیں گے جو کبھی اِن تحریکوں کا حصہ بھی نہیں رہے۔ آنے والے ظالم نہیں دیکھتے کہ مقتولوں کے اجداد نے اپنے فیصلوں میں اپنی نسلوں کو شریک کیا

نہ پایا نہیں۔ وہ صرف یہ دیکھتے ہیں اجداد کے قرض کی ادائیگی ہمیشہ نسلیں ادا کرتی ہیں اور یہی اُصول ہے۔

مَیں ابھی تک دونوں جگہ جنازے میں شریک ہونے کے باوجود حاجی فطرس علی کی میت کے قریب نہیں گیا تھا، حالانکہ کئی جاننے والے مجبور کر رہے تھے کہ مَیں قریب ہو کر اُن کا چہرہ دیکھ لوں۔ میرے والد نے بھی یہی اصرار کیا تھا لیکن مَیں اپنی بات پر قائم رہا اور حاجی صاحب کی میت اور تدفین سے مستقلاً دور رہا۔ رات آٹھ بجے مَیں اور میرے والد گاؤں لوٹ آئے۔ ہم نہایت بوجھل اور دل گرفتہ تھے۔ مَیں نے اُنھیں گاؤں کے درختوں کے کٹنے کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا مگر اُنھوں نے خود ہی یہ بات چھیڑ دی اور کہا اُس نے ایک درخواست بھی چیئرمین کے خلاف دی تھی لیکن چھ بار اُس درخواست کا پیچھا کرنے کے باوجود کسی نے آ کر نہ ڈسپنسری کا دورہ کیا اور نہ چیئرمین کو اُف تک کی۔ اُلٹا ایک شام یامین چودھری نے مجھے پنچایت میں کئی لوگوں کے درمیان بلا کر رعب دیا، اگر چپ کر کے بیٹھ جاؤں تو بہتر ہے ورنہ کافر کر کے گاؤں سے نکلوا دوں گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کسی اندھے کانے لونڈے کو چار پیسے دے کر تیرا قصہ ہی پاک کروا دوں۔ اُس دن سے بیٹا مَیں تو چپ کر گیا ہوں۔ ایک بار حاجی فطرس صاحب سے کہا تھا۔ اُنھوں نے بھی یہی مشورہ دیا کہ جہاں سننے والا کوئی نہ ہو وہاں اپنی رائے کو بے وقعت نہ کرو۔

والد صاحب تھوڑی دیر بعد آہ بھر کر دوبارہ بولے، ضامن تیری دادی اور دادے کی ہڈیاں اِسی گاؤں کے قبرستان میں پڑی ہیں۔ مَیں بھی جب تک جیتا ہوں یہاں سے دور نہیں جانا چاہتا۔ پر تجھے غم کرنے کی ضرورت نہیں۔ مَیں نے چار چھ درخت نئے اِسی سڑک کنارے گھر کے سامنے لگا دیے ہیں۔ کسی نہ کسی دن بڑے ہو جائیں گے۔

گھر میں یہ رات مَیں نے نہایت کرب اور اذیت میں بسر کی اگلے دن صبح اُٹھ کر گاؤں کی پچھلی جانب کھیتوں میں نکل گیا تاکہ دل میں پڑنے والی بوجھ کی گرہیں کچھ ہلکی ہو جائیں۔ شاید اِس کے بعد گاؤں میں آنا نصیب بھی ہو یا نہیں کہ طبیعت بہت بوجھل اور بیزار کر دینے والی ہو گئی تھی۔ ایک گھنٹے بعد پھر پھرا کر واپس آ گیا۔ اب مَیں اپنے سامنے کے دروازے سے باہر نکلنا نہیں چاہتا تھا کہ مجھ سے اُس اُجڑے ہوئے در و دیوار کا سامنا نہیں ہوتا تھا۔ والد اور والدہ نے مجھے اصرار کیا کہ ایک دو دن مزید رُک جاؤں۔ اُن کے شدید اصرار پر مَیں رُک تو گیا مگر سارا دن باہر نہیں نکلا حتیٰ کہ سہ پہر ہو گئی۔ تب مَیں

واپس اُسی چھوٹی کھڑکی سے دوبارہ نکلا اور کھیتوں کے دوسری طرف سے ہوتا ہوا گاؤں میں چلا گیا لیکن مجھے کوئی شے اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ لوگ بدلے ہوئے تھے۔ گلیوں کے اکثر درخت کٹے ہوئے تھے۔ لوگوں نے گاؤں کی سڑکوں میں بڑے بڑے تھڑے نکال کر کھلی سڑکیں گلیوں کی مانند تنگ کر دی تھیں۔ گاؤں کے درمیان سڑکوں کے دائیں بائیں بہنے والے پانی کے نالے ختم ہو گئے تھے جن کے ذریعے درختوں کو پانی ملتا تھا۔ اُن پانی کے نالوں کو مٹی سے پُر کر کے وہاں تک لوگوں نے اپنے گھروں کی دیواریں کھڑی کر دی تھیں۔ درخت آدھے سے بھی کم رہ گئے تھے۔ یہ ایک دم کیا بھونچال آیا تھا۔ اچانک اِس تبدیلی پر جسے مَیں اپنی آنکھوں کے سامنے واضح دیکھ رہا تھا، مجھے خیال آیا جو شہروں کی تبدیلیاں اور زمانے کے تغیرات دیکھنا چاہتا ہو اُسے اِس گاؤں میں ہونے والی تبدیلیوں سے اندازہ لگا لینا چاہیے کہ تیسری دُنیا کے شہروں پر کتنے زلزلے گزر جاتے ہیں اور لوگ اُنھیں ہضم کر جاتے ہیں۔ تیسرے دن مَیں والدہ اور والد سے رخصت لے کر منہ اندھیرے ہی گاؤں سے نکل کھڑا ہوا کہ اب مجھ میں اِسے دن کے وقت دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔ اُسی دن شام چار بجے ریل نے راولپنڈی پہنچا دیا۔ وہاں سے مَیں نے ٹیکسی لی اور ایف سکس اپنے اپارٹمنٹ پہنچ گیا۔ میری توقع کے عین مطابق شیزا فلیٹ پر موجود نہیں تھی۔

(۶۷)

مَیں بہت تھکا ہوا تھا۔فلیٹ پر آتے ہی نیند نے دبوچ لیا۔ اِس عالم میں بھی مَیں ڈپریشن زدہ خواب دیکھتا رہا۔کبھی درختوں کے کٹنے کے اور کبھی سید حاجی فطرس علی کے قتل کے بھیانک منظر دکھائی دینے لگتے۔ یہ خواب آپس میں اتنے گڈ مڈ ہو گئے کہ عجب صورت بن گئی۔ مَیں نے دیکھا حاجی فطرس علی ہمارے گاؤں میں آیا ہوا ہے اور وہ ایک آدمی کو ڈسپنسری کے درخت کاٹنے سے روک رہا ہے۔ وہ آدمی پہلے حاجی صاحب کو گالیاں دینے لگتا ہے پھر اچانک وہی کلہاڑا، جس سے درخت کاٹ رہا تھا، حاجی فطرس علی کے سر پر دے مارتا ہے۔ مَیں ڈرا ہوا ایک طرف کھڑا تھا اور حاجی فطرس کو بچانے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ مجھے خوف لاحق ہوا کہ وہ اگلے ہی لمحے یہ کلہاڑا میرے سر پر دے مارے گا۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے حاجی صاحب کے سر سے اتنا خون نکلا کہ پہلے اُس درخت کا گڑھا خون سے بھر گیا، اُس کے بعد وہ پھیلتا ہوا ڈسپنسری کو ڈبونے لگا۔ اُسی میں وہ آدمی بھی غوطے کھانے لگا جس نے حاجی صاحب کے کلہاڑا مارا تھا اور خون اب نہر کی طرح پورے گاؤں میں پھیلنے لگا تھا اور کسی طرح رُک نہیں رہا تھا۔ تب اردگرد کے لوگ بھی اُس میں ڈوبتے چلے گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہمارا پورا گاؤں اُس خون میں تیرنے لگا۔ مَیں ڈر کے مارے وہاں سے بھاگ اُٹھا اور اِدھر اُدھر بھاگ کر کسی درخت کو ڈھونڈنے لگا جس پر چڑھ کر ڈوبنے سے بچ جاؤں مگر مجھے وہاں کوئی درخت نظر نہیں آ رہا تھا۔ گاؤں میں تمام طرف گرد، خون اور کھنڈرات پڑے تھے۔ بھاگتے ہوئے میرے پاؤں پیچھے کو کھنچتے تھے اور خون پاؤں کو چھوتا تھا۔ اُسی وقت مَیں نے حاجی فطرس علی کو دیکھا کہ وہ دور کھڑے سب پر زہر خند مسکراہٹ

پھینک رہے تھے۔ مَیں دُور ہی دُور سے اُن سے ملتجی ہو رہا تھا کہ مجھے نکال لیجیے مگر وہ میری طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ تب ایک لمحہ ایسا آیا کہ مَیں کسی بیابان میں تھا اور میرے پیچھے خون کے دریا بہہ رہے تھے۔ مجھے اُسی لمحے اپنے باپ اور ماں کی فکر لاحق ہوئی۔ مَیں نے سوچا وہ تو گاؤں کے خون میں ہی بہہ گئے ہیں۔ مَیں چیخیں مار کر رونے لگا۔ اُسی وقت مَیں نے دیکھا مَیں گھر کے صحن میں کھڑا ہوں۔ میرا والد اور میری والدہ ہمارے صحن میں کھڑی اُسی ٹاہلی پر چڑھے بیٹھے ہیں اور مجھے پکار رہے ہیں کہ جلد شاخوں کے ذریعے اُوپر چڑھ جاؤں اور خون سے بچ جاؤں۔ مَیں اُنھیں غور سے دیکھتا ہوں کہ یہ کب اور کیسے اِس پر چڑھے ہیں کہ اُسی وقت اُن کے اوپر حاجی فطرس علی ہوا میں معلق مجھے کہہ رہے ہیں مَیں نے نہیں کہا تھا سب ڈوب جائیں گے؟ اِن کو مَیں نے بچایا ہے لیکن تُو ڈرپوک ہے اِس لیے اِسی خون میں ڈوبے گا۔ اُن کی بات سنتے ہی خون میرے پاؤں کو چھونے لگا اور مَیں ایک دم چیخ مارتا ہوں۔

اسی عالم میں میری آنکھ کھل گئی۔ مَیں نے دیکھا شیزا میرے سرہانے بیٹھی میرا پسینا پونچھ رہی تھی۔ مَیں نے اپنے جسم پر ہاتھ لگایا، وہ پسینے سے شرابور ہو رہا تھا اور شیزا کہہ رہی تھی، ضامن کیا ہوا؟ مَیں تمہارے پاس ہوں، کچھ نہیں ہوا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا شیزا میرے سرہانے بیٹھی میرے گالوں کو سہلا رہی ہے، مَیں نے اُس کے ہاتھوں کو چھوا اور اُٹھنے کی کوشش کی۔

ضامن پڑے رہو تمھیں سخت بخار ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا، مَیں تو اچھا بھلا سویا تھا۔ بخار کیسے ہو گیا؟ مَیں نے نحیف آواز میں پوچھا۔ شیزا وقت کیا ہوا ہے اور مَیں کہاں لیٹا ہوں؟

تم اپارٹمنٹ پر ہی ہو میری گود میں ہو ضامن۔ اسلام آباد ایف سکس میں۔ پریشان مت ہو مَیں تمھارے پاس ہوں نا؟ تم ڈر گئے ہو، چیخیں مار کے رو رہے تھے، کیا دیکھا تم نے؟

نہیں مَیں پریشان نہیں ہوں، شیزا مَیں نے بھیانک خواب دیکھا ہے، ساری دنیا خون سے بھر گئی ہے اور خون میرا پیچھا کر رہا ہے۔ ہم سب اُس میں ڈوب رہے ہیں۔ یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے مَیں کانپ رہا تھا۔ کیسی باتیں کر رہے ہو؟ کوئی بھی نہیں ڈوب رہا۔ سب ٹھیک ہی تو ہے۔ ہر شے اپنی جگہ پر ہے۔ شیزا نے میرے ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

اُس کی یہ اپنائیت جیسے جیسے بڑھ رہی تھی مَیں شروع میں اِس سے لذت محسوس کرتا رہا مگر اب آہستہ آہستہ ڈرنے لگا تھا۔ اُس کی ضرورت محبت میں بدلتی جا رہی تھی اور یہاں مَیں اُسی ضرورت کا عادی ہو چکا تھا اور خوف تھا کہیں اُس کی محبت مجھ سے مری طاقت سے بڑھ کر وفا کا تقاضا نہ شروع کر

ے لیکن اِس وقت اُس کا بوسہ ایک مسیحائی کا لمس تھا۔ اُس مسیحائی نے مجھے بولنے کی مزید طاقت دی،
یزا میں نے خواب میں دیکھا حاجی صاحب کے سر پر پڑنے والے کلہاڑے نے پہلے ہمارے گاؤں کو
ون میں ڈبو دیا۔ اُس کے بعد اردگرد کی ہر شے جہاں تک نظر جاتی تھی خون میں ڈوب گئی اور یہی خون
میرے پیچھے لگا ہوا تھا۔

مگر تمھیں تو فون آیا تھا حاجی صاحب کو کسی نے گولی سے قتل کیا ہے؟ شیزا نے مجھے یاد دلایا۔
دیکھو ضامن خواب بہت عجیب وغریب ہوتے ہیں اِن کے سر پیر نہیں ملتے۔ تمھیں کسی کے مرنے کا بہت
صدمہ پہنچا ہے۔ یہ اُسی صدمے کا نتیجہ ہے۔

شیزا خواب اتنے سادہ نہیں ہوتے کہ آپ اُنھیں عجیب وغریب کہہ کر نظرانداز کر دو۔ کبھی کبھی
انہونیوں کی خبریں لے کر آتے ہیں۔ مَیں خواب میں اُس خون کی بُو بھی محسوس کر رہا تھا اور اُس کلہاڑے
کی پوری آواز کو سنا تھا جو ایک دھماکے کے ساتھ حاجی صاحب کے سر پر گرا تھا۔ اُس کے بعد مَیں نے
دیکھا میرے والدین بھی اُس میں ڈوبنے لگے ہیں اور وہ ایک درخت پر چڑھ کر بیٹھے ہیں اور اُن کے
اوپر حاجی فطرس علی ہوا میں معلق ہیں اور نیچے مَیں کھڑا ہوں اور خون میرے پاؤں کو بھی چھو رہا ہے۔ مجھے
لگا میرے والدین بھی وفات پا چکے ہیں اور میں بھی جلد ایسی خون کی ندی میں ڈوب کر اُن سے جا ملوں
گا۔ تب میری چیخ بلند ہو گئی۔ ایک طرف سے آیا ہوا صدمہ حواس باختہ نہیں کرتا۔ جب آپ کو چاروں
طرف سے اُترتے ہوئے بگولوں کی ریت گھیر لے تو خواب سچے ہونے لگتے ہیں۔ ہمارے گاؤں کے
تمام درخت کٹ چکے ہیں۔ پرندوں کی آوازوں کی جگہ تعفن پھیلانے والی بدبوئیں گھیرنے لگی ہیں۔

مَیں آپ کو میڈیسن دیتی ہوں، شاید بخار آپ کے سر کو چڑھ گیا ہے، یہ کہہ کر شیزا اُٹھی اور کچھ
لمحوں بعد دو ٹیبلٹ لے آئی۔ آپ یہ ٹیبلٹ پانی سے لو، اتنے میں مَیں آپ کے لیے دودھ گرم کر دوں۔
اس کے ساتھ ہی وہ کچن میں داخل ہو گئی۔ مَیں نے پانی سے ٹیبلٹ لیں اور دوبارہ بیڈ پر سر رکھ دیا۔ واقعی
سر میں ایک گرانی تھی اور جسم مسلسل درد کر رہا تھا۔ یہ اچانک پتا نہیں کیا ہو گیا تھا۔ شیزا دودھ لے کر آ
گئی۔ مَیں نے دودھ پینے کے دوران وقت پوچھا۔

ابھی رات کے بارہ بج رہے ہیں۔ آپ نے گیارہ بجے چیخیں مارنا شروع کی تھیں۔ ضامن
تمھیں کیا پتا جب انسان اکیلا رہ جائے اور عزیز و اقارب مستقل قبروں میں اُتر جائیں، اس طرح کے
خواب زندگی کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اُن خوابوں کو بڑی کوشش سے جھٹکنا پڑتا ہے۔

مَیں شیزا کے منہ سے یہ بات سُن کے ایک دم ہونق رہ گیا۔ پہلی بار اُس نے شوبز کی دنیا کی لڑکی سے ایک یکسر جداگانہ بات کی تھی۔ یہ اچانک نہیں ہوا تھا، ضرور کوئی سبق سکھا دینے والے حادثے اِس کی وجہ تھے۔ اُس نے مجھے سختی سے اپنے متعلق دلچسپی لینے سے روکا تھا اور اپنے کام سے کام رکھنے کی جو تاکید کی تھی، اُس حکم نامے کے خوف اور کئی بار کی ڈانٹ ڈپٹ نے مجھے اُس کی کرید کا سوچنے بھی نہیں دیا تھا۔ مَیں نے شیزا کی آنکھوں میں دیکھا لیکن اُس نے اچانک اپنی آنکھیں دوسری طرف پھیر لیں۔

شیزا تم ہمیشہ مجھ سے کچھ پوشیدہ رکھتی ہو اور کسی طور بتانے کی کوشش نہیں کرتی۔ اتنی رازداری بھلا کیوں؟

ضامن اب تم ٹھیک ہو گئے ہو، دیکھو اُٹھو اور اپنے جسم سے پسینا پونچھ لو۔ اُس نے میرے سامنے تولیہ رکھتے ہوئے کہا۔ مَیں نے تولیہ پکڑ کر اپنے پورے جسم اور سینے پر پھیرنا شروع کیا تاکہ پسینا خشک ہو جائے۔ اِس کے بعد مَیں نے اُس سے کوئی بات نہیں کی اور قسم کھائی کہ آئندہ ایسی کسی بات کا عندیہ نہیں دوں گا جس سے اچھی بھلی خوش باش شیزا غصے سے دوچار ہو جائے۔ وہ سمجھے گی آخر مَیں کیوں اُس کی کرید میں لگا ہوا ہوں۔ بعض اوقات مخلص سے مخلص انسان بھی ایسی کمینی حرکتوں سے باز نہیں آتا مگر بہرحال جب ایک شخص نہیں چاہتا تھا اُس کے متعلق کچھ پوچھا جائے، اُس کی ذات سے متعلق یا کام سے متعلق تو کیوں مَیں بار بار اِس طرح کی بکواس شروع کر دیتا ہوں۔ مَیں اپنے بستر سے اُٹھ گیا لیکن اتنے میں وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ مَیں واپس آ کر اپنے بیڈ پر دوبارہ لیٹ گیا اور تھوڑی ہی دیر میں محسوس کیا کہ ٹیبلٹ میں نیند کا خمار موجود تھا۔ مَیں دوبارہ سو گیا۔

صبح نو بجے آنکھ کھلی تو دیکھا شیزا کچن میں موجود تھی اور ناشتا تیار کر رہی تھی۔ مَیں اُٹھ کر آہستہ سے اُس کے عقب میں جا کر کھڑا ہو گیا اور اُس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا شیزا مَیں سوری کہتا ہوں۔ شیزا نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور مسکرا کر گلے سے لگا لیا۔ اِس پر ہماری نہ صرف صلح ہو گئی بلکہ ہم نے ناشتے کو مؤخر کر کے میرے بیڈروم کی طرف راہ لی مگر شیزا نے مجھے پکڑا اور میرے بیڈروم کی بجائے اُس کے بیڈروم کی طرف چل دیے اور دو گھنٹے خوانِ صحبت پر جھکے لذتِ کام و دہن میں مصروف رہے۔ شیزا کے کمرے میں یہ میرا پہلا اختلاطی داخلہ تھا۔ اِس سے پہلے ہم جب بھی ملے، میرا ہی کمرہ اُس کا بار اُٹھاتا رہا تھا۔ اب ذیشان کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے اور دوسرا شیزا کی عنایات کی بھرپور اپنائیت کے سبب اُس کے کمرے میں ہمارے نشے بڑھتے رہے۔ آخر ہم دونوں پُرسکون ہو گئے اور اپنے شاور رومز

میں چلے گئے۔ میرا تمام بخار اُتر چکا تھا۔ طبیعت میں سبک روی آ گئی تھی۔ مَیں واش روم سے نکل کر اور کپڑے پہن کر ڈرائنگ روم میں آ گیا، شیزا ابھی تک اپنے کمرے کے شاور روم میں تھی۔ مَیں نے خیال کیا، اُس کے نکلنے تک مَیں ناشتا وغیرہ تیار کر لوں اور کچن میں چلا گیا۔ مَیں نے آملیٹ بنانا شروع کر دیا۔ چائے جو ابھی تک چولہے پر ویسے ہی آدھ پکی پڑی تھی اُس کے نیچے آگ جلا دی۔ ابھی آدھا ناشتا تیار ہوا تھا کہ شیزا کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں، ارے ضامن کہاں گم ہو گئے۔ کدھر ہو؟

اِدھر کچن میں آ جائیے محترمہ، مَیں نے اُسی لہجے میں جواب دیا۔

وہ کچن میں دوڑی چلی آئی، اررے کیا گھوسٹ قسم کا آملیٹ بنا رہے ہیں آپ۔ چھوڑیے اِسے، اُس نے میرے ہاتھ سے فرائی پین پکڑ کر ایک طرف رکھا اور چولہے کی آگ بجھا دی۔

ارے بھئی کیا کر رہی ہو، ناشتا بنا رہا ہوں۔

ابھی کیا یہ ناشتے کا وقت ہے؟ اُس نے نہایت شوخ انداز میں کہا۔

تو اور کیا کروں؟ مَیں نے اُسے حیرانی سے دیکھا۔ اُس کے کپڑوں اور جسم سے خوشبو مدھم سُروں کی طرح اُٹھ رہی تھی۔ مجھے اُس میں مدہوشی کی لپٹیں آ رہی تھیں لیکن مَیں اب اُس کے ساتھ دوبارہ لپٹنا نہیں چاہتا تھا۔

کرنا کیا ہے؟ ہوٹل چلتے ہیں، ابھی سوا بارہ ہوئے ہیں، ایک گھنٹے بعد بوفے ہے، میریٹ میں چلتے ہیں۔ اُس نے ایک شانِ بے نیازی سے میری طرف دیکھتے ہوئے آنکھ ماری۔

ارے بھائی مَیں ابھی اتنا امیر نہیں ہوا، خیر چلو، لیکن دیکھ آج بل ہم یعنی مَیں دوں گا۔ خاتون کے ساتھ ہو کر اُس کی جیب کاٹنا میرا شیوہ نہیں، مَیں نے ہنس کر کہا۔

ہاں ہاں آپ ہی دیجیے مگر وہاں میری ممبر شپ ہے، آپ کا خرچ دُگنا اُٹھے گا، اگر دینا ہی ہے تو گھر آ کر دے دیجیے گا۔ یہ کہتے ہوئے شیزا نے میرے گال سے ایک چٹکی بھری۔

چلیے بھئی منظور اور ہم ہوٹل چلے گئے۔

ہوٹل سے نکلنے کے بعد سیدھے ظفر عالم کے آفس پہنچے۔ ظفر عالم ہمیں کئی دنوں سے ایک ساتھ دیکھ رہا تھا اور وہ خوش تھا کہ ہم نے ایک دوسرے کو قبول کر لیا تھا۔ اُس کے خیال میں وہ تمام لڑکیاں جنھیں ظفر عالم کی بیگم اِس فیلڈ میں شامل کرتی تھی۔ ایک عرصے بعد اُن کے گھر گرہستی کی اخلاقی ذمہ داری گویا ظفر عالم خوشی کے ساتھ اپنے ذمے تصور کر لیتا تھا۔ وہ اِس میں اندر ہی اندر کاوش کرتا تھا اور

یہی کاوش اُس نے شیزا کے معاملے میں کی تھی مگر اس غیر محسوس طریقے سے کہ ہم دونوں کو گمان بھی نہیں ہوا تھا۔ اُس کے خیال میں کچھ مدت بعد لڑکی جب یوزلیس ہو جاتی ہے تو ڈپریشن میں چلی جاتی ہے۔ اُس وقت اُس کے لیے ایک بنیادی سہارا ضرور ہونا چاہیے جو آزاد خیال اور سیدھا سادہ ہو۔ اُس نے شیزا کے ذمے بھی اب کچھ دفتری قسم کے کام لگا رکھے تھے مثلاً نئی لڑکیوں کو شوبز اور خاص کر سیکس اور شوبز کی دنیا کی اخلاقیات بتانا اور اُن کے لباس کی ڈیزائننگ کرنا۔ محفل میں کس کو نظر انداز کرنا ہے اور کیسے نظر انداز کرنا ہے؟ کسے توجہ دینی ہے۔ توجہ دینے کا ارتقائی سفر کیسے طے کرنا ہے؟ فرش پر پاؤں کیسے رکھنا ہے اور قالین پر کیسے رکھنا ہے۔ بڑی گاڑی میں کیسے بیٹھنا ہے؟ چھوٹی گاڑی میں کیسے سفر کرنا ہے۔ آنکھوں میں کون سے لینز کس وقت لگانے ہیں؟ کس موسم میں کن لوگوں میں رہنا ہے۔ ڈرنک کب اور کتنی کرنی ہے اور کون سی کرنی ہے؟ کس کی گاڑی میں بیٹھنا ہے اور کس کی گاڑی میں نہیں بیٹھنا۔ اس طرح کے سیکڑوں قانون قاعدے تھے جنھیں شیزا نئی لڑکیوں کو سکھا رہی تھی۔

ظفر عالم کا یہ آفس آہستہ آہستہ ترقی کر کے چار کوٹھیوں میں منتقل ہو گیا تھا۔ میرے سمیت عملے کی تنخواہوں میں اضافہ بھی ہوا تھا اور نیا عملہ بھی رکھا گیا تھا۔ حسنات کا دفتر بھی یہیں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ اُس کے دو چار لوگوں کے علاوہ باقی کو فارغ کر دیا گیا تھا۔ اِس آفس میں کم و بیش دس پندرہ قسم کے شعبے کام کر رہے تھے۔ ایک سٹوڈیو بھی یہیں تھا۔ ایک سپیشل ڈیٹنگ ہاؤس بھی یہیں تھا۔ ڈیٹنگ ہاؤس میں کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ مڈل کلاس اور اپر مڈل کلاس گھروں کے لڑکے لڑکیاں ڈراما یا فلم میں اداکاری کے لیے آتے تھے مگر وہ سیکس کی ایسی دلدل کی نذر ہو جاتے تھے جس سے بعد میں خود بھی نکلنا نہیں چاہتے تھے کہ اُس سے اُنھیں ایک بہت بڑی آمدنی بالکل آسان رستے سے حاصل ہو جاتی تھی۔ اِن میں سے اکثر لڑکیاں عرب شیخوں کی طرف بھیجی جاتی تھیں۔ اُنھیں ٹورز کے نام پر دبئی اور عرب عمارات اور شارجہ کے چکر لگوائے جاتے تھے۔ یہاں اُن کی پے منٹ ڈالرز میں ہوتی تھی۔ یہیں ایک پرنٹ میڈیا کا آفس تھا۔ شوبز کا الگ آفس تھا۔ اُس کے اندر ایک آفس ڈیزائننگ کا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک امیریکن سکول بھی کھول دیا گیا تھا، جس میں بہت چنیدہ سٹوڈنٹس انتخاب کر کے رکھے جاتے تھے۔ مَیں چونکہ اُن کے لیے کافی عرصے سے بے ضرر اور اپنے کام سے کام رکھنے والا آدمی ثابت ہوا تھا اِس لیے کچھ ایسی چیزوں کے معاملے میں مجھ سے احتیاط نہیں برتی جاتی تھی جن سے عام آفس کے عملے سے احتیاط کی جاتی تھی۔

(۶۸)

اگلے چار سالوں میں حالات جوں کے توں رہے۔ مَیں اپنے کام کے ساتھ اپنا ادبی کام بھی زور شور سے کر رہا تھا۔ اِس میں میرا تعارف ایک ادیب کے طور پر پورے ملک میں ہو گیا تھا۔ لوگ مجھے تقریبات کی صدارت اور مہمان کی کرسی بھی عنایت کرتے تھے۔ ایسا نہیں کہ میری ادبی قامت بڑھ گئی تھی بلکہ یہ سب کچھ میرے سماجی سٹیٹس میں اضافے کی وجہ سے ہوا تھا۔ مَیں نے چند ایک ڈرامے بھی لکھ دیے تھے جن میں سے ایک دو ٹیلی ویژن پر چل بھی گئے۔ اگرچہ اِس میں ظفر عالم کا ہاتھ ہی شامل تھا مگر خود میرا کام بھی اچھا تھا۔ اِن کے علاوہ دو ایک کتابیں افسانوں کی آ چکی تھیں۔ اخبارات میں انگریزی اور اردو میں شوبز اور ماڈلنگ کے متعلق مضامین بھی لکھ رہا تھا۔ اِن تمام چیزوں سے میری اچھی کمائی اور شہرت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ شیزا کے ساتھ مَیں باقاعدہ نکاح تو نہیں کر سکا اور نہ یہ ممکن تھا البتہ مستقل اُسی کے ساتھ رہ رہا تھا۔ ذیشان دو سال پہلے اپنے چیک دوست کے ساتھ یورپ چلا گیا تھا۔ اُس کے جانے کے بعد اُس نے پلٹ کر میری تو ایک طرف اپنی بہن کی خبر بھی نہیں لی تھی۔ اسلام آباد، لاہور اور کراچی کی اکثر پارٹیز میں میرا جانا ضروری سمجھا جاتا تھا کیوں کہ مَیں جس طرح سے پارٹیز کو اٹینڈ کر کے اُن کی رپورٹ قلم بند کرتا تھا، بڑے سے بڑا تخلیق کار بھی ویسا نہیں لکھ سکتا تھا۔ اِن پارٹیز میں مجھے ہر قسم کے مرد و خواتین سے ملنے کا اتفاق ہو چکا تھا۔ بعض افسران اور بزنس مین مستقل طور پر اپنی بیویوں کے ساتھ یہ پارٹیز اٹینڈ کرتے تھے۔ اُن کی بیویوں کے بیگ میں شراب کی بوتلیں ہوتی

تھیں۔ جہاں کہیں موقع ملتا وہ کسی صاحبِ اختیار کو گھیر کر کھڑی ہو جاتیں اور بجائے ٹیبل پر پڑی شراب کے اپنے بیگ سے نکال کر کہنہ برس اور مہنگی شراب کا پیگ بنا کر دیتیں۔ اِس طرح شناسائی اور واقفیت میں صدیوں کا سفر چند لمحوں میں طے ہو جاتا تھا۔ بہت تیزی سے ترقّی کی جلد سیڑھیاں طے کرنے والے افراد نے اپنی الگ سے نوجوان اور خوبرو بیویاں رکھی ہوتی تھیں۔ جہاں کام بلاک ہو چکا ہوتا، اِن نوجوان بیگمات کو وہاں ٹارگٹ دیا جاتا۔ اکثر پارٹیاں یہی ٹارگٹس اچیو کرنے کے لیے کی جاتی تھیں۔ مجھے حیرت تھی ملک کے اکثر بڑے عہدوں پر براجمان لوگ ایسی بیگمات سے ہراول دستوں کا کام لیتے تھے۔ خاص کر ججز حضرات کے ہاں نوجوان بیگمات کی کثیر تعداد موجود ہوتی تھی اور مختلف پارٹیز میں وہی زیادہ تر پیش پیش ہوتیں۔ مجھے یہ حکمت سمجھ نہیں آئی تھی کہ اِن سے ججز کو کون سا کام پڑ سکتا ہے۔ اکثر اِن پارٹیز کے انتظام میں مجھ سے بھی مشورہ لیا جاتا تھا۔ دو بار مَیں نے کراچی اور اسلام آباد میں پارٹیز کے انتظام کی ذمہ داری لی اور اُسے بہت خوش اُسلوبی سے انجام بھی دیا۔ مجھے مدعوئین کی لسٹیں دے دی جاتی تھیں۔ یہ لسٹیں خود ظفر عالم نہایت خفیہ طور پر تیار کرتا تھا لیکن سب کام اچھا ہونے کے باوجود مجھ سے آئندہ پارٹیز کے انتظام کا کام نہیں لیا گیا۔ اگرچہ مَیں اِس میں خوش بھی تھا مگر ظفر عالم نے مجھ سے کہا آپ کو پارٹیز کے انتظام کی ذمہ داری سونپنا میرے اختیار میں نہیں ہے۔ آپ صرف اپنا کام ہی کرو گے۔ اِس سلسلے میں آپ کو دبئی بھی بھیجا جائے گا مگر مجھے دبئی کبھی نہیں بھیجا گیا۔ اِس کی وجہ بہت دیر بعد سامنے آئی کہ ملک کے بہت سے بزنس مین اور اُن کے پارٹنرز کے چہرے نہ پہچان لیے جائیں۔ اکثر اُن میں ملک کے اندر ایک دوسرے کے دُشمن تصور کیے جاتے ہیں مگر دراصل یہ لوگ بہت سے معاملات میں بزنس پارٹنر ہی ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں دیگر ممالک، جنھیں ہم دُشمن ممالک تصور کرتے ہیں، یہ لوگ اُن کے ساتھ اپنی ڈیلز اِنھی پارٹیز میں طے کرتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں نہایت اہم اور حساس ہیں۔ کوئی بھی ایسا شخص جسے اپنے معاشی مستقبل اور زندگی سے برابر بے نیازی ہو اُس کا وجود اِن لوگوں کے خسارے میں تصور کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اِن جگہوں پر کام کرنے والا آدمی ہرگز باشعور نہیں ہونا چاہیے۔ ہاں البتہ شیزا نے ایک دو چکر وہاں کے لگا لیے تھے اور وہ خوش تھی۔ مگر اُس نے کبھی میرے ساتھ اس پر بات نہیں کی۔

میرے گاؤں کا معاملہ یہ تھا کہ ہمارے گھر کے بالکل سامنے ڈسپنسری کی جگہ مرغی خانہ بن چکا تھا۔ اُس کی گندگی اور بدبو سے تنگ آ کر ہم نے وہ گھر مستقل طور پر چھوڑ دیا تھا مگر میرے والد نے

اُسے بیچا نہیں تھا کہ بہرحال وہ اُن کے والدیعنی میرے دادا کی نشانی تھی البتہ والد اور والدہ چھوٹے بھائی کے ساتھ لاہور میں غازی آباد منتقل ہو گئے تھے۔ وہاں تقسیم کے وقت سے ہمارے رشتے دار موجود تھے۔ اُنھی سے ایک مکان کرایے پر لے کر وہ بس گئے۔ یہاں والد صاحب نے مجالس اور محرم کے جلوسوں میں اپنی مصروفیات ڈھونڈ لی تھیں۔ ایک دو بار وہ مجھے ملنے کے لیے اسلام آباد بھی آئے مگر مَیں نے اُن کی ملاقات شیزا سے نہیں ہونے دی۔ شاید وہ اِس بات کو اچھا نہ جانتے۔ اگر کچھ نہ بھی کہتے تو مجھے اندیشہ تھا اُن کے دل میں میرے بارے میں اچھی رائے قائم نہیں ہوتی اور مَیں اُنھیں اِس عمر میں یہ صدمہ نہیں دینا چاہتا تھا کہ وہ مجھے ایک مکمل گمراہ شخص کے طور پر جانیں پھر میری والدہ کو میرے بارے میں بتائیں اور دونوں اگلی تمام عمر جب تک زندہ رہیں، میری بخشش اور ہدایت کی دعائیں مانگنے میں صرف کر دیں۔ اِسی کے ساتھ میرے دوزخی ہونے پر یقین بھی کیے رکھیں اور اِسی کرب و اذیت میں اپنے دن پورے کریں۔ اُنھوں نے کئی بار مجھے شادی کے بارے میں کہا مگر مَیں ٹال جاتا تھا اور اب تو وہ دونوں مایوس ہو چکے تھے۔

ندیم نے اپنی والدہ کو ڈھونڈ لیا تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ وہ ابھی تک وہیں تاندلیانوالہ کے اڈے پر تھی اور زندہ تھی لیکن ذہنی طور پر بالکل تباہ ہو گئی تھی۔ ندیم میرا بہت شکرگزار تھا۔ مَیں نے اُسے ظفر عالم کے آفس میں خدمت گار رکھوا دیا تھا۔ وہ وہاں اپنی ڈیوٹی دے رہا تھا اور اپنی ماں کو یہیں لے آیا تھا۔ یہاں وہ اس کا نفسیاتی علاج کروا رہا تھا مگر اب اُس کی کہانی ختم ہونے والی تھی۔

(۶۹)

یہ 1994ء کی ایک سرد شام تھی۔ درختوں کے پتے گر رہے تھے۔ ہمارے اپارٹمنٹ کے سامنے والا چنار کا درخت سرخ اور زرد رنگوں میں ڈوب کر اپنے حسن کی کلغیاں پھڑ پھڑا رہا تھا۔ مَیں اپنے اپارٹمنٹ میں بیٹھا ایک کہانی پر کام کر رہا تھا۔ شیزا دبئی گئی تھی اور آج واپس آنے والی تھی۔ مَیں اپنے افسانے کی آخری لائنوں کی ترتیب دے رہا تھا۔ شیزا نے کئی بار مجھے کہا تھا، مَیں اُس پر ایک افسانہ لکھوں۔ مَیں اُس سے وعدہ کر لیتا تھا مگر تا حال پورا نہیں کر سکا تھا۔ میرا مسئلہ یہ تھا جب لکھتا تھا تو اُسے خبر نہیں بننے دیتا تھا اور ایک مکمل کلاسک کی شکل میں لکھتا تھا کہ مدتوں یاد رہے۔ ابھی تک شیزا کے لیے ایسی کوئی کہانی میرے دماغ میں نہیں آئی تھی جو اُسے وقت سے ماورا کر دے اور مَیں شیزا کو اتنا سستا نہیں سمجھتا تھا۔ میرا یہ افسانہ جسے مَیں مکمل کر رہا تھا، ایک ریلوے کلرک کی زندگی پر تھا۔ جو پچھلے تیس سال سے مسلسل ریل کے انجن سے بندھا تھا۔ ریل کے انجن کے تمام پرزے اب اُس کے دماغ میں فٹ ہو گئے تھے۔ اُسے پوری دنیا ایک ریل لگتی تھی۔ جس کی کبھی پٹڑی خراب ہو جاتی، کبھی بوگی کا ڈبہ اُتر جاتا، کبھی نظر آتا کہ تمام مسافر بغیر ٹکٹ کے سوار ہوئے ہیں اور ریل کے ساتھ دھوکا کر رہے ہیں۔ اُس نے اپنے گھر میں پُرانی ٹکٹوں، ریلوے وردی اور دُوسری طرح طرح کی اشیا کا انبار لگا رکھا تھا جن کی اُس کا خیال تھا، کبھی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اُسے اکثر سوتے ہوئے اپنے جونیئرز کو جھڑکیاں دینے کی عادت تھی۔ بعض اوقات سوتے میں ہی لالٹین پکڑ کر ریلوے کی پٹڑیوں کی سیدھ ماپنے نکل جاتا۔ اُس

کی یہ حالات دراصل اس وجہ سے ہوئی تھی کہ اُس کے تمام کولیگز نے اچھا خاصا مال کما لیا تھا اور خود یہ ابھی تک باوجود کوشش کے، کچھ بھی کمائی نہیں کر سکا تھا۔ ایک بار ریلوے کا لوہا بیچتے ہوئے پکڑا گیا تھا اور نوکری جاتے جاتے بچی تھی۔ تب سے کوئی بھی غیر قانونی کام کرتے ڈرتا تھا۔ البتہ باقی لوگوں کی کمائی دیکھ کر نیم پاگل ہو چکا تھا۔

موسم نہایت رومانی تھا۔ مجھ پر ایک طرح کی دو طرف سے سرشاری چھائی ہوئی تھی کہ اس خوبصورت موسم میں ایک میرا افسانہ مکمل ہونے کے قریب تھا اور دوسری طرف شیزا جو پچھلے بیس دن سے دبئی میں تھی، وہ ابھی آنے والی تھی۔

عصر سے تھوڑا اوپر وقت ہوا تھا۔ یہ شام اور عصر کے درمیان کا وقت مجھے ہمیشہ گھائل کر دینے والا لگتا تھا۔ اِس وقت کے درمیان اکثر ایسی یادیں انسان کو گھیر لیتی ہیں جن میں رومان اور المیے کی ملی جلی کیفیت ہو۔ مَیں ایسی بہت سی شاموں کو یاد کر رہا تھا جس میں دونوں قسم کے جذبے عود کر آئے تھے۔ مَیں نے اپارٹمنٹ کی تمام کھڑکیاں کھول دی تھیں۔ اِن کھڑکیوں سے چنار کے اُڑتے ہوئے پتے اور ہواؤں کا شور میرے لیے قربت و فراق کی ایسی منظر کشی کر رہا تھا جیسی کرنی چاہیے تھی۔ اسلام آباد بلاشبہ ایک خوبصورت اور رنگین شہر تھا۔ رنگین سے میرا مطلب فطرت کی رنگینی ہے، ورنہ کراچی اور لاہور دوسری طرح کی رنگینیوں میں بہت ماڈرن تھے۔ مَیں اِن مناظر اور افسانے کے پیچ و خم میں کچھ لمحے کے لیے شیزا کو بھول سا گیا۔ اتنے میں اپارٹمنٹ کے لاک میں چابی گھومنے کی آواز آئی۔ اُس کے ساتھ ہی شیزا اندر داخل ہوئی۔ مَیں فوراً اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اُسے گود میں بھر لینے کے لیے اُوپر اُٹھانے کو آگے بڑھا مگر مَیں شیزا کو دیکھ کر ایک دم دہل سا گیا۔ اُس کے چہرے اور جسم کی حالت ایک مضمحل اونٹ کے بچے کی سی ہو رہی تھی۔ جو چلتے ہوئے لڑکھڑا بھی رہا تھا اور چل بھی رہا تھا۔ شیزا ایک تھکی ہوئی ہرنی کی طرح ڈول کر میرے بازوؤں میں جھول گئی۔ مجھے لگا اُس کا وزن ایک دم کم ہو گیا ہے اور وہ جادو کی طرح بھد سے اُڑ جائے گی۔ مَیں اُس کی اِس حالت پر خوف زدہ ہو گیا۔ یہ اچانک اُسے کیا ہوا تھا۔ وہ تو یہاں سے ہشاش بشاش گئی تھی۔ صنوبر کی شاخوں کی طرح لچکتی اور کھلکھلاتی ہوئی رخصت ہوئی تھی۔ یہ صرف بیس دن کے اندر اُسے کون سا روگ لگ گیا تھا اور اُس نے مجھے ٹیلی فون پر بھی بتانے کی زحمت نہیں کی تھی۔ مَیں نے اُسی طرح اُسے پکڑ کر آرام سے صوفے پر بٹھا دیا اور اُس کے چہرے اور بازوؤں کو ٹٹولنے لگا، کہیں بخار کی شدت تو نہیں۔ مَیں اُسے حیرانی اور کرب سے تکے جا رہا تھا۔ آخر وہ

میری بے چینی دیکھ کر بولی، ضامن مَیں بہت تھک گئی ہوں اور مجھے ہلکا ٹمپریچر بھی ہے۔ جلدی سے مجھے چائے بنا کر دو۔

شیزا وہ تو ٹھیک ہے، مگر صرف تھکاوٹ سے تو تمہاری یہ حالت نہیں ہو سکتی۔ خود کو آئینے میں دیکھا ہے؟ مَیں نے شیزا سے اپنی شدید حیرانی اور تحفظات کا اظہار کیا۔

ہاں سب دیکھ چکی ہوں۔ مَیں جب سے دبئی گئی ہوں دو تین دن بعد ہی میری طبیعت بگڑنا شروع ہو گئی تھی مگر مَیں کام نپٹائے بغیر واپس نہیں آنا چاہتی تھی۔ تم پہلے جلدی سے چائے بناؤ اور مجھے آرام کی ٹیبلٹ دے دو۔ یہ کہہ کر وہ اُسی صوفے پر دراز ہو گئی۔

مَیں نے کچن کی طرف جاتے ہوئے اُسے سوال کیا اور تمہارا سامان کہاں ہے؟ کہیں ٹیکسی میں تو نہیں پڑا؟

نہیں ٹیکسی میں کچھ نہیں ہے۔ مَیں نے اِس بار دبئی سے کچھ نہیں خریدا اور نہ کچھ لے کر آئی ہوں۔ میرا بیگ باہر دروازے پر پڑا ہے وہ اندر اُٹھا لائیں۔

مَیں نے جلدی سے دودھ میں پتی ڈال کر اُسے گرم کیا اور پین کلرز لا کر شیزا کو دیں۔ اُس نے پین کلر کھا کر تھوڑی دیر آرام کیا۔ اتنے میں چائے تیار ہو چکی تھی۔ وہ پینے لگی اور میرے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ دبئی کے سفر میں جو کچھ اُسے میسر آیا، مجھے بتانے لگی لیکن اُس کی آواز میں وہ تناؤ اور جوش نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد اُس کی حالت پہلے سے قدرے بہتر ہو گئی تھی مگر ایسی نہیں تھی کہ اُسے نظر انداز کیا جا سکے۔ میرے بتانے پر شیزا نے صرف اتنا کہا کہ اُسے مسلسل ٹمپریچر اور تھکاوٹ کا احساس ہوتا رہا ہے جسے وہ میڈیسن لے کر دور کر رہی ہے۔ ہاسپٹل جانے کی نوبت نہیں آئی اِس لیے کچھ کہا نہیں جا سکتا کیا پرابلم چل رہی ہے۔ مَیں نے آگے بڑھ کر شیزا کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور اُس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔ میرے لیے یہ بالکل ناگہانی صورت تھی۔ اِس دل فریب موسم کی جتنی انگڑائیاں تھیں مَیں ایک لمحے میں بھول گیا اور اب اُن کھڑکیوں کو بیزاری سے دیکھ رہا تھا جن سے ہوا اور پتوں کا شور اندر آ رہا تھا۔ سرد موسموں میں اپنے اوپر غم کی کیفیت نازل کر کے اُس سے لطف لینا اور بات ہے مگر ایسے موسم میں حقیقی غم کا سامنا کرنا واقعی اذیت ناک حالت سے دوچار کر دیتا ہے۔ شیزا نے خدا جانے میرے ارادے کو بھانپ کر یا اپنی طبیعت کی خواہش پر مجھے کہا، ضامن یہ کھڑکیاں بند کر دو۔ مجھے لگتا ہے کہیں سے کوئی اور کھڑکی کھلنے والی ہے۔ اُس کے اِس جملے نے مجھے ایک دم اندر سے جھنجھوڑ دیا جیسے کسی معصوم

پرندے کے پروں کو توڑ پھوڑ کر کچل دیا جاتا ہے اور اُس کے بعد پرندہ اپنے ننگے وجود کے ساتھ کیڑے مکوڑے کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس پر وہ تڑپتا اور لوٹنیاں لیتا ہے۔ مَیں نے کہا، شیزا ایسی باتیں کیوں کرتی ہو۔ تم اچھی بھلی ہو۔ ابھی آرام کر لو۔ ہم ہاسپٹل چلتے ہیں۔ یہ جملہ کہتے ہوئے مَیں نے اُس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ اُس کے آنسو نکل آئے جنھوں نے میرے ہونٹوں کو چھوا تو اُن کی گرمائش نے جیسے میرے ہونٹ جلا کر رکھ دیے ہوں۔

ضامن مَیں اب ہر طرف سے تھک گئی ہوں۔ مجھ سے یہ سب کچھ نہیں ہو پاتا، اُس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ مَیں بہت طویل سفر طے کر چکی ہوں۔ اتنا طویل کہ اُسے ہزاروں صدیاں بھی طے نہیں کر سکتیں۔ پلیز کوئی ایسا کام کرو کہ مَیں اِتنا ہی طویل آرام کر سکوں۔

مَیں جھنجلا کر بولا، تو نہ کرو کچھ، چھوڑ دو، تم کیوں کرتی ہو اتنے تھکا دینے والے کام۔ مَیں ہوں نا تمھارے ساتھ... اور دیکھو اِس طرح کے جملے کیوں بول رہی ہو؟ مَیں نے شیزا کو اِس قدر حصار میں کر لیا جیسے اُسے کوئی شے مجھ سے چھین کر لے جانا چاہتی ہو۔ شیزا میرے پاس ابھی کافی پیسے ہیں۔ مَیں اپنے والدین کی طرف سے بھی اتنا مجبور نہیں ہوں۔ تمھیں اچھی طرح سنبھال سکتا ہوں۔ اب تم کام مت کرو اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بس یہیں رہو۔ آزادی سے اور فراغت سے موسموں سے لطف اندوز ہو۔ اِن چناروں اور شفاف ہواؤں سے بانہیں کھول کر ملو۔ میرے ساتھ نغمے گاؤ۔ دیکھو مَیں تمھارے لیے ایک افسانے کا پلاٹ بھی تیار کر چکا ہوں۔

مَیں جذبات کی ایک لہر میں بہتا چلا گیا اور اِسی لہر میں اُسے تسلی دینے کے لیے افسانے کے پلاٹ کا جھوٹ بھی بول گیا۔ مَیں جانتا تھا مَیں کوئی پلاٹ نہیں بنا سکا تھا مگر اس کے بعد مَیں اُس افسانے پر کام کر سکتا تھا۔ یہ میرے لیے مشکل بات نہیں تھی مگر شیزا نے میری اِس بات کو بھی گویا سنا ہی نہیں تھا اور بالکل بھی پرجوش نہیں دکھائی دی۔

یہ باتیں کرنے کے دوران اُس پر پین کلر ٹیبلٹ نے اثر کر دیا تھا اور وہ نیند کی آغوش میں چلی گئی تھی۔ مَیں نے اُسے آرام سے وہیں پر لٹا دیا اور اُس کے اوپر کمبل دے دیا۔ کمرے میں موجود بیڈ پر لٹانے کی کوشش نہیں کی تا کہ وہ بیدار نہ ہو جائے۔ اب میرا اُس افسانے سے بالکل خیال اُتر گیا تھا جسے ابھی مکمل کرنے والا تھا۔ مجھے خدشہ ہوا یہ تب تک مکمل نہیں ہو سکے گا جب تک شیزا تندرست نہیں ہو جاتی مگر اُسے آخر ہوا کیا تھا کہ وہ بالکل آدھی ہو کر رہ گئی تھی۔ جیسے اُس کے اندر سے تمام چیزیں نکال لی

گئی ہوں اور وہ ایک خالی ڈبارہ گیا ہو۔ چہرے کی رنگت پھیکی ہو چلی تھی۔ ہاتھوں اور اُنگلیوں پر نشان پڑنے لگے تھے۔ کیا اس نے اپنی کیئر کرنا چھوڑ دی تھی یا وہ واقعی کسی بیماری میں گرفتار ہو چکی تھی۔ وہ دبئی میں جتنا بھی کام کرتی رہی ہو ایسا نہیں ہوسکتا کہ صحت کے اعتبار سے اتنی گر جاتی۔ کیا ظفر عالم اور دوسرے کسی آدمی نے اُس کی صحت پر کوئی توجہ نہیں دی تھی یا وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ بخار یا تھکاوٹ کے سبب ایسی ہو گئی تھی۔ مَیں بیٹھا مسلسل یہ سوچ رہا تھا اور اِس خیال میں تھا کہ اِس کا میڈیکل چیک اپ بہت ضروری ہے اور یہ کام مَیں کل صبح ہی انجام دوں گا۔ سب سے پہلے کل یہی کام کیا جائے گا کہ شیزا کو ساتھ لے جا کر اِس کے ٹیسٹ کروائے جائیں گے۔ پھر دیکھیں گے کیا کرنا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں اسے ٹی بی نے آ لیا ہو۔ ضرور دبئی میں مسلسل سفر کے دوران اِس نے بڑے گوشت یعنی اونٹ کے گوشت سے ٹی بی کو دعوت دی ہو گی۔ خیر کوئی بات نہیں ٹی بی کا علاج تو اب کوئی بات ہی نہیں تھی۔ ایک بار ٹیسٹ ہو جائیں، پھر دیکھتے ہیں۔ اِس کے ساتھ ہی مَیں نے اپنی تمام جمع پونجی کا حساب لگانا شروع کر دیا کہ وہ کتنی ہے اور اگر شیزا کا مسلسل علاج کرنا پڑے تو کہاں تک افورڈ ہوسکتا ہوں۔ تمام گوشوارے جمع کرتے مجھے آدھی رات ہو گئی اور اِس نتیجے پر پہنچا کہ کوئی بات نہیں میرا یہ سرمایہ کم از کم دو سال تک چلے گا۔ اِس کے علاوہ شیزا کے اپنے پاس بھی تو کافی رقم ہو گی۔ مَیں نے کبھی اُس کے پیسوں کا حساب نہیں پوچھا تھا نہ اِس پر کبھی بات ہوئی تھی مگر ایک تشویش کی بات تھی کہ اُس نے اپنے بھائی ذیشان کو بہت زیادہ سپورٹ کیا تھا۔ اِس حساب سے اُس کی کمائی میں مسلسل نقب لگی ہوئی تھی۔ یہ نقب پچھلے دو سال سے بند تھی جب سے وہ چیک ریپبلک گیا تھا۔ اِن باتوں کو سوچتے ہوئے مجھے رات کے دو بج چکے تھے لیکن نیند کا ابھی نام و نشان نہیں تھا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے میرے سارے خدشات غلط ہوں۔ شیزا کو کوئی بیماری نہ ہو، وہ واقعی زیادہ کام اور پارٹیز کے اٹینڈ کرنے یا کسی وحشی بدو کے بستر پر جانے کے سبب اِس حالت کو پہنچی ہو۔ آخر دو چار دن میں خود ہی ٹھیک ہو جائے۔ اب صبح کی اذانیں ہو رہی تھیں مگر نیند میرے لیے ایک گم شدہ اونٹ بن گئی تھی۔ حتیٰ کہ اگلا دن چڑھ آیا۔ اِتنے میں اچانک شیزا کی آواز سنائی دی۔ اُس کی آواز میں پہلی سی کمزوری تو نہیں تھی لیکن وہ طمطراق بھی نہیں تھا۔ مَیں بھاگ کر اُس کے پاس گیا۔

شیزا کیسی طبیعت ہے اب؟ مَیں نے پوچھا۔

اب مَیں کافی ٹھیک ہوں، سوری رات تمھیں بہت زحمت دی۔ اُس نے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

شیزا اِس طرح کی باتیں مت کیا کرو، مجھے ہرگز اچھا نہیں لگتا۔ مَیں نے احتجاج کیا۔
دیکھو ضامن جب سے تم مجھے ملے ہو آج تک ایک بھی جملہ تم نے احتجاج اور غصے والا نہیں کہا۔
سوری مَیں تمھیں بہت ڈانٹتی رہی ہوں۔ دراصل یہ ڈانٹ ڈپٹ میں اپنے اندر کے خلا کو بھرنے کے لیے
کرتی تھی۔ یہ گلیمر خلا ہی کا دوسرا نام ہے۔ مگر جسم کے اوپر اوڑھی ہوئی چکا چوند جسم کے اندر کے اُجاڑ پن
کو کہاں تک ڈھانپ سکتی ہے۔ باتوں سے پیدا کیے گئے فاصلے ذہنوں کو چھپا لیتے ہیں لیکن جسموں کی
دھول کو پھیلنے سے نہیں روک سکتے۔
پھر وہی بات۔ اب یہ بھلا معذرت کرنے کا وقت ہے؟ اِس وقت یہ باتیں بہت ہی بُری لگ
رہی ہیں، اگر اب تم نے ایسی بات کی تو ابھی ناراض ہو جاؤں گا۔
اچھا ٹھیک ہے، یہ کھڑکیاں کھول دو، اسلام آباد کی سردی ہی تو دیکھنے والی ہوتی ہے، شیزا نے
ایسی دلداری سے کہا کہ مَیں لڑکھڑاتا ہوا اُٹھا اور بھاگ کر کھڑکیوں کی طرف چلا گیا۔
اچھا شیزا بات سنو، ابھی ہم ناشتا کرتے ہیں۔ اُس کے بعد ہم ہاسپٹل جائیں گے۔ وہاں سے
ٹیسٹ کروائیں گے۔ تمہارا مکمل میڈیکل چیک اپ ہونا چاہیے۔ یہ مَیں نے اپنے دل میں رات طے کیا
ہے۔
ارے کیسی باتیں کرتے ہو۔ مجھے لگتا ہے تھکاوٹ اور بخار کے سبب ایسا تھا، مَیں کہیں نہیں
جانے والی۔ اُس نے قطعی انکار کے لہجے میں کہا۔
کیوں نہیں جانے والی؟ ہم ہر صورت جائیں گے۔ مَیں نے اپنی بات پر زور دیا، یہ ایسی بات
نہیں کہ نظر انداز کی جائے۔ مسلسل تھکاوٹ اور بخار میں رہنا بھی ٹھیک بات نہیں۔
ٹھیک ہے، تم اپنی ضد پوری کر لو لیکن مجھے تو ٹیسٹ وغیرہ سے ڈر لگتا ہے۔ مَیں نے بڑے
بڑے اُمرا کو دیکھا ہے۔ وہ یہیں سے آ کر بستر کے ہو جاتے ہیں۔ جب تک غفلت میں رہتے ہیں کئی
سال چلے پھرتے ہیں مگر جونہی بیماری کی تشخیص کراتے ہیں بستر سے لگ جاتے ہیں۔
تو کیا تم اِسی خوف سے ہسپتال نہیں جانا چاہتیں؟ اگر کوئی دبئی میں واقعہ پیش آیا ہے تو وہ بھی مجھے
بتا سکتی ہو؟ دیکھو مَیں ضامن علی ہوں۔ وہی ضامن علی جس نے آج تک تمھارے اعتماد کو ضرب
نہیں لگائی۔
ضامن دبئی میں کوئی ایسی بات نہیں ہوئی۔ شاید مَیں جب یہاں سے جا رہی تھی تو اس بار جانے

کو جی نہیں چاہتا تھا۔ شیزا نے گویا دبئی جانے پر تاسف کا اظہار کر دیا تھا۔

اچھا بھئی جو تم چاہو ویسے ہی کریں گے، بالکل بھی ٹیسٹ نہیں کرواتے۔ اب خوش، مَیں نے شیزا کو سینے سے لگا لیا۔ اب تم ایسا کرو نہا دھو لو، پھر ہم باہر جائیں گے اور شمالی علاقوں کی سیر کا پروگرام بناتے ہیں۔

ارے کیا یاد دلا دیا تم نے، شیزا ایک دم تڑپ گئی، مَیں آج تک سکردو نہیں گئی۔ پھر غم زدگی سے بولی یہ پروگرام ہم پہلے کیوں نہ بنا سکے۔ عجب غبار آلود زندگی میں رُوح زخمی کر بیٹھی ہوں۔

ہاہاہا... تو اب تم مولویانی بننے کے چکر میں ہو؟ بھئی اُن سے کئی درجہ نیک طینت ہو تم۔ مَیں نے شیزا میں شاید اُس احساس کی لہر کو محسوس کیا جس میں اکثر عورتیں اپنے معاشرتی اور سماجی نظام کو خلط ملط کر کے احساسِ ندامت کا شکار ہو جاتی ہیں اور یہ نہایت خطرناک بات ہے۔ مَیں نے کہا، ارے ایسی بات کیوں کرتی ہو؟ اب کون سا تم سو سال کی دادی اماں بن گئی ہو؟ مجھ سے تو ابھی چودہ پندرہ برس چھوٹی ہو۔ حالانکہ مرد اِن ذلتوں میں عورت سے کہیں زیادہ غرق ہوتا ہے اگر معاشرہ اِسے ذلت کہنے پر مصر ہی ہو تو۔

اچھا مَیں نہاتی ہوں۔ تم بھی تیار ہو جاؤ، دوپہر کا بھوجن میلوڈی کی مچھلی سے کرتے ہیں۔ آج مَیں بھی آپ کے دوستوں سے میلوڈی بک ڈپو پر ملنا چاہوں گی۔ شیزا نے میری طرف اِس طرح دیکھ کر کہا، جیسے مَیں اُس کی اِس خواہش کو پسند بھی کروں گا یا نہیں؟

ہاں کیوں نہیں، چلو تمھیں سب سے ملواؤں گا، وہاں عابد حسین ہیں، امیر علی ہیں، وجاہت محمود ہوں گے، یہ سب بہت علمی آدمی ہیں۔ مَیں تو پہلے ہی کئی بار تمھیں ملوانا چاہتا تھا مگر ڈرتا تھا۔

تھوڑی دیر میں ہم دونوں تیار ہو چکے تھے۔ مجھے ایسے لگا جیسے شیزا میں پہلی سی رنگت اور خوش طبعی لوٹ آئی ہے اور مَیں خواہ مخواہ کسی وہم میں گرفتار تھا۔ مَیں نے شیزا سے کہا، کیا ممکن نہیں کہ ہم وہاں تک پیدل چلیں لیکن اُس نے انکار کر دیا۔ کہنے لگی، مجھ سے اتنا نہیں چلا جائے گا۔ پھر ٹیکسی کو فون کر لیا۔ یہ ٹیکسی والا شیزا کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا۔ اُسے شیزا کے تمام ٹائم ٹیبل اور شیڈول کا پتا ہوتا تھا لیکن وہ اِس قدر اپنے کام سے کام رکھنے والا تھا کہ کبھی شیزا کے معاملے میں دخل اندازی نہیں کی۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم میلوڈی پہنچ گئے۔ سب سے پہلے مچھلی والے کو مچھلی کے لیے آرڈر دیا۔ شیزا کہنے لگی آج اپنے سب دوستوں کے لیے بھی مچھلی بنواؤ، وہیں بیٹھ کے کھائیں گے۔ مَیں نے پانچ کلو مچھلی کا آرڈر دیا اور

میلاڈی بک ڈپو پر آ بیٹھے۔ وہاں عابد حسین اور حسیب احمد اور امیر علی بیٹھے تھے۔ وجاہت محمود ابھی نہیں آ یا تھا۔ موسم کافی گہرا ہو چکا تھا، بادل اور ہوا اور سردی کے امتزاج نے پورے جذب کو اچھال دیا تھا۔ ہم دونوں نے اوورکوٹ پہنے ہوئے تھے۔ شیزا کو اوورکوٹ بہت بھاتا تھا، وہ اُونچے قد اور سمارٹ فگر سے اس اوورکوٹ میں نہایت حسین رشین دیوی لگتی تھی۔ اُس کی رنگت آج پہلے جیسی نہیں تھی، مگر مجھے یہاں بھی اُس پر پیار آ رہا تھا۔ رات اُس کی طبیعت نے جس قدر خوف میں مبتلا کیا تھا، اِس وقت وہ سارا خوف ختم ہو گیا تھا۔ جیسے ہی ہم مچھلی والے کو آرڈر دے کر دُکان پر پہنچے تمام احباب اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور شیزا کو میرے ساتھ دیکھ کر بہت کھل اُٹھے۔ مَیں افسوس کر رہا تھا کہ شیزا میرے دوستوں سے پہلے کیوں نہیں ملی۔ اگر کچھ عرصہ پہلے ملتی تو میرے تیور ہی کچھ اور ہوتے۔ سوچ کی یہ کمینگی صرف میری نہیں، ہر اُس مشرقی مرد کے دماغ میں صدیوں سے سرایت کی ہوئی ہے جو خاص کر برصغیر کی آب و ہوا میں نشو و نما پاتا ہے۔ ہندوازم میں عورت کو دیوی کا رُتبہ دراصل اُس کی فطری آزادی پر ضرب تھی جس کی آڑ میں عورت کے ہر اُس فعل کو دیوی ازم کے نیک تصور کے منافی سمجھا گیا جس میں وہ آزادی سے جنسی تلذز حاصل کرے یا اُس کی عام زندگی مردوں کی طرح گزرے۔ ہندوازم کے اِس تصور نے اُسے معاشرے اور سماج کی عزت کے ساتھ منسوب کر دیا، وہیں سے یہ غیر عادلانہ نظام برصغیر کے تمام مردوں میں سرایت کر گیا۔ یہاں تک کہ خود عورتیں بھی اِس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں اور سماج کی عزت کے نام پر قید کو اپنی قسمت سمجھ بیٹھیں۔ جدید زمانے میں خود عورتوں نے جب قلم اُٹھایا تو عورت کی اِسی قید کو اسلامی نظام قرار دے کر ہار کی طرح اپنی تحریروں میں پرو دیا۔ حالانکہ وہ اسلام کو ڈائجسٹ میں لکھے گئے شُذروں سے زیادہ نہیں جانتیں۔

کچھ چیزوں سے شعوری طور پر جان چھڑانا پڑتی ہے مگر شعوری طور پر چیزوں کو نظر انداز کرنا کبھی اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا جو لاشعور کے نہاں خانوں سے وقوع پذیر ہوں۔ اِس وقت جب کہ شیزا بیمار تھی مجھے اُس کے حسن کو دوستوں کو دکھانے کی فکر ہو رہی تھی اور تاسف تھا کہ مَیں اُس چکا چوند میں یہ حسن کیوں نہ دکھا پایا جب تفاخر کے سائے پوری گرفت سے اُن پر حاوی ہو سکتے تھے۔

ہمارے جاتے ہی سب دوست اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ دو تین کرسیاں وافر پڑی تھیں۔ ہم دو کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ عابد حسین نہایت وضع داری سے بولے، تو میاں ضامن آج آپ نے شیزا بیٹی کو ہم سے اشیر واد دلوانے کی ٹھان ہی لی مگر مَیں بتائے دیتا ہوں۔ دیر آئیدی کا جرمانہ پڑے گا۔

عابد صاحب، ہم جرمانے کا آرڈر دے کر آئے ہیں، آپ فکر نہ کیجیے، شیزا نے میرے جواب دینے سے پہلے ہی برابر جواب دیا، مگر ایک بات کہوں، ضامن صاحب مجھے نہیں لائے، مَیں انھیں لے کر آئی ہوں۔ آپ لوگوں کا تذکرہ اِن سے بہت سنتی تھی، ہم نے کہا چلیے آج ملا ہی دیجیے۔

ارے کیا بات ہے، کاش ہمارے تذکرے ہواؤں سے سنتی، امیر علی نے مسکرا کر کہا، پرندوں کی زبانی کوئی پیغام پہنچتا تو کچھ آپ کے دل میں راہ پاتا جو ہم نے سیکڑوں بار بھیجا مگر آپ نے نہ سنا۔ ضامن صاحب تو ٹھہرے ہمارے دشمن۔ ایک دشمن کی زبانی کیا حال سنتی ہوں گی۔

شیزا نے قہقہہ لگا کر کہا، نہیں، ایسے بھی ضامن صاحب آپ کے بارے میں بدگمان نہیں ہیں۔ ہمیں تو ہمیشہ یہی بتاتے ہیں کہ اسلام آباد میں یہی ایک دل کے لیے اِن کا ٹھکانا ہے۔ باقی تو سب جگہیں ہوا و ہوس کی ہیں۔ تبھی تو ہم نے اِنھیں کہا چلیے اپنے دل کے ٹھکانے تک لے چلیے۔

جی ہاں اور دل کو یہ کبھی یہاں نہ لائے، اِدھر اُدھر ساتھ لیے پھرتے رہے۔ امیر علی دوبارہ بولا۔

ارے بھائی آج لے تو آیا ہوں اپنے دل کو، مَیں نے شیزا کی طرف دیکھ کر کہا۔

بھئی میاں یہ تو ہماری بیٹی ہے۔ عابد حسین نے کہا، ضامن کا دل اتنا خوبصورت نہیں ہو سکتا۔

اِس بات پر سب نے قہقہہ لگایا۔ اتنے میں چائے اور مٹھائی چلی آئی۔ عابد صاحب کی دکان پر آنے کے بعد یہ طے تھا کہ چائے اور مٹھائی لازمی ہے۔ وہ کب اپنے چھوکرے کو اِن چیزوں کا آرڈر دیتے تھے، یہ بات آج تک مجھ پر نہ کھلی تھی۔ غالباً اُنھیں ڈر ہوتا تھا کہیں مروت میں مہمان اِن چیزوں سے انکار نہ کر دے۔

مَیں نے چائے کو دیکھتے ہوئے کہا، شاہ صاحب، ابھی ہم مچھلی کا آرڈر کر کے آئے ہیں اور ابھی آپ ہمیں چائے پلا رہے ہیں۔ مچھلی کون کھائے گا؟

دیکھو بھئی، وہ بولے، چائے اور مٹھائی کے بغیر کسی بھی محفل کی بات چیت ایسے ہی ہے جیسے کسی لاوارث لاش کے آس پاس بیٹھے اُس کی معلومات لے رہے ہوں۔ اِدھر مَیں تو کسی کی فاتحہ خوانی پر بھی جاؤں تو ہفتہ نکلنے پر جاتا ہوں کہ وہاں منہ بندھے مجھ سے بیٹھا نہیں جاتا۔ یہ چائے پییں اور مٹھائی کھائیں۔ میرا خیال ہے اِن دو معمولی اشیا سے مچھلی بچ نہیں سکے گی۔ وہ بھی کھا لی جائے گی۔ اِن سرد زرد موسموں میں آگ اور منہ چلتا رہنا چاہیے۔

ارے واہ شاہ صاحب، کیا بات نکالی ہے، وجاہت محمود جو ابھی ابھی میلوڈی بک ڈپو میں داخل

ہوا تھا، نے کہا۔ یہ میلوڈی بک ڈپو اِس اسلام آباد میں ایک روایت ہے اور روایتیں مر جائیں تو شہر ویران ہو جاتے ہیں۔ آپ کی چائے سلامت اور آپ سلامت۔

وجاہت محمود نے اگرچہ یہ بات مزاح کے انداز میں کہی تھی مگر اُس کی یہ بات حقیقت تھی کہ میلوڈی بک ڈپو ہی اسلام آباد میں ایک زندہ ٹھکانا تھا، باقی سب مُردوں کی بستیاں اور گریڈوں کے قبرستان تھے۔ سچ تو یہ تھا یہاں آ کر ہمیشہ مجھے لگتا تھا مَیں حاجی فطرس علی کی محفل میں بیٹھا ہوں۔ اُن کی دکان کے سامنے یہ بڑا پیپل کا درخت۔ پیپل کے نیچے جوتے گانٹھنے والے موچی کی دری، سامنے بہترین چائے کا کھوکھا اور ایک طرف نہایت صاف دال چاول کی ریڑھی، جہاں کبھی حلیم اور کبھی دال اور کبھی پائے کا شوربہ چلتا تھا۔ یہ تمام چیزیں اصل میں پوری زندگی کا احاطہ تھیں جن کے بیچ کبھی افسانے پر بات کبھی شعر پر گفتگو، کبھی مذہب اور فلسفے پر ہاتھ صاف اور بیچ بیچ میں پنجابی اردو قصے کہانیوں کی وارداتیں۔ یہ تھی اِس تھڑے کی ساری کائنات اور یہی کائنات مکمل زندگی کا بیانیہ تھی جو میری نہیں تو کم از کم عابد حسین کی ضرور تھی۔

ہم نے ہزار باتوں کے دوران چائے اور مٹھائی ختم کی ہی تھی کہ بُھنی ہوئی مچھلی کی پرات ہمارے سامنے آ گئی۔ مچھلی فروش کے لڑکے نے مچھلی کا نہایت عمدہ خوان چٹنی اور لیمن کے ساتھ لا کر رکھ دیا۔ عابد حسین نے اپنے لڑکے سے کہا، میاں یہاں دری بچھاؤ۔ دری بچھا دی گئی اور مَیں حیران اور ششدر ہو کر رہ گیا جب خود شیزا بھی ہمارے ساتھ اُسی سادہ سی دری پر بیٹھ گئی۔ کہاں پانچ برس پہلے کی اُس کی وہ نگاہِ دشنہ کہ سینوں کو چیر دے اور بات کرنے کا یارا نہ ہو اور کہاں آج اُس کی مہربانیاں کہ اُسی دری پر بیٹھ جائے۔ انسان کی زندگی میں کیسے انہونے انقلاب رونما ہوتے ہیں۔ کہیں نہ کہیں سب انسان فطرتاً ایک ہیں، بس صحبتوں کی قبولیت اُنھیں قرب اور بُعد کی منزلوں سے روشناس کراتی ہے۔ یہیں سے دُوری اور قربت کے احساسات مزاج کو تبدیل کر دیتے ہیں مگر یہ سفر اتنا سادہ اور جلد طے ہونے والا نہیں ہے۔ اِس میں بہت سے حادثوں اور معمولی اور بڑے واقعات کو دخل ہوتا ہے تب کہیں خندقیں پُر ہوتی ہیں اور آج شیزا جیسی ماڈرن لڑکی نے وہ خندق عبور کر لی تھی۔ جو دوسروں کو فاصلے پیدا کرنے کی اخلاقیات سکھاتی تھی آج اپنے فاصلے ختم کیے بیٹھی تھی مگر یہ تو تھا کہ ایک طرف سے فاصلہ ختم ہوا تھا تو اُس کا دوسری طرف سے فاصلہ بڑھ رہا تھا۔

ہم وہیں دری پر بیٹھ کر مچھلی کھاتے رہے۔ ہمارے دائیں طرف سُرخ کوئلوں کی انگیٹھی جلتی

رہی۔ بیچ میں ایک دوسرے پر پھبتی بھی کسی جاتی رہی۔ شیزا ہماری باتوں پر ہنس رہی تھی اور مَیں اُسے دل ہی دل میں دیکھ کر کتنا خوش ہو رہا تھا جیسے ایک نئی دنیا میں داخل ہو گیا ہوں مگر اچانک مجھے کوئی خیال عجیب طرح سے تڑپا کر رکھ دیتا تھا۔ مَیں اِس خیال کو فوراً جھٹک دیتا تھا۔ مچھلی کھانے کے بعد ہم نے دوبارہ چائے منگوائی۔ یوں ہمیں وہاں بیٹھے شام کے پانچ بج گئے۔ یعنی تین گھنٹے ہو گئے۔ شیزا وہاں اتنا خوش ہوئی کہ مجھے اُس کی اِس خوشی سے ایک گونا قرار آ گیا۔ شام کے وقت ہم نے ٹیکسی لی اور دوبارہ فلیٹ پر چلے آئے۔

فلیٹ میں داخل ہو کر مَیں ایک چوکی پر بیٹھ گیا۔ شیزا نے ایک تکیہ لیا اور میرے سامنے بیٹھ گئی اور مجھے غور سے دیکھنے لگی۔ اُس کی آنکھوں میں شبنمی چمک رہی تھی۔ مَیں اُس کے اِس طرح دیکھنے سے ذرا سا جھینپ گیا اور کہا، شیزا! اتنے غور سے کیا دیکھتی ہو؟ شیزا تھوڑی دیر اُسی طرح چپ بیٹھی رہی پھر بولی، ضامن مَیں نے بہت عرصہ تمھیں غور سے نہیں دیکھا۔ تم ایسے مرد ہو جس کے سینے میں بے پناہ استغنا کا سرمایہ بھرا ہوا ہے۔ تم اپنی خوبصورتی کو انتہائی بے رحمی سے چھپائے رکھتے ہو۔ کچھ عرصے سے مَیں تمھیں سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ تم پانی سے بھرے ہوئے برسنے والے بادل ہو جو خشک زمینوں کی تلاش میں رہتے ہو۔

اچھا! تمھارے منہ سے یہ تعریف مجھے اچھی لگی، مَیں نے جواب دیا، حالانکہ تعریف ہمیشہ عورت کے لیے ہوتی ہے جسے اُس خاتون تک جلد پہنچا دینا چاہیے جو اُس کی حقدار ہو مگر تم نے آج تک مجھے اُس تعریف کی اجازت ہی نہیں دی۔

ضامن تم سے ایک بات پوچھوں؟ شیزا نے اچانک بات بدل دی۔

ہاں پوچھو، مَیں فوراً سنبھل کر بیٹھ گیا۔

اِس وقت جب کہ تم میرے تمام ظاہر باطن کو جانتے ہو، اگر مَیں یہ کام چھوڑ دوں اور تمھاری والدہ سے ملنا چاہوں تو تمھارا کیا جواب ہو گا؟ یہ کہتے ہوئے اُس نے جان بوجھ کے منہ دوسری طرف کر لیا تھا، مَیں جانتی ہوں تم اِس وقت میرے اِس سوال پر ضرور پریشان ہو گے مگر ضامن میرے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں اور نہ میرے پاس دوسرا کوئی فرد ہے۔ سچ تو یہ ہے مَیں نے پچھلے دس سال ایک پُتلی کی طرح گزارے۔ ایسی پتلی جس کے ہر عضو کے ساتھ رسی بندھی ہو۔

مَیں کچھ دیر چُپ سادھے بیٹھا رہا مگر میرے اندر ایک طوفان جنم لے چکا تھا۔ مَیں واقعی شیزا کی

کیفیتوں کو ایک لمحے کے لیے سمجھنے سے قاصر رہا تھا۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا وہ اچانک اتنا بڑا فیصلہ کر لے گی اور مجھے ایسی اُلجھن میں مبتلا کر دے گی جس کا مَیں سامنا کرنے سے انکار نہیں تو ہچکچاہٹ کا شکار ہو سکتا تھا۔ مَیں نہیں جانتا تھا وہ کس کس کے ساتھ رہی ہے؟ کیا کرتی رہی ہے اور اُس کی ذات کتنے دروں سے جھٹلائی گئی ہے مگر یہ ضرور جانتا تھا وہ مجھے کسی مشکل میں نہیں ڈالے گی لیکن اُس نے مجھے مشکل میں ڈال دیا تھا۔ دوسری طرف مَیں زیادہ دیر خموشی کو اپنے اور اُس کے لیے خطرناک سمجھتا تھا۔ کچھ نہ کچھ ایسا ضرور تھا جو اُس کے اور میرے درمیان ہونے والا تھا۔ اُس نے آج تک مجھے یہ نہیں بتایا تھا وہ کتنی محدود اور لامحدود خواہشات کی اسیر ہے لیکن اِس وقت اُس کی تمام خواہش ایک رسی مَیں بندھی ہوئی مجھ تک پہنچ گئی تھی اور مَیں اُس خواہش کو رد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مَیں کسی اخلاقیات کا پیغمبر نہیں تھا۔ مَیں ایک مرد تھا، ایک عورت کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ سب کچھ اُس کا حاصل کر چکا تھا جسے سماجی بندھنوں کے بعد حاصل کیا جاتا ہے۔ پھر وہ کون سی اخلاقیات تھی جو راستے میں حائل تھی۔ مَیں نے اُس کی طرف دیکھا اور اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

کب چلو گی میری والدہ کے پاس؟

سچ؟ وہ خوشی سے چلائی۔

بالکل سچ۔ مَیں نے اُسی استقامت سے کہا۔ مَیں نے اپنی والدہ کے لیے کچھ جملے اپنے دماغ میں سوچ لیے تھے اور اِس بات پر یقین کر لیا تھا کہ میری والدہ میری بات پر یقین کر لے گی۔

ہم م م... ہم اِسی ہفتے چلیں گے۔ میرا خیال ہے تمہارے والد اور والدہ اور بھائی کے لیے کچھ خریداری کر لیں گے اور یہ سب مَیں کروں گی اپنے پیسوں سے۔

بھئی جیسے تمہاری خوشی!... مَیں نے اُس کی آنکھوں کو بوسہ دے دیا۔

(۷۰)

جنوری کی پانچ تاریخ تھی۔ مَیں اور شیزا میرے والدین کے لیے سپر مارکیٹ سے خریداری کر کے سہ پہرا اپنے فلیٹ پر لوٹے۔ اُس نے تمام کپڑے اِس قدر مہنگے اور شوق سے خریدے کہ مَیں دیکھتا رہ گیا۔ مَیں اُس دیہاتی معاشرے سے تعلق رکھتا تھا جہاں اگر دولت اربوں روپے میں بھی جمع ہو جائے تو خریداری کرتے وقت اُنھیں اول تو معیار کی عقل نہیں ہوتی۔ بالفرض کوئی معیار پر توجہ دلا دے تو قیمت ادا کرتے وقت دل ڈوبنے لگتا ہے۔ اِس کے برعکس شیزا نے خریداری کے معیار اور قیمت دونوں پر شاہانہ نظر سے فیصلے کیے اور مجھے اِس طرح سے اُس سے باہر رکھا جیسے مَیں سرے سے ایک گنوار انسان ہوں۔ اُس نے پہلے تو سپر مارکیٹ کی مہنگی ترین دکانوں کا انتخاب کیا پھر اُس میں مہنگے ترین لباس اور اشیا کا۔ ایک دکان سے اُس نے تین قسم کے پرفیوم کا انتخاب کیا۔ یہ چیزیں وہی تھیں جنھیں مَیں اُس کے کمرے اور اُس کے پہنے ہوئے لباس میں دیکھ چکا تھا۔ اتنا خرچہ وہ کیوں کر رہی تھی، یہ سوال میرے لیے تھا۔ اُس کے لیے یہ معمول تھا چنانچہ مَیں نے اپنے سوال کو معنی دینے کی کوشش نہیں کی اور خموشی سے اُس کے اوورکوٹ کے سیاہ کناروں کو دیکھتا ہوا پیچھے چلتا رہا۔ شیزا نے تمام چیزیں ڈرائنگ روم میں ڈھیر کر دیں اور نیم جان سی ہو کر بیڈ پر لیٹ گئی۔ مَیں نے محسوس کیا وہ مارکیٹ ہی میں تھک چکی تھی لیکن چلتی رہی تھی۔ مَیں اُس کے تیور اور غصے کو جانتا تھا چنانچہ کچھ نہیں بولا اور جب اُس نے عندیہ دیا کہ واپس چلتے ہیں تو مَیں نے فوراً واپسی کی خواہش ظاہر کی باقی کا جو کچھ بھی رہتا ہے کل خریدا جائے گا۔ مَیں نے اُس کی

متغیر حالت دیکھتے ہوئے جلدی سے اُس کے لیے دودھ گرم کیا اور اُس میں چائے کی پتی ڈال کر انڈے کے ساتھ اور پین کلر کے ساتھ اُسے دی۔ اُس نے پین کلر ایک طرف رکھ دی اور دودھ اور انڈا لے لیا۔ تب مجھے کہنے لگی ضامن مجھے سمجھ نہیں آ رہی مَیں اتنا جلدی تھک کیوں جاتی ہوں۔ اتنی پین کلر میرے لیے ٹھیک نہیں ہیں۔ اُس کی طبیعت بحال ہونے لگی تھی اور وہ سوگئی۔ مَیں نے اُسے چاروں طرف سے کمبل میں لپیٹ کر گیس کا ہیٹر آن کر دیا اور ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔ مَیں نے شیزا کے لیے افسانہ لکھنے کی کوشش کی جسے مَیں سوچ رہا تھا اور اب اُس کا کافی پلاٹ میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ مَیں نے افسانہ لکھنا شروع کر دیا۔ میرا خیال تھا مَیں کہانی کو ملاقات کے دن سے شروع کروں اور اُن اہم واقعات کو اُس میں برتوں جن میں شیزا کا سفر ایک تغافل شخصیت سے کسی شخصیت کی طرف رجوع کرتا ہے۔ یہ کہانی بہت سی معلومات کا تقاضا کرتی تھی لیکن مَیں وہ معلومات انتہائی احتیاط سے اخذ کرنا چاہتا تھا۔ جس کے لیے مناسب وقت درکار تھا۔ مَیں شیزا کی شخصیت کو بہت کچھ پڑھ چکا تھا۔ وہ بالکل عام لڑکی نہیں تھی اِس لیے جو کچھ مجھے پتا تھا اُس سے زیادہ جاننے کی ضرورت تھی۔ مَیں نے جہاں سے افسانہ شروع کرنا تھا اُس سے چل کر دو صفحات لکھ چکا تھا اور رات کے بارہ بج چکے تھے۔ اچانک شیزا کی آواز آئی ضامن، مَیں بھاگ کر اُٹھا اور اُس کے قریب ہو گیا۔ ضامن میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا۔

شیزا تمھیں کیا ہوتا جا رہا ہے، مَیں نے اُس کی نبض دیکھی وہ ٹھیک چل رہی تھی۔ اُس کے بعد مَیں نے بیڈ کی دراز سے تھرمامیٹر نکال کر اُس کی زبان کے نیچے رکھ دیا اور اُسے سہلانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد چیک کیا تو بخار بھی نہیں تھا البتہ چہرہ پہلے سے زیادہ متغیر تھا۔ مَیں نے خیال کیا وہ خواب دیکھتی رہی ہے اِس لیے یہ حالت ہے۔

شیزا تم بالکل ٹھیک ہو۔ سب ٹھیک ہے۔ مَیں نے اُسے تسلی دی۔

ضامن سب ٹھیک نہیں ہے۔ تم جلدی جلدی ایک کام کرو مجھے یہاں سے، اِس شہر سے لے جاؤ۔ وہ رونے لگی۔

ہاں ہاں، مَیں لے جاؤں گا۔ صبح ہوتے ہی یہاں سے نکل جائیں گے۔ اوکے ہو گیا، مَیں نے شیزا کو دلاسا دیا لیکن وہ ابھی تک کانپ رہی تھی۔ اچانک مجھے پھر کسی خوف نے گھیر لیا۔ مَیں جلدی سے اُٹھا اور حسنات کو فون کرنے کے لیے کریڈل اُٹھایا۔ مجھے اُمید تھی حسنات میرا فون سُن لے گا۔ ظفر عالم

اگر چہ دبئی سے واپس آ گیا تھا لیکن رات کے اِس وقت وہ کبھی فون نہیں اُٹھاتا تھا۔ مجھے فون کا رسیور پکڑتے دیکھ کر شیزا ایک دم چلائی، ضامن کیا کرنے لگے ہو؟ ظفر عالم کو مت فون کرنا۔

مَیں حسنات کو فون کرنے لگا ہوں۔ مَیں نے وضاحت کی۔

اُسے بھی مت فون کرو۔ شیزا دوبارہ چیخی، مَیں اُن سے نہیں ملنا چاہتی۔ مَیں اُن لوگوں کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی۔ تم میرے لیے کافی ہو، مجھے ایک پین کلر دے دو بس۔

او کے او کے، مَیں نے اُسے تسلی دی، اُنھیں فون نہیں کرتا، ٹیکسی والے کو بلا لوں۔ مَیں نے کہا۔

ابھی مَیں کہیں نہیں جانا چاہتی۔ تم پین کلر لے کر میرے پاس آ جاؤ۔

مَیں شیزا کی بات پر عمل نہیں کرنا چاہتا تھا مگر جانتا تھا وہ ہرگز نہیں مانے گی۔ چنانچہ مَیں نے اُسے پین کلر دی اَور ہسپتال کو کل پر چھوڑا اور اُس کے ساتھ لیٹ گیا۔

شیزا نے مجھ سے پوچھا کیا کر رہے تھے اس وقت تک، سوئے نہیں تھے؟

نہیں، بس کچھ کام کر رہا تھا۔ مَیں نے شیزا کی گردن اور بالوں میں انگلیاں پھیرنا شروع کر دیں۔

کیا کام؟

ایک افسانہ لکھ رہا تھا۔

اچھا کون سا؟

بھئی ابھی تو کچھ نہیں کہا جا سکتا، تم اپنی طبیعت بتاؤ کیسی ہے؟ مَیں نے افسانے کی بات سے گریز کرتے ہوئے کہا۔

شیزا ایک بات بتاؤ؟

پوچھو؟

تم نے واقعی ظفر عالم کمپنی سے قطع کر لیا ہے اور اُن کے ہاں کام مطلق نہیں کرنا چاہتی۔ تم کچھ دن سے اُن کا نام سننا بھی نہیں چاہتی۔ اگر بُرا نہ سمجھو تو مجھے کوئی بات ضرور لگتی ہے۔ تمھیں اِن لوگوں سے کچھ ایسا ویسا صدمہ ضرور پہنچا ہے۔

ضامن یہ ظفر عالم بیچارا کون ہے؟ یہ تو میری اور تمھاری طرح کا ایک نوکر ہے کمپنی میں۔ اس کی بیگم ایک مچھلی کا کانٹا ہے جو مچھلیاں پکڑنے کے کام آتا ہے اور اب تو وہ کانٹا بھی اپنے انجام کو پہنچنے والا ہے۔

کیا مطلب؟ مَیں ایک دم حیرانیوں کی وادی میں غوطے کھاتا چلا گیا۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو شیزا؟

ضامن تم نہیں جانتے، یہ ظفر عالم کا پورا آفس بلیک میلنگ کا ایک کریہہ دھندا ہے، جس میں ظفر عالم اور اُس کی بیوی خود بلیک میل ہو چکے ہیں۔ تم شکر کرو، تمھیں کسی راز کا حصہ نہیں بنایا گیا۔ ضامن، راز بہت جان لیوا ہوتے ہیں۔ مجھے اِن رازوں نے ہلاک کر دیا ہے۔ مَیں جسے اپنا فن سمجھتی تھی، وہی اصل میں میری ذلت تھا۔ ضامن کبھی اہم مت ہونا، اہم ہونا بہت بڑی ذلت ہوتی ہے۔ ہر مچھلی دوسری مچھلی کا چارا ہے اور ہر ڈور کے پیچھے ایک دوسری ڈور بندھی ہے۔ مَیں تو اُس ڈور کا بہت آخری حصہ ہوں اور یہ ظفر عالم بھی۔ اِس کا پہلا سرا نہ مجھے معلوم ہے نہ ظفر عالم کو۔

شیزا تم کس طرح کی باتیں کر رہی ہو؟ کیا یہ کمپنی، شوبز اور انٹرٹینمنٹ کی نہیں؟ اِس میں کون سے ایسے راز ہیں جنھیں مَیں اور تم نہیں جانتے؟

وہ راز مَیں نہیں جانتی کیا ہیں مگر جب مجھے کسی آدمی کے ڈرائنگ رُوم میں بھیجا جاتا تھا، میری اُنگلی میں انگوٹھی اور میرے بالوں میں لگے ہوئے کلپ سب اصل میں کیمرے ہوتے تھے اور حد تو یہ ہے مجھے بھی یہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔

مَیں شیزا کی بات سُن کر دم بخود رہ گیا۔ میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ میری آواز مضمحل ہو گئی اور سانس سینے میں رُکنے لگی۔ کیا شیزا مجھے زندگی کے کسی لمحے میں شکار تو نہیں کر گئی؟ مَیں تو خود اُس کے شکار میں سر بہ خم تھا لیکن مَیں تو اہم آدمی نہیں تھا۔ کیا یہ تمام آفس وہ چمکتی ہوئی دلدل تھی کہ جو اِس کے پار کے سمندر کا لُس لینے نکلا، پھر باہر نہیں نکلا۔ مَیں کچھ دیر کو چپ ہو گیا۔ اِسی عالم میں شیزا بولی، ضامن کیا سوچتے ہو؟ مَیں تمھاری آشنائی کے آغاز میں بے رحم تھی۔ تم میرے لیے محض ایک کلرک تھے۔ صرف غیر اہم تھے۔ مجھے تم سے ایسے کسی لمحے کی خواہش نہیں کی گئی جس میں تم کسی سراب کی پہنائیوں میں گم ہو جاتے۔ دیکھو میرا احصار تمھارے لیے تنگ نہیں تھا۔

نہیں شیزا! مَیں یہ نہیں سوچ رہا تھا، مَیں اُس کی بات سے دوبارہ حوصلے میں آ گیا۔ اگر ایسا ہے تو تم مجھے بتا سکتی ہو کون لوگ ہیں جن کے گلے تم اور تمھاری طرح کی حسین لڑکیوں کی بانہوں میں کسے جاتے ہیں۔ وہ کون ہیں جن کی سانس بند کی جاتی ہے؟

ہر وہ سرکاری اور غیر سرکاری بُوزنا جس کے پاس قلم کی لائن اور پیسے کی گٹھڑی ہے۔ یا وہ اُس کی طمع کرتے ہیں۔

لیکن ایک بات کی مجھے سمجھ نہیں آئی، مَیں نے اُس آفس میں ایسے کئی نو عمر لڑکوں اور نوجوانوں کو دیکھا ہے جو ماڈلنگ کا شوق رکھتے ہیں، ڈرامے اور گانے کے لیے کسی پلیٹ فورم کی توقع رکھتے ہیں اور آفس اُن پر بے بہا خرچہ کرتا ہے۔

شیزا نے بے نیازی سے میری طرف دیکھا اور بولی، ضامن اِس ملک کے بہت سے معززین لڑکوں کا شوق رکھتے ہیں۔ ہاں اُن لڑکوں میں سے ایک دو فیصد کو اُن کے ٹیلنٹ کے سبب آفس کوئی پلیٹ فارم بھی مہیا کر دیتا ہے۔ ذیشان کو بھی استعمال کیا گیا ہے۔ وہ بھی اِس ملک میں بہت سی دہلیزوں کی زینت بنا ہے۔ اُن کے پھانسے ہوئے تو رسوائی کی دگنی ذلت میں ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتو ہر وہ شخص جسے اقتدار یا اختیار کی کرسی سے الگ کیا جاتا ہے، وہ بازاروں اور گلیوں میں اصلی طاقتوروں کے خلاف نقارہ نہ بجاتا پھرے؟ مگر یہ سب باتیں تمھارے لیے فضول ہیں۔ تم نہ اِس ملک کا مقدر ہو، نہ اِس میں تمھاری اور میری حیثیت اُس گھوڑے کی ہے جو اپنی سواری کو بچا کر لے جائے۔ اِن باتوں کو چھوڑو۔ آؤ میرے سینے سے لگ کر لیٹ جاؤ اور مَیں شیزا کے سینے سے لگ کر لیٹ گیا۔ مَیں کس ذہنی کرب میں تھا؟ کون سی اذیتیں مجھے اپنے حصار میں لیے ہوئے تھیں؟ یہ بتانا میرے اختیار سے باہر تھا۔

اور جو عورتیں ہیں؟ مَیں نے شیزا سے آخری مگر کریہہ سوال کر دیا۔

اُن میں سے بعض کے لیے عورتیں بھی ہیں لیکن یہ صرف ایک ہتھکنڈہ ہے اور وہ شعبہ ہے جس سے میرا تعلق ہے۔ ہوسکتا ہے اِس کے علاوہ پارساؤں کے لیے کون سے جال بچھے ہوئے ہیں جنھیں وہ مصلہ سمجھ کر نماز کی نیت کر لیتے ہیں۔ یہ آخری جملہ کہتے ہوئے اُس نے آنکھیں موند لی تھیں اور بالکل خموش ہوگئی۔ وہ رو رہی تھی۔ مَیں اُسے دلاسے دینے لگا۔ کافی دیر بعد شیزا دوبارہ بولی۔

ضامن تمھیں پتا ہے ذیشان کا پچھلے چھ مہینے سے خط نہیں آیا۔ مَیں اُس کے لیے اُداس ہوں۔ بہت تنہا ہوں۔ مَیں نے کئی بار اُس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر نہیں ہوسکا۔

میں شیزا کی اِس بات پر بالکل خموش ہو گیا۔ پھر نہ جانے کب مجھے نیند نے آلیا۔ مجھ سے پہلے شیزا دوبارہ سو گئی تھی۔

لیکن اگلی صبح وہ ہوا جس کی نہ مجھے توقع تھی، نہ شیزا کو اور نہ دنیا کے کسی ایسے فرد کو جو یقین رکھتا ہو کہ اتنی بڑی کائنات میں شیزا کا ایک چھوٹا سا وجود بھی ہے۔

[illegible] آوازیں آنے لگیں۔ مَیں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔

اُس کا رنگ بالکل زرد تھا اور جسم کانپ رہا تھا۔ اعصاب میں تناؤ تھا۔ آنکھیں گویا مرگ کا پیغام دے رہی تھیں۔ میرے ہاتھ پاؤں سے زمین نکل گئی۔ مَیں نے فوراً ٹیکسی والے کو فون کیا اور پلٹ کر شیزا کی طرف دوڑا لیکن اُس کا وجود بے جان سفید انڈے کی طرح پھسل رہا تھا۔ مَیں نے جلدی سے فریج سے پانی نکالا اور شیزا کے ہونٹوں سے لگایا۔ اُس نے پانی کے ایک دو گھونٹ لیے اور ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ شیزا بڑی مشکل سے بولی، ضامن میرا جسم شدید درد میں مبتلا ہے، جیسے کوئی جسم کا گوشت چھری سے کاٹ رہا ہو۔ مجھے بچالو۔

شیزا کی یہ حالت دیکھ کر مجھے خود رونا آ گیا لیکن مَیں نے اپنے آنسو ضبط کیے رکھے کہ اِس سے وہ مزید شکستہ ہو جائے گی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کیا کروں؟ اُسے اچانک یہ کیا ہو جاتا تھا اور اِس شدت کے ساتھ کہ تمام جسم میں شدید درد کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ اُس کی صحت روز بروز گر رہی تھی۔ وہ ابھی جوان تھی مجھ سے بہت چھوٹی تھی۔ ایسی کوئی بیماری جس کا مَیں اندازہ کر سکتا تھا اُسے لاحق ہونے کا اندیشہ کم تھا۔ مَیں نے جلدی سے اُسے دوبارہ پین کلر دی۔ مجھے اب اِس ٹیبلٹ سے نفرت ہو چلی تھی۔ اتنی زیادہ پین کلر اُس کا جگر اور گردے تباہ کر سکتی تھیں۔ ہمارے گھر کے قریب ہی اسلام آباد کا سب سے پہلا ہاسپٹل پولی کلینک تھا۔ وہاں میرا کوئی شخص واقف نہیں تھا مگر اُس کی ایمرجنسی میں شیزا کو لے جایا جا سکتا تھا۔ اِتنے میں ٹیکسی آ گئی تھی۔ مَیں نے شیزا کو اپنے بازوؤں میں بھر لیا اور اُٹھا کر باہر لے آیا۔ جلدی سے شیزا کو ٹیکسی میں ڈالا۔ ٹیکسی ایف سکس ٹو سے سیدھی جی سکس ٹو میں داخل ہوئی اور پاکستان پوسٹ آفس کے سامنے سے ہوتے ہوئے پولی کلینک میں لے گیا۔ اب شیزا پین کلر کھانے سے قدرے سکون محسوس کر رہی تھی مگر اُسے اب واپس نہیں لے جایا جا سکتا تھا۔ ایک بار اُس کا مکمل میڈیکل چیک اپ ضروری تھا۔

مَیں اُسے ایمرجنسی میں لے جا چکا تھا۔ یہ صبح کا وقت تھا اِس لیے ہر چیز یہاں قدرے پرسکون تھی۔ ایمرجنسی میں ایک دو مریضوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ شیزا کو لے جاتے ہی مَیں نے وہاں موجود دو آدمیوں کو سو سو روپے کے نوٹ دیے۔ اُنھوں نے وہ نوٹ جلدی سے جیب میں ڈالے اور شیزا کو اٹینڈ کرنے لگے۔ ایمرجنسی میں موجود ڈاکٹر جلد ہی اُسے چیک کرنے لگا اور دو انجیکشن لگا دیے۔ اُس کے بعد میری طرف متوجہ ہوا۔ اِس کا نام ڈاکٹر نعیم تھا۔ یہ ایک نوجوان لڑکا تھا، شاید ابھی نیا نیا ڈاکٹری کر کے آیا تھا۔ اُس نے مجھ سے شیزا کی کیس ہسٹری دریافت کی۔ مَیں نے اُس کے دبئی سے آنے سے لے کر

اب تک کی تمام واردات بیان کر دی۔ شیزا اب مکمل ہوش میں تھی۔ اُس کے بعد وہ شیزا سے کچھ سوال جواب کرتا رہا اور مجھے لگا کہ وہ کچھ متفکر سا ہو گیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے مجھے ایک طرف کر دیا اور بولا آپ یہاں رُکیں اور خود باہر نکل گیا۔ چند منٹوں میں واپس آیا تو اُس کے ساتھ ایک اور ڈاکٹر موجود تھا۔ یہ ذرا بڑا اور سینئر ڈاکٹر تھا۔ اُس نے شیزا کو دیکھا اور دوبارہ وہی سولات کرنے شروع کر دیے۔ مَیں نے اُسے ایک ایک بات بتا دی۔ اُس کے بعد وہ شیزا کی طرف متوجہ ہوا اور نئے سرے سے اُسے چیک کرنے لگا۔ تب اُس نے ایک لیڈی ڈاکٹر کو طلب کیا اور پردہ گرا دیا۔ لیڈی ڈاکٹر شیزا کو چیک کرتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے پردہ ہٹا دیا اور ڈاکٹر کے ساتھ چہ مگوئیاں کرتی رہی۔ اِس سب کارروائی میں مَیں ایک متوحش شخص کی طرح اُنھیں دیکھ رہا تھا۔ لیڈی ڈاکٹر کے ساتھ مشورہ کرنے کے بعد اُس نے شیزا کو ایک مزید انجیکشن لگا دیا اور شیزا سے کہا آپ اُٹھ کر بیٹھ سکتی ہیں۔ پھر اُس نے میرا نام پوچھا اور کہا ضامن صاحب، آپ میرے ساتھ کمرے میں آ ئیے۔ مَیں نے شیزا کو ایک نظر دیکھا۔ شیزا نے مجھے اشارے سے ڈاکٹر کے ساتھ جانے کو کہا، مَیں ڈاکٹر کے پیچھے چل دیا۔ مَیں ایک طویل کوریڈور سے گزر کر ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ ڈاکٹر اور لیڈی ڈاکٹر دونوں میرے سامنے بیٹھ چکے تھے۔ مَیں نہایت بے صبری سے اُنھیں دیکھ رہا تھا اور فکر مند تھا کہ کون سی سیریس بات تھی جو مجھے بتانا چاہ رہے تھے۔ ڈاکٹر نے مجھے ایک بھاری خموشی کے بعد مخاطب کیا۔ ضامن صاحب، آپ اِس خاتون کے کیا لگتے ہیں؟

آپ مجھے اِس کا خاوند سمجھ لیجیے؟ مَیں نے جواب دیا۔

مطلب ابھی آپ کی اِن سے شادی نہیں ہوئی، ڈاکٹر نے دوبارہ سوال کیا۔

ڈاکٹر صاحب میرا نہیں خیال اِس کی بیماری کا میری شادی سے کوئی تعلق ہے؟

بہت بڑا تعلق ہے، ڈاکٹر نے قطعیت سے کہا، مجھے یہ عورت ایک نہایت خطرناک مرض کی مریضہ لگتی ہے۔ اگر آپ اِس کے نہایت قریبی عزیز ہیں تو آپ سے بات کی جا سکتی ہے ورنہ اُس کے کسی عزیز ترین شخص کو یہاں ہونا چاہیے۔

آپ مجھے اِس کا عزیز ترین شخص سمجھیں، شاید میرے علاوہ اِس کے نزدیک دوسرا کوئی نہیں ہے۔

ہمیں اِس میں کینسر کی علامات نظر آ رہی ہیں۔ اِس کا ایچ بی لیول بہت گر گیا ہے۔ ہو سکتا ہے

اسے خون کی قے بھی آئی ہو لیکن اِس نے آپ کو نہیں بتایا۔

ڈاکٹر کی بات ایک بم کی طرح میرے سر پر گری اور یوں لگا جیسے کسی نے میرے دماغ میں لوہے کا ڈنڈا مار دیا ہو اور مَیں اپنے حواس کو قابو کرنے کی مشکل میں ہوں۔ وہ قابو نہیں ہو رہے مگر مَیں ڈاکٹر کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ چنانچہ مجھے اپنے منتشر اعضا کو مجتمع کر کے بیٹھنا تھا۔ میرے منہ سے بمشکل نکلا، کون سا کینسر ہو سکتا ہے؟

اِس بارے میں ابھی ہم کچھ بھی حتمی نہیں کہہ سکتے۔ ہم اس کا مکمل ٹیسٹ کروائیں گے، اِن کے خون کے نمونے کراچی آغا خاں ہاسپٹل بھیجیں گے، وہاں سے رپورٹ آئے گی۔ یہاں ہمارے پاس فی الحال ایسی لیبارٹری نہیں ہے جو یہ ٹیسٹ کی حتمی رپورٹ ظاہر کر سکے۔ البتہ باقی تمام ٹیسٹ یہیں ہو جائیں گے۔

ڈاکٹر صاحب، مَیں بولا، آپ جو کچھ بھی کرنا چاہتے ہیں کیجیے۔ یہ لڑکی جسے مَیں آپ کے پاس لایا ہوں، یہی میری کائنات ہے۔ آپ جیسے بھی کہیں گے ہم اُس کے لیے تیار ہیں۔ مَیں ہر وہ کام کروں گا جو شیزا کی صحت یابی کے لیے ضروری ہو گا۔

ٹھیک ہے ہم کچھ ضروری ادویات تب تک لکھ دیتے ہیں۔ یہ باقاعدگی سے اِسے دیجیے اور کچھ رقم جمع کروا دیجیے تا کہ اِن کی ٹیسٹ رپورٹ حاصل کر سکیں۔ ڈاکٹر نے وضاحت کی اور خود دوائی لکھنے لگا۔

ڈاکٹر صاحب ایک بات آپ سے عرض کرنا چاہتا ہوں، کیا ایسا ممکن ہے یہ بات شیزا سے نہ کی جائے؟ ناممکن ہے، ڈاکٹر نے دوٹوک جواب دیا، ہاں البتہ جب تک ٹیسٹ رپورٹ نہیں آ جاتی تب تک ایسا ممکن ہے۔

ڈاکٹر صاحب آپ کا شکریہ، کتنے روپے جمع کرا دیے جائیں؟

کچھ ٹیسٹ یہیں پر ہوں گے۔ اُن کی فیس نہیں ہو گی البتہ کراچی کے لیے آپ پانچ ہزار جمع کرا دیں۔

بہت بہتر۔ یہ کہہ کر مَیں باہر نکل آیا، میری جیب میں اِس وقت کل ملا کر بائیس سو روپیہ تھا۔ مجھے پیسے لینے کے لیے واپس فلیٹ پر جانا تھا۔ مَیں شیزا کو بتائے بغیر خموشی کے ساتھ باہر نکلا۔ جلدی سے فلیٹ پر آیا اور بیڈ روم کی دراز سے پیسے نکالے۔ یہ پانچ ہزار تھے، مَیں واپس ہاسپٹل گیا اور ایک گھنٹے کے

اندر فیس جمع کروا کر فارغ ہو گیا۔ اِتنے میں ڈاکٹر نے مجھے تمام ادویات لکھ دیں اور اُن کی تفصیل بھی لکھ دی۔ ہم وہ ادویات لے کر واپس آ گئے۔ شیزا تمام راستے مجھ سے پوچھتی رہی، ڈاکٹر کیا کہہ رہا تھا مگر میں اُسے ٹالتا رہا کہ اُنھوں نے خون کے نمونے لے لیے ہیں۔ جب تک ٹیسٹ رپورٹ نہیں آ جاتی ڈاکٹر کچھ بھی بتانے سے گریز کر رہا ہے۔ مَیں نے یہ جھوٹ اِس لیے بولا کہ شیزا آج ہی دل چھوڑ کر بستر پر دراز نہ ہو جائے۔

(۷۱)

یہ گیارہ اپریل کی بہار کے دن تھے جب شیزا کی رپورٹ آئی اور رپورٹ پوزیٹو تھی۔ اس عرصے میں شیزا مسلسل بخار اور درد کے زیرِ اثر رہی مگر ڈاکٹر کی لکھی ہوئی ادویات نے اُس کو سہارا دیے رکھا تھا۔ کبھی بہت بہتر ہو جاتی کبھی بخار اور درد شروع ہو جاتا۔ بالآخر شیزا بستر پر دراز ہو گئی۔ رپورٹ آنے کے کچھ ہی دن بعد وہ تیزی سے حوصلہ چھوڑتی چلی گئی۔ اُسے بلڈ کینسر تھا اور سب سے زیادہ جو میرے لیے حوصلہ شکن بات تھی اُس کا کینسر اپنی ابتدائی سٹیج عبور کر چکا تھا۔ یہ سب کچھ شیزا کو بتا دیا گیا تھا، جس کا اثر اُس نے بہت جلد قبول کر لیا اور وہ اپنا حوصلہ اور ہمت چھوڑتی چلی گئی۔ ڈاکٹر عزیز الدین نے شیزا کی کیموتھراپی شروع کر دی تھی۔ مجھے اُس کیموتھراپی کے لیے ہر وقت خون کے بندوبست کی فکر تھی۔ دوسری طرف اُس کے سفید خلیے غیر موثر ہو رہے تھے۔ اُن کے لیے بھی پلیٹ لٹس کا بندوبست کرنا ہوتا تھا۔ سفید خلیوں کے غیر موثر ہونے کی وجہ سے شیزا کو خون کے پیچش اور قے آنا شروع ہو گئیں تھیں۔ جنھیں ٹھیک رکھنے کے لیے تازہ خون کی اشد ضرورت تھی۔ دوسری مصیبت میرے لیے یہ کھڑی ہو گئی تھی کہ شیزا کا خون او نیگیٹو تھا اور یہ نہایت کمیاب تھا۔ آئے دن بون میرو ٹیسٹ کروانا پڑتے تھے۔ اُن کے لیے الگ سے فیس دینا پڑتی تھی۔ غرض ہر طرف سے پیسوں کی جیبیں کھل گئی تھیں۔ میرا سارا وقت اِسی حالت میں گزر رہا تھا۔ کیسے اور کہاں سے خون کا انتظام کیا جائے، کہاں سے پلیٹ لٹس کا بندوبست کیا جائے۔ بہت سے دوستوں کو مفت پکڑ پکڑ کر لے گیا مگر روز کون آتا تھا؟ پھر بھی مَیں نے

اپنی پوری طاقت اِس میں صرف کر دی۔ اُدھر ڈاکٹروں نے اپنی بہترین خدمات پیش کی تھیں۔ شروع شروع میں تو ایسے لگا کہ کہیں سے خیر نہیں ہو رہی مگر پھر حالات ٹھیک ہونے لگے۔ شیزا کا درد کم ہوتا گیا اور اُس کا ایچ بی لیول بھی اپ گریڈ ہو گیا۔

علاج شروع ہوئے شیزا کو چوتھا مہینہ ہو گیا تھا۔ اِس عرصے میں میرا کم و بیش تمام سرمایہ ختم ہو چکا تھا مگر چار مہینے بعد ایک اچھی خبر ملی کہ شیزا ریکور ہونے لگی اور مَیں اُسے اُٹھا کر گھر لے آیا۔ اِس عرصے میں مجھے کام سے جواب دے دیا گیا تھا کہ مَیں اول اُن کے کام کر نہیں رہا تھا اور اگر کچھ کرتا تھا تو وہ بے دلی سے انجام دیتا تھا۔ ظفر عالم اور اُن کی کمپنی کے کچھ لوگوں نے آغاز میں تھوڑی بہت مدد کی مگر آہستہ آہستہ وہ دلچسپی لینا چھوڑ گئے تھے۔ میری ساری توجہ شیزا پر تھی۔ شیزا نے اپنا بینک اکاؤنٹ میرے حوالے کر دیا تھا جس میں حیرانی کی بات تھی کہ تین لاکھ سے زیادہ روپیہ نہیں تھا۔ اصل میں شیزا نے اپنے ابتدائی زمانوں میں ذرا بھر پیسہ بچانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مکان مہنگے کرایے پر تھا۔ ہر چیز الیٹ طریقے سے استعمال کی تھی۔ پھر اُس کے بھائی ذیشان کا خرچہ بھی اُسی کی گردن پر تھا۔ وہ جتنا کچھ خود کماتا تھا، اُسے ہائی کلاس میں رہنے کے لیے اُس سے دُگنا خرچ کر دیتا تھا، جس کا بوجھ شیزا پر آتا تھا۔ پہلے مَیں شیزا کو دو تین بار کراچی لے کر گیا لیکن کراچی میں اول کیموتھراپی کا خرچہ، پھر آنے جانے کا الگ خرچہ تھا اور پیسے اتنی تیزی سے خرچ ہوئے تھے کہ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ مجھے اِس بات کی فکر نہیں تھی کہ میرا اپنا ذریعہ معاش نہیں رہا تھا یا میری جیب خالی تھی اور مجھے اپنے خرچے کے لیے کیا کرنا تھا؟ سب کچھ ٹھیک ہو سکتا تھا اور ٹھیک ہونے بھی لگا تھا مگر چھ ہی ماہ گزرے تھے کہ شیزا پھر بیمار پڑ گئی اور اب اُس کی بیماری پہلے سے کہیں زیادہ گمبھیر ہو گئی۔ اب ہمارے پاس بہت کم پونجی بچی رہ گئی تھی۔ میرے لیے سب سے اذیت دینے والی بات یہ تھی کہ اگر یہ پیسے خرچ ہو گئے تو شیزا کا علاج، جو پہلے ہی اتنا مہنگا تھا مزید مخدوش تھا اور ایک دم رُک جانے والا تھا۔

مَیں شیزا کو دوبارہ پولی کلینک ہاسپٹل لے آیا۔ آپ کو لاکھ پتا ہو کہ مریض زندہ نہیں رہے گا مگر وہ اپنے علاج کے دورانیے میں مرے تو لاچاری کا احساس نہیں ہوتا۔ علاج رُک جائے فقط اِس بنیاد پر کہ پیسے نہ ہوں تو مریض کے ورثا اور خود مریض کی اذیت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ یہی احساس مجھے کھائے جا رہا تھا۔ اگرچہ ابھی تک ہمارے پاس رقم موجود تھی مگر مَیں نے اِس خوف سے کہ وہ رقم جتنا ہو سکے زیادہ دیر تک چلنی چاہیے، اپنے جاننے والوں اور دوست احباب سے رقم کے تقاضے شروع کر دیے۔ اِس میں

عابد حسین اور دوسرے کئی احباب نے کھل کر مدد کی۔ مَیں یہ نہیں کہتا ظفر عالم اور حسنات جیسے دوستوں نے ساتھ نہیں دیا۔ اُنھوں نے اُس مدد سے جو اُمرا و شرفا اپنے قریب کے لوگوں کی کرتے ہیں، سے بڑھ کر کی مگر وہ یہ تسلسل زیادہ دیر برقرار نہیں رکھ سکے بلکہ اب اُنھوں نے مجھ سے ملنے سے بھی انکار کرنا شروع کر دیا تھا۔ اِس کے باوجود مَیں ڈھیٹ بن کر اُن کے دروازوں پر جاتا رہا۔ مجھ سے شیزا کی اذیت نہیں دیکھی جاتی تھی۔ اب وہ پہلے سے بھی زیادہ تیزی سے کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ اُدھر کئی بار رابطہ کرنے کے باجود ذیشان کی کوئی خبر نہیں آ رہی تھی۔ میرا ایک بار اُس سے رابطہ ہوا مگر اُس نے پوری بات نے بغیر ہی فون کاٹ دیا تھا۔ اُس کے خیال میں مَیں شیزا کا بہتر خیال رکھ سکتا تھا اور خواہ مخواہ اُسے تنگ کر رہا تھا۔ اب میں پیسوں کا اتنا خیال کرتا تھا کہ ٹیکسی تو ایک طرف ویگن یا بس کے ٹکٹ کے لیے بھی پیے نہیں خرچتا تھا۔ بعض اوقات پیدل چل چل کر میرے پاؤں سوج جاتے تھے۔ ہسپتال سے کئی چکر باہر لگتے تھے۔ شیزا مجھے حسرت بھری نظروں سے دیکھتی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو مجھے خموشی سے پکارتے تھے۔ مَیں اُن آنسوؤں کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ نہ شیزا کا سامنا کرنے کی مجھ میں ہمت تھی۔ دوسری طرف میرے علاوہ شیزا کے پاس رُکنے والا کوئی آدمی نہیں تھا۔ اُس کی دوست آتی تھیں، کچھ دیر بیٹھتی تھیں اور چلی جاتی تھیں۔ اُن میں سے اکثر امیرزادیاں تھیں مگر وہ جاتے ہوئے صرف ہزار یا دو ہزار روپے تک کی رقم آہستہ سے شیزا کے سرہانے رکھ دیتیں۔ یہ وہ بھیک تھی جسے شیزا نہ چاہتے ہوئے بھی وصول کرنے پر مجبور تھی۔ وہ جانتی تھی، میری جیب کا سرمایہ ٹھکانے لگ چکا ہے اور اب تو اُس کی اپنی زنبیل بھی خالی ہو رہی تھی۔

مَیں نے مکان چھوڑ دیا تھا، وہ مکان جس میں مَیں اور شیزا نے سیکڑوں راتیں ہنستے اور چہلیں کرتے گزاری تھیں۔ وہاں سے نکلتے ہوئے میرا تمام سامان ایک ٹیکسی کی ڈکی میں آ گیا تھا کیونکہ اُس مکان کی ہر شے مَیں نے بیچ کر شیزا کے علاج میں خرچ کر دی تھی۔ اِس عرصے میں بہت سے ڈاکٹروں کے ساتھ میری بات چیت ہوئی۔ کبھی کبھی ڈاکٹر ہلکی سی اُمید دلا دیتے تھے جسے میں زندگی کی علامت سمجھ کر نئے سرے سے حوصلہ مند ہو جاتا تھا اور اُس کے علاج کے لیے جدو جہد شروع کر دیتا تھا۔ کبھی پھر حوصلہ چھوڑ دیتا تھا۔ میرے لیے سب سے اذیت ناک وقت وہ ہوتا تھا جو مَیں شیزا کے بیڈ کے پاس بیٹھ کر گزارتا تھا۔ اُس کی تکلیف اور درد کے وقت چیخیں سننے کی مجھ میں ہمت نہیں ہوتی تھی۔ مَیں بعض اوقات اپنی موت کی تمنا میں اِدھر اُدھر دوڑتا تھا مگر اُس چوہے کی طرح جو بڑے سیلاب میں پھنس جائے

اور نکلنے کی راہ نہ پائے۔ کوئی بیماری اِس قدر اذیت ناک ہو سکتی ہے؟ اِس سے پہلے مَیں نے زندگی کے اِن لمحوں کا تصور نہیں کیا تھا۔ جب آپ بیماریوں سے دُور ہوتے ہیں اور محض بیماریوں کا نام سنتے ہیں تو اُنھیں زندگی کا حصہ سمجھ کر بے نیازی سے دوسری باتیں کرنے لگتے ہیں مگر جب نا قابلِ علاج بیماریوں سے آپ کا سامنا ہو جائے تو لگتا ہے سوائے اِس بیماری کے کائنات کی ہر شے بھول جانے کے قابل ہے۔ اُس وقت موت کے معنی بالکل بدل جاتے ہیں۔ تب معلوم ہوتا ہے موت ایسی نہیں ہوتی جیسے ہم شب و روز اُس کا تذکرہ کرتے ہیں۔ تب موت مکمل اندھیرا ہوتی ہے نا قابلِ برداشت اندھیرا، اُس میں کسی ایک آدھ نام کی کرن کبھی کسی کے لیے معنی پیدا کر لیتی ہے مگر وہ مرنے والا کروڑوں میں سے کوئی ایک ہوتا ہے۔

شروع کے دِنوں میں جب شیزا کو ہسپتال میں داخل کیا گیا تو اُس سے ملنے اور دلاسا دینے والوں کے گروہ بغیر تھکاوٹ کے آتے رہے۔ وہ شیزا کے کمرے میں بہت دیر تک بیٹھنے میں بیزاری محسوس نہیں کرتے تھے۔ اُن ملنے والوں میں ہر قسم کے افراد تھے۔ وہ بھی جنھیں شیزا کبھی تنہائی میں مل چکی تھی، وہ بھی جنھیں وہ پارٹیوں میں دیکھ چکی تھی۔ اِن میں وہ بھی تھے جنھیں شیزا بھول چکی تھی مگر وہ اُسے نہیں بھولے تھے۔ ہاں مگر وہ اُسے اُسی حالت میں دیکھنے آتے تھے مگر افسردہ جاتے تھے۔ مَیں اِب لوگوں سے یکسر بے نیاز اور درد سے بھرا ہوا شخص فقط اتنی راحت محسوس کرتا تھا کہ جب تک وہ اُس کے پاس بیٹھے رہتے مَیں شیزا کے لیے خون کا کنواں کھودنے کسی نئے دوست، کسی نئے سیٹھ، کسی نئے سرکاری افسر یا بزنس مین سے بھیک مانگنے نکل جاتا۔ کہیں سے یہ پروقار اور تھکا دینے والی خیرات مل جاتی، کہیں سے اُس کا وعدہ مل جاتا اور کہیں سے خون کی دو بوتلیں میسر آ جاتیں۔ مَیں یہ جنگ شروع میں دوستوں کے میمنہ میسرہ کے ساتھ لڑتا رہا تھا مگر رفتہ رفتہ میرے یہ تمام سپاہی شکست کے آثار سے گھبرا کر دائیں بائیں ہو گئے تھے۔ شیزا کے وہ دوست جو کبھی اُس کے سرہانے پھولوں اور چند روپے کے ساتھ اپنا یقین بھی رکھ آتے تھے، وہ محض دلاسے کی بازگشت رہ گئے اور آٹھ ماہ بعد شیزا کی ڈوبتی ہوئی آنکھوں کا سامنا کرنے کے لیے مَیں اکیلا رہ گیا۔ پائی پائی کا محتاج ایک باؤلا فقیر، جسے ہر جگہ سے چونی اٹھنی کی خیرات چاہیے تھی۔ میرا ادب، میرا وقار اور معاشرے میں میری سماجی حیثیت دو کوڑی کی ہو کر رہ گئی تھی۔

(۷۲)

مَیں چار ماہ پہلے اپنا بستر اُٹھا کر جی سیون کی ستارہ مارکیٹ کے پہلو میں موجود ایک چھوٹی سی کالونی میں آ گیا تھا۔ یہ جگہ مارکیٹ کے عین مشرق میں سوفٹ نیچے تھی۔ نچلے درجے کے کلرکوں کے لیے بنے ہوئے لال رنگ کے چھوٹے چھوٹے فلیٹ اور اُن کے سامنے چاروں طرف جنگلی شہتوتوں کا بھرا ہوا جنگل تھا۔ بیچ بیچ میں کئی درخت پیپل اور چناروں کے موجود تھے۔ ہر طرف پتے اور گھاس کے ڈھیر پڑے بکھرے تھے۔ اِسی چھوٹے سے جنگل کے درمیان میں لڑکوں بالوں نے تھوڑی سی جگہ صاف کر کے اُس کو کھیلنے کے واسطے میدان بنا لیا تھا مگر یہ میدان محض ایک دل کی تسکین ہی تھی کہ ہاکی یا فٹ بال کھیلنے کے واسطے بالکل مناسب نہیں تھی۔ ایک طرح سے اونچ نیچ کے کھڈوں سے بیس مربع فٹ کا اکھاڑا سمجھ لیں۔ تھوڑا سا آگے جائیں تو وہی نالہ تھا جو اسلام آباد کے پورے شہر میں مکڑی کے جالے کی طرح پھیلا ہوا تھا اور ہر سیکٹر کو دوسرے سے قدرتی طور پر علیحدہ کرتا ہے۔ بالکل اِس کے آگے کنارے پر عیسائیوں کی کچی بستی ہے۔ یہ بستی بہت بڑی تھی اور بغیر کسی اجازت یا پرمٹ کے یہاں آباد ہوئی تھی۔ بستی کے مرد و خواتین بلکہ لڑکے صبح اسلام آباد کے مختلف اداروں اور گھروں اور علاقوں میں صفائی کرنے نکل جاتے اور شام کو واپس اِسی کچی آبادی میں لوٹ آتے۔ اسلام آباد میں یہ ایک نہیں بلکہ اِس طرح کی کئی بستیاں اور بھی تھیں۔ اِن میں کوئی بجلی اور پانی کا انتظام نہیں تھا اور ایک بڑے ایلیٹ شہر کے درمیان بالکل پتھر کے زمانے کی دنیا آباد تھی۔ یہ کالے اور ننگ دھڑنگ لوگ یہاں کیوں رہ رہے تھے اور اِس

انتہائی مہنگی جگہ پر اِن کے گندے اور کالے وجود کو کیوں برداشت کیا جا رہا تھا؟ اس کا جواب میرے پاس نہیں تھا مگر اُن دونوں طبقوں کے پاس بہر حال تھا جن کے درمیان ان کے بسنے کا یہاں خموش معاہدہ تھا۔ اگر انھیں یہاں سے نکال دیا جائے تو پورے شہر کی صفائی کا پول ایک ہی دن میں کھل جائے۔ چونکہ شہر کے لوگ بہت نفیس، کھاتے پیتے اور صاف رہتے ہیں۔ اشراف طبقے کے لوگوں کی نفاست کے لیے ضروری ہے کہ اُن کی صفائی ستھرائی کے لیے نچلے درجے کے لوگ اپنی خدمات انجام دیں۔ جس قدر کوئی شخص نچلے درجے سے ہوگا اتنا ہی اُس کی خدمت کا معیار بہتر ہوگا، خاص کر شرفا کے گند صاف کرنے کا معیار اور یہ بات اُنھیں اچھی طرح معلوم تھی۔ اِدھر اسلام آباد اُس تاخیر کا متحمل نہیں ہو سکتا کہ اُسے صاف کرنے میں دیر کی جائے چنانچہ چماروں کے قبیلوں کو یہاں آباد ہونے میں بہت آسانی ہو گئی۔ صاحب لوگوں کے گھروں میں کام اور صفائی کرنے والی خواتین کے اپنے مسائل تھے کہ اُنھیں یہ کہہ دینے میں کون سی محنت کرنا پڑتی کہ صاحب گھر بہت دور ہے اِس لیے دیر ہو گئی۔ تو صاحب لوگوں نے اِن خاندانوں کے یہاں آباد ہونے سے چشم پوشی اختیار کر لی مگر اتنا خیال رکھا ایک تو یہاں کا بے ترتیب جنگلی شہتوتوں کا جنگل مزید گھنا کر دیا اور دوسرا بجلی اور پانی سے اُنھیں دُور رکھا کہ یہ دونوں چیزیں خدانخواستہ اُن کے کسی بھی وقت مہذب ہونے کی طرف راستہ دیتیں۔ گھنے جنگل کی وجہ سے یہ لوگ بیرونِ ملک سے آئے ہوئے آقاؤں کی نظروں سے اوجھل رہتے۔ ایک خوبصورت شہر میں ایسی بدنما کالک کا چھپے رہنا ہی عقلمندی اور دانائی کی علامت تھی۔ اِس بستی میں شراب کی بھٹیاں عام تھیں اور اعلیٰ شراب کی سپلائی کا کاروبار بھی کھلے عام کیا جاتا تھا۔ مَیں پچھلے کئی دنوں سے دیکھ رہا تھا کہ یہاں شراب صرف دو طبقوں کے لیے حلال تھی، ایک اِن چماروں کے لیے جو مذہباً عیسائی تھے اور دوئم اشراف کے مسلمانوں کے لیے۔ مڈل کلاس یا غریب مسلمانوں کی شریعت میں یہ شربت سراسر نجاست تھا اور اِس کے استعمال پر سخت سزا تھی۔

میرے کمرے میں ایک چارپائی پڑی تھی۔ اُسی کے ساتھ ایک غسل خانہ تھا۔ غسل خانے کا سائز بھی کم و بیش کمرے ہی کا تھا۔ یہ کمرہ دراصل اصلی کوارٹر کے ساتھ ایک ناجائز قسم کا اضافہ تھا۔ یہ اضافہ کم و بیش ہر ایک نے کر رکھا تھا۔ سامنے کے لان میں سے ایک تھوڑی سی جگہ نکال کر تمام لوگوں نے اِس طرح کے کمرے بنا رکھے تھے جن پر ٹین کی چھتیں تھیں اور چھ انچ موٹی دیواریں تھیں۔ یہ دن ستمبر کے تھے۔ بارشیں زیادہ تھیں اور بے تحاشہ پانی برسا رہی تھیں۔ اِس کمرے کا فرش اینٹوں پر پلستر کیا گیا

تھا۔ دروازہ یوں تو لکڑی کا تھا مگر کافی حد تک ٹوٹا ہوا تھا اور کئی بار تالا توڑ کر نیا لگانے سے خستہ ہو چکا تھا۔ یہ چھوٹی سی آبادی اور اِس میں رہتے ہوئے لوئر گریڈ کلرک لوگ ایک دوسرے سے زیادہ اجنبی تو نہیں تھے مگر اُن کے تعلقات بھی رسمی سے تھے۔ پاس ہی ایک مسجد تھی۔ ایک دوسرے سے مسجد کے اوقات میں ہی ملتے تھے اور مل کر عموماً تنخواہوں میں اضافے اور ٹی اے ڈی اے یا آنریریم پر باتیں کرتے تھے۔ اِن باتوں کے علاوہ اُن کے پاس کوئی موضوع نہیں تھا۔ میرا اِس مسجد سے بس اتنا ہی سروکار تھا کہ کبھی کبھار آتے جاتے نظر فطری طور پر اس کے اُونچے مینار پر پڑتی تھی۔ مسجد کے نمازی وہی کالونی کے کلرک تھے۔ عین اذان کے وقت مشینی انداز سے سروں پر ٹوپیاں جمائے، شلواریں یا پاجامے ٹخنوں سے اُوپر اڑستے ہوئے اندر جا رہے ہوتے یا باہر آ رہے ہوتے۔ یہ سب میرے دُکھ سے اجنبی اپنے ثواب اور معاش کے بکھیڑوں میں اُلجھے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی اِن کے اِس عمل سے عجیب طرح کی گھن آتی تھی مگر اُس کی بے مزگی مجھ تک ہی محدود رہتی۔ اِن کلرکوں کو تلخی کا احساس کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ مجھ سے اور مَیں اُن سے اِس حد تک لاتعلق تھے جیسے ایک دوسرے کے لیے ہمارا وجود ہی نہ ہو۔ حتیٰ کہ جس کمرے میں رہ رہا تھا اُس کا مالک بھی اُنھی کی طرح سے لاتعلق تھا۔ وہ مجھے ایک مشین تصور کرتا تھا جس سے مہینے بعد پیسے نکال کر لاتعلق ہو جاتا تھا۔

مجھے یہاں منتقل کرنے میں ہسپتال کے ایک چپڑاسی کو دخل تھا۔ اُس کا نام یوحنا مسیح تھا۔ اُس کے ساتھ میرے تعلقات نہ صرف دوستانہ ہو گئے تھے بلکہ وہ مجھ سے بہت ہمدردی رکھنے لگا تھا۔ اُس کی دو وجوہات تھیں۔ وہ مسلسل ایسے ڈائجسٹ کا مطالعہ کرتا رہا تھا جس میں جاسوسی کہانیاں چھپتی تھیں اور اُسے معلوم تھا کہ مَیں ایک ادیب ہوں اور کہانیاں لکھتا ہوں۔ پچھلے آٹھ نو ماہ سے اُسے میرے گرتے ہوئے حالات کا اندازہ ہو گیا تھا۔ پہلے پہل وہ مجھ سے پانچ دس روپے خدمت کے وصول کر لیتا تھا مگر اب وہ مخلص دوست کی طرح تمام خدمات مفت بجا لاتا تھا۔ اُس کا اپنا مکان کچی آبادی میں ہی تھا اور اس بستی کی ہر اونچ نیچ سے واقف تھا۔

یوحنا میرے حالات کے پیشِ نظر ایک دن کہنے لگا، ضامن صاحب اگر آپ بُرا نہ سمجھیں تو مَیں آپ کو ایک کام دلا سکتا ہوں۔ اُس سے آپ کا روزانہ کا خرچ نکل آئے گا اور کام پر زیادہ غور کرنے کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی۔ مَیں حیران ہوا وہ مجھے کیسے کوئی کام دلا سکتا ہے؟ خیر میں نے اُس سے ہاں بھر لی۔ پبلشر سے اپنے مسودے کے پیسے نکلوانے کی ناکامی کے بعد مجھے شدت سے یہ احساس ہو چکا تھا کہ میں ایسا ادیب ہرگز نہیں ہوں جسے سوسائٹی کے عام افراد سے برتر تصور کیا جائے، حتیٰ کہ اشرافیہ کی گندگی صاف کرنے والے اُس بھنگی سے زیادہ اہم نہیں جو اُن کے بوٹ لیگر کے طور پر کام آتا ہے۔ چنانچہ میں یوحنا کے ساتھ کسی بھی کام پر جانے کو تیار تھا۔ وہ مجھے ستارہ مارکیٹ کے ایک دکاندار کے پاس لے گیا۔ وہ ایک مولوی نما آدمی بیٹھا تھا۔ اِسے مَیں کئی بار اُسی مسجد میں آتے جاتے دیکھ چکا تھا۔ اس کا پیٹ بڑھا ہوا تھا اور چھوٹی داڑھی تھی، عمر پچاس سے اُوپر تھی۔ سر پر پشتو ٹائپ ٹوپی تھی۔ یہ ٹوپیاں نئی نئی نکلی تھیں اور حال ہی میں ہر نمازی کے سر پر دیکھی جانے لگی تھیں۔ یہ جہاں بیٹھا تھا، وہ سامنے سے چھوٹی سی بک شاپ تھی مگر اِس کی سائیڈ پر ایک کافی بڑا کمرہ تھا۔ دکان کے کاؤنٹر پر بیس پچیس سال کا لڑکا بیٹھا تھا۔ اُس نے بھی ہلکی اور چھدری داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ ایک لڑکا اُس کے ساتھ مزید تھا۔ یہ عمر میں پندرہ سولہ سال ہی کا تھا مگر کافی ہشیار نظر آ رہا تھا۔ دکان پر گاہکوں کا کافی ہجوم تھا اور یہ گاہک سکول اور کالج کے لڑکے تھے۔ گاہ گاہ عورتیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ دکان کے سامنے اور کاؤنٹر کے آس پاس تو سٹیشنری اور سکول کی چھوٹی موٹی کتابیں تھیں مگر پہلو کے کمرے میں شیلفوں کے اُوپر تک کاپیوں اور رجسٹروں اور سکول کی بڑی کتابوں کا ایک جنگل آباد تھا۔ دکاندار جس کا نام سیف اللہ تھا، نہایت سکون سے ایک بڑی کرسی پر قریباً لیٹا ہوا تھا۔ اُس کے سامنے ایک چھوٹی سی ٹیبل تھی۔ ٹیبل پر لکھنے پڑھنے کی کوئی شے نہیں تھی بلکہ چائے اور روٹی یا اِسی طرح کی چھوٹی موٹی ضروریات کے لیے تھی۔ ہم دونوں سیف اللہ سے ہاتھ ملا کر دائیں بائیں کی تپائیوں پر بیٹھ گئے۔ میری حالت کچھ ایسی نہیں تھی جس سے میرا ادیب ہونا ثابت ہوتا۔ اُس نے گویا حقارت سے میری طرف دیکھا، پھر یوحنا کو دیکھا، جیسے کہہ رہا ہو، کس گداگر کو پکڑ کر لے آئے ہو؟ اِس کے تو اپنے دماغی حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ یوحنا دکاندار کی ذہنی کیفیت کو بھانپ گیا اور جلد بولنا شروع کر دیا۔

شیخ صاحب، آپ فکر نہ کریں، یہ بہت بڑا ادیب ہے، خدا قسم ایسا لکھتا ہے کہ جان نکال دیتا ہے۔ اپنے قلم کا جواب نہیں رکھتا، آپ ایک بار مجھ پر یقین کر کے دیکھو۔ اِن دِنوں ذرا مصیبت میں ہے

ورنہ لاکھوں میں کھیلتا تھا۔ آپ کو تو پتا ہے کینسر جیسی بیماری ملکہ کو لگ جائے تو بادشاہ کے گھر میں جھاڑو پھر جاتی ہے، یہ تو پھر ایک عام بندہ ہے۔

وہ تو ٹھیک ہے، مگر یہ لکھ لے گا؟ شیخ سیف اللہ نے بڑی بے یقینی سے گویا یوحنا پر لعنت بھیجنا چاہی۔ پھر اِس سے پہلے کہ یوحنا کوئی جلد بازی میں بات بگاڑ دیتا میں نے اُس کے تذبذب کو ختم کر دینا مناسب سمجھا اور یوحنا سے پہلے بولا، شیخ صاحب مجھے یہ تو نہیں پتا آپ کو کس طرح کا ادیب چاہیے، مگر ایک بار میرا کام دیکھ لینے میں کیا حرج ہے؟ آپ کو پتا چلے گا، مَیں کیسے قلم دل پر چلاتا ہوں۔

لیکن کیا یوحنا نے آپ کو یہ بھی بتا دیا ہے، لکھنا کیا ہے؟

سب بتا دیا ہے، آپ فکر نہ کریں، مجھے اپنی موت کا پروانہ بھی لکھنا پڑا تو لکھوں گا۔

اب شیخ کے چہرے پر تھوڑی سی ہنسی نمودار ہوئی۔ اُس نے اپنی ٹوپی درست کی اور بولا، ہمیں میاں موت کے پروانے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں تو اپنی مطلب کی شے لکھوانے کی ضرورت ہے۔ ہم نے جو کچھ لکھوانا ہے، وہ آپ کو بتا دیتے ہیں، بلکہ سمجھا دیتے ہیں۔ یہ ایسا مشکل کام بھی نہیں ہے لیکن آسان بھی نہیں ہے۔

آسان ہے بہت آسان ہے شیخ صاحب، اِن کے لیے بہت زیادہ آسان ہے، مَیں نے ان کے کچھ افسانے پڑھے ہیں، آپ اِنھیں بس کام دے دیجیے۔ یوحنا ایک دم اضطراب سے چیخ پڑا۔

ٹھیک ہے تم کہتے ہو تو دے دیتے ہیں، شیخ صاحب نے ایسی رعونت سے کہا جیسے ایک مِل مالک یا انٹرنیشنل بزنس مین کہتا ہے۔ تو آپ پہلی اسٹوری کب تک لکھیں گے؟

جب تک آپ کہیں گے، لکھ دوں گا لیکن مجھے پتا تو چلے کیا لکھنا ہے اور پیسے کیا دیں گے؟

پیسے بھی آپ کو ملیں گے لیکن سٹوری لکھنے کے بعد، شیخ سیف اللہ مکمل کاروباری انداز میں بولا۔

شیخ صاحب آپ اِن کو پانچ سو روپے ایڈوانس دے دو، میری ضمانت پر دے دو، یوحنا نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

اگر بھاگ گیا تو؟

تو مَیں ہوں نا آپ کے پاس۔

ٹھیک ہے، آپ کی بات مان لیتا ہوں، لیکن دیکھو سٹوری پوری ہائی لیول ہونی چاہیے۔ یہ کاروباری مسئلہ ہے، اگر بچے ایک بار چھوٹے درجے کے کام میں پیسے ضائع کر دیں تو دوبارہ نہیں

آتے۔ دوسری دکان کا رُخ کر لیتے ہیں۔ پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔

آپ فکر ہی نہ کریں، آپ مجھے مضمون بتائیں کرنا کیا ہے؟

یوحنا نے پہلے نہیں بتایا؟

بتایا ہے، لیکن ابھی کھل کے بتا دوں گا۔ یوحنا نے مجھے آنکھ ماری۔

اچھا کوئی بات نہیں یہ لو، یہ پڑھ لو۔ اِسے دیکھ کر اندازہ ہو جائے گا آپ کو کیا لکھنا ہے۔ اِس سے کم درجے کا کم از کم نہ ہو۔

شیخ سیف اللہ نے ایک چھوٹا سا رسالہ آگے بڑھایا۔ مَیں نے رسالہ اُس کے ہاتھ سے لے لیا۔ یہ ایک ساٹھ ستر صفحے کا چھوٹے سائز کا رسالہ تھا۔ اُس کے ماتھے پر کھیل تماشا عنوان سیاہ رنگ میں درج تھا۔ صفحہ اخباری سے کچھ ہی اُوپر تھا اور جلد یا کارڈ کی بجائے عام کاغذ ہی کا سرِ ورق تھا۔ غالباً یہ وہی رسالہ تھا جو مَیں نے دس دن پہلے اپنے پڑوسی کے چھوٹے لڑکے کے پاس دیکھا تھا۔ وہ جھاڑیوں میں بیٹھا اِسے پڑھ رہا تھا اور مجھے دیکھتے ہی اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ دوسرے بھی کئی لڑکے اِسی طرح کے رسالے پڑھتے پھرتے تھے۔ اِنھیں پڑھتا دیکھ کر مَیں خوش تھا کہ چلو اِس مُلک میں کتاب کا کلچر تو چل نکلا ہے۔ رسالہ دینے کے بعد اُس نے اپنا ایک رجسٹر نکالا جو دائیں طرف کی الماری میں پڑا تھا۔ رجسٹر میں کئی نام درج تھے، جن کے آگے اُن کی کتابیں اور پیسے لکھے ہوئے تھے۔ ان میں سے کچھ نام تو کافی مشہور تھے اور مَیں اُنھیں خوب جانتا تھا۔ گویا وہ سب اِس دکاندار کے گاہک تھے یعنی اِسے لکھ کر دیتے تھے۔ بچوں کا ادب لکھنا بُری بات نہیں تھی بلکہ احسن کام تھا لیکن آج تک اِن میں سے کسی نے مجھے نہیں بتایا تھا کہ وہ بچوں کے لیے رسالے یعنی کہانیاں اور ناولٹ لکھتا ہے۔ تھوڑی بہت جاسوسی تو ہر سنجیدہ ناول میں بھی ہوتی ہے اور بچوں کو بھی جاسوسی کی چیزیں پسند ہیں تو اِس میں پھر چھپانے والی کیا بات تھی؟ وہ نہیں چاہتے تھے کہ میرا بھی دھندا چلے۔ شیخ سیف اللہ نے ایک صفحے پر میرا نام بھی لکھا اور شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی کر کے اُس میں چپکا دی۔ آگے ایک خانہ رقم کا تھا، اُس میں پانچ سو روپے ایڈوانس لکھ دیا اور مجھ سے اُس پر دستخط لے لیے۔ دستخط کے بعد اُس نے مجھے گن کر چار سو روپے دیے۔

یہ چار سو روپے ایڈوانس ہے، باقی ایک چھ سو روپے اور دوں گا مگر وہ اُس وقت دوں گا، جب آپ مجھے رسالہ لا کر دے دیں گے۔

مگر یہ تو چار سو روپے ہیں اور سائن مجھ سے پانچ سو روپے پر لیے ہیں، مَیں نے احتجاج کیا۔

پریشان نہ ہوں، ناول مکمل کر کے لاؤ گے تو وہ چھ سو روپیہ پورا دے دوں گا، کب تک لاؤ گے؟
دو دن بعد لے لینا، مَیں نے ایک طمانیت سے جواب دے دیا۔
چلیں ٹھیک ہو گیا۔ اگر آپ نے یہ کام ٹھیک کیا تو آپ کو اور بھی کام دوں گا اور پیسے بھی زیادہ دوں گا۔ باقی بات یوحنا آپ کو سمجھا دے گا۔

مَیں وہ ناولٹ اور پیسے لے کر یوحنا کے ساتھ اُس کے گھر کچی آبادی میں آ گیا۔ یہ تیسرے چوتھے درجے کا ایک چھوٹا سا مکان تھا اور نالے کے عین کنارے پر ہونے کی وجہ سے مچھروں نے یہاں ایک جنگل آباد کر رکھا تھا مگر یوحنا نے ہسپتال سے طرح طرح کی دوائیاں جمع کر کے مچھروں کے ناک میں دم کیا ہوا تھا۔ یہ پوری عیسائیوں کی کالونی ایک طرح سے اپنی ایک دنیا تھی۔ کچّے پکّے گرجا گھر سے لے کر سستے قسم کے شراب خانے موجود تھے۔ چھوٹے بڑے ایسے بے فکری کے ساتھ نالے کے کنارے خوش باش تھے کہ ایف سکس تھری والے کیا ہوں گے۔ یوحنا کے گھر کے دو چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ اُن میں سے ایک کمرہ اُس نے اپنے بال بچوں اور بیوی کے لیے رکھا تھا اور دوسرے میں خود لوئر مڈل کلاس مسلمان یار باشوں کو سستی شراب پلا کر اُن سے پیسے اینٹھتا تھا۔ اسی کمرے میں سستی قسم کی مگر سڈول عیسائی لڑکیاں بھی پیش کرتا تھا جب اِن کچی آبادیوں میں وافر اور بہت شہوت انگیز تھیں۔

کمرے میں آنے کے بعد یوحنا نے مجھے کہا، ضامن صاحب، آپ بڑے ادیب ہیں بس اب اس کام کو جانے نہ دیجیے گا۔ ایک سے بڑھ کر ایک سنسنی خیز ناول لکھیے اور دیکھیے گا مہینوں میں آپ ہزاروں میں کھیلنے لگ جائیں گے، یہ مال بہت بکتا ہے۔ آپ ایسا کرو، اِسے بیٹھ کر پڑھو، اِتنے میں مَیں اچھی سی چائے بنا لوں۔ کمرے کے در و دیوار سینکڑوں پوسٹرز اور مسیح کی تصاویر سے سجے تھے مگر یہ اپنے پھٹے ہوئے پوسٹر، گھسا ہوا کارپٹ اور اِدھر اُدھر کی دیواروں اور فرش کی کالک کے نشان کمرے میں ایک کراہت پیدا کر دینے والی کیفیت سے دو چار کر رہے تھے۔ مَیں یہ بتانا شاید بھول گیا ہوں کہ یوحنا کی بیوی مستقل طور پر شیزا کی خبر گیری پر لگ گئی تھی۔ مَیں اُس کے اُسے پیسے دیتا تھا لیکن وہ پیسوں سے زیادہ شیزا سے مانوس ہو گئی تھی۔ شیزا ابھی میری غیر موجودگی میں اُسی سے مطمئن رہتی تھی۔ اِس وقت بھی وہ شیزا کے پاس اُس کے کمرے میں تھی اور مجھے وہاں سے نکلے دو گھنٹے ہی ہوئے تھے۔ ویسے بھی یہ جگہ ہسپتال سے زیادہ دُور نہیں تھی۔

اب یوحنا چائے بنانے لگا اور میں نے اُس ناولٹ کا مطالعہ شروع کر دیا۔ ابھی دو تین صفحے ہی پڑھے تھے کہ میرا سر گھومنے لگا۔ اوہ میرے خدایا، یہ کیا لکھا ہوا ہے؟ یہ تو ایک ہولناک قسم کی ٹرپل ایکس سٹوری تھی اور ایک لڑکا اپنے دوست کے ساتھ مل کر اپنی بہن کے ساتھ سیکس کرنے چلا تھا۔ میرا سر چکرانے لگا۔ یہ چھوٹے چھوٹے صفحات تھے۔ مَیں چند منٹوں میں بیس پچیس صفحات پڑھ گیا اور بالکل سکتے کی حالت میں آ گیا۔ نہایت کریہہ اور واہیات قسم کی یہ کتاب تو واقعی ایک گھناؤنا جرم تھا۔ تو یہ بڑھا بک شاپ کے پردے میں یہ دھندا کھولے بیٹھا تھا۔ اِس سٹوری میں دوست کے ساتھ مل کر اپنی ہی بہن کے ساتھ سیکس کا معاملہ دکھایا جا رہا تھا اور جذبات کو نہایت انگیخت کرنے والے جملوں سے سٹوری کو بُری طرح سے اخلاقیات کے نچلے ترین درجے تک گرا دیا گیا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ کتابیں جنھیں مَیں بچوں کو پڑھتا دیکھتا تھا اور خوش ہوتا تھا، کتنا بڑا ناسور تھا۔ یہ بچے تو بالکل برباد ہو رہے تھے جب وہ ایسی کہانیاں پڑھ لیں گے تو گھر میں ماں، بہن سے لے کر اپنی عزت تک کے لیے کس طرح کے بھیڑیے بن کر نکلیں گے؟ یہ لٹریچر اُنھیں اول درجے کا ذہنی اور جنسی مریض بنا دے گا۔ اُن بچوں کی اصل لٹریچر سے بیگانگی اور بے زاری پیدا کرنے میں معاون ہوگا۔ مَیں کئی دِنوں سے بلکہ جب سے یہاں آیا تھا، ہر بچے کے ہاتھ میں اِسی طرح کا رسالہ دیکھ رہا تھا۔ مَیں خود بھی رسالے اور ڈائجسٹ پڑھتا تھا، مگر وہ جاسوسی کہانیاں ہوتے تھے اور کیسے عمدہ ادب اور جاسوسی کی ملی جلی کیفیت کو لے کر چلتے تھے مگر یہ محض شہوت دلانے والے بے کار رسالے، جنھیں پڑھ کر مشت زنی اور بدفعلی کے علاوہ کچھ نہیں سوجھ سکتا تھا، ایک بہت بڑا جرم تھا جو بچوں کے ساتھ روا رکھا گیا تھا۔ یوحنا چائے لے کر آ گیا تھا۔ مَیں اِتنے میں چالیس صفحات ختم کر چکا تھا۔ سٹوری میں فقط جذبات بھڑکانے والے اور بے عزت کر دینے والے جملے اِس قدر تھے کہ اُن کی تکرار سے میرا جی اوبنے لگا۔ یہ کتاب دوطرفہ سیکس کی کہانی تھی۔ مَیں نے زندگی میں ایسی کہانیاں کبھی نہیں پڑھی تھیں۔ یوں تو الف لیلہ اور طلسم ہوشربا میں بہت سے ایسے مناظر دکھائے جاتے تھے جن میں پردہ بکارت بار بار پھٹتا تھا مگر وہ صرف ہیرو کے حصے میں آتی تھیں اور جملے محض پردہ بکارت تک ہی رہتے تھے مگر یہاں تو فقط یہی کچھ تھا اور بہت بُرے طریقے سے تھا۔ اُس مولوی کا کہنا کہ یہ اُن سب میں بہترین اسٹوری ہے اور مجھے اِس سے آگے جانا ہے تو خدا جانے وہ کیا ذلالت کی منزل تھی جہاں مَیں نے جانا تھا۔ اِس سے بڑھ کر یہ بات کہ اِن کے لکھنے والے نامی گرامی مصنف ہی نہیں بلکہ ٹی وی کے اکثر ڈراما نگار بھی تھے اور ہزاروں کما رہے تھے۔

کیسی ہے؟ یوحنا چائے رکھ کر ایک طرف بیٹھتے ہوئے بولا،

آپ نے یہ پڑھ رکھی ہیں؟ مَیں نے وہ رسالہ نما چیتھڑا ایک طرف پھینک کر پوچھا۔

ہاں یار، بہت مزے کی ہیں۔ یہاں اردگرد کے سب بچے یہی پڑھ رہے ہیں۔ ایک دن ایک بچے سے چھین کر مَیں نے بھی پڑھ لی۔ وہ نالے کے پار سیدھا پلاٹ کے آخر میں جو کنواں نظر آ رہا ہے، اُس کی دیوار میں اُگے ہوئے پیپل کے پیچھے ایک سکول کا لڑکا یہ پڑھ رہا تھا اور مُشت زنی کر رہا تھا۔ میری اُس پر نظر پڑ گئی، مَیں نے جا پکڑا۔ وہ سکول سے بھاگا ہوا وہاں بیٹھا تھا۔ مَیں نے اُسے دبوچ لیا، کہا سالے کتاب پڑھتے ہوئے یہ کیا کر رہا ہے اور اُس کے ہاتھ سے یہ چھین لی اور اُس کے کانوں پر چار لگائیں اور بھگا دیا۔ یہاں آ کر جب پڑھنا شروع کی تو بہت ہیجان خیز نکلی۔ دوسرے دن مَیں نے اُسے پھر پکڑ لیا، کہا بتاؤ کہاں سے لی ہے؟ اُس نے یہ دکان بتائی۔ تب مَیں نے بھی اِس سے خرید کر پڑھنا شروع کر دیں۔ رفتہ رفتہ یہ میرا واقف بن گیا۔ پھر مجھے آپ کا خیال آ گیا کہ بھوکے پھرتے ہو، در در کے دھکے کھاتے ہو، چلو یہی کچھ لکھ کر روٹی کما کھاؤ۔ شیزا کا تھوڑا بہت علاج بھی ہوتا رہے گا۔

اچھا... مَیں نے اُس کی طرف نہایت زہر آلود نظروں سے دیکھا۔ تم اِن کو اسٹوریاں کہتے ہو۔ اِنھیں لکھنے کا تجربہ ایسے کسی شخص کے پاس نہیں جو پورے تخیل میں پہلے اپنے خاندان کو اس میں نہ لپیٹ لے۔ اِس طرح کا ادب لکھنے سے میری معذرت ہے۔ مَیں اپنے گھر کو اِس میں شامل نہیں کر سکتا۔

کون سا گھر؟ یوحنا حیرانی سے بولا۔

وہی جسے میں کہانی لکھتے وقت اپنے دماغ میں مسلسل فرض کر لوں گا اور ایک دن وہی فرض کیا ہوا مجھے حقیقت لگے گا۔ تب تک میرے ذہن کی کایا کلپ ہو چکی ہوگی۔

لیکن آپ نے تو صرف لکھنا ہے۔ پہلے جو کچھ لکھتے ہو، وہ کیا آپ کے گھر کی کہانیاں ہوتی ہیں؟

یقیناً گھر کی کہانیاں نہیں ہوتیں مگر وہ کہانیاں اِس قدر بیہودہ نہیں کہ اُنھیں اپنے گھر کی کہانیاں فرض نہ کر سکوں۔ شکریہ جناب، یہ کام مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ مَیں نے دوٹوک کہا اور یوحنا کی چائے کی چُسکیاں لینے لگا۔

دیکھو ایسا نہ کرو، آپ کون سا اپنا نام اُن پر لکھیں گے؟ کتنے ہی لوگ اِس طرح کی کہانیاں لکھ کر پیسے کما رہے ہیں۔ جب اُنھیں کوئی فرق نہیں پڑا تو آپ کو کیا پڑے گا؟

مجھے ذہنی طور پر فرق پڑے گا، مَیں نے جواب دیا، باقی ہم سب ایک ہی طبقے سے تعلق رکھتے

ہوئے بہت کچھ ایک دوسرے سے مختلف کر رہے ہوتے ہیں۔ کوئی لکھ رہا ہے تو لکھے، مَیں نہیں لکھ سکتا۔ مَیں ایسی کہانی کے ساتھ انصاف نہیں کر پاؤں گا۔ جو بھی لکھوں گا، وہ بالکل پھسڈی ہوگی۔

اور جو اُن سے ایڈوانس پیسے لیے ہیں؟ وہ تشویش سے کہنے لگا۔

جہاں ہم نے اتنے سارے لوگوں کا اُدھار دینا ہے، وہیں اِسے بھی اُن میں شامل کر لو۔ مَیں نے کہا۔

یہ بات تو عین اخلاقی ہے؟ ہے نا؟ یوحنا نے مجھے طنزیہ کہا۔

مَیں یوحنا کی اِس بات کا کوئی جواب نہ دے سکا اور منہ دوسری طرف کر کے بیٹھ گیا۔

مجھے خموشی سے بیٹھے دیکھ کر یوحنا دیوار کے ساتھ جا کر لیٹ گیا۔ وہ شاید سوچنے لگا کہ یہ آدمی تو ایک قسم کا مجھ پر بوجھ بن گیا ہے۔ تھوڑی دیر اسی طرح خموشی چھائی رہی اور نہایت بیزار کُن کیفیت پیدا ہوگئی۔ کچھ لمحوں بعد چائے ختم ہوگئی۔ مَیں اُٹھ کر یوحنا کے پاس جا بیٹھا اور نہایت ملائمت سے بولا، دیکھو یوحنا، ایک بات میری غصہ کیے بغیر سُن لو۔ اُس کے بعد جو جی میں آئے وہی کرنا۔ وہ اُسی طرح خموش لیٹا رہا۔ مَیں نے بات کرنا شروع کر دی۔ یوحنا مجھے نہیں معلوم تمھاری کوئی بہن ہے؟ مَیں نہیں جانتا تمھاری ماں زندہ ہے یا گزر گئی ہے؟ مَیں یہ بھی نہیں جانتا تمھیں اِن رشتوں سے کچھ دلچسپی ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو کس قسم کی ہے اور کتنی ہے؟ مَیں تمھارے مزاج اور تمھاری اخلاقیات کے بارے میں کچھ نہیں جانتا، نہ جاننا چاہتا ہوں لیکن تم سے یہ ضرور عرض کروں گا کہ اِن رشتوں کے بارے میں مَیں اس قدر بے نیاز نہیں ہوں، جتنا تم خیال کر رہے ہوگے۔ ٹھیک ہے میری بہن اپنی مرضی سے کسی سے شادی کرتی ہے، یا کسی کے ساتھ بھاگ جاتی ہے تو شاید مَیں اِس امر میں بے نیاز ہو جاؤں۔ مَیں اُسے اُس کے حال میں چھوڑ دوں جیسے خود اپنے آپ کو ایسے کسی غیر اخلاقی معاملے میں چھوڑ دیتا ہوں۔ مَیں یہ بھی نہیں جانتا، میری ماں کا ماضی یا حال کیسی اخلاقیات کا پابند رہا ہے۔ وہ کن جرائم یا پاکیزگی کے تحت اپنی زندگی گزار رہی ہے مگر میرے لیے مناسب نہیں کہ مَیں اُنھیں اپنے ذہن میں رکھ کر اس طرح کی غلیظ زبان استعمال کروں جو اِن رسالوں میں برتی گئی ہے۔ تم شاید اِس بات سے واقف نہیں اِنسان شکلوں کے توسط سے سوچتا ہے۔ جب میں بہن یا ماں کا لفظ سیکس میں استعمال کروں گا تو میرے ذہن کے پردے میں اپنی ہی ماں یا بہن کی تصویر بنے گی کیونکہ مَیں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے ماں کا لفظ میرے لیے لفظ نہیں ایک امیج بن چکا ہے۔ چنانچہ کسی دوسری تصویر کو ذہن میں نہیں برت سکتا۔ دوسری طرف

میری ماں یا بہن اِس تمام غلاظت سے بے خبر میری حرامزدگی کا شکار ہو رہی ہوں گی اور وہ ایسے خیانت کار بیٹے کو ویسے ہی اپنی دعاؤں میں یاد رکھتی ہو گی جیسے ایک ماں رکھتی ہے۔ مَیں کسی صورت بھی نہیں چاہوں گا کہ مَیں اپنی ماں کی دعاؤں کے ساتھ خیانت کروں۔ اُس کی اُس پاکیزہ سوچ کے ساتھ بد دیانتی کروں جس نے ہر بار امام ضامن باندھ کر مجھے گھر سے رخصت کیا ہے اور جب تک نظر سے اوجھل نہیں ہوتا میری طرف مطہر پھونکیں بھیجتی رہتی ہے۔ مَیں کوئی مصلح نہیں، نہ مجھے کسی کی عاقبت اور مستقبل کی پریشانی لاحق ہے۔ نہ مَیں ایسے کسی حرام حلال اور جنسیاتی رویوں کے بارے میں سماجی اور معاشرتی تصورات رکھتا ہوں۔ شاید یہ سب کچھ مختلف معاشروں کے مختلف ٹیبوز ہوں۔ اُن کے اپنے بنائے ہوئے مذہبی دائرے ہوں۔ مجھے نہ اپنی کسی قوم کا درد مارا جاتا ہے، نہ مجھے ابھی اپنے درددوں اور دکھوں سے فرصت ہے کہ کسی کے درد پر توجہ دوں۔ مجھے اِس بات سے بھی کوئی غرض نہیں کہ کسی کے بچوں کی اخلاقیات تباہ ہو رہی ہے۔ مجھے نہ اِس کام کا کوئی فنڈ ملتا ہے اور نہ میرا یہ فرض ہے۔ ہو سکتا ہے، کوئی این جی او مجھے بھاری تنخواہ پر بچوں کے اخلاق سنوارنے کا منصب دے دے، تب مَیں شاید تمھیں بھی اخلاقی بھاشن اور اپنے مستقبل کے معماروں کے بارے میں وعظ و نصیحت کروں مگر مَیں اِس وقت ایسی کسی بھی اخلاقیات کا قائل نہیں ہوں۔ اِس سب کے باوجود مَیں یہ کام نہیں کر سکتا بلکہ مجھ سے یہ کام ہو نہیں پائے گا۔ مَیں اپنا اور اِن بچوں کا محض وقت ضائع کروں گا جو انھیں پڑھ کر جنسی تلذذ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

مگر یہ پیسے جو ہم کھا چکے ہیں، اُسے کیسے واپس کریں گے؟ دوسری چیز اور بتا دوں، اِن کچی آبادیوں میں اس طرح کے فلسفے چوتڑوں کی ہیجان خیز بُو میں بہہ جاتے ہیں۔ یہاں جو لوگ سیکس کرنے آتے ہیں، کبھی سیکس کے دوران اُن کی گالیوں بھری باتیں سُن لو تو ماں بہن کے لفظ سے ہی کراہت آنے لگے۔ میری بات تحمل سے سننے کے بعد یوحنا اب تھوڑا سا نرم ہو چکا تھا مگر قائل نہ ہوا۔

یہ کوئی زیادہ رقم نہیں ہے۔ کسی وقت اتنے پیسوں سے ہم دوستوں کو آئس کریم کھلا دیتے تھے۔ کبھی ہماری جیب میں اتنی یافت ہوئی تو ٹھیک ورنہ اِس طرح کے ایڈوانس کو ہضم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، مَیں نے ہنستے ہوئے یوحنا سے کہا۔

لیکن میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے؟ یوحنا نے کہا۔

کیا؟ مَیں نے پوچھا۔

وہ مَیں تمھیں بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال یہ سمجھو کہ اب ہم نے اُسے یہ رقم واپس نہیں کرنی۔ وہ دُکاندار البتہ میرے اِس گھر سے واقف ہے، ضرور پیسوں کا تقاضا کرے گا اور اُسی کے لیے مَیں پہلے ہی اُس کا بندوبست کر دوں گا۔

بالکل ٹھیک ہوا۔ اب مَیں ایک جگہ ایک کام کے سلسلے میں جا رہا ہوں۔ میرا خیال ہے شام تک آؤں گا۔ تم اِن کو دو چار دن ٹرخاؤ، اُس کے بعد دیکھیں گے لیکن کوئی ایسی حرکت نہ کرنا جس سے ہمیں ایک اور ٹینشن آن لگے۔ یہ کہہ کر مَیں نے یوحنا سے ہاتھ ملا لیا اور باہر نکل گیا۔

(۷۳)

سیف اللہ سے ایڈوانس لیے تین دن ہو چکے تھے۔ مجھے کل یوحنا نے بتایا تھا کہ سیف اللہ اُسے دھمکا رہا تھا اور کہہ رہا تھا دو دن کا وعدہ کرنے کے بعد اُنھیں ناولٹ ابھی تک کیوں نہیں ملا؟ دوسری طرف ثیزا کا علاج اب ان چھوٹے موٹے کاموں سے ممکن نہیں تھا چنانچہ مَیں نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ ایک بار پھر والدہ سے عدیلہ والے سونے کو حاصل کرنے کی کوشش کروں گا اور اِس بار کچھ بھی ہو جائے وہ سونا اُن سے لے کر رہوں گا۔ اگر اِس حالت میں خدا کا عذاب آتا ہے تو آ جائے۔ مَیں تھوڑی دیر پہلے ہسپتال سے یہ کہہ کر لوٹا تھا کہ رات کو واپس آ جاؤں گا۔ یہاں آ کر چند منٹ بیٹھنے کے بعد مجھے قرار نہیں آیا اور مَیں اُٹھ کر دوبارہ نکل کھڑا ہوا۔

شام کا دھندلکا چھا چکا تھا، مَیں کمرے سے نکل کر ایک تنگ پگڈنڈی سے ہو کر ٹیلے نما اونچائی پر چڑھنے لگا۔ یہ پگڈنڈی سیدھی مشرقی جانب مارکیٹ کی طرف جاتی تھی۔ پگڈنڈی کے دونوں جانب کنیر کے پودوں کی بڑی بڑی جھاڑیاں تھیں۔ اُن کے پھول اِس موسم میں بہت بھلے لگتے تھے۔ جھاڑیاں اتنی گھنی اور سیاہ تھیں کہ ایک جنگل سا بن جاتا تھا۔ درمیان میں پگڈنڈی کے بیچ رستہ بہت تنگ اور گھٹا ہوا تھا۔ مَیں اِسی رستے پر جا رہا تھا۔ شام ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی مگر اندھیرا اِس قدر ضرور بڑھ گیا تھا کہ کوئی چیز صاف نظر نہیں آ رہی تھی۔ مَیں جھاڑیوں کے پاس سے گزرتا ہوا اُنھیں چھوتا جا رہا تھا۔ اچانک ایک جگہ جھاڑیوں کے زور زور سے ہلنے کی آواز آنے لگی۔ مَیں ایک دم ڈر کے پیچھے ہٹ گیا اور

دو قدم کے فاصلے پر ہو کر کھڑا ہو گیا۔ کنیر کے پودے مسلسل اور متواتر ہل رہے تھے۔ مجھے خیال ہوا، یہ کوئی بہت بڑا سانپ یا سؤر ہو سکتا ہے۔ شام کی اوٹ میں بڑھتی ہوئی اِس خنک رات میں آس پاس کوئی اور آدمی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ یہ راستہ محض ایک آدمی کے گزرنے کا تھا اور بالکل ویران تھا۔ مَیں تھوڑی دیر کھڑا اُس منظر کو دیکھتا رہا، پھر آہستہ آہستہ دوبارہ آگے کی طرف قدم بڑھا دیے اور عین اُسی جگہ پہنچ گیا جہاں سے پہلے پیچھے ہٹا تھا۔ یہاں کنیر کے پودے اُسی تسلسل سے برابر ہلے جاتے تھے۔ ایک دو لمحے کے لیے رُکے لیکن پھر ہلنے لگتے۔ مَیں نے ہمت کر کے ایک پودے کو تھوڑا سا ہاتھ سے سرکا کر پیچھے ہٹایا۔ پودے کو ہاتھ لگاتے ہی ایک دم وہاں سناٹا چھا گیا۔ جیسے رات کے سکوت میں ایک اور سکوت شامل ہو گیا ہو۔ پھر ایک لمحے کے لیے میرے ہاتھ گویا شل ہو کر رہ گئے۔ کنیر کے پودوں میں دو نوعمر لڑکے میرے سامنے برہنہ لیٹے ہوئے تھے۔ اُن میں سے ایک لڑکا وہی تھا جسے مَیں نے پُرانے ٹیوب ویل کے حوض میں بیٹھے ہوئے کتابچہ پڑھتے دیکھا تھا۔ وہ دونوں سہم گئے اور اسی طرح لیٹے رہے۔ مَیں نے اُن کو وہیں اُسی حالت میں چھوڑا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ میرا دل ایک دم تیز ہو گیا اور سانس کی گردش تھم نہیں رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مَیں نے کیا دیکھا ہے اور اب کہاں جا رہا ہوں۔ جس وقت مَیں کمرے سے باہر نکلا تھا تب ہی گویا خالی الذہن ہو چکا تھا۔ ہوش آیا تو میں جی سیون ستارہ مارکیٹ کے تھانے کے سامنے کھڑا تھا۔ تھانے کا دروازہ کھلا تھا۔ یہ تھانہ مارکیٹ کے عین جنوب مغرب کی طرف ایک کونے پر تھا۔ سامنے ایک اونچا اور ہرا بھرا پیپل کا درخت تھا۔ چند قدم پر بے شمار درختوں کا ایک جنگل تھا۔ یہ جنگل بھی جنگلی شہتوتوں سے بھرا ہوا تھا۔ اسلام آباد میں جگہ جگہ جنگلی شہتوتوں کا جنگل اور اِس میں پھرتے سؤروں کی منطق کافی دیر تک مجھے سمجھ نہیں آئی تھی مگر وقت کے ساتھ یہ معما کھل گیا تھا۔ یہ جنگلی شہتوت جو اصل میں اِس علاقے کا درخت نہیں تھا، جاپان سے ٹنوں کے حساب سے اِس کا بیج منگوا کر ہیلی کاپٹروں کے ذریعے پورے علاقے میں پھینکا گیا تھا تاکہ جلد یہ علاقہ ہرا بھرا ہو جائے۔ یہ درخت یہاں کی بارشوں میں اتنی تیزی سے جوان اور گھنا ہوا کہ جلد پورا علاقہ گنجان جنگل میں بدل گیا۔ اُس کے بعد سؤر یہاں اردگرد سے پہنچ گئے تھے کہ یہاں اُن کے پنپنے کے مواقع بہت تھے۔ مَیں تھانے کے دروازے کے باہر اُس درخت کی اوٹ لے کر چند منٹ کھڑا ہو کر سوچنے لگا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ اِتنے میں ایک سپاہی نے دیکھ لیا اور جلدی سے میری طرف بڑھا۔ سپاہی کے کاندھے پر بندوق تھی لیکن واضح نظر آ رہا تھا کہ وہ بندوق جب سے بنی تھی شاید ہی کسی کے

استعمال میں رہی ہو۔ یہ کاندھے کا وزن جدید دنیا میں انسان نے نجانے کیوں خواہ مخواہ اپنے ذمے بڑھا لیا تھا۔ سپاہی نے نزدیک ہو کر پوچھا ''کیا بات ہے؟ یہاں کیوں گھوم رہے ہو، کوئی کام ہے؟''

سپاہی کا لہجہ اُس کے محکمے کے پیشِ نظر کرخت تھا۔ اُنھیں غالباً ملازمت ملتے ہی اپنے شعبے کی غیر معمولی حیثیت کا احساس ہو جاتا ہے۔ مجھے یہ بات بھی اُن کا معمول لگی۔ مَیں نے لاشعوری طور پر سپاہی کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

جی ہاں مجھے ایک کام ہے، ایک درخواست دینا ہے۔

کس کے خلاف؟ کوئی چوری ہو گئی ہے؟

جی نہیں، بس ایسے ہی ایک اطلاع دینا تھی۔ تھانیدار صاحب ہوں گے؟

اندر آ جاؤ، وہ بھی مل جائیں گے۔

سپاہی آگے چل پڑا۔ اُس کے پیچھے مَیں بھی داخل ہو گیا۔ تھانہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ چار کمرے تھے اور ایک چھوٹی سی حوالات تھی۔ ایک چھوٹا سا صحن تھا۔ صحن میں ایک کالا کلوٹا آدمی ننگا لیٹا ہوا تھا جس کی ٹانگیں ایک سپاہی نے جکڑ رکھی تھیں اور دوسرے نے بازو تھامے ہوئے تھے۔ ایک سپاہی ڈیڑھ فٹ لمبے ٹائر سے اس کے ننگے اور کالے چوتڑوں پر ضربیں لگا رہا تھا۔ وہ آدمی ضرب کی تکلیف سے چیخیں مار رہا تھا اور اُن سے بچنے کی کوشش میں تھا مگر اُس کی یہ کوشش ناکام ثابت ہو رہی تھی کیوں کہ اُس کو جکڑنے والے دونوں سپاہی سانڈوں کی طرح طاقتور تھے۔ مَیں ایک لحظہ ٹھٹک گیا اور اُسے دیکھ کر جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ یہ شخص میرا جانا پہچانا تھا۔

قریب ہی ایک موٹا تازہ آدمی وردی پہنے ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ اُس کے سامنے ایک میز پڑی تھی۔ ایک لڑکا جس کی عمر پندرہ یا سولہ برس ہو گی اور رنگ سانولا تھا، اُس کے پاؤں دبا رہا تھا۔ قریب ایک کالی کرسی رکھی ہوئی تھی۔ اُس نے ایک آنکھ ٹیڑھی کر کے میری طرف دیکھا لیکن خاموش رہا۔ مَیں قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ یہ جگہ دیوار کے ساتھ تھی اور عین دیوار کی بنیاد کے ساتھ ایک چنار کا درخت کھڑا تھا جس کے نیچے یہ تھانیدار بیٹھا پٹنے والے کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ چنار کی ایک شاخ پر بڑا سا بلب لٹکا ہوا تھا۔ اُس کی روشنی پورے صحن کو جگمگا رہی تھی۔ یہ دو ہزار واٹ کا بلب پچھلی طرف سے گزرتی ہوئی تاروں پر سے ڈائریکٹ لیا گیا تھا۔ مَیں نے انتظار کیا کہ وہ مجھے بیٹھنے کا کہے گا مگر تھانیدار نے کوئی توجہ نہ دی اور اُسی طریقے سے بیٹھے ہوئے کہنے لگا۔ جی کیا مسئلہ ہے فرمایئے؟

کیا مَیں بیٹھ سکتا ہوں تا کہ آرام سے بتا سکوں؟ آخر کار مَیں نے خود ہی ڈھیٹ ہو کر اجازت مانگ لی۔

ہاں بیٹھیں۔ اُسی وقت اُس نے چھترول کرنے والے سپاہیوں کی طرف مخاطب کر کے انھیں پٹائی سے روک دیا۔ اُن کے رُکتے ہی تھانے میں ایک دم سناٹے کی سی کیفیت طاری ہوئی۔ جیسے کوئی چپ سی سادھ لی گئی ہو۔

جب ہر طرف سے سکوت ہو گیا تو مَیں نے اپنی بات شروع کی، سر مَیں آپ کے حضور ایک اطلاع دینا چاہتا ہوں۔ یہ نہایت سنجیدہ مسئلہ ہے اور آپ کے تھانے کی حدود میں چل رہا ہے۔

دیکھیں بھائی بجھارتیں سننے کا میرے پاس وقت نہیں۔ مجھے مت سمجھائیں میرے تھانے کی حدود میں کیا چل رہا ہے اور کیا نہیں۔ پہلے ہی اِس چوہڑے نے دماغ خراب کر رکھا ہے۔ حرامی ہمارے صاحب کو دو نمبر شراب سپلائی کر آیا ہے۔ جو بات ہے سیدھی سیدھی بتاؤ۔

ستارہ مارکیٹ میں ایک کتابوں کی دکان پر بچوں کو فحش رسالے بیچے جا رہے ہیں، اُن کی وجہ سے اِس پوری کالونی کے بچوں کی عادتیں خراب ہو چکی ہیں۔ مجھے بھی اُن کے لکھنے کی آفر ہوئی ہے۔

مَیں نے تھانیدار کے حکم کو ضرورت سے زیادہ سنجیدہ لے کر بات اتنی مختصر کر دی کہ اُس کی تمام ہولناکی محض ایک اطلاع تک سمٹ کر رہ گئی۔ اِس کیفیت میں تھانیدار کا تاثر اِتنا معمولی اور غیر سنجیدہ تھا کہ مجھے لگا جیسے مَیں نے تھانیدار کا محض وقت ضائع کیا ہے اور یہ واقعات اُس کے سامنے کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ مَیں اِس تمام صورتِ حال سے پریشان ہو گیا اور جواب سنے بغیر اُٹھ کھڑا ہوا۔ میرا ارادہ ہوا جس قدر جلد ممکن ہو یہاں سے نکل جاؤں۔ اِس جگہ مجھے ایک عجیب سی گھن محسوس ہونے لگی۔ ابھی مَیں اُٹھ کر چلنے ہی لگا تھا کہ تھانیدار کی آواز نے چونکا دیا۔

تو آپ نے اِس تمام علاقے کی اصلاح کا ٹھیکا لے رکھا ہے؟ تھانیدار نے نہایت تلخی سے جواب دیا۔

جناب مَیں تو صرف آپ کو اطلاع دینے آیا ہوں، مَیں نے نہایت عاجزی سے جواب دیا۔

آپ ایسا کریں یہاں اپنا ایڈریس اور نام پتا بتاتے جائیں۔ مَیں دیکھتا ہوں، اِس مارکیٹ میں کون سا کنجر خانہ چل رہا ہے۔ یہ کہہ کر تھانیدار نے ایک سفید رنگ کی پرچی آگے بڑھائی اور ایک پنسل اُس پرچی کے اوپر رکھ دی۔

مَیں نے پنسل پکڑ لی اور جب اُس پر لکھنے لگا تو اچانک میری نظر تھانیدار کی آنکھوں کی طرف اُٹھ گئی۔ مجھے وہاں ایک عجیب سا خبیث رُوح کا منظر محسوس ہوا۔ ایک طرح کی مجرمانہ چمک صاف دکھائی دے رہی تھی۔ مَیں اُس کی آنکھوں سے ڈر گیا۔ پتا لکھتے ہوئے میرے ہاتھ کانپنے لگے۔ مجھے محسوس ہوا تھانیدار کو اِن رسالوں اور اُس کے فروخت کنندگان کے متعلق پہلے سے علم ہے۔ اب یہ قضیہ واپس مجھ پر ہی ڈال دیا جائے گا۔ مَیں نے اُس پرچی پر غلط نام کے ساتھ ایک غلط فلیٹ کا نمبر لکھ دیا اور جلدی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

جیسے ہی چلا تھانیدار نے پھر بلایا۔ جب آپ کو بلایا تو گواہی دینے کے لیے تکلیف دیں گے۔ اس لیے ایک دو دن اپنے فلیٹ سے اِدھر اُدھر نہ ہوں۔

جی بہتر اور اُسی وقت تیز قدم اُٹھاتے ہوئے باہر نکل آیا۔ جیسے ہی تھانے کے گیٹ سے باہر نکلا مَیں نے کھل کر ایک سانس لی اور اطمینان کا اظہار کیا۔ جیسے اندر کسی نے میرا گلا گھونٹ دیا ہو۔ رات کافی ہو چکی تھی۔ تھانے کے دروازے سے ذرا دور ہٹ کے مَیں نے اپنے بارے میں دوبارہ سوچنا شروع کیا۔ میرے قدم ہسپتال کی طرف اُٹھ گئے۔

(۷۴)

مَیں نے یہ تمام رات شیزا کے سرہانے بیٹھ کر گزاری۔ وہ میرے قریب آنے سے بہت زیادہ پرسکون ہوجاتی تھی جیسے آوارہ پرندے کو سرد رات کی خنکی میں ایک تپش بھرا گھونسلا مل گیا ہو۔ اگلے دن کے بارہ بج چکے تھے۔ مَیں واپس اس کالونی میں نہیں جانا چاہتا تھا حالانکہ ابھی تک یوحنا نے کوئی بُری خبر نہیں سنائی تھی مگر مجھے کالونی سے ایک طرح کا ڈر لگنے لگا تھا۔ مَیں نے اپنے دائیں طرف دیکھا، مَیں اکیلا تھا، بائیں طرف دیکھا، وہاں بھی کوئی صدا اور دھیمی سی آواز تک نہ تھی۔ بالکل اکیلا، تنہا، یاس و حسرت اور نا اُمیدی کی مکمل تصویر تھا۔

ظفر عالم اور حسنات جن کا آفس ایک عرصے سے دبئی منتقل ہو رہا تھا، وہ مستقل طور پر دبئی میں منتقل ہو گیا۔ اُن سے رہی سہی نوکری اور تنخواہ کی توقع تھی وہ بھی نہ رہی۔ اِس تمام عرصے میں ایک عابد حسین میلوڈی بک ڈپو میرے لیے آخری پناہ گاہ تھا۔ یہ جگہ ہسپتال کے بالکل ساتھ پڑتی تھی اور میرے تمام دِنوں کی ساتھی تھی۔ اب مَیں عابد حسین کے پاس آتا تھا مگر اُس سے نہ کسی قسم کی مدد لیتا تھا۔ نہ اُس سے شیزا کی بیماری اور اپنی کس مپُرسی کے حوالے سے کچھ بتاتا تھا، کسی ہمدرد کو مسلسل اپنی بے بسی اور معاشی بدحالی کا قصہ سُنانے سے ایک گونہ دُوری پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے، کسی انسان پر بھی اپنا بوجھ ضرورت سے زیادہ ڈال دینا دلوں کی دُوری کا سبب بنتا ہے اور یہ کم عقلی کی دلیل ہے۔ اب وہ بچارا اِس قابل نہیں رہا تھا کہ میرا مسلسل وزن برداشت کرتا۔ ہاں مگر میرے کھانے پینے کا تمام بندوبست اُسی

کے پاس ہو گیا تھا اور یہ کھانا پینا مَیں دن میں صرف ایک بار کرتا تھا۔ اِس کے علاوہ اُس کے پاس فون سیٹ تھا۔ مَیں وہاں سے فون کر سکتا تھا، یا اگر کہیں سے مجھے کسی نے فون کرنا ہوتا تو مَیں نے سب جاننے والوں کو اُنھی کا نمبر دے دیا تھا۔ البتہ اب اُن کی دکان پر زیادہ بیٹھتا نہیں تھا کہ میرے پاس اتنی فرصت ہی نہیں رہی تھی۔ میرا اکثر وقت شیزا کے کمرے میں ہاسپٹل میں اُس کے بیڈ سے لگے بیٹھے گزرتا تھا۔ مَیں دیکھ رہا تھا شیزا کی اُنگلیوں کے کنارے سیاہ ہو چکے تھے۔ اُس کی آنکھوں میں بدترین حلقے پڑ گئے تھے۔ اُس کی ہڈیاں ایک کے بعد ایک باہر نکلنے لگی تھیں۔ مجھے خوف تھا ایک دن مجھے یہ ہڈیاں گٹھڑی میں باندھ کر لے جانا پڑیں گی۔

مَیں شیزا کے کمرے میں بیٹھا اُس کے جسم میں لگی خون کی بوتل کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا، دراصل یہ میری ہڈیوں کے گودے سے نکالا ہوا خون ہے جسے ایک دن خود ختم ہو جانا ہے۔ شیزا مجھے کبھی کبھی دیکھ کر ہنسنے کی کوشش کرتی تھی تا کہ مَیں اُس کی طرف سے مایوس ہو کر کہیں اُسے تنہا نہ چھوڑ دوں۔ مَیں اُس کی اِس مسکراہٹ کے پیچھے چھپے اُس بے بسی اور بے پناہ لاچاری کے حزن کو صاف دیکھ لیتا تھا اور شیزا کی معصومیت پر رو دیتا تھا کہ وہ مجھے اِس قدر کمزور سمجھتی ہے۔ میرا ضمیر کم از کم اُس کے مرنے سے پہلے نہیں مر سکتا تھا۔

آج میرا ارادہ تھا کہ مَیں شام کو لاہور نکل جاؤں اور والدہ سے وہ دولت حاصل کروں جو اس امانت سے کہیں زیادہ نیک راہ میں خرچ ہو سکتی تھی۔ مَیں شیزا کو یہ اطلاع دینے کے لیے جھکا کہ آج شام گاؤں جانے کا ارادہ رکھتا ہوں، اُسی وقت عابد حسین کمرے میں داخل ہوئے۔ شاہ صاحب نہایت اضطراب کی حالت میں تھے، اُنھوں نے مجھے آنکھ کے اشارے سے اپنے پیچھے آنے کے لیے کہا۔ جیسے ہی مَیں باہر نکلا، عابد صاحب نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور بولے، ضامن مجھے آپ کے گھر سے فون آیا ہے، تمھیں اِس وقت جلدی گھر پہنچنا چاہیے۔

عابد صاحب کی بات سُن کر میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا، مَیں اُن کا منہ دیکھنے لگا اور بولا، عابد صاحب خیر ہے، کیا ہوا؟

آج عصر کے وقت امام بارگاہ باب الحسین میں کچھ دہشت گردوں نے نمازیوں پر فائرنگ کر دی ہے۔ پچیس نمازی شہید ہو گئے ہیں۔ اُن میں ایک آپ کے والد صاحب بھی ہیں۔ اتنا کہہ کر وہ خموش ہو گئے۔ پھر بولے مَیں جانتا ہوں تمھارے غم و الم کا حساب بڑھ گیا ہے مگر خدا بڑے حوصلے

والوں سے امتحان بھی ویسے ہی لیتا ہے۔

پہلے تو مجھے خود اندازہ نہیں ہوا عابد صاحب کیا کہہ رہے ہیں مگر اُن کے خوش ہونے کے چند لمحوں بعد ہی معاملے کی سنجیدگی کا اندازہ ہو گیا۔ میرا سینہ بھاری ہو گیا، آواز حلق میں پھنس گئی۔ مجھے لگا دل کے ساتھ بڑے بڑے پتھروں کے باٹ باندھ دیے گئے ہیں جن کا وزن اُٹھانے سے قاصر ہوں۔ مجھ سے اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں رہا جا سکا۔ مَیں ہسپتال کے کوریڈور کے ایک ستون سے لگ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ میرا بلڈ پریشر بیٹھتا جا رہا تھا اور آنکھوں میں سیاہیاں بھر رہی تھیں۔ مَیں نے کل دوپہر سے کچھ کھایا نہیں تھا۔ میری حالت دیکھ کر عابد حسین نے مجھے دونوں شانوں سے پکڑ کر اُٹھانا چاہا مگر مَیں نہیں اُٹھ سکا اور کرب کی حالت میں ایک خوفناک چیخ ماری۔ میری چیخ سُن کے ہسپتال کا عملہ اور اردگرد پھرنے والے مریضوں کے ورثا دوڑتے ہوئے میری طرف آئے۔ اُنھیں عابد صاحب سمجھانے لگے کہ مَیں بیمار نہیں ہوں۔ مَیں جگر کی پوری طاقت سے دھاڑیں مار کر رونے لگا اور اِس قدر شدید گریہ شروع کیا کہ مجھے بہت سے لوگوں نے پکڑ لیا۔ یہ ایک موت کا غم نہیں تھا، اصل میں مَیں اندر سے بالکل ٹوٹ چکا تھا۔ اِس شہادت نے اُس شکستہ عمارت کو بالکل دھڑام کر دیا تھا۔ جسے حالات کے صدموں نے پے بہ پے ٹھوکریں لگائی تھیں۔ مجھے معلوم تھا میرے باپ کی قسمت گمنام رُوح کی طرح دُنیا کی دیواروں سے ٹکراتی رہی ہے۔ مجھے ایک لمحے کے لیے بالکل اندازہ نہیں ہوا کہ مَیں کس جگہ ہوں اور کیوں ہوں؟ اکثر لوگوں نے یہی تصور کیا کہ میرا کوئی مریض فوت ہو گیا ہے اور مَیں اُس کے غم میں رو رہا ہوں۔ اب عابد صاحب اور اُن کے ساتھ ایک اور آدمی نے مل کر وہاں سے اُٹھایا اور دُور لے جا کر ایک بنچ پر بٹھا دیا۔ اِسی حالت میں کچھ لوگ پانی لے آئے۔ یہ پانی جس کی مجھے کوئی طلب نہیں تھی اور وہ زبردستی مجھے پلانا چاہتے تھے، میرے لیے نہایت بیزاری میں اضافہ کر رہا تھا۔ میں نے سختی سے پانی کو ایک طرف ہٹا دیا اور دوبارہ رونے لگا۔ مجھے رہ رہ کر والد کے چھوٹے چھوٹے واقعات یاد آ رہے تھے۔ اُنھیں نہ کسی سیاسی گروہ سے وابستگی تھی نہ کسی مذہبی منافع بخش کمیٹی سے علاقہ تھا۔ محض سیدھا سادا آدمی جو باقاعدہ نمازی بھی نہ تھا۔ فقط مجلس سننے کو اپنی عبادت سمجھنے والا تھا، اُسے کیوں مار دیا گیا۔ خدا جانے گولیوں کے بھاری سیسے نے اُس کے سینے میں کتنی جلن پیدا کی ہو گی، اُس کا دل کتنے بھاری پڑوں کے نیچے آیا ہو گا۔ بار بار میری ہچکی بندھ رہی تھی اور یہ حالت کافی دیر تک جاری رہی۔ پھر کچھ لمحوں میں مَیں نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ مجھے خیال آیا شیزا کمرے میں اکیلی ہے اور سوچ رہی ہو گی خدا جانے کون سی ایسی بپتا پڑ گئی

کہ اتنی دیر ہم نے باہر گزار دی ہے۔ مَیں نے عابد حسین صاحب سے کہا، مَیں ابھی نکل جانا چاہتا ہوں مگر اِسے کس سہارے پر چھوڑا جائے؟ ہو سکے تو ندیم کو یہاں بلا لیں۔

اِسے مجھ پر چھوڑ دیں، جب تک آپ پلٹ کر نہیں آتے مَیں اور میری بیوی اور دو بیٹیاں اِس کے لیے وقف ہیں۔ آپ فکر نہ کریں۔ شاہ صاحب کے اِس حوصلے اور شفقت پر میرے آنسو نکل آئے۔ تب ہم دونوں واپس کمرے میں آئے۔ شیزا نہایت بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ مَیں اُس کے سامنے بیٹھ گیا اور عابد صاحب ایک طرف کھڑے رہے۔ مَیں نے شیزا سے کہا، شیزا مَیں ایک ہفتے کے لیے لاہور جا رہا ہوں، آپ نے گھبرانا نہیں۔ شاہ صاحب اور اِن کا پورا خاندان تمہارے پاس ہوگا۔ شاہ صاحب کی بیگم تمہارے سے بہت واقف ہے۔ اکیلا نہیں چھوڑیں گے۔

شیزا نے میری طرف غور سے دیکھا جیسے اُس کے خدشات بڑھ گئے ہوں، اُس کی اِس فکر مندی کو دیکھتے ہوئے آخر مَیں نے اُسے اصل بات بتانے کا فیصلہ کر لیا۔ شیزا مَیں ہرگز تمھیں چھوڑ کر نہ جاتا مگر معاملہ ایسا نہیں کہ نظر انداز کیا جا سکے۔ آج صبح میرے والد نماز کے دوران ٹارگٹ کلنگ میں شہید ہو گئے ہیں۔ میرا وہاں پہنچنا انتہائی ضروری ہے۔ مجھے افسوس ہے تمھارا خریدا ہوا سامان اُن کے کسی کام نہیں آ سکا۔ پندرہ دن کے خون کی بوتلوں اور کیموتھراپی کا سامان ہو چکا ہے۔ مجھے اُمید ہے مَیں جلد کچھ اور بھی کروں گا۔ میری والدہ کے پاس کافی پیسے ہیں واپسی پر لیتا آؤں گا۔ میرے ہوتے ہوئے تمھیں بالکل فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کہتے ہوئے مَیں رو پڑا۔ اِسی دوران شیزا کے آنسو نکلنے لگے۔ مَیں نے اُس کی مدھم آنکھوں کے دو گڑھوں کے درمیان سے یہ گرم پانی کے قطرے اپنے ہاتھوں سے پونچھ ڈالے، اُس کے ماتھے کو بوسہ دیا اور باہر نکل آیا۔

(۷۵)

مَیں سہ پہر تین بجے لاہور پہنچ گیا۔ اڈے سے رکشا لے کر اپنے بھائی کے گھر روانہ ہو گیا۔ لاہور میں ہمارے کچھ زیادہ رشتے دار اور دوست نہیں تھے۔ میرا تو کبھی بھی لاہور میں زیادہ رہنا نہ ہوا تھا اِس لیے لوگوں سے دوستی کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ ہاں کچھ ادب اور فکشن سے تعلق رکھنے والے احباب جانتے تھے لیکن اُنھیں ملنے کی مجھے کبھی خواہش نہیں ہوئی۔ نہ کسی نے مجھے خود ملنے کی دعوت دی تھی۔ چنانچہ لاہور میں میرے ساتھ والد کی پرسہ داری کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ میں خود بھی اس سے احتراز کرتا تھا کہ مجھے بار بار دوستوں کے گلے لگ کر محض یہ جتانا پڑے کہ ہاں میں نے اپنے باپ کے پُرسے پر آئے ہوؤں کی شکل دیکھ لی ہے۔ اس سے نہ مجھے فرق پڑتا تھا نہ میرے باپ کو۔

مَیں جیسے ہی گھر پہنچا۔ وہاں ایک کہرام برپا تھا۔ ہمارے لاہور کے رشتہ دار بھی وہیں پہنچ چکے تھے۔ یہ رشتے دار کبھی بھی ہمارے قریب نہیں رہے، نہ آپس میں دلی خیر خواہی رکھتے تھے، ہاں کبھی کبھار مجلس یا شادی غمی میں سامنا ہوتا تو سلام دُعا ہو جاتی تھی۔ اب اُن کا تقاضا تھا کہ اِن کو یہیں مومن پورہ قبرستان میں دفن کر دیا جائے۔ میری والدہ نے جونہی مجھے گھر میں داخل ہوتے دیکھا، وہ مجھ سے لپٹ گئی اور بین کر کے رونے لگی۔ اُس کے بین اور بے ہوشی کو دیکھتے ہوئے مجھے گمان ہوا کہیں وہ بھی اِسی وقت فوت نہ ہو جائے۔ میرا بھائی خود رنج والم میں مبتلا تھا اور ایک طرف چارپائی سے لگ کر اوندھا بیٹھا ہوا تھا۔ مَیں نے آگے بڑھ کر اپنے والد کا چہرہ دیکھا۔ اُس کا پورا لباس خون میں تر بتر تھا۔ مجھے نہیں خبر

اُسے کس پاداش میں مارا گیا تھا۔ وہ کسی ایسے آدمی سے واقف نہیں تھا جسے فرقہ پرستی کی سیاست یا اُس
کی تاریخ سے لینا دینا ہو۔ اُسے یہ تک معلوم نہیں تھا، قتل و غارت کے فیصلے کہاں بیٹھ کے ہوتے ہیں۔ وہ
یہ بھی نہیں جانتا تھا گولیاں بانٹنے والے خود نہیں جانتے اُن کی کون سی گولی کس کا انتخاب کرے گی۔ وہ تو
بس اپنے معمولی فیصلے سے نہایت غیر معمولی خدمات انجام دینے والے ہوتے ہیں۔ مَیں نے اپنا چہرہ
والد کے پرسکون چہرے پر رکھ دیا، وہ بوڑھا آدمی جسے چھ تانبے کی گولیوں کا سیسہ پلایا گیا تھا، اِس قدر
وزن کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ تو ایک کمزور سا آدمی ایک چھرے سے مارا جا سکتا تھا مگر جنھیں گولیاں
بانٹی جاتی ہیں اُن سے اُن کی کثیر تعداد چلانے کا حساب نہیں لیا جاتا، فقط بہے ہوئے خون کی مقدار تولی
جاتی ہے کہ واقعی جس قدر سیسہ خرچ ہوا ہے اتنا خون بہا ہے یا قتل و غارت میں بے ایمانی سے کام لیا گیا
ہے۔ مَیں نے اپنے باپ کی خون سے بھری لاش کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا تھا کہ اِن کے معاملے میں
قاتلوں نے واقعی اپنے مالکوں کے ساتھ ایمانداری سے کام لیا تھا۔ میرا والد اور اُس کی چارپائی اِس
طرح خون میں نہائے تھے جیسے اُنھیں اُس سے غسل دیا گیا ہو، ایک بار تو میرے دماغ میں عجیب
کیفیت پیدا ہوئی کہ میرے باپ کے کمزور جسم میں اس قدر خون تھا؟ والدہ مجھ سے لپٹ کر رو رہی تھی
اور مسلسل بَین کر رہی تھی۔ مجھے پکار پکار کر اُن کی مدد کو پکار رہی تھی کہ مَیں کہیں سے اپنے والد کو واپس
لے آؤں مگر اُن کی یہ خواہش کتنی عجیب تھی۔ جو الفاظ وہ ادا کر رہی تھی وہ خود اُن کی اہمیت سے واقف
نہیں تھی۔ وہ والد کے بارے میں کبھی ایک خواہش کا اظہار کرتی، کبھی خاموش ہو کر اُس کی جنت کا پروانہ
سناتی اور کبھی اُس کے پرسکون لیٹے ہوئے بدن کو آلِ محمدؐ کے سپرد کرتی، پھر تھوڑی دیر بعد اُسے زندہ
واپس لوٹانے کا تقاضا شروع کر دیتی۔ مجھے معلوم تھا، بَین اِسی طرح ہوتے ہیں، عورتوں کی خواہشیں ایسی
ہی بے ترتیب اور حزن و ملال میں مبتلا کر دینے والی ہوتی ہیں۔ وہ صبح سے رو رہی تھی اور غش کھا رہی تھی۔
مَیں چاہتا تھا جس قدر جلد ممکن ہو اُسے بَین کی اذیت سے چھٹکارا دلاؤں اور یہ اُس وقت تک ممکن نہیں تھا
جب تک والد صاحب کو زمین کے سپرد نہ کر دیا جاتا۔ دوسری طرف اہلِ لاہور اور امام بارگاہ کی مرکزی
کابینہ کا فیصلہ یہ تھا کہ اِن تمام شہیدوں کو مومن پورہ کے گنجِ شہیداں میں دفن کیا جائے۔ کافی ردوقد کے
بعد مَیں نے اُن سے اجازت لی کہ اِنھیں اِن کے اصلی گاؤں میں لیجاؤں کیونکہ اُن کی بھی یہی خواہش
تھی۔ مَیں اور میرا چھوٹا بھائی عشا کے وقت اپنے والد صاحب کو لے کر گاؤں پہنچے۔ گاؤں میں اُن کی قبر
دادا اور دادی جی کے ساتھ پہلے ہی بنا دی گئی تھی۔ اِس طرح قبریں بنا کر کہیں نہ کہیں دل مطمئن ہو جاتا

ہے کہ اب وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل گئے ہیں۔ جیسے دُنیا میں اکٹھے بسر ہو رہی تھی اُسی طرح اگلی زندگی میں بھی اُن کی یہی گھر والی صورت ہے مگر ایک فرق کے ساتھ کہ وہاں وہ لوگ معیشت، مزدوری اور لڑائی جھگڑے کے دھندوں سے آزاد بسر کر رہے ہیں۔ دوسرے دن اُن کے اُسی گاؤں کی بڑی مسجد میں قل کرائے گئے جسے ابھی تک کسی ایک فرقے کے لیے مختص نہیں کیا گیا تھا۔ اگر کسی ایک فرقے کی تھی بھی تو قل پر فی الحال اعتراض نہیں ہوا تھا اور ہر شے ٹھیک ٹھاک ہو گئی تھی۔ میرا چچا جان ابھی تک وہیں تھا اور ہمارے اور اپنے احاطے کی اُس نے درمیانی دیوار گرا کر ایک کر دیا تھا۔ یہ بات مجھے اچھی لگی تھی۔ دو دن گزر جانے پر میری والدہ کو کچھ قرار آ گیا تھا۔ اب وہ روتی تو تھی مگر اُس کے وقفوں کا دورانیہ طویل ہو گیا تھا۔ عموماً شہید ہونے والے لوگوں کے ورثا کا ایک اطمینان اُن کی شہادت کو ابدی زندگی سے جوڑ کر مطمئن ہو جانے سے ہوتا ہے۔ یہی اطمینان یہاں بھی تھا۔ والد صاحب کی شہادت کی خبر سُن کر شہر سے کئی دوست آ گئے تھے۔ اِن میں میرے پرانے کامریڈ دوست بھی شامل تھے جو اپنے اپنے کاروباری دھندوں میں مصروف ہو کر اب معیشت کی بار برداری کر رہے تھے مگر مذہب ایسی خرافات سے ابھی تک دُور تھے۔ وہ جنازے کے دوران ایک طرف کھڑے ہو کر محض سگریٹ پھونکتے ہوئے مزدور اور سرمایہ داری نظام اور کچی اور پکی قبروں پر بحث کر رہے تھے۔ ایک کامریڈ صاحب نے مجھے ایک نہایت خوبصورت سنگِ مرمر کی قبر کے بارے میں پوچھا کہ یہ کس کی ہے؟ دراصل اُس سے وہ اپنے دماغ میں ایک بیانیہ ترتیب دے چکا تھا کہ سرمایہ داری نظام قبرستانوں پر بھی اثر انداز ہوا ہے لہٰذا قبرستان سرے سے نہیں ہونے چاہئیں مگر بدقسمتی سے وہ اپنے بیانیے کو وہاں بیان کرنے سے قاصر تھا کیونکہ وہ قبر ایک ایسے راج مزدور کے دادا کی تھی جو تعمیراتی کاموں میں مزدوری کرتے وقت اکثر سامان چوری کر لیتا تھا۔ اُسی چوری شدہ سامان سے یہ قبر تعمیر کی گئی تھی۔

تین دن تک مَیں گاؤں میں رہا۔ تیسرے دن کچھ ہوش آیا تو مَیں نے گاؤں کے ایک پی ٹی سی ایل سے کال کر کے دو بار عابد حسین سے شیزا کے بارے میں دریافت کیا۔ میری توقع کے برخلاف عابد صاحب مجھے سب ٹھیک کی خبریں دے رہے تھے بلکہ اُنھوں نے مجھے بتایا کہ وہ شیزا سے اب باتیں بھی کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے عابد صاحب کی بات ٹھیک ہو مگر مجھے یہی خیال تھا کہ وہ صرف میری دلجوئی کر رہے ہیں۔

اِدھر والد صاحب کے قُلوں کے بعد والدہ کا تقاضا تھا کہ مَیں شہر بالکل نہ جاؤں۔ میری والدہ

بار بار میری صحت کو دیکھ کر سوال کرتی، ضامن تمھیں کوئی پریشانی ہے، لیکن تم بتا نہیں رہے۔ تمھاری صحت اِس قابل نہیں کہ تم واپس اسلام آباد جاؤ۔ مَیں نے خود اپنی صحت پر کافی عرصے سے کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ میرے لیے ایسی صحت جس میں محض بے آرامی اور بے وقت کھانے کی وجہ سے جسم میں چربی پگھل جانا اور رنگ پھیکا پڑ جانا ایسی بڑی بات نہیں تھی مگر والدہ مجھے دیکھ کر بہت زیادہ پریشان ہو گئی تھی۔ اُسے اپنے خاوند کی بجائے اب میری فکر پڑ گئی تھی اور مسلسل مجھ سے کچھ پوچھنے کے چکر میں تھی کہ آخر مَیں اِس حالت کو کیسے پہنچا۔ میری والدہ اگرچہ زیادہ بوڑھی نہیں تھی مگر مجھے احساس تھا کہ اب وہ زیادہ صدموں کا سامنا نہیں کر سکتی۔ اِس لیے مَیں نے اُسے کوئی بات نہیں بتائی۔ تیسری شام والد کی وفات کو چوتھا دن ہو گیا تھا۔ اب میری والدہ نے اور ہم نے اپنے چولھے سے روٹی پکانے کا بندوبست کیا۔ یہ شام کے کھانے کا وقت تھا۔ میرا بھائی گھر سے باہر تھا۔ حویلی کی درمیانی دیوار گرا کر چچا جان نے پورے گھر کو ایک ہی کر دیا تھا مگر وہ ذرا ہم سے کافی دُور بیٹھے تھے۔ والدہ صاحبہ روٹیاں پکا رہی تھیں اور مَیں چولھے کے نیچے آگ جلا رہا تھا۔ اُس کے بوڑھے ہاتھوں میں روٹی پکانے کا ہُنر ابھی تک ویسا ہی تھا جیسا جوانی میں تھا۔ گوبھی کا سالن پکا ہوا تھا۔ مَیں نے توے کی گرم روٹی کے ساتھ لقمہ لیا تو معلوم ہوا مَیں تیس سال پیچھے جا کھڑا ہوا ہوں اور وقت کے پہیے نے اُلٹا چکر لے لیا ہے۔ اب مَیں نے اپنی والدہ کو کچھ بتانے کی ٹھان لی۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں بیس سال پہلے مَیں نے اُس سے ایک سوال کیا تھا۔ مَیں نے کہا، امی ایک بات آپ سے کرنا چاہتا ہوں۔

وہ ہاتھوں پر روٹی کے پیڑے کو جما کر گول کر رہی تھی، میری بات سُن کر ایک دم اُس کے ہاتھ رُک گئے اور میری طرف دیکھنے لگی۔

مَیں نے کہا، امی یہ بتائیں، آج تک آپ نے کبھی دیکھا کہ مَیں نے کسی وقت روپے پیسے کی خواہش کی ہو یا کسی کے مال پر قبضہ کرنے کی کوشش کی ہے؟

اُس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا، مجھے اپنے بیٹوں پر فخر ہے، دونوں نے کبھی اِس طرح کا لالچ نہیں کیا۔ مَیں نے تمھیں طاہر دودھ سے پالا ہے اور نہ تیرے باپ نے کبھی تمھیں حرام کھلایا ہے۔ اب وہ بات بات پر میرے والد کی فطرت بیان کرتی تھی۔ اُسی کی مثال دینے لگتی تھی اور مَیں جانتا تھا پوری زندگی وہ یہی کرے گی، پھر تم کیسے کسی کے مال پر آنکھ رکھ سکتے تھے؟ خدا ایسے بیٹے ہر ایک کو دے۔

والدہ کی اِس بات نے مجھے آمادہ کیا کہ مَیں اب اپنا مدعا بیان کروں، مَیں نے کہا امی بار بار آپ جو میری صحت کے بارے میں دریافت کر رہی ہو، پھر اُس کا قصہ سنو کہ مَیں کس مصیبت میں گرفتار ہوں، اُس کے بعد مَیں نے شیزا کے متعلق تمام بات بتا دی لیکن اُس میں سے اُس کی زندگی کا وہ حصہ حذف کر دیا جو اُن لمحوں سے متعلق تھا جنھیں زمانہ آلائشیں کہتا ہے۔ میری والدہ نے تمام بات نہایت خموشی سے سنی اور چپ بیٹھی رہی۔ اِس دوران مَیں نے دیکھا اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی جاری ہو چکی تھی۔ اُس کا دل مَیں پہلے ہی جانتا تھا کس قدر نرم ہے۔ وہ کافی دیر چپ بیٹھی رہی۔ مَیں نے روٹی کھانا بند کر دی تھی۔ اُس نے بھی چولہے سے توا اُتار کر رکھ دیا۔ جب خموشی نے طول پکڑ لیا تو مَیں دوبارہ بولا، امی مَیں جانتا ہوں عدیلہ کی امانت ہزار ہا مصیبتوں سے زیادہ اہم ہے مگر اُس امانت سے جسے اب وصول کرنے والا پچھلے بیس سال سے نہیں ملا، اگر کسی کی زندگی کے کچھ لمحے بڑھ جائیں تو زیادہ اللہ رسول کا کام نہیں ہے؟ اتنی بات کہہ کر مَیں بالکل خموش ہو گیا اور تہیہ کر لیا اگر والدہ نے اِس کے بعد مجھے کوئی جواب نہ دیا تو آج ہی اسلام آباد روانہ ہو جاؤں گا۔ مَیں نے اب اپنی آنکھیں نیچے کر لی تھیں۔ وہ کچھ دیر خموشی سے بیٹھی رہی، پھر اُٹھی اور مجھے بازو سے پکڑ کر اپنے ایک کمرے میں لے گئی۔ بولی ضامن کوئی چیز لے کر یہاں سے فرش کو اکھاڑ دو اور جلدی کرو۔ اگر خدا مجھ سے پوچھے گا تو مَیں اُس کا سامنا خود کر لوں گی۔ مَیں نے باہر سے ایک سخت لوہے کا سریا اُٹھایا اور اندر داخل ہو کر کمرے کے ایک کونے سے اینٹوں کا فرش کھودنے لگا۔ تھوڑی دیر میں اینٹیں الگ ہو گئیں۔ تب والدہ نے کہا اب کسّی لے کر یہاں سے گڑھا کھودو۔ مَیں نے اُس میں ساڑھے تین فٹ گہرا گڑھا کھود دیا۔ اندر سے ایک مومی کاغذ نکلا جو کافی بھاری تھا، مَیں نے اُسے کھولنا شروع کیا تو چھ سات پرتوں کے نیچے سے سونے کی چوڑیاں، سونے کی پازیبیں اور کانٹے وغیرہ نکل آئے۔ یہ کافی زیادہ تھے۔ مجھے والدہ نے کہا، یہ بیس تولے ہے، جلدی اِنھیں لے جا کر بیچو اور اُس کا علاج کراؤ...اور کل صبح ہی نکل جانا۔

(۷۶)

اگلی صبح فجر کی نماز کے بعد مَیں سیدھا قبرستان اپنے والد صاحب کی قبر پر پہنچ گیا۔ یہ قبر اُس نالے پر تھی جس کے اُوپر پوری قطار میں جامنوں اور ٹاہلیوں کے درخت لگے تھے اور سایہ بہت زیادہ تھا۔ نالے کے ٹھنڈے پانی کے ساتھ صبح کے عالم میں درختوں پر پرندوں کی چہکار سے مجھ پر ایک کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ مَیں پختہ طور پر جان چکا تھا کہ جو اِس قدر فطری طور پر خوبصورت اور ٹھنڈے سائے میں دفن ہیں وہ یقیناً بخشی ہوئی روحیں ہیں۔ سامنے بھی ٹاہلیوں کے ہرے درخت تھے مگر اُن کے پتے تروتازہ نہیں تھے کہ ایک مہینے بعد خزاں آنے والی تھی۔ یہاں پہلو بہ پہلو تین قبریں تھیں۔ اُوپر کی طرف دادا کی، اُس سے بائیں جانب یعنی مغرب کی طرف دادی اماں کی اور اُس سے بائیں طرف ابا جی کی۔ تینوں قبروں پر علم لگا دیے گئے تھے۔ والد صاحب کی قبر کے کتبے پر شہید کا اضافہ کر دیا گیا تھا۔ حاجی فطرس علی اور اُس کے بعد میرے والد صاحب کی قبر پر وفات کی بجائے شہادت کے لفظ سے میرا یہ خیال پختہ ہو گیا کہ آئندہ پاکستان میں شہیدوں کی قبریں کھمبیوں کی طرح اُگیں گی۔ ہو سکتا ہے ہر قبرستان میں آنے والے تیس چالیس برسوں میں ایک تہائی تعداد شہیدوں کی ہو جائے۔ مَیں کافی دیر وہاں کھڑا اُس بے گناہ کی قبر پر درود و صلوٰۃ پڑھنے کے ساتھ روتا رہا۔ محمد و آلِ محمد کے واسطے دے کر اُن کی بخشش کی دعائیں کرتا رہا حالانکہ مجھے کامل یقین تھا کہ اگر کوئی روزِ حساب ہے تو والد صاحب کی بخشش میری دعاؤں کی محتاج نہیں۔ مَیں زندگی بھر مذہب سے زیادہ قریب نہیں رہا تھا۔ کبھی کبھار ہی امام بارگاہ

جاتا تھا۔ سالوں بعد کہیں ایک آدھ دفعہ عید پڑھی ہو گی مگر میرا دل زنگ آلود نہیں ہوا تھا۔ زمانے کے نشیب و فراز نے مجھے کائنات کے معاملے میں جلد فیصلے کرنے سے باز رکھا تھا۔ مَیں نے اپنے اکثر دوستوں کے برعکس کبھی مذہب سے بیزاری کا اظہار نہیں کیا تھا جو ہمارے معاشرے میں ایک دوسرے کو دیکھ کر رواج پا چکا تھا۔ اِس کی خاص وجہ شاید جنابِ امیر علیہ السلام کے کردار کی پختگی تھی جسے مَیں نے دل کی گہرائی سے جذب کر لیا تھا۔ کائنات کے اِن پاکیزہ کرداروں نے مجھے روک رکھا تھا کہ مَیں خدا کا انکار نہیں کر سکا تھا۔ اب تو گویا مکمل طور پر واپس پلٹ چکا تھا۔ پھر اِس کسمپرسی میں میرے پاس اِس سہارے کے علاوہ رہا بھی کیا تھا کہ اسے بھی ضائع کر دیتا۔

جب تک سورج طلوع ہو کر چمکتا ہوا برآمد نہیں ہو گیا، وہاں سے نہیں ہلا۔ مَیں پہلے بھی دادی اور دادے کی قبر پر آ چکا تھا اور اُنھیں قبرستان کے عین اُنھی فوت شدگان میں سے سمجھتا تھا جیسے دوسرے اُس قبرستان میں موجود تھے۔ مَیں نے ہمیشہ جس طرح اپنی دادی اور دادے کے لیے مغفرت کی دعا کی، تمام اہلِ قبور کے لیے بھی ویسے ہی کرتا تھا مگر اِس بار میرے اندر کے تعصب نے ایسا کرنے پر ملامت کی اور مَیں نے وہاں تمام دفن لوگوں کی بجائے صرف اپنی دادی، دادے اور والد کا نام لے کر مغفرت کی دعا کی اور آیات کا ثواب اُنھی تین نفوس کے لیے چاہا۔ مجھے باقی مُردوں سے اب کوئی غرض نہیں تھی حالانکہ میرے والد کے جنازے میں بلا تفریق تمام لوگ شامل تھے۔ اِس سے بھی بڑھ کر جو تبدیلی میرے اندر رونما ہوئی وہ یہ تھی کہ مَیں اپنے اِس فعل پر نہ صرف خوش تھا بلکہ گھر آتے ہوئے اِس یقین کے ساتھ داخل ہوا کہ خدا میرے اِس فعل سے راضی ہوا ہے۔ کیونکہ مَیں نے اُس پر اُن دیگر گناہ گاروں کی بخشش کا بوجھ نہیں ڈالا جنھیں وہ معاف نہیں کرنا چاہتا۔ وہ اِس مشکل میں نہ پڑ کر بہت خوش ہے لیکن گھر آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد میرے دل نے مجھے اِس امر میں ملامت کرنا شروع کر دی اور مَیں دل ہی دل میں خدا سے معافی مانگنے لگا مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حاجی فطرس علی کے بعد میرے والد کے فرقہ وارانہ قتل نے میرے اندر ایک قسم کے مذہبی تعصب کا بیج رکھ دیا تھا۔

واپس آ کر مَیں نے ناشتا کیا، جسے میری والدہ نے نہایت اہتمام سے میرے سامنے رکھا تھا۔ اِس ناشتے میں تین چار الگ سے بھی کھانے موجود تھے۔ اُن کھانوں کو نیاز کے نام سے پکایا گیا تھا۔ پہلے مَیں نے اُن پر درود اور چند قرآنی آیات پڑھیں اُس کے بعد کھانا شروع کیا۔ میری والدہ کھانا کھانے کے ساتھ مسلسل سامنے بنے مرغی خانے پر نالاں ہو رہی تھی جس کی بدبو نے چاروں طرف

نحوست پیدا کر دی تھی۔ مَیں جانتا تھا میری والدہ چند دن میں یہاں سے چلی جائے گی کیوں کہ اب اِس گاؤں میں اُس کا کوئی نہیں رہ گیا تھا۔ تین قبریں تھیں جنھیں وہ گاہے گاہے آ کر دیکھ سکتی تھی اور اُن کے لیے نیازیں تو اب روز پکا کر بانٹا کرے گی۔

دس بجے مَیں نے والدہ سے رخصت لی۔ اُس نے امام ضامن باندھا اور آنسوؤں سے بھرے کٹوروں کے ساتھ مجھے رخصت کیا۔ رخصت ہوتے وقت اچانک مجھے خیال آیا کہ والدہ تو کافی بوڑھی ہوگئی ہے۔ یہ احساس مجھے بالکل ابھی ہوا تھا، وہ بہت جلد بوڑھی ہوگئی تھی اور میرے اندر خطرے کی گھنٹی بجی کہ کہیں جلد واپس نہ آنا پڑے۔ اِس خیال میں سب سے بڑی وجہ وہ امانت تھی جو اُس نے میرے حوالے کی تھی۔ مَیں نے جلد ہی وہ خیال جھٹک دیا اور گھر سے باہر نکل آیا۔ مَیں اِس گاؤں کے در و دیوار، جن میں بچپن کی اب کوئی یاد اور نشانی باقی نہیں بچی تھی، جلد چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ گیارہ بجے شہر پہنچا اور سیدھا پہلے حبیب علی کی دُکان پر نیشنل بینک والی گلی میں گیا۔ مجھے حبیب علی کے سوا اب شہر میں کسی سے نہیں ملنا تھا۔ میرا خیال تھا، اِس شہر میں سوائے حبیب علی کے کون ہے؟ مگر شہر میں داخل ہونے کے بعد احساس ہوا شہر کے محلے، چوک، چوراہے، گلیاں اور گلیوں میں وہ درخت، جن کی ہواؤں کے لمس نے مجھے پالا ہے، وہ تو میرے اپنے ہیں۔ مَیں کافی دیر بعد شہر میں آیا تھا۔ خاص کر سید فطرس علی کی شہادت کے بعد تو بالکل شہر میں داخل ہونے پر ہَول آتا تھا۔ جب اپنے لوگ اُن مقاموں سے ہٹ جائیں جن کی نسبت سے مقام پہچانے جاتے ہیں تو اُنھی سے وحشتیں رونما ہونے لگتی ہیں۔ مجھے آج ہر حالت میں شہر کے در و دیوار کو دیکھنا تھا لیکن میرا خیال ہے حبیب علی کی دکان تک پہنچتے مجھے بہت سی اجنبی چیزوں کا سامنا ہوا۔ اکثر درخت کٹ چکے تھے۔ گول چوک میں چاروں کونوں پر چار پیپل کے درختوں میں سے دائیں طرف کے دو رہ گئے تھے، باقیوں کی جگہ دونوں کونوں پر دیو قامت پلازے کھڑے ہو چکے تھے۔ یہ دیکھ کر بہت کوفت ہوئی۔ مَیں اُس جگہ سے جلدی آگے نکل گیا۔ شہر کی تمام سڑکیں تنگ سی ہوگئی تھیں۔ حبیب علی کی دُکان بھی اب تین منزلہ ہوگئی۔ مَیں پہلے تو اِس دکان کو پہچان نہیں سکا لیکن تھوڑی دیر میں سمجھ آ گئی کہ جگہ تو یہی تھی۔ مَیں اندر داخل ہوا تو حبیب علی کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ مَیں نے دکان پر بیٹھے لڑکے کو بڑی مشکل سے اپنی طرف متوجہ کیا اور پوچھا، بیٹے یہاں حبیب علی صاحب ہوتے تھے، کیا یہ دکان اُنھی کی ہے؟ اُس نے میری طرف غور سے دیکھا اور پہچاننے کی کوشش کی پھر بولا، جی سر، اُنھی کی دکان ہے، آپ فرمائیے کیا چاہیے؟

مَیں صرف اُنھیں ملنے آیا ہوں۔ کہاں ملیں گے؟ مَیں نے لڑکے کو غور سے دیکھا، اُس کی شکل حبیب علی سے ملتی جلتی تھی، تو گویا یہ اُس کا لڑکا تھا۔ خوبصورت لڑکا تھا۔ عمر چودہ پندرہ برس کی تھی اور کافی ہشیار نظر آ رہا تھا۔

وہ سرا ُوپر اپنے آفس میں بیٹھے ہیں، لڑکے نے اپنے قریبی لڑکے سے مخاطب کیا، طاہر، جاؤ، چچا جان کو ابو کے پاس چھوڑ آؤ۔ وہ لڑکا ایک دم اُٹھ کر میرے آگے چل پڑا اور بولا آیئے سر۔ مَیں لڑکے کے پیچھے چلنے لگا، ہم دوسری منزل سے ہوتے ہوئے تیسری پر پہنچ گئے۔ آگے ایک وسیع آفس بنا ہوا تھا۔ دو دوست اُس کے اور بھی بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ایک دم حیران ہوتے ہوئے اُٹھا، او میرے یار، ضامن، تُو کہاں فوت ہو گیا تھا یا اللہ بندہ زندہ ہو تو مل ہی جاتا ہے۔ اِس کے ساتھ ہی اُس نے مجھے دبا کے گلے سے لگا لیا۔ پہلی نظر میں تو مَیں حبیب علی کو پہچان ہی نہیں پایا۔ چھوٹی چھوٹی سفید داڑھی، سر پر ٹوپی، ماتھے پر محراب بنی ہوئی، سجدوں کے نشان اور سفید کرتے اور سفید پاجامے میں نہایت دیدہ زیب، کسی لکھنوئی نواب صاحب کا منشی لگتا تھا۔ اُسے اُٹھتے دیکھ کر باقی دونوں آدمی بھی اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ حبیب علی کا آفس بہت کھلا تھا۔ نیچے عمدہ قالین پڑا تھا۔ دائیں بائیں لیدر کے دو صوفے رکھے تھے۔

مَیں وہاں ایک صوفے پر بیٹھ کر بولا، حبیب علی، یہاں تو طبقے ہی اُلٹے ہوئے پڑے ہیں۔ زمین آسمان سے جا لگی ہے اور آسمان زمین پر آ پڑے ہیں۔

حبیب علی حیرانی سے بولا، مَیں سمجھا نہیں، ضامن میرے یار، پہلے سے زیادہ عجیب ہو گئے ہو۔ پہلے یہ بتاؤ کھاؤ پیو گے کیا؟ آپ کی صحت بہت خراب ہوئی پڑی ہے، کہیں روٹی ووٹی تو نہیں چھوڑ دی اور ہماری غیر اعلانیہ بھابی نے چائے پانی بند کر دیا ہے۔

حبیب علی، مَیں نے افسردگی سے جواب دیا، اُس بختاں ماری کا اپنا چائے پانی بند پڑا ہے۔ کوئی دن کی مہمان ہے۔ خیر تم سناؤ کاروبار بہت ترقی کر گیا ہے۔ تمھاری دُکان قد و قامت اور موٹاپے میں، ہر سہ جانب سے پھیلی ہے۔ مجھے خوشی ہوئی ہے۔

ہاں میاں لیکن خدا کی قسم اِس میں مَیں نے دو باتوں کا خاص خیال رکھا ہے تو یہ کچھ ہوا۔ اول کامریڈ بھائیوں کو یہاں سے دُور رکھا۔ دوئم شہر کے تاجروں کے ساتھ کسی قسم کی منافع خوری کا معاہدہ نہیں کیا۔ نہ اُن کی تنظیم کا ممبر بنا اور نہ گھٹیا دھندے کیے۔ دکان محنت اور ایمانداری سے چلائی اور یہ دن

دیکھے مگر یہ بتا ابھی تو نے کہا بھابی کوئی دن کی مہمان ہے۔ تیری یہ بات سُن کر مجھے ایک دم تشویش ہو گئی ہے۔

میاں قصہ یہ ہے، اُسے کینسر ہو گیا ہے، مَیں نے کسی بھی تمہید کا سہارا لیے بغیر حبیب علی پر ایک دم اِس افسوس ناک اطلاع کا باٹ گرایا تا کہ زیادہ علت ومعلول سے بچ سکوں۔ اِس کے ساتھ ہی وہ تمام واردات جو شیزا اور میرے حالات میں گزر چکی تھی سب ایک ہی سانس میں سنا ڈالی۔

مجھے معلوم تھا حبیب علی شیزا اور میرے واقعات میں بہت زیادہ افسردگی اور اضطراب کا مظاہرہ کرے گا اور بہت سی چیزیں کرید کرید کر پوچھے گا۔ شیزا کے علاج کے بارے میں بیسیوں مشورے دے گا اور خود اسلام آباد پہنچ کر اُس کی پرسش کرنے کی کوشش کرے گا جبکہ مَیں اِن میں سے کسی بات کا بھی اب متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ جب اِنسان بہت سے رنجوں سے اُلجھ بیٹھے تو دوست احباب کی تسلیاں اور غم خوارگیاں غم ہلکا کرنے کی بجائے مزید بڑھا دیتی ہیں۔ اِس سے پہلے کہ وہ مجھ پر نئے سوالات کی بوچھاڑ کرے مَیں نے اگلی مصیبت کو بیان کر دیا اور کہا، دوسری کہانی یہ ہے کہ تم اپنے دھندوں میں اُلجھے ہو، تمھیں یہاں پہنچ کر اطلاع نہ دے سکا، مَیں ایک ہفتے سے یہاں آیا ہوا ہوں۔

ہائیں؟ اور مجھے نہیں ملے؟ اُس نے تعجب کا اظہار کیا۔

جی ہاں نہیں ملا، اِس لیے کہ میرے والد شیعہ ٹارگٹ کلنگ میں قتل ہو گئے ہیں۔ آپ اُنھیں شہید کہہ سکتے ہیں اور اب یہ میرا حق بھی ہے۔

اللہ اکبر، حبیب علی گویا ایک دم ٹپٹا گیا، چچا علی نہیں رہے؟ اِن للہ وَاِنا الیہ راجعون۔

جی ہاں نہیں رہے۔ لاہور میں ہونے والی ٹارگٹ کلنگ کے شہیدوں میں سے ایک وہ بھی تھے۔ مَیں نے نہایت تلخی سے کہا۔

حبیب علی نے اپنے زانوؤں پر زور سے ہاتھ مارے، ہائے یار سید فطرس علی کے بعد آپ کے ابا بھی چلے گئے۔ وہ دونوں بھی کتنے دوست تھے۔ ایک دن میرے پاس آئے تھے اور کہنے لگے حبیبے فطرس علی کے بغیر اِس شہر میں آنے کو جی نہیں کرتا۔ پھر میری طرف مخاطب ہو کر بولا، کیا تم اُس جگہ جہاں اُن کا مطب اور گھر تھا، گئے ہو فطرس صاحب کے بعد؟

نہیں تو، کیا ہوا؟ مَیں نے فوراً پوچھنا چاہا۔

پہلے چچا علی کی فاتحہ خوانی کر لیں اُس کے بعد خود جا کر دیکھ لیجیے گا۔ یہ کہہ کر اُس نے دعا کے لیے

ہاتھ اُٹھا دیے۔ اُس کے ساتھ ہی دونوں دوسرے لوگوں نے بھی ہاتھ اُٹھا لیے اور ابا جان کی فاتحہ خوانی کی دعا کی۔ ابھی دعا سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ حبیب علی کے کمرے میں کباب اور چائے کی ٹرے آ گئی۔ ٹرے لانے والے لڑکے نے پوچھا اِسے کہاں رکھوں؟ حبیب علی نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے کہا، یہاں تپائی پر رکھ دو۔ لڑکا ٹرے رکھ کر چلا گیا مگر یہاں نہ تو اب کوئی چائے کو ہاتھ لگا رہا تھا اور نہ حبیب علی کسی کو کہہ رہا تھا، یہ کھائیے اور پیجیے۔ دراصل اُس کی دُکان اور محفل ایسے حادثات کی متحمل ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ حبیب علی نے جس طرح محنت سے اپنے کاروبار کی ترقی کی تھی، اُس میں زندگی کے بہت بڑے سکون اور اطمینان کے دخل کے ساتھ اُس پر نہ گزرنے والے صدمات کا بھی دخل تھا۔ اچانک برپا ہو جانے والے صدمات بنیادوں کو ایسے ہلا دیتے ہیں کہ انسان عقل اور عمل کا جوہر رکھتے ہوئے بھی کم ہمت ہو جاتا ہے۔

کافی دیر محفل میں افسردگی اور خموشی کی باہمی صلح مندی سے کمرہ ایک یاسیت کی تصویر بن رہا تھا۔ حبیب علی بنیادی طور پر ظرافت پسند اور جملے باز آدمی تھا۔ ایسے شخص کو جب مذاق کا جملہ ادا کرنے کا موقع نہیں رہتا تو سنجیدگی کی اداکاری کرنا نہایت مصیبت بن جاتا ہے۔ وہ الفاظِ نصرت نہیں رکھتا، زبان ایک دم گونگی ہو جاتی ہے۔ یہی حالت اِس وقت حبیب علی کی تھی۔ مجھے اندازہ تھا وہ کس خموشی کی اذیت سے دوچار ہے۔ جب مجھے محسوس ہوا حبیب علی کو بات کرنے کا یارا نہیں رہا تو خود ہی بول اُٹھا، خیر چھوڑیے حبیب میاں، ہمارے دن راتوں نے تنگ کر دیے ہیں، ہمارے سورج تاریک ہو گئے ہیں اور یہ ایسے ہی رہیں گے، آپ کیوں اپنا خون جلاتے ہیں، لیجیے چائے ڈالیے، یہ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ مجھے جلدی یہاں سے نکلنا ہے۔ یہ کہتے ہی مَیں نے اپنے کپ میں چائے ڈالی اور ایک کباب اُٹھا لیا۔ میری دیکھا دیکھی دوسرے لوگوں نے بھی وہی کیا۔ چائے کے دوران حبیب علی سے مَیں نے والدہ کی امانت والی بات دہرائی اور وہ سونے کی تھیلی نکال کر اُس کے سامنے میز پر رکھ دی۔

یہ کیا ہے؟ حبیب علی نے حیرانی سے میری طرف دیکھا۔

یہ وہی سونا ہے، جس کا ابھی تم سے تذکرہ کیا تھا۔ اِسے فروخت کرنا ابھی اور اِسی وقت تمھارے ذمے ہے۔ یہ بیس تولے خالص سونا ہے۔ نوے ہزار میں بکے گا۔ آپ اِسے بیچیں، اِتنے میں مَیں حاجی فطرس علی کے مکان سے ہو آؤں۔

یہ کہہ کر مَیں وہاں سے اُٹھ پڑا۔ اِس سے پہلے کہ حبیب علی کچھ عذر بیانی کرتا جو کہ اُس کے بس

میں نہیں تھی، مَیں دوبارہ بولا، حبیب علی مَیں آج تین بجے کی تیز گام سے نکلوں گا۔ اِس لیے آپ کے پاس اِسے بیچنے کے لیے صرف تین گھنٹے ہیں۔ یہ سب کام چھوڑیے اور نکل جائیے۔ یہ کہہ کر مَیں باہر نکل گیا۔ پیچھے سے اُس نے آواز دی، ہاں ٹھیک ہے لیکن ڈیڑھ بجے تک واپس آ جانا۔ کم سے کم دوپہر کا کھانا تو اکٹھے کھا لیں۔

ہاں لوٹ آؤں گا، مَیں نے واپس دیکھے بغیر اُسے جواب دیا اور سیڑھیاں نیچے اُترتا چلا گیا۔ میرے دل میں عجیب سی کسک تھی۔ مَیں بینک والی گلی سے نکل کر کنویں والے چوک کی طرف چل پڑا۔ یہ گلی جہاں سے انارکلی کی چھوٹی گلی کی طرف نکلتی تھی وہاں سے چھتا بازار کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ اول سب دکانیں عورتوں کے دوپٹوں اور سلمٰی ستارہ والوں کی تھیں اور اب یہاں دکانوں کے باہر ریڑھیوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ یہ ریڑھیاں اصل میں بازار کے دائیں بائیں طرف کے دُکانداروں نے لگوائی تھیں۔ ریڑھیوں پر اُنھی دُکانوں کا کپڑا بکتا تھا، اس کے علاوہ یہی دُکاندار ریڑھیوں والوں سے اپنی دُکان کے سامنے ریڑھی لگانے کا بھتہ بھی وصول کرتے تھے۔ یہ بھتہ پولیس، بلدیہ اور شہر کی انتظامیہ میں برابر تقسیم ہوتا تھا۔ بازار قریب قریب سائیکل یا موٹر بائیک کے لیے تنگ ہو گیا تھا۔ فقط چلنے کی راہ باقی بچی تھی۔ یہ حالت دائیں بائیں کی دکانوں کے سامنے کی تھی۔ بازار کے عین بیچ میں ریڑھیاں کھڑی کر کے درمیان سے چار فٹ ایک طرف سے اور چار فٹ دوسری طرف سے گزرنے کی راہ چھوڑی تھی۔ ٹاؤن کمیٹی والے اِن سے پیسہ کھا کر بازار کے بند کرنے کا خموش سرٹیفکیٹ جاری کر چکے تھے۔ بازار کے چھتے جانے کے باعث جو بھی درخت اُن کی چھت میں رکاوٹ بنا اُسے کاٹ دیا گیا تھا۔ یہ کام پچھلے چار پانچ برسوں میں ہوا تھا۔ مَیں کنویں والے چوک پہنچا تو کنویں کی جگہ مجھے وہاں ایک ٹینک رکھا ہوا ملا۔ یہ ایک دم کنواں کہاں چلا گیا تھا اور اُس سے بڑھ کر ستم یہ کہ نیم کا چار پانچ سو سال پرانا درخت بھی کٹ گیا تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ یہ کتنی ٹھنڈی اور پرسکون جگہ تھی۔ اب نہ کنواں تھا، نہ اُس کا ٹھنڈا اور میٹھا پانی تھا۔ ہاں ایک لوہے کی گرم پانی کی ٹنکی رکھ دی گئی تھی اور اُس کے گرد لوہے کے سریوں کا اونچا اور بڑا جنگلا کھڑا کر دیا گیا تھا۔ یہ سب کیا تھا؟ اِنھیں کوئی پوچھنے والا نہیں تھا؟ درختوں کے کاٹنے کا کوئی ذمہ دار کیوں نہیں بنتا تھا؟ جب درخت کٹ رہے ہوتے ہیں تو وہاں کے لوگ کیا کرتے ہیں؟ کیا وہ لنگڑے اور بے زبان جانور ہیں کہ خموشی سے اُن کے کٹنے کا تماشا دیکھتے ہیں۔ مَیں یہاں سے فوارہ چوک کی طرف ہو گیا۔ یہاں بھی عجیب تماشا تھا۔ دائیں پہلو والی نیم تو موجود تھی مگر عین چوک والا

شرینہہ کا درخت نہیں تھا اور دائیں بائیں بڑے بڑے پلازے کھڑے تھے۔ یہ پلازے ابھی ابھی بنائے گئے تھے۔ اِن میں عجیب تعمیراتی سٹرکچر استعمال کیا گیا تھا۔ فقط کنکریٹ کا بے ڈھنگا سا بڑا ڈبا کہہ سکتے ہیں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے اِس شہر کو بھی شیزا والی کینسر کی بیماری لگ گئی ہے اور میرے ہاتھ سے شیزا اور یہ شہر برابر نکلا جا رہا ہے۔ مَیں وہاں سے دائیں طرف کے چھوٹے بازار کو ہو گیا تاکہ محمدیہ مسجد والی راہ لے کر نکل جاؤں اور گول چوک سے ہو کر پیپلوں والے بڑے مطب کی طرف نکلوں۔ اِدھر جب محمدی مسجد کے قریب پہنچا تو ایک اور صدمے نے میرے دل پر خنجر چلا دیا۔ مسجد کے بائیں پہلو اور گول چوک والی گلی کی کھڑکی میں موجود حکیموں کی دکانیں ختم ہو گئی تھیں۔ وہاں بھی شٹروں والی اونچی اور لوہے پیپے کی دُکانیں کھل گئی تھیں۔ مَیں نے جیسے تیسے گول چوک کی اُس نکڑ کو پاس کیا، جس کے ایک کونے کا پیپل غائب تھا اور وہاں ایک بینک بن چکا تھا۔ اب جونہی مَیں تار گھر کے قریب پہنچا تو دیکھا کہیں حکیم قطرس علی کا مطب نظر نہیں آ رہا تھا۔ بار بار نظر دوڑانے کے باوجود میری نظر پھسل کر ایک اسلحے والی دکان پر پڑتی تھی۔ اُس پر لکھا ہوا تھا چودھری اسلحہ ڈیلر اینڈ سنز۔ یہ کیا تھا؟ یہاں قطار در قطار نیم اور پیپلوں کے پیڑوں کے سائے اور اُن کی چھاؤں میں حاجی صاحب کا مطب کہاں گیا؟ وہ پیلے رنگ کی خوبصورت عمارت، اُسے آسمان کھا گیا یا زمین نگل گئی۔ مَیں سیدھا اسلحے والی دکان میں گھس گیا۔ یہ بالکل نئی تھی اور پلازے کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ وہاں ایک آدمی بڑی مونچھوں اور مائع لگی ہوئی کاٹن کی قمیص پہنے بیٹھا تھا۔ ایک اور آدمی اسی ڈیل ڈول کا اُس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھا تھا۔ مَیں نے اُسے پوچھا، چودھری صاحب یہاں ایک مطب ہوتا تھا۔ اُس کے سامنے نیم اور پیپلوں کے دس پندرہ بوڑھے درخت تھے، وہ کیا ہوئے؟ اُس نے میری طرف ہنس کر دیکھا اور بولا بابو جی وہ مطب ختم ہو گیا۔ حاجی قطرس صاحب کے بیٹوں سے یہ جگہ ہم نے خرید لی ہے۔ ہم حکیم تو تھے نہیں۔ اس لیے اسلحے کی دکان کھول لی ہے۔ حاجی صاحب کا بیٹا اپنے رشتہ داروں کے پاس کراچی چلا گیا ہے۔

اور اُس کا مطب اور لائبریری بھی تھی؟ مَیں نے اُن سے ایسے سوال کیا جیسے وہ لائبریری اور مطب میں دلچسپی رکھتے ہوں۔

وہ دوبارہ بولا، لائبریری اور مطب کو اُس کا بیٹا جانے اور وہ جانے۔ ہم نے تو یہ مطب جب خریدا تو بالکل خالی تھا۔

اور جو یہاں درخت کھڑے تھے؟ اُن کی وجہ سے یہ بازار بہت چھاؤں سے بھرا ہوا تھا۔ مَیں

بے بسی کے عالم میں بولا، وہ بھی کیا حاجی صاحب کا بیٹا ساتھ لے گیا؟ یہ جملہ ادا کرتے ہوئے میرے چہرے پر غصے کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔

ہاں وہ تو نہیں لے کر گیا تھا۔ وہ ہم نے بیچ دیے ہیں۔ اب ہم نے دکان چلانی تھی یا چھاؤں بیچنی تھی۔ بڑھے نے پورا بازار درختوں سے ایسے بھرا ہوا تھا جیسے چھانگا مانگا میں بیٹھا ہو۔ میاں یہ شہر ہے۔ نہ گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ تھی، نہ سامنے سے دکان نظر آتی تھی۔ سڑک پر پتوں نے الگ گند مچا رکھا تھا، صفائی کرنے والے نخرے کرتے تھے۔ ہم نے درختوں کا ٹنٹا ہی ختم کر دیا۔ لگتا ہے آپ یہاں بہت دیر کے بعد آئے ہو۔ پھر اپنے دوسرے ساتھی کی طرف منہ کر کے مذاق کے عالم میں بولا، غالباً بھائی صاحب حکیم صاحب سے آملے کا مربہ کھانے آتے تھے۔

جی ہاں، وہی کھانے آتا تھا، آملے اور ہڑیڑ کا مربہ خاص کر وہ عمدہ تیار کرتے تھے اور صندل کا شربت بہت خوب ہوتا تھا۔ مَیں جانتا تھا وہ مذاق کے موڈ میں ہیں مگر مَیں نے جان بوجھ کر گویا اُن کی معلومات میں اضافہ کیا۔

ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟ وہ مونچھوں والا اب کے بولا۔

آپ مجھے اب اِس میں سے کیا دے سکتے ہیں؟ میرے لائق یہاں اب کیا رہ گیا ہے؟ مَیں نے بھی اُن سے طنز کیا۔

ہاں جناب، ہم تو اب آپ کو تانبے کی ٹِلٹ ہی دے سکتے ہیں۔ ایک سے اُفاقہ نہ ہو تو دوسری لے لیجیے، وہ ہنس کر مذاقاً بولا اور یہ گولیاں پانی کی بجائے اِس لوہے کے پسٹل سے لینا پڑیں گی۔ اِس کے ساتھ ہی دونوں نے قہقہہ لگایا۔

اُن کے اِس مذاق نے مجھے بالکل کچل کے رکھ دیا اور دل ڈبا دینے والی بے طاقتی جسم میں بھر گئی۔ یوں لگا ٹانگوں میں میرے بے جان دھڑ کا بوجھ اُٹھانے کی ہمت نہیں رہی۔ اول تو سب کچھ ویران اور تباہ ہو گیا تھا۔ اُس پر اُن کا بیہودہ مذاق۔ جیسے واقعی میرے سینے میں بھاری سیسے اور تانبے کی دو گولیاں پیوست ہو گئی ہوں۔ مَیں ایک دم گھبرا کر باہر نکلا اور واپس حبیب علی کی دُکان کی طرف چل پڑا۔ یہ سب کچھ میرے بس سے باہر ہو چکا تھا۔ دل تیز دھڑکنے لگا تھا۔ جس انسان پر پے بہ پے مصیبتوں کے ہتھوڑے چلے ہوں وہ اگر ٹوٹا نہ ہو تو اندر سے شکستہ ضرور ہو جاتا ہے، یہی کیفیت میری تھی کہ مَیں اب چلتا پھرتا ایک نازک سا شیشہ رہ گیا تھا اور ہر معمولی ٹھوکر مجھے بکھیر کے رکھ دینے میں کافی تھی۔

بازار کے دونوں طرف سے درختوں کا قتل عام اور اِدھر اُدھر سے پلازوں کا جنم میرے دل کو کھا گیا تھا۔ مَیں شاداب سائیکلوں والی دکان سے آگے نکلا اور ڈوبتے ہوئے دل کو اچانک تھوڑا سا سہارا ہوا۔ میرا خدشہ غلط ثابت ہوا۔ حکیم فتح دین کا مطب ابھی تک باقی تھی۔ اُس کے سر پر کھڑے نیم اور پیپل کے جڑواں درخت بھی باقی تھے۔ مَیں بے ساختہ دکان میں داخل ہو گیا اور فتح دین کے لڑکے سے کہا، بیٹے ایک گلاس صندل کا شربت دو ذرا۔ یہ لڑکا مجھے نہیں پہچانتا تھا اور اس کا باپ یہاں موجود نہیں تھا۔ وہاں مَیں نے آملے کا مربہ کھایا اور شربت کا گلاس پیا اور آدھا گھنٹا اُس لکڑی کے بینچ پر گویا لیٹا رہا جس پر بیٹھ کر لوگوں نے اُسے ملائم اور چمکدار بنا دیا تھا۔ پیسے دیتے ہوئے، مَیں نے لڑکے سے کہا، بیٹے آپ اِس مطب کو بیچو گے تو نہیں؟

کسے؟ لڑکے نے حیرانی سے پوچھا۔

یہی اپنی اِس مطب کی دکان کو؟

ہم کیوں بیچیں گے؟ اِسے بیچ کے ہم نے اپنے ابا سے قتل ہونا ہے۔

میری زبان سے نکلا، یا اللہ اِس کے والد کی زندگی ہزار برس سے کم نہ کرنا۔ اُس لڑکے کو میری بات کی سمجھ نہیں آئی، وہ ٹک ٹک مجھے دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ مَیں پونے دو بجے واپس حبیب علی کی دکان میں داخل ہو گیا۔ میرے جاتے ہی اُس نے نوے ہزار روپیہ پہلے میرے سامنے رکھا اور بعد میں کھانا میز پر پھیلا دیا اور بولا، یہ دو سو اوپر نوے ہزار ہیں۔ آج کل سونے کا بھاؤ اتنا ہی ہے۔ اللہ کرے شیزا کو صحت عطا ہو۔

(۷۷)

مَیں دو بجے اسلام آباد پہنچا۔ مجھے والد صاحب کے معاملے میں پانچ دن لگ گئے تھے۔ آج چھٹے روز مَیں یہاں پہنچا تھا۔ رات کے دو بجے تھے۔ مجھے قرار تو بالکل نہیں تھا اور کسی صورت جلد شیزا کی شکل دیکھنا چاہتا تھا۔ کینسر کے مریض کا ایک معاملہ یہ ہوتا ہے کہ اُسے مسلسل پین کلر انجیکشن میں رکھا جاتا ہے۔ ایسا نہ ہو تو تکلیف اتنی شدید ہوتی ہے کہ مریض اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہ انجیکشن اور دوائیاں اُسے بے ہوشی اور نیم بے ہوشی میں رکھتی ہیں مگر ایک وقت میں پین کلر دوائیاں بھی بے اثر ہو جاتی ہیں۔ اگر ایسا معاملہ پیش آ جائے تو مریض کے لیے جتنا عرصہ زندگی کی سانسیں چلتی ہیں، وہ عذاب میں چلتی ہیں۔ مَیں ہسپتال پہنچا تو دیکھا یوحنا کی بیوی وہاں موجود تھی۔ اُس نے بتایا عابد حسین کی بیٹی یہاں سے رات گیارہ بجے گئی ہے۔ اُنھوں نے شیزا کی نگہداشت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ یہ اب بے ہوشی اور نیند میں ہے کل صبح نو بجے شاید ہوش آئے گا۔ یہ سُن کر مَیں شیزا کے کمرے میں داخل نہیں ہوا۔ واپس درجہ سوم کی کالونی میں آ گیا۔

اگلے دن صبح آٹھ بجے میری آنکھ کھلی۔ مَیں کچھ کھائے پیے بغیر پیدل چل پڑا اور آدھ گھنٹے بعد دوبارہ شیزا کے وارڈ کے سامنے پہنچ گیا۔ مَیں نے شیزا کے پاس جانے سے پہلے نرس سے بات کی۔ مَیں یہ بتا تا چلوں کہ اب ہسپتال کا پورا عملہ ڈاکٹروں سے لے کر نرسوں تک میرا واقف ہو چکا تھا۔ حتیٰ کہ وہاں کے بھنگی بھی میرے ساتھ ہمدردی کرنے لگے تھے۔ یوحنا بھی اُنھی میں سے ایک تھا۔ نرس نے

مجھے بتایا کہ اب وہ بیدار ہو چکی ہے لیکن ایک بات کے بارے میں خبردار کرتی جاؤں کہ اُس کے پاس زیادہ دن نہیں ہیں۔ نرس کا یہ جملہ ایسا چمٹا تھا جس نے سُرخ انگارہ میرے کلیجے پر رکھ دیا۔ مَیں وارڈ میں داخل ہوا تو عابد حسین کا بیٹا وہیں تھا۔ مَیں اُن کا کیسے شکر ادا کروں؟ اب تو مَیں ایک لاچار شخص کی طرح ہو گیا تھا۔ اُس نے مجھے ملتے ہی بتایا، شیزا کی حالت پہلے سے بہتر ہے لیکن ڈاکٹر کچھ زیادہ پُر اُمید نہیں ہیں حالانکہ شیزا اب مسلسل ہوش میں ہے اور آپ کے بارے میں بہت پوچھ چکی ہے۔

اگر وہ ہوش میں بھی ہے اور پہلے سے بہتر بھی نظر آ رہی ہے تو نا اُمیدی کی کون سی بات ہے؟ مَیں نے نرس کے ساتھ تلخی سے بات کی۔ مجھے بعض اوقات لگتا تھا یہ لوگ ہم سے جان چھڑانا چاہتے ہیں حالانکہ مَیں نے اِن کی خدمت میں کوئی کوتاہی نہیں کی تھی۔

ضامن صاحب آپ غصہ نہ ہوں، نرس نے جواب دیا، مجھے نرس کی ڈیوٹی کرتے بیس سال ہو گئے ہیں۔ مَیں اپنے بیس سال کے تجربے سے یہ بات کہہ رہی ہوں۔ موت سے کچھ دن پہلے آدمی ایک طرح سے جنگ ہار جاتا ہے اور موت کو قبول کر کے مطمئن ہو جاتا ہے۔ اُس اطمینان کو ہم اُس کی صحت کی بحالی سمجھ لیتے ہیں حالانکہ وہ موت کا پیغام ہوتا ہے۔

مجھے اُس کی منطق سمجھ نہیں آئی اور مَیں قریباً دوڑتا ہوا شیزا کے بیڈ کی طرف گیا۔ مَیں بہت دِنوں کے بعد ملا تھا۔ مجھے یقین تھا مریض کے ساتھ جب اُس کے گہرے رشتے کا تعلق ٹوٹ جائے تو دو میں سے ایک کام ہوتا ہے، مریض صحت یاب ہو جاتا ہے یا آخرت کی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ یہ میرا تجربہ رہا تھا۔ آپ اِس میں کسی قسم کی منطق تلاش کریں تو نہیں ملے گی۔ جیسے ہی اُس کے بیڈ پر پہنچا میرے لیے اِن دونوں حالتوں میں سے ایک بھی منتظر نہیں تھی البتہ اُسے دیکھتے ہی میری آنکھوں پر ایک ہتھوڑا لگا۔ جیسے ایک چھپاکے کے ساتھ کسی نے اچانک پردہ ہٹا دیا ہو۔ اُس پردے کے دوسری طرف جو تصویر تھی وہ بہت ڈرا دینے والی تھی۔ اچانک مجھے لگا میری زندگی نے لمحے کے ہزارویں حصے میں سابقہ زندگی کا سفر طے کر لیا تھا اور یہ سفر ایسے دائرے میں تھا جس کا مَیں تصور بھی نہیں کر سکتا۔ بیڈ پر آنکھیں بند کیے پڑی شیزا کی شکل عین بہ عین عدیلہ کے بیٹے عماد کی تھی۔ وہ عماد جو میرے لیے ایک کراہت آمیز بھوت تھا۔ ایسا بھوت جس کی ہڈیوں پر سکڑی ہوئی سیاہ ربڑ چڑھی تھی۔ مَیں شیزا کو دیکھ کر ایک دم ڈر گیا۔ مجھ پر یہ انکشاف پہلے کیوں نہ ہوا تھا؟ حیرت تھی کہ وہ اِس شکل کے ساتھ نہایت پُرسکون انداز میں لیٹی ہوئی تھی۔ یہ اچانک کیا ہوا تھا۔ کوئی کایا کلپ ہوئی تھی؟ مَیں پچھلے ایک سال سے اُس کی خبر گیری میں لگا

ہوا تھا، اُس کے شاداب چہرے سے لے کر سیاہ ہڈیوں کی گٹھڑی بننے تک پہلے مجھے یہ شکل ویسی نہیں لگی تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی، مَیں شیزا کے بستر کے پاس کھڑا تھا یا عدیلہ کے بیٹے عماد کے سر پر کھڑا تھا جسے مَیں اپنی طرف سے تیس سال پہلے دفنا چکا تھا۔ اچانک یہ کیسے ممکن تھا کہ شیزا تیس سال پہلے مرے ہوئے عدیلہ کے بیٹے عماد کی کایا کلپ ہو جائے۔ مَیں کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا تھا؟ بالکل وہی گڑھے میں بیٹھی ہوئی موٹی آنکھیں، ویسی ہی باریک اور سکڑی ہوئی سیاہ اُنگلیاں۔ سر سے گنجی اور اُسی طرح ٹانگوں کی ہڈیاں پیٹ سے لگائے ہوئے لیٹی تھی۔ مَیں گھبرا گیا اور رو پڑا۔ میرا رونا مجھ سے لاکھ کوشش کے باوجود ضبط نہیں ہو سکا۔ وقت کے اِس لمحے مجھ پر ایسا انکشاف بے معنی نہیں تھا۔ میری والدہ کا مجھے عدیلہ کی امانت سونپ دینا۔ مَیں نے پہلے یہ کیوں نہیں سوچا تھا کہ یہ زینت کی بیٹی بھی ہو سکتی ہے۔ اُنھی میں سے خون کا ایک لوتھڑا جنھیں جلد برپا ہونے والے صدمات کھا گئے۔ مَیں عماد کے سیاہ بھوت سے کس قدر کراہت کھاتا تھا اور اُس کی بہن زینی پر حیران ہوتا تھا کہ وہ اِتنے کریہہ اور غلیظ بندے کو چھو رہی ہے۔ اُس کے ہاتھ دُھلاتی ہے، اُس کی مردہ آنکھوں کو دھوتی ہے، حتیٰ کہ اُس کے ماتھے کو بوسے دیتی ہے۔ اِس کے ہاتھوں کو اگر یہی بیماری لگ گئی تو کیا ہوگا۔ اِسے ذرا بھی جھجک اور کراہت محسوس نہیں ہوتی؟ لیکن اب مَیں، جسے ایک سال یہی کچھ کرتے ہو گیا تھا، بالکل بھی محسوس نہیں ہوا تھا کہ کسی کریہہ جسم کو چھو رہا ہوں بلکہ اُسے چھونے اور محبت کرنے کے لیے ابھی بھی بے چین ہو جاتا تھا۔ یہ زندگی اور اِس کے اُصول کیسے عجیب تر، بیہودگی کی حد تک عجیب اور بے ڈھنگے، خوبصورت اور ناسمجھ میں آنے والے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ اب میری ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ اُسے آواز دوں مگر مَیں نے آواز دے دی اور اُس سے دگنی محبت سے آواز دی جس محبت کو اُس کے لیے چھ دن پہلے مَیں چھوڑ کر گیا تھا۔ مَیں نے اُس کے کان کے قریب ہو کر کہا، شیزا مَیں تیرا ضامن آ گیا ہوں اور بے اختیار رو پڑا، مَیں نے روتے ہوئے کہا، شیزا دیکھو پھر تیرے پاس آ گیا ہوں۔ شیزا نے میری آواز پر آہستہ سے اپنی مردہ آنکھوں میں ''جنھیں مردہ کہنے سے مجھے سخت تکلیف ہوتی ہے'' ہلکی سی جنبش کی اور آنکھیں کھول دیں۔ یہ واقعی عماد کی آنکھیں تھیں یا پھر شیزا کی تھیں؟ جس کی بھی تھیں مجھے کائنات سے زیادہ عزیز تھیں۔ اُس نے اُنھی آنکھوں کے اشارے سے مجھے دیکھا اور مَیں نے اپنا منہ اُس کی ہڈیوں کے کھونچے پر رکھ دیا۔ اِسے آپ شیزا کا چہرہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اب اُس کے آنسو نہیں گر رہے تھے۔ اس نے اپنے ہاتھ کو ہلکی سی

جنبش دی اور پاس بیٹھنے کے لیے کہا۔ مَیں پاس بیٹھ گیا اور اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ آخر مَیں نے زینی کی بیٹی کو تلاش کر لیا تھا لیکن کیا ابھی اُس کو بتا دوں؟ مگر نہیں، اب جو بھی ہو چلنے دیا جائے۔

اُسی لمحے اُس نے اشارہ کیا، مَیں اپنے کان اُس کے قریب لاؤں۔ مَیں نے اپنے آپ کو شیزا کے حوالے کر دیا۔ اپنے کان بالکل اُس کے ہونٹوں کے پاس لے گیا تب میرے کانوں میں ہلکی سی لرزش ہوئی، شیزا بولنے لگی تھی۔ ضامن تم آ گئے ہو۔ افسوس مَیں تمھارا استقبال آنسوؤں سے نہیں کر سکتی۔ وہ خشک ہو چکے ہیں۔

مَیں شیزا کے اِس جملے کا کوئی جواب نہیں دے سکا اور دل بھینچ کے رہ گیا۔

ضامن، وہ دوبارہ بولی، مَیں تمھیں اپنے بارے میں پوچھنے سے ڈانٹتی رہی۔ مجھے افسوس ہے۔

شیزا میرے لیے بس تمھی اہم ہو، تمھارے آگے پیچھے سے مجھے کچھ لینا نہیں، مَیں نے دل گرفتگی سے جواب دیا۔

اُس نے میری اس بات پر آنکھیں بند کر لیں اور کچھ دیر تھکاوٹ کے سبب خاموش رہی، پھر ایک ہی دم آنکھیں بند کیے ہوئے بولی، شاید تمھیں میری اصل کا اندازہ ہو کہ مَیں کون ہوں مگر مروت میں باور نہیں کرا رہے۔ جو کچھ بھی ہے، مَیں آج تمھیں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔ مجھے اپنے آپ پر نہیں اپنی ماں پر رحم آ رہا ہے۔

مَیں دھڑکتے دل کے ساتھ اُس کی بات سننے کے لیے تیار ہو گیا۔

وہ کمزور آواز میں بولنے لگی، ضامن میری ماں کا نام زینت ہے اور باپ کا نام جنید۔ باپ مارا جا چکا ہے۔ میری دادی کا نام ڈاکٹر فرح ہے۔ وہ بھی قتل ہو گئی ہے لیکن قتل ہونے سے پہلے وہ ہمیں کراچی سے یہاں اسلام آباد لے آئی اور میری ماں کو اُس نے گھر سے نکال دیا۔ مَیں اسلام آباد کی زندگی میں اپنی والدہ، جو ایک دیہاتی اور غریب عورت تھی سے ملنے سے گریز کرتی رہی۔ اس لیے اُس کے متعلق کسی کو نہیں بتایا۔ میری ماں پاکپتن کے ایک گاؤں ''کماری والا'' میں ہے۔ مَیں نے ایک بار اُس کے متعلق پتا کیا تھا، وہ وہاں لوگوں کا علاج معالجہ کرتی ہے اور اُس زندگی میں خوش ہے۔ وہاں وہ شاد بیگم کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔ یہ نام اُسے میرے باپ نے دیا تھا جب وہ اُسے کراچی بھگا لایا تھا۔ جب سے میری دادی نے اُس کو نکالا ہے تب سے اُسے ہمارا نہیں پتا چلا اور نہ ہم نے اُس کی خبر لی۔ پلیز اُسے میری خبر کر دو کہ مَیں جانے والی ہوں۔ تم آج ہی نکل جاؤ۔ چلے جاؤ گے نا؟ اس وقت تک

ئیں اپنے آپ کو مرنے سے روک لوں گی لیکن جلدی کرنا میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ شاید آج یا کل کومے میں چلی جاؤں اور اُس سے اگلے دن کہیں اور۔

مَیں شیزا کی بات سُن کر کئی ہنگاموں کو ایک ساتھ طے کر گیا۔ یا خدا تُو عجیب ہے، کتنا عجیب ہے؟ اور وہیں بلک بلک کر رونے لگا۔ اتنا درد مَیں نے اپنے اور شیزا کے اُن لمحوں کے درمیان محسوس کیا کہ کائنات سمٹ کر اُسی درد میں غائب ہو گئی اور فقط درد اور کرب رہ گیا۔ اِس دوران شیزا کا ہاتھ میرے ہاتھ کے اُوپر رہا جیسے وہ مجھے دلاسے دے رہی ہو۔ مَیں بہت دیر روتا رہا۔ آخر زندہ انسان کو ٹھہراؤ آ جاتا ہے، مجھے بھی آ گیا۔

مَیں نے کہا، ہاں شیزا مَیں آج ہی اُس کی طرف جاتا ہوں لیکن تجھے کچھ نہیں ہو گا۔ مَیں ایک لاکھ روپیہ تمھارے لیے مزید لے آیا ہوں۔ اب ان شاء اللہ تم ٹھیک ہو کر رہو گی۔ گھبراؤ نہیں۔ میری شیزا تمھیں پتا ہے، یہ تمھارے ہی پیسے تھے جو میری ماں کے پاس امانت پڑے تھے اور مَیں ضامن علی اُسی گاؤں میں تمھاری ماں کا پڑوسی تھا۔ تمھاری دادی، والد اور ماں مجھے بہت اچھی طرح جانتے تھے۔
میری بات سن کر شیزا کی آنکھیں ایک دم بہت کھل گئیں، اُس نے میرا ہاتھ دبا لیا اور مَیں نے اُسے بے اختیار چومنا شروع کر دیا۔ اُس کے بعد خدا جانے مَیں کتنی دیر شیزا سے لپٹا رہا۔

(۷۸)

شام چار بجے کا وقت تھا اور میرا رُخ پیدل ہی یوسف کے گھر کی طرف تھا۔ یوسف اور اُس کی بیٹی ہسپتال ہی میں میرے واقف ہوئے تھے۔ دو مہینے پہلے ہی ریٹائرڈ ہو گئے تھے۔ بنیادی طور پر دونوں میاں بیوی شریف النفس اور کم معاوضے پر زیادہ کام آنے والے لوگ تھے۔ ایف سیون کی کچی آبادی میں اِن کا قیام تھا۔ یوسف ہسپتال میں کام کرنے کے علاوہ بوٹ لیگر کا کام بھی کرتا تھا۔ اس معاملے میں یہ ایک دو دفعہ تھانے کی ہوا بھی کھا چکا تھا۔ اِن کی شراب کا تمام کاروبار ہسپتال میں طے پاتا تھا اور ہسپتال کے ایک کمرے میں شراب کو سٹور کر کے رکھتے تھے، جہاں یہ اپنے وائپر، جھاڑو اور دیگر صفائی کا سامان رکھتے تھے۔ چونکہ اِس طرح کے کمرے میں کوئی شریف آدمی جانا پسند نہیں کرتا جہاں گندگی صاف کرنے کا سامان پڑا ہو چنانچہ یہی کمرہ ان کی سپلائی کے کام کے لیے مفید تھا۔ یوسف مختلف صاحبوں یعنی بڑے بڑے افسروں، بیوروکریٹس اور اپنے دیگر گاہکوں کے لیے اُن کی پارٹیوں اور نجی محفلوں میں استعمال ہونے والی شراب کی بوتلیں پہلے یہاں لا کر رکھتا، پھر اُنھیں اپنے گاہکوں تک پہنچاتا تھا۔ اگرچہ اس کی بیوی بھی اِس کے کام میں مکمل ہاتھ بٹاتی۔ اگرچہ وہ یوسف کے مقابلے میں زیادہ سمجھدار تھی اور مجھ سے ناراض تھی۔ اُس کی وجہ یہ تھی کہ ایک دفعہ مَیں نے پیسوں کی قلت کی وجہ سے یوسف کی شراب کی تین بوتلیں چوری کر لیں اور اُنھیں مہنگے داموں بیچ کر کچھ رقم بنالی تھی۔ یہ بلیک لیبل کی مہنگی بوتلیں ایک مخصوص پارٹی میں جانا تھیں اور نہ جا سکیں۔ یوسف کو جب عین وقت پر یہ بوتلیں نہ

ملیں تو اُسے سخت سزا دی گئی اور تھانے سے لتر پریڈ کروائی گئی۔ تھانے میں جس دن مَیں درخواست دینے گیا تھا، وہ یوسف کی لتریشن ہو رہی تھی۔ صاحب لوگوں کو گمان ہوا یوسف اُن کے پیسے کھا گیا ہے اور تیسرے درجے کی شراب اُنھیں دے گیا ہے۔ مجھے شراب چوری کرتے کسی نے دیکھا تو نہیں تھا مگر یوسف اور اُس کی بیوی کو مجھ ہی پر شک تھا کیونکہ واحد مَیں ہی تھا جو اُن کے اِس مال خانہ کو جانتا تھا۔ وہ ظاہراً تو مجھے پوچھنے کی جرات نہ کر سکے مگر مجھ سے ایک فاصلہ اختیار کر لیا اور اب مجھے دوبارہ اُن سے کام پڑ گیا تھا۔ مجھے امید تھی وہ اپنا غصہ تھوک دیں گے اور مجھ سے پیسے لے کر میرے لیے کام کر دیں گے۔ مَیں اِس کے عوض اُن کا سابقہ قرض بھی چکا دینا چاہتا تھا۔

حالات کی ستم ظریفی کہیے یا عادت کی دلفریبی کہ پے در پے ٹوٹنے والی معاشی اور سماجی بجلیوں نے مجھے پیدل خرامی کا عادی کر دیا تھا۔ ہوا کافی نرم تھی اور درختوں کے دیوہیکل پرندے اپنی شاخوں کو پھڑ پھڑا رہے تھے۔ میرا خیال تھا اب مجھے اسلام آباد سے باہر نہیں جانا چاہیے۔ شیزا کی حالت زیادہ ٹھیک نہیں تھی اور ممکن تھا وہ میرے جانے کے بعد زندہ نہ رہے۔ اِس بات کا مجھے بہت قلق ہوتا۔ کم از کم مَیں اُس کی موت کے وقت اُس کے سرہانے نہ سہی، قریب ضرور رہنا چاہتا تھا۔ زندگی مجھ سے اِس کے علاوہ کوئی مقصد نہیں چاہتی تھی۔ نہ ہی مَیں لوگوں کی زبان سے یہ لفظ ادا ہوتے دیکھنا چاہتا تھا کہ دیکھیے صاحب، بچاری کا کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ آخری وقت پر ضامن بھی چھوڑ گیا۔ مَیں یوسف کو شیزا کی ماں زینت، جواب شاد بیگم ہو چکی تھی، کے پاس بھیجنے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ مَیں جیسے ہی بلیو ایریا عبور کر کے ایف سیون کی کچی آبادی کی طرف مُڑا، عین نالے کے اُوپر جنگلی شہتوت کی لکڑی سے بنائے ہوئے پگڈنڈی نما پُل کے پاس یوسف کی بیوی مل گئی۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھہر گئی اور وہاں آنے کا سبب پوچھا۔ میں نے اُس سے کہا مجھے یوسف سے ایک ضروری کام ہے۔ اُس سے ملنے کے لیے آیا ہوں۔ یوسف کی بیوی نے ناگواری سے میری طرف دیکھا مگر کوئی بھی سخت جملہ زبان سے نکالنے سے پرہیز کیا اور بولی، یوسف ایف سکس تھری میں عابد ڈار صاحب کے گھر کی صفائی کے لیے گیا ہے۔

اُن کے گھر کا پتا بتا سکتی ہیں؟ مَیں نے یوسف کی بیوی سے التجا کی۔

مارگلہ روڈ پر تین نمبر گلی میں اٹھارہ نمبر کوٹھی اُنھی کی ہے۔ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی مگر جاتے ہی واپس پلٹی اور بولی، کیا ایک بار پھر اُسے پولیس سے پکڑوانا ہے؟

یوسف کی بیوی کی یہ بات سُن کر مَیں شرم سے ایک دم نگاہیں نیچی کر کے کھڑا ہو گیا۔ واقعی اُس

نے بہت تکلیف دہ بات کی تھی۔ مَیں لاچار قدموں سے پیچھے مُڑا اور ایف سیون کی جناح سُپر کے دائیں طرف سے ہوتا ہوا ایف سکس تھری کی مغربی سڑک پر آ گیا۔ اب مجھے خیال آیا کہ ٹیکسی لے لینی چاہیے۔ ایک تو مَیں تھک سا گیا تھا اور دوسرا یہ کہ مَیں جلد کسی کو زینت کے پاس بھیجنا چاہتا تھا۔ ٹیکسی نے چالیس روپے لیے اور مجھے مارگلہ روڈ پر ہی اُتار دیا۔ شام کے سائے بڑھنے لگے تھے اور پیپلوں کے پتوں کی آواز میں پہلے سے زیادہ اُداس گیت رچ گئے۔ مَیں دو چار منٹ پیدل چل کر اٹھارہ نمبر کوٹھی کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ دروازے پر ایک چوکیدار بیٹھا تھا۔ پچھلے کچھ سالوں سے بڑے صاحبوں کی کوٹھیوں پر چوکیداروں کی پلٹنیں بیٹھی نظر آنے لگی تھیں۔ یہ صاحبی عادات کی تشفی کے لیے تھا یا ضرورت تھی، مَیں اِس بارے میں لاعلم تھا۔ گلی میں مکمل خاموشی تھی۔ مَیں نے چوکیدار سے کہا، اِس کوٹھی میں ایک آدمی یوسف کام کر رہا ہے، ذرا اُسے بُلا دینا۔ اُس نے کچھ دیر میری طرف شک بھری نظروں سے دیکھا۔ اُنھیں شاید بتا دیا گیا تھا کہ سول افسر، فوجی افسر اور چوکیدار کے بارے میں افسرانہ فرمان ہے کہ یہ لوگ ہر ایک کو شک سے دیکھیں۔ مَیں اُس کے جواب کے انتظار میں تھا، کیا بولتا ہے؟ کچھ لمحوں بعد نہایت تکلف سے اپنی جگہ سے اُٹھا اور بغیر کچھ بولے اندر چلا گیا۔ لوٹا تو اُس کے ساتھ یوسف بھی تھا۔ یوسف میری حالت کو بخوبی جانتا تھا۔ اُس کی گرم جوشی پہلے والی تو نہیں تھی مگر مسکرا کر میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور چوکیدار سے کہا صاحب کو بیٹھنے دو۔ مَیں فوراً بولا، یوسف مَیں جلدی میں ہوں اور ایک ضروری کام سے تمھاری طرف آیا ہوں اور بیٹھنے کے لیے بالکل وقت نہیں ہے۔ ذرا میری بات سُن لو۔ یوسف ایک دو قدم آگے بڑھا اور بولا، جی ضامن صاحب خیر تو ہے۔؟

یوسف کیا تم کچھ وقت نکال کر پاکپتن کے ایک گاؤں میں جا سکتے ہو؟ بہت مصیبت آ پڑی ہے۔

نہیں صاحب، یوسف نے نہایت سپاٹ انداز میں جواب دیا، میری بیوی پہلے ہی مجھ سے طلاق لینے کے چکروں میں ہے۔ وہ مجھ سے بہت تنگ ہے۔ دوسری بات یہ کہ اِس کے علاوہ کل دو صاحبوں کے ہاں پارٹیاں ہیں۔ مجھے اُن میں شراب پہنچانی ہے۔ ورنہ دو مہینے تھانے کی ہوا کھانی پڑے گی۔

میں یوسف کے طنز کو نظر انداز کر کے بولا، کیا تم پارٹی میں شراب کی سپلائی کا کام کسی اور کے سپرد نہیں کر سکتے؟ میرا کام اِن سے زیادہ ضروری ہے۔

ضامن صاحب آپ اچھے بھلے سیانے ہیں، یوسف نے کہا، غریب لوگ اپنے ضروری کام خود

کرتے ہیں اور صاحبوں کے ضروری کام بھی وہی انجام دیتے ہیں۔ اِس لیے میری طرف سے پھر معذرت۔ اپنے کسی اور دوست کو کہہ لیں۔

اتنا کہہ کر یوسف گفتگو منقطع کر کے اندر چلا گیا اور مَیں نہایت غصے سے پیچھے مڑا۔ یہ بالکل ایسا نہیں تھا لیکن تھانے کی مار پیٹ نے اِسے بدل دیا تھا۔ مَیں نے یوسف پر لعنت بھیجی اور اُسی گلی میں چل کر ایک ویران سے پلاٹ سے گزرتا ہوا اُس سڑک پر آ گیا جہاں دونوں طرف جیکرنڈا کے درختوں نے چھاؤں کی ہوئی تھی۔ میرا سینہ ایک بے آواز کرب سے ہانپ رہا تھا اور قدموں میں بھاری وزن بندھ گیا تھا۔ شام کے آثار بالکل قریب تھے۔ جیسے ہی مَیں ایک چھوٹی سی پُلی پر پہنچا جہاں سے ایک چوڑی سڑک مارگلہ روڈ کو نکلتی تھی۔ وہاں اچانک میرے سامنے دو بُڈھے آ گئے۔ دونوں نے واکنگ جوگر پہن رکھے تھے اور پسینے سے شرابور تھے۔ اُن میں سے ایک نے نیکر اور شرٹ پہنی تھی اور ستر سال کے پیٹے میں تھا مگر ابھی تک ساٹھ سال کے شخص جیسی صحت میں تھا۔ مَیں نے اِسے فوراً پہچان لیا۔ اِس آدمی کو مَیں کیسے بھول سکتا تھا جس نے مجھے چھ ماہ تک حبسِ بے جا میں رکھا تھا۔ یہ وہی حرام خور سیکرٹری تھا جسے مَیں نے پہلے ایک بار نہیں تین سے چار بار اسلام آباد کی سڑکوں اور پارکوں میں نظر انداز کیا تھا حالانکہ اِسے دیکھتے ہی میرے سینے میں آگ جل اُٹھتی تھی۔ مَیں کوئی بھی عذر بیان کروں مگر سچ یہ ہے کہ مَیں اِسے کچھ کہتے ہوئے ڈرتا تھا۔ جس نے ملک کی حساس فائلوں کا سودا کر کے نجانے اسلام آباد کے ایف سکس میں کتنے پلاٹ اور کوٹھیاں بنا رکھی تھیں اور ملک سے باہر بزنس چلا لیے تھے۔ اُس کے بدلے میں مجھ جیسے کتنوں ہی کو ملک کا غدار ڈکلیئر کر دیا تھا۔ اب اِس میں اور کتے میں ذرا فرق نہیں رہا تھا۔ مجھے اچانک محسوس ہوا کہ یہ شخص قوت و اختیار سے بے دخل ہو چکا ہے اور محض ایک بوسیدہ گوشت کا ٹکڑا رہ گیا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اب مَیں اپنے آغاز و انجام سے بے خبر ہو گیا تھا۔ وہ اپنے ہی جیسے ملعون کے ساتھ روز ہوا خوری کر کے شہر کی ہوا کو جوٹھا کر رہا تھا۔ مجھے ایک دم کسی انجانی غیرت نے آ لیا۔ شاید یہ غیرت ہر طرف سے مکمل مایوسی اور ابھی ابھی یوسف کی بے مروتی کے سبب پیدا ہوئی تھی۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کوئی جذباتی لمحہ وارد ہو گیا ہو۔ عموماً اِس طرح کے لمحے کسی بھی انسان پر وارد ہو سکتے ہیں جس میں کسی طرف سے اُسے سوچنے کی بجائے عمل کرنے کا پیغام ملتا ہے۔ مَیں نے اُسی لمحے اُس واحد پُلی پر اُن کا رستہ روک لیا جہاں سے وہ گزرنے لگے تھے۔ یہ ایک گزرگاہ تھی جس کے دونوں طرف پانی تھا اور بڑی بڑی گھاس تھی۔ اُسی وقت اُس ریٹائرڈ فرعون نے مجھے پہچان لیا اور ایک دم مسکرا کر بولا، ہیلو ضامن کیا

حال ہے؟ پھر اپنے ساتھی کی طرف دیکھ کر کہا، معین سرور صاحب یہ ضامن ہیں۔ کسی وقت میرے ماتحت کام کرتے تھے۔

اب میرا پارہ پہلے سے بھی دگنا ہو گیا اور مَیں بولا، جی ہاں معین سرور صاحب مَیں اس گدھے کے ماتحت رہا ہوں۔ اِسی لیے جانتا ہوں کہ اِس کے پیٹ میں کتنے مُرداروں کا گوشت ہے۔

کیا بکواس ہے؟ رستہ چھوڑو۔

میری بات پر وہ ایک دم سُرخ ہو گیا۔ اُس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ اُسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ تعارف کا اگلا پتہ ذلت کی جہنم میں گرے گا۔ مَیں نے رستہ مزید بلاک کر دیا۔ ابھی تک آس پاس کوئی نہیں تھا اور میرے پاس وقت تھا کہ اپنی چھ ماہ کی صعوبت اور والدین کی مصیبت کا حساب جتنا بھی لے سکوں، اُسے وصول کر لوں۔ چنانچہ بات جاری رکھی۔

ارے بیگ صاحب آپ تو غصہ کرنے لگے، مَیں نے اُس کی آنکھوں میں خوفناک طریقے سے جھانکتے ہوئے کہا، حالانکہ یہ حق تو تب سے میرے پاس محفوظ ہے جب آپ نے اپنی سگی بیٹی کو فارنرز کے ہاتھ رہن رکھ کر مجھے چھ ماہ تک ایک جہنم میں رکھا اور میرے باپ کو پولیس سے ذلیل کراتے رہے۔

یہ کیا بک رہے ہو؟ اب وہ غصے سے کانپنے لگا۔ تم جانتے ہو مَیں تمھاری کیا حالت کرا سکتا ہوں؟ اور یہ کہتے ہی اُس نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا، چلیے معین صاحب، اِس شخص کا دماغ چل گیا ہے اور وہ دونوں پیچھے کی طرف مڑے۔

مَیں نے فوراً آگے ہو کر اُسے دوبارہ روک لیا، بیگ صاحب اتنی جلدی کہاں جاتے ہیں؟ دیکھیے آپ نے جو ابھی مجھے کہا کہ آپ میرے ساتھ کیا کر سکتے ہیں؟ بھلا یہ بات مَیں نہیں تو اور کون جانتا ہے،، جی ہاں جانتا ہوں۔ تم ایک کتے ہو اور مجھے دوبارہ بھی کاٹ سکتے ہو۔ اگرچہ ریٹائرڈ کتے ہو مگر ابھی آپ کے کئی ایسے اعلیٰ نسل کے ساتھی کتے ہوں گے جو آپ کے ایک اشارے پر مجھے چیر پھاڑ سکتے ہیں مگر دیکھیے نا جو وقار آپ کے گلے کے پٹے کو تب حاصل تھا، اب نہیں رہا۔ کتا تو پھر کتا ہے۔ اُسے ریٹائر ہونا ہی ہے۔

میرے اِن جملوں نے اُسے اپنے ساتھی کے سامنے بالکل ہی کیچوا بنا کر رکھ دیا۔ اُس نے مجھے مارنے کے لیے اچانک اپنی چھڑی ہوا میں بلند کر دی۔ یہی وہ لمحہ تھا جس کے مَیں انتظار میں تھا۔ اُس کا ساتھی البتہ اِس دوران حواس باختہ ہو کر پیچھے کی طرف بھاگنے کے چکر میں ہوا۔ مَیں نے فوراً اُس سے

چھڑی چھین لی اور ایک زبردست تھپڑ اُس کے منہ پر دے مارا۔ بڈھا اُس ایک تھپڑ ہی سے چکرا کر نیچے گر گیا۔ اُس کے گرتے ہی مَیں نے تیزی سے دوسری جانب دوڑ لگا دی اور آن کی آن میں دوسری، پھر تیسری گلی سے ہو کر غائب ہو گیا۔ مَیں نے پیچھے مُڑ کر نہیں دیکھا اور بھاگتے ہوئے اپنی رفتار ایسے رکھی جیسے معمول کی ورزش پر ہوں۔ کچھ ہی دیر میں میریٹ ہوٹل کے سامنے نکل آیا۔ یہاں سے مَیں نے ایک ٹیکسی لی اور واپس ہسپتال آ گیا۔ اب مَیں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ مَیں خود ''کماری والا'' جاؤں گا اور آج رات ہی نکل جاؤں گا۔

(۷۹)

مَیں پینتیس سال بعد پاکپتن کے ایک دُور دراز چھوٹے سے گاؤں ''کماری والا'' میں ایک خستہ مکان کے دروازے پر کھڑا تھا اور وہ میرے سامنے تھی۔ مَیں نے اُسے اُس مسافر کی طرح تلاش کر لیا تھا جس کی زنبیل میں صرف بُری خبروں کی پوٹلیاں بندھی ہوں۔ اُس وقت جب ہم جُدا ہوئے تھے، میرے خدوخال واضح ہو رہے تھے۔ تب میری کوئی مکمل شکل سامنے نہیں آئی تھی مگر زینت ایک بھرپور جوانی کے ساتھ خدوخال کی واضح شکل اختیار کر چکی تھی۔ یہی وجہ تھی آج بڑھاپے اور کسمپرسی کے زمانے میں بھی مَیں نے اُسے پہچان لیا تھا جب کہ وہ میرے نقوش کو یادداشت کے احاطے میں لانے سے قاصر تھی۔ اچانک اُس کی اُبھرنے والی آواز نے میرے تخیل کو روک دیا۔

جی آپ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟

مَیں اسلام آباد سے آیا ہوں، آپ سے ایک اہم بات کرنی ہے لیکن یہاں دروازے پر کھڑے ہو کر نہیں ہو سکتی۔ اگر آپ مجھے کہیں بیٹھنے کی جگہ دیں تو کچھ بات کہنے کے قابل ہوں۔

لیکن مَیں نے آپ کو پہچانا نہیں، یہیں بتا دیں جو بھی بات ہے۔ مَیں نے محسوس کیا وہ ڈر گئی تھی اور بات کرتے ہوئے لرزنے لگی۔

دیکھیں مَیں آپ کے لیے ایک نہایت ضروری خبر لایا ہوں۔ میرے پاس وقت کم ہے، مَیں نے زور دے کر کہا۔ مجھ سے مت ڈریں۔ ایک منٹ اکیلے میں وقت دیں۔

میری اِس بات پر اُس نے دروازے کو چھوڑ دیا اور مجھے گزرنے کا راستہ دینے کے لیے ایک طرف ہو گئی۔ جیسے ہی مَیں دروازے کے اندر ہوا، اُس نے دروازہ بند کر دیا اور میرے آگے چل پڑی۔ وہ بی بی جو پہلے اُسے اندر سے بلا کر لائی تھی، وہ بھی اُس کے ساتھ ہی چلنے لگی۔ یہ بات مجھے کوفت میں مبتلا کر رہی تھی۔ وقت بہت زیادہ گزر رہا تھا اور یہاں کوئی تنہائی دینے کو تیار نہیں تھا۔ شاد بیگم کے گھر میں دو کچّے کمرے تھے۔ اُن کے سامنے اچھا خاصا بڑا صحن تھا۔ صحن بہت سے چھوٹے بڑے درختوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک ٹاہلی کا بڑا درخت اِن سب پر حاوی نظر آ رہا تھا۔ کچھ فاختائیں اور لالیاں اُس کی شاخوں پر چہک رہی تھیں۔ اُسی ٹاہلی سے پرے سردیوں کی ٹھنڈی دھوپ میں ایک چارپائی پڑی تھی۔ اُس نے مجھے چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود ایک کمرے میں داخل ہو گئی۔ مَیں چارپائی پر بیٹھ کر اُس کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد باہر نکلی تو اُس نے اپنے کپڑے تبدیل کیے ہوئے تھے۔ ایک ہاتھ میں دیگچی تھی اور دوسرے میں دودھ کا ڈول تھا۔ اُس نے دودھ کا ڈول اور دیگچی ساتھ والی عورت کو تھمائی اور بولی، لے چاچی موجاں، چائے بنا دے۔

چاچی موجاں نے شاد بیگم کے ہاتھ سے چائے کی دیگچی اور ڈول پکڑا اور دیوار کے ساتھ بنے ہوئے چولہے پر بیٹھ کر آگ جلانے لگی۔ آگ کے لیے جمع کی گئی بہت ساری کیکر کی سوکھی لکڑیاں چولہے کے نیچے ڈال کر اُس نے آگ لگا دی۔ اُسے کام پر لگا کر زینت میرے قریب چارپائی بچھا کر بیٹھ گئی اور بولی، جی اب بتایئے، جب تک ماسی موجاں چائے بناتی ہے، آپ بات کر لیں اور پہلے بتائیں کہ آپ اسلام آباد سے یہاں کیوں آئے ہیں اور کون ہیں؟

شاد بیگم میں اُس گاؤں کا وہ چھوٹا بچہ ہوں، جسے تمھارے ہاتھوں کے لمس سکون دیتے تھے۔

کیا مطلب؟ اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔

غم کے ان شدید لمحوں میں زینت کی حیرانی کو طول نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں نے جلد اُس کی متجسس نگاہوں کو بھانپ کر کہا۔ مَیں پینتیس سال گزرے زمانے کا وہ لڑکا ہوں جسے تم ایک ڈسپنسری میں کھیلتے دیکھتی تھی اور ہنستی تھی۔ اُس وقت تم شاد بیگم نہیں زینت عرف زینی تھی۔

(وہ ایک دم کھڑی ہو گئی) وہ جو پڑوس میں چاچی زینب کا بیٹا ضامن علی؟

جی وہی۔ مَیں نے پرسکون ہو کر کہا۔

مائے تم کتنے بدل گئے ہو۔ یہ کہہ کر ایک دم کاٹ دینے والے جوش کے ساتھ میرے گلے لگ

گئی اور سر اور ماتھا چومنے لگی۔ اِسی عالم میں اُسے جذبات نے گھیر لیا۔ گلے لگ کر رونے لگی۔ اُس کی ہچکیوں کی آواز آہستہ آہستہ اتنی بلند ہو گئی کہ پہلے چولہے پر بیٹھی چاچی موجاں اُٹھ کر وہاں آ گئی۔ اُس کے بعد باہر بیٹھے ہوئے لوگ بھاگ کر اندر آنے لگے۔ زینت نے کسی کی پروا کیے بغیر مجھے بھینچ لیا۔ اِس سارے عالم میں میرے دل کی کیفیت ایسی بھر کر اُمڈ آئی کہ مَیں بھی رونے لگا۔ اُس سے بڑھ کے میرے لیے ایک کرب یہ بھی تھا کہ آج محض بچھڑے ہوؤں کو ملنا ہی نہیں تھا کہ رو دھو کر بس کر لیا جاتا بلکہ ایک عظیم صدمہ ابھی باقی تھا جو اِس جدائی کے آسیب سے کہیں بڑھ کر ماتم زدہ کرنے والا تھا۔ باہر سے لوگوں کے آنے پر اُس کے گھر کا صحن قریباً بھر گیا۔ لوگ اگرچہ میرے لیے اجنبی تھے مگر اُن کو کہیں یہ احساس ضرور تھا یہ شخص بہت ہی قریب کا اجنبی ہے۔ مجھے معلوم تھا یہ ڈاکٹرنی اِن لوگوں کے لیے کتنی اہم ہے اور یہ لوگ اِس کی کس قدر عزت کرتے ہیں لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ اِسے روتا دیکھ کر یوں بے چین ہو جائیں گے۔ تمام لوگ اُس کو پکڑ کر مجھ سے چھڑانے لگے اور دلاسے دینے لگے کہ کوئی بات نہیں بچھڑے ہوئے آخر ملے تو ہیں۔ یہ بات خوشی کے آنسو بہانے کی ہے۔ پرندے رونے دھونے اور شور و غوغا کے عادی نہیں تھے۔ وہ چند لمحوں میں درختوں سے اُڑ کر کہیں اور جا بیٹھے۔ تھوڑی دیر میں لوگ ہمیں دلاسا دے کر گھر سے نکل گئے اور اب ہم بیٹھے چائے پی رہے تھے اور یہی وقت تھا جب زینت کے لیے ایک نئے صدمے اور مصیبت نے پر پھیلانے تھے۔ مجھے اِس عورت کی خوبصورتی اور بد نصیبی کے درمیان ایسا رشتہ نظر آ رہا تھا جسے کم از کم اِس کی موت سے پہلے جدا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ کیسا دن تھا اور کس نوعیت کے بچھڑے ہوئے دوست تھے کہ اُن کے ملنے پر گزری رُتوں کی باتیں بھی نہ ہو سکتی تھیں۔ ایک نئی راہ کی دوزخ کا ہیولا سامنے کھڑا تھا۔ جب تمام لوگ گھر سے نکل گئے اور ہم دونوں وہاں موجود رہ گئے تو اِس سے پہلے کہ زینت کسی خوشی کی اُمید باندھتی مجھے اُس کو وہ خبر دینا تھی، جس کے بعد اُس کا تمام چین اور راحت غم کی آگ نے کھا لینا تھا۔ مَیں ہزار خواہش کے باوجود وہ دردناک خبر اُس سے روک نہیں سکتا تھا۔ میری حبیب ترین ہستی ہونے کے باوجود مَیں اُسے صدمہ پہنچائے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ مَیں نے زینت کے چہرے پر بھرپور نظر ڈالی اور اُسے کہا، زینت تم نے مجھے یہ نہیں پوچھا کہ مَیں یہاں کیسے اور کیوں پہنچا ہوں؟

کسی نے بتایا ہو گا کہ مَیں یہاں رہتی ہوں، ظاہر ہے اتنی مدت بعد جب کسی دوست کو پتا چلتا ہے کہ اُس کے لڑکپن کا ہم مزاج فلاں جگہ موجود ہے تو ملنے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ باقی تم بتاؤ

تمہیں میرا یہاں رہنا کس نے بتایا ہے؟

زینت کے اِس جملے سے یہ بات واضح تھی کہ اُسے اندازہ نہیں تھا وہ کس بھسم کردینے والی آگ کی چادر کو ابھی اوڑھ لے گی اور مَیں اُس پر جلد واضح کر دینا چاہتا تھا کہ وہ زیادہ خوش گمانی میں نہ رہے۔ جس قدر جلد ممکن ہو اُسے صدمے سے دو چار کر دیا جائے۔

مَیں نے کہا، مجھے اِس مقام کا پتا آپ کی بیٹی شیزا نے بتایا ہے۔

تم اُسے ملے ہو؟ وہ ایک دم اُٹھی اور بے چین ہو گئی۔

جی ہاں، پچھلے سات سال سے اُسی کے ساتھ تھا لیکن یہ انکشاف مجھ پر دو دن پہلے ہوا ہے کہ وہ آپ کی بیٹی ہے۔

میری بات سن کر زینت کے سر سے دوپٹا سرکنے لگا، وہ ہونق آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا جو مَیں کہہ رہا تھا، وہ سچ تھا۔

ضامن مجھے جلدی بتاؤ، وہ کہاں ہیں؟ مَیں نے کراچی میں ہر اُس شخص سے رابطہ کیا جس پر ذرا سا بھی شبہ تھا کہ مجھے میرے بچوں تک پہنچا دے گا مگر مَیں اُن کو نہیں ڈھونڈ سکی۔ تم نہیں جانتے میں کیسے تڑپ رہی ہوں۔ وہ اتنے پتھر دل نکلیں گے، مجھے اندازہ نہیں تھا۔ پچھلے سترہ سال سے مَیں اُن کی صورت دیکھنے سے ترس گئی ہوں۔ میرا کلیجا منہ کو آ رہا ہے۔ تم اُن کو اپنے ساتھ کیوں نہیں لے کر آئے؟ زینت اُس اونٹنی کی طرح باؤلی ہو گئی جس کے بچے صحرا میں گم ہو گئے ہوں اور وہ اِدھر اُدھر حواس باختہ بھاگتی پھرے۔

کیا اب اُس نے خود تمھیں بھیجا ہے؟ آخر اُس کے دل میں ماں کی محبت جاگ اٹھی ہے اور ذیشان کہاں ہے؟ اب تو وہ کافی بڑا ہو گیا ہو گا۔ زینت سوال پر سوال کیے جا رہی تھی اور مجھے حیرت تھی کہ اس کے گونا گوں تمام سوالوں کا میرے پاس صرف ایک جواب تھا۔

ذیشان بھی وہیں تھا، کچھ عرصہ پہلے، مَیں نے بتایا۔

وہیں تھا، کا کیا مطلب؟ کیا اب وہ وہاں نہیں ہے؟

وہ یورپ کے کسی ملک جا چکا ہے، مَیں نے مختصراً کہا۔

مَیں یہ سب کچھ یہاں نہیں بتا سکتا۔ آپ کو میرے ساتھ اسلام آباد چلنا ہو گا۔

ضامن علی مجھے صحیح صورت بتاؤ۔ مَیں پریشان ہو رہی ہوں، خیر تو ہے نا؟

مَیں زینت کے اِس سوال پر خموش ہو گیا، مجھے چُپ دیکھ کر وہ بہت زیادہ پریشان ہو گئی، چہرے کا رنگ سفید پڑنے لگا اور دل میں غم کی آگ سے سیاہ راکھ اُس کے اوسان کی پریشانی میں اُڑتی ہوئی صاف دِکھنے لگی۔ اُس کی یہ حالت دیکھ کر مَیں نے صرف اتنا کہا، تم تیار ہو جاؤ، ہم آج ہی اسلام آباد جائیں گے۔

میرے اِس جملے پر وہ شدید کرب کی حالت میں اُٹھی، اُس کے سر کا دوپٹا سرک کر زمین پر گر پڑا، جسے اُس نے نہیں اُٹھایا۔ مجھ سے ملنے کے بعد اُس کی جس حالت نے اُسے سرشار کیا تھا، اب اُسی نسبت سے بیزار کر دینے والی کیفیت میں جا رہی تھی۔

مَیں تمھارے ساتھ چلتی ہوں۔ یہیں ٹھہرو مَیں اندر سے پیسے لے لوں، یہ کہہ کر وہ جلدی سے اُٹھی اور دوڑ کر کمرے میں داخل ہو گئی۔ پھر چند ہی ثانیوں بعد میرے پاس آن کھڑی ہوئی۔ مجھے زینت کی بے چینی اور اضطراب سے شدید رنج ہو رہا تھا۔ سترہ سال بعد اپنی بیٹی کی زندہ لاش سے ملنے جا رہی تھی۔

ضامن علی تم بتاتے کیوں نہیں؟ کیا ذیشان پر کوئی حادثہ تو نہیں گزر گیا؟

اب میں نے فیصلہ کر لیا کہ زینت کو اِس پریشانی اور اذیت سے نکال کر یقینی غم کے سمندر میں پھینک دینا بہتر ہے۔ یہ عورت جسے میں نہ چاہ کر بھی تانبے کی گرم اور سُرخ دیگ میں ڈال دینے والا تھا، اُس کے لیے دونوں صورتوں میں اب غم کی تپش تو موجود ہی تھی مگر اِس سے بہتر ہے کہ وہ کشمکش سے نکل کر اصل صدمے سے دوچار ہو جائے۔ مَیں نے اُسے بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

ذیشان کو کچھ نہیں ہوا، وہ اپنی دنیا میں مست ہے البتہ تمھاری بیٹی مرنے والی ہے۔ مَیں نے آخر دل کی سنگ بستہ سرد مہری سے کام لے کر اُسے بتا دیا۔

میرے یہ الفاظ اتنے اچانک اور تیزی سے ادا ہوئے کہ زینت کو چند ثانیوں تک اُن کی معنویت کا اندازہ ہی نہیں ہو سکا۔ گویا میری آواز ایسا خوفناک بلاسٹ تھا جس نے سماعت چھین لی ہو اور ہر چیز بے آواز ہو گئی ہو۔ زینت کے لیے اِس سے بڑھ کر اور کیا خلا ہو سکتا تھا کہ وہ کچھ دیر کے لیے اُس سنگ کی طرح سرد ہو گئی جس میں زندگی کے آثار ڈھونڈنا اپنی ناکامی کا راستہ ڈھونڈنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ محض آنکھیں کھولے ایک ٹک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اُس کی مسلسل خموشی نے مجھے خوفناک بے چینی سے دوچار کر دیا۔ ایسا سکوت طاری تھا کہ مَیں لمحے بھر کو ڈر گیا۔ اِسی ڈر کی شدت سے میں نے

دوبارہ بولنا شروع کر دیا۔

اُسے بیماری کے ایسے آسیب نے پکڑ لیا ہے جس کے پنجے موت کی طرف بڑھتے ہیں اور کوئی تدبیر اُس کے شکار کو چھین نہیں سکتی۔ شیزا چند دِنوں میں مر جائے گی۔ زینت مجھے افسوس ہے مَیں ہزار تدبیروں کے باوجود اس کو بچانے سے معذور ہو گیا، یہ کہتے ہوئے مَیں خود رونے لگا۔

کچھ لمحوں بعد اُس پر سکتے کا عمل پگھلنے لگا، وہ ایک دم چیخ مار کر اٹھی اور بولی، کیا ہوا میری بیٹی کو؟ ضامن اُسے کیا ہوا، جلد بتاؤ؟ اور ذیشان کہاں ہے؟

مَیں نے روتے ہوئے جواب دیا، آپ کی بیٹی کو کینسر ہے۔ وہ اسلام آباد کے ایک ہاسپٹل میں موت کے بستر پر سانس کھینچ رہی ہے۔

اِس کے بعد زینت کربناک آواز سے باہر دوڑی، اُس کے سر سے دوپٹہ گر گیا تھا، پاؤں سے جوتے نکل گئے تھے۔ مَیں اُسی رفتار سے اُس کے پیچھے دوڑ رہا تھا اور میرے پیچھے چاچی موجاں دوڑی چلی آتی تھی۔

(۸۰)

اگلے دن صبح گیارہ بجے ہم دونوں اسلام آباد کے پولی کلینک میں جیسے ہی داخل ہوئے زینت کے قدموں کی رفتار اُس کے دل کی دھڑکن سے مشابہ ہو گئی۔ مَیں اُس کے ساتھ تھا لیکن اُسے دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ شیزا کی حالت ایسی نہیں تھی کہ ایک نارمل انسان اُسے ٹھہر کر دیکھ سکتا۔ آنکھوں کے ڈیلے چہرے کی ہڈیوں سے اُبھر کر اِتنے باہر آ گئے تھے کہ اُن کی پوری گولائی کا احاطہ کیا جا سکتا تھا۔ مَیں نے زندگی میں اتنی بڑی گولائی کی آنکھیں باہر نکلی ہوئی نہیں دیکھی تھیں۔ اُن آنکھوں میں روشنی کی بجائے موت کی دیوی بیٹھی مسلسل ڈیلوں کے اندر لوہے کی سیخیں مار رہی تھی۔ اِن کچوکے مارنے والی سیخوں سے دل کے اندر چھید صاف دیکھے جا سکتے تھے۔ زینت اپنی بیٹی شیزا سے سترہ سال بعد مل رہی تھی تو اُس کی بچپن کی شکل کا ہیولا اُس کی آنکھوں میں موجود ہو گا جو اُسے اِس حالت کا یقین دلانے سے مانع تھا۔ اپنی زندہ اور خوبصورت بیٹی سے جدا ہونے کے بعد ملاقات کے وقت ایک مردے سے ملنا ہرگز ایسی چیز نہیں ہے جسے بیان کرنے کی قوت کسی میں موجود ہو۔ یہی بے بسی مَیں خود محسوس کر رہا تھا۔

پولی کلینک اسلام آباد میں ایک اچھا ہسپتال تھا۔ اِس میں کسی لاوارث کا علاج اپنی طرز کی ایک معجزنمائی تھی۔ اُس کے لیے اِن ماں بیٹی کی شکرگزاری میرے لیے بہت تھی مگر اُس کا موقع اب کبھی نہیں آ سکتا تھا کہ موت ہر شکرگزاری کو ختم کر دیتی ہے اور ہر مروت کو بہا کر لے جاتی ہے۔

جیسے ہی شیزا کا کمرہ سامنے آیا، مَیں پیچھے رُک گیا۔ زینت نے ایک آنکھ مجھے دیکھا اور مَیں نے

اُسے آگے جانے کا اشارہ کر دیا۔ اُس کے ساتھ کمرے میں داخل ہونے کی میری ہمت نہیں ہو رہی تھی۔
یہ ایک طرح سے میری اپنے ساتھ ہمدردی تھی۔ مَیں کمرے کے باہر کھڑا ہو گیا اور اُس کرب ناک
اذیت سے بچ گیا جو اُس وقت پیدا ہونے والی تھی۔ زینت بھاگ کر کمرے میں داخل ہو گئی۔ اُس کے
پیچھے کمرے کے عین دروازے پر کھڑا تھا۔ زینت نے جیسے ہی بیڈ کو دیکھا وہ ایک دم جھٹکے سے رُک گئی
جیسے کسی غلط جگہ داخل ہو گئی ہے۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ سامنے پڑا ہڈیوں کا ڈھانچا، جس کے ماتھے
پر آنکھوں کی بجائے کانچ کے بڑے کینچے ٹکائے گئے ہیں، واقعی اُس کی بیٹی شیزا ہے؟ یا اُس کے بھائی کا
وہ ڈھانچا ہے جسے وہ پینتیس سال پہلے دفنا چکی تھی اور ایک بار پھر اُس کی زندہ لاش سے وہ سامنا کر رہی
تھی۔ زینت چند ثانیے کے کچھ حصے رُکی کہ حیرانی نے اُس کو سکوت کا لمحہ نوازا تھا۔ اُس کے بعد
بے خودی میں آگے بڑھ کر چیختی ہوئی اپنی بیٹی کے ساتھ جا چپکی۔ شیزا جس بیڈ سے ٹیک لگا کر لیٹی تھی وہ
پچھلی طرف سے تھوڑا سا بلند کیا گیا تھا۔ اُس کے سر کے بال اُڑ چکے تھے۔ جسم لکڑی کی خشک پتلی
شاخوں کی شکل میں بے طرح کی کیفیت میں بے سُدھ تھا۔ مَیں نے کمرے کا دروازہ فوراً بند کر دیا۔ مَیں
جانتا تھا ہسپتال کا عملہ اِس بات کی اجازت نہیں دے گا کہ یہاں رونا دھونا مچے۔ اِس سے مریض کی
حالت بگڑنے کا اندیشہ بڑھ جاتا ہے مگر جہاں مریض موت کے انتظار میں ہو وہاں ایسی احتیاطیں بھی
قابلِ جرم ہوتی ہیں۔ مَیں چاہتا تھا ماں بیٹی جی بھر کر رو لیں۔ جی بھر کر قسمت کی بدتوفیقی کو دشنام کر
لیں۔ خدا کی لاپروائی پر طعنہ زنی کر لیں۔ مجھے یہ کرب اور یہ اذیت اُن چند لمحوں میں بہتر محسوس ہوئی تھی
جس کا سامنا مَیں کتنے عرصے سے تنہا کر رہا تھا۔ مَیں نے دیکھا شیزا کے آنسو گالوں پر متواتر بہنے لگے
تھے۔ اُس کی بولنے اور لمس لینے کی قوت سلب ہو چکی تھی، محض آنکھوں کا نور تھا، جس سے اندازہ کر سکتی
تھی کہ کوئی اُس کا اپنا آیا ہے۔ اُس نے اپنے کمزور ہاتھوں کو مشکل سے ماں کے گلے میں ڈالا اور اُس
کے چہرے پر اپنی آنکھیں ملنے لگی جو اُس کے پورے جسم پر واحد جاندار شے نظر آ رہی تھیں اور کچھ ہی
دنوں میں یہ بھی بے نور ہونے والی تھیں۔ زینت گڑگڑا کر اور دھاڑیں مار کر رونے لگی تھی۔ مجھے نہیں
معلوم اِس وقت اُسے کسی صبر کا مفہوم سمجھایا جا سکتا تھا یا اُسی حالت میں رہنے دیا جانا چاہیے تھا۔ مَیں
نے فیصلہ کیا تھا اِن کو کچھ دیر کے لیے اِسی حالت میں چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل جاؤں اور مَیں کمرے
سے باہر نکل گیا تھا۔ چاچی موجاں دروازے پر کھڑی تھی۔ وہ ابھی تک حیرتوں میں گم کسی شے کو سمجھنے سے
... نظر آ رہی تھی۔

باہر ایک نرس اِس تمام حالت کو دیکھ کر پریشان کھڑی تھی۔ مَیں نے اُسے اشارے سے پاس بلایا اور منت کی، مادام مہربانی کریں کچھ لمحوں کے لیے مریض کی ماں کو وہیں رہنے دیں۔ وہ بہت جلد رخصت ہو جانے والی اپنی بیٹی کو مل رہی ہے۔ نرس میرے اشارے کو سمجھ گئی اور دوسرے کمرے میں داخل ہو گئی۔ مَیں اِن حالات میں ہسپتال کے کوریڈور میں چکر لگانے لگا۔ میرا دماغ کئی دِنوں سے شل ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں نیند کے سمندر اور جسم تھکاوٹ کے پتھروں سے سنگساری کی حالت میں تھا۔ مَیں نہ جانے کتنے عرصے سے اِس اذیت سے دوچار تھا جس کو حاصل کرنے کے لیے کوئی محنت نہیں کی تھی۔ محض چند لمحوں کی شناسائی سے اُسے خرید بیٹھا تھا۔ باہر نکل کر میرے لیے ایسی کوئی مصروفیت نہیں تھی جس میں اپنے کو سنبھال لیتا۔ مجھے معلوم تھا اِس وقت ماں بیٹی ایسی حالت میں ہیں کہ اُن پر موت اور زندگی کے تمام امتیازات مٹ چکے ہیں۔ زمانے کے بُعد و قرب یکساں ہو چکے ہیں۔ اُنھیں فی الحال اسی حالت میں رہنے دیا جائے۔ مَیں ہسپتال کے کوریڈور کو عبور کر کے ایک دفعہ پھر ایم ایس کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ ایم ایس عزیز الدین نے جس حد تک میرے ساتھ تعاون کیا تھا اُس کے لیے مَیں ابھی اُس کا شکریہ ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا اور اِس بات پر شرمندہ بھی تھا۔ مجھے معلوم تھا جب بھی مَیں اُس کے کمرے کا رُخ کرتا ہوں، وہ اِس گمان میں ہوگا کہ مَیں اُس کی مہربانیوں کا شکریہ کرنے کے لیے داخل ہو رہا ہوں مگر ہر بار اُس کے سامنے بالکل غیر متوقع نئی عرض داشت پیش کر کے اُسے مایوس کرتا تھا۔ ایم ایس کے کمرے کے باہر پی اے مجھے اچھی طرح جان چکا تھا۔ وہ میری اُس حیثیت کو دیکھ چکا تھا جو اُسے میرے نظر نہ آنے والے عہدے اور کام میں چھپی ہوئی تھی۔ ایم ایس کا اُٹھ کر مجھے ملنا اُس کے لیے کسی بڑی شخصیت کا ہونا کافی تھا۔ مَیں ایم ایس کے کمرے میں داخل ہوتا تھا۔ وہ ایک دم پھرتی کے ساتھ دروازہ کھول کر مجھے داد طلب نظروں کے ساتھ دیکھتا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے وہ داد اُس کی طرف تشکر آمیز نگاہوں کے ساتھ دینا پڑتی تھی۔ کمرے میں داخل ہو کر مَیں بجھے ہوئے دل سے سامنے والی کرسی پر گویا گر گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے حیرانی اور تذبذب کی کیفیت سے دیکھا۔ مَیں نے تھوڑی دیر توقف کے بعد نہایت عاجزانہ آواز میں بولنا شروع کیا۔ ڈاکٹر صاحب! کیا اِس سے بڑھ کر میرے لیے کوئی شرمندگی کی بات ہو سکتی ہے کہ مَیں پچھلے کئی دِنوں سے آپ پر سوار ہوں۔

ضامن صاحب مَیں سمجھا نہیں؟ ڈاکٹر صاحب حیرانی سے بولے۔

مَیں آپ کا شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہوں، میرا خیال ہے اس سلسلے میں مجھے وہ ہنر نہیں آتا

جسے آپ کے سامنے بیان کروں۔ البتہ آپ سے عرض کرنا چاہتا ہوں، مَیں نے کچھ مزید پیسوں کا بندو بست کر لیا ہے۔ اگر آپ کچھ دن مزید شیزا کا علاج جاری رکھ سکیں تو مہربانی ہو گی اور اب تو اُس کی ماں بھی یہاں پہنچ چکی ہے۔

میری بات سُن کر ڈاکٹر اپنی کرسی سے اُٹھا۔ میرے نزدیک آیا اور کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا، ضامن صاحب، مَیں یہاں لوگوں کے علاج کرنے کے لیے بیٹھا ہوں، شکریہ قبول کرنا میرا مقصد نہیں ہے۔ مجھے آپ سے اور شیزا کی ماں سے ہمدردی ہے۔ آپ کے جذبے کو سلام کرتا ہوں لیکن ایک بات بتا تا چلوں مجھے حیرت ہے شیزا پچھلے تین چار دن سے زندہ کیسے ہے؟ اُس کے پاس وقت بالکل نہیں رہا۔ مَیں نے اُس کے تمام ٹیسٹ کر لیے ہیں۔ اب اُس میں کچھ نہیں بچا۔ اپنے آپ کو ذہنی طور پر اُس سے جدا ہونے کو تیار کر لیں۔

کیا کچھ بھی زندگی کی رمق باقی نہیں؟ مَیں نے انتہائی دلگیر لہجے میں کہا۔ کیا ایسا بالکل ممکن نہیں کہ وہ چند دن اپنی ماں کو ہوش وحواس کی حالت میں رہ کر دیکھ لے؟

اِس کے لیے اُسے انگلینڈ یا امریکا شفٹ کرنا پڑے گا مگر اُس کے لیے اول تو آپ کے پاس وسائل نہیں۔ اگر بالفرض وہ پیدا بھی ہو جائیں تو وقت نہیں بچا۔

زیادہ سے زیادہ کتنا وقت بچا ہے؟ مَیں نے ڈاکٹر صاحب کی طرف رحم طلب نظروں سے دیکھا اور مَیں دیکھ رہا تھا کہ وہ پسیج رہا تھا۔

ڈاکٹر عزیز الدین تھوڑا سا آگے بڑھا اور میری طرف ہمدردی سے دیکھ کر بولا، مَیں پندرہ دن سے زیادہ اِسے نہیں سنبھال پاؤں گا۔

مَیں ڈاکٹر کے جواب سے تھوڑا سا حوصلے میں آ گیا۔ مَیں نے کہا، ڈاکٹر صاحب اگر خدا کو منظور ہوا تو مجھے اتنے دن کافی ہیں۔

تم کیا کرو گے؟ ڈاکٹر نے مجھے کاندھے سے پکڑ کر کہا، صرف دِنوں کی بات نہیں، وسائل بھی چاہییں اور مَیں جانتا ہوں آپ کے پاس پھوٹی کوڑی نہیں رہی۔

اُسی کے لیے ایک جگہ جاؤں گا۔ اگر اِسے بچنا ہے تو مجھے کہیں بھی جانے میں عار نہیں۔ آپ بس اتنے عرصے میں اِس کو بچائے رکھیں۔ یہ کہہ کر مَیں نے اپنی جیب سے وہ تمام رقم نکال کر ڈاکٹر صاحب کو دکھائی۔ یہ دیکھیے اگر اِن پیسوں سے اتنے دن یہ نکال سکتی ہے تو یہ پورے نوے ہزار ہیں۔

باقی کا بندوبست کرنے کے لیے مَیں آج ہی نکل جاؤں گا۔

ڈاکٹر نے میری طرف غور سے دیکھا اور بولا ٹھیک ہے۔آپ اِس میں سے چالیس ہزار روپیہ ڈاکٹر صبیحہ کو جمع کروا دیں۔ہم اِن پیسوں سے اِس کا مزید علاج جاری رکھتے ہیں مگر یاد رکھیں اگر آپ کچھ نہ کر سکے تو یہاں یہ لڑکی پیسوں کی موجودگی میں بھی نہیں بچ سکے گی اور باہر جا کر بچ جائے گی، مَیں یہ بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا۔صرف ایک فی صد چانس ہے۔

ڈاکٹر کے الفاظ سُن کر مَیں کمرے سے باہر نکل آیا اور پُر جوش قدموں سے شیزا کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔آخر وہاں پہنچ گیا۔شیزا نے مجھے دیکھا مگر وہ کیفیت دیکھنے اور نہ دیکھنے کے درمیان تھی۔مَیں بھی اُسے آنسوؤں کے ساتھ چپ چاپ دیکھتا رہا۔زینت اُس کے سرہانے بیٹھی مسلسل رو رہی تھی اور اُسے چوم رہی تھی۔مَیں نے زینت کو اشارے سے وہاں سے اُٹھا کر کمرے کے کونے میں لے گیا اور اُسے کہا کہ مَیں ایک بار خانیوال میں ٹبہ ولی بخش جا رہا ہوں۔آپ اِس کے پاس ہی ٹھہریں۔ان شاءاللہ کل واپس آ جاؤں گا۔

زینت نے حیرانی سے میری طرف دیکھا اور بولی۔ضامن آپ کیا سوچ کر وہاں جا رہے ہیں؟

مَیں نے جواب دیا، کچھ بھی سوچ کر نہیں جا رہا۔بس یونہی قسمت کے ایک بند دروازے کو کھٹکھٹانے لگا ہوں۔شاید بھیک مل جائے۔

ضامن وہاں سوائے موت کے کچھ نہیں ہے۔خدا را اُنھیں مت خبر ہونے دیں کہ ہم یہاں ہیں۔ورنہ جو کچھ دن بچے ہیں وہ بھی نہیں رہیں گے۔زینت نے گڑگڑا مجھے روکنے کی کوشش کی۔

زینت جس شخص کے بازو کٹ جائیں وہ باگ کو جبڑوں سے پکڑنے پر مجبور ہے، حالانکہ جانتا ہے گھوڑے کی سرکشی دانت توڑ دے گی۔ہمارے پاس کچھ نہیں بچا جسے چھپایا جا سکے۔آپ یہیں رُکیں، مَیں ابھی نکل رہا ہوں، ڈاکٹر سے مَیں نے کچھ وقت لیا ہے، اللہ کو منظور ہوا تو کچھ راہ نکل آئے گی۔اُس کے بعد میں نے آگے بڑھ کر شیزا کے ماتھے کا بوسہ لیا اور جلدی سے باہر نکل آیا۔

(۸۱)

مَیں نے اِسلام آباد کے بلیو ایریا میں رینٹ کمپنی سے کار کرایے پر لی۔ ڈرائیور نہایت خاموش اور جہاندیدہ آدمی تھا۔ اُس نے میرے چہرے کی پریشانی سے بھری سلوٹیں بھانپ لی تھیں۔ اس لیے پورے رستے کوئی سوال نہیں کیا اور کار چلاتا رہا۔ ہم اسلام آباد سے رات نو بجے نکلے اور صبح سات بجے خانیوال ٹبہ ولی بخش پہنچ گئے۔ ٹبہ ولی بخش میں ہر چیز ویسی ہی تھی جیسی بہت عرصہ پہلے مَیں دیکھ چکا تھا۔ مَیں ڈرائیور کو چودھری طلال بخش کے ڈیرے کا رستہ بتاتا رہا اور ہم عین اُسی دروازے کے سامنے آ رُکے جس کے کسی وقت بڑے گیٹ نے مجھے دہشت زدہ کر دیا تھا۔ دروازہ بھی وہی تھا مگر پہلے سے کہیں خستہ ہو چکا تھا اور بالکل کھلا ہوا تھا۔ ہم کار سیدھا اندر لے گئے۔ وہاں صبح کا عالم تھا۔ ایک شخص چارپائی پر لیٹا تھا۔ اِس کے علاوہ کوئی موجود نہیں تھا۔ مجھے بہت حیرت ہوئی کہ وہ دیرینہ ہیبت اور شان و شوکت کہاں گئی۔ پچیس سال کے عرصے میں یہاں کے رنگ و روغن اتنے پھیکے کیسے پڑ گئے۔ نہ نوکر چاکر نظر آتے تھے اور نہ ڈیرے پر لوگوں کی پالیاں بیٹھی گپیں ہانک رہی تھیں۔ یہ سب کچھ دیکھ کر مجھے شدید مایوسی ہوئی۔ سچ پوچھیں تو مَیں پُرانے جاہ و جلال کی آس میں یہاں پہنچا تھا۔ اِس اُمید میں کہ چودھری طلال لاکھ ظالم اور غاصب سہی مگر وقت کے ساتھ اُس کی فطرت میں تبدیلی رونما ہو چکی ہو گی اور وہ ایک بے سہارا اور موت کی آغوش میں جاتی ہوئی اپنی قریبی عزیزہ کو بچانے کی کوشش کرے گا تاکہ اُس کے سابقہ گناہوں کی تلافی ہو سکے۔ مَیں رستے میں بہت سی گفتگوئیں سوچتا آیا تھا اور نہایت پُراُمید تھا۔

مجھے چودھری طلال کے الیکشن جیتنے اور اُس کے وزیر بننے کی خبر تھی مگر یہ عرصہ بیس سال پہلے کا تھا۔ اُس کے بعد میں نے ہر چیز میں دلچسپی لینا چھوڑ دی تھی اور نہیں جانتا تھا کہ اس وقت اُن کی کیا صورت حال ہے۔ مجھے دیکھ کر چار پائی پر لیٹا ہوا آدمی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس آدمی کی ہلکی سی سفید داڑھی تھی اور عمر کے آخری حصے میں تھا۔ ڈیرے کی حالت اگر چہ بُری نہیں تھی بلکہ فرش وغیرہ پختہ ہو چکے تھے اور سامنے کا حصہ بھی تعمیر کر دیا گیا تھا مگر یہ تمام جگہ وحشت زدگی کا نمونہ نظر آ رہی تھی۔ مَیں نے آگے بڑھ کر اُس آدمی سے ہاتھ ملایا۔ بوڑھے نے ایک موڑھا کھینچ کر مجھے اُس پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ اتنے میں ایک اور آدمی ہمارے پاس آ کر رُک گیا۔ یہ قدرے جوان آدمی تھا اور شلوار قمیص میں تھا۔ ہلکی مونچھیں رکھی ہوئی تھی۔ رنگ سانولا تھا مگر عقل و ہوش میں ذرا پڑھا لکھا لگتا تھا۔ مَیں نے اُس سے بھی سلام لیا اور موڑھے پر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں میری طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ اُن کی حیرانی سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ اب اِس ڈیرے میں لوگوں کا آنا جانا بالکل ختم نہیں تو کم و بیش بند ہو چکا ہے ورنہ ہمارے یہاں آنے پر یہ حیران نہ ہوتے اور نہ ہی اتنی اجنبیت ظاہر کرتے۔ آخر چند لمحوں بعد اُن کی حیرانی نے سکوت توڑا اور بوڑھا آدمی مجھ سے مخاطب ہوا۔ جی بیٹا آپ لگتا ہے پہلی بار یہاں آئے ہیں۔ مَیں نے پہلے آپ کو نہیں دیکھا۔

بابا جی مَیں ایک بار پہلے بھی یہاں آ چکا ہوں لیکن وہ وقت شاید پچیس سال پہلے کی بات ہے۔

اچھا، بابے نے اِس بات پر زیادہ حیرانی ظاہر نہیں کی اور بولا، چائے پییں گے؟ پھر میرا جواب نے بغیر لڑکے کی طرف دیکھ کر کہا، بیٹا گھر سے چائے پانی کا بندوبست کرو۔

ہماری اِس گفتگو کے دوران ڈرائیور دور ہی ایک چار پائی پر بیٹھ گیا اور یہ اچھی بات تھی۔ بعض اوقات ایک معمولی آدمی کے سامنے بھیک مانگنا اچھا نہیں لگتا۔ اب وہ ہماری گفتگو نہ سُن کر اپنی حد تک میرا بھرم رکھ رہا تھا۔ مَیں نے بابے سے کہا، نہیں بابا جی مجھے بہت جلدی ہے۔ اِس وقت چائے پانی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مَیں بہت جلد نکل جانا چاہتا ہوں۔

کوئی بات نہیں بیٹا جب تک آپ کام بتائیں گے، ناشتا بن کر آ جائے گا۔ کہاں سے آئے ہیں؟ اُس نے متحمل سے کہا۔ انداز سے لگتا تھا کہ بہت سُلجھا ہوا آدمی ہے۔

مَیں اسلام آباد سے آیا ہوں اور چودھری طلال سے ملنا چاہتا ہوں۔ آپ اُنھیں اطلاع دے دیں، بہت مہربانی ہوگی۔

میری بات سُن کر بابا ایک دم خاموش ہوگیا، جیسے مَیں نے کسی نایاب شے کی بابت سوال کر دیا ہو جو وہاں دستیاب نہیں ہے۔ مجھے بھی ڈیرے میں داخل ہوتے یہی دھڑکا لگا تھا کہ کہیں ساری محنت اکارت نہ چلی جائے اور وہ نظر آ رہی تھی۔ چودھری طلال تو ایک طرف، ایسے لگتا تھا یہاں اُس کا کوئی خاص آدمی بھی نہیں ہے۔ مَیں بے چینی کا شکار ہوگیا۔ لڑکا وہاں سے جا چکا تھا۔ سامنے بیری کا بڑا درخت جھوم رہا تھا جو پہلے یہاں موجود نہیں تھا۔ اچانک میری نظر اُسی کے پتوں اور شاخوں کے چکیلے پن کی طرف گئی اور عین اُسی وقت مجھے شیزا کا اُن دنوں کا چہرہ یاد آ گیا جب اُس کی رگوں میں گلابی اور لال خون دوڑتا تھا۔ نوخیز چکیلی کونپلوں اور حسین لوگوں میں کتنی مشابہت ہوتی ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں بابے کی آواز نے مجھے چونکا دیا، بیٹا یہ ناشتا لیں۔ ناشتا آ گیا ہے۔

میرے لیے اب ایک ایک لمحہ پہاڑ ہو رہا تھا اور مَیں پر دل ہی دل میں کُڑھ رہا تھا کہ وہ بے مقصد کی باتوں میں وقت ضائع کر رہا ہے اور مجھے چودھری طلال کے بارے میں کچھ خبر نہیں دے رہا، آخر مَیں غصے کے عالم میں کہا، بابا جی آپ ناشتے اور اِدھر اُدھر کی باتوں میں وقت برباد کر رہے ہیں، سیدھا چودھری طلال کے بارے میں کیوں نہیں بتاتے۔

بڈھا میری بے تابی اور سخت الفاظ کو بھانپ گیا اور بولا، باؤ جی چودھری طلال یہیں گھر پر ہے۔ اُسے ملنے کی کیوں جلدی ہے آپ کو؟ وہ آپ کے کسی کام نہیں آ سکتا۔ تم بہت دیر بعد یہاں آئے ہو اور نہ ہی تمھیں ٹبہ علی بخش کی کوئی خبر مل سکی ہے۔ اب وہ ایک بجھی ہوئی راکھ ہے جس کی آگ اُسی کی ہوس کھا گئی ہے۔

کیا مطلب؟ مَیں ایک دم ہونق ہو کر بڈھے کو دیکھنے لگا۔

آج سے پانچ سال پہلے چودھری طلال کو ایک ڈاکٹر نے دو فائر مارے۔ وہ فائر اُس کی کمر پر لگے۔ اُن فائر سے چودھری صاحب کی جان تو بچ گئی مگر ریڈھ کی ہڈی کی نسیں کٹ گئیں۔ جس سے وہ مٹی کا ڈھیر بن گئے ہیں۔ علاج کے لیے باہر کے ملکوں تک گئے مگر بچ نہیں سکے اور چلنے پھرنے سے رہ گئے۔ اُن کا بیٹا امریکا میں تھا۔ باپ کے لیے اُس نے ہر کوشش کی مگر ڈاکٹروں نے جواب دے دیا۔ اسی علاج میں اُن کی بہت سی زمین بک گئی۔ بیٹا تھک ہار کر اُنھیں گھر لے آیا۔ اب چودھری صاحب کے لیے چلنا پھرنا اور کھڑے ہونا تو ایک طرف، بیٹھ بھی نہیں سکتے۔ بس چارپائی پر لیٹے رہتے ہیں اور لیٹے لیٹے بالکل پاگل ہو گئے ہیں۔ شروع شروع میں بہت لوگ تیماری داری کو آتے تھے مگر دنیا کب

تک گوشت کی بندھی ہوئی گٹھڑی کو دیکھتی۔ بے کار پڑا گوشت بدبو دینے لگتا ہے تو لوگ اُس سے کنارہ کر لیتے ہیں۔ اب پوچھنے گُھسنے والے بھی نہیں آتے۔ ہم جیسے نوکر چاکر رہ گئے ہیں وہ ہمیں بھی جب دیکھتے ہیں تو رونے لگ جاتے ہیں یا گالیاں دینے لگتے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیں آپ اُن سے مل کر کیا کریں گے؟

مَیں بڈھے کی بات سُن رہا تھا اور زمانے کی نیرنگیوں کو دیکھ رہا تھا۔ میرے مالک تیری لاٹھی کا کوئی نام نہیں ہے۔ مجھے نہیں معلوم یہ عبرت تھی یا حادثہ مگر اس وقت میری مایوسی نے مجھے نڈھال کر دیا تھا۔ کیا ضروری تھا کہ جب مجھے چودھری طلال کی ضرورت پڑے وہ آدمی ایک کیچوا بن چکا ہو۔

مَیں نے ایک طویل ٹھنڈی آہ کھینچی اور پوچھا، وہ ڈاکٹر کون ہے اور اُس کی چودھری طلال سے کیا دشمنی تھی؟

اُس کا نام ڈاکٹر لطیف تھا۔ آج کل تو جیل میں سڑ رہا ہے اور ہمیں بھی حیرت ہے آخر اُس نے یہ کام کیوں کیا؟ چودھری صاحب نے اُس کا کوئی نقصان تو کیا کرنا تھا اُس کے کسی آگے پیچھے کو بھی نہیں جانتے تھے۔ بس ایک دن چودھری طلال کی قسمت اُنھیں اکیلے خانیوال لے گئی۔ ایک ڈرائیور ہی ساتھ تھا۔ دراصل چودھری طلال کو اُسی ڈاکٹر نے ایک گاؤں محسن وال کی ڈسپنسری کے افتتاح پر دعوت دی۔ جب وہ افتتاح کرنے کے لیے آگے بڑھے تو پیچھے سے فائر کر دیے۔ وہاں ایک دم ہنگامہ برپا ہو گیا۔ لوگوں نے ڈاکٹر کو پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیا۔ اُس نے وہیں اقبالِ جرم کر لیا۔ عدالت نے اُسے بارہ سال کی سزا سنا دی۔ اب وہ تو ایک سال بعد واپس آ جائے گا مگر چودھری ایک لاش میں بدل گیا۔

چودھری طلال کے بیٹے اور بیٹی نے کیا کیا اِس معاملے میں؟ مَیں نے سوچا شاید وہ ہی مل جائیں۔

وہ تو جناب پہلے ہی امریکا میں تھے۔ جب چودھری طلال کو فائر لگے اُس وقت بیٹا کچھ دِنوں کے لیے پاکستان آیا مگر جلد واپس لوٹ گیا اور بیٹی نے ہی مقدمہ لڑا اور ڈاکٹر کو سزا دلوائی۔ پھر چھ ماہ بعد وہ بھی امریکا چلی گئی۔ چار سال بعد بیٹا دوبارہ واپس آیا اور دس ایکڑ چھوڑ کر باقی تمام زمین میاں سکندر خاں بوسن کو بیچ کر پھر واپس نکل گیا۔

تو کیا دوستوں اور رعایا نے کوئی مدد نہیں کی؟ مَیں نے وضاحت چاہی۔

جی رعایا نے تو ایک دم لُوٹ مچا دی۔ ہر چیز کا صفایا کرنے لگی۔ چودھری صاحب کا منشی سب

کچھ بیچ کر اپنی جائدادیں بنانے لگا۔ اب وہ خود کروڑ پتی ہے۔ اگر چند دن چودھری طلال کا بیٹا اور نہ آتا تو سب صفایا ہو گیا تھا۔

تو یہ دس ایکٹر اُس نے کیوں نہیں بیچے؟ میں نے پوچھا۔

اِس لیے کہ ہم اُس کی دیکھ بھال میں یہاں رہتے ہیں تو اُس کا ذمہ بھی تو ادا کرنا تھا۔ اِسی جائداد سے ہم کھاتے ہیں اور چودھری طلال کی سیوا کرتے ہیں۔ اب رشتے دار تو اِن کا کوئی رہا نہیں۔ سب کو چودھری طلال نے اپنے ہاتھ سے مکا دیا تھا۔ ہم کہاں سے کھلاتے پلاتے۔ خدا جانتا ہے ہم نے اُس کی خدمت میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ روٹی، دارو سب دیتے ہیں اور وقت پر دیتے ہیں۔ کبھی کبھی چودھری کا بیٹا کچھ بھجوا دیتا ہے۔ سب اِسی پر کام آتے ہیں۔ دوست یار تو پنچھیوں کی طرح اُڑ گئے۔ ہماری تو دعا ہے جلد عذاب سے جان چھٹے اور اِسے اللہ اُٹھا لے مگر بہت سخت جان ہے چودھری۔ تمھیں کیا بتاؤں، تم نے چودھری کی شانیں نہیں دیکھی۔ بڑا جاہ وجلال تھا۔

آپ اِن کے کیا لگتے ہیں؟

ہم جی اِن کے کچھ نہیں لگتے۔ آپ ہمیں بھی رعایا ہی سمجھیں۔ یہ میرا بیٹا ہے۔ اُس نے اُسی جوان لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔

اِن باتوں کے دوران مَیں نے ناشتا کر لیا۔ ناشتے میں چائے اور پراٹھا تھا۔ ڈرائیور کو اُس نے وہیں ناشتا دے دیا تھا جہاں وہ بیٹھا تھا۔ پھر تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہی۔ میرے چاروں طرف مایوسی اور نا اُمیدی کے بادل چھا گئے۔ کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ مَیں انتہائی بے دِلی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر فوراً مڑا اور بوڑھے سے کہا، بابا جی مجھے ایک بار چودھری طلال سے ملوا دیں۔

ٹھیک ہے جی، یہ کہہ کر وہ اٹھا اور بولا آ جائیں۔ مَیں اُس کے ساتھ چل پڑا۔ بوڑھا ڈیرے کے پچھلی طرف ایک احاطے میں داخل ہو گیا۔ یہ احاطہ نہایت کھلا تھا۔ چاروں طرف دالان در دالان تھے اور بہت بڑی حویلی نما کمرے تھے۔ اتنی بڑی حویلی تھی کہ ایک نظر میں سب کا احاطہ نہیں ہو سکتا تھا۔ صحن میں ایک نہایت بوڑھا نیم کا درخت تھا۔ اُس کے پتے جا بجا بکھرے ہوئے تھے اور کسی نے اُنھیں صاف نہیں کیا تھا۔ دالانوں کے ایک کونے میں دُور ایک چارپائی پڑی تھی۔ ہم دونوں اُسی چارپائی کی طرف بڑھتے گئے۔ ایک عورت اُس سے کچھ فاصلے پر بیٹھی دودھ بلو رہی تھی۔ ہمیں دیکھ کر وہاں سے اُٹھ گئی۔ وہ چارپائی پکڑنے لگی۔ اتنے میں ہم اُس چارپائی کے پاس پہنچ گئے۔ یہاں ایک

شخص نہایت کسمپرسی کی حالت میں لیٹا تھا۔ اُس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ کپڑوں اور بستر کی حالت بھی میلی سی تھی۔ ایک چادر یا دیسی دھاگے سے بُنا ہوا کھیس اُس کی ادوائن کی طرف پڑا تھا۔ یہ آدمی ایسے لیٹا تھا جیسے مرا ہوا گدھ ہو۔ چہرے پر انتہائی بے رونقی تھی۔ ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیاں قدرے مُڑی ہوئی اور بے جان سی تھیں۔ جسم کی جلد نہایت پتلی اور سیاہی مائل ہو گئی تھی۔ اتنے میں اُس عورت نے چارپائی لا کر ہمارے قریب رکھ دی۔ بُڈھے نے چودھری طلال کو مخاطب کیا، چودھری صاحب، یہ بابو جی آپ سے ملنے اسلام آباد سے آئے ہیں۔ اُس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور مجھے دیکھنے لگا، مگر زبان سے کچھ نہیں بولا۔ ہم دونوں اُس کے سامنے چارپائی پر بیٹھ گئے۔ مَیں نے بیٹھتے ہی کہا چودھری صاحب کیا حال ہے؟

چودھری طلال نے نہایت اضمحلال سے سر کو ہلکی سی جنبش دی اور بس دیکھتا رہا۔ اُس کی چارپائی کے نیچے پاخانے اور پیشاب وغیرہ کا سامان پڑا ہوا تھا۔ جسے بوڑھی عورت جلدی جلدی اُٹھا رہی تھی۔ مجھے اُس پورے ماحول سے شدید کراہت پیدا ہو رہی تھی۔ یہ کراہت تو عماد سے بھی بڑھ کر تھی۔ اُس پوری فضا میں ایک ہلکی بدبو کا احساس پھیلا ہوا تھا اور ایک غلیظ مُردہ نما جانور میرے سامنے لیٹا تھا جسے مزید زندہ رکھنے کی کوئی تُک مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ مَیں سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے یہاں سے فوراً اُٹھ جانا چاہیے۔ اُسی وقت اُس مُردے کی آواز سنائی دی۔ تم ضامن ہو، مَیں تمھیں جانتا ہوں۔

اِن الفاظ سے مَیں فوراً چونکا اور ایک سرد لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں پھر گئی۔ اُس لمحے مَیں نے محسوس کیا یہاں مجھے شدید خطرہ ہے۔ میرا ایک دم جی چاہا ابھی بھاگ جاؤں مگر یہ میرا وہم تھا۔ وہ مُردہ دوبارہ بولا، مجھے افسوس ہے، مَیں اپنی اور اپنے عزیزوں کی بربادی کا ذمہ دار ہوں۔ (بُڈھے کی طرف دیکھ کر) مَیں نے اِس خنزیر سے سو بار کہا ہے مجھے زہر دے دو، یہ حرامی نہیں مانتا۔

مَیں خاموش بیٹھا رہا اور اِس بات پر غور کرنے لگا اگر اِسے میرا نام بھی پتا ہے اور مجھے اچھی طرح سے جانتا ہے تو مَیں ابھی زندہ کیسے ہوں۔ اتنے میں اُس کی آواز دوبارہ آئی، شیزا کیسی ہے؟

اب گویا میرے اوسان جواب دینے لگے تھے۔ اِسے شیزا کے بارے میں بھی خبر ہے پھر تو یہ بھی جانتا ہو گا کہ میرا اُس سے کیا رشتہ ہے اور ہم کہاں رہتے تھے اور شیزا کا کیا کاروبار تھا؟ اور یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ پھر یہ کہ یہ پچھلے پانچ سال سے اِسی بستر پر ہے تو یہ ہم سے اِس سے بھی پہلے واقف ہو گا۔

اُسے کینسر ہو گیا ہے اور آخری سانسوں پر ہے۔ کیموتھراپی سے ایک سال تک بچت رہی۔ اب دوبارہ وہی حالت ٹھہر گئی ہے۔ بون میرو ٹرانسپلانٹ کے لیے پیسہ نہیں ہے۔ مَیں اسی لیے یہاں آیا تھا مگر مجھے خود آپ کی حالت دیکھ کر افسوس ہوا۔ آپ خود ایک قابلِ رحم درجے پر موجود ہیں۔ زخمی پیادے ایک دوسرے کے لیے محض لاشیں ہوتی ہیں۔

میری اِس اطلاع پر اُس کے آنسو نکلنے لگے اور مَیں نے دیکھا وہ شدید بے چین ہو گیا تھا۔ اُس کے ہونٹ تھرتھرانے لگے، جسم میں کپکپی طاری ہو گئی۔ اُسی حالت میں چند لمحے گزر گئے۔ اِس خموشی میں دونوں طرف سے صدیوں کی بے بسی اور لاچاری شامل تھی۔ پھر وہ دوبارہ بولا، ذیشان کہاں ہے؟ کیا وہ دوبارہ ملک میں نہیں آیا؟

اب میرے صبر کا پیمانہ چھلک گیا اور مَیں غصے سے بولا، جب آپ کو ہر چیز کا پتا تھا تو آپ نے اُنھیں مروایا کیوں نہیں؟ یا پھر اُن کی مدد کیوں نہیں کی؟ اور کیوں اُنھیں در بدر کی ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔

مَیں اپنے منشی پر زیادہ بھروسا کر بیٹھا تھا اور جب مجھے خبر ہوئی وہ اژدھا بن چکا تھا۔ وہ مجھے ہی کھا گیا۔ وہ شیزا اور ذیشان کو بھی کتے کی طرح سونگھتا پھر رہا تھا۔ اگر مَیں اُن تک پہنچتا تو میرا منشی اُن کا کام تمام کر دیتا اور اب مَیں یہ نہیں چاہتا تھا۔

یہ کہہ کر اُس نے گویا تمام کہانی عیاں کر دی تھی اور اُس نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا اور دوبارہ نہیں بولا۔ اب میرے لیے وہاں بیٹھنا ممکن نہیں رہا تھا۔ مَیں فوراً وہاں سے اُٹھا اور تیز قدموں سے باہر کی طرف بڑھا۔ میرے پیچھے ہی بڈھا چل پڑا لیکن باہر آتے ہی مَیں نے ڈرائیور کو چلنے کا اشارہ کیا۔ اُسی لمحے ہم وہاں سے چل دیے۔ کسی سے سلام تک نہیں لیا۔ مَیں کیوں کسی سے سلام لیتا۔ یہاں کوئی شیزا کے لیے مدد کرنے والا نہیں رہا تھا اور اب تو لوگوں سے میرا سلام دعا صرف اُنھی تک محدود ہو گیا تھا جو شیزا کے لیے میری مدد کر سکتے تھے۔ اُسی دن شام کے وقت مَیں دوبارہ اسلام آباد میں داخل ہو گیا۔ اب مَیں ایک ایسا ناکام بادشاہ تھا جسے میدانِ جنگ میں چاروں طرف سے بُری خبروں نے گھیر لیا ہو اور دشمن کے شہسوار بس اُس تک پہنچنے ہی والے ہوں۔

(۸۴)

مَیں نے زینت کو چودھری طلال کی تمام واردات بتا دی تھی اور یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اب شیزا کے لیے ہمارے پاس کوئی راستہ نہیں بچا۔ مَیں ڈاکٹر عزیز الدین سے بھی سامنا کرنے سے ہچکچا رہا تھا۔ اُس سے مَیں نے جو وقت لیا تھا اب وہی میرے لیے قیامت کے لمحوں کی طرح طویل ہو رہا تھا۔ یہ کیسی ستم ظریفی تھی کہ جس کے لیے مَیں اپنی جان کو داؤ پر لگانے کے لیے تیار تھا اب اُسی شیزا کا سامنا کرنے سے ڈرتا تھا۔ مَیں ایک عجیب منقلب لمحوں سے دوچار تھا کہ شیزا کے لیے موت کی دعا مانگ رہا تھا۔ مَیں دل ہی دل میں اُس کرب سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا جو شیزا کو دیکھ کر میرے سینے میں مزید بھر جاتا تھا۔ زینت شیزا کی چارپائی سے لگی بیٹھی تھی۔ وہ وہاں سے تب اُٹھتی جب اُسے ضروری حاجت ہوتی۔ مَیں شیزا کے کمرے میں چند لمحوں کے لیے داخل ہوتا پھر نکل جاتا اور اسلام آباد کی گلیوں اور سڑکوں پر ایک حواس باختہ شخص کی طرح ٹہلنے لگا تھا۔ مَیں دیکھتا تھا لوگوں کے پاس کتنے پیسے تھے۔ اربوں روپے کی جائدادیں تھیں، کروڑوں روپے کے بنگلے اور کوٹھیاں تھیں مگر اسلام آباد کے اِن ہزاروں کوٹھیوں والوں اور سیکڑوں ارب پتیوں میں سے کوئی ایک بھی نہیں تھا جو شیزا کے لیے مددگار ثابت ہوتا۔ مجھے اِن بنگلوں اور اِن میں رہنے والے ارب پتیوں سے گھن آنے لگی تھی۔ بلاشبہ یہ ایک حاسدانہ احساس بھی ہو سکتا تھا۔ اگر ایسا تھا تو یہ احساس شیزا کی بیماری سے پہلے کیوں نہ ہوا۔ مجھے ٹبہ ولی بخش سے لَوٹے ہوئے آٹھ دن گزر چکے تھے۔ اِن آٹھ دِنوں میں چار بزنس مینوں سے مل چکا تھا کہ وہ خدا کے واسطے شیزا کے

علاج کے لیے اپنی نیکی صرف کر دیں مگر اُن کے پاس ایسی خرافات کے لیے پیسہ نہیں تھا۔ ایسی گمنام نیکی جس کا احساس عوام کو نہیں ہوسکتا تھا۔ کون ایسا بے وقوف بزنس مین ہوگا جو صرف ایک جان بچانے کے لیے اپنا آٹھ دس لاکھ روپیہ خرچ کرتا جب کہ اُس نیکی کی دو چار لوگوں کے علاوہ کسی کو خبر نہ ہو پاتی۔ یہ بزنس مین اِس سے سو گنا کم پیسے خرچ کر کے چاولوں کی دیگیں پکا کر بانٹ سکتے تھے۔ کسی موڑ پر پینے کے صاف پانی کا سٹیل کا کولر لگا کر اُس پر اپنے نام کی تختی لگا سکتے تھے جس سے ہزاروں لوگوں کو اِن کی نیکی کی خبر ہو جاتی۔ غریب لوگوں کو حج کی لاٹری دے کر یا میلاد اور مجلس برپا کر کے بھی اِس سے کئی گنا زیادہ ثواب کما لیتے۔ اُنھیں کیا پڑی تھی مرنے کے قریب ایک گمنام اور بے کار لڑکی کے لیے اپنا بے بہا پیسہ صرف کرتے جو اُن کے نہ کسی کام آسکتی تھی، نہ اُن کی سخاوت کی تشہیر کرنے کی قدرت رکھتی تھی۔ پھر یہ بھی کیا خبر تھی کہ اُن کا پیسہ بھی ضائع نہ جائے گا اور وہ بچ جائے گی۔ جس کے متعلق اپنے جاننے والوں کو بتا کر کہیں کہ اُنھوں نے فلاں لڑکی کا صرف اللّٰہ کے لیے علاج کرایا اور وہ آج اللّٰہ کے فضل سے زندہ سلامت اپنے بال بچوں میں خوش باش جی رہی ہے۔ اِس عرصے میں مَیں نے بیت المال کے ایک وزیر سے بھی رابطہ کیا مگر وہاں حکومت کے سرکاری افسران اور وزرا کے بیرونِ ملک علاج کے لیے ہی پیسہ ناکافی تھا اور بڑی مشکل سے اُن کے اخراجات پورے ہوتے تھے۔ شیزا تو نہ سرکاری ملازم تھی اور نہ سابقہ یا حالیہ وزیر کی قرابت دار تھی۔ چنانچہ یہ غیر قانونی راستہ اُن کے لیے کیسے پیدا ہوسکتا تھا۔ اگر کوشش بھی کی جاتی تو جب تک اُن کی فائل علاج کے لیے تیار ہوتی شیزا اپنے خدا کے حضور پیش ہو چکی ہوتی۔ اُس کے پاس اُس کا وقت نہیں تھا۔

یہ جمعرات کی سہ پہر تھی۔ اِسلام آباد میں ایک ٹھہرا ہوا سکوت تھا جیسے طوفان اٹھنے سے پہلے کے عین قریبی لمحات ہوں۔ مَیں نے پولی کلینک ہسپتال سے نکل کر بلیو ایریا کی سڑک پار کی اور ایف سکس کے علاقے میں داخل ہو گیا۔ مَیں کئی دِنوں سے عابد حسین سے نہیں ملا تھا بلکہ کسی سے بھی ملنے سے گریز کر رہا تھا۔ مَیں اپنے اور اُن کے درمیان ایک واضح اور دوٹوک فرق محسوس کر رہا تھا۔ مجھے وہم ہو چکا تھا کہ مَیں اِس دنیا میں انسان کی بجائے صرف ایک دماغ بھیجا گیا ہوں جسے ہاتھ پاؤں لگا دیے گئے ہیں اور اِس کے علاوہ مَیں کچھ نہیں ہوں۔ بس کرب انگیز خیالات سوچوں اور سڑکوں پر چلوں۔ مجھے اُن کتوں اور پرندوں سے سخت ہمدردی تھی جو یہ کام بھی کرنے سے عاری تھے۔ یہ بھی عجیب بات تھی کہ اب مجھے میری والدہ شدید یاد آنے لگی تھی۔ وہ لاہور میں اپنے بیٹے کے پاس تھی اور تندرست تھی۔ یہ بھی ہوسکتا

ہے وہ تندرست اور خوش نہ ہو مگر میرے لیے ایسا سوچ لینے میں کیا دقت تھی، جب کہ مجھے اُس کی بیماری اور غمزدگی کی ابھی تک کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔ مَیں نے چلتے ہوئے سپر مارکیٹ کی شمالی سڑک پار کی اور ہل روڈ پر ہو گیا۔ یہ سڑک ایف سکس تھری اور ایف سکس ٹو کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے اور بہت کشادہ بنائی گئی۔ یہاں سے میرا رُخ مارگلہ کی طرف تھا۔ مَیں فقط چل رہا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف کے درختوں نے اُسے چھتے کی طرح ڈھانپ رکھا تھا اور شام قریب تھی۔ اکا دُکا کاریں اور گاہے گاہے ٹیکسیاں گزر رہی تھیں۔ مَیں دائیں طرف کے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے کبھی کبھی کسی درخت کی شاخ کو پکڑ کر اُس کے پتے نوچ لیتا اور اُنھیں سڑک پر پھینک کر آگے بڑھ رہا تھا۔ مَیں اِس طرف کیوں جا رہا تھا؟ ہو سکتا ہے میرے لاشعور میں اِس کا کوئی جواز ہو۔ اگر جواز نہیں بھی تھا تو کچھ خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ البتہ مَیں اتنا جانتا تھا کہ اب مجھے ہسپتال میں زیادہ دیر ٹھہرنے سے شدید اذیت ہوتی تھی۔ میرے دماغ میں شیزا اور عماد گڈمڈ ہو کر رہ گئے تھے۔ کبھی دونوں ایک لگتے تھے مگر میری اذیت کا سبب یہ نہیں تھا۔ اب مَیں بس اپنا کچھ وقت صرف کرنا چاہتا تھا، کہیں بھی صرف کرنا چاہتا تھا۔ اِس وقت مجھے نہ کسی جگہ سے داد چاہیے تھی، نہ مدد درکار تھی، سب سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ کتنی عجیب بات ہے انسان جب لوگوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے تو خدا سے بھی لاپروائی اختیار کر لیتا ہے۔ اُس کی تمام حاجتیں دراصل انسانوں ہی سے وابستہ ہوتی ہیں۔ خدا کی ضرورت اِس لیے پڑتی ہے کہ وہ انسانوں کو اُس کی مدد کے لیے مائل کرے۔ چونکہ مجھے اب کسی کی ضرورت نہیں رہی تھی اِس لیے خالی الذہن چلتا جا رہا تھا۔ اب میرے سامنے مارگلہ روڈ آ گئی تھی اور اُس کے آگے جنگل تھا، جن میں ایک کلومیٹر چلنے کے بعد پہاڑیاں شروع ہو جاتی تھیں۔ مَیں جنگل میں اک چنار کے درخت کے تنے کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ شاید اِس اندھیرے میں مجھے آگے جانے سے ڈر محسوس ہوا۔ اب مَیں پوری رات ہسپتال نہیں جانا چاہتا تھا کیونکہ میرے پاس وہاں کوئی کام نہیں تھا۔ مَیں وہاں کافی دیر بے دھیانی میں کھڑا رہا، درختوں کے پتوں کو گرتا ہوا دیکھتا رہا، ہوا کافی سرد ہو چکی تھی۔ مجھے ایک کپکپی سی محسوس ہوئی جیسے بخار ہو رہا ہو۔ تب میں اپنے بوسیدہ فلیٹ کی طرف چل دیا جہاں میری تمام چیزیں اپنی غربت کے احساس میں بکھری ہوئی تھیں۔

اِدھر شیزا پوری طرح کومے میں جا چکی تھی اور اُس کے ہوش میں آنے کی کوئی اُمید نہیں تھی۔ مَیں اُس کے متعلق ہر خطرے کو بھانپ چکا تھا اور اپنی طرف سے دل کو بتا دیا تھا کہ شیزا مر چکی ہے۔ میرے لیے یہ تعجب کی بات نہیں تھی لیکن کسی اجنبی کو بتاتا کہ اب مجھے شیزا سے کوئی غرض نہیں ہے تو وہ

مجھے ایک شیطان سمجھتا۔ اجنبی ہمیشہ ایسے معاملات میں یہی تاثر دیتے ہیں مگر وہ آدمی جس کی نبض آہستہ آہستہ ڈوب رہی ہو اُسے مرنے اور جینے کے درمیان امتیاز کرنے کی کوئی خاص پروا نہیں رہتی۔ یہی حالت میری تھی۔ میں کچھ دِنوں سے شیزا کے کرب کو جرعہ جرعہ پینے کے بعد پوری طرح سیر ہو چکا تھا اور اُن آنسوؤں سے بے نیاز تھا جنھیں اُس کی ماں زینت کے سامنے بہانا ضروری تھا۔ مجھے پوری طرح یقین تھا شیزا کی موت کی خبر سُن کر میرے آنسو نہیں نکلیں گے۔ پھر میرے پاس وہ کون سا معاوضہ تھا جسے مَیں زینت کی جھولی میں رکھتا اور اُسے کہتا یہ شیزا کی محبت کی اُجرت ہے۔ میری ہر ممکن خواہش تھی کوئی ایسا حادثہ پیش آ جائے جس کے سبب مَیں شیزا کی موت کے وقت وہاں موجود نہ ہوں مگر یہ نہ ہو سکا۔

اِس دن کے بعد دو مزید راتیں اِسی حالت میں گزریں۔ زینت ایک لمحے کے لیے بھی شیزا سے جدا نہیں ہوئی۔ اس کی آنکھیں متورم ہو چکی تھیں۔ مَیں خود کبھی اُس کے کمرے میں آ جاتا اور کبھی باہر نکل جاتا۔ بڑی مشکل سے زینت کو دو تین بار کھانا کھلایا۔ چاچی موجاں اِس عالم میں ہمارے لیے نعمت ثابت ہو رہی تھی۔ پھر چوتھی رات صبح چار بجے شیزا ہم سے رُخصت ہو گئی۔ اِس عالم میں کہ مَیں اُس کی چارپائی کے دائیں طرف بیٹھا تھا اور زینت بائیں طرف تھی۔ یہ رات دراصل زندگی کے اُن تمام عذابوں سے بھاری تھی جو مَیں نے اور شیزا نے بیماری کے دِنوں میں جھیلے تھے۔ مَیں ہزار بھاگ جانے کی خواہش کے باوجود اِس آخری رات شیزا کی چارپائی سے الگ نہیں ہوا۔ مَیں حیران ہوا عین اُس وقت جب شیزا مر رہی تھی میرے آنسو کس طرح پلٹ آئے تھے۔ مجھے ایک بار پھر شدید رقت نے کیسے اپنے شکنجے میں لے لیا اور مَیں چیخیں مار کر رونے لگا۔ ڈاکٹر نے جونہی ہمیں شیزا کے مرنے کی اطلاع دی اور نرس نے اُس کے چہرے سے آکسیجن ماسک اُتارا میرا دل شدتِ غم سے بھر گیا اور مَیں شیزا کی چارپائی کے ساتھ لپٹ گیا۔ اُس کے مرنے پر زینت نے ایسے ایسے بَین کیے کہ میرے جگر میں چھید کرتے چلے گئے۔ ہم دونوں نے شیزا کو اتنا چوما اور اِتنا لپٹے کہ ہسپتال کا عملہ حیران تھا۔

اِس وقت زینت میرے لیے ایک بوڑھی مسافرہ کا رُوپ دھار چکی تھی جس کی تمام متاعِ سفر میں لُٹ چکی ہو اور اب وہ بے دست و پا ہو گئی تھی۔ اُس کی شاداب منزلیں اُس بدعا نے کھا لی تھیں جو شاید عدیلہ نے اُسے کربناک خموشی میں دی تھیں جب وہ معیذ کے ہاتھوں قتل ہونے کے قریب تھی۔ مَیں نہیں جانتا تھا تمام لُٹے ہوئے لوگ آپس میں کیسے جمع ہو جاتے ہیں، دوسری طرف کے تمام خوش باش انسانوں سے الگ۔ وہ ہمتیں جو ایسے المیے اُٹھانے کے لائق ٹھہرتی ہیں کیا اُن کی گمنامی عدیلہ اور زینت

سے ہوتی ہوئی شیزا پر آ کر ختم ہو جاتی ہے یا زمانوں کے اطراف میں دوسری بڑی گمنامیوں تک پہنچتی ہے۔ مَیں اپنے دُکھ کو اِس وقت زینت کی مصیبت پر قربان کرنے کو تیار تھا اور بار بار اُس کے چہرے کی طرف دیکھتا تھا جو ہر لمحے بوڑھا تر ہو رہا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ مَیں کسی وقت اِس چہرے کا مدار رہا تھا۔ زینت کی چیخیں اور رہ رہ کر رونے کی اذیت مجھے ایک گونا تسکین سے دوچار کر رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ میرے حصے کا درد بھی بانٹ رہی تھی۔

پھر اُسی دن دس بجے مَیں نے ایمبولینس کرائے پر لی اور ہم شیزا کی لاش لے کر پاکپتن پہنچ گئے۔ میرا دل نہیں چاہتا تھا مَیں ایمبولنس میں بیٹھوں مگر یہ بہت ضروری تھا۔ ایمبولینس مسلسل نو گھنٹے چلتی رہی حتیٰ کہ شام سات بجے چیکن والا میں جا اُترے اور سردیوں کی شام میں اِس وقت بہت اندھیرا ہو گیا تھا۔ رستے میں زینت نے اپنے تمام آنسوؤں کا خراج شیزا کی لاش پر لٹا دیا۔ اِس عمل میں اُس کی آنکھوں کی زنبیلیں بالکل خالی ہو گئیں اور وہاں پہلے سے زیادہ گڑھے پڑ گئے۔ یہاں سے ہم نے لاش کو ایک ٹرلو میں رکھا اور چیکن والا لے کر آئے۔ چیکن والا میں ایک بہت بڑا ہجوم شیزا کو دیکھنے کے لیے جمع ہو گیا اور ہمیں یہاں پندرہ بیس منٹ رُکنا پڑا۔ لوگ لالٹینیں جلا جلا کر لائے اور شیزا کی لاش دیکھنے کے لیے ایک دوسرے کو دھکیلنے لگے۔ تب ہم نے ایک سانڈنی پر لاش کو رکھا اور بڑی مشکل سے پیدل چلتے ہوئے رات نو بجے 'کماری والا' پہنچ گئے۔ کماری والا میں شیزا کی لاش کو اُسی چوک سے گزار کر جہاں مَیں نے پہلے چند لمحے گزارے تھے، زینت کے گھر لے جایا گیا اور صحن میں چارپائی اُتار دی۔ اِس جگہ لوگ جوق در جوق جمع ہونے لگے۔ عورتیں زینت کے گلے لگ کر بین کرتی رہیں۔ مَیں ایک کونے میں کھڑا زمانے کی نیرنگیاں دیکھتا رہا اور خالی آنکھوں سے اُس ہجوم کو تکتا رہا جس نے شیزا کی چارپائی کو اپنی بھیڑ میں چھپا رکھا تھا۔ اندھیرا بہت بڑھ گیا تھا۔ اِس عالم میں لوگوں کی توجہ مجھ سے ہٹی ہوئی تھی۔ مَیں نے اِس بات کو غنیمت سمجھا اور ایک دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ مَیں بہت دِنوں سے تھکا ہوا تھا اور سخت سردی کے باوجود نیند نے مجھے بہت غوطے دیے۔ یہاں تک کہ مجھے دیوار کے ساتھ ہی بیٹھے بیٹھے صبح ہو گئی۔ زینت رو رو کر بے حال ہو گئی تھی اور اب نڈھال ہو کر خاموش چارپائی کے ساتھ لگی بیٹھی تھی۔ کماری والا کی بہت سے عورتیں ابھی بھی اُس کے اردگرد حلقہ کیے ہوئے تھیں۔ صبح ایک آدمی نے میرے لیے وہیں چارپائی رکھ دی اور ناشتا لے کر آ گیا۔ مَیں نے تھوڑا بہت ناشتا کیا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ آسمان کی وسیع فضاؤں میں ایک جما دینے والا سکوت تھا۔ مَیں اُس لامحدود سکوت

میں فقط بلندیوں کی اُن خلاؤں کو دیکھ رہا تھا جہاں شاید ٹھنڈی نیلاہٹ کے بڑے بڑے چرخے گھوم رہے تھے۔ وہ شیزا کی موت سے بالکل بے نیاز تھے اور کسی ایسے صدمے کے منتظر تھے جو شیزا کی موت سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھا۔ اُن یخ بستہ خلاؤں میں گھومتے ہوئے بے نشان چرخوں کو تکتے میری آنکھیں سردنمی سے بھر گئیں۔ اچانک مجھے خیال آیا میری جیب میں زینت کی امانت پچاس ہزار روپے ابھی موجود تھے۔ مَیں ایک دم چارپائی سے اُٹھا اور زینت کے کمرے میں چلا گیا۔ سامنے اُس کی چارپائی موجود تھی جہاں وہ سوتی تھی۔ یہ رنگین پایوں والی بڑی سی چارپائی کمرے کے ایک کونے میں نہایت نفاست سے رکھی ہوئی تھی۔ اُس کے اُوپر پڑے ہوئے لحاف کو ایسے تہہ کیا گیا تھا جیسے کپڑے طے کیے جاتے ہیں۔ مَیں نے ایک نظر اپنے پیچھے دیکھا کہ کوئی مجھے دیکھ تو نہیں رہا۔ اردگرد کوئی شخص نہیں تھا۔ اُسی وقت جلدی سے مَیں نے اپنی لیدر کی پرانی جیکٹ سے پیسوں کی گڈیاں نکالیں اور لحاف کے نیچے رکھ دیں اور پُھرتی سے باہر نکل کر اپنی چارپائی پر لیٹ گیا، یہاں تک کہ سہ پہر تین کا عمل ہو گیا۔

شیزا کو نہلا کر دفنانے کے لیے تیار کر دیا گیا۔ زینت کی چیخیں اور بین آسمان کا کلیجہ چیر رہے۔ پرندے حیران تھے۔ وہ اِس وحشت زدگی میں اُڑ کر دُور بھاگتے تھے پھر واپس پلٹتے تھے۔ شام ساڑھے تین بجے ہم نے شیزا کا جنازہ پڑھ کر لاش 'کماری والا' کے اُس چھوٹے سے قبرستان میں دفنا دی جو ایک ٹیلے پر موجود تھا۔ پھر تھوڑی ہی دیر میں لوگ آہستہ آہستہ وہاں سے ہٹنے لگے اور چند ہی لمحوں میں قبرستان خالی ہو گیا۔ ایک شخص نے مجھے بھی چلنے کے لیے کہا۔ مَیں نے اُسے کہا آپ جائیں مَیں ابھی آتا ہوں۔ وہ شخص چلا گیا اور مجھے تنہا چھوڑ دیا۔ مَیں قبر پر بیٹھ گیا۔ یہاں درختوں کی بہتات اور گرتے ہوئے پتوں کا بہت زیادہ شور تھا۔ خزاں کی سرد ہوا تیز ہو چکی تھی۔ درختوں کے پتے گر رہے تھے۔ شیزا کی قبر عین اُس پیپل کے پیڑ کے نیچے تھی جس کے اوپر مَیں نے سنہری پرندوں کو اُڑانیں بھرتے دیکھا تھا اور پتوں کو مسلسل کھڑکھڑاتے سنا تھا۔ اِس پیپل کے زرد پتے ابھی تک کھڑکھڑا رہے تھے، تالیاں بجا رہے تھے اور خزاں کی تیز اور سرد ہوا کی ٹھوکریں کھا کر قبر پر گر رہے تھے۔ مَیں کافی دیر وہاں رُکا رہا۔ مَیں نے دیکھا، کچھ ہی دیر میں شیزا کی قبر پیپل کے زرد پتوں سے ڈھک گئی تھی۔ وہیں پیپل کی ایک شاخ پر کہیں سے اُڑتی ہوئی سُرمئی چڑیا آ کر بیٹھ گئی اور تیز آواز میں بولنے لگی۔ مَیں نے اُس کے پروں کو غور سے دیکھا، وہ اپنی آواز اور جاذبیت میں شیزا سے کم نہیں تھی۔ ہوا تیز اور سرد ہونے

لگی تھی۔ مَیں ایک ہی دم جھکا اور شیزا کی قبر کو اُس کا ماتھا سمجھ کر بھرپور بوسہ دیا۔ میری ناک اور چہرے پر قبر کی تازہ مٹی لگ گئی۔ تب مَیں نے اُسے آخری سلام کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ اب مَیں ''کماری والا'' میں رُکنا نہیں چاہتا تھا۔ مَیں قبرستان سے سیدھا سر دشام کو ہم سفر کر کے اسلام آباد کی طرف چل پڑا۔ بھلا زینت سے اب میرا واسطہ ہی کیا تھا؟

[illegible] ہے ... یہ شخص [illegible] مشکل ہے [illegible] پہلے سے زیادہ [illegible] ہیں۔
ان کے تمام کام میں تازگی ہے، روایت اور تاریخ کا شعور حیرت زدہ کرنے والا ہے۔ جس طرح ان کا شعر اور پھر فکشن میں کام ہے۔ اس سے پہلے ایسی روایت موجود نہیں ہے۔ وہ شاعر بھی ہیں، افسانہ نگار بھی ہیں اور ناولسٹ بھی۔ ان کے فکشن میں پنجاب کی سرزمین سے غیر معمولی دلچسپی ان کے بیان میں غیر معمولی مہارت کا ثبوت دیتی ہے۔ ناطق کی نثر سے مکالمہ اور بیانیہ کے [illegible] ان کی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ناطق کے فکشن کا قاری خود انسان اور فطرت کے پیچیدہ رشتوں، انسان اور انسان کے درمیان محبت اور آویزش کے نکات سے بہرہ اندوز ہوتا ہوا دیکھ سکتا ہے۔ علی اکبر ناطق سے اردو ادب [illegible] توقعات اور امیدیں وابستہ کرنا [illegible] ہوگا۔ ان کا سفر بہت طویل ہے، راہیں کشادہ اور منفعت سے بھری ہوئی ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی

علی اکبر ناطق کا فکشن حقیقت اور کہانی کے پیچیدہ پہلوؤں کو سامنے لے کر آتا ہے۔ وہ دیہات اور اس کے کرداروں کی اقدار کا آدمی ہے اور حقیقی طور پر سن آف سوئل ہے۔ وہ احمد ندیم قاسمی کی طرح دیہات کا رومان پیش نہیں کرتا بلکہ اپنے کرداروں کو حقیقت کی زندگی عطا کرتا ہے۔

انتظار حسین

علی اکبر ناطق ایک عجیب سا لاابالی نوجوان ہے جس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اگلے لمحے آپ کا دشمن ہو جائے یا فوراً ہی آپ کو گلے لگا لے لیکن یہ طے ہے کہ افسانے، ناول یا شاعری میں اس کی صلاحیتیں بلاخیز ہیں۔ اس کا افسانوی مجموعہ "قائم دین" ایسا ہے کہ اردو ادب کا ایک سراسر نیا روپ اس میں سواری کرتا نظر آتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ

جب علی اکبر ناطق نے فون پر مجھ سے کہا، "اس کو جلدی پڑھنے کی کوشش کیجیے گا۔" تب میں خوب ہنسی تھی۔ لیکن ہوا تو یہی، ایک دفعہ کتاب شروع کی تو اس ابتدائی مشکل کے ختم ہونے کے بعد میں نے "نولکھی کوٹھی" ناول کو پڑھنا شروع کیا تو آخری صفحے تک پڑھتی ہی چلی گئی۔ یہ جیسے کوئی آنکھوں دیکھا قصہ تھا جس کی سچائی نے ذہن کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس نے مجھ کو اداس اور سنجیدہ چھوڑا۔ علی اکبر کی تحریر پڑھتے ہوئے آپ انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔

فہمیدہ ریاض

علی اکبر ناطق کے "نولکھی کوٹھی" نے مجھے ایسا جکڑا کہ ایک ہی نشست میں تقریباً ساڑھے چار سو صفحات کی یہ کتاب پڑھ گیا، بیچ میں کھانا وغیرہ کھایا ہو تو میں اس کی قسم نہیں دیتا۔ ناطق کے ناول نے مجھے حیران تو نہیں کیا کیونکہ وہ اپنی شاعری اور افسانہ نگاری کی دھاک پہلے ہی بٹھا چکا تھا، البتہ پریشان ضرور کیا کہ ؎

ایسی چنگاری بھی یا رب، اپنی خاکستر میں تھی

ظفر اقبال

علی اکبر ناطق
فقیر بستی میں تھا
ناول
نولکھی کوٹھی
علی اکبر ناطق
علی اکبر ناطق
شاہ محمد کا ٹانگہ
افسانے
علی اکبر ناطق
قائم دین
افسانے
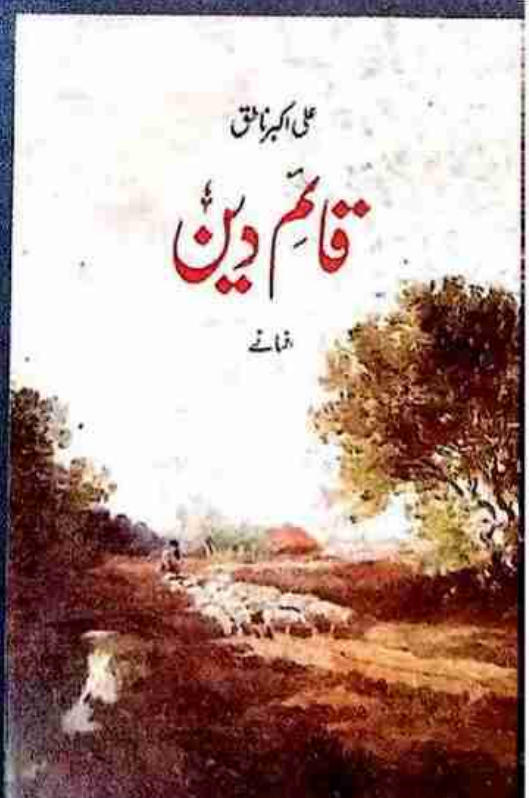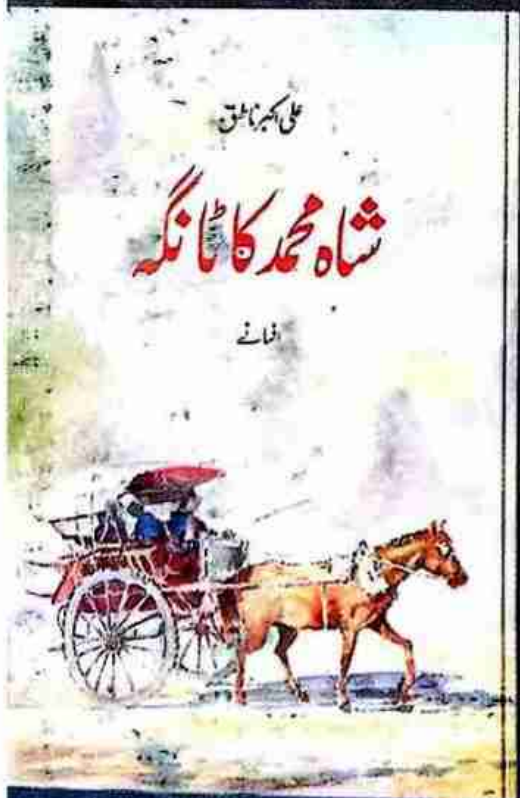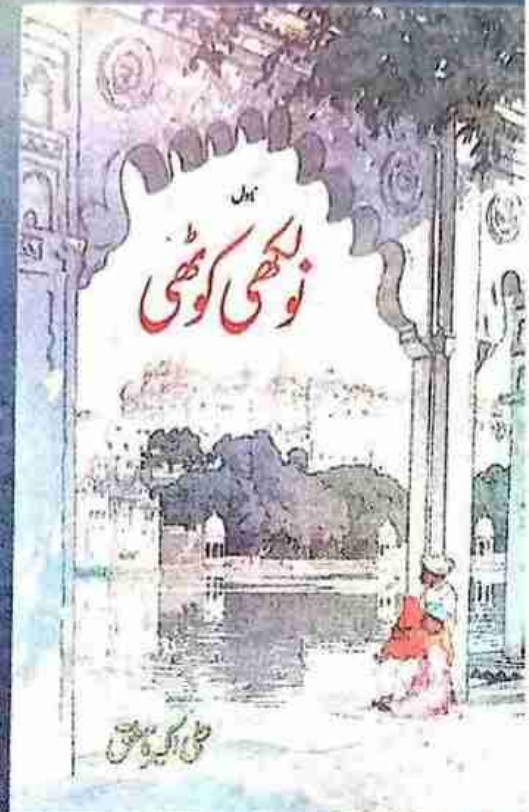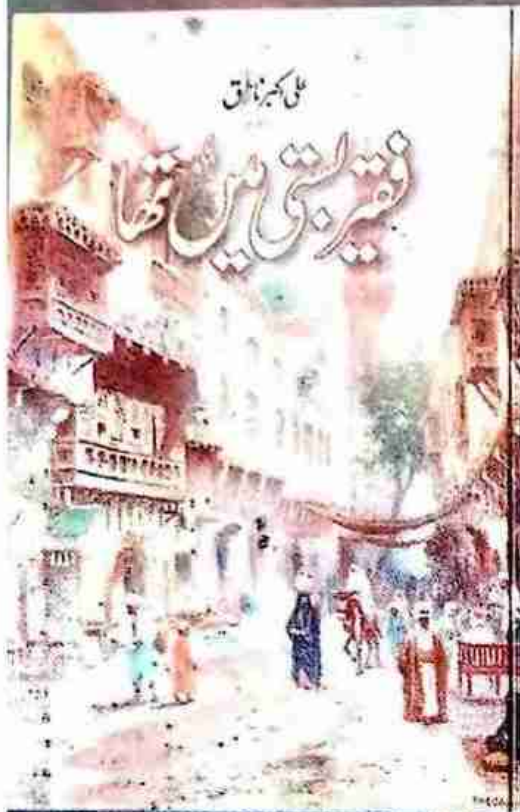
علی اکبر ناطِق - ایک انوکھا شخص، پنجاب کی زرخیز زمین سے اُگا زرخیز شخص، کبھی سادہ تو کبھی پیچیدہ، گاہے شعلہ گاہے شبنم، حلقۂ یاراں میں ابریشم اور معرکۂ حق و باطل میں فولاد کی عملی تفسیر، ایک لمحے سب کا دوست، اپنا دُشمن، دوسرے لمحے سب کا دُشمن، اپنا دوست، جواہر کی مانند قیمتی اور نایاب، البتہ دوستوں کے لیے ارزاں اور میسّر، کبھی سب کے بیچ قہقہے لگاتا ہوا تو کبھی تنہائی میں آنسو بہاتا ہوا، اِدھر نثر میں فن پارے پہ شاہ پارہ لاتا ہوا اُدھر گلشنِ شاعری پر چاندی کی پھوار برساتا ہوا، ایک جانب اپنی ذات میں انجمن دوسری جانب اُس سا تنہا شخص کوئی نہیں، میں نے اُسے غضب میں بھٹی میں دہکتی تلوار کی طرح دہکتے بھی دیکھا ہے اور محبت میں گلاب ہوتے بھی، سو اس کی ذات کے جھوٹ اور سچ کچھ کچھ جانتا ہوں کیوں کہ شاید وہ بھی اپنے آپ کو مکمل طور پر نہیں جانتا، اگر اس کی ذات کی زرخیزی اور وفور کو ادب کی راہ نہ ملتی تو نہ جانے یہ طوفانِ بلا کدھر کا رُخ کرتا، تخریب کرتا یا تعمیر کرتا، کرتا ضرور کہ وہ ہاتھ پہ ہاتھ دَھرے بیٹھا نہ رہتا۔ اگر اس سے پوچھا جائے کہ وہ کیا پسند کرے گا کہ آنے والے اسے کیسے یاد رکھیں، بہ طور ادیب یا شاعر، تو اغلب امکان ہے کہ وہ بول اُٹھے گا... ''غلامِ علی''

یہ ہمہ صفت، متلون مزاج، سیمابی، پارہ نُما آدمی اس دَور میں اپنی طرز کا واحد آدمی ہے، ایک انوکھا شخص!

عرفان جاوید
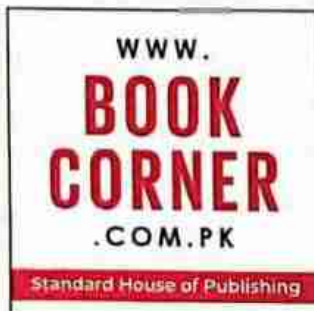
BookCornerJlm
bookcornershowroom
bookcorner
bookcornerjhelum
0314-4440882
Jhelum (Pakistan)

Title Cover Drawing by